جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن

قُل فَلِلّٰہِ الحُجَّۃُ البَالِغَۃُ
کہیے: پس حجت پوری اللہ کی رہی

رَحمَۃُ اللّٰہِ الوَاسِعَۃ

شرح

حُجَّۃُ اللّٰہِ البَالِغَۃ

جلدِ پنجم

تصنیف

امام اکبر، مجدد ملت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

استاذ دارالعلوم دیوبند

زمزم پبلشرز

جدید نظرثانی شدہ ایڈیشن

قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃ
کہیے: پس حجت پوری اللہ کی رہی

رَحمۃُ اللّٰہِ الواسِعۃ

شرح

حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغۃ

جلدِ پنجم

تصنیف

امامِ اکبر، مجدّدِ ملّت، حکیم الاسلام

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی قدّس سرّہ

(۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ — ۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)

شارح

حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ
اُستاذِ دارالعُلوم دیوبند

ناشر

زمزم پبلشرز

نزد مُقدس مسجد، اُردو بازار، کراچی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب کا نام .... رحمۃ اللہ الواسعۃ (جلد پنجم)

(جدید نظر ثانی شدہ ایڈیشن)

تاریخ اشاعت .... دسمبر ۲۰۰۳ء

باہتمام .... احباب زمزم پبلشرز

کمپوزنگ ....

سرورق ....

مطبع ....

ناشر .... زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اردو بازار کراچی

فون: 0092-21-2760374 - 2725673

فیکس: 0092-21-2725673

ای میل - zmzm01@cyber.net.pk



ملنے کے دیگر پتے

- دارالاشاعت، اردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ، بالمقابل آرام باغ کراچی
- صدیقی ٹرسٹ، لسبیلہ چوک کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار لاہور
- کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

ساؤتھ افریقہ میں

Madrasah Arabia Islamia.
P.O.Box 9786
Azaad Ville 1750
South Africa.
Tel: (011) 413 - 2786

انگلینڈ میں

AL Farooq International Ltd.
1 Atkinson Street,
Leicester,, LE5 3QA
Tel: (0116) 2537640

فہرست مضامین

نکاح وطلاق

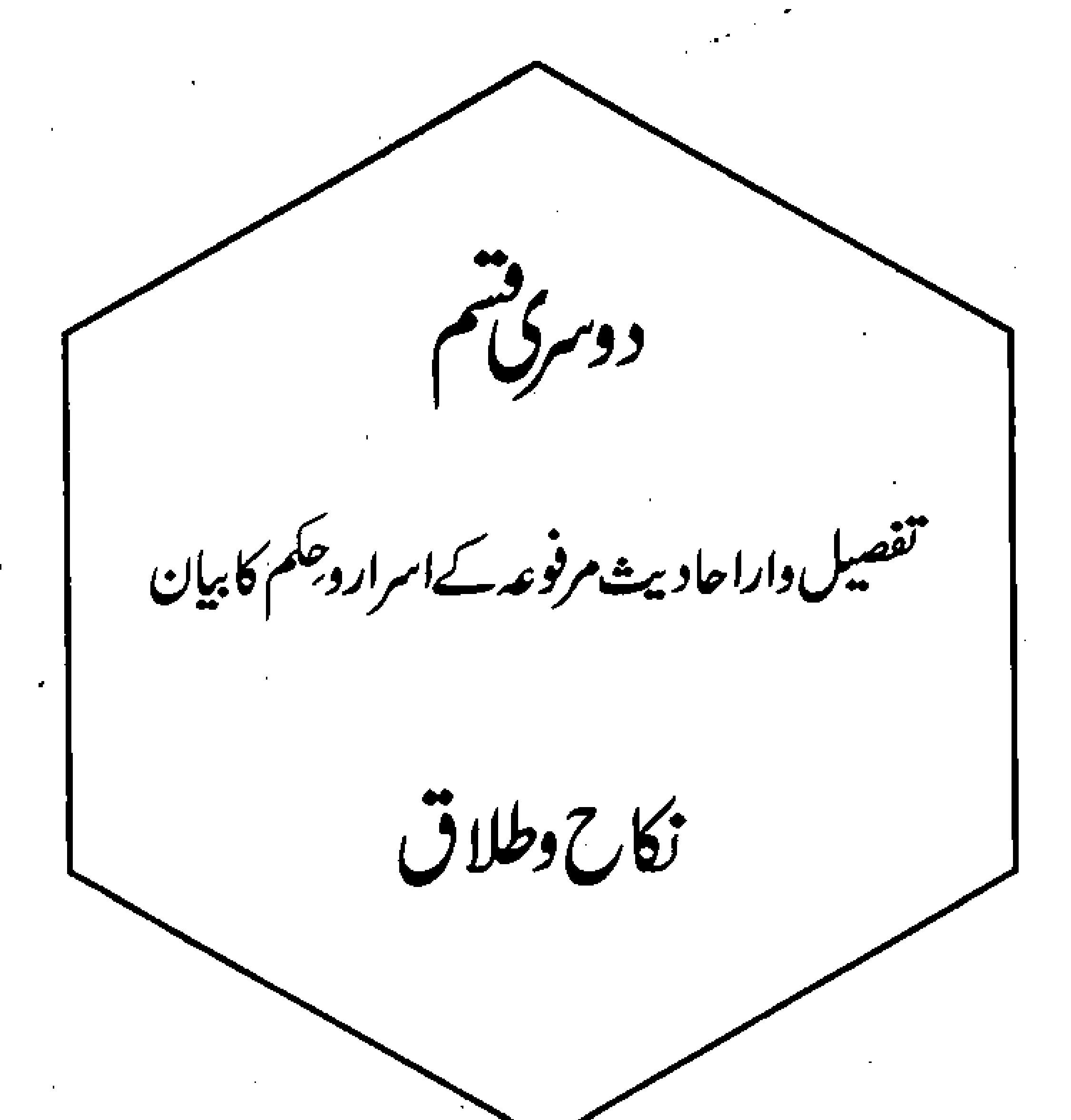
خلافت وامارت

قضاء کے لئے ہدایات و قوانین (قضاء بھاری ذمہ داری ہے، عہدہ کا طالب مخلص کم ہوتا ہے، دیندار خداترس عالم ہی قاضی بنایا جائے، قاضی غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے، قاضی کی اجتہادی غلطی بھی

باب (۶) جہاد کا بیان ۳۷۴-۴۳۰

معیشت (زندگانی)

سیرت، فتن، مناقب



دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حکم کا بیان

نکاح وطلاق

باب ـــــ ۱

تدبیر منزل کے سلسلہ کی اصولی باتیں

تدبیر منزل میں عربوں کی عادتوں کا لحاظ

فن تدبیر منزل: وہ علم ہے جو ترقی یافتہ تمدن یعنی شہری زندگی میں خاندانی تعلقات کی نگہداشت سے بحث کرتا ہے۔اس فن کی اکثر ضروری باتیں کتاب کی تمہید میں ارتفاقات وغیرہ کے بیان میں گزر چکی ہیں۔ان کو دیکھ لیا جائے[1]
یہاں ایک بات جان لیں:

نظام خانہ داری کی بنیادی باتوں پر عرب وعجم کے تمام گروہ متفق ہیں۔البتہ ان کے پیکروں اور شکلوں میں اختلاف ہے۔مثلاً نکاح کی ضرورت سب کے نزدیک مسلّم ہے،مگر اس کے طریقوں میں اختلاف ہے۔اور نبی ﷺ کی بعثت عربوں میں ہوئی ہے۔چنانچہ حکمت الٰہی نے چاہا کہ زمین میں اللہ کا بول بالا ہونے کی راہ اور اشاعتِ دین کا طریقہ یہ ہو کہ عربوں کا غلبہ ہو۔اور ان کی عادتوں کے ذریعہ لوگوں کی عادتوں کا چلن ختم کر دیا جائے۔اور ان کی حکومت کے ذریعہ لوگوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔پس ضروری ہے کہ تدبیر منزل کی تشکیل عربوں کی عادتوں کے ذریعہ ہو۔ان میں جو نظام خانہ داری رائج تھا اس کی صورتیں اور شکلیں بعینہٖ تدبیر منزل میں ملحوظ رکھی جائیں[2]

﴿من أبواب تدبير المنزل﴾

اعلم: أن أصول فن تدبير المنازل مسلَّمةٌ عند طوائف العرب والعجم، ولهم اختلاف في أشباحها وصُوَرِها، وبُعث النبي صلى الله عليه وسلم في العرب، واقتضت الحكمة أن يكون طريقُ ظهورِ كلمةِ الله في الأرض غلبتَهم على الأديان، ونسخُ عاداتِ أولئك بعاداتهم، ورياساتِ أولئك بِرياساتهم، فأوجب ذلك أن لا يتعين تدبيرُ المنازل إلا في عادات العرب،

[1] دیکھیں کتاب کی پہلی قسم، مبحث سوم، باب چہارم (رحمۃ اللہ ۱:۴۴۱-۴۵۵) مبحث سادس، باب یازدہم (رحمۃ اللہ ۲:۲۲۹-۲۴۹)
[2] تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۲:۹۹)



وأن تُعتبر تلك الصور والأشباح بأعيانها.

وقد ذكرنا أكثرَ ما يجب ذكرُه في مقدمة الكتاب في الارتفاقات وغيرها، فراجِع.

ترجمہ: تدبیر منزل کے سلسلہ کی اصولی باتیں: جان لیں کہ گھروں کے انتظام کے فن کی بنیادی باتیں عرب وعجم کی جماعتوں کے نزدیک مسلّم ہیں۔ اور ان میں ان کے پیکروں اور شکلوں میں اختلاف ہے۔ اور نبی ﷺ عرب میں مبعوث کئے گئے ہیں۔ اور حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ زمین میں اللہ کے کلمہ (دین) کے ظہور کی راہ (شکل) عربوں کا (دیگر) ادیان پر غلبہ، اور ان کی عادتوں کا عربوں کی عادتوں سے ختم کرنا اور ان کی ریاست کا عربوں کی ریاست کے ذریعہ زوال ہو۔ پس اس چیز نے واجب کیا کہ گھروں کے نظام کی تعیین نہ ہو مگر عربوں کی عادتوں میں، اور یہ کہ ان صورتوں اور پیکروں کا بعینہٖ اعتبار کیا جائے ——— اور تحقیق ذکر کردی ہیں ہم نے اکثر وہ باتیں جن کا ذکر کرنا ضروری تھا کتاب کی تمہید میں ارتفاقات وغیرہ کے بیان میں، پس اس کو دیکھ لیں۔

تصحیح: فی مقدمة الکتاب: تمام نسخوں میں فی مقدمة الباب تھا۔ مگر یہ زلّتِ قلم ہے۔ اور مقدمہ سے مراد کتاب کی قسم اول ہے۔ وہ قسم ثانی کی تمہید ہے۔

باب ——— ۲

منگنی اور اس سے لگتی باتیں

ضرورتِ نکاح

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے جوانو! تم میں سے جو شخص گھر بسانے کی طاقت رکھتا ہے: وہ نکاح کرلے۔ کیونکہ نکاح نگاہ کو بہت زیادہ پست کرنے والا، اور شرمگاہ کی بہت زیادہ حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جو نکاح کی طاقت نہیں رکھتا وہ روزے لازم پکڑے۔ کیونکہ روزہ اس کے لئے آختگی ہے“ (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۸۰)

تشریح: جب جسم میں منی کی تولید زیادہ ہوتی ہے تو اس کے اَبخرے دماغ کی طرف صعود کرتے ہیں۔ پس وہ خوبصورت عورت کو دیکھنے کی رغبت پیدا کرتے ہیں۔ اور دل اس کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور مادّہ کا ایک حصہ شرمگاہ کی طرف اترتا ہے تو نفس میں شہوت پیدا ہوتی ہے، اور جنسی خواہش بھڑکتی ہے۔ اور ایسا اکثر عالَم جوانی میں ہوتا ہے۔ اور یہ نفس کا ایک بڑا حجاب ہے، جو اس کو نیکوکاری میں انہماک سے روکتا ہے۔ اور اس کو بدکاری پر ابھارتا ہے۔ اور اس کے اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور باہمی معاملات کی خرابی کے بھنور میں پہنچا دیتا ہے۔ پس اس حجاب کو دور کرنا ضروری ہے۔

پس جوشخص ہم بستری کی طاقت رکھتا ہے، اوروہ اس پر قادر ہے، بایں طور کہ اس کو ــــ مثال کے طور پر ــــ ایسی عورت میسر ہے جس سے نکاح کرنا حکمت کے تقاضے کے مطابق ہے۔ اور وہ اس کے نان ونفقہ پر قادر ہے۔ تو اس کے لئے اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہ وہ نکاح کرلے۔ اس سے نگاہ بہت زیادہ پست ہوجاتی ہے۔ اور شرمگاہ کی خوب حفاظت ہوجاتی ہے۔ کیونکہ نکاح سے استفراغِ مادّہ خوب ہوجاتا ہے۔

اور جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتا وہ مسلسل روزے رکھے۔ متواتر روزوں میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے نفس کی تیزی ٹوٹتی ہے۔ اور جوانی کا جوش ٹھنڈا پڑتا ہے۔ کیونکہ روزوں سے مادّہ کی فراوانی کم ہوتی ہے۔ پس وہ برے اخلاق جو خون کی زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں بدل جاتے ہیں۔

تبتّل (بیوی سے بےتعلقی) کی ممانعت

شریعت نے مثبت پہلو سے جہاں نکاح کی ترغیب دی ہے، منفی پہلو سے بیوی سے بےتعلق رہنے کی ممانعت بھی کی ہے:

حدیث ــــــ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے بیوی سے بےتعلق ہوجانے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو اجازت نہ دی، اور فرمایا: "سنو! قسم بخدا! میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ اور تم میں سب سے زیادہ اللہ کا خوف کھاتا ہوں۔ تاہم میں (نفل) روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ اور (رات کو) نفل پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ اور عورتوں سے ازدواجی تعلق بھی رکھتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ میرا نہیں!" (بخاری حدیث ۵۰۶۳)

تشریح: ایران کے مانی فرقہ کے لوگ، عیسائی راہب اور سادھو سنت: اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے نکاح نہیں کرتے تھے، جو غلط طریقہ ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ جس کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے پسند کیا ہے: وہ طبیعت کی اصلاح کرنا ہے، اور اس کی کجی کو دور کرنا ہے۔ نفس کے تقاضوں کو پامال کرنا ان کا طریقہ نہیں۔ یہ بات پہلے تفصیل سے پہلے ذکر کی جاچکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے (رحمۃ اللہ: ۵۳۰)

﴿ الخِطبة و مايتعلق بها﴾

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "يامعشرَ الشباب! من استطاع منكم الباءَةَ فليتزوجْ، فإنه أغض للبصر، وأحصن للفرج، ومن لم يستطع فعليه بالصوم، فإنه له وِجاءٌ"

اعلم: أن المني إذا كثر تولُّدُه في البدن صَعِدَ بخارُه إلى الدماغ، فحبَّبَ إليه النظرَ إلى المرأة الجميلة، وشَغَفَ قلبَه حبُّها، ونزل قسطٌ منه إلى الفرج، فحصل الشبقُ، واشتدت الغُلمةُ، وأكثرُ مايكون ذلك في وقت الشباب. وهذا حجابٌ عظيم من حُجُبِ الطبيعة، يمنعه

مـن الإمـعـان في الإحـسـان، ويُهيِّجه إلى الزنا، ويُفسد عليه الأخلاق، ويوقعه في مهالك عظيمةٍ من فساد ذات البين، فوجب إماطةُ هذا الحجاب.

فـمـن استطاع الجماع، وقدر عليه، بأن تيسرت له — مثلاً — امرأةٌ على ما تأمر به الحكمةُ، وقـدر عـلـى نـفـقتها، فلا أحسنَ له من أن يتزوج، فإن التزوج أغض للبصر، وأحصنُ للفرج، من حيث أنه سببٌ لكثرة استفراغ المني.

ومـن لـم يستطع ذلك فـعـليـه بالصوم، فإن سَرْدَ الصوم له خاصيةٌ في كسر سَوْرة الطبيعة، وَكَبْحِها عن غُلَوائها، لما فيه من تقليل مادتها، فيتغير به كل خُلق نشأ من كثرة الأخلاط.

[۲] وردَّ صـلـى الله عـلـيـه وسـلـم عـلـى عثـمـان بـن مظعون التبتُّلَ، وقال: "أما والله! إني لأخشـاكـم لله، وأتـقاكم له، لكني أصوم وأُفطر، وأصلي وأرقُد، وأتزوَّجُ النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني"

اعلم: أنه كانت المانَوِيَّةُ والمَتَرَهِّبَةُ من النصارى يتقربون إلى الله بترك النكاح، وهذا باطل، لأن طـريـقة الأنبيـاء عـليهـم السـلام التـي ارتـضـاهـا الله للنـاس: هي إصلاح الطبيعة، ودفعُ اعوجاجها، لاسلخُها عن مقتضياتها، وقد ذكرنا ذلك مستوعبا، فراجعْ.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: الباءة: نکاح، جماع۔ بَوَّأَ الرجلُ: شادی کرنا۔ ایک دوسرا لفظ ہے: الباه والباهة: اس کے معنی بھی نکاح اور جماع کے ہیں۔ یہی لفظ قوتِ باہ کے لئے مستعمل ہے۔ حدیث میں یہ لفظ نہیں۔ نامرد کو روزوں کی کچھ حاجت نہیں...... وَجَأ (ف) وِجَاءَ الفحلَ: آختہ کرنا یعنی نر کے خصیوں کو چھیتنا جس سے وہ خصی جیسا ہو جائے۔ اور خَصاہ (ض) خِصَاءً: فوطے نکالدینا۔ روزوں سے شہوت ٹوٹتی ہے۔ قوتِ مردمی ختم نہیں ہوتی...... الشبق: شہوت۔ شَبِقَ الذکر: کثیر الشہوت ہونا...... غَلِمَ (س) غُلمة: جماع کی شہوت کا زیادہ ہونا...... کَبَحَ (ف) کَبْحًا: چوپائے کو روکنے کے لئے لگام کھینچنا...... الغُلَواء: الغُلُوّ: زیادتی، حد سے بڑھ جانا۔ غُلَواء الشباب: جوانی کا جوبن...... الأخلاط: سوداء، صفراء، خون اور بلغم۔ یہاں خون مراد ہے۔

☆ ☆ ☆

نکاح کے لئے عورت کا انتخاب

جب نکاح ضروری ہوا تو ایسی عورت کی نشاندہی ضروری ہے جس سے نکاح مصلحت سے ہم آہنگ ہو، اور جس سے گھریلو زندگی کے مقاصد تکمیل پذیر ہوں۔ کیونکہ میاں بیوی میں صحبت ورفاقت ناگزیر ہے۔ اور جانبین سے ضرورتیں امر

واقعی ہیں۔ پس اگر عورت بدفطرت، بداطوار، بداخلاق اور بدکلام ہوگی تو مرد کا جینا حرام ہو جائے گا۔ اور نکاح وبالِ جان بن جائے گا۔ اور اگر عورت نیک سیرت، خوش اخلاق، خوش کلام اور نیک اطوار ہوگی تو گھر پوری طرح سنور جائے گا۔ اور ہر طرف سے برکتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''دنیا ساری متاع (ایک وقت تک برتنے کی چیز) ہے۔ اور دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۸۳)

ملحوظہ: یہ تمہید ہے۔ اس کے تحت وہ اوصاف بیان کئے جائیں گے جن کا نکاح میں لحاظ ضروری ہے۔

دینداری کو ترجیح

حدیث ـــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت چار مقاصد سے نکاح کی جاتی ہے: اس کے مال کی وجہ سے، اس کی خاندانی خوبیوں کی وجہ سے، اس کی خوبصورتی کی وجہ سے، اور اس کی دینداری کی وجہ سے: پس تم کوشش کر کے دیندار عورت حاصل کرو۔ تمہارے ہاتھ خاک آلود ہوں!'' یعنی ناداری وغیرہ کی پرواہ مت کرو (مشکوۃ حدیث ۳۰۸۲)

تشریح: لوگ عموماً نکاح کے لئے عورت کے انتخاب میں چار باتیں پیشِ نظر رکھتے ہیں:

۱ ـــــ عورت کی مالداری دیکھتے ہیں۔ تاکہ اس کے مال سے خود شوہر کو تعاون ملے۔ یا ماں کی طرف سے ملنے والے ترکہ کی وجہ سے اولاد خوش حال ہو۔

۲ ـــ عورت کا حسب ونسب اور خاندانی خوبیاں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ اونچے خاندان میں نکاح کرنا شرف وعزت کی بات ہے۔

۳ ـــ عورت کا حسن وجمال دیکھتے ہیں۔ کیونکہ فطرتِ انسانی خوبصورتی کی طرف مائل ہے۔ اور اکثر لوگوں پر فطرت کا غلبہ ہوتا ہے۔

۴ ـــ عورت کی دینداری دیکھتے ہیں۔ جو عورت پارسا، باعفت، عبادت گذار اور خدا کی نیک بندی ہوتی ہے اس سے نکاح کو ترجیح دیتے ہیں۔

پہلا اور دوسرا مقصد یعنی مال وجاہ اور ثروت وشرف وہ لوگ پیشِ نظر رکھتے ہیں جن پر دنیاداری کا غلبہ ہوتا ہے۔ اور تیسرا مقصد یعنی عورت کی خوبصورتی اور رعنائی وہ لوگ پیشِ نظر رکھتے ہیں جو نفس کے غلام ہوتے ہیں۔ اور دینداری وہ لوگ دیکھتے ہیں جو پاکیزگی، نیازمندی، فیاضی اور انصاف کے جوہر سے آراستہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند کرتے ہیں جو دینی کاموں میں ان کی معاونت کرے۔ وہ اہلِ خیر وصلاح کی صحبت کے خواہاں ہوتے ہیں۔

فائدہ: ''تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں'' بددعا نہیں، بلکہ فقر واحتیاج سے کنایہ ہے۔ اور وَلَــو مقدر ہے۔ یعنی نکاح کا یہی مقصد قابل لحاظ ہے۔ اگرچہ دیندار عورت سے نکاح کرنے سے مال ومتاع حاصل نہ ہو، پھر بھی اسی کو ترجیح دینی چاہئے۔

اور دیگر مقاصد کی نفی بطور مثال ہے۔ البتہ اگر دینداری کے ساتھ مذکورہ اوصاف ثلاثہ یا ان میں سے بعض جمع ہوں تو نور علی نور! اور اس کی نظیر علی رغم انف ابی ذر ہے۔ (مشکوٰۃ حدیث ۲۶ کتاب الایمان) یعنی مؤمن مرتکب کبیرہ جنت میں جائے گا، چاہے یہ بات ابوذرؓ کو پسند نہ ہو۔

عورت کی دو خوبیاں

اولاد پر شفقت اور شوہر کی چیزوں کی نگہداشت

حدیث ــــ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اونٹ پر سواری کرنے والی عورتوں میں یعنی عرب کی عورتوں میں سب سے بہتر قریش کی عورتیں ہیں۔ وہ چھوٹی اولاد پر بہت شفقت کرنے والی اور شوہر کی املاک کی بہت زیادہ نگہداشت کرنے والی ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۸۴)

تشریح: مستحب یہ ہے کہ عورت ایسے علاقہ یا قبیلہ کی ہو جن کی عورتوں کی عادتیں اچھی ہوں۔ کیونکہ لوگ سونے چاندی کی کھانوں کی طرح مختلف صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور قومی عادات واطوار انسان پر غالب ہوتے ہیں۔ گویا وہ فطری امر کی طرح ہوتے ہیں جن سے جدا ہونا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ مذکورہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ خاندان قریش کی عورتیں بہترین عورتیں ہیں۔ ان میں چند خوبیاں ہیں: ایک: یہ کہ وہ نابالغ اولاد پر بہت زیادہ مہربان ہوتی ہیں۔ دوسری: یہ کہ وہ شوہر کے مال کی اچھی طرح نگہداشت کرتی ہیں۔ نوکروں وغیرہ کا خیال رکھتی ہیں۔ اور یہ دو خوبیاں نکاح کے اہم مقاصد ہیں۔ انہی دونوں کی وجہ سے خانگی نظام درست ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں انہی دو کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اور تیسری خوبی یہ ہے کہ وہ اخلاق صالحہ کے جوہر سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اگر آپ ہمارے علاقہ کی اور ماوراء النہر وغیرہ کی عورتوں کے احوال کا جائزہ لیں تو اخلاق صالحہ میں مضبوط قدم اور ان سے بہت زیادہ چپکی رہنے والی: قریش کی عورتوں سے زیادہ کوئی عورت نظر نہیں آئے گی۔

عورت کی دو اور خوبیاں

تولید کی وافر صلاحیت اور شوہر سے محبت

حدیث ــــ حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زیادہ بچے جننے والی زیادہ پیار کرنے والی عورت سے نکاح کرو۔ کیونکہ میں تمہاری زیادتی کے ذریعہ دیگر امتوں پر (قیامت کے دن) فخر کرنے والا ہوں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۹۱)

تشریح: میاں بیوی میں مودّت ومحبت سے مدنی (گھریلو) مصلحت تکمیل پذیر ہوتی ہے یعنی گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اور نسل کی کثرت سے مدنی اور ملّی دونوں مصلحتیں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں یعنی خاندان بھی بڑھتا ہے اور افرادِ ملت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اور عورت کا اپنے شوہر سے محبت کرنا: اس کے مزاج کی درستگی اور اس کی طبیعت کی قوت پر دلالت کرتا ہے۔ نیز شوہر سے محبت اس کو شوہر کے علاوہ کی طرف نظر اٹھانے سے روک دیتی ہے۔ اور شوہر کا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ کنگھی وغیرہ اسبابِ زینت کے ذریعہ خود کو آراستہ کرے گی تو مرد بھی اسی کا ہو کر رہ جائے گا اور اس کی شرم گاہ اور نظر خوب محفوظ ہو جائے گی۔

[۳] ثم لابد من الإرشاد إلى المرأة التي يكون نكاحُها موافقًا للحكمة، مُوَفِّرًا عليه مقاصدَ تدبير المنزل، لأن الصحبةَ بين الزوجين لازمةٌ، والحاجاتِ من الجانبين متأكدةٌ، فلو كان لها جِبِلَّةُ سوءٍ، وفي خُلقها وعادتها فَظَاظَةٌ، وفي لسانها بَذَاءٌ: ضاقت عليه الأرض بما رحبت، وانقلبت عليه المصلحةُ مفسدةً. ولو كانت صالحةً صلح المنزلُ كلَّ الصلاح، وتهيأله أسبابُ الخير من كل جانب. وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" الدنيا كلها متاع، وخير متاع الدنيا المرأةُ الصالحة"

[٤] قال صلى الله عليه وسلم:" تُنكح المرأة لأربع: لما لها، ولحَسَبها، ولجمالها، ولدينها، فاظفرْ بذات الدين تَرِبَتْ يداك!"

اعلم: أن المقاصدَ التي يقصدها الناسُ في اختيار المرأة أربعُ خصالٍ غالبًا، تُنكح:

[الف] لما لها: بأن يُرْغَبَ في المال، ويُرْجى مواساتها معه في مالها، وأن يكون أولادُه أغنياءَ، لما يجدون من قِبَلِ أمهم.

[ب] ولحسبها: يعني مفاخر آباءِ المرأة، فإن التزوج في الأشراف شرفٌ وجاهٌ.

[ج] ولجمالها: فإن الطبيعة البشرية راغبة في الجمال، وكثير من الناس تغلب عليهم الطبيعة.

[د] ولدينها: أي لعفتها عن المعاصي، وبُعدها عن الريب، وتقربها إلى بارئها بالطاعات،

فالمال والجاه مقصدُ من غلب عليه حجابُ الرسم، والجمالُ وما يشبهه من الشباب مقصدُ من غلب عليه حجاب الطبيعة، والدِّينُ مقصدُ من تهذَّب بالفطرة، فأحبَّ أن تُعاوِنَه امرأتُه في دينه، ورَغِبَ في صحبة أهل الخير.

[٥] قال صلى الله عليه وسلم:" خير نساء ركبن الإبل نساءُ قريشٍ، أحناه على ولد في صِغَرِه، وأرعاه على زوج في ذات يده"

أقول: يستحب أن تكون المرأة من كُوْرَةٍ وقبيلةٍ: عاداتُ نسائها صالحةٌ، فإن الناس معادنُ كمعادن الذهب والفضة، وعاداتُ القوم ورسومهم غالبةٌ على الإنسان، وبمنزل الأمر

المجبول هو عليه، وبيَّنَ أن نساء قريش خيرُ النساء، من جهة أنهن أحنى إنسانٍ على الولد في صغره، وأرعاه على الزوج في ماله ورقيقه، ونحو ذلك. وهذان من أعظم مقاصد النكاح، وبهما انتظام تدبير المنزل. وإن أنت فتَّشت حال الناس اليومَ في بلادنا وبلاد ما وراءَ النهر وغيرها: لم تجد أرسخَ قدمًا في الأخلاق الصالحة، ولا أشدَّ لزوما لها: من نساء قريش.

[٦] وقال صلى الله عليه وسلم: "تزوَّجوا الولود الودود، فإني مكاثر بكم الأمم"

أقول: تـوادُّ الزوجين: به تتم المصلحة المنزلية، وكثرةُ النسل: بها تتم المصلحة المدنية والملية، ووَدُّ المرأة لزوجها دال على صحة مزاجها وقوةِ طبيعتها، مانعٌ لها من أن تطمح بصرها إلى غيره، باعثٌ على تجمُّلها بالامتشاط وغير ذلك، وفيه تحصين فرجه ونظره.

ترجمہ: (۳) پھر ایسی عورت کی طرف راہ نمائی ضروری ہوئی جس سے نکاح حکمت (مصلحت) کے موافق ہو، مرد پر کامل کرنے والا ہو گھریلو نظام کے مقاصد کو۔ کیونکہ میاں بیوی میں رفاقت لازم ہے، اور جانبین سے ضرورتیں پختہ ہیں۔ پس اگر ہوگی عورت کے لئے بدفطرت، اور اس کے اخلاق وعادات میں سختی، اور اس کی زبان میں بدکلامی، تو مرد پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہوجائے گی۔ اور مصلحت مرد پر خرابی سے پلٹ جائے گی۔ اور اگر عورت نیک ہوگی تو گھر پوری طرح سنور جائے گا۔ اور ہر جانب سے اس کے لئے خیر کے اسباب مہیا ہوں گے۔ اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:......

(۴) جان لیں کہ وہ مقاصد جن کا لوگ عموماً قصد کرتے ہیں عورت کے انتخاب میں: چار باتیں ہیں۔ عورت نکاح کی جاتی ہے: (الف) اس کے مال کی وجہ سے بایں طور کہ رغبت کی جائے مال میں، اور امید باندھی جائے عورت کی غم خواری کی شوہر کے ساتھ اس کے مال میں یعنی عورت شوہر کا مالی تعاون کرے، یا بایں طور کہ اس کی اولاد مالدار ہو اس مال سے جو وہ اپنی ماں کی طرف سے (ترکہ میں) پائے —— (ب) اور اس کے حسب کی وجہ سے۔ مراد لے رہے ہیں آپ عورت کے آباء کی خاندانی خوبیاں۔ پس بیشک اشراف میں شادی کرنا شرف وجاہ ہے —— (ج) اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے۔ پس بیشک انسانی طبیعت خوبصورتی کی طرف مائل ہے۔ اور بہت سے لوگوں پر طبیعت غالب ہوتی ہے —— (د) اور اس کی دینداری کی وجہ سے یعنی گناہوں سے عورت کے بچنے کی وجہ سے۔ اور اس کے دور ہونے کی وجہ سے شک کی بات سے۔ اور اس کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اپنے خالق سے عبادت کے ذریعہ —— پس مال اور جاہ اس شخص کا مقصد ہے جس پر حجاب دنیا چھایا ہوا ہے۔ اور خوبصورتی اور وہ چیزیں جو اس کے مشابہ ہیں جوانی سے: اس شخص کا مقصد ہیں جس پر حجاب نفس چھایا ہوا ہے۔ اور دین اس شخص کا مقصد ہے جو فطرت کے ذریعہ مہذب ہوگیا ہے۔ پس وہ پسند کرتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی معاونت کرے اس کے دین میں، اور وہ اہل خیر کی صحبت کا خواہش مند ہوتا ہے۔

(۵) یہ بات مستحب ہے کہ عورت ایسے علاقہ یا قبیلہ کی ہو جن کی عورتوں کی عادتیں اچھی ہوتی ہیں۔ پس بیشک لوگ



سونے چاندی کی کھانوں کی طرح ہیں۔ اور قوم کی عادتیں اور ان کے ریت رواج انسان پر غالب ہوتے ہیں۔ اور بمنزلہ اس امر کے ہوتے ہیں جس پر وہ قوم پیدا کی گئی ہے۔ اور نبی ﷺ نے بیان کیا کہ قریش کی عورتیں بہترین عورتیں ہیں۔ بایں جہت کہ وہ انسانوں میں سب سے زیادہ شفقت کرنے والی ہیں بچے پر اس کے بچپن میں۔ اور انسانوں میں سب سے زیادہ حفاظت کرنے والی ہیں شوہر کے مال اور اس کے غلام اور اس کے مانند کی۔ اور یہ دونوں باتیں نکاح کے بڑے مقاصد میں سے ہیں۔ اور ان دونوں کی وجہ سے خانگی نظام درست ہوتا ہے۔ اور اگر آپ آج لوگوں کے احوال کا جائزہ لیں ہمارے علاقہ میں اور ماوراء النہر اور اس کے علاوہ علاقوں میں تو آپ نہیں پائیں گے اخلاقِ صالحہ میں مضبوط قدم اور نہ اخلاقِ صالحہ سے بہت زیادہ چپکی رہنے والی: قریش کی عورتوں کے علاوہ کو۔

(۶) میاں بیوی کے ایک دوسرے سے محبت کرنے کے ذریعہ گھریلو مصلحت تکمیل پذیر ہوتی ہے۔ اور نسل کی زیادتی کے ذریعہ گھریلو اور ملی مصلحت پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ اور عورت کا اپنے شوہر سے محبت کرنا اس کے مزاج کی درستگی اور اس کی طبیعت کی قوت پر دلالت کرتا ہے جو اس کو روکنے والا ہے اس بات سے کہ عورت اپنی نگاہ اٹھائے شوہر کے علاوہ کی طرف۔ وہ اس کو ابھارنے والا ہے عورت کے خوبصورت بننے پر کنگھی کرنے اور اس کے علاوہ کے ذریعہ، اور اس میں مرد کی شرمگاہ اور اس کی نظر کی حفاظت ہے۔

لغات: الفَظَاظَة: بدخُلقی، سخت کلامی، اکھڑپن...... اَلبَذَاءَ ۃ: بدزبانی، بدکلامی...... الکُورَۃ: علاقہ، پرگنہ جس میں بہت سے گاؤں شامل ہوں...... کَاثرہ مکاثرۃ: زیادتی وکثرت میں کسی سے مقابلہ کرنا، فخر کرنا، بڑھ جانا...... وَدَّہ یَوَدُّہ وَدًّا وَوُدًّا: چاہنا، محبت کرنا۔

تشریح: حجابِ رسم یعنی حجابِ دنیا اور حجابِ طبیعت یعنی حجابِ نفس، تفصیل رحمۃ اللہ (۱: ۵۶۳) میں دیکھیں ــــــ فطرت: خصالِ اربعہ (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) کی مرکب حالت کا نام ہے، جیسا کہ رحمۃ اللہ (۱: ۵۵۴) میں گذرا ــــــ احناہ وارعاہ کی ضمیریں انسان کی طرف عائد ہیں، جیسا کہ شاہ صاحب نے مرجع ظاہر کر کے اشارہ فرمایا ہے۔

☆ ☆ ☆

نکاح میں کفاءت معتبر ہے

البتہ

کُفُو میں معمولی باتیں نظر انداز کی جائیں

کفاءت: نکاح میں حسب ونسب، ذات برادری اور دین وغیرہ میں یکسانیت اور برابری کا نام ہے۔ کُفُو: مماثل،

برابر، ہم پلّہ اور ہم رتبہ شخص کو کہا جاتا ہے۔ کفاءت کے سلسلہ میں متعدد روایات ہیں۔ مگر سب ضعیف ہیں۔ البتہ مجموعہ حسن لغیرہ اور قابل استدلال ہے۔ اور نکاح میں کن امور میں برابری مطلوب ہے یہ بات منصوص نہیں۔ فقہاء نے لوگوں کے احوال پیشِ نظر رکھ کر یہ باتیں طے کی ہیں۔ اور ان میں اختلاف بھی ہوا ہے۔ البتہ دین کی کفاءت بالا جماع صحتِ نکاح کے لئے شرط ہے۔ یعنی مسلمان لڑکی کا نکاح غیر مسلم سے، اگر چہ وہ کتابی ہو نہیں ہوسکتا۔ اور دینداری میں کفاءت بھی بالا جماع معتبر ہے۔ مگر وہ صحتِ نکاح کے لئے شرط نہیں۔ یعنی پرہیزگار لڑکی کا نکاح ایسے ہی لڑکے سے کرنا چاہئے۔ اور نسب یعنی ذات برادری میں، پیشہ میں اور مالداری میں کفاءت امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ کیونکہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں (سورۃ حجرات آیت ۱۰) اور انسانوں کی اقوام وقبائل میں تقسیم محض تعارف کے لئے ہے (سورۂ حجرات آیت ۱۳) اور حدیث میں ہے کہ ''لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح یکساں ہیں۔ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقوی کی وجہ سے (رواہ الدیلمی عن انسؓ، کشف الخفا عجلونی حدیث ۲۸۴۷ کی شرح) اور حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

''لوگو! سنو! تمہارا رب ایک ہے، اور تمہارے باپ بھی ایک ہیں۔ سنو! کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ نہ کسی عجمی کو عربی پر، اور نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر، مگر تقوی کی وجہ سے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں'' (اخرجہ البیہقی وابن مردویہ، درمنثور ۹۸:۶) اور مال آنی جانی چیز ہے۔ اور پیشہ کسی کے ساتھ چپکا نہیں رہتا۔ آدمی معمولی پیشہ چھوڑ کر دوسرا کوئی اچھا کام کرسکتا ہے (ہدایہ ۳۰۱:۲) البتہ تقوی میں یکسانیت پر روایات متفق ہیں۔ اس لئے امام مالک رحمہ اللہ صرف دینداری میں کفاءت کا لحاظ کرتے ہیں۔

اور دیگر فقہاء نسب یعنی ذات برادری، پیشہ اور مہر ونفقہ کے بقدر مالداری میں بھی کفاءت کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کفاءت صحتِ نکاح کے لئے شرط نہیں، مگر قابل لحاظ ہے اور لڑکی اور ولی کا حق ہے۔ کیونکہ اس کے نہ ہونے سے دونوں کو عار لاحق ہوتا ہے۔ پس خلاف ورزی کی صورت میں صاحبِ حق کو قاضی سے رجوع کرنے کا حق ہے۔ جمہور کے نزدیک کفاءت میں ان امور کا اعتبار: خانگی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے ہے۔ کیونکہ عموماً لوگوں کا رہن سہن اور طرز معاشرت مختلف ہوتا ہے۔ پس کفو (میل کے لوگوں) میں نکاح کرنا ایک فطری امر جیسا ہے، اور وہ میاں بیوی میں الفت ومحبت کی احتمالی جگہ ہے۔

اس مسئلہ میں مالکیہ نے درج ذیل روایت سے دینداری کے علاوہ دیگر امور میں کفاءت معتبر نہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت کفاءت کے غیر معتبر ہونے پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کفو میں معمولی باتیں نظر انداز کی جائیں۔ فرماتے ہیں:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارے پاس (تمہاری لڑکی وغیرہ کا) رشتہ وہ شخص بھیجے جس کے دین اور جس کے اخلاق کو تم پسند کرتے ہو، تو تم اس سے نکاح کردو، اگر تم ایسا نہیں کروگے (بلکہ مال وجمال کی لالچ کروگے) تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۹۰)

تشریح: اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نکاح میں کفاءت کا اعتبار نہیں۔ کفاءت سے صرف نظر کیسے کی جاسکتی ہے؟ وہ تو ان چیزوں میں سے ہے جس پر دنیا جہاں کے لوگ پیدا کئے گئے ہیں یعنی فطری امر ہے۔ اور حسب ونسب میں طعن وتشنیع کبھی قتل سے بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ اور لوگوں کے مراتب مختلف ہیں، سب یکساں نہیں۔ اور اس قسم کی باتیں شریعت نظر انداز نہیں کرتی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں اعلی خاندان کی عورتوں کو روکونگا مگر برابر کے لوگوں سے'' یعنی کفو ہی میں ان کو نکاح کی اجازت دونگا (ابن ابی شیبہ ۴: ۲۱۸)

بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفو میں معمولی باتیں نظر انداز کی جائیں یعنی لڑکا غریب، خستہ حال، بدصورت یا باندی کی اولاد ہو[1]، یا اس قسم کی کوئی اور بات ہو تو اس کا خیال نہ کیا جائے۔ جب لڑکا میل کا ہے، اور اس کی دینی اور اخلاقی حالت بھی اچھی ہے تو رشتہ قبول کر لیا جائے۔ کیونکہ نظام خانہ داری میں مطلوب دو باتیں ہیں: ایک: اچھے اخلاق میں معیت وصحبت یعنی بااخلاق رفیق حیات۔ دوم: وہ معیت وصحبت دین کی اصلاح کا ذریعہ ہو۔ پس جب لڑکا بااخلاق اور دیندار ہے تو وہ بہترین رفیق ہے، وہ لڑکی کے دین کو سنوارے گا۔

فائدہ: (۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا ارشاد سے کفاءت کا معتبر ہونا معلوم ہوتا ہے۔ مگر آپؓ کے ایک دوسرے ارشاد سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ فرمایا: مَابَقِيَ فِيَّ شيئٌ من أخلاق الجاهلية. ألا! إني لا أُبالي أيَّ المسلمين نَكَحْتُ، وأيَّهم أنكحتُ یعنی میرے اندر جاہلیت کی باتوں میں سے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ سنو! مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں نے کس مسلمان عورت سے نکاح کیا، اور ان میں سے کس سے میں نے (اپنی لڑکی وغیرہ کا) نکاح کرایا (ابن ابی شیبہ ۴: ۲۱۸) اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ نسب، ذات برادری اور پیشہ میں کفاءت کا اعتبار کرنا جاہلیت کی بات ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ازالۃ الخفا (۲: ۱۱۰ رسالہ فقہ عمرؓ) میں ان دونوں قولوں میں یہ تطبیق دی ہے کہ کفاءت لڑکی اور ولی کا حق ہے، تاکہ دونوں کو عار لاحق نہ ہو۔ لیکن اگر دونوں کسی دینی مصلحت سے (مثلاً لڑکا عالم دین ہے) اپنا یہ حق ساقط کر دیں تو وہ محبوب اور پسندیدہ بات ہے۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے مذکورہ بالا حدیث کو، جو کفاءت کے عدم اعتبار پر دلالت کرتی ہے، کفو کے ساتھ خاص کیا ہے فرمایا ہے کہ اس سے مراد: کفو میں معمولی باتوں کو نظر انداز کرنا ہے۔ مگر اس تخصیص کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ جبکہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت صراحۃً عموم پر دلالت کرتی ہے۔ بیہقی رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إن الله أذهب نَخْـوَةَ الجاهلية، وتكبرها بآباء ها، كلكم لآدم وحواء، كطَفِّ الصاع بالصاع، وإن أكرمكم عند الله أتقاكم، فمن أتاكم ترضون دينه وأمانته فزوجوه یعنی اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کا غرور،

---

[1] نسب کا اعتبار باپ کی طرف سے ہوتا ہے، ماں کی طرف سے نہیں ہوتا۔ یعنی باپ جس خاندان کا ہے، بیٹا بھی اسی خاندان کا شمار ہوتا ہے۔ پس اگر لڑکا ام ولد (باپ کی باندی) کی اولاد ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ۱۲

اور آباء جاہلیت پر فخر کرنا ختم کردیا ہے۔ تم سب آدم وحواء کی اولاد ہو، جیسے غلہ سے بھرا ہوا ایک پیمانہ، دوسرے بھرے ہوئے پیمانہ کے برابر ہوتا ہے۔ اور تم میں اللہ کے نزدیک زیادہ معزز وہ شخص ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ پس جب کوئی ایسا شخص رشتہ بھیجے جس کے دین اور جس کی دیانت داری پر تمہیں بھروسہ ہو تو اس سے نکاح کردو (درمنثور ۹۸:۶) یہ حدیث جس سیاق میں آئی ہے اس کی عموم پر دلالت واضح ہے۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذات برادری وغیرہ میں کفاءت کو امر جاہلی قرار دیا ہے۔ پس مذکورہ تطبیق تشفی بخش نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ حسب ونسب، قومیت، ذات برادری اور پیشوں وغیرہ کے ساتھ جو شرف وعزت اور دناءت ورذالت کا تصور قائم ہوگیا ہے: وہ غیر اسلامی ہے۔ مگر ایسی چیز ہے جس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ حدیث میں ہے کہ جاہلیت کی چار باتیں میری امت میں رہیں گی۔ لوگ ان کو بالکلیہ نہیں چھوڑیں گے: ایک حسب (خاندانی خوبیوں) پر فخر کرنا یعنی اپنی بڑائی جتلانا۔ دوم: نسب میں طعن کرنا یعنی دوسروں کے نسب میں کیڑے نکالنا۔ الی آخرہ (رحمۃ اللہ ۳: ۶۹۰) پس جب تک معاشرہ اس برائی سے پاک نہ ہوجائے: عارضی طور پر نکاح میں اس کا لحاظ ضروری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو فرمایا ہے کہ میں شریف خاندانوں کی عورتوں کو میل کے لوگوں ہی میں نکاح کی اجازت دونگا، اسی طرح کفاءت کے اعتبار کی جو روایات ہیں: ان کا مصداق یہی عارضی صورت ہے۔ یعنی اگرچہ یہ امر جاہلی ہے مگر نکاح کو پروان چڑھانے کے لئے اس کا لحاظ ضروری ہے۔ البتہ اخوت اسلامی کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ یہ تصور اور یہ تفاوت ختم ہوجائے۔ مذکورہ بالا حدیث شریف کا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دوسرے قول کا یہی مطلب ہے۔ واللہ اعلم۔

[۷] قال صلى الله عليه وسلم: "إذا خطب إليكم من ترضَون دينه وخُلُقَه فزوِّجوه، إن لاتفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد عريض"

أقول: ليس في هذا الحديث أن الكفاءة غيرُ معتبرة، كيف؟ وهي مماجُبل عليه طوائفُ الناس. وكاد يكون القدحُ فيها أشدَّ من القتل، والناسُ على مراتبهم، والشرائعُ لا تُهْمِلُ مثلَ ذلك، ولذلك قال عمر رضي الله عنه: لأمنعن فروجَ ذوات الأحساب من النساء إلا من أكفائهن.

ولكنه أراد أن لا يَتَّبِعَ أحدٌ محقَّرات الأمور، نحوُ قلة المال، ورَثَاثَةِ الحال، ودَمَامَةِ الجمال، أو يكون ابنَ أم ولدٍ، ونحوِ ذلك من الأسباب، بعد أن يرضى دينَه وخلقه، فإن أعظم مقاصد تدبير المنزل الاصطحاب في خُلق حسنٍ، وأن يكون ذلك الاصطحاب سببا لصلاح الدين.

ترجمہ: اس حدیث میں یہ بات نہیں ہے کہ کفاءت معتبر نہیں۔ کیسے؟ کفاءت تو ان چیزوں میں سے ہے جس پر

لوگوں کے گروہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور قریب ہے کہ کفاءت میں طعن زیادہ سخت ہو قتل سے۔ اور لوگ اپنے مرتبوں پر ہیں۔ اور شریعتیں اس قسم کے امور رائگاں نہیں کرتیں۔ اور اسی وجہ سے عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:...... مگر آپؐ نے چاہا کہ کوئی شخص پیروی نہ کرے معمولی باتوں کی، جیسے مال کی کمی، اور خستہ حالی اور بدصورتی یا لڑکا باندی کا بیٹا ہو، اور اس کے مانند دیگر اسباب میں سے، اس کے بعد کہ وہ لڑکے کے دین اور اخلاق کو پسند کرتا ہے، پس بیشک تدبیر منزل کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد: اچھے اخلاق میں معیت وصحبت ہے یعنی شوہر بااخلاق ہو۔ اور یہ کہ وہ معیت وصحبت دین کے سنورنے کا سبب ہو یعنی شوہر دیندار ہوتا کہ لڑکی کے دین کو سنوارے۔



نامبارک عورت سے احتراز

مثبت پہلو سے مناسب عورت کی طرف راہ نمائی کے بعد، اب منفی پہلو سے ایسی عورت کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے نکاح نہ کرنا بہتر ہے۔ اسلام نے نحوست کی نفی کی ہے۔ ابن ماجہ (حدیث ۱۹۹۳) میں ہے: لاشُؤْم، وقد یکون الیُمْنُ فی ثلاثۃ: فی المرأۃ، والفرس، والدار: نحوست نہیں۔ اور کبھی خیر وبرکت تین چیزوں میں ہوتی ہے: عورت، گھوڑے اور گھر میں۔ یہ ذاتی نحوست کی نفی اور عرضی خیر کا اثبات ہے۔ یعنی بعض عارضی اسباب کی بنا پر چیزیں مبارک نامبارک ہوتی ہیں۔ پھر جن چیزوں سے مزاولت وقتی یا کم وقت کے لئے ہو، ان میں مبارک نامبارک کا خیال کرنا ضروری نہیں۔ البتہ جن چیزوں سے تعلق عرصۂ دراز کے لئے ہو جیسے بیوی، گھر، گھوڑا اور تلوار وغیرہ ان میں مبارک نامبارک کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر نامبارک چیز پلے پڑ گئی تو زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ درج ذیل حدیث میں اسی کا بیان ہے:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نحوست: عورت، گھر اور گھوڑے میں ہے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۰۸۷)

تشریح: اس حدیث کا صحیح مطلب شانِ ورود کی روشنی میں یہ ہے کہ بعض اسباب کی وجہ سے، جو اکثر مخفی ہوتے ہیں، کسی عورت سے نکاح کرنا یا کسی گھر میں بود وباش اختیار کرنا نامبارک ہوتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم ایک ایسے گھر میں رہتے تھے جس میں ہماری تعداد بہت تھی اور اس میں ہمارے اموال بھی زیادہ تھے۔ پھر ہم ایک دوسرے گھر میں منتقل ہو گئے تو ہماری تعداد اور ہمارے اموال دونوں کم ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذَرُوْهَا ذَمِیْمَةً: اس گھر کو چھوڑ دو، وہ برا گھر ہے! (ابوداؤد حدیث ۳۹۲۴ آخر کتاب الطب) یہی مذکورہ حدیث کا شانِ ورود ہے۔

پس ایسی صورت میں جبکہ تجربہ کسی عورت سے نکاح نامبارک ہونے پر دلالت کرتا ہو تو مستحب یہ ہے کہ اس عورت سے نکاح نہ کیا جائے۔ چاہے وہ خوبصورت یا مالدار ہو، ایسی نامبارک عورت سے احتراز اولی!

[۸] قال صلى الله عليه وسلم: " الشؤم في المرأةو الدار و الفرس "

أقول: التفسير الصحيح الذى يوجبه موردُ الحديث: أن هنالك سببا خفيفا غالبيا يكون به أكثر من يتزوّجُ المرأةَ– مثلاً– مُحَارِفًا غيرَ مبارك. ويستحب للرجل إذا دلت التجربةُ على شؤم امرأة أن يُريح نفسَه بترك تزوجها، وإن كانت جميلة، أو ذات مال.

ترجمہ: صحیح تفسیر جس کو حدیث کا مورد واجب کرتا ہے یہ ہے کہ وہاں یعنی نفس الامر میں کوئی سبب ہے جو عموماً پوشیدہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اکثر وہ لوگ جو کسی عورت سے نکاح کرتے ہیں — بطور مثال یعنی یہی حکم گھر میں رہنے اور گھوڑا رکھنے کا بھی ہے —— خیر سے دور ہونے والے، نامبارک ہوتے ہیں۔ اور آدمی کے لئے مستحب ہے، جب تجربہ کسی عورت کے نامبارک ہونے پر دلالت کرے، کہ اپنی ذات کو آرام پہنچائے اس سے نکاح نہ کرکے، اگرچہ وہ خوبصورت یا مالدار ہو۔

لغت: مُحَارِفًا: حرف (کنارہ) سے بمعنی نامبارک ہے۔ مخطوطہ کراچی کے حاشیہ میں اس کے معنی لکھے ہیں: مُحارف: برکنار کردہ شدہ از خیرات۔

☆　　☆　　☆

کنواری سے نکاح بہتر ہے یا ثیبہ سے؟

حکمت کا فیصلہ یہ ہے کہ کنواری سے نکاح کو ترجیح دی جائے، بشرطیکہ وہ عاقلہ بالغہ ہو یعنی ناسمجھ بچی نہ ہو —— کیونکہ کنواری میں چند خوبیاں ہوتی ہیں: اول: وہ تھوڑے (جماع وغیرہ) پر بہت زیادہ خوش رہتی ہے، کیونکہ اس میں چالاکی کم ہوتی ہے۔ دوم: اس میں بچے جننے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ وہ نوجوان ہوتی ہے۔ سوم: اس کو سلیقہ سکھانا، حکمت کے تقاضوں پر چلانا اور ذمہ داریاں اوڑھانا آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ کوری تختی کے مانند ہوتی ہے، جس میں ہر نقش ابھر سکتا ہے۔ چہارم: وہ شرمگاہ اور نظر کی خوب حفاظت کرتی ہے، کیونکہ اس میں شرم وحیا زیادہ ہوتی ہے۔

اور ثیبہ (شوہر دیدہ) کی صورت حال اس سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ چالاک (عیار) اور درشت خو ہوتی ہے اور قوت تولید بھی اس کی کمزور پڑ جاتی ہے، اور وہ لکھی ہوئی تختی ہے، جس کے سابقہ نقوش مٹانا اور سلیقہ سکھانا آسان نہیں۔ البتہ اگر نظام خانہ داری تجربہ کار عورت کے بغیر سرانجام نہ پاسکتا ہو تو پھر ثیبہ سے نکاح کرنا بہتر ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ثیبہ سے نکاح کیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: ''باکرہ سے کیوں نہ کیا، تم اس سے اٹھ کھیلیاں کرتے اور وہ تم سے اٹھ کھیلیاں کرتی!'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ابا جان اُحد میں شہید ہوگئے۔ گھر میں سات نوخیز بہنیں ہیں۔ اس لئے میں ایک ذمہ دار عورت گھر میں لایا ہوں تاکہ وہ ان کو سنبھالے۔ آنحضرت ﷺ نے

ان کو دعائیں دیں۔

[۹] والحكمة تحكم بإيثار البكر بعد أن تكون عاقلة بالغة، فإنها أرضى باليسير لقلة خبابتها، وأنتق رَحِمًا لقوة شبابها، وأقرب للتأدب بما تأمر به الحكمةُ، ويُلْزَم عليها، واحصنُ للفرج والنظر، بخلاف الثيبات، فإنهن أهل خبابة وصعوبة الأخلاق، وقلة الأولاد، وهن كالألواح المنقوشة، لايكاد يؤثر فيهن التأديب، اللهم! إذا كان تدبير المنزل لاينتظم إلا بذات التجرِبة، كما ذكره جابر بن عبد الله رضي الله عنهما.

ترجمہ: اور حکمت کنواری کی ترجیح کا فیصلہ کرتی ہے، اس کے بعد کہ وہ عاقلہ بالغہ ہو۔ پس بیشک کنواری تھوڑے پر بہت زیادہ خوش ہونے والی ہے، اس میں مکاری کم ہونے کی وجہ سے، اور اس کی بچہ دانی زیادہ جھاڑنے والی ہے اس کی جوانی کے قوی ہونے کی وجہ سے، اور وہ زیادہ نزدیک ہے تہذیب سیکھنے سے اس چیز کے ذریعہ جس کا حکمت حکم دیتی ہے، اور وہ چیز اس پر لازم کی جاتی ہے، اور وہ شرمگاہ اور نظر کی خوب حفاظت کرنے والی ہے —— برخلاف بیواؤں کے، پس بیشک وہ مکاری والی اور درشت اخلاق والی اور کم اولاد والی ہیں، اور وہ لکھی ہوئی تختی کی طرح ہیں، نہیں قریب ہے کہ اثر کرے ان میں ادب سکھلانا۔ اے اللہ! (مگر) جب نظام خانہ داری تجربہ کار عورت کے بغیر سرانجام نہ پا سکتا ہو، جیسا کہ اس کو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے ذکر کیا۔

☆ ☆ ☆

پیام نکاح سے پہلے عورت کو دیکھنے کی حکمت

حدیث —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص کسی عورت کو پیام نکاح بھیجنے کا ارادہ کرے: پس اگر وہ قدرت رکھتا ہو کہ اس خوبی کو دیکھے جو اس کے لئے اس عورت سے نکاح کا باعث ہے تو وہ ایسا کرے'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک لڑکی کو پیام بھیجنے کا ارادہ کیا۔ پس میں اس کو چھپ کر دیکھنے کی کوشش کرتا تھا، تا آنکہ میں نے وہ خوبی دیکھ لی جو میرے لئے اس سے نکاح کا باعث تھی۔ پھر میں نے اس سے نکاح کیا (ابوداؤد حدیث ۲۰۸۲ مشکوۃ حدیث ۳۱۰۶)

حدیث —— حضرت مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجنے کا ارادہ کیا۔ نبی ﷺ نے ان سے دریافت کیا: ''تم نے اس عورت کو دیکھا ہے؟'' جواب دیا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس کو دیکھ لو، اس سے امید ہے کہ تم دونوں میں خوب موافقت ہو'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۰۷) اور حضرت مغیرہؓ ہی سے رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''اس کو

ایک نظر دیکھ لو، کیونکہ انصار کی آنکھوں میں کچھ (عیب) ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۹۸)

تشریح: جس عورت سے شادی کرنے کا ارادہ ہو، اس کو دیکھنے کا استحباب بایں وجہ ہے کہ نکاح غور وفکر کے بعد ہو۔ یعنی چونکہ نکاح ایک اہم معاملہ ہے، اس لئے واقفیت وبصیرت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ دیکھے بغیر نکاح کرے گا تو انجام کار تین صورتیں ہونگی: یا تو بیوی پسند آئے گی یا نہیں؟ اور ناپسند ہوگی تو رکھے گا یا چھوڑے گا؟ بہر صورت پہلے دیکھ لینا، بغیر دیکھے نکاح کرنے سے، بہتر ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

۱ — اگر بیوی پسند نہ آئی تو بھی رکھے گا۔ کسی بھی طرح نباہ کرے گا، تو جو افسوس دامن گیر ہوگا اس کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اور اگر پہلے دیکھ لیا ہے، اور پسند خاطر نہ ہونے کے باوجود کسی مصلحت سے نکاح کیا ہے تو اتنا افسوس نہ ہوگا۔

۲ — اور اگر ناپسند ہونے کی صورت میں چھوڑ دے گا تو یہ بہت ہی برا ہے۔ اس سے بہتر تو پہلے دیکھ لینا ہے تا کہ تلافی آسان ہو۔

۳ — اور اگر اتفاق سے پسند آ گئی تو بھی بہتر یہ ہے کہ پہلے دیکھ لے۔ کیونکہ اب شوق ونشاط سے شادی کرے گا۔ رغبت سے برات چڑھے گی، اور نشاط کی پلکوں سے دلہن کو اٹھا کر لائے گا۔

بہر حال: عقل مند آدمی کسی معاملہ میں اسی وقت اقدام کرتا ہے، جب معاملہ کی اچھائی برائی واضح ہوئے۔ وہ دیکھ بھال کر ہی اقدام کرتا ہے۔

فائدہ: دیکھنا اس وقت سود مند ہے جب لڑکا باشعور ہو۔ دیکھنے سے ناک نقشہ اور رنگ روغن کا پتہ چلتا ہے، اور یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ لڑکی میں کوئی عیب تو نہیں۔ اور اگر ہے تو وہ گوارہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ دیکھنے سے سیرت واخلاق کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ باتیں قابل اعتماد بابصیرت عورتوں کے ذریعہ ہی معلوم ہوسکتی ہیں۔ پس ان کا دیکھنا بھی اپنے دیکھنے کے قائم مقام ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر خود دیکھنا ضروری ہو تو اس کا لحاظ رکھا جائے کہ لڑکی کو یا اس کے گھر والوں کو ناگوار نہ ہو، بلکہ بہتر یہ ہے کہ چھپ کر دیکھے جیسا کہ حدیث میں گذرا۔

[۱۰] قال صلى الله عليه وسلم: "إذا خطب أحدُكم المرأةَ: فإن استطاع أن ينظر إلى ما يدعوه إلى نكاحها فليفعل" وقال: " فإنه أحرى أن يُؤْدَمَ بينكما" وقال: " هل رأيتَها؟ فإن في أعين الأنصار شيئًا"

أقول: السبب في استحباب النظر إلى المخطوبة: أن يكون التزوُّجُ على رَوِيَّةٍ، وأن يكون أبعدَ من الندم الذي يلزَمه إن اقتحم في النكاح ولم يوافقه، فلم يَرُدَّه، وأسهلَ للتلافي إن رَدَّ، وأن يكون تزوُّجها على شوق ونشاط إن وافقه. والرجل الحكيم لايلج مولِجًا حتى يتبين خيره وشره قبل ولوجه.

ترجمہ: منسوبہ کو دیکھنے کے استحباب کی وجہ یہ ہے کہ نکاح غور وفکر سے ہو، اور یہ کہ وہ زیادہ دور ہو اس پشیمانی سے جو

اس کولاحق ہوگی اگر وہ نکاح میں گھسا اور وہ اس کو موافق نہ آیا، پس اس نے نکاح کو رد نہ کیا (یہ پہلی صورت ہے) اور یہ کہ وہ زیادہ آسان ہوگا تلافی کے لئے اگر اس نے رد کیا یعنی بیوی کو چھوڑ دیا (یہ دوسری صورت ہے) اور یہ کہ نکاح شوق ونشاط سے ہو، اگر نکاح اس کو موافق آیا (یہ تیسری صورت ہے) اور دانش مند آدمی کسی داخل ہونے کی جگہ میں داخل نہیں ہوتا تا آنکہ اس کے لئے واضح ہو جائے اس معاملہ کی اچھائی برائی اس کے داخل ہونے سے پہلے۔

لغت وترکیب: آدَمَ بینهما إیدامًا: صلح کرانا، موافقت کرانا...... دوسرے أن یکون کا اسم ضمیر ہے، جو تزوّج اور متزوج دونوں کی طرف لوٹ سکتی ہے...... أسهل کا عطف أبعد پر ہے۔

☆ ☆ ☆

نظر پڑنے سے کوئی عورت بھلی لگے تو اس کا علاج

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورت شیطان کی صورت میں سامنے آتی ہے، اور شیطان کی صورت میں پیٹھ پھیرتی ہے (پس) جب تم میں سے کسی کو کوئی عورت بھلی لگے، اور وہ اس کے دل میں اتر جائے، تو چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کا قصد کرے، اور اس سے صحبت کرے۔ پس بیشک یہ چیز اس خیال کو پھیر دے گی جو اس کے دل میں پیدا ہوا ہے''
(رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۱۰۵)

تشریح: شہوتِ فرج سب سے خطرناک شہوت ہے۔ وہ سب سے زیادہ قلب پر حاوی ہوتی ہے اور بہت سی خرابیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ اور عورتوں کی طرف دیکھنا شہوت کو بھڑکاتا ہے۔ حدیث کے شروع میں جو فرمایا ہے کہ عورت بصورتِ شیطان سامنے آتی ہے، اور بصورتِ شیطان پیٹھ پھیرتی ہے اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ شہوت میں ہیجان پیدا کرتی ہے۔

پس جس شخص نے کسی عورت کو دیکھا۔ اور اس پر اس کا دل آ گیا۔ وہ اس کا مشتاق ہوا اور اس پر فریفتہ ہو گیا تو دانش مندی کی بات یہ ہے کہ اس خیال کو مہمل نہ چھوڑا جائے۔ ورنہ وہ بڑھتا رہے گا، اور رفتہ رفتہ دل کا مالک ہو جائے گا۔ اور اس سے جو چاہے کروائے گا۔ پس اس کا علاج یہ ہے کہ بیوی کے پاس پہنچے، اور اس سے صحبت کرے تاکہ وہ خیال کافور ہو جائے۔ اور یہ علاج دو وجہ سے تجویز کیا گیا ہے:

پہلی وجہ: ہر چیز کے لئے کمک (مدد) ہے جس سے وہ قوی ہوتی ہے، اور تدبیر ہے جس سے اس کا زور گھٹتا ہے۔ اور عورتوں کے عشق میں دیوانگی کو کمک اس سے پہنچتی ہے کہ منی کے برتن بھر جائیں۔ اور اس کے اَبخرے دماغ کی طرف صعود کریں۔ اور اس کا زور توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ ان برتنوں کو خالی کر دیا جائے۔ اور بیوی سے صحبت کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ: جب وہ اپنی بیوی سے صحبت کرے گا تو اس کا دل اس میں مشغول ہوگا۔ اور وہ اس کے لئے تسلی کا سامان فراہم کرے گا اُس خیال سے جو وہ اپنے دل میں پاتا ہے۔ اور وہ اس کے دل کو اُس خیال سے پھیر دے گا جس کی طرف وہ

متوجہ ہونے والا ہے۔اور جب کسی خیال کا علاج کردیا جاتا ہے اس کے جمنے سے پہلے تو وہ ادنی سعی سے زائل ہوجاتا ہے۔

[۱۱] وقال صلى الله عليه وسلم:" إن المرأة تُقْبِل في صورة شيطان، وتُدْبر في صورة شيطان: إذا أحدُكم أعجبته المرأةُ، فوقعت في قلبه، فَلْيعمدْ إلى امرأته فَلْيُواقِعْهَا، فإن ذلك يَرُدُّ مافي نفسه"

اعلم: أن شهوة الفرج أعظمُ الشهوات وأرهقُها للقلب، مُوْقِعَةٌ في مهالكَ كثيرةٍ، والنظر إلى النساء يهيجها، وهو قوله عليه السلام:" المرأة تُقبل في صورة الشيطان" إلخ.

فمن نظر إلى امرأة، ووقعت في قلبه، واشتاق إليها، وتولَّه لها، فالحكمةُ: أن لايهمل ذلك، فإنه يزداد حينا فحينا في قلبه، حتى يملكه، ويتصرف فيه.

ولكل شيئ مدد يتقوى به، وتدبيرٌ ينتقص به: فمدد التولُّه للنساء: امتلاء أوعية المنى به، وصعود بخاره إلى الدماغ. وتدبير انتقاصه: استفراغ تلك الأوعية.

وأيضًا: فإن الجماع يشغَل قلبه، ويُسَلِّيه عما يجده، ويصرف قلبه عما هو متوجه إليه، والشيئُ إذا عولج قبل تمكنه زال بأدنى سعي.

ترجمہ: واضح ہے۔لغات: تَوَلَّهَ: عشق میں دیوانہ ہونا..... سَلَاہ سَلْوًا: بھول جانا، تسلی پانا۔صبر آجانا۔

☆ ☆ ☆

پیام پر پیام دینے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کے پیام نکاح کے مقابلہ میں پیام نہ دے۔تا آنکہ وہ نکاح کرے یا چھوڑ دے یعنی بات ختم کردے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۴۴)

تشریح: ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی کسی عورت کو پیام نکاح دیتا ہے، اور عورت کا اس کی طرف میلان ہوتا ہے تو اس کی خانہ آبادی کی ایک شکل پیدا ہوجاتی ہے۔پس دوسرے کا بیچ میں کودنا اور پہلے کو اس چیز سے مایوس کرنا جس کے وہ درپے ہے، اور اس کو اس چیز سے نامراد کرنا جس کا وہ امیدوار ہے: اس کے ساتھ بدمعاملگی، اس پر ظلم اور اس پر تنگی کرنا ہے۔جس سے اس کو ایذا پہنچے گی اور ناگواری ہوگی۔اور فتنوں کا دروازہ کھلے گا، اس لئے اس کی ممانعت کی گئی۔

مطالبہ طلاق کی ممانعت کی وجہ

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی عورت اپنی (مسلمان) بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے، تاکہ وہ اس کے پیالے کو (اپنے پیالے میں) اُنڈیل لے۔اور چاہئے کہ نکاح کرے۔پس اس کے لئے وہ ہے جو اس کے لئے

مقدر کیا گیا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۴۵)

تشریح: کبھی آدمی نکاح ثانی کرنا چاہتا ہے، مخطوبہ مطالبہ کرتی ہے کہ پہلی بیوی کو طلاق دیدو۔ حدیث میں اس کی ممانعت کی گئی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ پہلی بیوی کا حق مارنا ہے۔ اور اس کی معیشت کو درہم برہم کرنا ہے۔ اور مملکت کے بگاڑ کے بڑے اسباب میں سے یہ ہے کہ آدمی دوسرے کی معیشت خراب کرے۔ اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی معیشت کا انتظام ایسے ذرائع سے کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے آسان کئے ہیں۔ دوسرے کی روزی پر لات مارنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

[۱۱] قال صلى الله عليه وسلم: " لايخطُب الرجل على خِطبة أخيه، حتى ينكِح أو يترك"

أقول: سبب ذلك: أن الرجل إذا خطب امرأة، وركنت إليه: ظهر وجهٌ لصلاح منزله، فيكون تأييسُه عما هو بسبيله، وتخييبه عما يتوقعه: إساءةً معه، وظلما عليه، وتضييقا به.

[۱۲] وقال صلى الله عليه وسلم: " لاتسألِ المرأةُ طلاق أختها، لتستفرغ صحفَتَها: ولتنكِح، فإن لها ماقدر لها"

أقول: السر فيه: أن طلب طلاقها اقتضابٌ عليها، وسعيٌ فى إبطال معيشتها؛ ومن أعظم أسباب فساد المدينة: أن يقتضب واحد على الآخر وجهَ معيشته؛ وإنما المرضيُّ عند الله: أن يطلب كل واحد معيشته بما يَسَّر الله له، من غير أن يَسعى فى إزالة معيشة الآخر.

ترجمہ: واضح ہے۔ اقتضب الشیئَ: کاٹنا۔

باب ——— ۳

شرم کی جگہیں

نظر کی آفات اور ان کا علاج

عورتوں کو دیکھنا مردوں میں عشق وفریفتگی پیدا کرتا ہے۔ اور مردوں کو دیکھنا بھی عورتوں میں یہی کام کرتا ہے۔ اور بارہا یہ دیکھنا ناجائز تعلقات کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے دوسرے کی بیوی کے درپے ہونا، یا نکاح کے بغیر تعلق جوڑنا، یا کفو کا لحاظ کئے بغیر نکاح کرنا۔ اور اس کے جو مفاسد دیکھنے میں آتے ہیں وہ کتابوں میں لکھے ہوئے واقعات سے بے نیاز کرتے ہیں۔ اس لئے حکمت نے چاہا کہ فساد کا یہ دروازہ بند کردیا جائے۔ مگر چونکہ حاجتیں متضاد اور اختلاط ناگزیر ہے، اس لئے

ضروری ہے کہ حاجتوں کا لحاظ کر کے ممانعت کے مختلف درجات قائم کئے جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے پردے کے درج ذیل طریقے مشروع کئے:

عورت کے لئے گھر میں رہنا بہتر ہے

پہلا طریقہ: یہ ہے کہ سخت مجبوری کے بغیر عورت گھر سے نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''عورت ستر ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اس کو گھورتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۰۹) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کی پارٹی اس کو گھورتی ہے یعنی لچے لفنگے لوگ عورت کو تاکتے جھانکتے ہیں۔ یا حدیث کنایہ ہے سامانِ فتنہ فراہم ہونے سے یعنی عورت کا گھر سے نکلنا لوگوں کے لئے باعثِ فتنہ ہے۔ پس اس کو گھر ہی میں رہنا چاہئے۔ سورۃ الاحزاب آیت ۳۳ میں ارشاد پاک ہے: ''اور تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو'' یہ حکم اگرچہ امہات المؤمنین کو دیا گیا ہے، مگر وہ سب خواتین اسلام کے لئے عام ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو چونکہ اللہ تعالیٰ نے حکمتِ شرعیہ سے حظِّ وافر عطا فرمایا تھا، اس لئے ان کی شدید خواہش تھی کہ اس حجاب کا حکم نازل ہو۔ یعنی عورتوں کو گھر سے نکلنے کی مطلق اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نزولِ حجاب کے بعد قضاء حاجت کے لئے نکلیں، تو چونکہ وہ بھرے بدن کی تھیں، اور جاننے والوں پر مخفی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو پہچان لیا۔ اور پکار کر کہا: ''تم ہم پر پوشیدہ نہیں رہ سکتیں یعنی ہم نے تم کو پہچان لیا، پس تم دیکھو کیسے نکلتی ہو؟ یعنی عورت کا اس طرح نکلنا ممکن ہی نہیں کہ اس کو کوئی پہچان نہ سکے، پس اس کا گھر ہی میں رہنا بہتر ہے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا گھر لوٹ آئیں۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے، اور کھانا نوش فرما رہے تھے۔ حضرت سودہؓ نے حاضر ہو کر ماجرا بیان کیا۔ آپؐ پر آثار وحی طاری ہوئے۔ جب وحی مکمل ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: ''تمہیں قضاء حاجت کے لئے نکلنے کی اجازت دی گئی ہے'' (بخاری شریف حدیث ۴۷۹۵) کیونکہ بالکلیہ نکلنے کی ممانعت میں بڑی تنگی ہے۔ اس لئے آپؐ نے گھر میں رہنے کو مستحب قرار دیا، واجب نہیں کیا۔

عورت گھر سے باحجاب نکلے

دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ جب عورت بوقتِ ضرورت گھر سے نکلے تو بڑی چادر اوڑھ کر یا برقعہ پہن کر نکلے۔ سورۃ الاحزاب آیت ۵۹ میں ارشاد پاک ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ! قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ، وَبَنٰتِكَ، وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ: يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ ترجمہ: اے پیغمبر! آپؐ اپنی بیویوں، اپنی بیٹیوں، اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیں کہ وہ سر سے نیچے کر لیا کریں اپنے (چہرے) پر تھوڑی سی اپنی چادریں۔ یعنی بدن چھپانے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ چہرہ پر بھی لٹکا لیں۔ یہی حجاب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب عورتیں اپنے گھروں سے کسی ضرورت کے لئے نکلتی

تھیں تو چادروں سے اپنے چہروں کو چھپالیتی تھیں۔ اور صرف ایک آنکھ دیکھنے کے لئے کھلی رہتی تھی (درمنثور ۵: ۲۲۱)

البتہ بہت بوڑھی عورتوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ بے حجاب نکل سکتی ہیں۔ سورۃ النور آیت ۶۰ میں ارشاد پاک ہے:
﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الّٰتِیْ لَایَرْجُوْنَ نِکَاحًا﴾ الآیۃ۔ ترجمہ: اور بہت بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی کچھ امید نہ رہی ہو یعنی وہ نکاح کے قابل نہ رہی ہو: ان پر اس بات میں کچھ گناہ نہیں کہ وہ اپنے (زائد) کپڑے اتار رکھیں، بشرطیکہ زینت کا دکھاوا کرنے والی نہ ہوں یعنی ان کے لئے اجانب بھی مثل محارم کے ہوجاتے ہیں۔ جن اعضاء کا محارم سے چھپانا ضروری نہیں، بہت بوڑھی عورتوں کے لئے غیر محرموں سے بھی ان کا چھپانا ضروری نہیں۔ اور اگر وہ اس سے بچیں یعنی حجاب کے ساتھ نکلیں تو وہ ان کے لئے زیادہ بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والے، جاننے والے ہیں۔

محارم وغیرہ کا حکم

سورۃ النور آیات ۳۰ و ۳۱ میں ستر وحجاب کے احکام کے ساتھ دو استثناء بھی ذکر کئے گئے ہیں: ایک: ناظر یعنی دیکھنے والے کے اعتبار سے۔ دوسرا: منظور یعنی جس کو دیکھا جائے اس کے اعتبار سے۔ ناظر کے اعتبار سے آٹھ قسم کے محرم مردوں کا، اور چار دوسری اقسام کا استثناء کیا گیا ہے۔ اور منظور کے اعتبار سے ان چیزوں کا استثناء کیا گیا ہے جو عادۃً کھل ہی جاتی ہیں۔ وہ آیات یہ ہیں:

''آپ مسلمان مردوں سے کہیں کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ان کاموں سے باخبر ہیں جو وہ کیا کرتے ہیں۔ اور آپ مسلمان عورتوں سے کہیں کہ وہ اپنی نگاہ نیچی رکھیں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (حدیث میں ہے کہ نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے پس نگاہ کی حفاظت ہی سے شرمگاہ کی حفاظت ہوتی ہے) اور اپنی زیبائش ظاہر نہ کریں، مگر وہ جو کھلی ہی رہتی ہے (یہ منظور کے اعتبار سے استثنا ہے۔ اور زیبائش سے مراد: ہر قسم کی خِلقی اور کسبی زینت ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مَاظَهَرَ مِنْهَا سے مراد چہرہ اور ہتھیلیاں ہیں۔ کیونکہ جب عورت کسی ضرورت سے باہر نکلے گی تو نقل وحرکت اور لین دین کے وقت چہرے اور ہتھیلیوں کو چھپانا مشکل ہے) اور وہ اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رہیں یعنی محارم کے سامنے بھی سینہ کا دُوہرا پردہ کریں۔ اور اپنی زیبائش ظاہر نہ کریں (یہ دوسرے استثنا کی تمہید ہے) مگر اپنے شوہروں، یا اپنے باپوں، یا اپنے خسروں، یا اپنے بیٹوں، یا اپنے سوتیلے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں، یا مسلمان عورتوں، یا ان کے سامنے جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ، یا ان مردوں کے سامنے جو طفیلی ہیں، جو جنسی خواہش رکھنے والے نہیں، یا ایسے بچوں کے سامنے جو ابھی عورتوں کی پردہ کی باتوں سے واقف نہیں ہوئے''

آٹھ قسم کے مرد جن کا استثنا کیا گیا ہے: (۱) شوہر (اس کے لئے لفظ محرم عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، فقہی اصطلاح

مراد نہیں)(۲) باپ(دادا، پردادا)(۳) خسر(خسر کے باپ دادا)(۴) اپنے لڑکے(۵) شوہر کے دوسری بیوی سے لڑکے(۶) حقیقی، علاتی اور اخیافی بھائی(۷) تینوں قسم کے بھائیوں کے لڑکے(۸) تینوں قسم کی بہنوں کے لڑکے۔

دوسری قسم کے چار لوگ: (۱) مسلمان عورتیں۔ ان کے سامنے وہ اعضاء کھولنا جائز ہے جو محارم کے سامنے کھولنا جائز ہے(۲) جو عورتوں کے مملوک ہیں۔ الفاظ کے عموم میں غلام باندی دونوں داخل ہیں۔ مگر اکثر فقہاء کے نزدیک اس سے صرف لونڈیاں مراد ہیں۔ غلام اس میں داخل نہیں۔ ان سے غیر محارم کی طرح پردہ واجب ہے۔ اور اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ اس کا ذکر ﴿أَوْ نِسَائِهِنَّ﴾ کے بعد آیا ہے۔ یعنی کافر عورتیں اجانب کے حکم میں ہیں، مگر لونڈیاں اگرچہ وہ کافر ہوں محارم کے حکم میں ہیں۔ اور بعض فقہاء مثلاً امام شافعی رحمہ اللہ عام مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مملوکہ غلام بھی محارم کی طرح ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہ کی بھی یہی رائے ہے(۳) وہ مغفل اور بدحواس قسم کے لوگ جو عورتوں کی طرف کوئی رغبت نہیں رکھتے۔ طفیلی کی قید احترازی نہیں۔ اور جو عورتوں کے حالات سے دلچسپی رکھتا ہو، اس سے پردہ واجب ہے، چاہے وہ بوڑھا یا ہیجڑا ہو۔ جیسا کہ ہیت نامی ہیجڑے کا تذکرہ آیا ہے(۴) وہ نابالغ بچے جو عورتوں کے مخصوص حالات اور ان کے اوصاف حسن وجمال سے بے خبر ہیں۔

باقی آیت کریمہ: ''اور عورتیں اپنے پاؤں زور سے زمین پر نہ ماریں کہ ان کا مخفی زیور معلوم ہو جائے (پس بجنے والا زیور پہننا جائز نہیں۔ اور جب زیور کی آواز کا پردہ ضروری ہے تو خود عورت کی آواز کا پردہ بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔ کیونکہ وہ زیور کی آواز سے زیادہ دل کش ہے، پس بالغ عورتوں کی تعلیم بھی عورتوں ہی کے ذریعہ ہونی چاہئے) اور اے مؤمنو! تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''

حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے اس آیت کی تفسیر میں تین باتیں بیان کی ہیں:

پہلی بات: اللہ تعالیٰ نے چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں کھولنے کی اجازت دی ہے۔ کیونکہ چہرہ سے پہچان ہوتی ہے، اور ہاتھوں سے عموماً چیزیں لی دی جاتی ہیں۔ یعنی یہ دونوں اعضاء حجاب میں داخل نہیں (جیسا کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے ہے)

دوسری بات: چہرے اور ہتھیلیوں کے علاوہ سارا بدن چھپانا واجب ہے، مگر شوہر، محارم اور مملوکہ غلام اس سے مستثنیٰ ہیں (یہ رائے بھی حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کی ہے)

تیسری بات: بہت بوڑھی عورتوں کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے کپڑے اتار رکھیں۔

فائدہ: یہ تیسری بات پہلی بات کے معارض ہے۔ جب جوان عورت کے لئے بھی چہرہ اور ہتھیلیوں کا حجاب نہیں تو بوڑھیوں کے لئے تو بدرجۂ اولیٰ نہیں۔ پھر باقی کونسے کپڑے نہ پہننے کی اجازت دی ہے؟! بات درحقیقت یہ ہے کہ سورۃ النور کی اس آیت میں حجاب اور ستر کے احکام ایک ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اور سورۃ الاحزاب میں صرف حجاب کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اور اس میں چہرے کے حجاب کی صراحت ہے۔ البتہ سورۃ النور کی آیت ۶۰ میں اس سے بہت بوڑھی عورتوں

کا استثناء کیا گیا ہے۔

اور چہرہ اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں، اور محارم وغیرہ کے لئے حجاب میں بھی داخل نہیں۔ بلکہ فقہاء نے دونوں پیروں کو بھی ان کے ساتھ لاحق کیا ہے۔ یہ تین اعضاء کھلے ہوئے ہونے کی حالت میں نماز درست ہے، اور محارم وغیرہ سے ان کا حجاب بھی نہیں ہے۔ اور اجانب کے حق میں بوقتِ ضرورت ان کا کھولنا جائز ہے، بے ضرورت کھولنا جائز نہیں، اور ان کے علاوہ بدن کا کھولنا مجبوری میں جائز ہے۔

فائدہ: آیت میں مذکورہ لوگوں کے حق میں چہرہ اور ہتھیلیوں کا حجاب نہیں۔ باقی بدن کا حکم بیان نہیں کیا۔ اس کا تذکرہ احادیث اور کتب فقہ میں ہے۔ مثلاً: شوہر کے حق میں بدن کے کسی حصہ کا ستر واجب نہیں۔ اور باپ وغیرہ محارم کے حق میں سر، سینہ اور اس کے مقابل پیٹھ اور پنڈلی کا ستر واجب نہیں۔ پیٹ، اس کے مقابل پیٹھ اور گھٹنے سے نیچے تک ستر واجب ہے۔ اسی طرح دیگر احکام ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں۔

اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی جائز نہیں

تیسرا طریقہ: یہ مقرر کیا کہ کوئی مرد کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں جمع نہ ہو، جہاں کوئی ایسا شخص نہ ہو جس سے دونوں ڈریں۔ درج ذیل تین احادیث اسی سلسلہ کی ہیں:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سنو! ہرگز کوئی مرد کسی خاوند دیدہ عورت کے پاس رات نہ گذارے، الا یہ کہ وہ شوہر یا محرم ہو'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۱۰۱)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہرگز کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے، ورنہ ان کا تیسرا شیطان ہوگا'' وہ ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیگا (رواہ الترمذی۔ مشکوۃ حدیث ۳۱۱۸)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسی عورتوں کے پاس جن کے شوہر عرصہ سے سفر میں ہوں ہرگز داخل نہ ہوؤ، پس بیشک شیطان چلتا ہے انسان میں خون کی نالیوں میں'' یعنی جس طرح رگ میں دیا ہوا انجکشن فوری اثر کرتا ہے، شیطان بھی چٹکی بجا کر فتنہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے یہ طاقت نہیں دی کہ وہ انسان کے بدن میں گھسے۔ اور آسیب چڑھتا ہے، بدن میں داخل نہیں ہوتا (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۹)

دوسرے کا ستر دیکھنے کی ممانعت

چوتھا طریقہ: یہ تجویز کیا کہ کوئی شخص کسی کا ستر نہ دیکھے۔ نہ مرد مرد کا، نہ عورت عورت کا، اور نہ مرد عورت کا اور نہ عورت مرد کا۔ مگر میاں بیوی مستثنیٰ ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''نہ آدمی دوسرے آدمی کے ستر کو دیکھے، اور نہ عورت دوسری

عورت کے ستر کو دیکھے'' پس غیر جنس کا ستر دیکھنا بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہے (مشکوۃ حدیث ۳۱۰۰)

تشریح: ستر دیکھنے کی ممانعت دو وجہ سے کی ہے:

پہلی وجہ — ستر دیکھنا شہوت کو بھڑکاتا ہے۔ غیر جنس کا ستر دیکھنے میں تو یہ بات اظہر ہے۔ اور ہم جنس میں بھی کبھی اس کی نوبت آتی ہے۔ عورتیں بھی کبھی ایک دوسرے پر فریفتہ ہوتی ہیں۔ اور مرد بھی کبھی ایک دوسرے پر عاشق ہوتے ہیں۔ اور ستر دیکھنے کی کچھ حاجت نہیں، اس لئے اس کی ممانعت کی (اور مجبوری کی حالت مستثنیٰ ہے)

دوسری وجہ — ستر چھپانا تہذیب کی بنیادی باتوں میں سے ہے۔ دنیا جہاں کے تمام لوگ اعضاء مستورہ کو شرمگاہ کہتے ہیں۔ یعنی ان کا کھولنا یا دیکھنا بے حیائی کی بات ہے، اس لئے اس کی ممانعت کی۔

چمٹ کر سونے کی ممانعت کی وجہ

پانچواں طریقہ: یہ مقرر کیا کہ دو شخص ایک کپڑے میں چمٹ کر نہ سوئیں۔ اسی حکم میں ایک چارپائی پر رات گذارنا بھی ہے، کیونکہ نیند میں ایک دوسرے سے چمٹ سکتے ہیں۔ درج ذیل دو حدیثیں اسی سلسلہ کی ہیں:

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک آدمی دوسرے آدمی تک ایک کپڑے میں نہ پہنچے یعنی بدن لگا کر نہ سوئے۔ اور ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ پہنچے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۰۰)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک عورت دوسری عورت سے کھلا جسم نہ لگائے، پس وہ اپنے شوہر سے اس عورت کا حال اس طرح بیان کرے گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۰۹۹)

تشریح: مباشرت کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جسم سے جسم لگانا شہوت بھڑکانے میں نہایت زود اثر ہے۔ جو طبق زنی اور اغلام کی خواہش پیدا کرتی ہے۔ اور ''گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ عورت کا عورت سے جسم لگانا کبھی مکنون محبت کا سبب بن جاتا ہے۔ پس بے ساختہ اس لطف اندوزی کا تذکرہ شوہر یا کسی رشتہ دار کے سامنے زبان پر آجاتا ہے۔ اور وہ ان کی فریفتگی کا سبب بن جاتا ہے۔ اور سب سے بڑی خرابی کی بات یہ ہے کہ کسی عورت کا حال شوہر کے علاوہ کے سامنے بیان کیا جائے۔ جیسے ہیت نامی ہیجڑا ازواج مطہرات کے پاس آیا کرتا تھا۔ ایک دن حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ نبی ﷺ بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے ام سلمہؓ کے بھائی عبداللہ بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ سے کہا: عبداللہ! اگر کل اللہ نے طائف فتح کر دیا تو میں تجھ کو غیلان کی لڑکی دکھاؤنگا، جو چار سلوٹوں سے آتی ہے اور آٹھ سلوٹوں سے جاتی ہے۔ یعنی جب آتی ہے تو اس کے پیٹ پر چار شکن، اور جاتی ہے تو اس کی پیٹھ پر آٹھ شکن نظر آتے ہیں۔ یعنی خوب بھرے بدن کی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اس کی یہ بات سنی تو فرمایا: ''یہ ہرگز تمہارے پاس نہ آیا کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۲۱) کیونکہ اس کی اس بات سے اندازہ ہوا کہ اس کی عورتوں کے اوصاف و محاسن کی طرف رغبت ہے۔ پس وہ ﴿غَيْرُ أُولِي الْإِرْبَةِ﴾ میں داخل

نہیں۔ نیز غیر شوہر سے غیلان کی لڑکی کا حال بیان کرنے میں اس غیر کی فریفتگی کا اندیشہ ہے۔

﴿ ذكر العورات ﴾

اعلم: أنه لما كان الرجالُ يُهَيِّجُهم النظرُ إلى النساء على عشقهن، والتولُّهِ بهن؛ ويفعلُ بالنساء مثلَ ذلك، وكان كثيرًا مَّايكون ذلك سببًا لأن يُبتغى قضاءُ الشهوة منهن على غير السنة الراشدة، كاتباع من هى فى عصمة غيره، أو بلانكاح، أو من غير اعتبار كفاءةٍ، والذى شوهد من هذا الباب يُغنى عما سُطر فى الدفاتر: اقتضت الحكمةُ أن يُسَدَّ هذا الباب. ولما كانت الحاجات متنازعةً مُحْوِجَةً إلى المخالطة: وجب أن يُجعل ذلك على مراتب بحسب الحاجات، فشرع النبى صلى الله عليه وسلم وجوهًا من الستر:

أحدها: أن لا تخرج المرأةُ من بيتها إلا لحاجة لاتجد منها بُدًّا. قال صلى الله عليه وسلم: "المرأةُ عورةٌ، فإذا خرجتِ استَشْرَفَهَا الشيطانُ" وقال الله تعالى: ﴿وَقَرْنَ فِىْ بُيُوْتِكُنَّ﴾

أقول: معناه: استشرف حِزْبُه، أو هو كناية عن تَهَيُّئِ أسباب الفتنة.

وكان عمر رضى الله عنه — لِمَا أوتى من علم أسرار الدين — حريصًا على أن يُنْزِلَ هذا الحجابُ، حتى نادى: ياسودةُ! إنكِ لاتَخْفَيْنَ علينا" لكنه صلى الله عليه وسلم رأى أن سدَّ هذا الباب بالكلية حرجٌ عظيم، فندب إلى ذلك من غير إيجاب، وقال: "أُذِنَ لكنَّ أن تخرجن إلى حوائجكن"

الثانى: أن تُلقِىَ عليها جِلْبَابَها، ولا تُظهر مواضعَ الزينة منها، إلا لزوجها، أو لذى رَحِمٍ مَحْرَمٍ. قال تعالى: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ: يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ، وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ، ذٰلِكَ أَزْكٰى لَهُمْ، إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِّمَا يَصْنَعُوْنَ. وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ: يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ، وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ، وَلَايُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا، وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ، وَلَايُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ، أَوْ آبَائِهِنَّ، أَوْ آبَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ، أَوْ اَبْنَائِهِنَّ، أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ﴾ إلى قوله: ﴿تُفْلِحُوْنَ﴾

فرخَّص فيما يقع به المعرفة من الوجه، وفيما يقع به البطش فى غالب الأمر، وهو اليدان. وأوجب سترَ ماسوى ذلك إلا من بعولتهن، والمحارم، وماملكت أيمانهن من العبيد. ورخَّص للقواعد من النساء أن يضعن ثيابهن.

الثالث: أن لايَخْلُوَ رجل مع امرأة، ليس معهما من يَهابانه. قال صلى الله عليه وسلم: "ألا!

لايَبِيْتَنَّ رجل عند امرأة ثيب إلا أن يكون ناكحا أو ذارحمٍ" وقال صلى الله عليه وسلم: لايخلون رجل بامرأة، إلا كان ثالثهما الشيطانُ" وقال صلى الله عليه وسلم:" لاتَلِجُوْا على المُغيبات، فإن الشيطان يجرى من ابن آدم مجرى الدم"

الرابع: أن لاينظر أحدٌ ـــ امرأة كانت أورجلاً ـــ إلى عورة الآخر ـــ امرأة كانت أو رجلاً ـــ إلا الزوجان.

قال صلى الله عليه وسلم:" لاينظر الرجل إلى عورة الرجل، ولا المرأة إلى عورة المرأة"

أقول: وذلك: لأن النظر إلى العورة يهيج الشهوة، والنساء ربما يتعاشقن فيما بينهن، وكذلك الرجال فيما بينهم، ولا حرجَ في ترك النظر إلى السوء ة. وأيضًا: فستر العورة من أصول الارتفاقات، لابد منها.

الخامس: أن لايُكامِعَ أحدٌ أحدًا في ثوب واحد. وفي معناه: أن يَبِيْتَا على سرير واحدٍ، مثلاً.

قال صلى الله عليه وسلم:" لايُفضى الرجل إلى الرجل في ثوب واحد، ولاتفضى المرأة إلى المرأة في ثوب واحد" وقال صلى الله عليه وسلم:" لاتُباشر المرأةُ المرأةَ، فتَنْعَتُها لزوجها، كأنه ينظر إليها"

أقول: السبب: أنه أشد شيئ في تهيُّج الشهوة، والرغبةُ تورث شهوةَ السِّحاق واللواطةِ. وقوله:" كأنه ينظر إليها". معناه: أن مباشرة المرأةِ المرأةَ ربما كانت سببا لإضمار حبها، فيجرى على لسانها ذكرُ ما وجدت من اللذة: عند زوجها، أو ذى رحم منها، فيكون سببا لتولُّههم، وأعظم المفاسد: أن تُنْعَتَ امرأةٌ عند رجل ليس زوجًا لها، وهو سبب إخراج هِيْتِ المخنَّثِ من البيوت.

ترجمہ: جسم کے ان حصوں کا بیان جن کا کھولنا موجب شرم ہے: جان لیں کہ جب عورتوں کو دیکھنا مردوں کو برانگیختہ کیا کرتا ہے ان کے عشق پر، اوران پر فریفتگی پر، اور دیکھنا عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا کرتا ہے۔ اور بارہا یہ چیز سبب بن جایا کرتی ہے اس بات کی کہ عورتوں سے حاجت روائی چاہی جائے، سنت راشدہ (دینی طریقہ) کے برخلاف۔ جیسے اس عورت کے پیچھے پڑنا جو کہ وہ اس کے علاوہ کی پناہ میں ہے، یا نکاح کے بغیر، یا کفاءت کا اعتبار کئے بغیر، اور جو مشاہدہ کیا گیا ہے اس قبیل کی باتوں سے وہ بے نیاز کرتا ہے ان باتوں سے جو بڑی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں: پس چاہا حکمت نے کہ یہ دروازہ بند کردیا جائے۔ اور جب حاجتیں متضاد، اختلاط پر مجبور کرنے والی تھیں تو ضروری ہوا کہ یہ سدّ باب حاجتوں کے لحاظ سے مختلف مراتب پر گروانا جائے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے پردے کے مختلف طریقے مشروع فرمائے ـــ ان میں سے ایک: یہ

ہے کہ عورت اپنے گھر سے نہ نکلے مگر کسی ایسی ضرورت کے لئے جس سے کوئی چارہ نہ ہو — اس کا مطلب: شیطان کی پارٹی گھورتی ہے، یا وہ فتنہ کے اسباب کے مہیا ہونے سے کنایہ ہے — اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ — بایں وجہ کہ وہ دین کے رموز کا علم دیئے گئے تھے — شدید خواہش مند تھے کہ یہ پردہ نازل ہو۔ یہاں تک کہ آپ نے پکارا: ''اے سودہ! تم ہم سے چھپ نہیں سکتیں''، مگر نبی ﷺ نے دیکھا کہ اس دروازہ کو بالکلیہ بند کرنا بڑی تنگی ہے۔ پس آپ نے اس پردہ کی طرف بلایا یعنی مستحب قرار دیا۔ واجب کئے بغیر، اور فرمایا: ''تمہیں اجازت دی گئی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لئے نکلو''

دوسرا طریقہ: یہ ہے کہ اپنے اوپر اپنی چادر ڈال لے، اور اپنی زیبائش کی جگہیں ظاہر نہ کرے مگر اپنے شوہر یا ذی رحم محرم کے سامنے — پس (۱) اجازت دی اللہ تعالیٰ نے اس عضو میں جس کے ذریعہ پہچان ہوتی ہے یعنی چہرہ، اور اس عضو میں جس کے ذریعہ عام طور پر پکڑا جاتا ہے، اور وہ دو ہاتھ ہیں (۲) اور واجب کیا ان کے علاوہ کا پردہ مگر ان کے شوہروں اور محارم سے اور ان غلاموں سے جن کے مالک ہیں ان کے دائیں ہاتھ (۳) اور اجازت دی بہت بوڑھی عورتوں کو کہ وہ اپنے کپڑے اتار رکھیں — تیسرا طریقہ: یہ ہے کہ تنہا نہ رہے کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ، نہ ہو ان کے ساتھ وہ شخص جس سے دونوں ڈریں — چوتھا طریقہ: یہ ہے کہ نہ دیکھے کوئی — خواہ عورت ہو یا مرد — دوسرے کے ستر کو — خواہ عورت ہو یا مرد — مگر میاں بیوی — اور وہ ممانعت اس لئے ہے کہ ستر دیکھنا شہوت کو بھڑکاتا ہے۔ اور عورتیں (بھی) کبھی ایک دوسرے پر فریفتہ ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح مرد بھی آپس میں۔ اور کچھ تنگی نہیں ننگاپے کی طرف نہ دیکھنے میں۔ اور نیز: پس ننگاپے کو چھپانا ارتفاقات (تہذیب) کی اُن بنیادی باتوں میں سے ہے جن سے چارہ نہیں۔

پانچواں طریقہ: یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو ایک کپڑے میں نہ چمٹائے۔ اور اس کے معنی میں ہے کہ دونوں — مثال کے طور پر — ایک چارپائی پر رات گذاریں۔ میں کہتا ہوں: (ایک کپڑے میں چمٹ کر سونے کی ممانعت کا) سبب یہ ہے کہ وہ یعنی جسم سے جسم لگانا سخت ترین چیز ہے۔ یعنی نہایت خطرناک ہے شہوت بھڑکانے میں۔ اور خواہش: چپٹی لڑانے اور اغلام کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اور آپ کا ارشاد: ''گویا وہ شوہر اس عورت کو دیکھ رہا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت کا عورت سے جسم لگانا کبھی سبب بن جاتا ہے اس کی محبت کو دل میں چھپانے کا۔ پس اس کی زبان پر جاری ہوتا ہے اس لذت کا تذکرہ جو اس نے پایا: اپنے شوہر یا اپنے رشتہ دار کے سامنے۔ پس وہ تذکرہ سبب بن جاتا ہے اس کی فریفتگی کا۔ اور خرابیوں میں سب سے بڑی خرابی: یہ ہے کہ کسی عورت کا حال بیان کیا جائے ایسے شخص کے سامنے جو اس کا شوہر نہیں اور وہ ہیت نامی ہیجڑے کو گھروں سے نکالنے کی وجہ ہے (کَامَعَ مکامعة: حفاظت وغیرہ کے لئے کسی کو خود سے چمٹا لینا)۔

تصحیح: وجوها من الستر مطبوعہ میں وجوها من السنن تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔ اور مولانا سندھی رحمہ اللہ نے بھی کی ہے۔

  ☆

سترعورت فرض ہونے کی وجہ

عورت: یعنی ننگاپا: وہ اعضاء ہیں جن کا کھلنا متوسط (معتدل) عرف وعادت میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ جیسے دور نبوی میں قریش کی عادتیں دیگر قبائل کی بہ نسبت معتدل تھیں۔ اور سترعورت انسانوں کے مسلمہ ارتفاقات (تہذیب) کی بنیادی بات ہے۔ اوران چیزوں میں سے ہے جس کے ذریعہ انسان کا دیگر حیوانات سے امتیاز ہوتا ہے۔ اس لئے شریعت نے سترعورت فرض کیا ہے۔

سترکا بیان: دوشرمگاہیں (بول وبراز کی جگہیں) دوفوطے، زیرناف اور دونوں رانوں کی جڑیں جو زیرناف سے متصل ہیں: بدیہی طور پر ستر ہیں۔ پس ان پر دلیل قائم کرنے کی حاجت نہیں۔ اور متعدد احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ ران بھی ستر ہے۔ وہ روایات درج ذیل ہیں:

حدیث (۱) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام کا اپنی باندی سے نکاح کردے تو وہ ہرگز باندی کے سترکو نہ دیکھے'' اور ایک روایت میں ہے: ''پس وہ ہرگز نہ دیکھے اس حصہ کو جو ناف سے نیچے اور گھٹنے سے اوپر ہے'' (رواہما ابوداؤد، واسنادہ حسن، مشکوۃ حدیث ۳۱۱۱) اس حدیث میں باندی کے ستر کا بیان ہے۔ اور ایک قول میں مرد اور باندی کا ستر ایک ہے (ہدایہ)

حدیث (۲) ـــــ جُرہد رضی اللہ عنہ سے جو اصحاب صفہ میں سے تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ران ستر ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۲) علاوہ ازیں: آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے علی! اپنی ران نہ کھولو، اور نہ کسی زندہ کی ران دیکھو، نہ کسی مردہ کی'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۳) اور حضرت معمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''معمر! اپنی رانیں ڈھانگ لو، کیونکہ دونوں رانیں ستر ہیں'' یہ روایات گو ضعیف ہیں، مگر سب مل کر حسن لغیرہ ہیں۔

اوراس کے خلاف حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جنگ خیبر کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی ران سے لنگی ہٹائی، یہاں تک کہ حضرت انس نے آپؐ کی ران کی سفیدی دیکھی (بخاری حدیث ۳۷۱) یہ روایت قوی ہے، جو ران کے ستر نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اختلاف روایات کی صورت میں احتیاط کی بات یہ ہے کہ ران کو ستر قرار دیا جائے۔ یہی بات شریعت کے ضوابط سے اقرب ہے۔ یعنی جب مُحرِم و مُبیح دلائل میں تعارض ہوتا ہے تو مُحرِم روایات کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہی بات امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمائی ہے (کتاب الصلوۃ، باب (۱۲) باب ما یُذکر فی الفخذ)

فائدہ (۱): گھٹنہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ستر میں شامل نہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ستر ہے۔ کیونکہ اس میں بھی روایات متعارض ہیں۔ مذکورہ بالا روایت کہ ''ہرگز نہ دیکھے اس حصہ کو جو ناف سے نیچے اور گھٹنہ سے

اوپر ہے" اس پر دلالت کرتی ہے کہ گھٹنہ ستر نہیں۔ اور سنن دار قطنی (۱:۲۳۱) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ضعیف روایت ہے کہ "گھٹنہ ستر میں شامل ہے" اور بخاری شریف (حدیث ۳۶۹۵) میں یہ واقعہ مروی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ پانی کی جگہ میں تشریف فرما تھے، اور دونوں یا ایک گھٹنہ کھلا ہوا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے آپؐ نے ان کو ڈھانک لیا۔ اس لئے احتیاط کی بات یہ ہے کہ گھٹنہ کو بھی ستر میں شامل کیا جائے۔

فائدہ (۲): عورت کا ستر بھی وہی ہے جو مرد کا ہے۔ چنانچہ ایک عورت دوسری عورت کے باقی بدن کو دیکھ سکتی ہے۔ البتہ عورت کے لئے سترِ عورت کے علاوہ حجاب کا مسئلہ بھی ہے، جو مرد کے لئے نہیں۔ اس لئے مرد کا باقی بدن ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔ اجنبی عورت بھی دیکھ سکتی ہے، بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ کیونکہ مرد کا جسم اول تو پرکشش نہیں۔ ثانیاً: مرد کے مشاغل بھی باقی بدن کھولنے پر مجبور کرتے ہیں۔ پس اگر اس کو دیکھنے کی ممانعت کی جائے گی تو حرج واقع ہوگا ——— اور عورت کے لئے چونکہ سترِ عورت کے ساتھ حجاب کا مسئلہ بھی ہے، اس لئے اس کے احکام مرد سے مختلف ہیں۔ جو یہ ہیں:

۱ — عورت کا اپنے میاں سے کوئی حجاب نہیں، بلکہ سترِ عورت کا حکم بھی نہیں۔

۲ — محارم سے پیٹ اور اس کے مقابل پیٹھ کا حجاب واجب ہے۔ اور چہرہ، سر، بال، گردن، کان، بازو، ہاتھ، پاؤں، پنڈلی، اور گردن سے متصل سینہ کا بالائی حصہ اور اس کے مقابل کی پیٹھ حجاب سے خارج ہے، جبکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو۔ اور سینہ کا بالائی حصہ اس لئے مستثنیٰ کیا گیا ہے کہ بچہ کو دودھ پلانے کے لئے یہ حصہ محارم کے سامنے کھولنا پڑتا ہے۔ اور جب یہ حصہ مستثنیٰ کیا گیا تو اس کے مقابل پیٹھ کا حصہ بھی مستثنیٰ کیا گیا۔

۳ — نماز میں چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور دونوں پیر (ٹخنوں سے نیچے) حجاب سے خارج ہیں۔ باقی سارا بدن ڈھانک کر نماز پڑھنا ضروری ہے۔

۴ — اور اجانب سے خوفِ فتنہ کے وقت تمام جسم کا حجاب واجب ہے۔ اور بوقت ضرورت چہرہ اور ہتھیلیاں کھولنا جائز ہے۔ اور بے ضرورت کھولنے میں اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ اعضاء حجاب میں شامل نہیں۔ اور احناف کے نزدیک شامل ہیں۔ احناف ﴿إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا﴾ کو ضرورت پر اور ﴿يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ﴾ کو ضرورت نہ ہونے پر محمول کرتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

واعلم: أن ستر العورة — أعني الأعضاء التي يحصل العار بانكشافها بين الناس في العادات المتوسطة، كالتي كانت في قريش مثلاً يومئذ — من أصل الارتفاقات المسلمة عند كل من يسمى بشرًا، وهو مما امتاز به الإنسان من سائر أنواع الحيوانات، فلذلك أوجبه الشرع.

والسَّوْءتان والخصيتان والعانة وماوليها من أصول الفخذين من أجلى بديهيات الدين أنها من العورة، لاحاجة إلى الاستدلال في ذلك.

وَدَلَّ قولُه صلى الله عليه وسلم: "إذا زوَّج أحدُكم عبدَه أمتَه فلاينظرنَّ إلى عورتها" وفى رواية: "فلاينظرنَّ إلى مادون السُّرة وفوق الركبة" وقولُه عليه السلام: "أما علمتَ أن الفخذَ عورةٌ": على أن الفخذين عورةٌ، وقد تعارضت الأدلة فى المسألة، لكن الأخذ بهذا أحوط، وأقربُ من قوانين الشرع.

ترجمہ: اور جان لیں کہ سترِ عورت ـــــ عورت سے مراد لیتا ہوں میں اُن اعضاء کو جن کے لوگوں کے درمیان کھلنے سے شرم حاصل ہوتی ہے۔ یعنی شرمندگی ہوتی ہے متوسط عادتوں میں۔ جیسے وہ عادتیں جو مثال کے طور پر اس زمانہ میں قریش میں تھیں ـــــ منفقد ارتفاقات کی بنیاد سے ہے، تمام ان لوگوں کے نزدیک جو "انسان" کہلاتے ہیں۔ اور وہ (سترِ عورت) ان چیزوں میں سے ہے جس کے ذریعہ انسان ممتاز ہوتا ہے حیوانات کی دیگر اقسام سے۔ پس اسی وجہ سے شریعت نے اس کو واجب کیا ہے۔

اور دو شرمگاہیں اور دو فوطے اور زیرِ ناف اور وہ جو عانہ سے متصل ہے دونوں رانوں کی جڑوں سے: دین کی واضح بدیہیات میں سے یہ ہے کہ وہ ننگا یا ہیں۔ کچھ حاجت نہیں اس پر دلیل قائم کرنے کی۔

اور دلالت کرتی ہیں (دو روایتیں) اس بات پر کہ دونوں رانیں ستر ہیں۔ اور اس مسئلہ میں دلائل متعارض ہیں، لیکن ان روایات کو لینا زیادہ احتیاط کی بات ہے، اور شریعت کے ضوابط سے قریب تر ہے۔

☆　☆　☆

برہنہ ہونے کی ممانعت کی وجہ

حدیث (۱) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "برہنہ ہونے سے بچو، کیونکہ تمہارے ساتھ وہ لوگ (فرشتے) ہیں جو تم سے جدا نہیں ہوتے، مگر استنجے کے وقت اور جب آدمی اپنی بیوی سے ہم بستر ہوتا ہے، پس ان سے شرماؤ، اور ان کا لحاظ کرو" (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۵)

حدیث (۲) ـــــ ایک صحابی سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنا ستر چھپائے رہو، مگر اپنی بیوی یا باندی سے" انھوں نے عرض کیا: اگر آدمی تنہا ہو؟ آپؐ نے فرمایا: "پس اللہ تعالیٰ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ ان سے حیا کی جائے" (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۷)

تشریح: برہنہ ہونا جائز نہیں، اگرچہ تنہائی میں ہو، البتہ ایسی ضرورت کے وقت جائز ہے جس سے چارہ نہ ہو، جیسے قضاء حاجت کے وقت ستر کھولنا۔ اور یہ ممانعت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ ـــــ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص اچانک آجاتا ہے۔ پس اگر آدمی ننگا ہوگا تو اس کے ستر پر دوسرے کی نظر

پڑے گی، اور عار لاحق ہوگا۔

دوسری وجہ ـــــ رحمۃ اللہ (۱:۴۳۶) میں بیان کیا جاچکا ہے کہ اعمال واخلاق میں دوطرفہ تعلق ہے یعنی جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اور اخلاق خود اعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی جو شخص حیادار ہے، اس کے نفس پر احتیاط واستحکام کا غلبہ ہوتا ہے، وہ بے شرم اور بے لگام نہیں ہوتا، وہ ضرور پردہ کا اہتمام کرے گا۔ اور پردہ کے اہتمام ہی سے یہ صفاتِ حمیدہ: حیا وغیرہ آدمی میں پیدا ہوتی ہیں۔

مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دینے کی وجہ

سوال: حجاب کا حکم عورتوں کو دیا گیا ہے، پس ان کو یہ حکم دینا کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں: معقول بات ہے۔ مگر سورۃ النور آیت ۳۰ میں یہی حکم مردوں کو بھی دیا گیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم دو وجہ سے دیا ہے:

پہلی وجہ ـــــ جو معاملہ دو شخصوں سے متعلق ہوتا ہے: وہاں جب شریعت ایک شخص کو کسی بات کا حکم دیتی ہے، تو وہ چاہتا ہے کہ دوسرے کو بھی حکم دیا جائے کہ وہ پہلے شخص کے ساتھ اس کو دیئے گئے حکم کے موافق معاملہ کرے۔ مثلاً: عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنا نکاح خود نہ کریں، بلکہ ان کے اولیاء ان کا نکاح کریں۔ تو اولیاء کو بھی حکم دیا کہ وہ عورتوں کی مرضی معلوم کرکے ان کا نکاح کریں، من مانی نہ کریں۔ اسی طرح جب عورتوں کو حکم دیا کہ وہ حجاب میں رہیں اور نظریں نیچی رکھیں، تو مردوں کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی نظریں نیچی رکھیں، عورتوں کو نہ دیکھیں۔

وضاحت: عورتوں کا ظاہری لباس بھی کبھی دل کش ہوتا ہے، اور کبھی عورت کو چہرہ وغیرہ کھولنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جیسے احرام میں اور دواخانے میں۔ ایسی صورت میں مردوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں۔ تاکہ حجاب کا مقصد بروئے کار آئے۔

دوسری وجہ ـــــ مردوں کو نظریں نیچی رکھنے کا حکم ان کے نفوس کو سنوارنے کے لئے دیا گیا ہے۔ ان کی اصلاح اسی وقت ہوسکتی ہے جب وہ اپنی نگاہوں کی حفاظت کریں، اور خود کو اس کا پابند بنائیں۔ اگر وہ عورتوں کو تاکتے جھانکتے رہیں گے تو ان کے دل خراب ہوجائیں گے۔

اچانک پڑی ہوئی نظر فوراً پھیر لینا ضروری ہے

حدیث ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے علی! نظر کے پیچھے نظر نہ ڈالو۔ کیونکہ تمہارے لئے پہلی نظر (جو اچانک پڑی ہے) جائز ہے، اور دوسری نظر تمہارے لئے جائز نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۰)

تشریح: اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ پہلی نظر کو زیادہ دیر ٹھہرائے رکھنا بھی بمنزلۂ دوسری نظر کے ہے۔ پس اچانک نظر پڑ جائے تو فوراً اس کو پھیر لینا ضروری ہے۔ اور یہ اشارہ اس طرح فرمایا ہے کہ آپؐ نے الآخرۃ فرمایا ہے الثانیۃ نہیں فرمایا۔ دوسری نظر وہ ہے جو پہلی کے انقطاع کے بعد وجود میں آئے۔ اور پچھلی نظر عام ہے۔ پہلی کی پچھلی حالت بھی پچھلی ہے۔

نابینا سے پردہ کرنے کی وجہ

حدیث ــــــ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما نبی ﷺ کے پاس تھیں۔ اچانک حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے۔ آپؐ نے دونوں سے پردہ کرنے کے لئے فرمایا۔ ام سلمہؓ نے عرض کیا: کیا وہ نابینا نہیں ہیں، جو ہمیں نہیں دیکھتے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’تو کیا تم دونوں بھی نابینا ہو؟ کیا تم دونوں ان کو نہیں دیکھتیں؟‘‘ (مشکوۃ حدیث ۳۱۱۶)

تشریح: نابینا سے پردہ کرنے کا حکم دینے کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں بھی مردوں میں رغبت رکھتی ہیں، جیسے مرد عورتوں میں رغبت رکھتے ہیں۔ پس یہاں بھی فساد کا اندیشہ ہے، اس لئے پردہ واجب ہے۔

اپنے غلام سے پردہ نہ ہونے کی وجہ

حدیث ــــــ نبی ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک غلام لے کر تشریف لے گئے، جو آپؐ نے ان کو ہبہ کیا تھا۔ حضرت فاطمہؓ نے اس وقت ایسا کپڑا اوڑھ رکھا تھا کہ اگر سر ڈھانکتی تھیں تو پیر کھل جاتے تھے۔ اور پیر ڈھانکتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی پریشانی دیکھی تو فرمایا: ’’پریشان نہ ہوو، آنے والے تمہارے ابا اور تمہارا غلام ہی ہیں‘‘ (مشکوۃ حدیث ۳۱۲۰)

تشریح: اس روایت سے معلوم ہوا کہ مملوکہ غلام سے پردہ نہیں۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مملوکہ غلام بمنزلۂ محارم اس لئے ہے کہ اس کی اپنی مالکہ کی طرف رغبت نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی نگاہ میں مالکہ کی عظمت ہوتی ہے۔ اور مالکہ کی بھی اس میں رغبت نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی نگاہ میں غلام حقیر ہوتا ہے۔ نیز ان کا ہر وقت کا ساتھ ہے، پس پردہ کرنے میں دشواری ہے۔

محارم کا پردہ ہلکا ہونے کی وجہ

اور محارم کے حجاب میں جو تخفیف کی گئی ہے اس کی چند وجوہ ہیں: اول: نزدیک کی رشتہ داری بے رغبتی کی احتمالی جگہ ہے۔ ماں بہن میں کس کو رغبت ہوتی ہے؟ دوم: محارم سے نکاح چونکہ ہمیشہ کے لئے حرام ہے، اس لئے مایوسی اس عورت

میں لالچ کو ختم کردے گی۔ سوم: عرصۂ دراز کا ساتھ بھی قلتِ نشاط کا سبب ہے۔ چہارم: ہر وقت کا ساتھ ہونے کی وجہ سے پردہ میں دشواری ہے۔ پنجم: ہر وقت کے ساتھی کی طرف التفات کم ہوتا ہے — ان تمام وجوہ سے محارم کا پردہ اجانب سے ہلکا رکھا گیا ہے۔ واللہ اعلم

[۱] وقال صلى الله عليه وسلم: " إياكم والتعريَّ! فإن معكم من لايفارقكم إلا عند الغائط، وحين يُفضي الرجل إلى أهله، فاستحيوهم وأكرموهم" وقال: " فالله أحق أن يُستحيىٰ منه"

أقول: التعرى لايجوز وإن كان خالياً، إلا عند ضرورة لايجد منها بدًا، فإنه كثيرًا مَّا يهجم الإنسانُ عليه. والأعمالُ إنما تعتبر بالأخلاق التى تنشأ منها. ومنشأُ السِّتر الحياءُ، وأن يَغلب على النفس هيئةُ التحفُّظ والتقيُّد، وأن يَترك الوقاحةَ، وأن لايسترسل.

[۲] وإذا أمر الشارع أحدًا بشيئ اقتضى ذلك أن يؤمر الآخَرُ أن يفعل معه حسب ذلك، فلما أُمرت النساء بالتستر وجب أن يُرَغَّبَ الرجال فى غض البصر. وأيضًا: فتهذيب نفوس الرجال لايتحقق إلا بغضِّ الأبصار، ومؤاخذة أنفسهم بذلك.

[۳] قال صلى الله عليه وسلم: "فإن لك الأولى، وليست لك الآخرة" أقول: يشير أن حالة البقاء بمنزلة الإنشاء.

[٤] وحين دخل أعرابى، وقيل: أليس هو أعمى لايُبصرنا؟ قال صلى الله عليه وسلم: "أفعمياوانِ أنتما؟ ألستُما تُبصرانه؟"

أقول: السر فى ذلك: أن النساء يرغبن فى الرجال كما يرغب الرجال فيهن.

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم لفاطمة رضى الله عنها: " إنه ليس عليكِ بأس، إنما هو أبوكِ وغلامُكِ"

أقول: إنما كان العبد بمنزلة المحارم، لأنه لارغبة له فى سيِّدته، لجلالتها فى عينه، ولا لسيِّدته فيه، لحقارته عندها، ويعسُر التستر بينهما.

[٦] وهذه الصفاتُ كلها معتبرةٌ فى المحارم: فإن القرابةَ القريبةَ مظنةُ قلةِ الرغبة، واليأس أحد أسباب قطع الطمع، وطولُ الصحبة يكون سببَ قلة النشاط، وعسرِ التستر، وعدمِ الالتفات؛ فلذلك جرت السنة أن الستر عن المحارم دون الستر عن غيرهم، والله أعلم.

ترجمہ: (۱) برہنہ ہونا جائز نہیں، اگرچہ آدمی تنہا ہو۔ مگر ایسی ضرورت کے وقت کہ اس سے کوئی چارہ نہ پائے۔ پس بیشک بارہا اس کے پاس کوئی انسان اچانک آجاتا ہے — اور اعمال انہی اخلاق کے ساتھ موازنہ کئے ہوئے ہیں جن سے

وہ اعمال پیدا ہوتے ہیں یعنی جیسے اخلاق وملکات ہوں گے ویسے اعمال وجود پذیر ہوں گے۔ اور سترِ عورت کے پیدا ہونے کی جگہ صفتِ حیا ہے، اور یہ بات ہے کہ نفس پر احتیاط اور پابندی کی کیفیت غالب ہو، اور یہ بات کہ چھوڑ دے وہ بے شرمی کو، اور یہ بات کہ آدمی بے لگام نہ ہو جائے۔

(۲) اور جب شارع کسی کو کسی چیز کا حکم دیتا ہے تو وہ حکم چاہتا ہے کہ دوسرا (بھی) حکم دیا جائے کہ وہ اس کے ساتھ اس حکم کے موافق معاملہ کرے۔ پس جب عورتوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ضروری ہوا کہ مردوں کو ترغیب دی جائے نظریں نیچی رکھنے کی۔ اور نیز: پس مردوں کے نفوس کا سنورنا متحقق نہیں ہوتا مگر نظریں نیچی رکھنے سے، اور اپنے نفوس کو پکڑنے سے اس چیز کے ساتھ۔

(۶) اور یہ تمام اوصاف محارم میں ملحوظ ہیں۔ پس بیشک نزدیک کی رشتہ داری بے رغبتی کی احتمالی جگہ ہے۔ اور مایوسی لالچ ختم کرنے کے اسباب میں سے ایک ہے۔ اور عرصۂ دراز تک ساتھ رہنا قلتِ نشاط کا، اور پردے کی دشواری کا، اور عدم التفات کا سبب ہوتا ہے۔ پس اسی وجہ سے طریقہ جاری ہے کہ محارم سے پردہ کم تر ہو ان کے علاوہ کے پردے سے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: تَحَفَّظَ عن الشیئ ومنه: بچنا، احتیاط برتنا ...... تَقَیَّدَ: پابند ہونا، پاؤں میں بیڑی لگنا ...... استرسل فی کلامه وعمله: جاری رکھنا ...... دون الستر: أی أقله وأخفه.

باب ـــــ ۴

نکاح کا طریقہ

نکاح میں ولی اور عورت کی اجازت کی وجہ

حدیث ــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نکاح (زیبا) نہیں مگر ولی کے ذریعہ'' یعنی نکاح ولی ہی کے ذریعہ ہونا چاہئے۔ عورتوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنا نکاح خود کریں (مشکوۃ حدیث ۳۱۳۰)

حدیث ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس سے حکم لیا جائے۔ اور کنواری کا نکاح نہ کیا جائے یہاں تک کہ اس سے اجازت لی جائے، اور اس کی اجازت خاموشی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۲۶) اور ایک روایت میں ہے: ''کنواری لڑکی سے اس کا باپ اجازت لے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۲۷)

تشریح: عورت کے نکاح میں ولی کی اجازت چار وجوہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: یہ بات جائز نہیں کہ نکاح کا پورا اختیار عورتوں کو دیدیا جائے۔ ایک: تو اس وجہ سے کہ عورتوں کی عقل

ناقص اوران کی سوچ نکمی ہوتی ہے۔اس لئے وہ بسا اوقات نہیں سمجھ پاتیں کہ ان کے لئے کیا بات مفید ہے۔دوم:اس وجہ سے کہ عورتیں عام طور پر خاندانی خصوصیات کا لحاظ نہیں کرتیں۔کبھی وہ غیر کفو کی طرف مائل ہوجاتی ہیں،جوان کے خاندان کے لئے ننگ کی بات ہوتی ہے۔پس ضروری ہے کہ ان کے نکاح کے معاملہ میں اولیاء کا کچھ دخل ہو،تاکہ یہ خرابیاں لازم نہ آئیں۔

دوسری وجہ: فطری اور بدیہی طریقہ جو لوگوں میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہوں۔بست وکشاد ان کے ہاتھ میں ہو،وہی عورتوں کے مصارف کے ذمہ دار ہوں،اور عورتیں ان کی پابند ہوں۔سورۃ النساء آیت ۳۴ میں ارشاد پاک ہے:''مرد عورتوں پر حاکم ہیں،اس وجہ سے کہ اللہ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں'' پس ان کے نکاح کا اختیار بھی مردوں کو ہوگا۔

تیسری وجہ:عورتوں کے نکاح میں اولیاء کی اجازت کی شرط لگانے سے ان کی شان دوبالا ہوتی ہے۔اور عورتوں کا خود نکاح کرنا بے شرمی کی بات ہے۔جس کا سبب قلتِ حیا ہے۔اور اس میں اولیاء کی حق تلفی اور ان کی بے قدری ہے۔

چوتھی وجہ: نکاح کی تشہیر ضروری ہے تاکہ بدکاری سے وہ ممتاز ہوجائے۔اور شہرت دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اولیاء نکاح میں موجود ہوں۔

البتہ یہ جائز نہیں کہ عورتوں کے نکاح کا پورا اختیار مردوں کو دیدیا جائے۔کیونکہ اولیاء وہ بات نہیں جانتے جو عورت اپنی ذات کے بارے میں جانتی ہے۔اور نکاح کا گرم سرد بھی اسی کو چکھنا پڑے گا،اس لئے اس کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔

پھر شوہر دیدہ عورت سے صراحۃً اجازت لینی ضروری ہے۔حکم لینے کا یہی مطلب ہے۔اور کنواری لڑکی سے بھی اجازت لینی ضروری ہے۔بشرطیکہ وہ عاقلہ بالغہ ہو۔اور اس سے اجازت لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انکار نہ کرے۔اور اس کی اجازت کا ادنی درجہ:اس کی خاموشی ہے۔اور اگر لڑکی نابالغہ ہو تو اس سے اجازت لینی ضروری نہیں۔کیونکہ اس کی کوئی رائے نہیں ہوتی۔اس کا نکاح ولی اپنی صوابدید سے کرسکتا ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی صوابدید سے کیا تھا،جبکہ ان کی عمر کل چھ سال کی تھی۔

﴿ صفة النكاح ﴾

[١] قال صلى الله عليه وسلم: "لانكاح إلا بولي"

اعلم: أنه لايجوز أن يُحَكَّمَ في النكاح النساءُ خاصةً، لنقصان عقلهن وسوء فكرهن، فكثيراً مّا لايهتدين المصلحةَ، ولعدم حماية الحسب منهن غالباً، فربما رغبن في غير الكفء، وفي ذلك عارٌ على قومها، فوجب أن يُجعل للأولياء شيئ من هذا الباب لِتُسَدَّ المفسدةُ.

وأيضا: فإن السنة الفاشية في الناس من قِبَلِ ضرورةٍ جبلّيةٍ: أن يكون الرجال قوامين على النساء، ويكون بيدهم الحل والعقد، وعليهم النفقات، وإنما النساء عوانٍ بأيديهم، وهو قوله تعالى: ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ﴾ الآية.

وفي اشتراط الولي في النكاح تنويهُ أمرهم، واستبداد النساء بالنكاح وقاحةٌ منهن، منشؤها قلةُ الحياء، واقتضابٌ على الأولياء، وعدمُ اكتراثٍ لهم.

وأيضًا: يجب أن يميَّز النكاح من السِّفاح بالتشهير، وأحقُّ التشهير أن يحضُرَه أولياؤها.

وقال صلى الله عليه وسلم: "لاتُنكح الثيب حتى تُستأمر، ولا البكر حتى تُستأذن، وإذنها الصموت" وفي رواية: "البكر يستأذنها أبوها"

أقول: لايجوزُ أيضا أن يُحكَّم الأولياء فقط، لأنهم لايعرفون ما تعْرِفُ المرأةُ من نفسها، ولأن حارَّ العقد وقارَّه راجعان إليها.

والاستئمار: طلبُ أن تكون هي الآمرة صريحاً. والاستئذان: طلبُ أن تأذن، ولا تمنع، وأدناه السكوت.

وإنما المراد استيذان البكر البالغة، دون الصغيرة كيف؟ ولارأى لها. وقد زوَّج أبو بكر الصديق رضي الله عنه عائشةَ رضي الله عنها من رسول الله صلى الله عليه وسلم، وهي بنتُ ست سنين.

ترجمہ: (۱) یہ بات جان لیں کہ جائز نہیں کہ نکاح میں صرف عورتوں کو فیصلہ سونپ دیا جائے: (۱) ان کی عقل کے ناقص ہونے کی وجہ سے، اوران کی سوچ کے نکما ہونے کی وجہ سے۔ پس وہ بارہا مصلحت کی طرف راہ نہیں پاتیں (۲) اور عام طور پر ان کی طرف سے خاندانی خوبیوں کی حمایت نہ ہونے کی وجہ سے، پس کبھی وہ غیر کفو میں رغبت کرتی ہیں۔ اوراس میں اس کی قوم پر عار ہے۔ پس ضروری ہے کہ اولیاء کے لئے اس سلسلہ سے کچھ گردانا جائے، تاکہ خرابی کا سدباب ہو۔

اور نیز: پس لوگوں میں عام رائج طریقہ فطری بداہت کی جانب سے یہ ہے کہ مرد عورتوں کے ذمہ دار ہوں۔ اوران کے ہاتھ میں کھولنا اور باندھنا ہو، اوران کے ذمے مصارف ہوں، اورعورتیں ان کے ہاتھ میں قیدی ہوں۔ الی آخرہ ——

(تیسری وجہ) اور نکاح میں ولی کی شرط لگانے میں مردوں کی شان بڑھانا ہے۔ اورعورتوں کا نکاح میں ڈکٹیٹر ہونا ان کے لئے بےشرمی کی بات ہے۔ اوراس کا منشا (پیدا ہونے کی جگہ) شرم کی کمی ہے۔ اوراولیاء کے حق کو کاٹنا ہے۔ اوران کی کچھ پرواہ نہ کرنا ہے —— اور نیز: ضروری ہے کہ نکاح کو زنا سے جدا کیا جائے شہرت دینے کے ذریعہ۔ اورشہرت دینے کی بہترین صورت یہ ہے کہ عورتوں کے اولیاء نکاح میں موجود ہوں۔

میں کہتا ہوں: یہ بھی جائز نہیں کہ صرف اولیاء حاکم بنائے جائیں۔ اس لئے کہ وہ نہیں جانتے اس بات کو جسے عورت

اپنی ذات کے بارے میں جانتی ہے۔اور اس لئے کہ عقد کا گرم اور سرد عورت کی طرف لوٹنے والا ہے —— اور استئمار: اس بات کی طلب ہے کہ ہو وہی حکم دینے والی صراحۃً —— اور استیذان: اس بات کی طلب ہے کہ وہ اجازت دے، اور وہ انکار نہ کرے۔اور اجازت کا ادنی درجہ خاموشی ہے —— اور مراد بالغہ کنواری سے ہی اجازت لینا ہے، نہ کہ نابالغہ سے، کیسے؟ اور کوئی رائے نہیں اس کی۔اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح کیا نبی ﷺ کے ساتھ درانحالیکہ وہ چھ سال کی تھیں۔

لغات: حَکَّمَه: حاکم بنانا، مختار بنانا...... عَوَان: مفرد العانیة: قیدی (مادہ عنی)...... اقتضب الشیئَ: کاٹنا، یہاں حق کا ٹنا مراد ہے...... لعدم حمایة کا عطف لنقصان پر ہے۔

☆ ☆ ☆

غلام باندی کا نکاح مولیٰ کی اجازت پر موقوف ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کرے وہ زانی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۳۵)

تشریح: چونکہ غلام اپنے آقا کی چاکری میں مشغول ہوتا ہے۔اور نکاح اور اس کے متعلقات یعنی بیوی کی غم گساری اور اس کے ساتھ تنہائی مولی کی خدمت میں خلل انداز ہوتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کا نکاح مالک کی اجازت پر موقوف ہو۔اور باندی کا بھی یہی حکم بدرجۂ اولی ہے۔اس کا نکاح بھی اس کے آقا کی اجازت پر موقوف رہتا ہے۔سورۃ النساء آیت ۲۵ میں اس کی صراحت ہے۔ارشاد پاک ہے: ''پس باندیوں سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے''

> [۲] قال صلی اللہ علیه وسلم: "أیما عبد تزوج بغیر إذن سیده فهو عاهر"
>
> أقول: لما کان العبد مشغولاً بخدمة مولاه، والنکاح وما یتفرع علیه من المواساة معها، والتخلی بها، ربما ینقُص من خدمته: وجب أن تکون السنةُ أن یتوقف نکاحُ العبد علی إذن مولاه.
>
> وأما حال الأمة: فأولی أن یتوقف نکاحُها علی إذن مولاها، وهو قوله تعالی: ﴿فَانْكِحُوْهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ﴾

ترجمہ: واضح ہے۔اور غلام زانی اس وقت ہوگا جب آقا کی اجازت سے پہلے بیوی سے صحبت کرے۔

☆ ☆ ☆



اہم مواقع کا خطبہ اور اس کی حکمت

کسی بھی اہم موقع پر مثلاً کوئی بڑا معاملۂ بیع ہو، کسی نزاعی معاملہ میں مصالحت کی گفتگو ہو، تقریر ہو یا عقد نکاح: مسنون یہ ہے کہ پہلے خطبہ پڑھا جائے، پھر معاملہ کی گفتگو کی جائے۔ وہ خطبہ یہ ہے:

إن الحمدلله! نحمده ونستعينه، ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا، ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلا مضلَّ له، ومن يضلله فلا هادي له، وأشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدًا عبده ورسوله.

ترجمہ: بیشک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ ہم ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور ہم ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور ہم ان سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ اور ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں اپنے نفس کی شرارتوں سے، اور اپنے اعمال کی برائیوں (کھوٹ) سے۔ جس کو اللہ راہِ راست پر لے آئیں اس کو کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ اور جس کو اللہ بچلا دیں اس کو کوئی راہِ راست پر نہیں لاسکتا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد (ﷺ) اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

اس خطبہ کے بعد ایسی تین (یا کم وبیش) آیتیں پڑھے جو اُس معاملہ سے متعلق ہوں یا جس موضوع پر تقریر کرنی ہے اُس سے متعلق آیات واحادیث پڑھے۔ پھر معاملہ کی گفتگو یا بیان شروع کرے۔ مثلاً: نکاح میں ایجاب وقبول کرے یا کرائے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے نکاح کے موقعہ کے لئے درج ذیل تین آیات منتخب فرمائی ہیں:

پہلی آیت: سورۃ آل عمران آیت ۱۰۲ ہے: ﴿**يٰـأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ، وَلَاتَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ**﴾ ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ (کے احکام کی خلاف ورزی) سے ڈرو، جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے یعنی کامل درجہ کا تقوی اختیار کرو، اور ہرگز نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اطاعت شعار ہو یعنی تمہارا جینا اور مرنا مسلمان ہونے کی حالت میں ہو۔

تفسیر: اس آیت کے ذریعہ اصولی طور پر یہ بات سمجھانا مقصود ہے کہ ایک مسلمان کو ہر حال میں احکام شرعیہ کا مطیع ہونا چاہئے۔ کسی بھی معاملہ میں اللہ کے کسی حکم کی خلاف روزی نہیں کرنی چاہئے۔ اور یہ حالت اس کی پوری زندگی کو محیط ہونی چاہئے۔ پس یہ آیت ہر معاملہ کے شروع میں پڑھی جاسکتی ہے۔

دوسری آیت: سورۃ النساء کی پہلی آیت ہے: ﴿**يٰـأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ، وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا، وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاءً، وَاتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْأَرْحَامَ، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا**﴾ ترجمہ: اے لوگو! اس اللہ (کے احکام کی خلاف ورزی) سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جی سے پیدا کیا۔ اور

اسی جی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ اور تم اُس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دیکر تم باہم سوال کرتے ہو، اور قرابتوں (کی حق تلفی) سے ڈرو، بیشک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہیں یعنی تمہارے سب اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

تفسیر: نکاح کے موقعہ پر، جبکہ ایک نیا رشتہ وجود میں آتا ہے، اس آیتِ پاک کے ذریعہ یہ بات ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ سب انسان خواہ مرد ہوں یا عورتیں ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اور وہی سب کے خالق ہیں۔ پس ان کے احکام کی اطاعت واجب ہے۔ اور وجوب کا ایک قرینہ یہ ہے کہ تم آپس میں ان کی قسمیں دیتے ہو، اور اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہو۔ اسی اللہ پاک کا ایک خاص حکم یہ ہے کہ اہلِ قرابت کے حقوق ادا کرتے رہو، اور قطع رحمی اور بدسلوکی سے بچو۔ اور نکاح کے بعد جو مصاہرت کا رشتہ وجود میں آئے: مرد و عورت دونوں اس رشتہ کے حقوق کا خیال رکھیں۔

تیسری آیت: سورۃ الاحزاب آیات ۷۰ و ۷۱ ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ، وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا. يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ، وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور سیدھی بات کہو۔ وہ تمہارے اعمال درست کر دیں گے۔ اور تمہارے قصور معاف کر دیں گے۔ اور جو بندہ اللہ اور اس کے رسول کے حکموں پر چلا، اس نے یقیناً بڑی کامیابی حاصل کر لی۔

تفسیر: نکاح کے بعد خانگی زندگی میں: کبھی زوجین کے درمیان، اور کبھی دو خاندانوں کے درمیان مناقشات پیش آتے ہیں۔ ان کے سلسلہ میں اس آیت پاک کے ذریعہ یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اگر تم نے احکامِ الٰہی کی اطاعت کی، اور سیدھی بات کہی، تو ان شاء اللہ سب معاملات درست ہو جائیں گے۔ اور صرف دنیا ہی نہیں، آخرت بھی سنور جائے گی۔ کیونکہ نادرست بات ہی سے جھگڑا پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے۔ اور اس کا علاج سیدھی سچی بات کہنا ہے۔ پس مرد و زن دونوں کو اپنی گھریلو زندگی میں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے۔

تشریح: زمانۂ جاہلیت کے لوگ نکاح سے پہلے خطبہ دیا کرتے تھے یعنی تقریر کیا کرتے تھے۔ جس میں ایسی باتیں بیان کرتے تھے جو ان کے نزدیک مناسب ہوتی تھیں یعنی اپنی قوم کے کارنامے وغیرہ ذکر کیا کرتے تھے۔ اور وہ خطبہ ان کے نزدیک مقصود (نکاح) کے ذکر کا وسیلہ (ذریعہ) ہوتا تھا۔ وہ اس تمہید کے ذریعہ نکاح کی اہمیت ظاہر کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ رواج بہتر تھا۔ کیونکہ خطبہ کا مقصد نکاح کی تشہیر اور اس کو عام لوگوں کے روبرو کرنا تھا۔ اور تشہیر ایسی بات ہے جو نکاح میں مطلوب ہے، تاکہ وہ بدکاری سے ممتاز ہو جائے۔

نیز خطبہ اہم مواقع ہی پر دیا جاتا ہے۔ اور نکاح کا اہتمام کرنا اور اس کو اہم معاملہ بنانا اعظم مقاصد میں سے ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اصل خطبہ کو باقی رکھا، مگر اس کے مندرجات کی اصلاح کی۔

اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپؐ نے خطبہ کے مذکورہ مصالح کے ساتھ ایک دینی مصلحت کا اضافہ فرمایا۔ اور وہ دینی

مصلحت: یہ ہے کہ ہر دنیوی کام کے ساتھ کوئی مناسب ذکر ملانا مناسب ہے۔ اور ہر جگہ شعائر اللہ کی شان بلند کرنا ضروری ہے۔ تاکہ دینِ حق کے پرچم لہرائیں۔ اور شعائر و علامات خوب ظاہر ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے خطبہ میں مختلف قسم کے اذکار مسنون کئے۔ جیسے اللہ کی تعریف، اللہ سے مدد طلب کرنا۔ اللہ سے قصوروں کی معافی مانگنا، اللہ کی پناہ طلب کرنا، اللہ پر بھروسہ کرنا، توحید و رسالت محمدی (ﷺ) کی گواہی دینا، اور قرآن کریم کی چند آیات کی تلاوت کرنا۔ اس دینی مصلحت کی طرف درج ذیل دو روایتوں میں اشارہ ہے:

حدیث (۱) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر وہ خطبہ (تقریر) جس میں تشہد (توحید و رسالت کی گواہی) نہ ہو، وہ خطبہ کٹے ہوئے ہاتھ کی طرح ہے یعنی ناقص ہے (مشکوۃ حدیث ۳۱۵۰)

حدیث (۲) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر وہ گفتگو (تقریر) جس کی ابتدا اللہ کی حمد سے نہ کی جائے وہ دست بریدہ ہے (اذکار نووی ص ۱۰۳، مشکوۃ حدیث ۳۱۵۱)

[۳] قال ابن مسعود رضي الله عنه: علّمنا رسولُ الله صلى الله عليه وسلم التشهد في الحاجة:" إنَّ الْحمدَ لله، نحمده، ونستعينه ونستغفره، ونعوذ بالله من شرور أنفسنا، من يهده الله فلا مضلَّ له، ومن يضلل فلاهادي له، وأشهد ان لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدًا عبده ورسوله" ويقرأ ثلاث آيات ﴿يـٰأيُّها الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰه حقَّ تُقٰتِهِ، وَلاتَمُوْتُنَّ إلاَّ وَأَنْتُم مُسْلِمُوْن﴾ ﴿واتَّقُوْا اللّٰهَ الَّذِي تساءَلُوْنَ بِهِ، وَالْأَرْحام، إنَّ اللّٰهَ كَانَ عليكُمْ رقيْبًا﴾ ﴿يـٰأيُّها الَّذِيْن آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰه، وقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِيْدًا. يُصْلِحْ لَكُمْ أعْمالَكُمْ، وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ، ومَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ فَقَدْ فازَ فَوْزًا عظِيْمًا﴾.

أقول: كان أهل الجاهلية يخطبون قبلَ العقد بما يرونه: من ذكر مفاخرِ قومهم ونحوِ ذلك، يتوسلون بذلك إلى ذكرِ المقصود، والتنويه به، وكان جرَيان الرسم بذلك مصلحةً، فإن الخطبة مبناها على التشهير، وجعلِ الشيئ بمسمع ومرأى من الجمهور، والتشهير مما يُراد وجودُه في النكاح، ليتميز من السِّفاح.

وأيضًا: فالخطبة لاتستعمل إلا في الأمور المهمة، والاهتمامُ بالنكاح وجعلُه أمرًا عظيمًا بينهم من أعظم المقاصد، فأبقى النبي صلى الله عليه وسلم أصلَها، وغيّرَ وصفها.

وذلك: أنه ضمّ مع هذه المصالح مصلحةً مِلّيةً، وهي: أنه ينبغي أن يُضم مع كل ارتفاق ذكرٌ مناسب له، ويُنَوَّه في كل محل بشعائر الله، ليكون الدينُ الحق منشورًا أعلامُه وراياتُه، ظاهرًا شعارُه وأماراتُه، فَسَنَّ فيها أنواعا من الذكر، كالحمد، والاستعانة، والاستغفار، والتعوذ، والتوكل، والتشهد، وآياتٍ من القرآن. وأشار إلى هذه المصلحة بقوله:" كل خُطبة ليس فيها

تشھدٌ فھي کالید الجذماء" وقوله: "کل کلام لایُبدأ فیه بالحمد لله فهو أجذم"

چند وضاحتیں: یہ روایت مشکوۃ میں حدیث ۳۱۴۹ ہے۔اور ترمذی وغیرہ کی روایت ہے۔ابن ماجہ میں دو جگہ اضافہ ہے۔تقریر میں اضافہ کے ساتھ خطبہ لکھا گیا ہے —— دوسری آیت: حضرت سفیان رحمہ اللہ نے پوری نہیں پڑھی۔اس کا آخری حصہ پڑھا ہے۔اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ آیت کا یہی جزء اس موقعہ پر مقصود ہے۔پس یہی حصہ پڑھا جائے تو بھی درست ہے۔اور پوری آیت پڑھی جائے تو بہتر ہے۔

ترجمہ: زمانۂ جاہلیت کے لوگ عقدِ نکاح سے پہلے تقریر کیا کرتے تھے،ان باتوں کے ذریعہ جن کو وہ مناسب سمجھتے تھے یعنی اپنی قوم کے کارناموں کا تذکرہ،اور اس کے مانند۔ذریعہ بناتے تھے وہ اس کو مقصود کے ذکر کا یعنی ایجاب وقبول کا۔اور مقصود کی شان بلند کرنے کا۔اور اس بات کا رواج چلنے میں مصلحت تھی یعنی یہ اچھی ریت تھی۔پس بیشک تقریر کا مدار تشہیر پر تھا،اور ایک چیز (نکاح) کے بنانے پر تھا عام لوگوں کی آنکھوں اور کانوں کے سامنے (جعلِ کا عطف التشھیر پر ہے اور عطف تفسیری ہے) اور تشہیر ان چیزوں میں سے ہے جس کے پائے جانے کا نکاح میں ارادہ کیا جاتا ہے،تاکہ وہ زنا سے جدا ہوجائے —— اور نیز: پس خطبہ نہیں استعمال کیا جاتا تھا مگر اہم امور میں۔اور نکاح کا اہتمام اور اس کو لوگوں کے درمیان بڑا معاملہ بنانا نکاح کے بڑے مقاصد میں سے ہے۔پس نبی ﷺ نے اس کی اصل کو باقی رکھا،اور اس کے وصف (مضامین) کو بدل دیا —— اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپؐ نے ان مصلحتوں کے ساتھ ایک ملی مصلحت کو ملایا۔اور وہ ملی مصلحت یہ ہے کہ مناسب یہ ہے کہ ہر دنیوی کام کے ساتھ کوئی ذکر ملایا جائے جو اس کے مناسب ہو،اور ہر جگہ شعائر اللہ (توحید ورسالت) کی شان بلند کی جائے،تاکہ دینِ حق پھیلائے ہوئے ہوں اس کے جھنڈے اور اس کے پرچم،ظاہر ہونے والے ہوں اس کے شعائر اور اس کے نشانات۔پس مسنون کئے آپؐ نے خطبہ میں مختلف قسم کے اذکار الی آخرہ۔

ترکیب: منشورًا اور ظاھرًا دونوں یکون کی خبریں ہیں۔اور منشورًا: اسم مفعول ہے پس أعلامه ورایاته اس کے نائب فاعل ہیں۔اور أعلام: عَلَم کی جمع ہے۔اور رَایات: رایة کی جمع ہے۔دونوں کے معنی جھنڈے اور پرچم کے ہیں۔اور ظاھرًا: اسم فاعل ہے۔اور شعارُہ وأماراته اس کے فاعل ہیں۔

☆ ☆ ☆

نکاح میں آواز کرنے اور دَف بجانے کی وجہ

حدیث (۱) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حلال وحرام کے درمیان امتیاز: نکاح میں شور آواز اور ڈفلی بجانا ہے" یعنی جاہلیت میں رائج نکاح کے چار طریقوں میں سے جائز نکاح وہی ہے جو علی الاعلان کیا جائے۔باقی تین نکاح جو چوری چھپے کئے جاتے ہیں وہ حرام ہیں (مشکوۃ حدیث ۳۱۵۳)

حدیث (۲) ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس نکاح کی تشہیر کیا کرو۔ اور (اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ) مسجدوں میں نکاح پڑھایا کرو، اور اس پر ڈفلی بجایا کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۵۲)

تشریح: زمانۂ جاہلیت کے لوگ نکاح کے موقع پر شور اور ڈفلی بجایا کرتے تھے۔ اور یہ عربوں میں پھیلی ہوئی عادت تھی۔ نکاح صحیح میں وہ اس کو چھوڑنے کے روادار نہیں تھے۔ ان میں نکاح کے چار طریقے رائج تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے[1] ان میں سے نکاح صحیح کو اسلام نے باقی رکھا۔ اور اس رائج طریقہ میں مصلحت یہ تھی کہ اس سے نکاح اور زنا میں امتیاز ہو جاتا تھا۔ ورنہ دونوں یکساں تھے۔ دونوں میں مرد وزن کی باہمی رضامندی سے شہوت پوری کی جاتی ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ کسی ایسی چیز کا حکم دیا جائے جس سے اول وہلہ ہی میں دونوں میں امتیاز ہو جائے۔ اور ایسا فرق ہو جائے کہ کسی کے لئے اس میں نہ کلام کی گنجائش رہے، اور نہ کوئی پوشیدگی ہو۔

فائدہ: دف بجانا بھی ایک طرح کا شور تھا۔ اس پر ڈھول باجے کو قیاس کرنا درست نہیں۔ اور اب جبکہ مسلمان نکاح کے رائج غلط طریقوں سے دور ہو گئے تو دف بجانے کی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ نیز کچھ روشنی کرنا، جھنڈیاں لگانا بھی دف کے قائم مقام ہو جاتا ہے۔

[٤] وقال صلى الله عليه وسلم: "فصلُ مابين الحلال والحرام الصوتُ والدُّف في النكاح" وقال صلى الله عليه وسلم: "أعلنوا هذا النكاحَ، واجعلوه في المساجد، واضربوا عليه بالدفوف"

أقول: كانوا يستعملون الدفَّ والصوت في النكاح، وكانت تلك عادةٌ فاشيةٌ فيهم، لايكادون يتركونها في النكاح الصحيح الذى أبقاه النبى صلى الله عليه وسلم من الأنكحة الأربعة، على ما بينته عائشةُ رضى الله عنها، وفى ذلك مصلحةٌ، وهى: أن النكاح والسِّفاح لما

[1] زمانۂ جاہلیت میں نکاح کے چار طریقے یہ تھے: (۱) ایک آدمی کی طرف سے دوسرے آدمی کو اس کی بیٹی یا زیر ولایت کسی لڑکی کے نکاح کے لئے پیام دیا جاتا۔ پھر وہ مناسب مہر مقرر کر کے اس لڑکی کا اس آدمی سے نکاح کر دیتا۔ یہی نکاح کا صحیح طریقہ تھا۔ اور اسی کو اسلام نے باقی رکھا ہے ——— (۲) جب کسی آدمی کی بیوی حیض سے پاک ہوتی، جبکہ رحم میں حمل قبول کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے تو شوہر اپنی بیوی سے کہتا کہ فلاں شخص سے جنسی تعلق قائم کر۔ پھر حمل ظاہر ہونے تک شوہر اپنی بیوی سے الگ رہتا۔ جب حمل کے آثار ظاہر ہو جاتے: شوہر اپنی بیوی سے صحبت کرتا۔ اور ایسا اس لئے کیا جاتا تھا کہ لڑکا نجیب (بڑی شان والا) پیدا ہو۔ عرب کے بعض پست قبیلوں میں یہ طریقہ رائج تھا ——— (۳) چند آدمی (دس سے کم) ایک عورت کے پاس جاتے۔ اور اس کی رضامندی سے سب اس سے صحبت کرتے۔ پھر اگر عورت حاملہ ہو جاتی، اور بچہ جنتی تو وہ ان سب آدمیوں کو بلاتی، اور کسی کو نامزد کرتی کہ یہ تیرا بچہ ہے۔ اور وہ آدمی انکار نہیں کر سکتا تھا ——— (۴) پیشہ ور قحبہ سے بہت سے لوگ جنسی تعلق قائم کرتے۔ پھر اگر اس کو حمل رہ جاتا، اور وہ بچہ جنتی تو قیافہ شناس بلایا جاتا۔ اور وہ علامات دیکھ کر فیصلہ کرتا کہ یہ بچہ فلاں کا ہے۔ اور اس کو ماننا پڑتا ——— اسلام نے یہ تمام شرمناک طریقے ختم کر دیئے۔ اور صرف ایک پاکیزہ طریقہ باقی رکھا جو اب لوگوں میں رائج ہے (بخاری حدیث ۵۱۲۷)

اتـفـقـا فـي قضاء الشهوة، ورِضا الرجل والمرأة: وجب أن يؤمر بشيئ يتحقق به الفرقُ بينهما بادي الرأي، بحيث لايبقى لأحد فيه كلام ولاخَفاء.

ترجمہ: لوگ نکاح میں ڈفلی اور آواز استعمال کیا کرتے تھے۔ اور وہ ان میں پھیلی ہوئی عادت تھی۔ نہیں قریب تھے وہ کہ اس عادت کو اُس نکاح صحیح میں چھوڑ دیں جس کو نبی ﷺ نے باقی رکھا ہے چار نکاحوں میں سے، جیسا کہ اس کو تفصیل سے بیان کیا ہے عائشہ رضی اللہ عنہا نے۔ اور اس عادت میں مصلحت ہے۔ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ نکاح اور زنا جب دونوں متفق تھے یعنی یکساں تھے قضاء شہوت میں اور مرد وزن کی رضامندی میں، تو ضروری ہوا کہ کسی ایسی چیز کا حکم دیا جائے جس کے ذریعہ دونوں کے درمیان اول وہلہ ہی میں فرق متحقق ہو، اس طرح کہ کسی کے لئے اس میں نہ کلام باقی رہے، اور نہ پوشیدگی۔

☆ ☆ ☆

متعہ کی اجازت پھر ممانعت کی وجہ

متعہ: کچھ مدت کے لئے نکاح کرنا۔ جس کے بعد نکاح خود بخود ختم ہوجائے۔ یہ ممنوع ہے۔ اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ پہلے اس کی اجازت تھی، پھر ممانعت کردی گئی۔ مسلم شریف میں روایت ہے: رسول اللہ ﷺ نے جنگِ اوطاس کے موقع پر تین دن تک متعہ کی اجازت دی، پھر ممانعت کردی (مشکوۃ حدیث ۳۱۴۸) اور متفق علیہ روایت ہے: نبی ﷺ نے جنگِ خیبر کے موقع پر متعہ کی اور گدھوں کے گوشت کی ممانعت فرمائی (مشکوۃ حدیث ۳۱۴۷)

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ متعہ کی اجازت شروع اسلام میں تھی۔ ایک شخص کسی ایسے شہر میں وارد ہوتا جہاں اس کی کوئی جان پہچان نہیں ہوتی تھی تو وہ کسی عورت سے اتنے دنوں کے لئے نکاح کرلیتا جتنے دن اس کا وہاں قیام کا ارادہ ہوتا۔ پس عورت اس کے سامان کی حفاظت کرتی۔ اور اس کے لئے کھانے کا انتظام کرتی۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ، أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ یعنی فلاح پانے والے مسلمان وہ ہیں جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی باندیوں سے، پس ان پر کچھ الزام نہیں (سورۃ المؤمنون آیت ۶ سورۃ المعارج آیت ۳۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''پس ہر شرمگاہ جو ان دو کے علاوہ ہے وہ حرام ہے'' (رواہ الترمذی، مشکوۃ حدیث ۳۱۵۸)

پہلے متعہ کی اجازت کی وجہ: پہلے ضرورت داعی تھی، اس لئے متعہ کی اجازت دی گئی۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ ایک شخص کسی ایسے شہر میں وارد ہوتا جہاں اس کی بیوی نہیں ہوتی تھی، وہاں اس کے لئے قیام کا مسئلہ ہوتا تو وہ نکاح کرلیتا تھا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اس زمانہ میں متعہ محض شرمگاہ کو کرایہ پر لینا نہیں ہوتا تھا، بلکہ دیگر خانگی مصالح بھی پیش نظر ہوتے تھے۔ بھلا صرف شرمگاہ کو کرایہ پر لینے کا معاملہ کیسے

ہوسکتا تھا؟ یہ بات تو انسانی اقدار کے خلاف ہے۔ اور ایسی بے شرمی کا کام ہے جسے فطرتِ سلیمہ ٹھکراتی ہے۔

بعد میں متعہ کی تین وجہ سے ممانعت کی گئی:

اول: بعد میں عام طور پر متعہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس لئے اس کی ممانعت کردی۔

دوم: متعہ میں دو خرابیاں تھیں:

(الف) اس سے نسب میں اختلاط واقع ہوتا تھا: کیونکہ متعہ کی مدت گزرنے کے بعد عورت مرد کے قابو سے نکل جاتی تھی۔ وہ خود مختار ہوجاتی تھی، پس اب وہ کیا کرے گی اس کا کچھ پتہ نہیں۔ پس اس کو عدت گذارنے کا حکم کیسے دیا جائے گا؟ اور کتنے دنوں کے لئے دیا جائے گا؟ جبکہ صورتِ حال یہ ہے کہ نکاح صحیح میں جو ہمیشہ کے لئے کیا جاتا ہے عدت کا انضباط نہایت دشوار ہے، پس متعہ میں عدت کا تعین کیسے ہوسکتا ہے؟

(ب) متعہ رواج پائے گا تو نکاح صحیح کا سلسلہ ختم ہوجائے گا۔ کیونکہ عام طور پر لوگ نکاح قضاء شہوت کے لئے کرتے ہیں۔ اور جب یہ ضرورت متعہ سے پوری ہوجائے گی تو لوگ نکاح کیوں کریں گے؟ —— ان دو خرابیوں کی وجہ سے متعہ کی ممانعت کردی۔

سوم: نکاح اور زنا میں مابہ الامتیاز دو باتیں ہیں: ایک: زنا عارضی معاملہ ہے اور نکاح دائمی رفاقت و معاونت ہے۔ دوم: زنا میں عورت کا کسی مرد کے ساتھ اختصاص نہیں ہوتا۔ اور نکاح میں تمام لوگوں کے روبرو عورت میں منازعت ختم کردی جاتی ہے۔ اور متعہ میں بھی زنا والی دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی ایک عارضی معاملہ ہوتا ہے اور اس میں بھی عورت کسی کے لئے مختص نہیں ہوتی، اس لئے اس کی اجازت ختم کردی گئی۔

[۵] وكان صلى الله عليه وسلم قد رخص في المتعة أيامًا، ثم نهى عنها.

أما الترخيص أولاً: فلمكان حاجةٍ تدعو إليه، كما ذكره ابن عباس رضي الله عنهما فيمن يقدِم بلدةً ليس بها أهلُه، وأشار ابن عباس رضي الله عنهما أنها لم تكن يومئذ استئجارًا على مجرد البُضْع، بل كان ذلك مغمورًا في ضمن حاجاتٍ من باب تدبير المنزلِ، كيف؟ والاستئجار على مجرد البضع انسلاخٌ عن الطبيعة الإنسانية، ووقاحةٌ يَمُجُّها الباطنُ السليمُ.

وأما النهي عنها: فلارتفاع تلك الحاجة في غالب الأوقات.

وأيضًا: ففي جَرَيان الرسم به:

[الف] اختلاط الأنساب: لأنها عند انقضاء تلك المدة تخرج من حيزه، ويكون الأمر بيدها، فلا يُدرى ماذا تصنع؟ وضبطُ العدة في النكاح الصحيح -الذي بناؤه على التأبيد- في غاية العسر، فماظنك بالمتعة؟



[ب] وإهمال النكاح الصحيح المعتبر فى الشرع: فإن أكثر الراغبين فى النكاح إنما غالبُ داعيتهم قضاءُ شهوة الفرج.

وأيضًا: فإن من الأمر الذى يتميز به النكاحُ من السفاح التوطينَ على المعاونة الدائمة، وأن كان الأصلُ فيه قطعُ المنازعة فيها على أعين الناس.

ترجمہ: اور نبی ﷺ نے کچھ دنوں کے لئے متعہ کی اجازت دی۔ پھر آپؐ نے اس کی ممانعت کردی (یہ روایات کا خلاصہ ہے) —— رہا پہلے اجازت دینا: تو وہ ایسی ضرورت کی وجہ سے تھا جو متعہ کرنے کی طرف بلاتی تھی۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا تذکرہ کیا ہے اس شخص کے حق میں جو کسی ایسے شہر میں وارد ہوتا جہاں اس کی بیوی نہیں ہوتی تھی۔ اور ابن عباسؓ نے اشارہ کیا کہ ان دنوں میں (بھی) متعہ محض شرم گاہ کو کرایہ پر لینا نہیں تھا۔ بلکہ وہ خانگی نظام کی ضروریات کے ضمن میں چھپایا ہوا تھا یعنی متعہ سے اصل مقصود خانگی ضروریات ہوتی تھیں۔ شرمگاہ سے فائدہ اٹھانا ضمناً ہوتا تھا۔ کیسے؟ اور محض شرمگاہ کو کرایہ پر لینا فطرتِ انسانیہ سے خروج تھا۔ اور ایسی بے شرمی کی بات تھی جس کو سلیم ضمیر تھوک دیتا ہے —— اور رہی اس کی ممانعت: تو وہ اکثر اوقات میں اس کی ضرورت باقی نہ رہنے کی وجہ سے تھی —— اور نیز: اس کے رواج کے جاری رہنے میں: (الف) نسبوں میں اختلاط ہے: اس لئے کہ عورت اس مدت کے ختم ہونے پر مرد کے قابو سے نکل جائے گی۔ اور اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ پس معلوم نہیں وہ کیا کرے؟ اور عدت کی تعیین نکاح صحیح میں بھی —— جس کی بنیاد ہمیشگی پر ہوتی ہے —— نہایت دشوار ہے (کیونکہ قُروء سے حیض مراد ہیں یا طہر؟ اس میں اختلاف ہے) پس آپ کا کیا خیال ہے متعہ کے بارے میں؟ یعنی اس میں عدت کی تعیین کیسے ممکن ہے؟ —— (ب) اور شریعت میں معتبر نکاح صحیح کو رائگاں کرنا ہے۔ کیونکہ نکاح میں رغبت کرنے والے اکثر لوگ: ان کا غالب تقاضا شرمگاہ کی شہوت پوری کرنا ہوتا ہے —— اور نیز: پس ان چیزوں میں سے بعض جن کے ذریعہ نکاح زنا سے ممتاز ہوتا ہے: (۱) (نفس کو) خوگر بنانا ہے دائمی معاونت پر یعنی نکاح کو پائدار بنانا ہے (۲) اور یہ بات ہے کہ نکاح میں اصل: عورت میں منازعت کو ختم کرنا ہے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے۔

لغات: غَمَرَه (ن) غَمْرًا: ڈھانپ لینا۔ مغمور: چھپایا ہوا ...... وَطَّن نفسَه على الأمر توطينًا: کسی کام کا خود کو خوگر (عادی) بنانا۔

ترکیب: من الأمر میں مِن تبعیضیہ ہے یعنی نکاح اور زنا میں مابہ الامتیاز یہ دو باتیں بطور مثال ہیں، ان کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں جن سے امتیاز ہوتا ہے ...... أن كان الأصل کا عطف التوطين پر ہے، اور یہ إن کا دوسرا اسم مؤخر ہے۔ اور أن کی اصل أنه ہے۔

☆ ☆ ☆

نکاح میں مہر کی حکمت

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں نکاح کا جو شریفانہ طریقہ رائج تھا اس میں مہر مقرر کیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس کو برقرار رکھا ہے۔ اس میں دو مصلحتیں ہیں:

پہلی مصلحت —— مہر سے نکاح پائدار ہوتا ہے —— نکاح کا مقصد اس وقت تکمیل پذیر ہوتا ہے جب میاں بیوی خود کو دائمی رفاقت و معاونت کا خوگر بنائیں۔ اور یہ بات عورت کی طرف سے تو اس طرح متحقق ہوتی ہے کہ نکاح کے بعد زمام اختیار اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ وہ مرد کی پابند ہو جاتی ہے۔ مگر مرد با اختیار رہتا ہے۔ وہ طلاق دے سکتا ہے۔ اور ایسا قانون بنانا کہ مرد بھی بے بس ہو جائے، جائز نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں طلاق کی راہ مسدود ہو جائے گی۔ اور مرد بھی عورت کا ایسا اسیر ہو کر رہ جائے گا جیسا عورت اسیر تھی۔ اور یہ بات اس ضابطہ کے خلاف ہے کہ مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ اور دونوں کا معاملہ کورٹ کو سپرد کرنا بھی درست نہیں۔ کیونکہ قاضی کے یہاں مقدمہ لے جانے میں سخت مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور قاضی وہ مصلحتیں نہیں جانتا جو شوہر اپنے بارے میں جانتا ہے۔ پس مرد کو دائمی نکاح کا خوگر بنانے کی راہ یہی ہے کہ اس پر مہر واجب کیا جائے۔ تاکہ جب وہ طلاق دینے کا ارادہ کرے تو مالی نقصان اس کی نگاہوں کے سامنے رہے اور وہ ناگزیر حالات ہی میں طلاق دے۔ پس مہر نکاح کو پائدار بنانے کی ایک صورت ہے۔

دوسری مصلحت —— مہر سے نکاح کی عظمت ظاہر ہوتی ہے —— نکاح کی عظمت و اہمیت بغیر مال کے — جو کہ شرمگاہ کا بدل ہوتا ہے — ظاہر نہیں ہوتی۔ کیونکہ لوگوں کو جس قدر مال کی حرص ہے اور کسی چیز کی نہیں۔ پس مال خرچ کرنے سے نکاح کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں: مہر میں اور بھی فوائد ہیں: (۱) مہر اولیاء کی خوش دلی کا ذریعہ ہے۔ قابل لحاظ مال کے ذریعہ اہتمام سے نکاح کرنے سے عورت کے اولیاء کی آنکھیں ٹھنڈی ہونگی۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کے دل کے ٹکڑوں کا ایک شخص بڑے اہتمام سے مالک بن رہا ہے تو ان کا دل باغ باغ ہو جائے گا (۲) اور مہر کے ذریعہ نکاح اور زنا میں امتیاز بھی قائم ہوتا ہے۔ سورۃ النساء آیت ۲۴ میں ارشاد پاک ہے: ''محرمات کے سوا اور عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئیں، بشرطیکہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ چاہو، قید میں لانے کے طور پر، نہ کہ مستی نکالنے کے طور پر'' یعنی ان عورتوں کو پابند کرنا مقصود ہو، یہی نکاح ہے۔ صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی کرنا مقصود نہ ہو، یہی زنا ہے۔

مہر کی مقدار متعین نہ کرنے کی وجہ

نبی ﷺ نے مہر کی کوئی ایسی مقدار متعین نہیں کی کہ اس میں کمی بیشی نہ ہو سکے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف عوامل کی

وجہ سے سب لوگوں کے لئے یکساں قابل قبول مہر تجویز کرنا ممکن نہیں۔ وہ عوامل یہ ہیں:

۱ــــ نکاح کی اہمیت ظاہر کرنے میں عادتیں مختلف ہیں۔ یعنی نکاح کا مہتم بالشان ہونا ظاہر کرنے کے لئے مہر کتنا ہونا چاہئے؟ اس میں لوگوں کا رواج مختلف ہے۔ کوئی تھوڑا مہر کافی سمجھتا ہے، کوئی بھاری مہر مقرر کرتا ہے۔

۲ــــ اور عورتوں کی طرف رغبت کے مراتب بھی مختلف ہیں۔ یعنی کوئی بہت زیادہ مشتاق ہوتا ہے، اور کسی کی رغبت برائے نام ہوتی ہے۔

۳ــــ اور مال خرچ کرنے میں بخیلی میں بھی لوگوں کے طبقات ہیں۔ کسی کی چار پیسے نکلنے سے جان نکلتی ہے، اور کوئی تھوڑے کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

پس جس طرح قیمتی اشیاء کی قیمت متعین کرنا دشوار ہے، کیونکہ رغبت اور طلب کے اعتبار سے اس کی قیمت مختلف ہوتی ہے، اسی طرح مہر کی مقدار کی تعیین بھی ممکن نہیں۔ بہت معمولی مہر جیسے لوہے کی انگوٹھی یا مٹھی بھر ستّو یا کھجوریں بھی مہر ہوسکتی ہیں۔ جیسا کہ درج ذیل روایات سے معلوم ہوتا ہے:

حدیث (۱) ــــ ایک خاتون نے رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو اپنا نفس ہبہ کیا۔ آپؐ نے اسے قبول نہیں کیا۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپؐ میرا نکاح ان سے کردیں۔ آپؐ نے پوچھا: ''تمہارے پاس مہر میں دینے کے لئے کیا چیز ہے؟'' انھوں نے کہا: کچھ بھی نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''جاؤ، تلاش کرو، چاہے لوہے کی انگوٹھی ہو!'' (بخاری حدیث ۵۱۲۱)

حدیث (۲) ــــ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''جس نے اپنی بیوی کے مہر میں مٹھی بھر ستّو یا کھجوریں دیں اس نے یقیناً حلال کرلیا'' یعنی نکاح درست ہوگیا (رواہ ابوداؤد، مشکوٰۃ حدیث ۳۲۰۵)

مسنون مہر کی حکمت اور بھاری مہر کی ممانعت

البتہ نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اپنے عمل سے مہر کی مناسب مقدار متعین فرمائی ہے۔ آپؐ نے اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں کا مہر ساڑھے بارہ اُوقیہ مقرر کیا ہے۔ ایک اُوقیہ: چالیس درہم کا ہوتا ہے۔ پس کل پانچ سو درہم ہوئے۔ جن کی موجودہ وزن سے پندرہ سوتیس گرام چاندی ہوتی ہے۔ یہ یا اس کی جو قیمت ادائیگی مہر کے وقت ہو وہی مسنون مہر ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۰۳)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''سنو! عورتوں کے بھاری مہر مقرر مت کرو۔ کیونکہ بھاری مہر اگر دنیا میں عزت کی بات اور اللہ کے نزدیک تقوی کی بات ہوتی تو اس کے زیادہ حقدار نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تھے۔ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے بارہ اُوقیہ سے زیادہ پر کسی بیوی سے نکاح کیا ہو، اور اپنی کسی بیٹی کا نکاح کرایا ہو'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۰۴) آپؐ نے عربوں کی عادت کے مطابق کسر کو یعنی آدھے اُوقیہ کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مذکورہ روایت میں کیا ہے۔

تشریح: مسنون مہر کی حکمت یہ ہے کہ مہر کے سلسلہ میں مناسب بات یہ ہے کہ وہ نہ اتنا کم ہونا چاہئے کہ اس کی کچھ

اہمیت ہی نہ ہو، اور نہ اتنا بھاری ہونا چاہئے کہ شوہر کی قوم کے احوال کے اعتبار سے اس کی ادائیگی عادۃً سخت دشوار ہو۔ اور زمانۂ نبوت کے لوگوں کے احوال کے اعتبار سے پانچ سو درہم ایک معتد بہ مقدار تھی۔ اور آپؐ کے بعد بھی اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ ان کے لئے بھی یہ اچھی خاصی مقدار ہے۔ البتہ کچھ لوگ جو شاہانہ کرّوفر کے مالک ہیں ان کے نزدیک یہ مقدار کم ہوسکتی ہے۔ مگر تشریع میں ان کا اعتبار نہیں۔

مہر خوش دلی سے ادا کیا جائے

زمانۂ جاہلیت میں لوگ مہر کے سلسلہ میں عورتوں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ ان کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرتے تھے یا کم دیتے تھے۔ چنانچہ سورۃ النساء آیت چار میں اللہ پاک نے حکم دیا: ''اور تم بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دو، ہاں اگر بیویاں اس مہر کا کچھ حصہ خوش دلی سے چھوڑ دیں تو تم اس کو مزہ دار خوشگوار سمجھ کر کھاؤ''

اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی عورت سے کم یا زیادہ مہر پر نکاح کیا، اور اس کا اس مہر کی ادائیگی کا ارادہ نہیں تو وہ قیامت کے دن اللہ کے حضور میں زنا کار کی حیثیت سے پیش ہوگا'' (مجمع الزوائد ۴: ۱۳۲)

فائدہ: مہر کی زیادہ سے زیادہ مقدار بالاتفاق متعین نہیں۔ اور سورۃ النساء آیت ۲۰ میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَ آتَيْتُمْ إِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَأْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا﴾ یعنی اگر تم نے کسی بیوی کو انبار کا انبار مال دیا ہو، تو بھی بوقت طلاق اس میں سے کچھ واپس مت لو ـــــــ اور کم سے کم مہر کی مقدار میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک کم سے کم مہر بھی متعین نہیں۔ جس چیز پر زوجین راضی ہوجائیں وہ مہر ہوسکتی ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اسی کو پیش نظر رکھا ہے۔

اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک متعین ہے۔ اول کے نزدیک دس درہم، اور ثانی کے نزدیک چوتھائی دینار یعنی ڈھائی درہم کم از کم مہر ہونا ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل یہ ہے کہ: ﴿أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ﴾ کے ذریعہ نکاح میں مہر شرط کیا گیا ہے۔ اور اَموال جمع ہے مال کی، جو جمع قلت کا وزن ہے، جس کا تین سے دس تک اطلاق ہوتا ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بہ سندِ حسن روایت مروی ہے: **لامهر دون عشرة دراهم**: دس درہم سے کم مہر نہیں (نصب الرایہ ۳: ۱۹۹) اور مذکورہ روایات، اسی طرح تعلیم قرآن کو مہر بنانے کی روایت جو آگے آرہی ہے: ان روایات کے بارے میں معلوم نہیں کہ یہ نزولِ آیت سے پہلے کی ہیں یا بعد کی؟ نیز عرف میں مہر دو ہیں: ایک نقد دوسرا ادھار۔ نقد مہر وہ ہے جو اولِ ملاقات میں پیش کیا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے تَهَادَوْا تَحَابُّوْا: باہم ہدیہ دو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے یعنی ہدیہ محبت ومودت کا بیج ہوتا ہے۔ اور عورت اس موقعہ پر اپنی گرانقدر چیز پیش کرتی ہے۔ پس مرد کو بھی اس موقعہ پر کچھ پیش کرنا چاہئے۔ اور وہ چیز نکاح کا اصل مہر بھی ہوسکتی ہے۔ یہی نبی ﷺ کا طریقہ تھا۔ لیکن اگر اس کی گنجائش نہ ہو

تو کچھ اور پیش کیا جائے۔ مثلاً: انگوٹھی، تھوڑا ستو، کھجوریں اور آج کی اصطلاح میں مٹھائی کھٹائی۔ کچھ تو تقریب بہر ملاقات چاہئے۔ اور مذکورہ روایات وواقعات میں اس کی صراحت نہیں کہ وہ کونسا مہر تھا؟ پس محکم کتاب کو لینا اور اس کے موافق جو روایت مروی ہے اس پر عمل کرنا اَولیٰ ہے۔

[٦] وكانوا لايُنَاكِحون إلا بصداق، لأمورٍ بَعَثَتْهُمْ على ذلك، وكان فيه مصالحُ:

منها: أن النكاح لاتتم فائدتُه إلا بأن يوطِّنَ كلُّ واحد نفسه على المعاونة الدائمة، ويتحقق ذلك من جانب المرأة بزوال أمرها من يدها، ولاجائز أن يُشَرَّعَ زوالُ أمره أيضا من يده، وإلا انْسَدَّ بابُ الطلاق، وكان أسيرًا في يدها كما أنها عانيةٌ بيده، وكان الأصل أن يكونوا قوَّامين على النساء، ولاجائز أن يُجعل أمرُهما إلى القضاة، فإن مرافعة القضية إليهم فيها حرج، وهم لايعرفون ما يعرف هو من خاصة أمره، فتعين أن يكون بين عينيه خسارةُ مالٍ، إن أراد فَكَّ النظم، لئلايجترئ على ذلك إلا عند حاجة لايجد منها بدًّا، فكان هذا نوعا من التوطين.

وأيضًا: فلايظهر الاهتمام بالنكاح إلا بمال يكون عوضَ البضع، فإن الناس لما تشاحُّوا بالأموال شحًّا لم يتشاحُّوا به في غيرها: كان الاهتمام لايتم إلا ببذلها.

وبالاهتمام تَقَرُّ أعينُ الأولياء، حين يتملك هو فَلْذَةَ أكبادهم وبه يتحقق التمييز بين النكاح والسِّفاح، وهو قوله تعالى: ﴿أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ، مُحْصِنِيْنَ، غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ﴾ فلذلك أبقى النبي صلى الله عليه وسلم وجوبَ المهر كما كان.

ولم يضبطه النبي صلى الله عليه وسلم بحدٍ: لايزيد ولاينقص، إذالعادات في إظهار الاهتمام مختلفة، والرغباتُ لها مراتبُ شتّى، ولهم في المشاحَّة طبقات، فلا يمكن تحديده عليهم، كما لايمكن أن يُضبط ثمنُ الأشياء المرغوبة بحدٍّ مخصوص، ولذلك قال: "التمس ولو خاتمًا من حديد" وقال صلى الله عليه وسلم: "من أعطى في صَداق امرأته ملءَ كفه سَويقًا أو تمرًا فقد استحل" غير أنه سَنَّ في صداق أزواجه وبناته ثنتي عشرة أوقية ونَشًّا، وقال عمر رضي الله عنه: "ألا! لاتُغَالُوا صدُقة النساء، فإنها إن كانت مَكرُمة في الدنيا، أو تقوى عند الله لكان أولاكم بها نبي الله صلى الله عليه وسلم" الحديث.

أقول: والسر فيما سنَّ: أنه ينبغي أن يكون المهر مما يُتَشاحُّ به، ويكون له بال، وينبغي أن لايكون مما يتعذر أداؤُه عادةً، بحسب ما عليه قومه، وهذا القدر نصاب صالح حسبما كان

عليه الناس في زمانه صلى الله عليه وسلم، وكذلك أكثر الناس بعده، اللهم! إلا ناسٌ: أغنياؤُهم بمنزلة الملوك على الأسِرَّة.

وكان أهل الجاهلية يظلمون النساء في صدُقاتهن بمطل أو نقص، فأنزل الله تعالى: ﴿وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً، فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ﴾ الآية.

ترجمہ: اور وہ باہم نکاح نہیں کیا کرتے تھے مگر مہر کے ذریعہ، چند ایسی باتوں کی وجہ سے جنھوں نے ان کو اس پر ابھارا تھا۔ اور اس میں مصلحتیں تھیں: —— ان میں سے یہ بات ہے کہ نکاح کا فائدہ تام نہیں ہوتا، مگر بایں طور کہ ہر ایک اپنی ذات کو خوگر بنائے دائمی معاونت کا۔ اور یہ بات عورت کی جانب سے پائی جاتی ہے اس کے اختیار کے اس کے ہاتھ سے نکل جانے کے ذریعہ۔ اور جائز نہیں کہ قانون بنایا جائے مرد کے بھی معاملہ کا اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا۔ ورنہ طلاق کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ اور مرد عورت کے ہاتھ میں قیدی ہو کر رہ جائے گا، جیسا کہ عورت مرد کے ہاتھ میں قیدی ہے۔ درانحالیکہ اصل یہ تھی کہ مرد عورتوں پر حاکم ہوں۔ اور جائز نہیں کہ دونوں کا معاملہ قاضیوں کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ کیونکہ قاضیوں کے پاس مقدمہ لے جانے میں حرج ہے۔ اور قضات نہیں جانتے اس بات کو جس کو شوہر جانتا ہے خاص اپنے معاملہ میں۔ پس متعین ہوگئی یہ بات کہ ہو مرد کی آنکھوں کے سامنے مالی خسارہ، اگر وہ نظام توڑنے کا ارادہ کرے، تاکہ وہ اس پر دلیری نہ کرے مگر ایسی حاجت کے وقت جس سے وہ کوئی چارہ نہ پائے۔ پس یہ خوگر بنانے کی ایک صورت ہے —— اور نیز: پس ظاہر نہیں ہوتا نکاح کا اہتمام مگر ایسے مال کے ذریعہ جو شرمگاہ کا بدلہ ہو۔ پس بیشک لوگوں نے جب بخیلی کی اموال میں ایسی بخیلی کہ نہیں کی انھوں نے ویسی بخیلی اموال کے علاوہ میں۔ پس اہتمام تام نہیں ہوگا مگر اموال خرچ کرنے کے ذریعہ —— اور اہتمام نکاح سے اولیاء کی آنکھیں ٹھنڈی ہونگی، جب شوہر مالک بنے گا اولیاء کے دل کے ٹکڑوں کا —— اور اس کے ذریعہ نکاح اور زنا کے درمیان امتیاز قائم ہوگا۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ..... پس اسی وجہ سے نبی ﷺ نے مہر کا وجوب باقی رکھا جیسا تھا —— اور مہر کو نبی ﷺ نے کسی ایسی حد کے ساتھ منضبط نہیں کیا، جو نہ کم ہو نہ زیادہ۔ کیونکہ: (۱) نکاح کی اہمیت کے اظہار میں عادتیں مختلف ہیں (۲) اور عورتوں کی طرف رغبت کے مراتب مختلف ہیں (۳) اور بخیلی میں لوگوں کے طبقات ہیں۔ پس سب لوگوں کے حق میں مہر کی تعیین ممکن نہیں، جیسا کہ ممکن نہیں کہ پسندیدہ چیزوں کی قیمت کسی مخصوص حد کے ساتھ منضبط کی جائے الی آخرہ —— البتہ یہ بات ہے کہ آپ نے طریقہ رائج کیا اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں کے مہر میں ساڑھے بارہ اوقیہ کا۔ اور حضرت عمرؓ نے فرمایا: ..... میں کہتا ہوں: اور اس مہر میں راز جو آپ نے رائج کیا یہ ہے کہ مناسب یہ ہے کہ مہر ان چیزوں میں سے ہو جس میں بخیلی کی جاتی ہے، اور اس کے لئے اہمیت ہو۔ اور یہ بات مناسب ہے کہ نہ ہو مہر اس چیز میں سے جس کی ادائیگی عادۃً سخت دشوار ہو، ان احوال کے اعتبار سے جن پر شوہر کی قوم ہے۔ اور یہ مقدار ایک معتدبہ مقدار ہے ان احوال کے اعتبار سے جن پر لوگ نبی ﷺ کے

زمانہ میں تھے۔ اور آپؐ کے بعد بھی اکثر لوگوں کا یہی حال ہے۔ اے اللہ! مگر کچھ لوگ: جن کے مالدار شاہی تختوں پر بادشاہوں کی طرح ہیں ——— اور جاہلیت کے لوگ عورتوں پر ظلم کیا کرتے تھے ان کے مہروں کے سلسلہ میں: ٹال مٹول یا کمی کے ذریعہ، پس اللہ تعالیٰ نے نازل کیا۔ الی آخرہ۔



مختلف مہر اور اس کی وجہ

مہر کے تعلق سے عورتوں کی آٹھ قسمیں ہیں۔ اس لئے کہ نکاح میں مہر مقرر ہوا ہے یا نہیں؟ پھر صحبت یا خلوت ہوئی ہے یا نہیں؟ پھر شوہر نے طلاق دی ہے یا اس کی وفات ہوئی ہے؟ یہ آٹھ صورتیں ہوئیں، اس طرح ۲×۲×۲=۴×۲=۸ سب کی تفصیل مع احکام درج ذیل ہے:

۱	مہر مقرر ہوا ہے	صحبت یا خلوت ہو چکی ہے	شوہر نے وفات پائی	کامل مہر
۲	مہر مقرر ہوا ہے	صحبت یا خلوت ہو چکی ہے	شوہر نے طلاق دی	کامل مہر
۳	مہر مقرر ہوا ہے	صحبت یا خلوت نہیں ہوئی	شوہر نے وفات پائی	کامل مہر
۴	مہر مقرر ہوا ہے	صحبت یا خلوت نہیں ہوئی	شوہر نے طلاق دی	نصف مہر
۵	مہر مقرر نہیں ہوا	صحبت یا خلوت ہو چکی ہے	شوہر نے وفات پائی	مہر مثل
۶	مہر مقرر نہیں ہوا	صحبت یا خلوت ہو چکی ہے	شوہر نے طلاق دی	مہر مثل
۷	مہر مقرر نہیں ہوا	صحبت یا خلوت نہیں ہوئی	شوہر نے وفات پائی	مہر مثل
۸	مہر مقرر نہیں ہوا	صحبت یا خلوت نہیں ہوئی	شوہر نے طلاق دی	متعہ

مہر کے سلسلہ میں تین ضوابط ہیں۔ جو درج ذیل ہیں:

پہلا ضابطہ ——— نکاح سے شوہر بیوی کی شرمگاہ کا مالک ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے بیوی سے فائدہ اٹھانا جائز ہو جاتا ہے۔ پس نکاح ملکیتِ بُضع کا سبب، اور جماع اس کا اثر (نتیجہ) ہے۔ اور ہر چیز سے مقصود اس کا اثر ہی ہوتا ہے۔ اور حکم سبب پر مرتب ہوتا ہے۔ اس لئے مہر ان دونوں چیزوں (سبب واثر) پر تقسیم ہوگا۔ جہاں دونوں پائے جائیں گے پورا مہر واجب ہوگا۔ اور جہاں صرف سبب پایا جائے گا نصف مہر واجب ہوگا۔

دوسرا ضابطہ ——— شوہر یا بیوی کی موت سے نکاح مؤکد اور ثابت ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ شوہر نے موت تک اس کو مسترد نہیں کیا۔ اور نکاح سے اس نے قدم پیچھے نہیں ہٹایا، تا آنکہ موت شوہر اور نکاح کے درمیان حائل ہوگئی، اور وہ بیوی سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ اسی طرح عورت کی وفات ہوگئی تو بھی یہی حکم ہے۔ کیونکہ یہ سماوی عذر ہے۔ عورت کا اس میں

کوئی قصور نہیں۔

تیسرا ضابطہ ــــ طلاق سے نکاح مرتفع ہوجاتا ہے۔اور فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں رہتا۔پس طلاق اقالہ کے مشابہ ہے۔

جب یہ ضوابط معلوم ہوگئے تو اب جاننا چاہئے کہ زمانۂ جاہلیت میں مہر کے سلسلہ میں جھگڑے ہوتے تھے۔اور لوگ مہر ادا کرنے میں انتہائی بخیلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔اور طرح طرح سے حجت بازیاں کرتے تھے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان مناقشات کے سلسلہ میں مذکورہ ضوابط کے مطابق مبنی بر انصاف احکام نازل فرمائے۔جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی اور دوسری صورتیں ـــــ اگر مہر مقرر ہوا ہے،اور صحبت یا خلوت بھی ہوچکی ہے،تو خواہ شوہر وفات پائے یا طلاق دے:عورت کو پورا مہر ملے گا۔کیونکہ شوہر کے لئے سبب ملک اور اس کا اثر دونوں متحقق ہوچکے ہیں۔پس پورا مہر واجب ہوگا۔ اس صورت کا حکم سورۃ النساء آیات ۲۰ و ۲۱ میں مذکور ہے۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بیوی کو طلاق دے تو خواہ کتنا ہی مہر دیا ہو،اس میں سے کچھ بھی واپس لینے کی ممانعت ہے۔اور وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ’’تم باہم بے حجابانہ مل چکے ہو،اور وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اقرار لے چکی ہیں‘‘ یہی حکم شوہر کے وفات پانے کا ہے۔

تیسری صورت ـــــ اگر مہر مقرر ہوا ہے۔اور صحبت یا خلوت نہیں ہوئی،اور شوہر کی یا بیوی کی وفات ہوگئی تو بھی عورت کو پورا مہر ملے گا۔کیونکہ موت سے نکاح مؤکد ہوجاتا ہے۔اور موت کی بنا پر صحبت نہ کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔کیونکہ یہ سماوی عذر ہے۔عورت کا کچھ قصور نہیں۔

چوتھی صورت ـــــ تیسری صورت میں اگر شوہر طلاق دے تو عورت کو آدھا مہر ملے گا۔سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۷ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَإِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ، وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ ترجمہ:اور اگر تم بیویوں کو طلاق دو،ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے،اور تم نے ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہو،تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اس کا آدھا واجب ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب مہر کے دو عوامل میں سے ایک پایا گیا،دوسرا نہیں پایا گیا،اس لئے آدھا مہر واجب ہوگا۔پس یہاں دو مشابہتیں پیدا ہوئیں:ایک:صرف منگنی سے،جس میں کچھ مہر واجب نہیں ہوتا۔دوسری:نکاح تام سے،جس میں کامل مہر واجب ہوتا ہے۔پس مہر کو دونوں مشابہتوں پر تقسیم کیا تو آدھا مہر واجب ہوا۔

پانچویں اور چھٹی صورتیں ـــــ اگر مہر مقرر نہیں ہوا،اور صحبت یا خلوت ہوچکی ہے،تو خواہ شوہر وفات پائے یا طلاق دے: مہر مثل واجب ہوگا۔نہ کم نہ زیادہ۔اس لئے کہ عورت کے حق میں عقد تام ہوگیا ہے۔اور وجوبِ مہر کا سبب اور اثر دونوں متحقق ہوچکے ہیں۔پس مہر واجب ہے۔مگر مہر کچھ مقرر نہیں ہوا،اس لئے ضروری ہے کہ اس کی نظیر اور اس کے مانند کے ذریعہ اندازہ کیا جائے۔اور خاندان کی عورتوں کا مہر بہترین نظیر ہے،جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ساتویں صورت ـــــ اگر مہر مقرر نہیں ہوا۔اور صحبت یا خلوت بھی نہیں ہوئی،اور شوہر یا بیوی کا انتقال ہوجائے تو بھی مہر مثل واجب ہوگا،نہ کم نہ زیادہ۔اور شوہر کی وفات ہوئی ہو تو عورت پر عدت واجب ہے۔اور اس کو میراث بھی ملے گی۔

کیونکہ زوجین میں سے ایک کی موت سے بھی عقد مؤکد ہو جاتا ہے۔ اسی صورت کا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا تھا۔ پھر بروع بنت واشق کی حدیث سے اس کی تائید ہوئی (مشکوۃ حدیث ۳۲۰۷) (شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ صورت بیان نہیں کی)

آٹھویں صورت ــــــ اگر مہر مقرر نہیں ہوا۔ اور صحبت یا خلوت بھی نہیں ہوئی، اور شوہر نے طلاق دیدی، تو متعہ (ایک جوڑا کپڑا) واجب ہے۔ کیونکہ نکاح ہوا اور عورت کو کچھ نہ ملے یہ بات جائز نہیں۔ ارشاد پاک ہے: ''بشرطیکہ تم چاہو اپنے مالوں کے بدل'' اس آیت کی رو سے نکاح میں مال ضروری ہے۔ اور مہر مثل واجب کرنے کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ ملکیتِ بضع متقرر نہیں ہوئی۔ طلاق سے نکاح رد ہو گیا ہے۔ اور کوئی مہر بھی مقرر نہیں ہوا، اس لئے متعہ واجب ہے۔ اس صورت کا تذکرہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۶ میں ہے: ﴿لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ، مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ، أَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً، وَّمَتِّعُوْهُنَّ، عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهُ، وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ﴾ الآية. ترجمہ: تم پر کچھ مواخذہ نہیں اگر تم بیویوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہو، اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہو: اور ان کو ایک جوڑا دو، صاحبِ وسعت پر اس کی وسعت کے مطابق، اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے موافق ہے۔

[۷] وقال الله تعالى: ﴿لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ، مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ، أَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ الآية.

أقول: الأصل في ذلك: أن النكاح سببُ الملك، والدخولَ بها أثرُه، والشيئُ إنما يراد به أثرُه، وإنما يترتب الحكم على سببه، فلذلك كان من حقهما: أن يُوَزَّعَ الصداق عليهما؛ وبالموت يتقرر الأمر ويَثبت، حيث لم يَرُدَّه حتى مات، وما انخنس عنه حتى حال بينه وبينه الموتُ؛ وبالطلاق يرتفع الأمر وينفسخ، وهو شِبْهُ الرد والإقالة.

وإذا تمهّد هذا: فنقول: كانت في الجاهلية مناقشات في باب المهر، وكانوا يتشاحُّون بالمال، ويحتجون بأمور، فقضى الله تعالى فيها بالحكم العدل على هذا الأصل:

فإن سمى لها شيئا، ودخل بها، فلها المهر كاملاً، سواء مات عنها أو طلقها: لأنه تم له سبب الملك وأثره، وأفضى الزوج إليها، وهو قوله تعالى: ﴿وَقَدْ أَفْضَى بَعْضُكُمْ إِلَى بَعْضٍ، وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾

وإن سمى لها، ولم يدخل بها، ومات عنها، فلها المهر كاملاً: لأنه بالموت تقرر الأمر، وعدم الدخول غير ضارٌّ، والحالة هذه، لأنه بسبب سماوي.

وإن طلقها فلها نصف المهر، على هذه الآية، لتحقُّقِ أحد الأمرين، دون الآخر، فحصل شِبْهان: شِبْهٌ بالخِطْبة من غير نكاح، وشِبْهٌ بالنكاح التام.

وإن لم يسمِّ لها شيئًا، ودخل بها، فلها مثلُ صداقِ نسائها، لاوَكْس ولاشَطَط، وعليها العدة، ولها الميراث: لأنه تم لها العقد بسببه وأثرِه، فوجب أن يكون لها مهر. وإنما يُقَدَّرُ الشيئُ بنظيره وشِبْهِه، وصداقُ نسائها أقربُ ما يقدر به في ذلك.

وإن لم يسم لها شيئًا، ولم يدخل بها، فلها المتعة: لأنه لايجوز أن يكون عقدٌ خالياً عن المال، وهو قوله تعالى: ﴿أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ﴾ ولاسبيل إلى إيجاب المهر، لعدم تقرر الملك، ولا التسمية، فقُدِّر دون ذلك بالمتعة.

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم بیویوں کو طلاق دو، جب تک کہ تم نے اس کو ہاتھ نہ لگایا ہو، یا (یعنی اور) ان کے لئے کچھ مہر مقرر نہ کیا ہو'' آیت پوری پڑھیں (شاہ صاحب کی مراد دو آیتیں ہیں، کیونکہ آگے جو استدلال کیا ہے وہ اس کے بعد والی آیت سے ہے) ـــــ میں کہتا ہوں: اس (مہر) کے سلسلہ میں اصل: (۱) یہ ہے کہ نکاح ملکیتِ بُضع کا سبب ہے۔ اور عورت سے صحبت ملک کا اثر ہے۔ اور چیز سے اس کا اثر ہی مراد لیا جاتا ہے۔ اور حکم اس کے سبب ہی پر مرتب ہوتا ہے۔ پس اسی وجہ سے دونوں کے حق سے تھا کہ مہر تقسیم کیا جائے دونوں پر ـــــ (۲) اور موت سے معاملہ (نکاح) متقرر اور ثابت ہوتا ہے۔ بایں طور کہ شوہر نے معاملہ کو مسترد نہیں کیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اور نہ وہ معاملہ سے پیچھے ہٹا یہاں تک کہ شوہر اور معاملہ کے درمیان موت حائل ہو گئی ـــــ (۳) اور طلاق سے معاملہ مرتفع ہو جاتا ہے۔ اور ختم ہو جاتا ہے۔ اور طلاق ردّ اور اقالہ کے مانند ہے (ردّ اور اقالہ مترادف ہیں) ـــــ اور جب یہ بات ممہد ہو گئی تو ہم کہتے ہیں: زمانۂ جاہلیت میں مہر کے سلسلہ میں جھگڑے ہوتے تھے۔ اور وہ مال میں انتہائی بخیلی کرتے تھے۔ اور چند امور سے حجتیں پیش کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان مناقشات میں انصاف والا فیصلہ کیا اس اصل کے مطابق۔

(پہلی اور دوسری صورتیں) پس اگر شوہر نے عورت کے لئے کوئی مہر مقرر کیا ہے، اور اس سے ہمبستری کی ہے، تو عورت کے لئے پورا مہر ہے، خواہ شوہر اس کو چھوڑ کر مر گیا ہو، یا اس کو طلاق دی ہو۔ اس لئے کہ شوہر کے لئے مکمل ہو گیا ہے ملک کا سبب اور اس کا اثر۔ اور بے حجابانہ شوہر عورت تک پہنچا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ـــــ (تیسری صورت) اور اگر عورت کے لئے مہر مقرر کیا ہے۔ اور اس سے ہم بستری نہیں کی۔ اور شوہر اس کو چھوڑ کر مر گیا ہے تو عورت کے لئے پورا مہر ہے۔ اس لئے کہ موت سے معاملہ (نکاح) متقرر ہو جاتا ہے۔ اور صحبت نہ کرنا مضر نہیں، درانحالیکہ صورت حال یہ ہے (یعنی شوہر کی وفات ہوئی ہے) اس لئے کہ وہ (موت) آسمانی سبب ہے ـــــ (چوتھی صورت) اور اگر (تیسری صورت میں) اس کو طلاق دی تو اس کے لئے آدھا مہر ہے۔ اس آیت کی رو سے (یعنی جو آیت مضمون کے شروع میں لکھی ہے۔ حالانکہ اس صورت کا حکم اس کے بعد والی آیت میں ہے) دو امروں میں سے ایک کے پائے جانے کی وجہ سے، نہ کہ دوسرے کے۔ پس حاصل ہوئیں دو مشابہتیں: ایک: نکاح کے بغیر منگنی سے مشابہت اور دوسری: نکاح تام سے مشابہت ـــــ

(پانچویں اور چھٹی صورتیں) اور اگر عورت کے لئے کچھ مہر مقرر نہیں کیا۔ اور اس سے ہم بستری کی ہے تو عورت کے لئے اس کے خاندان کی عورتوں کے مہر کے مانند ہے، نہ کم اور نہ زیادہ، اور اس پر عدت ہے۔ اور اس کے لئے میراث ہے (یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کے الفاظ ہیں۔ مگر وہ فیصلہ ان دونوں صورتوں کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ ساتویں صورت کے لئے ہے۔ جس کو شاہ صاحب نے بیان نہیں کیا۔ اور یہ دو صورتیں اس طرح بنیں گی کہ شوہر کی یا تو وفات ہوئی ہے یا اس نے طلاق دی ہے) اس لئے کہ عورت کے لئے عقد تام ہوگیا ہے اس کے سبب اور اس کے اثر کے ساتھ، پس ضروری ہے کہ اس کے لئے مہر ہو۔ اور چیز اس کی نظیر اور اس کے مانند کے ذریعہ ہی اندازہ ٹھہرائی جاتی ہے۔ اور اس کے خاندان کی عورتوں کا مہر قریب ترین وہ چیز ہے جس سے اس بارے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے —— (ساتویں صورت بیان نہیں کی، آٹھویں صورت) اور اگر اس کے لئے کوئی مہر مقرر نہیں کیا، اور نہ اس کے ساتھ ہم بستری کی ہے (اور شوہر نے طلاق دی ہے) تو اس کے لئے متعہ ہے۔ اس لئے کہ یہ بات جائز نہیں کہ کوئی عقد مال سے خالی ہو۔ اور وہ اللہ کا ارشاد ہے: ''بشرطیکہ تم چاہو اپنے مالوں کے بدل'' اور کوئی راہ نہیں مہر واجب کرنے کی ملک متقرر نہ ہونے کی وجہ سے، اور مہر نامزد نہ ہونے کی وجہ سے۔ پس اندازہ کیا گیا مہر سے کم کا متعہ کے ذریعہ۔

☆ ☆ ☆

تعلیم قرآن مہر مقرر کرنے کی وجہ

پہلے یہ حدیث گذری ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص سے فرمایا: ''جاؤ، تلاش کرو، چاہے لوہے کی انگوٹھی ہو!'' اس حدیث کا باقی حصہ یہ ہے: وہ صحابی گئے، تلاش کیا، مگر کچھ نہیں پایا۔ واپس آکر عرض کیا: یارسول اللہ! بخدا! میرے پاس کچھ نہیں، لوہے کی انگوٹھی بھی نہیں! البتہ میری یہ لنگی ہے —— راوی حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ان کے پاس چادر یعنی کرتہ نہیں تھا —— اس کا آدھا اُس کے لئے ہے۔ آپ نے فرمایا: ''لنگی سے کیا کام چلے گا۔ اگر آپ اس کو پہنے رہے تو اس کو کچھ نہیں ملے گا۔ اور وہ پہنے گی تو آپ کے پاس کچھ نہیں ہوگا'' وہ صاحب بیٹھ گئے اور دیر تک بیٹھے رہے، پھر اٹھ کر چل دیئے۔ آپ نے ان کو بلوایا۔ اور پوچھا: ''تمہیں قرآن کتنا یاد ہے؟'' انھوں نے کہا: فلاں اور فلاں سورتیں یاد ہیں۔ انھوں نے متعدد سورتیں شمار کیں۔ آپ نے پوچھا: ''کیا تم ان کو حفظ پڑھتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: اِذْهَبْ فقد مَلَّكْتُكَها بما معك من القرآن: جاؤ، میں نے تمہیں اس کا مالک بنادیا اس قرآن کی وجہ سے جو تمہیں یاد ہے یعنی جتنا قرآن تمہیں یاد ہے اس کو سکھادو، یہی تمہارا مہر ہے (بخاری حدیث ۵۰۸۷، مشکوۃ حدیث ۳۲۰۲)

تشریح: تعلیم سُورا ایک اہم معاملہ ہے۔ اور تعلیم میں بھی ویسی ہی رغبت وطلب کی جاتی ہے، جیسی اموال میں کی جاتی ہے۔ پس تعلیم قرآن اموال کے قائم مقام ہوسکتی ہے۔

فائدہ: جن منافع کا عوض لینا جائز ہے، ان کو مہر مقرر کرنا بھی جائز ہے۔ فقہی ضابطہ ہے: ماجاز أخذُ الأجرة في مقابلته من المنافع جاز تسميته صداقًا (شامی ۲: ۳۶۲) اور تعلیم قرآن پر اب اجارہ درست ہے، پس اس کو مہر بنانا بھی درست ہے۔

[۸] وجعل النبي صلى الله عليه وسلم مرةً سُوَرًا من القرآن مهرًا، لأن تعليمها أمر ذوبال، يرغب فيه ويطلب كما ترغب وتطلب الأموال، فجاز أن يقوم مقامها.

شادی کے بعد ولیمہ کی مصلحتیں

زمانۂ جاہلیت میں لوگ میاں بیوی کے ملاپ سے پہلے ولیمہ کرنے کے عادی تھے۔ اور اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں:

پہلی مصلحت — جوملکی مفاد سے تعلق رکھتی ہے — یہ ہے کہ ولیمہ کے ذریعہ لطیف پیرایہ میں نکاح کی تشہیر ہوجاتی ہے۔ ولیمہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ اب شوہر بیوی سے ملنے والا ہے۔ اور زفاف کی تشہیر ضروری ہے، تاکہ اولاد کے نسب میں کوئی بدگمانی نہ کرے۔ علاوہ ازیں: ولیمہ سے اول وہلہ ہی میں نکاح اور زنا میں امتیاز ہوجاتا ہے۔ اور برملا عورت کا شوہر کے ساتھ اختصاص ہوجاتا ہے۔

دوسری مصلحت — جو خانگی مصلحت ہے — یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ضروریات کی تکمیل فرماتے ہیں۔ اور جو چیز ان کے لئے مفید ہوتی ہے عنایت فرماتے ہیں۔ اور خانگی زندگی کے نظم وانتظام کے لئے بیوی کی ضرورت ہے۔ پس حسب خواہش کسی عورت سے نکاح ہوجانا بلاشبہ اللہ کی بڑی نعمت ہے، جس کا شکر بجالانا ضروری ہے۔ ولیمہ اس کی عملی شکل ہے۔

تیسری مصلحت — حسن سلوک — ولیمہ: بیوی اور اس کے خاندان کے ساتھ نیک سلوک ہے۔ اس لئے کہ بیوی کی خاطر مال خرچ کرنا، اور دلہن آنے کی تقریب سے لوگوں کو جمع کرنا، اس بات کی دلیل ہے کہ بیوی شوہر کی نظر میں باعزت اور باوقعت ہے۔ اور اس قسم کے امور جن سے خاندان میں جوڑ پیدا ہو: ضروری ہیں۔ خاص طور پر جب دلہن گھر میں پہلی مرتبہ آئے۔

چوتھی مصلحت — جو تہذیب نفس سے تعلق رکھتی ہے — یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی نئی نعمت کا حاصل ہونا، جیسے بیوی کا بدست آنا، خوشی، نشاط اور سرور کا باعث ہے، جو مال خرچ کرنے پر ابھارتا ہے۔ اور مال خرچ کرنے سے آدمی سخاوت کا خوگر ہوتا ہے۔ اور انتہائی بخل کے رذیلہ سے نجات ملتی ہے — اور اس قسم کے اور بھی فوائد ومصالح ولیمہ میں موجود ہیں۔

پس مذکورہ چاروں مصالح کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولیمہ کو باقی رکھا۔ اور اس کی ترغیب دی۔ اور آپؐ نے خود بھی

اس پرعمل کیا۔البتہ ولیمہ کی کوئی حدمتعین نہیں کی۔اوراس کی وجہ مہر کے بیان میں گذر چکی کہ تمام لوگوں کے لئے یکساں قابل قبول حدمتعین کرناممکن نہیں۔اوراوسط درجہ کا ولیمہ ایک بکری ہے۔اسی کا آپؐ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تھا کہ ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری کا ہو(مشکوۃ حدیث ۳۲۱۰)اور چھوٹا ولیمہ وہ ہے جو آپؐ نے کیا ہے۔آپؐ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ولیمہ میں لوگوں کو ملیدہ کھلایا یعنی اس میں گوشت نہیں تھا(بخاری حدیث ۲۷۱، مشکوۃ حدیث ۳۲۱۴) اور بعض ازواج کے ولیمہ میں آپ نے دو مد(چار رطل) آٹا خرچ کیا(مشکوۃ حدیث ۳۲۱۵)

فائدہ: نکاح کے بعد زفاف سے پہلے ولیمہ کرنا: جاہلیت کا طریقہ تھا۔جیسا کہ شاہ صاحب نے اس کی صراحت کی ہے۔اسلام مین مسنون زفاف کے بعد ولیمہ کرنا ہے۔بذل المجهود میں ہے:قال السبكي: والمنقول من فعل النبي صلى الله عليه وسلم أنها بعد الدخول. وفي حديث أنس عند البخاري وغيره التصريحُ بأنها بعد الدخول، لقوله:" أصبح عروسا بزينب فدعا القوم"(بذل ۱۰:۱۲۸مصری،کتاب النکاح،باب قلۃ المہر)

[۹] وكان الناس يعتادون الوليمة قبل الدخول بها، وفي ذلك مصالحُ كثيرة:

منها: التلطف بإشاعة النكاح، وأنه على شَرَفِ الدخول بها، إذ لابد من الإشاعة، لئلا يبقى محلٌ لوهم الواهم في النسب، وليتميز النكاح عن السفاح بادى الرأى، ويتحقق اختصاصه بها على أعين الناس.

ومنها: شكر ما أولاه الله تعالى من انتظام تدبير المنزل، بما يصرفه إلى عباده، وينفعهم به.

ومنها: البر بالمرأة وقومِها، فإن صرف المال لها، وجمع الناس في أمرها،يدل على كرامتها عليه، وكونها ذاتَ بالٍ عنده؛ ومثلُ هذه الأمور لابدّ منها في إقامة التأليف فيما بين أهل المنزل، لاسيما في أول اجتماعهم.

ومنها: أنِ تجدُّدَ النعمة– حيث مَلَكَ مالمْ يكن مالكاً له– يورث الفرح والنشاط والسرور، ويهيّج على صرف المال، وفي اتباع تلك الداعية التمرّنُ على السخاوة، وعصيانُ داعية الشح، إلى غير ذلك من الفوائد والمصالح.

فلما كان فيها جملة صالحة من فوائد السياسة المدنية والمنزلية، وتهذيب النفس، والإحسان: وجب أن يُبقيها النبي صلى الله عليه وسلم، ويرغِّب فيها، ويحثَّ عليها، ويعمل هو بها.

ولم يُضبطه النبي صلى الله عليه وسلم بحدٍ لمثل ما ذكرنا في المهر، والحدُّ الوسطُ الشاةُ، وأولم صلى الله عليه وسلم على صفية رضي الله عنها بحَيْس، وأولم على بعض نسائه بمدَّيْن من شعير.

ترجمہ: اور زمانۂ جاہلیت کے لوگ عادی ہوگئے تھے عورت سے ہم بستری کرنے سے پہلے ولیمہ کرنے کے۔ اور اس (ولیمہ) میں بہت سی مصلحتیں ہیں ـــــ ازانجملہ: لطیف پیرایہ میں نکاح کی تشہیر ہے، اور اس بات کا اعلان ہے کہ وہ عنقریب بیوی سے ہم بستری کرے گا۔ کیونکہ تشہیر ضروری ہے تاکہ نہ باقی رہے کوئی جگہ نسب میں بدگمانی کرنے والے کی بدگمانی کے لئے۔ اور تاکہ اول وہلہ ہی میں نکاح زنا سے جدا ہوجائے۔ اور شوہر کا عورت کے ساتھ اختصاص پایا جائے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ـــــ اور ازانجملہ: اس نعمت کا شکر بجالانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے یعنی خانگی زندگی کا انتظام اس چیز کے ذریعہ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بندوں کو نفع پہنچاتے ہیں ـــــ اور ازانجملہ: عورت اور اس کی قوم کے ساتھ حسن سلوک ہے۔ اس لئے کہ عورت کے لئے مال خرچ کرنا، اور عورت کے معاملہ میں لوگوں کو اکٹھا کرنا، شوہر کی نگاہ میں عورت کی عزت پر، اور شوہر کے نزدیک عورت کے باوقعت ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس قسم کی چیزیں ضروری ہیں اہل منزل کے مابین جوڑ پیدا کرنے کے لئے۔ خاص طور پر ان کے پہلے اجتماع کے موقعہ پر ـــــ اور ازانجملہ: یہ بات ہے کہ تجدیدِ نعمت ـــــ بایں طور کہ وہ مالک ہوا اس چیز کا جس کا وہ پہلے مالک نہیں تھا ـــــ خوشی اور نشاط اور سرور پیدا کرتا ہے، اور مال خرچ کرنے پر ابھارتا ہے۔ اور اس تقاضے کی پیروی میں سخاوت کا خوگر بننا ہے، اور انتہائی بخیلی کے تقاضے کی نافرمانی کرنا ہے۔ اور اس قسم کے اور بھی فوائد ومصالح ہیں ـــــ اور جب ولیمہ میں ملکی اور خانگی سیاست کے فوائد کی، اور تہذیب نفس اور حسن سلوک کی کافی مقدار موجود تھی تو ضروری ہوا کہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم باقی رکھیں، اور اس کی ترغیب دیں، اور اس پر ابھاریں، اور بذاتِ خود بھی اس پر عمل کریں ـــــ اور متعین نہیں کیا ولیمہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی حد کے ذریعہ، ویسی ہی حکمت کی وجہ سے جو ہم نے مہر کے تذکرہ میں بیان کی ہے۔ اور درمیانی حد: ایک بکری ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کا ولیمہ کیا ملیدہ کے ذریعہ۔ اور اپنی بعض ازواج کا ولیمہ کیا دو مُدّ جو کے ذریعہ۔

تصحیح: **لئلا یبقی محلّ** مخطوطہ کراچی میں محلاً ہے۔ مگر واضح محلّ ہے، اس لئے اسی کو باقی رکھا ہے...... **لمثل ما ذکرنا** مطبوعہ میں **بمثل ما ذکرنا** تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے...... **تهذيب النفس والإحسان** میں تقدیم وتاخیر ہے۔

دعوتِ ولیمہ قبول کرنے میں حکمت

حدیث (۱) ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو ولیمہ کی دعوت دی جائے تو چاہئے کہ اس میں شرکت کرے'' (متفق علیہ) اور مسلم کی ایک روایت میں ہے: ''پس چاہئے کہ وہ دعوت قبول کرے، خواہ شادی کی دعوت ہو، یا

کوئی اور دعوت'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۱۶)

حدیث (۲) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو کسی کھانے کی دعوت دی جائے تو چاہئے کہ قبول کرے۔ پھر اگر چاہے تو کھائے، اور چاہے تو نہ کھائے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۱۷)

تشریح: لفظ ولیمہ عام ہے۔ خواہ شادی کی دعوت ہو یا کوئی اور تقریب: ولیمہ کہلاتی ہے۔ اور ولیمہ وغیرہ کی دعوت قبول کرنے کا حکم دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ —— اسلامی قانون سازی کے اصول میں سے یہ بات ہے کہ جب کسی شخص کو حکم دیا جائے۔ وہ لوگوں کے ساتھ کسی مصلحت سے کوئی معاملہ کرے، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کام میں جو وہ کرنا چاہتا ہے تابعداری کرنے پر، اور اس کی مطاوعت پر ابھارا جائے۔ ورنہ حکم دینے سے جو مقصود ہے وہ تکمیل پذیر نہ ہوگا۔ مثل مشہور ہے: ''تالی دو ہاتھوں سے بجتی ہے!'' پس جب ایک ہاتھ سے کہا کہ تالی بجا، تو دوسرے ہاتھ کو موافقت کا حکم دینا ضروری ہے۔ اسی طرح جب شادی کرنے والے کو حکم دیا کہ وہ دعوتِ ولیمہ کرکے اپنے نکاح کی تشہیر کرے تو ضروری ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جائے کہ وہ اس کی دعوت قبول کریں —— پھر اگر روزے سے ہو، اور نہ کھائے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ یعنی دعوت میں جائے، اور معذرت کرکے اور دعا دیکر آجائے۔ کیونکہ دعوت کا مقصد نکاح کی تشہیر ہے جو حاصل ہوگیا۔

دوسری وجہ —— دعوتِ ولیمہ قبول کرنا بھی صلہ رحمی ہے۔ کیونکہ اس سے دلوں میں جوڑ پیدا ہوتا ہے۔ اور دعوت قبول نہ کرنے سے دوری اور بدگمانی پیدا ہوسکتی ہے۔ اور دعوتِ ولیمہ کے رواج میں ملکی اور خاندانی دونوں فائدے بھی ہیں۔ جن کی تفصیل ابھی گذر چکی۔

فائدہ: پہلے ولیمہ وغیرہ کی دعوت ہاتھ کے ہاتھ دی جاتی تھی، اس لئے فرمایا کہ جو روزہ سے ہو وہ بھی دعوت قبول کرے۔ اور دعوت میں جائے، اور معذرت کرکے آجائے۔ لیکن اب ولیمہ کی دعوت پہلے سے دی جاتی ہے۔ پس اگر دعوت قبول کی ہے تو اس دن روزہ نہیں رکھنا چاہئے۔ اس دن روزہ رکھ لینا حیلہ بازی ہے —— نیز ایک معاشرتی خرابی یہ ہے کہ دعوت قبول کرلی جاتی ہے، اور شرکت نہیں کی جاتی۔ یہ اور بھی برا ہے۔ اس سے دعوت کرنے والے کا کھانا برباد ہوتا ہے۔ اور سخت ناراضگی کا سبب بھی ہوتا ہے۔ البتہ پہلے سے معذرت کردی جائے تو وہ کچھ زیادہ برا نہیں۔

[۱۰] قال: ''إذا دُعی أحدُکم إلی الولیمة فَلْیأْتِها'' وفی روایة: ''فإن شاء طعِم، وإن شاء ترك''

أقول: لما کان من الأصول التشریعیة: أنه إذا أُمِر واحدٌ أن یصنع بالناس شیئًا لمصلحةٍ، فمن موجَب ذلك: أن یُحَثَّ الناس علی أن ینقادوا له فیما یرید، ویَمْتَثِلوا له، ویُطاوعوه، وإلا لَمَا تحققتِ المصلحةُ المقصودة بالأمر؛ فلما أُمر هذا أن یشیِّعَ أمرَ النکاح بولیمةٍ تُصنع للناس: وجب أن یؤمر أولئك أن یُجیبوه إلی طعامه؛ فإن کان صائما ولم یطعم فلا بأس بذلك،

فإنه حصلت الإشاعةُ المقصودة.

وأيضًا: فمن الصلة أن يجيبَه إذا دعا، وفي جَرَيَان الرسم بذلك انتظام أمر المدينة والحيِّ.

ترجمہ: جب اصولِ تشریعیہ میں سے یہ بات تھی کہ جب کوئی شخص حکم دیا جائے کہ وہ لوگوں کے ساتھ کوئی چیز کرے کسی مصلحت سے، تو اس کے مقتضی میں سے یہ بات ہے کہ لوگ ابھارے جائیں اس پر کہ وہ اس کی اس بات میں تابعداری کریں جو وہ چاہتا ہے۔ اور اس کا امتثال کریں۔ اور اس کی مطاوعت کریں، ورنہ متحقق نہیں ہوگی امر سے مقصود مصلحت۔ پس جب یہ شخص (شادی کرنے والا) حکم دیا گیا کہ وہ نکاح کے معاملہ کی تشہیر کرے ایسے ولیمہ کے ذریعہ جو لوگوں کے لئے کیا جائے، تو ضروری ہوا کہ لوگ حکم دیئے جائیں اس بات کے کہ وہ اس کی دعوت قبول کریں ولیمہ کے کھانے کے لئے —— پھر اگر روزہ سے ہو، اور نہ کھائے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ پس بیشک تشہیر کا مقصد پورا ہو گیا —— اور نیز: پس صلہ رحمی میں سے یہ بات ہے کہ اس کی دعوت قبول کرے جب وہ دعوت دے۔ اور اس کی ریت چلنے میں مملکت اور قبیلہ کے معاملہ کا انتظام ہے۔

☆ ☆ ☆

شادی میں حد سے زیادہ آرائش ناپسند ہونے کی وجہ

حدیث —— حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر کوئی مہمان آیا۔ اس کے لئے کھانا بنایا گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کیا اچھا ہوتا اگر ہم رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو بھی کھانے پر بلا لیتے! چنانچہ آپؐ کو دعوت دی گئی۔ آپؐ تشریف لائے۔ اور چوکھٹ کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھا۔ آپؐ نے گھر کے ایک گوشہ میں منقش پردہ دیکھا۔ آپؐ لوٹ گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پیچھے گئیں۔ اور واپسی کی وجہ دریافت کی۔ آپؐ نے فرمایا: میرے لئے —— یا فرمایا: کسی نبی کے لئے —— جائز نہیں کہ وہ مزین کئے ہوئے گھر میں داخل ہو" (مشکوۃ حدیث ۳۲۲۱)

تشریح: شادی وغیرہ کے مواقع پر حد سے بڑھی ہوئی آرائش وزیبائش دو وجہ سے ناپسندیدہ ہے:

پہلی وجہ —— جبکہ ناجائز چیزوں کے ذریعہ آرائش ہو —— جب جاندار کی تصویر کشی حرام ہے۔ اور ایسے کپڑوں کا استعمال بھی حرام ہے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے گھر سے دور رہا جائے جس میں وہ تصاویر ہوں۔ اور اس پر نکیر کی جائے۔ خاص طور پر انبیاء علیہم السلام کے لئے (اور ان علماء کے لئے جو قوم کے مقتدا ہیں) نکیر کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ ان کی بعثت (اور علماء کی وراثت) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ہے۔

دوسری وجہ —— جبکہ جائز چیزوں کے ذریعہ آرائش ہو —— انتہائی درجہ کی آراستگی دولت مندی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اور آدمی دولت منداس وقت بنتا ہے جب دنیا طلبی میں دور تک جائے۔ اور دنیا طلبی میں انہماک آخرت کی تیاری سے

غافل کرتا ہے۔ روم وایران کے لوگوں میں اس چیز کا مشاہدہ کیا جاچکا تھا۔ وہ دنیا میں اتنے پھنسے ہوئے تھے کہ آخرت کا ذکر تک پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ شریعت میں اس چیز کی ممانعت کردی جائے۔ اور اس سے نفرت کا اظہار کیا جائے۔

[۱۱] وقال صلى الله عليه وسلم:" إنه ليس لي — أو لنبي — أن يدخل بيتا مُزَوَّقا"

أقول: لما كانت الصُّوَرُ يحرم صنعها، ويحرم استعمال الثوب المصنوعة هي فيه: كان من مقتضى ذلك: أن يُهجر البيتُ الذي فيه تلك الصورُ، وأن تُقام اللائمةُ في ذلك، لاسيما للأنبياء عليهم السلام، فإنهم بُعثوا آمرين بالمعروف، وناهين عن المنكر.

وأيضًا: فلما كان استحسانُ التجمُّل البالغ سببا لشدة خوضهم في طلب الدنيا— وقد وقع ذلك في الأعاجم حتى أنساهم ذكرَ الآخرة— وجب أن يكون في الشرع ناهيةٌ عن ذلك، وإظهارُ نفرة عنه.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: زَوَّقه: آراستہ کرنا۔ بناؤسنگھار کرنا...... اللائمةُ: ملامت۔ ملامت برپا کرنا یعنی نکیر کرنا...... نَاهِيَة عن ذلك: مخطوطہ کراچی میں بھی اسی طرح ہے۔ مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں: والأظهر: نهيٌ بدلَ ناهية.

☆ ☆ ☆

مفاخرت والی دعوت قبول نہ کرنے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے دعوت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے والے دونوں شخصوں کی دعوت قبول کرنے سے منع کیا (مشکوۃ حدیث ۳۲۲۵) یعنی جو لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنی شان اونچی کرنے کے لئے شاندار دعوتیں کریں ان کی دعوت قبول نہ کی جائے۔

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں لوگ دعوت کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہر ایک چاہتا کہ دوسرے پر غالب آئے۔ وہ اسی غرض سے مال خرچ کرتا۔ اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا تھا۔ ایسی دعوتوں سے باہم کینہ پیدا ہوتا ہے۔ آپسی معاملات خراب ہوتے ہیں۔ اور کسی دینی یا ملکی مصلحت کے بغیر مال ضائع ہوتا ہے۔ اور وہ صرف نفس کی خواہش کی پیروی ہے۔ پس ضروری ہے کہ ایسے ولیمہ کا بائیکاٹ کیا جائے۔ اور اس کی بے قدری کی جائے۔ اور تحقیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس دعوت میں شرکت نہ کی جائے۔

دو دعوتوں میں وجہ ترجیح

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو دعوت دینے والے اکٹھا ہوں تو آپ اس کی دعوت قبول کریں جس کا دروازہ قریب ہے۔ اور اگر ان میں سے ایک پہلے پہنچے تو اس کی دعوت قبول کریں جو پہلے دعوت دینے آیا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۲۳)

تشریح: جب دو دعوتوں میں تعارض ہو تو وجہ ترجیح تلاش کی جائے۔ اور وجہ ترجیح دو ہیں: (۱) دعوت دینے کے لئے پہلے آنا (۲) مدعو کے گھر سے داعی کا گھر قریب ہونا۔

[۱۲] ونهى صلى الله عليه وسلم عن طعام الْمُتَبَارِيَيْنِ أن يُؤكل.

أقول: كان أهل الجاهلية يتفاخرون، يريد كلُّ واحد أن يغلب الآخر، فيصرف المالَ لذلك الغرض، دون سائر النيات، وفيه الحقد، وفسادُ ذاتِ البين، وإضاعةُ المالِ من غير مصلحة دينية أو مدنية، وإنما هو اتباع داعيةٍ نفسانية، فلذلك وجب أن يُهجر أمرُه، ويُهانَ، ويُسَدَّ هذا البابُ، وأحسنُ ما يُنهى به أن لايؤكل طعامُه.

[۱۳] وقال صلى الله عليه وسلم: '' إذا اجتمع داعيان فأجب أقر بهما باباً، وإن سبق أحدهما فأجب الذى سبق''

أقول: لما تعارضَا طُلب الترجيحُ، وذلك إما بالسَّبْقِ، أو بقُرْبه.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: تَبَارَى الرجلان: باہم ٹکرانا۔ مقابلہ کرنا۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنا۔

باب —— ۵

وہ عورتیں جن سے نکاح حرام ہے

جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کا تذکرہ درج ذیل نصوص میں ہے:

۱ — ﴿وَلاَتَنْكِحُوْا مَانَكَحَ آبَاؤُكُمْ﴾ سے ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ تک یعنی سورۃ النساء آیات ۲۲-۲۵

۲ — ﴿الزَّانِىْ لاَيَنْكِحُ إِلاَّ زَانِيَةً﴾ آخر تک۔ یعنی سورۃ النور آیت تین۔

۳ —— حضرت غَیلان ثقفی رضی اللہ عنہ کی روایت: جب وہ مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس بیویاں تھیں۔ وہ سب ان کے ساتھ اسلام لائیں۔ نبی ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ ''چار رکھ لو، باقی جدا کر دو'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۶)

۴— نبی ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”کسی عورت سے اس کی پھوپی پر نکاح نہ کیا جائے، اور نہ اس کی خالہ پر“ (مسلم شریف ۱۹۱:۹ کتاب النکاح باب تحریم الجمع إلخ، مشکوٰۃ حدیث ۳۱۶۰)

ان آیات میں یعنی سورۃ النساء کی آیت ۲۳ میں جن محرمات کا بیان ہے: ان کی تحریم اہل جاہلیت میں شائع ذائع اور مسلّم تھی۔ لوگ اس کو چھوڑنے کے روادار نہیں تھے۔ وہ ان میں طبقۃً عن طبقۃٍ متوارث چلی آرہی تھی یعنی وہ شریعت اسماعیلی کے احکام تھے۔ اور وہ تحریم ان کے دلوں میں ایسی جمی ہوئی تھی کہ جب تک وہ پارہ پارہ نہ ہوجائیں نکل نہیں سکتی تھی۔ اور اس تحریم میں بڑی مصلحتیں تھیں۔ البتہ کچھ باتیں لوگوں نے اصل دین سے سرکشی اور اس پر زیادتی کرتے ہوئے ایجاد کی تھیں۔ جیسے سوتیلی ماں سے نکاح کرنا، اور دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا، پس اللہ عزوجل نے ان کی تحریم حسب سابق باقی رکھی، اور جن احکام میں سستی پیدا ہوگئی تھی ان کی تاکید کی، اور تحریفات کی اصلاح کی۔

﴿ المحرَّمات ﴾

الأصل فيها: قوله تعالى: ﴿وَلَاتَنْكِحُوْا مَانَكَحَ آبَاؤُكُمْ﴾ إلى قوله: ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم: "أَمْسِكْ أربعًا، وفارِقْ سائِرَهُنَّ" وقوله صلى الله عليه وسلم: "لا تُنكح المرأة على عمتها" الحديث. وقوله تعالى: ﴿اَلزَّانِيْ لَايَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً﴾ الآية.

اعلم: أن تحريم المحرَّمات المذكورةِ في هذه الآيات كان أمرًا شائعًا في أهل الجاهلية، مسلَّما عندهم، لايكادون يتركونه، اللّٰهم! إلا أشياءَ يسيرةً، كانوا ابتدعوها من عند أنفسهم بغيًا وعُدوانًا، كنكاح مانكح آباؤهم، والجمع بين الأختين. وكانوا توارثوا تحريمها طبقة عن طبقة، حتى صار لايخرج من قلوبهم إلا أن تَمَزَّعَ، وكان في تحريمها مصالحُ جليلةٌ، فأبقى الله عزّوجلّ أمر المحرمات على ماكان، وسجَّل عليهم فيما كانوا تهاونوا فيه.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: تَمَزَّعَ الشيئُ: بکھرنا۔ پھیلنا۔ ترکیب: جملہ كانوا توارثوا کا عطف جملہ لايكادون پر ہے۔ اور جملہ اللّٰهم إلخ معترضہ ہے۔

☆ ☆ ☆

تحریم کے نو اسباب

پہلا سبب: قرابت قریبہ

تحریم کی پہلی بنیاد: بہت نزدیک کی رشتہ داری ہے۔ اس سبب سے سات رشتے حرام ہوتے ہیں۔ جن کا تذکرہ سورۃ

النساء آیت ۲۳ میں ہے۔ان کا خلاصہ چار اصول ہیں:

۱ــــ مذکر ومؤنث اصول یعنی باپ، دادا، نانا اوپر تک۔اور ماں، دادی، نانی اوپر تک۔أُمَّهات سے یہ سب اصول مراد ہیں۔

۲ــــ مذکر ومؤنث فروع یعنی بیٹا، پوتا، نواسا نیچے تک۔اور بیٹی، پوتی، نواسی نیچے تک۔ بَنَات سے یہ سب فروع مراد ہیں۔

۳ــــ اصلِ قریب (ماں باپ) کی تمام مذکر ومؤنث فروع یعنی بھائی بھتیجے نیچے تک۔اور بہنیں، بھتیجیاں، بھانجیاں نیچے تک أخوات، بنات الأخ اور بنات الأخت سے یہ رشتہ دار مراد ہیں۔

۴ــــ اصلِ بعید (دادا دادی، نانا نانی اوپر تک) کی تمام صُلبی (بلا واسطہ) مذکر ومؤنث اولاد یعنی چچا، ماموں، پھوپی اور خالہ، چاہے وہ پردادا اور پرنانا کی صلبی اولاد ہوں۔عَمّات و خالات سے یہ سب مراد ہیں۔

تحریم کی وجہ ــــ مذکورہ رشتوں کی حرمت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ ــــ مفاسد کا سدّباب مقصود ہے ــــ قریبی رشتہ داروں میں رفاقت اور ہر وقت کا ساتھ ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے پردہ کا التزام ممکن نہیں۔اور جانبین سے فطری اور واقعی حاجتیں ہیں، مصنوعی اور بناوٹی نہیں۔پس اگر ایسے مردوں اور عورتوں میں لالچ منقطع نہیں کی جائے گی، اور رغبت ختم نہیں کی جائے گی تو مفاسد کا سیلاب امنڈ آئے گا۔کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ایک شخص کی اجنبی عورت کے محاسن پر نظر پڑتی ہے تو وہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔اور اس کی خاطر جان جوکھوں میں ڈال دیتا ہے۔پس جن کے ساتھ تنہائی ہوتی ہے، اور وہ ایک دوسرے کی خوبیوں کو شب و روز دیکھتے ہیں، کیا وہاں مفاسد پیدا نہیں ہوں گے؟ اسی فساد کو روکنے کے لئے قرابتِ قریبہ میں نکاح حرام کیا گیا ہے، کیونکہ سلیم المزاج لوگوں کی رغبت حرام کی طرف نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ ــــ عورتوں کو ضررِ عظیم سے بچانا مقصود ہے ــــ اگر محرمات میں رغبت کا دروازہ کھولا جائے گا، اور امید کا دروازہ بند نہیں کیا جائے گا۔اور اس سلسلہ میں بے راہی اختیار کرنے والوں پر سخت نکیر نہیں کی جائے گی، تو دو طرح سے عورتوں کو ضررِ عظیم پہنچے گا:

۱ــــ عورت جس مرد سے نکاح کرنا چاہے گی، اولیاء نہیں کرنے دیں گے۔خود نکاح کرنا چاہیں گے۔کیونکہ ان عورتوں کا معاملہ اولیاء کے ہاتھ میں ہے۔وہی ان کا نکاح کرانے کے ذمہ دار ہیں۔پس عورت کے جذبات پامال ہوں گے۔اور اس کو بھاری نقصان پہنچے گا۔

۲ــــ اگر شوہر عورت کے حقوق ادا نہیں کرتا، تو عورت کی طرف سے اولیاء حقوقِ زوجیت کا مطالبہ کرتے ہیں۔کیونکہ عورت کمزور ہے۔وہ اپنے حق کے لئے نہیں لڑ سکتی۔پس اگر ولی خود شوہر بن جائے گا، اور عورت کی حق تلفی کرے گا، تو عورت کی طرف سے حقوقِ زوجیت کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔اس طرح عورت کو ضررِ عظیم پہنچے گا (یہ وجہ رحمۃ اللہ

۱: ۴۴۲ میں گذر چکی ہے)

اوراس کی نظیر: یتیم لڑکیوں سے نکاح کی ممانعت ہے۔ بخاری شریف (حدیث ۴۵۷۳) میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص کی ولایت میں ایک یتیم لڑکی تھی۔ اوراس کا ایک باغ تھا۔ جس میں یہ لڑکی بھی شریک تھی۔ اس شخص نے خود ہی اس لڑکی سے نکاح کرلیا۔ اوراس کا باغ کا حصہ ہتھیالیا۔ اس پر سورۃ النساء کی آیت تین نازل ہوئی کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے انصاف پر قائم نہیں رہ سکو گے تو تمہارے لئے دوسری عورتیں بہت ہیں۔ ان میں جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو یعنی یتیم لڑکیوں سے نکاح مت کرو۔ یہ ممانعت ان لڑکیوں کو ضرر سے بچانے کے لئے ہے۔

والأصل في التحريم أمور:

منها: جَرَيَانُ العادة بالإصْطِحاب، والارتباط، وعدم إمكان لزوم الستر فيما بينهم، وارتباطِ الحاجات من الجانبين، على الوجه الطبيعي دون الصناعي: فإنه لولم تجر السنة بقطع الطمع عنهن، والإعراض عن الرغبة فيهن، لَهَاجَتْ مفاسدُ لاتُحصى. وأنت ترى الرجلَ يقع بصره على محاسنِ امرأةٍ أجنبيةٍ، فيتولَّه بها، ويقتحم في المهالك لأجلها، فما ظنك فيمن يخلو معها، وينظر إلى محاسنها ليلاً ونهارًا؟!

وأيضًا: لوفُتح بابُ الرغبة فيهن، ولم يُسَدّ، ولم تقم اللائمة عليهم فيه: أفضى ذلك إلى ضرر عظيم عليهن، فإنه سببُ عضلهم إياهن عمن يرغَبْنَ فيه لأنفسهم، فإنه بيدهم أمرهن، وإليهم إنكاحهن، وأن لايكون لهن إن نكحوهن من يطالبهم عنهن حقوق الزوجية، مع شدة احتياجهن إلى من يخاصم عنهن.

ونظيره: ماوقع في اليتامى: كان الأولياءُ يرغبون في مالهن وجمالهن، ولايوفون حقوقَ الزوجية، فنزل: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ الآية. بَيَّنت ذلك عائشةُ رضي الله عنها.

وهذا الارتباط على الوجه الطبيعي واقع بين الرجال والأمهات، والبنات، والأخوات، والعمات، والخالات، وبنات الأخ، وبنات الأخت.

ترجمہ: اورتحریم میں اصل چند امور ہیں: از انجملہ: عادت کا چلنا ہے رفاقت اور ارتباط کے ساتھ۔ اور آپس میں پردہ کا التزام ممکن نہ ہونا ہے۔ اور حاجتوں کا جانبین سے جڑا ہوا ہونا ہے، فطری طور پر، نہ کہ مصنوعی طور پر: پس بیشک شان یہ ہے کہ اگر نہیں چلے گا طریقہ ان عورتوں سے لالچ منقطع کرنے کا، اوران میں رغبت سے روگردانی کا تو بے شمار مفاسد جوش زن

ہونگے۔ اور آپ دیکھتے ہیں ایک شخص کو جس کی نظر اجنبی عورت کی خوبیوں پر پڑتی ہے، پس وہ اس پر فریفتہ ہوجاتا ہے۔ اور اس کی خاطر ہلاکتوں میں گھستا ہے۔ پس آپ کا کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں جو اس عورت کے ساتھ تنہا ہوتا ہے، اور اس کی خوبیوں کو شب وروز دیکھتا ہے؟

اور نیز: اگر محرمات میں رغبت کا دروازہ کھولا جائے گا، اور امید کا دروازہ بند نہیں کیا جائے گا۔ اور لوگوں پر اس سلسلہ میں ملامت برپا نہیں کی جائے گی تو یہ چیز ان عورتوں کے حق میں ضرر عظیم تک پہنچائے گی: (۱) پس بیشک وہ (نکاح کا جواز) ان مردوں کے اپنے لئے روکنے کا سبب ہے ان عورتوں کو اس شخص سے جس میں وہ رغبت کرتی ہیں۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ ان عورتوں کا معاملہ ان مردوں کے اختیار میں ہے۔ اور ان کا نکاح کرانا بھی ان کے اختیار میں ہے (۲) اور یہ کہ نہیں ہوگا اُن عورتوں کے لئے ـــــ اگر وہ خود ان سے نکاح کریں گے ـــــ وہ شخص جو ان مردوں (اولیاء) سے مطالبہ کرے ان عورتوں کی طرف سے حقوقِ زوجیت کا ان عورتوں کے بہت زیادہ محتاج ہونے کے ساتھ ایسے آدمی کی طرف جو ان کی طرف سے مخاصمت کرے ـــــ اور اس کی نظیر: وہ بات ہے جو یتیموں کے بارے میں پیش آئی تھی: سرپرست رغبت کیا کرتے تھے یتیم بچیوں کے مال اور ان کی خوبصورتی میں، اور پورے ادا نہیں کرتے تھے زوجیت کے حقوق۔ پس نازل ہوا...... یہ بات عائشہؓ نے بیان کی ہے ـــــ اور یہ فطری طور پر ارتباط واقع ہے مردوں اور ماؤں، اور بیٹیوں، اور بہنوں، اور پھوپیوں، اور خالاؤں، اور بھتیجیوں اور بھانجیوں کے درمیان یعنی قرابتِ قریبہ کی وجہ سے یہ سات رشتے حرام ہیں۔ انہی میں رفاقت وتعلقات پائے جاتے ہیں۔

ترکیب: **لأنفسهم** متعلق ہے **عضلهم** سے أی منع الأولیاء إیاهن ممن یرغبن فیه، لطمع الأولیاء فیهن لأنفسهم.

دوسرا سبب: رضاعت

تحریم کا دوسرا سبب: رضاعت (دودھ پلانا) ہے۔ رضاعت سے بھی وہ ساتوں رشتے حرام ہوتے ہیں جو نسب سے حرام ہوتے ہیں یعنی دودھ پلانے والی ماں، اور اس کے تمام اصول وفروع۔ اور اس کا شوہر، اور اس کے تمام اصول وفروع۔ اور دونوں کی اصل قریب کی تمام فروع۔ اور دونوں کے اصولِ بعیدہ کی صلبی اولاد۔ اور سورۃ النساء آیت ۲۳ میں جو صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کا ذکر ہے: وہ بطور مثال ہے۔ یہ بات حدیث نے واضح کی ہے۔ فرمایا: ''دودھ پینے سے وہ تمام رشتے حرام ہوتے ہیں، جو ولادت (ناتے) سے حرام ہوتے ہیں'' (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۳۱۶۱)

اور حرمتِ رضاعت کی تین وجوہ ہیں:

پہلی وجہ ـــــ علاقۂ جزئیت وبعضیت ـــــ جس عورت نے دودھ پلایا ہے وہ ماں کے مشابہ ہے۔ کیونکہ اس کے دودھ سے بچے کے جسم کے اخلاط اور اس کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ماں نے بچہ کو پیٹ میں رکھ کر پالا ہے۔ اور انا نے باہر بچہ پر دودھ بہایا ہے۔ اور بچہ کی شروع زندگی میں اس کی حیات کا سامان کیا ہے۔ پس دونوں کے جسم کے اجزاء

سے بچہ کا جسم تیار ہوتا ہے۔ یہی علاقۂ جزئیت وبعضیت ہے۔ اور جزء سے انتفاع حرام ہے۔ اس لئے رضاعت سے حرمت پیدا ہوتی ہے۔ پس انا بھی دوسرے درجہ کی ماں ہے۔ اور اس کی اولاد دوسرے درجہ کے بھائی بہن ہیں۔ اور یہی حال دوسرے رشتوں کا ہے۔

دوسری وجہ ــــ ماں جیسی بے تکلفی ــــ دودھ پلانے والی بچے کی پرورش میں مشقت برداشت کرتی ہے۔ اور بچے کے ذمے اس کے حقوق ثابت ہوتے ہیں[1] اور انا بچپن میں بچہ کے جسم کا ہر جزء دیکھ چکی ہے۔ غرض اس سے ماں جیسی بے تکلفی رہ چکی ہے۔ پس ایسی عورت کو نکاح میں لانا اور اس کو جورو بنانا فطرتِ سلیمہ کے خلاف ہے۔ بعض چوپایوں تک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ماں یا دودھ پلانے والی کی طرف جنسی التفات نہیں رکھتے، انسان تو انسان ہے؟ پس اس کے لئے یہ بات کیسے روا ہوسکتی ہے کہ اپنی انا یا اس کے اصول وفروع کو اپنی جورو بنائے؟

. تیسری وجہ ــــ عربوں کے تصورات کا لحاظ ــــ عرب اپنی اولاد کو قبائل میں دودھ پلواتے تھے۔ بچہ ان میں جوان ہوتا تھا۔ اور محارم کی طرح ان کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ چنانچہ عربوں کے تصورات میں دودھ پلانا بھی نسب ہی کی طرح کا رشتہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ ان تصورات کا لحاظ کیا جائے۔ اور رضاعت کو نسب پر محمول کیا جائے یعنی اس کو بھی بحکم نسب رکھا جائے۔ حدیث میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا: ''دودھ پینے سے وہ سب رشتے حرام ہوتے ہیں جو ولادت سے حرام ہوتے ہیں'' یعنی رضاعت بحکم ولادت ہے۔

ومنها : الرضاعة: فإن التى ارضعتْ تُشْبِهُ الأمَّ، من حيث أنها سببُ اجتماع أمْشاجِ بِنْيته وقيامِ هَيْكَلِهِ، غير أن الأم جمعت خِلْقَته فى بطنها، وهذه دَرَّتْ عليه سَدَّ رَمَقِهِ فى أول نشأته، فهى أم بعد الأم، وأولادُها إخوة بعد الإخوة.

وقد قاستْ فى حِضانته ما قاست، وقد ثبت فى ذمته من حقوقها ما ثبت، وقدرأتْ منه فى صِغَره ما رأت، فيكون تملُّكُها والوثوبُ عليها مما تَمُجُّهُ الفطرةُ السليمةُ. وكم من بهيمة عجماءَ لاتلتفت إلى أمها أو إلى مرضعتها هذه اللفتة، فما ظنك بالرجال؟

وأيضًا : فإن العرب كانوا يسترضعون أولادَهم فى حى من الأحياء، فَيَشِبُّ فيهم الوليدُ، ويخالِطُهم كمخالطة المحارم، ويكون عندهم للرضاعة لُحمةٌ كلحمة النسب: فوجب أن يُحمل على النسب، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "يَحْرُمُ من الرَّضاعة ما يحرُمُ من الوِلادة"

[1] حدیث میں ہے: ایک شخص نے پوچھا: مایُذْهِب عنی مَذَمَّةَ الرَّضاع ؟ یعنی رضائی ماں کا حق کس طرح ادا ہوسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ایک بُردہ سے خواہ غلام ہو یا باندی'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۴)

ترجمہ: اور از انجملہ: رضاعت ہے۔ پس بیشک وہ عورت جس نے دودھ پلایا ہے: وہ ماں کے مشابہ ہے۔ اس طرح کہ دودھ پلانے والی بچے کے جسم کے اخلاط کے اجتماع کا، اور اس کے ڈھانچے کے وجود پذیر ہونے کا سبب ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ ماں نے اس کی بناوٹ کو اپنے پیٹ میں جمع کیا ہے۔ اور انا نے بچہ پر دودھ بہایا ہے، زندگی باقی رکھنے کے بقدر، اس کی پیدائش کے شروع میں۔ پس وہ ماں کے بعد دوسری ماں ہے۔ اور اس کی اولاد: بھائی بہنوں کے بعد دوسرے بھائی بہن ہیں —— (دوسری وجہ) اور تحقیق مشقت برداشت کی ہے اس نے بچہ کی پرورش میں وہ جو برداشت کی ہے۔ اور تحقیق بچے کے ذمے اس کے حقوق ثابت ہوئے ہیں: وہ جو ثابت ہوئے ہیں۔ اور تحقیق دیکھا ہے اس نے بچے سے اس کے بچپن میں: وہ جو دیکھا ہے۔ پس اس کا مالک بننا، اور اس پر کودنا ان چیزوں میں سے ہے جس کو فطرتِ سلیمہ تھوک دیتی ہے۔ اور کتنے ہی بے زبان چوپایے ہیں جو اپنی ماں کی طرف یا ان کو دودھ پلانے والی کی طرف اس نوعیت کا جنسی التفات نہیں کرتے۔ پس کیا خیال ہے تمہارا مردوں (انسانوں) کے بارے میں؟ —— اور نیز: پس بیشک عرب اپنی اولاد کو دودھ پلوایا کرتے تھے قبائل میں سے کسی قبیلہ میں۔ پس بچہ ان میں جوان ہوتا تھا، اور ان سے میل جول رکھتا تھا محارم کے ساتھ میل جول رکھنے کی طرح۔ اور عربوں کے نزدیک دودھ پلانے کے لئے ایک رشتہ تھا نسب کے رشتہ کی طرح، پس ضروری ہوا کہ وہ نسب پر محمول کیا جائے۔ اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:......

لغت: اَمْشَاج: مَشِج یا مَشِیج کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں: دو ملی ہوئی چیزیں۔ مَشَجَ (ن) مَشْجًا: ملانا، مخلوط کرنا۔ یہاں اَمْشَاجِ البِنْیَۃ سے مراد: جسم کی بناوٹ ہے۔ اور قیام ھیکلہ: اس کا [illegible] ہے۔

رضاعت میں دو چیزیں: مقدار اور مدت ضروری ہیں

رضاعت کی مقدار میں اختلاف: امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک: مطلق رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ دودھ کی کوئی خاص مقدار ضروری نہیں۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک: پانچ مرتبہ شکم سیر ہو کر دودھ پینا ضروری ہے۔ اس سے کم میں حرمت ثابت نہیں ہوتی۔

اور مدتِ رضاعت میں بھی اختلاف ہے: امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: ڈھائی سال کی عمر تک دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اور باقی ائمہ کے نزدیک: دو سال کی عمر تک دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ثابت نہیں ہوتی۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جب دودھ پینا سبب تحریم اس وجہ سے تھا کہ دودھ پلانے والی عورت ماں کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ اس کا دودھ بچہ کے جسم کی بناوٹ اور اس کے ڈھانچے کی ساخت کا سبب ہے۔ اس لئے رضاعت میں دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے:

پہلی بات —— بچہ دودھ کی اتنی مقدار پیئے جس سے علاقۂ جزئیت پیدا ہو۔ برائے نام دودھ پینا کافی نہیں۔ اور یہ

مقدار پانچ مرتبہ واضح طور پر دودھ پینا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قرآن کریم میں دس مرتبہ واضح طور پر یعنی شکم سیر ہوکر دودھ پینے سے حرمت کا حکم نازل ہوا تھا۔ پھر وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ اور پانچ مرتبہ واضح طور پر دودھ پینے سے حرمت کا حکم آیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو وہ حکم قرآن میں پڑھا جاتا تھا (مشکوۃ حدیث ۳۱۶۷) (امام نووی رحمہ اللہ نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ پانچ مرتبہ دودھ پینے کی آیت کی تلاوت منسوخ ہوگئی تھی، مگر حکم باقی تھا۔ اور چونکہ یہ نسخ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخر میں ہوا تھا، اس لئے جن لوگوں کو نسخ کا علم نہیں تھا، وہ اس کی تلاوت کرتے تھے۔ مسلم شریف ۱۰:۲۹ مصری کتاب الرضاع)

مقدار مقرر کرنے کی وجہ: بچے کے جسم کی نشو ونما زیادہ مقدار میں دودھ پینے سے ہوتی ہے۔ تھوڑا دودھ پینے سے نہیں ہوتی۔ اس لئے قانون سازی میں ضروری ہوا کہ قلیل وکثیر کی حد بندی کی جائے، تاکہ اشتباہ کے وقت اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

دس سے تقدیر کی وجہ: ایک سے نو تک اکائیاں ہیں۔ اور دس پہلی دہائی ہے۔ پس دس: اکائیوں سے آگے بڑھنے کی پہلی حد ہے۔ اور دس کے ذریعہ دہائیوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ دس میں ایک ملانے سے گیارہ بنتے ہیں۔ اور دو دہائیاں مل کر بیس بنتی ہیں جو دوسری دہائی ہے۔ نیز دس جمع قلت کی آخری حد، اور جمع کثرت کی ابتدائی حد ہے، اس لئے قابل لحاظ کثرت کی تعیین کے لئے دس کا عدد نہایت موزون ہے۔ اور اتنی مقدار بچے کے بدن میں اثر انداز بھی ہوتی ہے۔

پانچ سے نسخ کی وجہ: پھر احتیاطاً دس کو پانچ سے منسوخ کیا گیا۔ کیونکہ جب بچہ پانچ مرتبہ شکم سیر ہوکر دودھ پیتا ہے، تو اس کے بدن اور چہرے پر رونق اور تازگی ظاہر ہوتی ہے۔ اور اگر دودھ میں کمی رہتی ہے اور انّا کا دودھ کم ہوتا ہے تو بچہ کا جسم مرجھاتا اور لاغر ہوتا ہے —— اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ دودھ بچہ کے جسم کی بڑھوتری اور اس کے ڈھانچے کی نشو ونما کا سبب ہے —— اور پانچ مرتبہ سے کم دودھ پینے کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ چنانچہ حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ''ایک بار دودھ پینا اور دو بار پینا حرام نہیں کرتا'' اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے کہ ''ایک بار پستان چوسنا اور دو بار چوسنا حرام نہیں کرتا'' اور حضرت ام الفضل کی دوسری روایت میں ہے کہ: ''ایک بار پستان بچہ کے منہ میں دینا اور دو بار دینا حرام نہیں کرتا'' (یہ سب مسلم کی روایات ہیں۔ مشکوۃ حدیث ۳۱۶۴ تا ۳۱۶۶)

مطلق دودھ پینے سے حرمت کی وجہ: رضاعت کی اہمیت ظاہر کرنا، اور اس کو مؤثر بالخاصہ بنانا ہے۔ اور ان تمام احکام میں جن کی بنائے حکم معلوم نہ ہو یہی سنت الٰہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے دودھ میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اس کا ایک قطرہ بھی جزئیت پیدا کرتا ہے۔ اور یہ بات ہر اس حکم میں کہنی چاہئے جس کی وجہ سرسری نظر میں سمجھ میں نہ آئے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۳:۲۲۲)

دوسری بات —— دودھ پینا مدت رضاعت میں ہو، جبکہ دودھ سے بدن کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ورنہ بعد میں تو وہ اور

غذاؤں کی طرح ایک غذا ہے، جیسے جوان روٹی کھاتا ہے، اور اس سے اس کے بدن کی نشوونما ہوتی ہے، پس جس زمانہ میں بدن کی ساخت دودھ سے ہوتی ہے اس زمانہ کی رضاعت کا اعتبار ہے۔ درج ذیل دو حدیثوں میں اس کی صراحت ہے:

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دودھ پینا وہی معتبر ہے جو شدت بھوک سے ہو'' یعنی جو بھوک کو مٹائے۔ اور شیر خوار کے لئے کھانے کے قائم مقام ہو (مشکوۃ حدیث ۳۱۶۸)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہی دودھ پینا حرام کرتا ہے جو انتڑیوں کو چیرے، اور عورت کا دودھ ہو، اور دودھ چھڑانے کی مدت سے پہلے ہو'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۳)

ولما كان الرضاع: إنما صار سببا للتحريم لمعنى المشابهة بالأم، في كونها سببًا لقيامِ بِنْيَةِ المولود، وتركيبِ هَيْكَلِه: وجب أن يُعتبر في الإرضاع شيئان:

أحدهما: القدرُ الذي يتحقق به هذا المعنى، فكان فيما أُنزل من القرآن عشرُ رَضَعاتٍ معلوماتٍ يُحَرِّمْنَ، ثم نُسِخْنَ بخمسٍ معلومات، فتوفى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وهن مما يُقرأ من القرآن.

أما التقدير: فلأنه لما كان المعنى موجودًا في الكثير، دون القليل، وجب عند التشريع أن يُضرب بينهما حدٌّ يُرجع إليه عند الاشتباه.

وأما التقدير بعشر: فلأن العشر أولُ حدِّ مجاوزة العدد من الآحاد، وتَدَرُّ به في العشرات، وأولُ حدٍّ يُستعمل فيه جمع الكثرة، ولا يُستعمل فيه جمعُ القلة، فكان نصابا صالحا لضبط الكثرة المعتدِّ بها، المؤثرةِ في بدن الإنسان.

أما النسخ بخمس: فللاحتياط: لأن الطفل إذا أُرضع خمسَ رَضَعاتٍ غزيراتٍ يظهر الرونقُ والنضارةُ على وجهه وبدنه، وإذا أصابه عَوَزُ اللبن في هذه الرضعات، وكانت المرضِعُ غيرَ ذاتِ دَرٍّ، ظهر على بدنه القُحُولُ والهُزالُ — وهذه آيةُ أنها سببُ التنمية وقيام الهيكل — ومادون ذلك لايظهر أثره؛ قال صلى الله عليه وسلم: " لاتُحَرِّمُ الرَّضْعة والرضعتان، ولا تحرم المَصَّةُ والمصتان، ولا تحرم الإملاجة والإملاجتان"

وأما على قول من قال: يُحَرِّم الكثير والقليل: فالسببُ تعظيمُ أمر الرضاع وجعلِه كالمؤثر بالخاصية، كسنة الله تعالى في سائر ما لا يُدْرَكُ مناطُ حكمِه.

والثاني: أن يكون الرضاع في أول قيام الهيكل، وتشبُّحِ صورةِ الولد، وإلا فهو غذاء بمنزلة سائر الأغذية الكائنة بعد التشبُّح وقيام الهيكل، كالشاب يأكل الخبز؛ قال صلى الله عليه

وسلم: " إن الرضاعة من المَجَاعة" وقال صلى الله عليه وسلم: " لا يُحَرِّمُ من الرضاع إلا ما فَتَقَ الأمعاءَ، في الثَّدْيِ، وكان قبل الفطام"

ترجمہ: اور جب دودھ پینا تحریم کا سبب تھا ماں کے ساتھ مشابہت کی علت وجہ، دودھ پلانے والی کے سبب ہونے میں نومولود کی باڈی اور اس کے ڈھانچے کی ترکیب کے وجود کے لئے یعنی اس کے جسم کی نشو ونما کے لئے تو ضروری ہوا کہ دودھ پلانے میں دو باتوں کا لحاظ کیا جائے:

ان میں سے ایک: دودھ کی وہ مقدار ہے جس کے ذریعہ یہ علت پائی جائے یعنی مشابہت متحقق ہو، چنانچہ اس کے سلسلہ میں جو حکم قرآن میں نازل کیا گیا: دس معلوم رضاعتیں حرام کرتی ہیں۔ پھر وہ پانچ معلوم رضاعتوں کے ذریعہ منسوخ کی گئیں۔ پس وفات پائی رسول اللہ ﷺ نے درانحالیکہ وہ پانچ رضاعتیں قرآن میں پڑھی جاتی تھیں —— رہا اندازہ مقرر کرنا: پس اس لئے کہ جب وہ علت (مشابہت) کثیر میں موجود تھی، قلیل میں نہیں تھی، تو قانون سازی کے وقت ضروری ہوا کہ قلیل وکثیر کے درمیان کوئی حد مقرر کی جائے۔ جس کی طرف بوقتِ اشتباہ رجوع کیا جائے۔

اور رہی دس کے ذریعہ تقدیر: پس دس آحاد سے عدد کے آگے بڑھنے کی پہلی حد ہے یعنی دس سے دہائی شروع ہوتی ہے۔ اور دس کے ذریعہ دہائیوں میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ اور دس پہلی حد ہے جس میں جمع کثرت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس میں جمع قلت کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ پس دس کافی مقدار ہے اس کثرت کی تعیین کے لئے جس کا شریعت میں لحاظ کیا گیا ہے، جو انسان کے بدن میں اثر انداز ہونے والی ہے۔

رہا پانچ کے ذریعہ نسخ: تو وہ احتیاط کی بنا پر ہے: اس لئے کہ جب بچہ دودھ پلایا جاتا ہے پانچ بھرپور رضاعتیں تو بچے کے بدن اور اس کے چہرے پر رونق اور تازگی ظاہر ہوتی ہے۔ اور جب بچے کو ان رضاعتوں میں کمی پہنچتی ہے، اور انّا زیادہ دودھ والی نہیں ہوتی تو بچے کے بدن پر سوکھا پن اور لاغری ظاہر ہوتی ہے —— اور یہ اس بات کی نشانی ہے کہ رضاعت بڑھوتری اور ڈھانچہ کے قیام کا سبب ہے — اور اس سے کم رضاعتوں کا اثر ظاہر نہیں ہوتا (اس کے بعد تین حدیثیں ہیں، جن کو ایک ساتھ ذکر کر دیا ہے)

اور رہا اس شخص کے قول پر جس نے کہا کہ قلیل وکثیر حرام کرتا ہے: تو اس کی وجہ رضاعت کے معاملہ کو بڑھانا اور اس کو مؤثر بالخاصیت چیزوں کی طرح بنانا ہے۔ جیسے اللہ کی سنت ہے ان تمام چیزوں میں جن کے حکم کی علت نہیں جانی جاتی۔

اور دوسری بات: یہ ہے کہ دودھ پلانا ڈھانچے کے قیام اور بچے کی صورت کے متمثّل ہونے کے آغاز میں ہو، ورنہ تو دودھ ایک غذا ہے دوسری غذاؤں کی طرح جو ڈھانچے کے تمثّل اور قیام کے بعد ہونے والی ہے۔ جیسے جوان روٹی کھاتا ہے (اس کے بعد دو حدیثیں ہیں)

لغات: دَرَّ (ن،ض) دَرًّا: دودھ کا بہنا۔ تَدِرُّ به: اس کے ذریعہ اضافہ کیا جاتا ہے..... قَحِلَ (س) الشیئُ: خشک ہونا

الفُحول: خشکی، سوکھا پن۔

استدراک: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ جوفرمایا ہے کہ ''دس پہلی حد ہے جس میں جمع کثرت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اوراس میں جمع قلت کا استعمال نہیں کیا جاتا'' یہ بات تحقیق طلب ہے۔ نحو وصرف کی کتابوں میں اس کے خلاف ہے۔ پنج گنج میں ہے: ''وجمع تکسیر بردو نوع است: جمع قلیل: وآن از سہ تا دہ باشد..... وجمع کثیر: وآن زیادہ از دہ باشد'' ——— اور شرح جامی (ص۲۸۱) میں ہے: جمع القلة: وهو ما يطلق على ثلاثة وعشرة وما بينهما...... جمع كثرة: يطلق على ما فوق العشرة إلى مالانهاية له ——— اور پہلے یہ بات آئی ہے کہ ارشاد پاک: ﴿أَنْ تَبْتَغُوْا بِأَمْوَالِكُمْ﴾ میں اموال جمع قلت ہے، اور حدیث میں اس کی وضاحت دس درہم سے آئی ہے۔

پس مناسب یہ تھا کہ شاہ صاحب فرماتے: دس جمع قلت کی آخری حد ہے، اس کے بعد جمع کثرت شروع ہوتی ہے۔ پس دس میں کثرت کا شائبہ ہے، کیونکہ وہ جمع کثرت سے لگا ہوا عدد ہے، اس لئے کثرت کا انضباط دس کے ذریعہ کیا گیا ——— تقریر میں اسی انداز کی بات کہی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

تیسرا سبب: قطع رحمی

سورۃ النساء آیت ۲۳ میں دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہی حکم ایسی دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنے کا ہے: جن میں سے کسی کو بھی مرد فرض کیا جائے تو دوسری سے اس کا نکاح حرام ہو۔ جیسے پھوپی بھتیجی اور خالہ بھانجی۔ ان میں سے اگر ایک کو مرد فرض کیا جائے گا تو چچا بھتیجی یا پھوپی بھتیجا اور ماموں بھانجی یا خالہ بھانجا ہوں گے، جن میں نکاح حرام ہے۔ اور اس پر تنبیہ حدیث میں ہے: لايجمع بين المرأة وعمتها، ولا بين المرأة وخالتها: عورت اور اس کی پھوپی اور عورت اور اس کی خالہ کے درمیان جمع نہ کیا جائے (مشکوۃ حدیث ۳۱۶۰)

اور حرمت کی وجہ قریبی رشتہ داروں میں قطع رحمی سے بچنا ہے۔ کیونکہ سوکنیں ایک دوسرے پر جلتی ہیں۔ اور بغض وحسد کی آگ دونوں کے رشتہ داروں تک پہنچتی ہے۔ اور رشتہ داروں میں بغض وحسد نہایت بُرا اور سخت قبیح ہے۔ حضرت عطاء بن ابی رباح اور حضرت حسن بصری رحمہما اللہ تو قطع رحمی اور آپسی بگاڑ کی وجہ سے دو چچازاد بہنوں کو بھی نکاح میں جمع کرنے کو ناپسند کرتے تھے (مصنف ابن ابی شیبہ ۴: ۲۲۷) پھر دو بہنوں وغیرہ کو جمع کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

اور نبی ﷺ نے اسی اصل سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ابوجہل کی لڑکی سے نکاح کی اجازت نہیں دی تھی (بخاری حدیث ۴۷۲۹) کیونکہ سوکن کی طرف سے حسد ہوگا اور شوہر اس کو دوسری پر ترجیح دے گا، تو اندیشہ ہے کہ شوہر کو دوسری بیوی اور اس کے خاندان سے بغض ونفرت ہوجائے۔ اور نبی سے نفرت — اگرچہ کسی دنیوی معاملہ میں ہو — کفر تک پہنچاتی ہے۔

ومنها :الاحترازُ عن قطع الرحِمِ بين الأقارب : فإن الضرَّتَين تتحاسدان، وينجر البغضُ إلى أقرب الناس منهما، والحسدُ بين الأقارب أخنَعُ وأشنَعُ، وقد كره جماعاتٌ من السلفِ ابنَتَيْ عمٍ لذلك، فما ظنك بامرأتين: أيهما فُرِض ذكرًا حُرِّمَتْ عليه الأخرى، كالأختين، والمرأةِ وعمتِها، والمرأةِ وخالتها؟

وقد اعتبر النبي صلى الله عليه وسلم هذا الأصلَ في تحريم الجمع بين بنتِ النبي صلى الله عليه وسلم وبنتِ غيره، فإن الحسد من الضرَّة، واستئثارَها من الزوج، كثيرًا مَّا ينجرَّان إلى بغضِها وبغض أهلها، وبغضُ النبي صلى الله عليه وسلم — ولو بحسب الأمور المعاشية — يُفضي إلى الكفر؛ والأصلُ في هذا: الأختان، ونبَّهَ النبي صلى الله عليه وسلم بقوله:" لايُجمع بين المرأة وعمتِها" الحديثَ على وجه المسألة.

ترجمہ: اوراز انجملہ :رشتہ داروں کے درمیان قطع رحمی سے بچنا ہے: پس بیشک دوسوکنیں ایک دوسرے پر جلتی ہیں۔ اور بغض گھسٹتا ہے دونوں سے قریب ترین لوگوں کی طرف۔ اور رشتہ داروں کے درمیان حسد نہایت بُرا اور نہایت قبیح ہے۔ اور سلف میں سے کئی لوگوں نے دو چچازاد بہنوں کو اسی وجہ سے ناپسند کیا ہے۔ پس آپ کا کیا خیال ہے ایسی دوعورتوں کے بارے میں کہ جونسی ان میں سے مرد فرض کی جائے تو اس پر دوسری حرام قرار دی جائے، جیسے دو بہنیں، اور عورت اور اس کی پھوپی، اور عورت اور اس کی خالہ؟

اوراعتبار کیا ہے اس اصل کا نبی ﷺ نے: نبی ﷺ کی صاحبزادی اور آپؐ کے علاوہ کی لڑکی کے درمیان جمع کرنے کے حرام ٹھہرانے میں۔ اس لئے کہ سوکن کی طرف سے حسد، اور شوہر کا اس کو ترجیح دینا: بارہا یہ دو باتیں گھسٹتی ہیں عورت سے اور اس کے خاندان سے بغض کی طرف۔ اور نبی ﷺ سے بغض — اگرچہ وہ دنیوی معاملات کے اعتبار سے ہو — کفر تک پہنچاتا ہے۔

اور بنیاد اس مسئلہ میں دو بہنیں ہیں۔ اور نبی ﷺ نے آگاہ کیا ہے، اپنے ارشاد: ''عورت اور اس کی پھوپی کے درمیان جمع نہ کیا جائے'' الی آخرہ سے مسئلہ کی وجہ پر (تقریر میں یہ آخری حصہ شروع میں لیا گیا ہے)

لغت: خَنَعَ فلان: برا کام کر کے شرمانا، اور سر نیچا کرنا۔

☆ ☆ ☆

چوتھا سبب: مصاہرت

مصاہرت: خسر داماد ہونے سے چار رشتے حرام ہوتے ہیں:

۱— شوہر کے نسبی یا رضاعی اصول — باپ، دادا، نانا — عورت پر حرام ہوتے ہیں۔ عورت اصولِ شوہر کے لئے

بیٹی کے مانند ہوجاتی ہے۔

۲ــــ شوہر کی نسبی یا رضاعی فروع ــــ بیٹا، پوتا، نواسا ــــ عورت پر حرام ہوتی ہیں۔ عورت فروع شوہر کے لئے ماں کے مانند ہوجاتی ہے۔

۳ــــ بیوی کے نسبی یا رضاعی اصول ــــ ماں، دادی، نانی ــــ شوہر پر حرام ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں شوہر کے لئے ماں کے مانند ہوجاتی ہیں۔

۴ــــ بیوی کی نسبی یا رضاعی فروع ــــ لڑکی، لڑکے کی لڑکی، لڑکی کی لڑکی ــــ شوہر پر حرام ہوتی ہیں۔ یہ عورتیں شوہر کے لئے بیٹی کے مانند ہوجاتی ہیں۔

پہلی تین صورتوں میں حرمت نفس عقد سے ثابت ہوتی ہے۔ اور آخری صورت میں بیوی سے صحبت پر موقوف رہتی ہے۔ اور یہ حرمت زوجین کی اصل قریب کی فروع یا اصولِ بعیدہ کی صلبی فروع میں ثابت نہیں ہوتی۔

اور حرمتِ مصاہرت کی دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت ــــ اگر لوگوں میں یہ دستور چل پڑے کہ ماں کو اپنی بیٹی کے خاوند سے، اور مردوں کو اپنے بیٹوں کی بیویوں سے اور اپنی بیویوں کی بیٹیوں سے رغبت ہو یعنی ان سے نکاح جائز ہو تو اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اس تعلق کو توڑنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور جو آڑے آئے گا اس کو قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور زمین فساد سے بھر جائے گی۔ اگر آپ قدمائے فارس کے اس سلسلہ کے قصے سنیں یا اپنے زمانہ کی ان قوموں کے احوال کا جائزہ لیں مثلاً یورپ و امریکہ کے احوال پر نظر ڈالیں جو اس سنتِ راشدہ کے پابند نہیں تو آپ بھیانک واقعات اور مہالک و مظالم کا مشاہدہ کریں گے۔

دوسری حکمت ــــ سسرالی اور دامادی رشتہ داری میں صحبت و رفاقت لازمی چیز ہے۔ پردہ نہایت دشوار ہے، تحاسد وتباغض بری چیز ہے۔ اور جانبین سے ضرورتیں ٹکراتی ہیں یعنی کبھی ساس کو داماد سے حاجت ہوتی ہے، کبھی داماد کو ساس سے۔ پس حرمتِ مصاہرت کا معاملہ یا تو ماں بیٹے جیسا ہے یعنی علاقۂ جزئیت کی بنا پر حرمت ہے یا دو بہنوں جیسا معاملہ ہے یعنی قطع رحمی سے بچنے کے لئے حرمت ہے۔

فائدہ: پہلی علت ہی درست ہے۔ حرمت مصاہرت کا اصل سبب زوجین کے درمیان پیدا ہونے والا بچہ ہے۔ جو طرفین کا جزء ہے۔ دونوں کے نطفہ سے اس کا جسم بنا ہے۔ اور جزء کا جزء: جزء ہوتا ہے۔ پس بچہ کا باپ اس کی ماں کا جزء ہوگیا۔ اور بچہ کی ماں اس کے باپ کا جزء ہوگئی۔ پھر یہ جزئیت دونوں کے اصول وفروع کی طرف متعدی ہوتی ہے تو **بعضهم من بعض** ہوگئے۔ اسی وجہ سے یہ حرمت زوجین کی اصل قریب یا اصلِ بعید کی فروع میں نہیں پائی جاتی۔ تفصیل کے لئے میرا رسالہ ''حرمت مصاہرت'' دیکھیں۔

ومنها: المصاهرة: فإنه لو جرت السنةُ بين الناس أن يكون للأم رغبةٌ في زوج بنتها،

وللرجال في حلائل الأبناء، وبناتِ نسائهم، لأفضى إلى السعي في فك ذلك الربط، أو قتلِ من يَشُحُّ به. وإن أنت تَسَمَّعْتَ إلى قَصَصِ قدماء الفارسيين، واستقرأتَ حالَ أهلِ زمانك، من الذين لم يتقيدوا بهذه السنة الراشدة: وجدتَ أمورًا عظاما، ومهالكَ ومظالمَ لاتُحصى.

وأيضًا: فإن الاصطحابَ في هذه القرابة لازمٌ، والسترُ متعذرٌ، والتحاسدُ شنيعٌ، والحاجات من الجانبين متنازعة، فكان أمرها بمنزلة الأمهات والبنات، أو بمنزلة الأختين.

ترجمہ: اور از انجملہ: مصاہرت ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ اگر لوگوں میں طریقہ رائج ہوجائے کہ ماں کے لئے اپنی بیٹی کے شوہر (داماد) میں رغبت ہو، اور مردوں کے لئے اپنے بیٹوں کی بیویوں (بہوؤں) میں، اور اپنی بیویوں کی بیٹیوں (ربیباؤں) میں، تو یہ چیز پہنچائے گی اس تعلق کو ختم کرنے کی کوشش تک، یا اس شخص کے قتل تک جو اس ربط میں بخیلی کرتا ہے یعنی توڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اور اگر آپ بغور سنیں قدماء فارس کے واقعات، اور اپنے زمانہ کے اُن لوگوں کے حالات کا جائزہ لیں جو اس راہِ راست کے پابند نہیں، تو آپ سنگین معاملات اور بے شمار مہالک ومظالم پائیں گے —— اور نیز: پس بیشک اس رشتہ داری میں رفاقت لازمی ہے۔ اور پردہ نہایت دشوار ہے۔ اور ایک دوسرے پر حسد کرنا برا ہے۔ اور جانبین سے ضرورتیں ٹکراتی ہیں —— پس مصاہرت کا معاملہ: ماؤں اور بیٹیوں جیسا ہے یا دو بہنوں جیسا ہے۔

لغات: شَحَّ به: کوئی چیز دینے میں کنجوسی کرنا...... تَسَمَّعَه وله وإليه: غور سے سننا۔

☆ ☆ ☆

پانچواں سبب: چار سے زیادہ بیویاں

شریعت نے نکاح کے لئے چار کا عدد مقرر کیا ہے۔ اور اس سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس سے زیادہ بیویوں کے ساتھ ازدواجی معاملات میں حسن سلوک ممکن نہیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ لوگ عورتوں کی خوبصورتی پر للچاتے ہیں۔ اور بہت سے نکاح کر لیتے ہیں۔ پھر لاڈلی کو اپنا لیتے ہیں اور باقیوں کو لٹکا دیتے ہیں۔ وہ نہ شوہر والی پسندیدہ ہوتی ہیں کہ ان کی آنکھ ٹھنڈی ہو، نہ بے شوہر کی ہوتی ہیں کہ ان کا معاملہ ان کے ہاتھ میں ہو۔ عورتوں کو اسی ضرر عظیم سے بچانے کے لئے تعداد مقرر کی ہے۔

اور یہ تعداد اس لئے مقرر کی ہے کہ اس میں مرد اور عورت دونوں کا فائدہ ہے:

عورت کا فائدہ: عورتوں کا مزاج مرطوب ہوتا ہے۔ اس لئے جلدی جلدی شوہر سے ملنے کے لئے ان کی طبیعت میں ابھار پیدا نہیں ہوتا۔ وہ وقفہ کے بعد ہی اس کی خواہش کرتی ہیں۔ اور چار بیویوں والا ہر بیوی کی طرف تین راتوں کے وقفہ کے بعد لوٹ سکتا ہے۔ اور تین جمع کی ابتدائی حد ہے۔ اقل جمع تین ہیں۔ اور اس کے بعد کثرت کی زیادتی ہے۔ جس

کی کوئی حد نہیں۔اس طرح ہر عورت کا نمبر بہت دنوں کے بعد آتا ہے۔جس سے اس کا لطف دوبالا ہوتا ہے۔اور تین دن کا وقفہ بہت لمبا وقفہ بھی نہیں کہ عورت کو انتظار کی گھڑیاں گننی پڑیں۔

اور شوہر کا فائدہ: اس میں یہ ہے کہ باری باری بیویوں کے پاس جائے گا۔ ہر دن ایک ہی ذائقہ لطف نہیں دیتا۔اور تین سے کم میں باری مقرر کرنے کا فائدہ ظاہر نہیں ہوتا یعنی نیا لطف حاصل نہیں ہوتا۔نہ اس صورت میں ''شب باشی'' اور ''رات کے قیام'' کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔سلف سے مروی ہے: صاحبُ الواحدة في بَلاءٍ وعَناء: إن مرِضتْ مرِض معها، وإن حاضتْ حاض معها. وصاحب الاثنتين بين جمرتَين. وصاحبُ الثلاثة ضيفٌ كلَّ ليلة. وصاحبُ الأربعة في قرية كلَّ ليلة: ایک بیوی والا مصیبت اور پریشانی میں مبتلا رہتا ہے: اگر بیوی بیمار پڑگئی تو اسے بھی بیمار بننا پڑتا ہے، اور بیوی کو ماہواری آگئی تو اسے بھی لنگوٹ باندھنی پڑتی ہے۔اور دو بیویوں والا دو چنگاریوں کے بیچ میں ہوتا ہے۔اور تین بیویوں والا ہر رات مہمان ہوتا ہے۔اور چار بیویوں والا ہر رات نئی بستی میں رات گذارتا ہے۔جس کا لطف سیاح جانتے ہیں۔

فائدہ: چار ہی عورتوں سے نکاح کا جواز سورۃ النساء آیت تین میں مذکور ہے۔ارشاد پاک ہے: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ ترجمہ: پس تم ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں: دو دو، تین تین اور چار چار سے۔اس آیت میں اگرچہ کلمۂ حصر نہیں مگر موقع کی دلالت حصر پر ہے۔کیونکہ جب کسی چیز کی اجازت دی جاتی ہے، اگر اجازت دینے والا کسی حد پر رک جائے تو اتنے ہی کی اجازت ہوتی ہے۔مثلاً کہا جائے کہ دو، تین اور چار لے لو۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کم لے سکتا ہے، زیادہ نہیں۔

اور احادیث میں انحصار کی وضاحت ہے: (۱) حضرت غیلان رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔رسول اللہ ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ چار رکھ کر باقی سے علحدگی اختیار کریں (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۶) (۲) اور حضرت حارث بن قیس اسدی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں۔رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی یہی حکم دیا کہ چار رکھ کر باقی سے علحدگی اختیار کریں (ابوداؤد حدیث ۲۲۴۱) (۳) اور حضرت نوفل بن معاویہ دیلمی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کے نکاح میں پانچ عورتیں تھیں۔ان کو بھی رسول اللہ ﷺ نے ایک بیوی الگ کرنے کا حکم دیا (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۷) پس آیت اور احادیث سے ثابت ہوا کہ چار سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

تعددِ ازدواج کی حکمتیں

نکاح کے معاملہ میں بہت زیادہ تنگی کرنا یعنی ایک ہی بیوی میں اجازتِ نکاح کو منحصر کرنا ممکن نہیں۔مصالح مقتضی ہیں کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت دی جائے۔چند حکمتیں درج ذیل ہیں:

پہلی حکمت: مؤمن کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تقوی اور پرہیزگاری کی ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے بعض مردوں

کوقوی الشہوت بنایا ہے۔ایسے لوگوں کے لئے ایک بیوی کافی نہیں۔عورتوں کو بہت سے اعذار پیش آتے ہیں۔وہ ہر وقت اس قابل نہیں ہوتیں کہ شوہران سے ہم بستر ہوسکے۔ان کو ماہواری آتی ہے اور حمل کے زمانہ میں جنین کی حفاظت کے لئے ان کو مردوں سے اختلاط کم کرنا پڑتا ہے۔اس لئے اگر ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی جائے گی تو تقوی کا دامن مرد کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔

دوسری حکمت: نکاح کا سب سے اہم مقصد افزائش نسل ہے۔اور مرد بیک وقت متعدد بیویوں سے اولاد حاصل کرسکتا ہے۔پس تعدد ازدواج سے مقصد نکاح کی تکمیل ہوتی ہے۔

تیسری حکمت: متعدد عورتیں کرنا مردوں کی عادت وخصلت ہے۔اور کبھی مرد اس کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں۔اور جائز مباہات (شان وشوکت) کی اجازت ہے۔جیسے متعدد مکانات، سواریاں اور لباس رکھنا۔پس تعدد ازدواج بھی ایک فطری تقاضہ کی تکمیل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نکاح میں عدم انحصار کی وجہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جائز تھا کہ جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کریں۔آپ کے لئے چار میں انحصار نہیں تھا۔کیونکہ نکاح میں تحدید کا مقصد عام طور پر پیش آنے والی احتمالی خرابی کا سدّباب ہے۔کسی معین اور واقعی خرابی کو ہٹانا پیش نظر نہیں یعنی چونکہ چار سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں اندیشہ ہے کہ ان کی حق تلفی ہو، اس لئے تحدید کی گئی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ زیادہ بیویاں ہونگی تو ضرور حق تلفی ہوگی۔کچھ لوگ چار سے زیادہ کے حقوق بھی مکمل طور پر ادا کرسکتے ہیں۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں دو باتیں ایسی تھیں جو امت میں نہیں ہیں: ایک: کسی بیوی کی حق تلفی ہورہی ہے یا نہیں؟ اس کو آپ جانتے تھے۔کیونکہ آپ صاحب وحی تھے۔پس آپ کے لئے احتمال واندیشہ پر حکم دائر کرنے کی حاجت نہیں۔دوم: آپ اطاعتِ الٰہی اور امتثالِ امر خداوندی میں مامون ومحفوظ تھے کیونکہ آپ معصوم تھے۔ازواج کی حق تلفی کا گناہ آپ سے صادر ہوہی نہیں سکتا۔اس لئے آپ کو نکاح کے باب میں تحدید سے مستثنیٰ رکھا گیا۔

فائدہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ برس کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے پہلا نکاح کیا۔پھر ۲۵ سال تک جب تک حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں آپ نے دوسرا کوئی نکاح نہیں کیا۔حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد چونکہ گھر میں چھوٹی بچیاں تھیں اور رسالت کی ذمہ داری اس لئے آپ نے خاندان کی عورتوں کے اصرار سے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، جو بیوہ تھیں۔اس وقت آپ کی عمر مبارک ۵۰ سال تھی۔اسی زمانہ میں آپ کو خواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا دکھلائی گئیں۔اور کہا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہیں۔چونکہ اس وقت عائشہؓ کی عمر پانچ چھ سال تھی، اس لئے اس خواب کی صورت واضح نہیں ہوئی۔پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں

یہ بات ڈالی گئی [1] اور انھوں نے اس نکاح کی تحریک کی تو آپؐ نے ان سے نکاح کرلیا۔ مگر ابھی وہ گھر آباد نہیں کرسکتی تھیں، اس لئے عملاً آپؐ کے گھر میں ایک ہی بیوی رہی۔ یہی ایک نکاح آپؐ نے کنواری عورت سے کیا ہے۔ باقی سب نکاح بیوہ عورتوں سے کئے ہیں۔ اور ہجرت کے بعد کئے ہیں جبکہ آپؐ کی عمر مبارک ۵۶ تا ۶۰ سال تھی۔ اور یہ نکاح ملّی، ملکی اور شخصی مصالح کے پیش نظر کئے ہیں۔ مثلاً: (۱) حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح لے پالک کی رسم مٹانے کے لئے کیا ہے۔ اور اس نکاح کا حکم اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں نازل فرمایا ہے۔ یہ ملّی مصلحت ہے (۲) اور حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہما سے نکاح ملکی مصلحت سے کیا ہے۔ تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ بدر کے بعد اسلام کے خلاف تمام جنگوں کی کمان ابوسفیانؓ کے ہاتھ میں رہی ہے۔ مگر حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح کے بعد انھوں نے کوئی اہم فوج کشی نہیں کی۔ یہ اس نکاح کا فائدہ تھا (۳) اور چند خواتین کی اسلام کے لئے بڑی قربانیاں تھیں، جیسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، جب وہ بیوہ ہوگئیں تو ان کی دلداری کیلئے آپؐ نے ان سے نکاح کیا ہے۔ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دل جوئی کے لئے کیا ہے۔ یہ شخصی مصلحت ہے ـــــ غرض سبھی نکاح انہی مقاصد ثلاثہ سے کئے ہیں۔ جن کی تفصیل طویل ہے۔ کوئی نکاح آپؐ نے اپنی ضرورت کے لئے نہیں کیا۔ کیونکہ آپؐ کی چہیتی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپؐ کے گھر میں تھیں۔ اور یہ عمر طبعی ضرورت کی بھی نہیں تھی۔ وہ تو جوانی کا زمانہ ہے، جو آپؐ نے ایک بیوی کے ساتھ بسر کیا ہے۔ اور چونکہ یہ تینوں مصالح ایسے تھے کہ ان کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے آپ ﷺ کے لئے نکاح کی تحدید نہیں کی گئی۔

ومنها: العدد الذى لايمكن الإحسانُ إليه فى العِشْرَةِ الزوجية: فإن الناس كثيرًا مّا يرغبون فى جمال النساء، ويتزوّجون منهن ذواتَ عددٍ، ويستأثرون منها حَظِيَّةً، ويتركون الأُخَرَ كالمعلّقة، فلاهى مزوّجةٌ حَظِيَّةٌ تَقَرُّ عينُها، ولا هى أَيِّمٌ يكون أمرُها بيدها. ولايمكن أن يُضَيَّقَ فى ذلك كلَّ تضييقٍ، فإن من الناس من لايُحْصِنُه فرجٌ واحدٌ؛ وأعظمُ المقاصد التناسلُ، والرجلُ يكفى لِتَلْقِيحِ عددٍ كثير من النساء.

وأيضًا: فالإكثار من النساء شِيْمَةُ الرجال، وربما يحصل به المباهاةُ، فَقَدَّر الشارع بأربع: وذلك: أن الأربع عددٌ يمكن لصاحبه أن يرجع إلى كل واحدة بعد ثلاث ليال، وما دون ذلك لايفيد فائدةَ القَسْم، ولايقال فى ذلك: بات عندها؛ وثلاثٌ أولُ حدِّ كثرة، وما فوقَها زيادةُ المكثرة.

وكان للنبى صلى الله عليه وسلم أن ينكِحَ ماشاء: وذلك: لأن ضربَ هذا الحد، إنما هو لدفعِ مفسدةٍ غالبيةٍ، دائرةٍ على مَظِنَّةٍ، لا لدفع مفسدةٍ عَيْنِيَّةٍ حقيقيةٍ، والنبى صلى الله عليه وسلم قد

[1] انھوں نے سوچا ہوگا کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بوڑھی عورت ہیں۔ زیادہ دنوں تک وہ بھی آپؐ کا ساتھ نہیں دے سکیں گی۔ پس ان کے بعد عائشہ رضی اللہ عنہا گھر بسانے کے قابل ہوجائیں گی ۱۲



عرف المَئِنَّةَ فلا حاجة له في المَظِنَّةِ، وهو مأمونٌ في طاعة الله وامتثالِ أمره، دون سائر الناس.

ترجمہ: اور از انجملہ: وہ عدد ہے یعنی چار سے زیادہ جس کے ساتھ ازدواجی صحبت میں حسن سلوک ممکن نہیں۔ پس بیشک لوگ بارہا عورتوں کی خوبصورتی میں رغبت کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بہت سی عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ اور ان میں سے محبوبہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور دوسری کو لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دیتے ہیں۔ پس وہ نہ تو ایسی شادی شدہ محبوبہ ہوتی ہے جس کی آنکھ ٹھنڈی ہو، اور نہ وہ ایسی بے نکاحی ہوتی ہے جس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہو (یہاں تک چار سے زیادہ نکاح حرام ہونے کی وجہ ہے۔ پھر تعددازدواج کی حکمتیں ہیں) اور نہیں ممکن کہ اس سلسلہ میں تنگی کی جائے پوری طرح تنگی کرنا: (۱) پس بیشک بعض لوگ ایسے ہیں جن کو ایک شرمگاہ زنا سے محفوظ نہیں رکھ سکتی (۲) اور نکاح کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد: افزائشِ نسل ہے۔ اور ایک آدمی بہت سی عورتوں کو حاملہ کرنے کے لئے کافی ہے (۳) اور نیز: زیادہ عورتیں کرنا مردوں کی عادت ہے۔ اور کبھی اس کے ذریعہ فخر کیا جاتا ہے (اس کے بعد چار کے عدد کی وجہ ہے:) پس شارع نے چار سے اندازہ مقرر کیا۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ چار ایک ایسا عدد ہے کہ چار بیویوں والے کے لئے ممکن ہے کہ ہر ایک کی طرف لوٹے تین راتوں کے بعد (یہ عورت کے فائدہ کا بیان ہے) اور جو اس سے کم ہے وہ باری مقرر کرنے کا فائدہ نہیں دیتا، اور نہیں کہا جاتا اس صورت میں کہ ''اس نے اس کے پاس شب باشی کی'' (یہ شوہر کے فائدے کا بیان ہے) اور تین کثرت کی ابتدائی حد ہے، اور جو اس سے زیادہ ہے وہ کثرت میں زیادتی ہے (یہ عورت کے فائدے کا تتمہ ہے)

اور نبی ﷺ کے لئے جائز تھا کہ جتنی عورتوں سے چاہیں نکاح کریں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حد کی تعیین: وہ صرف اکثری خرابی کو ہٹانے کے لئے ہی ہے جو احتمالی جگہ پر دائر ہونے والی ہے۔ کسی معین اور حقیقی خرابی کو ہٹانے کے لئے نہیں۔ اور نبی ﷺ (حق تلفی کی) علامت کو پہچانتے تھے، پس آپؐ کے لئے احتمالی جگہ کی کچھ حاجت نہیں۔ اور آپؐ اللہ کی اطاعت اور ان کے حکم کے امتثال میں معصوم تھے۔ دوسرے لوگ ایسے نہیں ہیں۔

لغات: العِشْرة: صحبت، اختلاط، آپس داری ...... الشِیْمَة: عادت، طبیعت ...... الحَظِیَّة: محبوب عورت جو دوسری عورتوں کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہو۔ جمع حَظَایا ...... باهاه مباهاة: فخر کرنا۔

تصحیح: مادون ذلك لايفيد تمام نسخوں میں مادون واحدة لايفيد تھا۔ یہ تصحیح میں نے اندازے سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

چھٹا سبب: اختلافِ دین

مسلمان مرد کا نکاح کافر عورت سے درست نہیں۔ البتہ اگر کافر عورت کتابی (یہودی یا نصرانی) ہو تو درست ہے۔ اور مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی کافر سے، خواہ وہ کتابی ہو، درست نہیں۔ اور یہ احکام دو اصول پر مبنی ہیں: اول: عورت مرد کے

تابع اور زیر اثر ہوتی ہے۔ دوم: اہل کتاب کا کفر (دین اسلام کا انکار) مشرکین ومجوس وغیرہ کے کفر سے اخف ہے۔ کیونکہ یہود ونصاری دین سماوی کے قائل ہیں۔ اور شریعت کے اصول وکلیات سے واقف ہیں۔ اس لئے وہ دین اسلام سے اقرب ہیں ـــــ پس مسلمان مرد کا نکاح کتابیہ سے درست ہے۔ وہ شوہر کا اثر قبول کر کے مسلمان ہوجائے گی۔ دوسری کافر عورتوں سے نکاح درست نہیں کہ ان کے ایمان کی امید کم ہے۔ اور مسلمان عورت کا نکاح کتابی مرد سے بھی درست نہیں۔ کیونکہ مرد کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے اس کے دین کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ شاہ صاحب قدس سرۂ فرماتے ہیں:

سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۱ میں ارشاد پاک ہے: "اور مسلمان عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں مت دو، یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں۔ اور مسلمان غلام مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ (مشرک) تمہیں اچھا معلوم ہو۔ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتے ہیں" ـــــ اس آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اس حکم میں ملحوظ مصلحت یہ ہے کہ مسلمانوں کی کفار کے ساتھ معیت وصحبت، اور مسلمانوں اور کافروں میں ہمدردی اور غمگساری کا رواج، خاص طور پر ازدواجی معاملات میں: دین کو خراب کرنے والا ہے۔ اور اس بات کا سبب ہے کہ مسلمان کے دل میں دانستہ یا نادانستہ کفر سرایت کر جائے۔ اس لئے مسلمان عورت کا نکاح کسی بھی کافر مرد سے حرام کیا گیا۔ اور مسلمان مرد کا نکاح بھی کافر عورت سے حرام کیا گیا۔ البتہ کتابیہ سے جائز رکھا گیا۔ کیونکہ یہود ونصاری دین سماوی کے پابند ہیں۔ اور شریعت کے اصول وکلیات کے بھی قائل ہیں۔ دیگر کفار میں یہ بات نہیں۔ اس لئے اہل کتاب کی صحبت ومعیت ان کے علاوہ کی بہ نسبت ہلکی ہے۔ اور شوہر بیوی پر غالب اور حاکم ہوتا ہے۔ اور عورتیں شوہروں کے ہاتھوں میں محض قیدی ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مسلمان کتابی عورت سے نکاح کرے گا تو فساد ہلکا ہوگا۔ پس اس ہلکے ضرر کا حق یہ ہے کہ اس کی اجازت دی جائے۔ اور دوسری صورتوں کی طرح اس صورت میں سختی نہ برتی جائے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ آیت ۵ میں اس کی صراحۃً اجازت دی گئی۔

فائدہ: کتابی عورتوں سے نکاح کے سلسلہ میں اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ خاص طور پر غیر مسلم ممالک (یورپ وامریکہ) میں عورتیں مردوں کے زیر اثر نہیں رہیں۔ اور کتابی عورتوں سے جو مسلمان نکاح کرتے ہیں وہ بھی عام طور پر دین آشنا نہیں ہوتے۔ اس لئے ان عورتوں کے اسلام قبول کرنے کے واقعات بہت ہی کم ہیں۔ عام طور پر مرد ہی عورت کا اثر قبول کر لیتا ہے۔ اور بچے تو ماں کے زیر اثر ہی پروان چڑھتے ہیں۔ اس لئے اب یہ نکاح باعث فتنہ ہے۔ پس اس سے احتراز ضروری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ہلکے فتنہ کی وجہ سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو، جب انھوں نے مدائن میں ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تھا تاکید کے ساتھ حکم دیا تھا کہ اس کو فوراً چھوڑ دو۔ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یہ نکاح حرام ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا ولکنی أخاف أن یَعَاطَوا المؤمنات منهن: لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ ان کی وجہ سے مسلمان عورتوں کو سخت غصہ آئے گا۔ اور ایک روایت میں ہے: فإنی أخاف أن یقتدیَ بك المسلمون، فیختاروا نساءَ أهل الذمة لجمالهن، وکفی بذلك فتنة لنساء المسلمات: مجھے

اندیشہ ہے کہ مسلمان آپ کی پیروی کریں گے۔ اور ذمیوں کی عورتوں کو ان کی خوبصورتی کی وجہ سے ترجیح دیں گے۔ اور یہ بات مسلمان عورتوں کے فتنہ کے لئے کافی ہے یعنی لوگوں کی توجہ مسلمان عورتوں سے ہٹ جائے گی (ازالۃ الخفا ۲: ۱۱۱ در رسالہ مذہب عمرؓ)

ومنها: اختلاف الدين: وهو قوله تعالى: ﴿وَلَاتُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا﴾ الآيةَ، وقد بُيِّنَ في هذه الآية: أن المصلحة المرعية في هذا الحكم: هو أن صحبةَ المسلمين مع الكفار، وجَرَيَانُ المواساة فيما بين المسلمين وبينهم، لاسيما على وجه الازدواج، مُفسِدةٌ للدين، سببٌ لأن يَّدِبَّ في قلبه الكفرُ، من حيث يشعر، ومن حيث لايشعر.

وأن اليهود والنصارى يتقيدون بشريعة سماوية، قائلون بأصول قوانين التشريع وكلياته، دون المجوس والمشركين، فَمَفْسدةُ صُحْبتهم خفيفةٌ بالنسبة إلى غيرهم، فإن الزوج قاهرٌ على الزوجة، قَيِّمٌ عليها، وإنما الزوجاتُ عوانٍ بأيدهم، فإذا تزوج المسلم الكتابية خَفَّ الفسادُ، فمن حق هذا: أن يُرَخَّصَ فيه، ولا يشدَّدَ كتشديد سائر أخوات المسألة.

ترجمہ: واضح ہے۔ **لغت**: دَبَّ (ض) دَبًّا و دَبِيْبًا: رینگنا۔ سرکنا۔ سرایت کرنا۔

☆ ☆ ☆

ساتواں سبب: دوسرے کی باندی ہونا

سورۃ النساء آیت ۲۵ میں باندیوں سے نکاح کے سلسلہ میں تین باتیں مذکور ہیں:

۱ــــ باندی سے نکاح وہ شخص کرے جو آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی وسعت نہیں رکھتا۔

۲ــــ مسلمان باندی سے نکاح کرے۔

۳ــــ باندی سے نکاح اس وقت کرے جب زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: یہ تینوں باتیں باندی سے نکاح کے لئے شرط ہیں۔ وہ مفہوم شرط اور مفہوم وصف سے استدلال کرتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک شرط نہیں، ترجیحات ہیں۔ ان کے نزدیک مذکورہ دونوں مفہوم حجت نہیں۔ ان کے نزدیک آزاد مسلمان عورت سے نکاح کی وسعت کے باوجود باندی سے نکاح جائز ہے۔ نیز کتابی باندی سے بھی نکاح جائز ہے۔ اور زنا میں ابتلا کا اندیشہ بھی شرط نہیں۔ البتہ اولیٰ یہ ہے کہ باندی سے نکاح وہی شخص کرے جو آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی وسعت نہیں رکھتا، اور مسلمان باندی سے نکاح کرے، کتابی سے نہ کرے۔ اور اسی صورت میں کرے کہ مبتلائے معصیت ہونے کا اندیشہ ہو۔ کیونکہ باندی سے جو اولاد ہوگی وہ اس کے آقا کی غلام

ہوگی۔ پس اپنی اولاد کو غلامی کے درپے کرنا اچھی بات نہیں۔ مگر مجبوری کا حکم دوسرا ہے ـــــ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ سبب: امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک پر بیان کیا ہے۔ اور اس کی حکمت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

نکاح اور زنا میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نکاح میں عورت کی شرمگاہ ایک شخص (شوہر) کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ اگر دوسرا اس میں دست درازی کرے تو شوہر کو مدافعت کا حق ہے۔ اور زنا میں ایسا اختصاص نہیں ہوتا۔ زمانۂ جاہلیت میں جو چار قسم کے نکاح رائج تھے، جن کی تفصیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی ہے (جن کا پہلے ایک حاشیہ میں تذکرہ گذر چکا ہے) ان میں سے صرف ایک طریقے میں ایسا اختصاص ہوتا ہے، اس لئے اسلام نے اسی کو باقی رکھا۔ باقی تین طریقوں میں یعنی نیوگ (ہندؤں میں اولاد حاصل کرنے کی ایک خاص رسم) وغیرہ میں ایسا اختصاص نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلام نے ان کو حرام اور بدکاری قرار دیا۔

اور دوسرے کی باندی سے نکاح کرنے میں بھی صحیح اختصاص نہیں ہوسکتا۔ باندی کی شرمگاہ محلِ خطر میں رہتی ہے۔ کیونکہ باندی کی شرمگاہ کی اس کے آقا سے حفاظت ناممکن ہے۔ اس لئے کہ آقا اس سے خدمت لے گا۔ اور خلوت میں کیا ہوگا اس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہوگا۔ اور شوہر کا اختصاص بھی باندی (بیوی) کے ساتھ، اس کے آقا کے تعلق سے، ناممکن ہے۔ کیونکہ آقا کو نکاح کے بعد بھی باندی سے خدمت لینے کا حق ہے۔ پس اختصاص کی ایک ہی صورت ہے کہ آقا کی دینداری اور امانت داری پر اعتماد کیا جائے۔ اور امید رکھی جائے کہ وہ اپنی باندی میں دست درازی نہیں کرے گا۔

اور یہ جائز نہیں کہ آقا کو اپنی باندی سے خدمت لینے سے، اور اس کے ساتھ تنہائی میں رہنے سے روک دیا جائے۔ کیونکہ یہ کمزور ملکیت کو قوی ملکیت پر ترجیح دینا ہے جو درست نہیں۔ باندی میں دو ملکیتیں ہیں: ایک: گردن کی ملکیت جو مولیٰ کی ہے۔ دوسری: شرمگاہ کی ملکیت جو شوہر کی ہے۔ اور پہلی ملکیت اقوی ہے، جو دوسری ملکیت کو شامل ہونے والی اور اس کو تابع بنانے والی ہے۔ کیونکہ جو گردن کا مالک ہوتا ہے وہ خود بخود شرمگاہ کا بھی مالک ہو جاتا ہے۔ اور دوسری ملکیت اضعف ہے۔ وہ پہلی ملکیت میں مندرج ہے۔ پس شوہر کی خاطر مولیٰ کا حق کاٹ دینا الٹے بانس بریلی والی مثل ہے!

غرض: جب دوسرے کی باندی کے ساتھ صحیح اختصاص نہیں ہوسکتا تو اس سے نکاح ہی حرام ہے۔ البتہ اگر باندی پاک دامن مسلمان عورت ہو، اور کسی مرد کو اس سے نکاح کرنے کی شدید حاجت پیش آئے، اور اس کو زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو، اور وہ آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی وسعت نہ رکھتا ہو تو فساد ہلکا ہو جائے گا۔ کیونکہ مجبوری ہے۔ اور مجبوریاں ممنوعات کو مباح کرتی ہیں۔ اس لئے ایسی صورت میں غیر کی باندی سے اس کے مولیٰ کی اجازت سے نکاح درست ہے۔

ومنها: كونُ المرأةِ أمةً لآخر: فإنه لايمكن تحصينُ فرجِها بالنسبة إلى سيدها، ولا اختصاصه بها بالنسبة إليه، إلا من جهة التفويض إلى دينه وأمانته، ولا جائزَ أن يُسَدَّ سيدُها عن استخدامها، والتخلّي بها، فإن ذلك ترجيحُ أضعفِ المِلْكين على أقواهما؛ فإن هنالك مِلْكين:

ملكَ الرقبة وملكَ البُضع، والأول هو الأقوى المشتمِلُ على الآخر، المُستتبِعُ له، والثانى هو الضعيفُ المندرِجُ؛ وفى اقتضاب الأدنى للأعلى قلبُ الموضوع، وعدمُ الاختصاص بها، وعدمُ إمكان ذبِّ الطامع فيها هو أصل الزنا.

وقد اعتبر النبى صلى الله عليه وسلم هذا الأصلَ فى تحريم الأنكحةِ التى كان أهل الجاهلية يتعاملونها، كالاستِبْضاع وغيرِه، على ما بيّنته عائشةُ رضى الله عنها.

فإذا كانت فتاةً مؤمنةً بالله، محصِنةً فرجَها، واشتدتِ الحاجةُ إلى نكاحها مخافةَ العنت، وعدمِ طَوْلِ الحرة: خَفَّ الفسادُ، وكانت الضرورةُ، والضروراتُ تبيح المحظورات.

ترجمہ: اور از انجملہ: عورت کا دوسرے کی باندی ہونا ہے: پس بیشک شان یہ ہے کہ ممکن نہیں باندی کی شرمگاہ کی حفاظت کرنا اس کے آقا کی بہ نسبت۔ اور ممکن نہیں شوہر کا خاص ہونا باندی کے ساتھ: آقا کی بہ نسبت۔ مگر آقا کی دینداری اور امانت داری کی طرف معاملہ سونپنے کی جہت سے۔ اور جائز نہیں کہ آقا کو باندی سے خدمت لینے اور اس کے ساتھ تنہائی سے روک دیا جائے۔ پس بیشک یہ دو ملکیتوں میں سے کمزور ترین ملکیت کو ان میں سے قوی ترین ملکیت پر ترجیح دینا ہے۔ پس بیشک وہاں دو ملکیتیں ہیں: ملکیتِ رقبہ اور ملکیتِ شرمگاہ۔ اور پہلی ملکیت ہی قوی ترین ہے جو دوسری کو شامل ہونے والی، اس کو اپنے جلو میں لینے والی ہے۔ اور دوسری ہی کمزور داخل ہونے والی ہے۔ اور ادنیٰ (شوہر) کے لئے اعلیٰ (آقا) کو کاٹنا برعکس بات ہے۔ اور باندی کے ساتھ (شوہر کا) خاص نہ ہونا، اور اس میں لالچ کرنے والے (آقا) کو ہٹانے کا ممکن نہ ہونا ہی زنا کی اصل ہے ــــ اور تحقیق نبی ﷺ نے اس اصل کا اعتبار کیا ہے ان نکاحوں کو حرام قرار دینے میں جن سے زمانۂ جاہلیت کے لوگ باہم معاملہ کرتے تھے۔ جیسے نیوگ وغیرہ جیسا کہ اس کو عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے۔

پس جب باندی: اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والی اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والی عورت ہو۔ اور اس سے نکاح کرنے کی سخت حاجت پیش آئے، زنا کے اندیشہ کی وجہ سے، اور آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے تو فساد ہلکا ہو جائے گا۔ اور ضرورت پائی جائے گی۔ اور ضرورتیں ممنوعات کو مباح کرتی ہیں۔

تصحیح: طَوْل الحرة مطبوعہ میں طول الحر (مذکر) تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

آٹھواں سبب: منکوحہ عورت

سورۃ النساء آیت ۲۴ میں ارشاد پاک ہے: ''اور (تم پر حرام کی گئیں) وہ عورتیں جو شوہر والی ہیں، مگر جو تمہاری مملوک ہو جائیں'' اس آیت کی رو سے جو بھی عورت کسی مسلمان یا کافر کی منکوحہ ہے اس سے نکاح حرام ہے۔ اور حرمت کی وجہ یہ

ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کر کے صحبت کرے گا تو وہ زنا ہوگا۔ حضرت سعید بن میتب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ شوہر والی عورتوں کی حرمت اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام کیا ہے (موطا ۲:۵۴۱ کتاب النکاح، باب ماجاء فی الاحصان) اور یہ صحبت زنا اس لئے ہے کہ زنا کسی عورت سے اختصاص پیدا کیئے بغیر اور دوسروں کی لالچ منقطع کیئے بغیر صحبت کرنے کا نام ہے۔ اور جب عورت کسی کے نکاح میں ہے تو دوسرے ناکح سے اس کا اختصاص نہیں ہوسکتا۔ نہ پہلے شوہر کی اس سے طمع منقطع ہوگی، پس وہ زنا ہے۔ البتہ منکوحہ عورت باندی بن جائے تو استبرائے رحم کے بعد آقا کے لئے حلال ہوگی۔ غزوۂ اوطاس میں ایسی عورتیں ہاتھ آئی تھیں، اور صحابہ کو ان سے صحبت کرنے میں اشکال پیش آیا تھا کہ ان کے شوہر تو زندہ ہیں۔ اس پر مذکورہ آیت پاک نازل ہوئی۔ اور ان باندیوں کو حلال قرار دیا گیا (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۰) اور ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ قید ہوگئیں تو ان کے شوہروں کی طمع منقطع ہوگئی۔ اور دارالاسلام میں آگئیں تو ان سے صحبت کرنے میں بھیڑ کرنے کا موقع بھی نہ رہا۔ اور جن کے حصہ میں آئیں ان کے ساتھ اختصاص بھی پایا گیا۔ اس لئے ان سے صحبت جائز ہوئی۔

نواں سبب: عورت کا کسبی ہونا

سورۃ النور آیت تین میں ارشاد پاک ہے: ''اور زانیہ سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک'' اس آیت کی رو سے جو عورت کسبی (رنڈی) ہے اس سے نکاح حرام ہے۔ البتہ اگر وہ توبہ کرلے، اور اپنے پیشے سے باز آجائے تو نکاح درست ہے۔ اور حرمت دو وجہ سے ہے: ایک: جو عورت شوہر کے قبضہ اور گھر میں آنے کے بعد بھی اپنی عادت پر برقرار رہے تو یہ شوہر کا بھڑواپن ہے۔ دوم: اس بات کا اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ جو اولاد ہوگی وہ شوہر کی ہوگی۔ اس لئے ایسی کسبی عورت سے نکاح حرام کیا گیا۔

تحریم پامال کرنے والے کی عبرتناک سزا

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بُردۃ بن نیار رضی اللہ عنہ کو ایک ایسے شخص کی طرف بھیجا جس نے اپنی سوتیلی ماں سے نکاح کیا تھا کہ وہ اس کو قتل کر کے اس کا سر لے آئیں (مشکوۃ حدیث ۳۱۷۲)

تشریح: محرّمات کی تحریم کی مصلحت اسی وقت تکمیل پذیر ہوسکتی ہے جب تحریم کو امر لازم اور فطری خُلُق قرار دیا جائے۔ اور محرمات سے نکاح کرنے کو ایسا مبغوض اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا جائے جیسا خنزیر کھانا، جس سے انسان فطری طور پر نفرت کرتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ محرمات کی تحریم کو شہرت دی جائے۔ اس کی عام اشاعت کی جائے۔ اور جو لوگ تحریم کو رائگاں کریں یعنی اس کی خلاف ورزی کریں ان کو سخت سزا دیکر تحریم قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اور وہ سزا یہی ہے کہ جو بھی کسی محرم سے — خواہ وہ نکاح کی وجہ سے محرم ہو یا کسی اور سبب سے — زنا کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ اور اس سلسلہ میں قطعاً کوئی رعایت نہ کی جائے۔

ومنها : كونُ المرأة مشغولةً بنكاح مسلم أو كافر : فإن أصلَ الزنا: هو الازدحام على الموطوء ة، من غير اختصاص أحدهما بها، وغيرِ قطع طمعِ الآخرِ فيها، ولذلك قال الزهرى رحمه الله: ويرجع ذلك إلى أن الله تعالى حَرَّم الزنا. وأصابَ الصحابة رضى الله عنهم سبايا، وتَحَرَّجُوْا من غِشْيَانها، من أجل أزواجهن من المشركين. فأنزل الله تعالى:﴿ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ أى: فهنّ حلالٌ من جهة أن السَّبْىَ قاطعٌ لطَمعه؛ واختلافُ الدار مانعٌ من الازدحام عليها، ووقوعُها فى سهمه مخصص لها به.

ومنها : كون المرأةِ زانيةً مكتسبةً بالزنا: فلايجوز نكاحها حتى تتوب، وتَقْلع عن فعلها ذلك، وهو قوله تعالى:﴿ وَالزَّانِيَةُ لَايَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ﴾

والسرفيه: أن كونَ الزانية فى عصمته، وتحت يده، وهى باقيةٌ على عادتها من الزنا: دُيُوْثِيَّةٌ، وانسلاخ عن الفطرة السليمة، وأيضًا: فإنه لايأمن من أن تُلحِق به ولدَ غيره.

ولما كانت المصلحةُ من تحريم المحرَّمات لاتتم إلا بجعل التحريم أمرًا لازمًا، وخُلُقا جبليا، بمنزلة الأشياء التى يُستنكف منها طبعًا: وجب أن يؤكَّد شهرتُها وشيوعها وقبول الناس لها، بإقامةِ لائمةٍ شديدةٍ على إهمال تحريمها، وذلك: أن تكون السنةُ قتلَ من وقع على ذات رحم محرم منه بنكاح أو غيره، ولذلك بعث رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى من تزوج بامرأة أبيه: أن يؤتى برأسه.

ترجمہ:اورازانجملہ :عورت کا کسی مسلمان یا کافر کے نکاح میں مشغول ہونا ہے:پس بیشک زنا کی اصل:موطوءہ پر ازدحام ہی ہے(ازدحام کرنے والے) دونوں میں سے ایک کے عورت کے ساتھ اختصاص کے بغیر،اورعورت میں دوسرے کی لالچ کو کاٹے بغیر۔اوراسی وجہ سے زُہری رحمہ اللہ نے فرمایا:(یہ نظر چوک گئی ہے۔درحقیقت یہ حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا قول ہے،جس کو زُہری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے)اور یہ حکم اس بات کی طرف راجع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زنا کو حرام ٹھہرایا ہے۔اورصحابہ کے ہاتھ آئے قیدی،اورانھوں نے تنگی محسوس کی ان باندیوں سے صحبت کرنے میں ان کے مشرک شوہروں (کے زندہ ہونے) کی وجہ سے۔پس اللہ تعالیٰ نے نازل کیا:''اورمنکوحہ عورتیں حرام ہیں،مگر جن کے تم مالک ہوگئے''یعنی وہ حلال ہیں:اس وجہ سے کہ قید کرنا شوہر کی لالچ کو ختم کرنے والا ہے۔اورملک کا اختلاف عورت پر ازدحام سے مانع ہے۔اورعورت کا فوجی کے حصہ میں آنا عورت کو اس کے ساتھ خاص کرنے والا ہے —— اورازانجملہ : عورت کا زانیہ ہونا، زنا سے کمائی کرنے والا ہونا ہے۔پس اس سے نکاح جائز نہیں، یہاں تک کہ وہ توبہ کرے،اوراپنے

اس فعل سے باز آجائے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:...... اور اس میں حکمت یہ ہے کہ زنا کار عورت کا مرد (شوہر) کی عصمت (پناہ) میں ہونا، اور اس کے قبضہ میں ہونا، درانحالیکہ وہ اپنی زنا کی عادت پر برقرار ہے: بھڑواپن اور فطرتِ سلیمہ سے قدم باہر رکھنا ہے۔ اور نیز: پس شوہر اس بات سے مطمئن نہیں کہ عورت اس کے ساتھ اس کے علاوہ کا بچہ ملائے ——

اور جب محرمات کی تحریم کی مصلحت تام نہیں ہوتی مگر تحریم کو امر لازم اور فطری اخلاق قرار دینے کے ذریعہ: ان چیزوں جیسا جن سے انسان فطری طور پر نفرت کرتا ہے، تو ضروری ہوا کہ مؤکد کیا جائے محرمات کی تشہیر کو اور ان کی اشاعت کو، اور لوگوں کی قبولیت کو: سخت ملامت برپا کرنے کے ذریعہ ان کی تحریم کو رائگاں کرنے پر۔

اور وہ بات اس طرح ہو سکتی ہے کہ طریقہ یہ ہو کہ جو شخص اپنے کسی ذی رحم محرم سے زنا کرے —— خواہ وہ نکاح کی وجہ سے محرم ہو یا اس کے علاوہ طریقہ سے —— اس کو قتل کر دیا جائے۔ اور اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس شخص کی طرف آدمی بھیجا جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کیا تھا کہ اس کا سر لایا جائے۔

باب —— ۶

آدابِ مباشرت

شہوتِ فرج عطیۂ خداوندی

کچھ حیوانات براہ راست مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے کیڑے۔ اور ان میں توالد نہیں ہوتا۔ اور کچھ مٹی سے پیدا ہوتے ہیں، پھر ان میں توالد بھی ہوتا ہے، جیسے مکھیاں۔ اور بہت سے حیوانات صرف توالد سے بڑھتے ہیں۔ انسان ان میں سے ہے۔ اور انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے والی مخلوق بنایا ہے۔ دیگر حیوانات میں یہ وصف نہیں۔ اس وجہ سے ان میں بوقت ضرورت شہوتِ فرج ابھرتی ہے، اور اس سے نسل بڑھتی ہے۔ اور انسان پر اللہ تعالیٰ نے شہوتِ فرج مسلط کی ہے۔ وہ ہر وقت اس پر سوار رہتی ہے۔ کیونکہ اس کا اپنے جوڑے کے ساتھ ہر وقت کا ساتھ ہے۔ پس اگر وقتِ ضرورت ہی شہوت ابھرے گی تو اس کی خانگی زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا۔ اور مشیتِ خداوندی نے طے کیا کہ نوعِ انسانی کی بقاء توالد و تناسل کے ذریعہ ہو، تو ضروری ہے کہ مثبت پہلو سے انسان کو افزائش نسل کی تاکید کے ساتھ ترغیب دی جائے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے مرد و زن سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔ یہ ارشاد پاک جملہ خبریہ ہے۔ اور ہر خبر انشاء کو متضمن ہوتی ہے۔ پس اس میں افزائش نسل کا حکم ہے۔ اور حدیث میں فرمایا: تزوجوا الودود الولود: ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو بہت پیار کرنے والی اور بہت

بچے جننے والی ہوں۔اس میں بھی افزائشِ نسل کی طرف اشارہ ہے ــــ اور منفی پہلو سے قطعِ نسل سے اوران باتوں سے جو قطعِ نسل کا باعث ہوتی ہیں بختی کے ساتھ روک دیا جائے۔

اور توالد وتناسل کا واحد ذریعہ شہوتِ فرج ہے۔شہوتِ بطن اس کے لئے مدومعاون ہے۔یہ شہوت ہمہ وقت انسان پر مسلط ہے۔اوراس کو طلبِ نسل پر مجبور کرتی ہے۔خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔اورنسل کی بربادی کے اسباب مثال کے طور پر چھ ہیں:

۱ ــــ لڑکوں سے اغلام کرنا ۲ ــــ عورتوں سے اغلام کرنا۔یہ دونوں باتیں اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہیں۔اور وہ اس طرح کہ جو شہوتِ فرج ایک خاص مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر مسلط کی ہے،اس کو بروئے کار لانے کے بجائے ضائع کردیا جاتا ہے۔یہ فطری چیز میں تبدیلی ہے ــــ پھر پہلا سبب یعنی لڑکوں سے اغلام کرنا زیادہ سنگین ہے۔کیونکہ اس میں جانبین سے اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہے۔اور وہ اس طرح کہ مفعولیت کی شان اللہ تعالیٰ نے مردوں میں پیدا نہیں کی۔پس فاعل ومفعول دونوں ہی خلافِ فطرت عمل کا ارتکاب کرتے ہیں۔

۳ ــــ مردوں کا مخنث بننا۔یہ بھی بدترین خصلت ہے ۴ ــــ اعضائے تناسل کاٹ دینا ۵ ــــ ایسی دوائیں استعمال کرنا کہ قوتِ باہ ختم ہوجائے۔ ۶ ــــ عورتوں سے بے تعلق ہوجانا ــــ اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں،جیسے تجرّد کی زندگی اپنانا۔یہ سب اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہیں۔اورنسل کی طلب کو رائگاں کرنا ہے۔چنانچہ نبی ﷺ نے ان سب باتوں کی ممانعت کی۔اور فرمایا:''عورتوں سے ان کی پچھلی راہ میں صحبت مت کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۹۲) اور فرمایا:''وہ شخص ملعون ہے جو اپنی بیوی کی پچھلی راہ میں صحبت کرتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۹۳) اور آپؐ نے فوطے نکالدینے کی ممانعت کی۔اور بیوی سے بے تعلق ہوجانے کی ممانعت فرمائی۔اس سلسلہ میں کثیر روایات مروی ہیں۔

﴿ آدابُ المباشرة ﴾

اعلم: أن الله تعالى لما خلق الإنسان مَدَنِيًّا بالطبع، وتعلَّقت إرادتُه ببقاء النوع بالتناسل: وجب أن يُرَغِّبَ الشرعُ فى التناسل أشدَّ رغبةٍ، وينْهى عن قطع النسل وعن الأسباب المُفضِية إليه أشدَّ نهى.

وكان أعظمُ أسبابِ النسل، وأكثرُها وجودًا، وأفضاها إليه، وأحثُّها عليه: هو شهوةُ الفرج، فإنها كالمسلَّط عليهم منهم، يَقْهرهم على ابتغاء النسل، أَشاءُوا أم أبَوْا.

وفى جَرَيَان الرسم بإتيان الغِلمان، ووطءِ النساء فى أدبارهن: تغييرُ خلق الله، حيث مَنَعَ المسلَّطَ على شيئ من إفضائه إلى ما قُصد له؛ وأشدُّ ذلك كلِّه وطءُ الغِلْمان، فإنه تغييرٌ لخلق

الله من الجانبين؛ وتأنُّثُ الرجال أقبحُ الخصال؛ وكذلك جريان الرسم بقطع أعضاءِ التناسل، واستعمالُ الأدوية القامعة للباءة، والتبتلُ، وغيرُها: تغييرٌ لخلق الله عزوجل، وإهمالٌ لطلب النسل، فنهى النبي صلى الله عليه وسلم عن كل ذلك، قال:" لاتأتوا النساء في أدبارهن" وقال:" ملعون من أتى امرأته في دبرها" وكذلك نهى عن الخصاء والتبتل في أحاديث كثيرة.

ترجمہ: واضح ہے۔ قولہ: فإنها كالمسلَّط إلخ ترجمہ پس شہوتِ فرج گویا لوگوں پران کے اندر سے مسلط کی ہوئی ہے۔ منهم کا مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خارجی چیز مسلط نہیں کی گئی۔ بلکہ ان کے اندر یہ فطری جذبہ رکھا گیا ہے..... قولہ: حيث منع المسلَّطَ إلخ ترجمہ: اس طرح کہ اس نے روکا ایک چیز پر مسلط کی ہوئی صلاحیت کو اس کے پہنچانے سے اس چیز تک جس کا آدمی کے لئے ارادہ کیا گیا ہے یعنی شہوت کو افزائش نسل میں استعمال نہیں کیا۔

☆ ☆ ☆

ہر طرف سے صحبت جائز ہونے کی وجہ

سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۳ میں ارشاد پاک ہے:"تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں۔ پس جدھر سے چاہو اپنے کھیت میں آؤ"

تفسیر: یہود بدوں حکم خداوندی طریقۂ مباشرت میں تنگی کیا کرتے تھے۔ اور انصار اور ان کے حلفاء یہود کا طریقہ اپنائے ہوئے تھے۔ یہود کہتے تھے کہ اگر بیوی سے پشت کی جانب سے آگے کی شرمگاہ میں صحبت کی جائے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا تو مذکورہ آیت نازل ہوئی (مشکوۃ حدیث ۳۱۸۳) اس ایت کی رو سے ہر طرف سے صحبت درست ہے۔ خواہ سامنے سے خواہ پیچھے سے، بشرطیکہ صحبت اگلی راہ میں ہو۔

اور یہ بات دو وجہ سے ہے: اول: یہ ایسا معاملہ ہے جس کے ساتھ کوئی ملکی یا ملّی مصلحت متعلق نہیں محض شخصی معاملہ ہے۔ اور شوہر اپنی مصلحت بہتر جانتا ہے۔ دوم: یہ یہود کا تعمق تھا۔ انھوں نے یہ بات بلاوجہ چلائی تھی۔ پس اس کو ختم کرنا ہی مناسب ہے۔

[۱] قال الله تعالى: ﴿نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ، فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّى شِئْتُمْ﴾

أقول: كان اليهود يُضَيِّقون في هيئة المباشرة من غير حكمٍ سماوي، وكان الأنصار ومن وَلِيَهُم يأخذون سنتَهم، وكانوا يقولون: إذا أتى الرجلُ امرأتَه من دبرها في قُبُلها: كان الولدُ أحولَ، فنزلت هذه الآية، أي أَقْبِلْ وَأَدْبِرْ ماكان في صِمَامٍ واحدٍ؛ وذلك: لأنه شيئٌ لايتعلق به المصلحةُ المدنية والمِلِّية، والإنسانُ أعرفُ بمصلحة خاصةِ نفسِه، وإنما كان ذلك من تعمقات اليهود، فكان من حقه أن يُنسخ.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: وَلِيَهٗ يَلِيْهِ وَلْيًا: قریب ہونا۔ ملا ہوا ہونا۔ مراد حلفاء ہیں...... صِمَام: سوراخ۔ اصلی معنی: شیشی کی ڈاٹ۔ یہ لفظ حدیث میں آیا ہے (مسلم شریف ۱۰:۷ مصری باب جواز جماعه امرأته إلخ)

☆ ☆ ☆

عزل کا حکم اور اس کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ سے عزل کے بارے میں دریافت کیا گیا؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم عزل نہ کرو تو کچھ حرج نہیں! جو بھی نفس قیامت تک پیدا ہونے والا ہے: ہونے والا ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۱۸۶)

تشریح: آدمی کبھی کسی خاص مصلحت سے نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی یا باندی کو حمل قرار پائے۔ اس لئے جب فراغت کا وقت قریب آتا ہے تو وہ بیوی سے علحدہ ہو جاتا ہے۔ اور باہر استفراغ کرتا ہے۔ اسی کو عزل کہتے ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ عزل ناجائز تو نہیں، مگر اچھا بھی نہیں۔

ناجائز اس لئے نہیں کہ عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح بیوی سے پچھلی راہ میں صحبت کرنے میں اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی اور طلب نسل سے گریز پایا جاتا ہے: عزل میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ چاہیں گے عزل کے باوجود حمل قرار پائے گا۔ اسی حدیث میں آگاہ کیا گیا ہے کہ ہونے والی تمام باتیں پہلے سے مقدر ہیں۔ اور جب کوئی بات مقدر ہوتی ہے، اور عالَم اسباب میں اس کا سبب ضعیف ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس میں کشادگی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔ مثلاً: بچہ کا ہونا مقدر ہوتا ہے تو جب آدمی انزال سے قریب ہوتا ہے، اور چاہتا ہے کہ عضو باہر نکال لے تو بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مادے کے چند قطرے اندر ٹپک جاتے ہیں، جو بچے کی تولید کے لئے کافی ہو جاتے ہیں۔ یہی بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے کہ عزل علوق سے مانع نہیں: مابالُ رجالٍ يَطَئُوْنَ وَلائدَهم، ثم يَعْزِلون؟ لا تأتيني وليدةٌ يعترف سيدُها أنْ قد أَلَمَّ بها، إلا ألحقتُ ولدَها، فاعزِلوا بعدُ، أو اترُكوا! لوگوں کا کیا حال ہے: اپنی باندیوں سے صحبت کرتے ہیں، پھر عزل کرتے ہیں؟ جو بھی باندی میرے پاس آئے گی، جس کا آقا معترف ہو کہ اس نے اس سے صحبت کی ہے تو میں اس کے بچے کو آقا کا قرار دونگا۔ پس اب چاہو عزل کرو، چاہو نہ کرو (موطا مالک ۲: ۷۴۲ كتاب الأقضية، باب القضاء في أمهات الأولاد)

اور کبھی آدمی کی شخصی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ عزل کرے۔ مثلاً عورت قید میں آئی ہے، آقا نہیں چاہتا کہ وہ حاملہ ہو جائے۔ وہ اس کو فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، یا بیوی صحت کی خرابی کی وجہ سے حمل کی متحمل نہیں۔ یا دو بچوں میں ضروری وقفہ نہ رہنے کی وجہ سے دودھ میں کمی رہتی ہے۔ اس لئے وہ عزل کرتا ہے تو یہ جائز ہے۔

اور کراہیت کی وجہ یہ ہے کہ مصلحتیں مختلف ہیں: جہاں شخصی مصلحت کا ایک تقاضا ہے وہاں نوعی مصلحت کا دوسرا تقاضا ہے۔

نوع انسانی کی مصلحت یہ ہے کہ عزل نہ کیا جائے، تا کہ اولاد کی کثرت ہو، اور نسل بڑھے۔ اور تشریعی اور تکوینی احکام میں نوعی مصلحت کو شخصی مصلحت پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے جواز کے باوجود عزل ناپسندیدہ ہے۔

[۲] وسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن العزل؟ فقال: ماعليكم ألَّا تفعلوا، مامن نسمة كائنة إلى يوم القيامة إلا وهي كائنة!"

أقول: يشير إلى كراهية العزل، من غير تحريم. والسبب في ذلك: أن المصالح متعارضة، فالمصلحة الخاصة بنفسه في السَّبْي — مثلاً — أن يعزِل، والمصلحةُ النوعية: أن لا يعزل، ليتحقق كثرةُ الأولاد وقيامُ النسل؛ والنظرُ إلى المصلحة النوعية أرجحُ من النظر إلى المصلحة الشخصية، في عامّة أحكام الله تعالى التشريعية والتكوينية — على أن العزل ليس فيه مافي إتيان الدبر من تغيير خلق الله، ولا الإعراض من التعرض للنسل.

ونبَّه صلى الله عليه وسلم بقوله: "ما عليكم أن لا تفعلوا" على أن الحوادث مقدَّرةٌ قبلَ وجودها، وأن الشيئَ إذا قُدِّرَ، ولم يكن له في الأرض إلا سبب ضعيف، فمن سنة الله عزوجل أن يبسطَ ذلك السبب الضعيف حتى يفيد الفائدة التامَّةَ؛ فالإنسان إذا قارب الإنزال، وأراد أن ينزع ذكره، كثير ما يتقاطر من إحليله قطراتٌ، تكفي في مادة ولده، وهولايدري. وهو سرُّ قول عمر رضي الله عنه بالحاق الولد بمن أقرَّ أنه مَسَّها: لا يمنع من ذلك العزل.

ترجمہ: (۲) اور رسول اللہ ﷺ سے عزل کے بارے میں دریافت کیا گیا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''کچھ حرج نہیں تم پر اس میں کہ نہ کرو تم۔ نہیں کوئی جی قیامت تک وجود میں آنے والا، مگر وہ وجود میں آنے والا ہے'' — میں کہتا ہوں: آپؐ اشارہ کررہے ہیں عزل کے ناپسند ہونے کی طرف، حرام ٹھہرائے بغیر — اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مصلحتیں متعارض ہیں: پس اس کی ذات کے ساتھ خاص مصلحت: قیدی میں — بطور مثال — یہ ہے کہ عزل کرے۔ اور نوعی مصلحت یہ ہے کہ عزل نہ کرے، تا کہ اولاد کی کثرت اور نسل کا بقاء متحقق ہو۔ اور مصلحتِ نوعیہ کی طرف نظر زیادہ راجح ہے مصلحتِ شخصیہ کی طرف نظر سے، اللہ تعالیٰ کے تمام تشریعی اور تکوینی احکام میں — علاوہ ازیں: عزل میں وہ بات نہیں جو پچھلی راہ میں صحبت کرنے میں ہے یعنی تخلیق الٰہی میں تبدیلی، اور نہ نسل سے تعرض کرنے سے روگردانی ہے — اور آگاہ کیا نبی ﷺ نے اپنے ارشاد: ''کچھ حرج نہیں تم پر اس بات میں کہ نہ کرو تم'' (الی آخرہ) سے اس بات پر کہ واقعات (ہونے والی باتیں) اندازہ مقرر کئے ہوئے ہیں، ان کے پائے جانے سے پہلے۔ اور اس بات سے آگاہ کیا کہ جب کوئی چیز مقدر کی جاتی ہے۔ اور اس کے لئے زمین میں نہیں ہوتا مگر کوئی کمزور سبب تو اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اس کمزور سبب میں کشادگی پیدا کی جاتی

ہے، یہاں تک کہ وہ پورا پورا فائدہ دیتا ہے۔ پس جب وہ انزال سے قریب ہوتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اپنا عضو باہر نکال لے، تو بارہا اس کے پیشاب کے سوراخ سے چند قطرے ٹپک جاتے ہیں، جو اس کے بچہ کے مادہ میں کافی ہوجاتے ہیں۔ اور اس کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اور وہ راز ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کا بچے کو ملانے میں اس شخص کے ساتھ جس نے اعتراف کیا کہ اس نے عورت سے صحبت کی ہے: ''نہیں روکتا اس سے عزل''

ملحوظہ: نبّہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ما من نسمة إلخ لکھنا چاہئے تھا۔ کیونکہ اسی میں یہ آگاہی ہے۔ پہلے جزء میں تو عزل کا حکم ہے۔

☆ ☆ ☆

شیر خوارگی کے زمانہ میں صحبت کرنے کا حکم اور اس کی وجہ

حدیث (۱) ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بخدا! میں نے ارادہ کیا کہ دودھ پلانے والی عورت سے جماع کرنے کی ممانعت کردوں۔ پھر میں نے روم وفارس پر نظر ڈالی تو وہ شیر خوارگی کے زمانہ میں صحبت کرتے ہیں، اور بچوں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۸۹)

حدیث (۲) ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کو چپکے سے قتل مت کرو۔ پس بیشک شیر خوارگی کے زمانہ میں صحبت کرنے کا اثر شہسوار کو پہنچتا ہے، پس وہ اس کو پچھاڑ دیتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۹۶)

تشریح: شیر خوارگی کے زمانہ میں بچہ کی ماں سے صحبت کرنا مکروہ ہے، حرام نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں صحبت کرنا عورت کے دودھ کو خراب کر دیتا ہے۔ اور بچے کو کمزور کرتا ہے۔ اور جو کمزوری گھٹی میں شامل ہوتی ہے، وہ زندگی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اس عمومی ضرر کا لحاظ کرتے ہوئے اس زمانہ میں صحبت کرنے کی ممانعت کا ارادہ فرمایا۔ مگر جب آپؐ نے روم وفارس کا جائزہ لیا تو واضح ہوا کہ یہ ضرر عام اور ایسا مظنہ نہیں جس پر تحریم کا حکم دائر کیا جائے۔ اس لئے آپؐ نے ممانعت کا ارادہ ترک فرمادیا۔

اور کراہیت کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں صحبت سے ممکن ہے حمل قرار پا جائے۔ اور حمل ٹھہرنے کے کچھ عرصہ بعد عورت کا دودھ خراب ہوجاتا ہے۔ جو بچے کی صحت کے لئے مضر ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں صحبت سے بچنا بہتر ہے۔ اور ایک بیوی ہونے کی وجہ سے احتراز نہ کرسکے، تو جب عورت کے دودھ میں تغیر آجائے یعنی وہ زردی مائل ہونے لگے تو دودھ چھڑا دینا چاہئے۔

فائدہ: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے جو پہلے مبحث ۶ باب ۲۰ میں مدلل کی جاچکی ہے کہ نبی ﷺ اجتہاد فرمایا کرتے تھے۔ اور آپؐ کے اجتہاد کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ مصالح ومفاسد اور ان کے مظان (اجمالی جگہوں) کا لحاظ کرکے

آپؐ تحریم یا کراہیت کا حکم دیتے تھے (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " لقد هَمَمْتُ أنْ أنهى عن الغِيْلَةِ، فنظرتُ في الروم وفارس فإذاهم يَغِيْلون أولادَهم، فلا تَضُرُّ أولادَهم" وقال: " لاتقتلوا أولادكم سرًّا، فإن الغَيْلَ يدرك الفارس فَيُدَعْثِره"

أقول: هذا إشارة إلى كراهية الغِيلَة، من غير تحريم. وسببه: أن جماع المرضِع يُفسد لبنَها، ويُنَهِّكُ الولدَ، وضُعْفُه في أول نمائه يدخل في جَذْرِ مزاجه.

وبين النبي صلى الله عليه وسلم أنه أراد التحريم، لكونه مَظِنَّةً للضرر الغالب، ثم إنه لما استقرأ وجد أن الضرر غيرُ مَطَّرِدٍ، وأنه لايصلح للمظنة، حتى يُدار عليه التحريمُ.

وهذا الحديث أحدُ دلائلِ ما أثبتناه: من أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يجتهد، وأن اجتهادَه معرفةُ المَصالح والمظانِّ، وإدارةُ التحريم والكراهية عليها.

ترجمہ: (۳) یہ (دوسری حدیث) شیر خوارگی کے زمانہ میں صحبت کی کراہیت کی طرف اشارہ ہے، حرام ٹھہرائے بغیر۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دودھ پلانے والی سے صحبت کرنا، اس کے دودھ کو خراب کر دیتا ہے، اور بچے کو کمزور کرتا ہے۔ اور بچے کے نشو ونما کے آغاز میں کمزوری اس کے مزاج کی جڑ میں داخل ہو جاتی ہے ـــــ اور نبی ﷺ نے (پہلی حدیث) میں بیان فرمایا کہ آپؐ نے حرام ٹھہرانے کا ارادہ کیا تھا۔ شیر خوارگی کے زمانہ میں صحبت کے احتمالی (امکانی) جگہ ہونے کی وجہ سے اکثری (عمومی) ضرر کے لئے یعنی ہر بچہ کو ضرر پہنچتا ہے۔ پھر جب آپؐ نے جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ضرر عام نہیں، اور یہ کہ وہ جماع احتمالی جگہ بننے کے قابل نہیں کہ اس پر حرام ٹھہرانا دائر کیا جائے ـــ (فائدہ) اور یہ حدیث اس بات کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے جس کو ہم نے ثابت کیا ہے۔ یعنی یہ بات کہ نبی ﷺ اجتہاد کیا کرتے تھے۔ اور یہ بات کہ آپؐ کا اجتہاد مصلحتوں اور احتمالی جگہوں کو جاننا ہے۔ اور ان پر تحریم وکراہیت کو دائر کرنا ہے۔

لغات: غَالَتْ تَغِيلُ غَيْلاً کے دو معنی ہیں: (۱) دودھ پلانے کے زمانہ میں شوہر کا بیوی سے صحبت کرنا (۲) حمل کی حالت میں بچہ کو دودھ پلانا۔ نہایہ ابن اثیر میں ہے: الغِيلة ـ بالكسر ـ الاسم من الغَيل ـ بالفتح ـ وهو أن يجامع الرجلُ زوجتَه وهي مرضع، وكذلك إذا حملت وهي مرضع ...... نَهَكَه: کمزور کرنا۔

تصحیح: لكونه مظنة للضرر الغالب: مطبوعہ میں لكونه مظنة الغالب لضرر تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

مباشرت کا راز فاش کرنے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن اللہ کے نزدیک وہ آدمی بدترین درجہ میں ہوگا جو اپنی بیوی سے ہم بستر ہوتا ہے۔ اور وہ عورت جو اپنے شوہر سے ہم بستر ہوتی ہے، پھر وہ عورت کا راز فاش کرتا ہے (اور وہ مرد کا راز فاش کرتی ہے)'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۹۰)

تشریح: مباشرت کا راز فاش کرنا دو وجہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: جب جماع کے وقت پردہ کرنا واجب ہے تو درونِ پردہ کیا ہوا کام ظاہر کرنا پردہ کے مقصد کو فوت کرنا، اور اس کی غرض کو توڑنا ہے۔ پس اس کا مقتضی یہ ہے کہ راز فاش کرنے سے روکا جائے۔

دوسری وجہ: زن وشوئی کے معاملات ظاہر کرنا نری بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ اور اس قسم کے جذبات کی پیروی یعنی خانگی باتیں کھولنا اور ان کو دلچسپی سے سننا نفس میں ظلمتیں پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی۔

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: "إن من أَشَرِّ الناس عند الله منزلةً يوم القيامة: الرجلُ يُفضى إلى امرأته، وتُفضى إليه، ثم يَنْشُرُ سِرَّها"

أقول: لما كان السَّتر واجبًا، وإظهارُ ما أُسبل عليه السترُ قلبا لموضوعه، ومناقضًا لغرضه: كان من مقتضاه: أن يُنهى عنه. وأيضًا: فإظهارُ مثلِ هذه مَجَانَةٌ ووقاحةٌ، واتباعُ مثلِ هذه الدواعي يُعِدُّ النفسَ لتشبُّحِ الألوان الظلمانية فيها.

ترجمہ: (۴) جب پردہ پوشی واجب تھی۔ اور اس بات کا اظہار جس پر پردہ لٹکایا گیا ہے، پردہ کے موضوع (مقصد) کو پلٹنا ہے، اور اس غرض کو توڑنا ہے: تو اس کے تقاضے میں سے تھا کہ اس سے روکا جائے ــــ اور نیز: پس اس قسم کی باتوں کا اظہار بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ اور اس قسم کے جذبات کی پیروی: تاریک رنگوں کے نفس میں متمثل ہونے کے لئے نفس کو تیار کرتی ہے۔

لغات: أفضى إليه: پہنچنا...... مَجَنَ مُجُوْنًا ومَجَانَةً: بے حیا ہونا۔

حالت حیض میں جماع حرام ہونے کی وجہ

سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۲ میں ارشاد پاک ہے: ''اور لوگ آپؐ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں؟ آپؐ کہیں کہ وہ گندگی ہے۔ پس حیض میں تم عورتوں سے علحدہ رہا کرو۔ اور ان سے قربت مت کیا کرو، تا آنکہ وہ پاک ہوجائیں۔ پس جب وہ خوب پاک ہوجائیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت

رکھتے ہیں۔ اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت رکھتے ہیں'

تفسیر: نزولِ قرآن کے وقت حائضہ سے معاملہ کرنے میں ملتیں مختلف تھیں۔ یہود غلو کرتے تھے۔ وہ حائضہ کے ساتھ کھانے پینے اور لیٹنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ اور مجوس حیض کو کچھ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے نزدیک صحبت بھی جائز تھی۔ وہ حیض کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ یہ سب افراط وتفریط تھا۔ اسلام نے اعتدال ملحوظ رکھا۔ اور حکم دیا کہ ''صحبت کے علاوہ ہر معاملہ کرو'' (مشکوۃ حدیث ۵۴۵ باب الحیض)

اور صحبت کی ممانعت دو وجہ سے ہے:

اول —— حالت حیض میں صحبت —— خاص طور پر حیض کے ہیجان کے وقت —— ضرر رساں ہے۔ اور اس پر اطباء کا اتفاق ہے۔

دوم —— نجاست میں لت پت ہونا بری عادت ہے، فطرتِ سلیمہ اس سے گریز کرتی ہے۔ اور نجاست سے تلطخ شیاطین سے قریب کرتا ہے۔

اور حرمت کی ان دونوں وجوہ کی طرف لفظ أذىٰ میں اشارہ ہے۔ کیونکہ أذىٰ کے دو معنی ہیں: اصلی اور کنائی: اصلی معنی ہیں ضرر رساں اور کنائی معنی ہیں: کوئی بھی گندگی (قرطبی)

سوال: پیشاب پاخانہ کرنے میں بھی نجاست کے ساتھ تلطخ ہے، پھر اس کی اجازت کیوں ہے؟

جواب: دو فرق ہیں: ایک: استنجا وغیرہ میں ضرورت ہے۔ اور ضرورتیں ممنوعات کو مباح کرتی ہیں۔ اور حالت حیض میں صحبت کرنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ دوم: پاخانہ وغیرہ کرنے میں نجاست کا ازالہ مقصود ہوتا ہے۔ اور حائضہ سے صحبت کرنے میں ناپاکی میں غوطہ لگانا ہے۔ اس لئے دونوں کا حکم مختلف ہے۔

اور حائضہ سے جماع کے علاوہ فائدہ اٹھانے میں روایتیں مختلف ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خاص خون کی جگہ سے بچنے کا حکم دیا ہے: قالت لإنسان: اِجْتَنِبْ شِعَارَ الدم (دارمی ۱:۲۴۳) اور مرفوع روایات میں ہے کہ لنگی کے اوپر سے استفادہ کرسکتا ہے، اور اس سے بھی بچنا بہتر ہے (مشکوۃ حدیث ۵۵۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو چیز حرام ہے اس کو بیان کیا ہے۔ اور حدیث سدِّ ذرائع کے باب سے ہے یعنی جو چیز مفضی الی الجماع ہے اس کو جماع کے حکم میں رکھا گیا ہے۔

حالتِ حیض میں صحبت کا حکم: جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اور حالتِ حیض میں صحبت کرتا ہے: اس کے لئے حدیث میں یہ حکم آیا ہے کہ وہ آدھا دینار خیرات کرے (مشکوۃ حدیث ۵۵۳) اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر حیض کا خون سرخ ہوتو ایک دینار صدقہ کرے، اور زرد ہوتو آدھا دینار صدقہ کرے (مشکوۃ حدیث ۵۵۴) دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ اور فقہاء بھی وجوب پر متفق نہیں۔ البتہ استحباب میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ خیرات کرنا بطور کفارہ ہے۔ اور کفارہ کی

حکمت پہلے کئی جگہ گذر چکی ہے۔

[٥] وكانت الملل مختلفةً فيما يُفعل بالحائض: فمن متعمِّق كاليهود، يمنع مؤاكلتَها ومضاجعتَها؛ ومن متهاوِنٍ كالمجوس، يجوِّزُ الجماع وغيره، ولايجد للحيض بالاً، وكل ذلك إفراط وتفريط، فراعتِ الملةُ المصطفوية التوسطَ، فقال:" اصنعوا كلَّ شيئ إلا النكاح"

وذلك: لمعان: منها: أن جماع الحائض — لاسيما في فور حيضها — ضارٌّ، اتفق الأطباء على ذلك، ومنها: أن مخالطة النجاسة خُلُقٌ فاسد، تمجُّه الطبيعةُ السليمةُ، ويقرِّب من الشياطين.

وفي مثل الاستنجاء حاجةٌ، وإنما المقصود من ذلك إزالتُها، وفي جماع الحائض الغَمْسُ في النجاسة، وهو قوله تعالى:﴿قُلْ: هُوَ أَذًى! فَاعْتَزِلُوْا النِّسَاءَ فِيْ الْمَحِيْضِ﴾

واختلفتِ الرواية فيما دون الجماع: فقيل: يَتَّقِيْ شِعَارَ الدم، وقيل: يَتَّقِي ما تحتَ الإزار. وعلى الوجهين: هو سدُّ الدواعي.

وجاء الأمرُ لمن عصى الله، فجامعَ الحائضَ: أن يتصدق بدينار، أو نصفِ دينار، وهذا ليس بِمُجْمَعٍ عليه، وَسِرُّ الكفارة ما ذكرنا مراراً.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: تَهَاوَن بالأمر: خاطر میں نہ لانا۔ حقیر و معمولی سمجھنا ...... فَوْرُ كل شيئ: ہر چیز کا اول ...... شِعَار: وہ کپڑا جو بالوں سے متصل ہو، یہاں مراد: خون کی جگہ یعنی شرمگاہ ہے ...... المحيض: مصدر میمی بمعنی حیض ہے۔

استدراک: قولہ: وعلى الوجهين إلخ دونوں روایتوں کا محمل سدّ ذرائع نہیں۔ بلکہ صرف دوسری روایت: سدّ ذرائع کے لئے ہے۔

باب — ۷

حقوقِ زوجیت

زوجین میں ارتباط کی اہمیت

خانہ داری کے تعلقات میں سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ نفع بخش اور سب سے زیادہ ضروری زوجین میں ارتباط ہے۔ کیونکہ دنیا جہاں کے تمام لوگوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ عورت امور معاش کی تکمیل میں مرد کا تعاون کرتی ہے، اس کے کھانے پینے اور لباس کی تیاری کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کی اولاد کی پرورش

کرتی ہے۔اوراس کی عدم موجودگی میں گھر میں اس کی نائب ہوتی ہے۔وغیرہ وہ باتیں جن کی وضاحت کی حاجت نہیں۔

چنانچہ آسمانی شریعتوں کی زیادہ تر توجہ اس بات کی طرف رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو یہ ارتباط باقی رہے۔نکاح کے مقاصد تکمیل پذیر ہوں۔اور اس جوڑ کو مکدر کرنے سے اور اس کو ختم کرنے سے احتراز کیا جائے۔اور کوئی بھی جوڑ باہمی الفت ومحبت کے قیام کے بغیر: اس کے مقاصد تکمیل پذیر نہیں ہوسکتے۔والدین اور اولاد کے درمیان کا ارتباط ہو یا آقا اور غلام کے درمیان کا تعلق: اسی وقت نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جبکہ باہم الفت ومحبت ہو۔اور میاں بیوی میں الفت ومحبت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں چند باتوں کی پابندی کریں۔مثلاً: دونوں ایک دوسرے کی ہمدردی وغمگساری کریں۔کسی سے کوئی بے ادبی کی بات سرزد ہوجائے، جیسے ریح خارج ہوجائے، تو اس سے درگذر کریں۔اور دونوں ایسی حرکتوں سے بچیں جن سے بغض ونفرت اور دل میں وساوس پیدا ہوتے ہیں۔اور دونوں الفت ومحبت کی طرح ڈالیں یعنی ہر ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کریں۔اور ایک دوسرے کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئیں۔اور اس قسم کی اور باتوں کا خیال رکھیں تاکہ آپس کا جوڑ مستحکم ہو۔پس حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ اس قسم کی باتوں کی ترغیب دی جائے اور ان پر لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔

ملحوظہ: یہ اس باب کی تمہید ہے۔اس کی تفصیل باب کے تمام مضامین ہیں۔

﴿حقوق الزوجية﴾

اعلم: أن الارتباطَ الواقعَ بين الزوجين أعظمُ الارتباطات المنزلية بأسرها، وأكثرُها نفعًا، وأتمُّها حاجةً: إذ السنةُ عند طوائف الناس عربِهم وعجمِهم: أن تعاونَه المرأةُ في استيفاء الارتفاقات، وأن تتكفَّل له بتَهيِئَةِ المطعمِ، والمشرب، والملبس، وأن تَخْزَنَ مالَه، وتحضُن ولدَه، وتقوم في بيته مقامَه عند غيبته، إلى غير ذلك مما لاحاجة إلى شرحه وبيانه.

فلذلك كان أكثرُ توجُّهِ الشرائع إلى إبقائه ما أمكن، وتوفير مقاصده، وكراهيةِ تنغيصِه وإبطاله. وكلُّ ارتباط: لايمكن استيفاء مقاصده إلا بإقامة الألفة؛ ولا ألفةَ إلا بخصال، يُقَيِّدَان أنفسَهما عليها، كالمواساةِ، وعفوِ ما يَفْرُطُ من سوء الأدب، والاحترازِ عما يكون سببا للضغائن ووَحَرِ الصدر، وإقامةِ الألفة، وطَلاقَةِ الوجه، ونحو ذلك؛ فاقتضت الحكمة: أن يُرَغَّبَ في هذه الخصال، ويُحَثَّ عليها.

ترجمہ: واضح ہے۔لغات: تكفَّل بالشيئ: کسی چیز کا ذمہ دار ہونا...... نَغَّص تَنْغِيْصًا: بے کیف ومکدر ہونا......

الضغينة: کینہ، شدید بغض وعداوت۔ جمع ضَغَائِن...... الوَحَر والوَحْر: دل میں آنے والے پریشان کن خیالات۔
ترکیب: کلُّ ارتباط مبتدا ہے، اور لایمکن إلخ خبر۔

☆ ☆ ☆

عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت قبول کرو۔ پس بیشک وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ اور پسلیوں میں سب سے ٹیڑھی پسلی اوپر کی ہے یعنی اسی نہایت کج پسلی سے عورتیں پیدا کی گئی ہیں۔ پس اگر تم پسلی کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو اس کو توڑ بیٹھوگے۔ اور اگر اس کو اس کے حال پر رہنے دوگے، تو وہ برابر ٹیڑھی رہے گی۔ پس عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی وصیت قبول کرو'' (متفق علیہ) اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ: ''عورت کو توڑنا اس کو طلاق دینا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۳۸ و۳۲۳۹)

تشریح: اس حدیث میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی بات: حدیث کے پہلے اور آخری جز کا مطلب یہ ہے کہ تم میری وصیت قبول کرو، اور اس کے موافق عورتوں سے برتاؤ کرو۔ یعنی نبی ﷺ نے امت کو عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی نہایت تاکید کی ہے۔ پس امت کو چاہئے کہ اس وصیت کے مطابق عورتوں سے اچھا سلوک کریں۔

دوسری بات: حدیث کے دوسرے جزء میں یہ بیان کیا ہے کہ عورتوں کے اخلاق میں کجی اور برائی ہے۔ اور وہ ایسی لازمی ہے جیسی خمیر میں گوندھی ہوئی چیز لازم ہوتی ہے۔ یعنی حدیث کے دوسرے جزء میں عورت کی تخلیق کا بیان نہیں ہے۔ بلکہ نسوانی فطرت میں نہایت کجی کی تمثیل ہے۔

تیسری بات: حدیث کے تیسرے جزء میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جو شخص بیوی سے گھریلو مقاصد کی تکمیل چاہتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ معمولی باتوں کو نظر انداز کرے۔ اور جو باتیں طبیعت کے خلاف پیش آئیں ان کو برداشت کرے، اور غصہ پی جائے (اور یہ تیسری بات: دوسری بات پر متفرع ہے۔ کیونکہ جب نسوانی فطرت نہایت کج واقع ہوئی ہے۔ اور عورت کے بغیر کام نہیں چل سکتا، تو اب اس سے بہتر سلوک کر کے ہی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ورنہ طلاق کی نوبت آجائے گی۔ اور گھر درہم برہم ہوجائے گا)

البتہ اگر عورت کا چال چلن صحیح نہ ہو اور صحیح غیرت کا موقع ہو، یا عورت نافرمان ہو، اور اس کے نشوز کا علاج مقصود ہو، یا اس قسم کی کوئی اور بات پیش نظر ہو تو سخت معاملہ کیا جاسکتا ہے۔

فائدہ: یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ ہر عورت اس کے شوہر کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے: یہ بات مشاہدہ کے خلاف اور

بدیہی البطلان ہے۔ قرآن وحدیث میں اس سلسلہ میں کوئی اشارہ نہیں —— رہا حضرت حواء رضی اللہ عنہا کا حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا ہونے کا معاملہ: تو یہ بات بھی قرآن کریم اور صحیح احادیث میں صراحۃً بیان نہیں کی گئی۔ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں: ﴿وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ میں دونوں مؤنث ضمیریں نفس کی طرف لوٹتی ہیں۔ آدم علیہ السلام کا وہاں صراحۃً ذکر نہیں ہے۔ اور نفس سے مراد نفس انسانی ہے۔ اسی سے آدم وحواء علیہما السلام پیدا کئے گئے ہیں۔ پھر ان کے توسط سے اس نفس انسانی کے بے شمار افراد: مرد وزن پیدا کئے گئے ہیں۔ اس سے زیادہ صراحت قرآن کریم میں نہیں۔ اور صحیح حدیث صرف وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی۔ مگر وہ نسوانی فطرت کی کجی کی تمثیل ہے۔ عورت کی تخلیق کا بیان نہیں۔ عمدۃ القاری (۱۵: ۲۱۳ کتاب أحادیث الأنبیاء حدیث ۳۳۳۱ کی شرح) میں ہے: وقیل: الحدیث: لم یُذکر فیه النساءُ إلا بالتمثیل بالضِّلَع والاعوجاجِ الذی فی أخلاقهن منه، لأن للضلع عِوَجًا، فلا یتهیأ الانتفاع بهن إلا بالصبر علی اعوجاجهن اھ

البتہ تیسرے درجہ کی روایات میں یہ بات صراحۃً مذکور ہے۔ مگر ان کے بارے میں اطمینان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اسرائیلات سے ماخوذ نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ بات بائبل، کتاب پیدائش، باب ۲ آیات ۲۲-۲۴ میں مذکور ہے ممکن ہے وہاں سے اسلامی روایات میں یہ بات درآئی ہو۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت حواء رضی اللہ عنہا کی تخلیق کس مادہ سے ہوئی تھی؟ تو روح المعانی میں سورۃ النساء کی پہلی آیت کی تفسیر میں حاشیہ میں خود مفسر نے امام باقر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، اور عمدۃ القاری (حوالہ بالا) میں ربیع بن انس رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جس مٹی سے آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے تھے، اس کے باقی ماندہ مادّہ سے حضرت حواء پیدا کی گئی تھیں۔ اور یہی بات معقول ہے۔ کیونکہ تمام وہ حیوانات جن میں توالد وتناسل کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے، ان کے پہلے دونوں فرد (مذکر ومؤنث) مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں۔ مادہ: نر کی پسلی سے نہیں پیدا کی گئی۔ واللہ اعلم

[۱] قال صلی الله علیه وسلم: "استوصوا بالنساء خیرًا، فإنهن خُلِقْنَ من ضِلَعٍ، فإن ذهبتَ تقیمه کسرتَه، وإن ترکتَه لم یزل أعوجَ"

أقول: معناه: اقبلوا وصیتی، واعملوا بها فی النساء، وأن فی خُلقهن عوجًا وسوءً، وهو کالأمر اللازم، بمنزلة ما یتوارثه الشیئُ من مادَّته، وأن الإنسان إذا أراد استیفاءَ مقاصدِ المنزل منها: لابد أن یجاوِزَ عن محقرات الأمور، ویکظمَ الغیظَ فیما یجدُه خلافَ هواه، إلا مایکون من باب الغیرة المحمودة، وتدارُکًا لجورٍ، ونحو ذلك.

ترجمہ: (۱) حدیث کے معنی: تم میری وصیت قبول کرو، اور اس کے موافق عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرو (۲) اور یہ کہ ان

کے اخلاق میں کجی اور برائی ہے۔اور وہ کجی امر لازم جیسی ہے، جیسے وہ بات جس کی چیز وارث ہوتی ہے اپنے مادّہ سے یعنی جو بات خمیر میں پڑی ہوتی ہے: وہ چیز میں ضرور ظاہر ہوتی ہے(۳)اور یہ کہ انسان جب اپنے گھریلو مقاصد کی تکمیل کا عورت سے خواہش مند ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ معمولی باتوں سے درگذر کرے۔اور اس بات میں جس کو وہ اپنی خواہش کے خلاف پاتا ہے غصہ کو پیئے۔البتہ وہ بات جو غیرتِ محمودہ کے قبیل سے ہو، یا کسی ظلم کا تدارک ہو، اور اس کے مانند۔

☆ ☆ ☆

بیوی کے ساتھ خوبی سے گذران کرنے کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی مؤمن (شوہر) کسی مؤمنہ (بیوی) سے نفرت نہ کرے۔اگر اس کو عورت کی کوئی عادت ناپسند ہے، تو وہ اس کی کوئی دوسری عادت پسند کرے گا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۴۰)

تشریح: اگر شوہر کو عورت کی کوئی عادت ناپسند ہو، تو بھی مناسب یہ ہے کہ طلاق دینے میں جلدی نہ کرے، بلکہ خوبی کے ساتھ گذران کرے۔کیونکہ بارہا عورت میں اور پسندیدہ عادتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے معاشرتی تلخی برداشت کی جاسکتی ہے۔

فائدہ: سورۃ النساء آیت ۱۹ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ، فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ ترجمہ: اور بیویوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو۔اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں، تو ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو، اور اللہ تعالیٰ اس میں کوئی بڑی منفعت رکھ دیں۔مثلاً: وہ بیوی یا اس سے پیدا ہونے والی اولاد تمہارے لئے باعث خیر ہو۔

[۲] وقال صلى الله عليه وسلم: "لايَفْرَكْ مؤمنٌ مؤمنةً، إن كره منها خُلُقا رَضِيَ منها آخَرَ"
أقول: الإنسان إذا كره منها خُلُقا ينبغي أن لايبادِرَ إلى الطلاق، فإنه كثيرًا مّايكون فيها خُلُقٌ آخَرُ يُستطاب منها، ويُتحمل سوءُ عشرتها لذلك.

ترجمہ: انسان جب عورت کی کوئی عادت ناپسند کرے تو (بھی) مناسب یہ ہے کہ طلاق دینے میں جلدی نہ کرے۔پس بیشک بارہا عورت میں دوسری عادتیں ہوتی ہیں جو پسندیدہ ہوتی ہیں۔اور اس کی خاطر برداشت کی جاتی ہے اس کے ساتھ میل جول کی برائی۔

لغات: فَرِكَ (س) فَرْكًا: میاں بیوی کا ایک دوسرے سے نفرت کرنا، بغض رکھنا...... اِستَطاب الشیئَ: کسی چیز کو اچھا پانا یا سمجھنا۔

عورتوں کے ساتھ حُسنِ معاشرت

حدیث ــــــ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا: ''عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو یعنی ان کے حقوق ادا کرو، اوران پر زیادتی نہ کرو، کیونکہ تم نے ان کو اللہ کے امن وامان کے ساتھ (اپنے نکاح میں) لیا ہے یعنی تم نے ان کو اللہ کا عہد دیا ہے کہ تم ان کے ساتھ نرمی اور خوبی کا برتاؤ کروگے۔ اور تم نے ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے احکام کے مطابق حلال کیا ہے (پس ان احکام کو پامال نہ کرو، اور وہ احکام یہ ہیں:) اور تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ تمہارے بستروں کو کوئی ایسا شخص نہ روندے جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔ یعنی جس مرد یا عورت کا گھر میں آنا تمہیں پسند نہ ہو: ان کو عورتیں گھر میں آنے کی اجازت نہ دیں۔ پس اگر وہ خلاف ورزی کریں تو تم ان کو مارو، ایسا مارنا جو اذیت رساں نہ ہو۔ اور ان کا تم پر دستور کے موافق نان نفقہ اور کپڑا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۵۵۵ کتاب الحج، باب قصة حجة الوداع، فی حدیث جابر الطویل)

تشریح: عورتوں کے معاملہ میں اصل واجب: خوبی کے ساتھ میل جول رکھنا ہے۔ سورۃ النساء آیت ۱۹ میں اللہ پاک نے اسی کا حکم دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ''اور ان عورتوں کے ساتھ دستور کے مطابق گذر بسر کرو''۔ مذکورہ حدیث میں نبی ﷺ نے اسی کی وضاحت کی ہے۔ اور نان نفقہ، لباس اور خوبی والے برتاؤ کو اس میں شامل کیا ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت نہیں کی، کیونکہ آسمانی شریعتوں میں آخری درجہ کی تفصیلات طے کرنا ممکن نہیں۔ مثلاً یہ طے کرنا کہ نفقہ میں کونسی جنس دی جائے، اور کتنی مقدار دی جائے؟ یہ طے کرنا ناممکن ہے، اس لئے کسی چیز کی تخصیص کئے بغیر مطلق حکم دیا، تاکہ دنیا کے تمام لوگ اپنے عرف و دستور کے لحاظ سے عمل کریں۔

> [۳] قال صلى الله عليه وسلم: " اتقوا اللّٰهَ في النساء، فإنكم أخذتموهنّ بأمان الله، واستحللتم فروجَهن بكلمة الله، ولكم عليهن أن لا يُوْطِئْنَ فُرُشَكم أحدًا تكرهونه، فإن فعلن فاضربوهن ضربًا غير مُبَرِّحٍ، ولهن عليكم رزقهن وكسوتهم بالمعروف"
>
> اعلم: أن الواجب الأصليَّ هو المعاشرة بالمعروف، وهو قوله تعالى: ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ فبيَّنها النبي صلى الله عليه وسلم بالرزق، والكسوة، وحسن المعاملة؛ ولايمكن في الشرائع المستَنِدة إلى الوحي: أن يُعَيِّنَ جنسُ القُوْتِ وقدرُه مثلا، فإنه لايكاد يتفق أهل الأرض على شيئ واحد، ولذلك إنما أمر أمرًا مطلقًا.

ترجمہ: (۳) جان لیں کہ واجب اصلی: وہ خوبی کے ساتھ میل جول رکھنا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور

گذران کروان کے ساتھ دستور (عرف) کے موافق" پس وضاحت فرمائی نبی ﷺ نے معاشرتِ معروف کی نان ونفقہ، لباس اور عمدہ معاملہ کے ذریعہ۔ اور نہیں ممکن ہے ان شریعتوں میں جو وحی پر بھروسہ کرنے والی ہیں: یہ بات کہ روزی کی جنس اور اس کی مقدار ــــ بطور مثال ــــ متعین کی جائے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ نہیں قریب ہیں زمین والے کہ متفق ہوں کسی چیز پر، اور اسی وجہ سے آپ نے مطلق حکم دیا۔

لغات: يُؤْطِئْنَ ہمزہ کے ساتھ اور يُوْطِئْنَ ابدال کے ساتھ، باب افعال سے ہیں۔ اَوْطَأَ الأرضَ: زمین روندوانا ...... ضَرَبَهُ ضَرْبًا مُبَرِّحًا: اسے بری طرح پیٹا۔ مُبَرِّح: اذیت رساں۔ أَلَمٌ مُبَرِّحٌ: سخت درد...... المستَنِدَة: (اسم فاعل) اِسْتَنَدَ إليه: منسوب ہونا، ٹیک لگانا، بھروسہ کرنا۔

☆ ☆ ☆

عورت شوہر کے بلانے پر نہ آئے تو اس پر لعنت کی وجہ

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر پر بلائے، اور وہ نہ آئے اور شوہر اس پر غصہ میں رات گذارے، تو اس پر فرشتے صبح تک لعنت کرتے ہیں" (مشکوۃ حدیث ۳۲۴۶)

تشریح: جب نکاح میں ملحوظ مصلحت مرد کی شرمگاہ کی حفاظت ہے، تو ضروری ہے کہ اس مصلحت کو واقعہ بنایا جائے، اور اس کو بروئے کار لایا جائے۔ کیونکہ اصلِ شرعی یہ ہے کہ جب کسی مصلحت کے لئے کوئی مظنہ مقرر کیا جاتا ہے (جیسے شرمگاہ کی حفاظت کے لئے نکاح مظنہ (احتمالی جگہ) ہے) تو اس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ جب مظنہ پایا جائے تو وہ مصلحت ضرور پائی جائے۔ اس لئے عورت کو حکم دیا کہ جب شوہر اس سے صحبت کی خواہش کرے تو وہ اس کی ہم نوائی کرے۔ ورنہ تحصینِ فرج کی مصلحت متحقق نہیں ہوگی۔ پس اگر عورت انکار کرتی ہے تو وہ اس مصلحت کو ٹھکراتی ہے جو عند اللہ مقصود ہے۔ اور قاعدہ ہے کہ جو اس مصلحت کو پامال کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بندوں میں قائم کی ہے یعنی نظام عالم کو درہم برہم کرتا ہے: اس پر فرشتوں کی لعنت برستی ہے۔ اِسی ضابطہ سے عورت پر صبح تک فرشتوں کی لعنت ہوتی ہے۔

فائدہ: صبح کے بعد کیا صورت ہوگی؟ اس میں دو قول ہیں: ایک: یہ کہ صبح لعنت موقوف ہوجائے گی، کیونکہ شوہر کاموں میں مشغول ہوجائے گا۔ اور جماع سے اس کا ذہن ہٹ جائے گا۔ دوسرا: دلیل کے اعتبار سے راجح قول یہ ہے کہ صبح سے شام تک بھی لعنت برستی رہے گی، جب تک وہ شوہر کو موقع نہ دے۔ اور حدیث میں اکتفاء بأحد الأمرین ہے۔ جیسے بیدك الخیر میں (مرقات شرح مشکوۃ)

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: "إذا دعا الرجل امرأته إلى فِراشه، فأبتْ، فبات غضبانَ: لعنَتْها الملائكةُ حتى تُصبح"

أقول: لما كانت المصلحةُ المرعيةُ في النكاح تحصينَ فرجه: وجب أن تُحقَّق تلك المصلحةُ؛ فإن من أصول الشرائع: أنها إذا ضُربتْ مَظِنَّةً لشيئ: سُجِّلَ بما يُحقِّقُ وجودَ المصلحة عند المظنة؛ وذلك: أن تُؤمر المرأةُ بمطاوعته، إذا أراد منها ذلك، ولولا هذا لم يتحقق تحصينُ فرجه، فإن أبتْ فقد سعتْ في رد المصلحة التي أقامها الله في عباده، فتوجَّه إليها لعنُ الملائكة على كل من سعى في إفسادها.

ترجمہ: جب وہ مصلحت جو نکاح میں ملحوظ رکھی گئی ہے: مرد کی شرمگاہ کو محفوظ کرنا تھی، تو ضروری ہوا کہ وہ مصلحت بروئے کار لائی جائے۔ پس بیشک شریعتوں کے اصول میں سے یہ بات ہے کہ جب کوئی مصلحت کسی چیز کے لئے احتمالی جگہ مقرر کی جاتی ہے، تو اس بات کی تاکید کی جاتی ہے جو مصلحت کے پائے جانے کو واقعہ بنائے، مظنہ پائے جانے پر۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ عورت کو حکم دیا جائے شوہر کا ساتھ دینے کا جب وہ عورت سے وہ بات چاہے۔ اور اگر یہ بات نہیں ہوگی تو شوہر کی شرمگاہ کو محفوظ کرنا واقعہ نہیں بنے گا۔ پس اگر عورت انکار کرتی ہے، تو یقیناً اس نے کوشش کی اس مصلحت کو ٹھکرانے میں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں برپا کیا ہے۔ پس عورت کی طرف متوجہ ہوگی فرشتوں کی وہ لعنت جو ہر اس شخص پر ہوتی ہے جو اس مصلحت کو خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لغات: حَقَّق الأمر: حقیقت وواقعہ بنانا۔ ثابت کرنا، سچا کر دکھانا، بروئے کار لانا، پایۂ ثبوت کو پہنچانا...... سَجَّلَ: درج رجسٹر کرنا۔ پکا کرنا، مؤکد کرنا۔

ترکیب: أنها إذا ضربت میں أنها کی ضمیر مؤنث: المصلحة کی طرف عائد ہے اور وہی ضُرِبَت کی ضمیر کا مرجع ہے...... توجَّه إليها إلخ میں على كل إلخ لعن سے متعلق ہے۔

تصحیح: في إفسادها اصل میں في فسادها تھا۔ یہ تصحیح مولانا سندھی رحمہ اللہ نے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

بلا وجہ غیرت کھانا اللہ کو سخت ناپسند ہے

حدیث ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بعض غیرتیں اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں، اور بعض سخت ناپسند: وہ غیرت جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے: وہ شک کی بات میں غیرت کھانا ہے۔ اور وہ غیرت جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے: وہ خواہ مخواہ غیرت کھانا ہے'' (نسائی ۵:۷۸ مصری، کتاب الزکوۃ، باب الاختیال فی الصدقۃ)

تشریح: ایک غیرت کھانا وہ ہے جو کسی مصلحت یا گھر کے ضروری نظم وانتظام پر مبنی ہے۔ جیسے عورت کا عمومی چال چلن مشکوک ہو، یا اس کا کسی خاص آدمی سے ملنا شک کے دائرہ میں آتا ہو، تو غیرت کھانا اور عورت پر پابندی لگانا اللہ تعالیٰ کو

پسند ہے۔ دوسری غیرت: شوہر کی بداخلاقی اور تنگ دلی کی بنا پر ہے۔ اور بلاوجہ عورت کو پریشان کرنا ہے۔ یہ غیرت اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ مذکورہ روایت میں نبی ﷺ نے دونوں غیرتوں میں خط امتیاز کھینچا ہے۔

[٥] قال صلى الله عليه وسلم: "إن من الغيرة ما يحب اللّٰهُ، ومنها ما يُبغض الله: فأما التي يحبها الله: فالغيرة في الرِّيبة، وأما التي يُبغضها الله: فالغيرة في غير رِيبة"

أقول: فَرَّق بين إقامة المصلحة والسياسة التي لابد له منها، وبين سوء الخلق، والضجر، والضِيق من غير موجب.

ترجمہ: نبی ﷺ نے امتیاز کیا ہے مصلحت اور اس سیاست کو برپا کرنے کے درمیان جس سے شوہر کو مفر نہیں، اور بداخلاقی اور تنگ دلی اور بلاوجہ کی تنگی کے درمیان۔

☆ ☆ ☆

عورت کے نشوز کا علاج اور اس کی وجہ

سورۃ النساء آیات ۳۴ و۳۵ میں عورت کی نافرمانی کے بالترتیب چار علاج تجویز کئے گئے ہیں۔ اور بات یہاں سے شروع کی ہے کہ: "مرد عورتوں کے نگرانِ کار ہیں" کیونکہ جب نکاح کے ذریعہ گھر وجود میں آیا ہے، جس کے دورکن ہیں تو یہ بات مناسب نہیں کہ دونوں خود مختار ہوں، اس سے بے راہ روی پیدا ہوگی۔ اور دونوں ایک دوسرے پر حاکم ہونگے تو کشمکش ہوگی۔ اور عورت کی بالا دستی سے بہتر مرد کی بالا دستی ہے۔

(الف) فطری طور پر بھی کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو قوت عقلی زیادہ عطا فرمائی ہے۔ اور سیاست سے بھی مردوں کو وافر حصہ ملا ہے یعنی مرد معاملات کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہیں۔ اور حرم کی حفاظت اور عار کی باتیں ہٹانے میں بھی مرد زیادہ مضبوط ہیں۔ ارشاد پاک: "بایں وجہ کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو بعضوں پر برتری بخشی ہے" کا یہی مطلب ہے۔

(ب) اور مال کے ذریعہ بھی کہ مرد عورت کے نان ونفقہ، اور لباس وغیرہ ضروریات کا انتظام کرتا ہے۔ پس اس کا عورت پر ایک طرح کا احسان ہے۔ اس لئے عورت طبعی طور پر مرد کی ممنون ہے۔ ارشاد پاک: "اور بایں وجہ کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں" کا یہی مطلب ہے۔

پھر جو عورتیں نیک چلن ہیں —— اور زیادہ تر عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں —— ان کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ارشاد پاک ہے: "پس نیک عورتیں: اطاعت شعار اور پوشیدہ چیز (ناموس) کی بہ حفاظتِ خداوندی حفاظت کرنے والی ہیں" یعنی وہ اللہ کی مدد وتوفیق سے اپنی آبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔

البتہ جن عورتوں کی نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کی اصلاح ضروری ہے۔ اور نشوز کے درجات کے تفاوت سے اصلاح کے چار طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: زبانی فہمائش کرنا۔ کیونکہ اصلاح کا اصول یہ ہے کہ پہلے آسان تدبیر کی جائے۔ اس سے کام نہ چلے تو سختی کی جائے۔

دوسرا طریقہ: ناراضگی ظاہر کرنا اور عورت کو اپنے ساتھ نہ لٹانا، مگر عورت کو گھر سے نہ نکالے، نہ خود نکلے۔ تاکہ عورت اپنے قصور کی تلافی کرنا چاہے تو کر سکے۔

تیسرا طریقہ: تعزیر و تادیب ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ چہرے پر اور نازک حصوں پر نہ مارے، اور سخت مار بھی نہ مارے کہ جس سے جسم پر نشان پڑ جائیں۔ ان تین طریقوں سے معاملہ قابو میں آجائے اور عورت بات ماننے لگے تو خواہ مخواہ عورت کو پریشان نہ کرے، یاد رکھے کہ وہ مطلق بالا دست نہیں۔ اس سے اوپر بھی ایک بالا دست ہے۔

چوتھا طریقہ: اگر اختلاف سخت ہو جائے۔ اور مرد عورت کی نافرمانی، اور عورت مرد کے ظلم کا دعوی کرے، تو اب نزاع ختم کرنے کی صورت یہ ہے کہ دو آدمیوں کی پنچایت بٹھائی جائے: ایک پنچ مرد کے خاندان کا ہو، اور ایک عورت کے خاندان کا۔ دونوں اگر اخلاص سے محنت کریں گے تو زوجین میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ورنہ پھر علحدگی کا راستہ ہے۔

اور عورت کے نشوز کا یہ علاج مرد کے اختیار میں اس لئے دیا گیا ہے کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار اعلی ہے اور عورت کی سیاست (نظم و انتظام) بھی اسی کے ذمے ہے۔ پس اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ کام مرد ہی کو سپرد کیا جائے۔

اور آخری مرحلہ میں پنچایت بٹھانے کا حکم اس لئے ہے کہ جو باتیں زوجین کے درمیان پیش آئی ہیں، ان پر قاضی کے سامنے گواہ قائم کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے اس معاملہ میں قضات کوئی خاص رول ادا نہیں کر سکتے۔ پس بہتر یہ ہے کہ معاملہ ایسے دو شخصوں کو سونپا جائے جو زوجین کے قریبی رشتہ دار اور خاندان میں دونوں پر زیادہ مہربان ہیں۔ تاکہ میاں بیوی کھل کر ان کے سامنے بات رکھ سکیں، اور وہ جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔

فائدہ: آیت کریمہ میں یہ بات اصلِ کلی کی صورت میں بیان کی گئی ہے۔ **الرجال** اور **النساء** عام الفاظ ہیں **الأزواج** اور **الزوجات** خاص الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں یعنی صنفِ مرد صنفِ عورت پر بالا دست ہے۔ صنف کی صنف پر فطری برتری کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ رجال نساء پر خرچ کرتے ہیں۔ اولاً باپ بیٹی پر خرچ کرتا ہے، پھر شوہر بیوی کے مصارف کا کفیل ہوتا ہے۔ اور بیوہ کی کفالت: باپ یا خاندان کرتا ہے۔ اور **الإنسان عبد الإحسان** حقیقت واقعہ ہے۔ چنانچہ مرد کو نگرانِ کار اور ذمہ دار بنایا گیا۔ باپ بیٹی کا نگران ہے جب تک وہ باپ کے ماتحت ہے۔ اسی طرح شوہر نگران ہے جب وہ بیوی بن جائے۔

[٦] قال الله تعالى: ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ﴾ إلى قوله: ﴿إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا﴾

أقول: يجب أن يُجعل الزوجُ قوّاما على امرأته، وأن يكون له الطَّوْلُ عليها:

[الف] بالجبلة: فإن الزوج أتمُّ عقلاً، وأوفر سياسة، وآكد حمايةً، وذبًّا للعار.

[ب] وبالمال: حيث أنفق عليها رزقَها وكسوتَها.

وكونُ السياسة بيده: يقتضي أن يكون له تعزيرُها وتأديبها إذا بغت، وليأخذْ بالأسهل فالأسهل؛ فالأولُ بالوعظ، ثم الهجر في المضجع يعني تركَ مضاجعتِها، ولا يُخرجها من بيته، ثم الضربِ غيرِ المبرِّح أي الشديد؛ فإن اشتدَّ الشقاقُ، وادَّعى كلٌّ نشوزَ الآخر، وظلْمَه: لم يمكن قطعُ المنازعة إلا بحكمَيْن: حَكَمٍ من أهله، وحكمٍ من أهلها، يحكمان عليهما من النفقة وغيرها ما يَرَيان من المصلحة.

وذلك: لأن إقامة البينة على ما يجرى بين الزوجين ممتنعة، فلا أحقَّ من أن يجعل الأمر إلى أقرب الناس إليهما وأشفقِهم عليهما.

ترجمہ: ضروری ہے کہ شوہر کو اس کی بیوی پر حاکم بنایا جائے، اور یہ کہ شوہر کے لئے اپنی بیوی پر پوری وسعت ہو: (الف) فطری طور پر: پس بیشک مرد عقل میں زیادہ تام ہیں، اور نظم وانتظام میں کامل تر ہیں۔ اور حمایت اور عار دفع کرنے میں زیادہ مضبوط ہیں (ب) اور مال کے ذریعہ بایں طور کہ وہ عورت پر اس کی روزی اور اس کا لباس خرچ کرتا ہے —— اور نظم وانتظام کا شوہر کے ہاتھ میں ہونا چاہتا ہے کہ جب عورت سرکشی کرے تو اس کی تعزیر وتادیب مرد کے ہاتھ میں ہو۔ اور چاہئے کہ وہ زیادہ آسانی کو اپنائے، پھر اس سے کم آسانی کو۔ پس اول نصیحت کے ذریعہ ہے، پھر خوابگاہ میں چھوڑنے کے ذریعہ یعنی اس کے ساتھ ہم خوابی چھوڑنے کے ذریعہ۔ اور اس کو اپنے گھر سے نہ نکالے۔ پھر مارنے کے ذریعہ جو اذیت ناک نہ ہو یعنی سخت نہ ہو۔ پس اگر اختلاف سخت ہوجائے، اور ہر ایک دوسرے کی نافرمانی اور اس کے ظلم کا دعوی کرے، تو جھگڑا نمٹنا ممکن نہیں مگر دو پنچوں کے ذریعہ: ایک پنچ مرد کے خاندان کا، اور ایک عورت کے خاندان کا۔ دونوں زوجین پر نفقہ وغیرہ کا فیصلہ کریں، اس مصلحت کے موافق جو ان کی سمجھ میں آئے۔

اور یہ بات اس لئے ہے کہ ان باتوں پر جو زوجین کے درمیان پیش آتی ہیں گواہ قائم کرنا ممکن نہیں۔ پس اس بات سے زیادہ بہتر کوئی بات نہیں کہ معاملہ دونوں سے قریب تر لوگوں کو، اور خاندان میں سے دونوں پر زیادہ مہربان شخصوں کو سونپا جائے۔



عورت کو ورغلانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی عورت کو اس کے شوہر کے خلاف، یا کسی غلام کو اس کے آقا کے خلاف ورغلایا وہ ہم میں سے نہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۶۲)

تشریح: عورت یا غلام کو شوہر یا آقا کے خلاف بھڑکانا گھر کے نظام کو تباہ کرنا ہے۔ اس سے خانگی تعلقات مکدر ہوتے ہیں، اور طلاق کی نوبت آسکتی ہے۔ اور یہ بہکانا اس نظام کو تحلیل کرنے کی، اور اس مصلحت کو برباد کرنے کی کوشش ہے جس کا قائم کرنا واجب ہے۔ یعنی گھریلو تعلقات کو پروان چڑھانا ضروری ہے۔

[۷] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " ليس منا من خَبَّبَ امرأةً على زوجها، أو عبدًا على سيده"
أقول: أحد أسبابِ فسادِ تدبيرِ المنزل: أن يُخَبِّبَ إنسانٌ المرأةَ، أو العبدَ؛ وذلك: سعيٌ في تنغيص هذا النظم وفَكِّهِ، ومناقضةٌ للمصلحة الواجب إقامتها.

ترجمہ: گھر کے نظام کے بگاڑ کا ایک سبب: یہ ہے کہ کوئی شخص عورت کو یا غلام کو خراب کرے۔ اور وہ ورغلانا: اس نظام کو مکدر کرنے اور اس کو کھولنے کی کوشش ہے، اور اس مصلحت کو توڑنا ہے جس کا برپا کرنا واجب ہے۔

☆ ☆ ☆

خانگی نظام کو خراب کرنے والی باتیں

۱- بیویوں میں ناانصافی

چند باتیں ایسی ہیں جو لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، جن میں ابتلاء عام ہے: ان سے نظام خانہ داری خراب ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ شریعت ان کے درپے ہو، اور ان کے احکام بیان کرے۔

ان میں سے پہلی بات: یہ ہے کہ کسی کی چند بیویاں ہوں، اور وہ ان میں انصاف نہ کرے، ایک کو باری وغیرہ میں ترجیح دے۔ اور دوسری پر ظلم کرے۔ اور اس کو معلّق جیسی کرکے چھوڑ دے، تو اس سے گھر کا نظام تباہ ہوگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کی ممانعت نازل ہوئی۔ سورۃ النساء آیت ۱۲۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اور تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں کے درمیان پوری طرح برابری کرو، گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے۔ پس تم ایک طرف کو جھک نہ پڑو، پوری طرح سے جھک پڑنا، پس تم اس کو ایسا چھوڑ دو جیسے کوئی چیز اَدھر لٹکی ہو، اور اگر تم معاملہ درست کرلو، اور احتیاط برتو، تو اللہ تعالیٰ بیشک بخشنے والے، بڑے مہربان ہیں''



اور حدیث شریف میں بھی اس پر سخت وعید آئی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی کی دو بیویاں ہوں، پس اس نے دونوں کے درمیان انصاف نہ کیا، تو قیامت کے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کی ایک جانب جھڑی ہوئی ہوگی'' (ترمذی ۱:۲۱۳۶ کتاب النکاح، باب التسویۃ بین الضرائر) یہ جزاء جنسِ عمل سے ہے۔ اس نے ایک بیوی کو مفلوج کر رکھا تھا، اس لئے اس کی ایک جانب مفلوج ہوگی۔

۲- عورتوں کو ان کی مرضی کی شادی کرنے سے روکنا

دوسری بات: خرابی پیدا کرنے والی یہ ہے کہ اولیاء عورتوں کو اس شخص سے شادی کرنے سے روکیں، جس سے وہ شادی کرنا چاہیں۔ درانحالیکہ وہ ان کا کُفُو بھی ہو۔ اور اولیاء کے روکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس شخص سے ان کی اَن بن ہوتی ہے۔ دل میں کینہ اور غصہ ہوتا ہے۔ یا کسی وجہ سے ناک کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ یا کوئی دوسرا ایسا ہی نفسانی داعیہ ہوتا ہے جس کی وہ پیروی کرتے ہیں۔ اور عورتوں کی راہ میں اڑچن کھڑی کرتے ہیں۔ حالانکہ اس میں جو مفاسد ہیں وہ مخفی نہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۲ نازل ہوئی: ''اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو، پس وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے، پس تم ان کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے (سابق) شوہروں سے نکاح کریں، جبکہ وہ قاعدے کے موافق باہم رضامند ہو جائیں''

تفسیر: ایک عورت کو اس کے خاوند نے ایک یا دو طلاقیں دیں۔ اور عدت میں رجوع نہ کیا۔ جب عدت ختم ہوگئی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ سابق شوہر نے بھی نکاح کا پیام دیا۔ عورت بھی اس سے نکاح کرنے پر راضی تھی۔ مگر عورت کے بھائی کو غصہ آیا۔ اور اس نے اپنی بہن کو زوج اول سے نکاح کرنے سے روک دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ عورت کی خوشنودی اور بہبودی کو ملحوظ رکھو، اس کو اَنا کا مسئلہ نہ بناؤ۔ اور یہ حکم ہر ولی کے لئے عام ہے۔ ہاں اگر قاعدہ کے خلاف کوئی بات ہو، مثلاً غیر کفو میں عورت نکاح کرنا چاہے تو اولیاء کو روکنے کا حق ہے (فوائد شیخ الہند رحمہ اللہ ملخصاً)

۳- یتیم لڑکیوں سے شادی کرنا اور ان کے حقوق ادا نہ کرنا

تیسری بات: جو خرابی پیدا کرنے والی تھی: وہ یہ تھی کہ یتیم لڑکیاں جن لوگوں کی پرورش میں ہوتیں: اگر وہ مالدار اور خوبصورت ہوتیں تو ان سے خود نکاح کرتے، مگر ان کے پورے حقوق ادا نہ کرتے، جس طرح باپ والی لڑکیوں کے حقوق ادا کئے جاتے ہیں۔ اور اگر ان میں مالداری اور خوبصورتی نہ ہوتی تو اس کا دوسری جگہ نکاح کرتے۔ اس خرابی کی اصلاح کے لئے سورۃ النساء کی آیت تین نازل ہوئی۔ ارشاد فرمایا: ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہیں کرو گے، تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہیں پسند ہوں: دو دو، تین تین اور چار چار سے۔ پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ (چند

بیویوں میں) انصاف نہیں کروگے تو ایک پر یا اپنی مملوکہ لونڈیوں پر اکتفا کرو" —— اس آیت پاک میں دوحکم ہیں:

۱— اگر ظلم کا اندیشہ ہو تو یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

۲— اسی طرح اگر ناانصافی کا ڈر ہو تو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔ بلکہ ایک کے بھی حقوق ادا نہ کرسکتا ہو تو باندی سے کام چلائے یا روزوں سے علاج کرے۔

[۸] واعلم: أن من باب فسادِ تدبيرِ المنزل: خصالاً فاشيةً في الناس، كثيرًا المبتلون بها، فلا بد أن يَتعرض الشرعُ لها، ويَبحث عنها:

منها: أن يجتمع عند رجل عددٌ من النسوة، فيفضِّلُ إحداهن في القَسْمِ وغيره، ويظلم الأخرى، ويتركها كالمعلَّقة، قال الله تعالى: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ، فَلاَ تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ، وَإِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "إذا كانت عند الرجل امرأتان، فلم يعدل بينهما، جاء يومَ القيامة وشِقُّه ساقطٌ"

أقول: قد مر أن المجازاة إنما تظهر في صورة العمل، فلا نُعيده.

ومنها: أن يعضُلَهن الأولياءُ عمن يرغَبْن فيه من الأكفاء، اتباعًا لداعيةٍ نفسانية من حِقد وغضب ونحوهما، وفي ذلك من المفسدة مالا يخفى، فنزل قوله تعالى: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ، فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ﴾

ومنها: أن يتزوج اليتامى اللاتي في حِجره، إن كنَّ ذوات مالٍ وجمال، ولا يَفِيْ بحقوقهن مثلَ ما يصنع بذوات الآباء؛ ويتركهن إن كن على غير ذلك، قال الله تعالى: ﴿وَإِنْ خِفْتُمْ أَلاَّ تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى، فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبَاعَ، فَإِنْ خِفْتُمْ أَنْ لاَّ تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ فَنُهِيَ الإنسانُ— إن خَشِيَ الجَوْرَ— أن ينكح اليتامى، أو ينكح ذواتَ عددٍ من النساء.

ترجمہ: اور جان لیں کہ گھر کے نظام کے بگاڑ کے قبیل سے ہیں: لوگوں میں پھیلی ہوئی چند باتیں، جن میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان باتوں سے شریعت تعرض کرے، اور اس سے بحث کرے —— از انجملہ: یہ ہے کہ ایک شخص کے پاس چند بیویاں اکٹھا ہوں۔ پس وہ ان میں سے ایک کو باری وغیرہ میں ترجیح دے۔ اور دوسری پر ظلم کرے۔ اور اس کو معلّق جیسا چھوڑ دے (اس کے بعد آیت اور حدیث ہیں) میں کہتا ہوں: یہ پہلے گذر چکا ہے کہ

مجازات عمل کی صورت ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ پس ہم اس کو نہیں دُھراتے ۔ اور از انجملہ: یہ ہے کہ اولیاء عورتوں کو روکیں اس شخص سے جس میں وہ رغبت کرتی ہیں۔ جو کفو میں سے ہے۔ کینہ اور غصہ اور ان کے مانند کسی نفسانی تقاضے کی پیروی کرتے ہوئے۔ اور اس میں جو خرابی ہے وہ پوشیدہ نہیں — اور از انجملہ: یہ ہے کہ ان یتیم لڑکیوں سے نکاح کرے جو اس کی پرورش میں ہیں: اگر وہ مالدار اور خوبصورت ہوں۔ اور ان کے حقوق پورے ادا نہ کرے جس طرح باپ والی لڑکیوں کے پورے حقوق ادا کئے جاتے ہیں۔ اور چھوڑ دے ان کو اگر وہ اس کے علاوہ ہوں یعنی مالدار اور خوبصورت نہ ہوں...... پس روکا گیا انسان — اگر وہ ظلم سے ڈرتا ہے — اس بات سے کہ وہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کرے، یا عورتوں میں سے کئی ایک سے نکاح کرے۔

☆ ☆ ☆

نئی بیوی کے حقِ شب باشی کی وجہ

حدیث — حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''اسلامی طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص باکرہ سے کسی عورت پر نکاح کرے تو اس کے پاس سات راتیں رہے، پھر باری مقرر کرے۔ اور جب بیوہ سے نکاح کرے تو اس کے پاس تین راتیں رہے، پھر باری مقرر کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۲۳)

تشریح: نئی بیوی کا مذکورہ حقِ شب باشی دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: پہلے بطور تمہید یہ بات جان لیں کہ چند بیویوں میں عدل وانصاف کرنا اور شب باشی کے لئے باری مقرر کرنا اگرچہ واجب ہے، مگر اس معاملہ میں بہت زیادہ سختی اور تنگی کرنا بھی درست نہیں۔ یعنی اس معاملہ میں کوئی استثناء ہی باقی نہ رہے: یہ بات بھی جائز نہیں۔ کیونکہ پوری اور حقیقی برابری کرنا اکثر انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ سورۃ النساء آیت ۱۲۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں برابری رکھو، گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے، پس تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ'' یعنی جب خالص انصاف کرنا ممکن نہیں تو صریح ظلم پر بھی نہ اتر آؤ، کیونکہ یہ اختیاری بات ہے۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ بعض معاملات میں، مثلاً مودّت کے معاملہ میں، حقیقی برابری ممکن نہیں۔ پس انسان اس کا مکلف نہیں۔

اس تمہید کے بعد جاننا چاہئے کہ آدمی بیوی کی موجودگی میں نئی شادی اس وقت کرتا ہے، جب کسی عورت کی طرف وہ راغب ہوتا ہے۔ اس کا حسن وجمال اس کو پسند آتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اس کے دل میں کھپ جاتی ہے۔ اور وہ اس عورت کا بہت زیادہ مشتاق ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں شوہر کو اس کا پابند کرنا کہ وہ شادی کے بعد نئی دلہن کے پاس بھی ایک ہی رات رہے: یہ تقریباً ناممکن ہے۔ اور محال جیسی بات کا حکم دینا ہے۔ اس لئے شریعت نے یہ استثنائی صورت رکھی

ہے۔اورنئی بیوی کے لئے مذکورہ حق شب باشی مقرر کیا ہے۔اوراس حق کی مقدار مقرر کی ہے تاکہ شوہراس پرزیادتی کرکے پرانی بیوی پرزیادتی نہ کرے۔

دوسری وجہ: شریعت میں ملحوظ مصالح میں تالیف قلب اور عزت افزائی بھی ہے۔مہمان کا اکرام اور یک شبانہ روز کی دعوت اسی غرض سے مامور بہ ہے۔پس نئی دلہن کی تالیف اور اکرام بھی ضروری ہے۔اوراس کی یہی صورت ہے کہ چندروز تک شب باشی میں اس کو ترجیح دی جائے۔یہ بات ایک حدیث سے مفہوم ہوتی ہے۔جب نبی ﷺ کا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا،تو آپؐ نے تین راتیں مسلسل ان کے پاس گذاریں،پھر فرمایا:''تم اپنے خاوند کے نزدیک کچھ بےقدر نہیں ہو،اگرتم چاہوتو میں تمہارے پاس سات راتیں رہوں''الی آخرہ (مشکوۃ حدیث ۳۲۳۴)اس حدیث میں اس طرف اشارہ ہے کہ نئی دلہن کے پاس چنددن مسلسل رہنا اس کی دلجوئی،قدردانی اور عزت افزائی کے لئے ہے۔

سوال: نئی بیوی کے پاس مسلسل چنددن رہنے میں پرانی بیوی کی دل شکنی ہے۔وہ خیال کرے گی: نیالباس آگیا: پرانا اتار پھینکا!

جواب: اس کی دل شکنی کا علاج شریعت نے اس طرح کیا ہے کہ یہ طریقہ رائج کیا کہ آنے والی بیوی کا چنددن تک حق ہے۔جب پرانی کو یہ مسئلہ معلوم ہوگا تو اس کا دل مطمئن ہوجائے گا۔کیونکہ جب کوئی طریقہ جاری کیا جاتا ہے،اوراس سے کسی کی ایذارسانی مقصود نہیں ہوتی،نہ وہ حکم کسی کے لئے خاص ہوتا ہے: تو معاملہ نرم پڑجاتا ہے یعنی اس طریقہ کو قبول کرلیا جاتا ہے۔جیسے حالت حیض میں صحبت کی ممانعت: شوہر کی حق تلفی نہیں۔کیونکہ یہ ساوی عذر ہے،اور ہرشوہر کے لئے عام حکم ہے،اور شوہر کی حق تلفی مقصود نہیں،پس شوہر صبر کرے گا اور بیوی کا شکوہ نہیں کرے گا۔اسی طرح پرانی بیوی بھی صبر کرے گی۔شوہر کا شکوہ نہیں کرے گی۔

اور یہ بات سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۱ سے مفہوم ہوتی ہے۔ارشاد پاک ہے:''ان میں سے آپؐ جس کو چاہیں اپنے سے دور رکھیں،اور جس کو چاہیں اپنے سے نزدیک رکھیں۔اور جن کو دور کر رکھا ہے ان میں سے پھر کسی کو طلب کریں تو بھی آپؐ پر کوئی گناہ نہیں''یعنی باری وغیرہ کی رعایت آپؐ پر واجب نہیں۔پھر اس کی وجہ بیان کی:''اس میں زیادہ توقع ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں،اور وہ آزردہ خاطر نہ ہوں۔اور جو کچھ بھی آپؐ ان کو دیدیں اس پر سب کی سب راضی رہیں'' یعنی جب ازواج مطہرات کو یہ مسئلہ معلوم ہوجائے گا کہ نبی ﷺ پر باری وغیرہ کی رعایت واجب نہیں تو وہ صابر وشاکر رہیں گی،کوئی شکوہ شکایت نہیں کریں گی۔معلوم ہوا کہ مسئلہ معلوم ہونے سے معاملہ ہلکا پڑجاتا ہے۔

اور مدت میں تفاوت کی وجہ: ظاہر ہے۔باکرہ میں رغبت بہت ہی زیادہ ہوتی ہے،اوراس کی تالیف قلب بھی زیادہ ضروری ہے۔اس لئے اس کے لئے سات دن مقرر کئے،اور شوہر دیدہ کے لئے تین دن مقرر کئے۔

فائدہ: اس میں اختلاف ہے کہ شب باشی میں یہ ترجیح: نئی بیوی کا صرف حق ہے،یا مخصوص حق ہے؟ احناف کے

نزدیک: محض حق ہے۔ پس اتنے ایام پرانی کے یہاں بھی گذارنے ہوں گے۔ اور ائمۂ ثلاثہ کے نزدیک: مخصوص حق ہے۔ پس یہ دن پرانی کو حساب میں نہیں دیئے جائیں گے۔ ان حضرات کی دلیل: حضرت انس رضی اللہ عنہ کا مذکور قول ہے، جو حکماً حدیث مرفوع ہے۔ اور احناف کی دلیل: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث ہے۔ وہ حدیث پوری اس طرح ہے: ''اگر تم چاہو تو میں تمہارے پاس سات دن رہوں، مگر اس صورت میں اپنی دوسری بیویوں کے پاس بھی سات سات دن رہونگا'' اگر تین دن حضرت ام سلمہ کا مخصوص حق ہوتے تو آپ یہ فرماتے کہ ''مگر اس صورت میں اپنی دوسری بیویوں کے پاس چار چار دن رہونگا'' کیونکہ اتنے ہی دن مخصوص حق سے زائد ہیں۔

[۹] ومن السنة: إذا تزوج البكرَ على امرأةٍ: أقام عندها سبعًا، ثم قَسَمَ، وإذا تزوج الثيب أقام عندها ثلاثا، ثم قسم.

أقول: السر في هذا: أنه لايجوز أن يضيَّق في هذا الباب كلَّ التضييق، فإنه لايطيقه أكثرُ أفرادِ الإنسان، وهو قوله تعالى: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾ نَبَّهَ على أنه لما لم يمكن إقامة العدل الصُّراح: وجب أن يُدار الحكمُ على ترك الجور الصريح.

فإذا رغب رجل في امرأة، وأعجبه حسنُها، وشَغَفَ قلبَه جمالُها، وكان له رغبةٌ وافرة إليها: لم يمكن أن يُصَدَّ عن ذلك بالكلية، لأنه كالتكليف بالممتنع، فَقُدِّرَ له مقدارُ استئثاره لها، لئلا يزيد فيقتحم في الجور.

وأيضا: فمن المصلحة المعتبرة: تأليفُ قلب الجديدة، وإكرامُها، ولا يحصل إلا بأن يستأثر، وهو إيماءُ قولِه صلى الله عليه وسلم لأم سلمة رضي الله عنها: "ليس لكِ على أهلِكِ هَوَانٌ، إن شئتِ سَبَّعْتُ" الحديث.

وأما كسرُ قلب القديمة: فقد عولج بجريان السنة بالزيادة للجديدة؛ فإنه إذا جرت السنة بشيئ، ولم يكن مما قُصِد به إيذاءُ أحدٍ، أو مما خُصَّ به: هَانَ وَقْعُه عليه، وهو أيماءُ قوله تعالى: ﴿ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ تَقَرَّ أَعْيُنُهُنَّ، وَلَايَحْزَنَّ، وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ﴾ يعني نزولَ القرآن بالخِيَرَةِ في حقهن: سببُ زوال السُّخْطة بالنسبة إليه صلى الله عليه وسلم.

والبكرُ: الرغبةُ فيها أتم، والحاجةُ إلى تاليف قلبها أكثرُ، فَجُعِلَ قدرُها السبعَ، وقدرُ الثيب الثلاث.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس میں یعنی نئی بیوی کے حق ترجیح میں راز یہ ہے کہ اس باب میں یعنی برابری اور باری مقرر

کرنے میں جائز نہیں کہ تنگی کی جائے بہت زیادہ تنگی۔ کیونکہ بیشتر افرادِ انسانی اس کی طاقت نہیں رکھتے (آیت کریمہ) متنبہ کیا اللہ تعالیٰ نے اس بات پر کہ جب خالص انصاف قائم کرنا ممکن نہیں تو ضروری ہے کہ حکم وائر کیا جائے صریح ظلم نہ کرنے پر ــــ پس جب کوئی آدمی کسی عورت میں رغبت کرے، اور اس کو اس کا حسن پسند آجائے۔ اور اس کے دل میں اس کی خوبصورتی کھپ جائے۔ اور وہ اس عورت کی طرف بہت زیادہ راغب ہو، تو ممکن نہیں کہ شوہر روک دیا جائے اس (ترجیح) سے بالکلیہ۔ اس لئے کہ وہ محال کا حکم دینے کی طرح ہے۔ پس شوہر کے لئے عورت کو ترجیح دینے کی مقدار مقرر کی گئی، تاکہ وہ اس سے آگے نہ بڑھے، پس وہ ظلم میں داخل ہو جائے ــــ اور نیز: پس مصلحتِ معتبرہ میں سے نئی کی تالیف ہے۔ اور اس کی عزت افزائی ہے۔ اور یہ بات حاصل نہیں ہوتی مگر ترجیح دینے کے ذریعہ۔ اور وہ نبی ﷺ کے قول کا اشارہ ہے..... اور رہی پرانی کی دل شکنی: تو یقیناً اس کا علاج کر دیا گیا ہے: نئی کے لئے زیادتی کا طریقہ رائج کرنے کے ذریعہ۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا طریقہ جاری ہو جاتا ہے۔ اور نہیں ہوتا وہ طریقہ اس چیز سے جس کے ذریعہ کسی کی ایذا رسانی کا ارادہ کیا جائے، یا اس طریقہ کے ساتھ کوئی شخص خاص کیا گیا ہو، تو اس کا اس شخص پر واقع ہونا ہلکا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا اشارہ ہے..... یعنی قرآن میں اختیار کے حکم کا نازل ہونا ان عورتوں کے حق میں ناراضگی کے ختم ہونے کا سبب ہے نبی ﷺ کے تعلق سے ــــ اور کنواری میں رغبت زیادہ تام ہوتی ہے۔ اور اس کی تالیفِ قلب زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ پس اس کی مقدار سات دن، اور بیوہ کی مقدار تین دن مقرر کی گئی۔

☆ ☆ ☆

بیویوں میں برابری اور باری مقرر کرنا کیوں ضروری ہے؟

حدیث (۱) ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی بیویوں کے یہاں باری باری رہتے تھے، پس برابری کرتے تھے، اور دعا کرتے تھے: "الٰہی! یہ میری تقسیم ہے ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں۔ پس میرا محاسبہ نہ فرمائیں ان چیزوں میں جو آپ کے اختیار میں ہیں، میرے اختیار میں نہیں" آپؐ کی مراد: قلبی محبت اور دل کا میلان ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۳۵)

حدیث (۲) ــــ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی فرماتے، پس جس کا نام نکلتا اس کو اپنے ساتھ لے جاتے" (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۳۲)

تشریح: نبی ﷺ کے یہ دونوں عمل اس وجہ سے تھے کہ کسی بیوی صاحبہ کا دل کھٹا نہ ہو۔ ورنہ دلیل کے اعتبار سے راجح قول یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کی طرف سے محض تبرع اور احسان تھا۔ آپؐ پر باری مقرر کرنا واجب نہیں تھا۔ سورۃ الاحزاب آیت ۵۱ میں ارشاد پاک ہے: "آپؐ ان میں سے جس کو چاہیں پیچھے کریں، اور آپؐ ان میں سے جس کو چاہیں اپنی طرف

ٹھکانہ دیں'' اس تخییر سے وجوب کی نفی ظاہر ہے۔

اور امت کے حق میں: یہ اجتہادی مسئلہ ہے، منصوص نہیں۔ اور جمہور فقہاء کے نزدیک: باری مقرر کرنا تو واجب ہے، مگر سفر میں لے جانے کے لئے قرعہ اندازی میں اختلاف ہے: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مستحب ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔

اور شاہ صاحب کی رائے: یہ ہے کہ باری مقرر کرنا بھی واجب نہیں۔ وہ بھی مستحب ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ جس کی دو بیویاں ہوں، اور وہ ان میں برابری نہ کرے الی آخرہ۔ یہ ارشاد مبہم ہے۔ معلوم نہیں کونسی برابری مراد ہے؟ اور اللہ پاک کا ارشاد کہ ''تم اس کو معلق جیسی چھوڑ دو'' واضح ارشاد ہے۔ اس میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ بے حد ظلم کرنا، کسی عورت کا حق بالکلیہ رائگاں کرنا، اور اس سے برابرتاؤ کرنا ممنوع ہے۔ پس اگر کوئی دونوں بیویوں کے حقوق ادا کرتا رہے تو باری مقرر کرنا ضروری نہیں۔

[۱۰] وكان صلى الله عليه وسلم يَقْسِمُ بينهن، وإذا أراد سفرًا أقرع بين نسائه.

أقول: وذلك دفعًا لِوَحَرِ الصدر؛ والظاهر: أن ذلك منه صلى الله عليه وسلم كان تبرعًا وإحسانا من غير وجوب عليه، لقوله تعالى: ﴿تُرْجِيْ مَنْ تَشَاءُ مِنْهُنَّ، وَتُؤْوِيْ إِلَيْكَ مَنْ تَشَاءُ﴾ الآية.

وأما في غيره: فموضعُ تأملٍ واجتهادٍ، ولكن جمهورَ الفقهاء أوجبوا القسم، واختلفوا في القرعة.

أقول: وفيه أن قوله: " فلم يعدل" مجملٌ، لا يُدرى أيُّ عدلٍ أُريد به. وقوله تعالى: ﴿ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ مُبَيِّنٌ أن المرادَ نفيُ الجورِ الفاحش، وإهمالُ أمرها بالكلية، وسوءُ العشرة معها.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: الوحر: غیظ وغضب۔ ترکیب: مبین مضاف ہے ما بعد کی طرف۔

☆ ☆ ☆

خیارِ عتق کی حکمتیں

حدیث — جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو آزاد کیا تو ان کے شوہر حضرت مغیث رضی اللہ عنہ غلام تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اختیار دیا۔ پس انھوں نے اپنی ذات کو اختیار کیا یعنی شوہر سے علحدہ ہونے کا فیصلہ کیا (مشکوۃ حدیث ۳۱۹۸)

تشریح: عورت جب آزاد ہوتی ہے تو اس کو دو وجہ سے خیار عتق حاصل ہوتا ہے:

پہلی وجہ — عار ہٹانا — جب عورت آزاد ہو، اور اس کا شوہر غلام، تو وہ اس کی بیوی رہنا پسند نہیں کرے گی۔ شریعت

نے یہ عار ہٹانے کے لئے عورت کو اختیار دیا ہے۔ البتہ اگر عورت غلام شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی ہو تو اس کی مرضی!

دوسری وجہ — رضامندی کو واقعی بنانا — جب باندی کا نکاح ہوا تھا تو وہ اپنے آقا کے قبضہ میں تھی۔ اور آقا کو اس پر ولایتِ اجبار حاصل تھا۔ یعنی اس کی مرضی کے بغیر بھی آقا اس کا نکاح کرسکتا تھا۔ پس اس وقت نکاح پر اس کی رضامندی حقیقی رضامندی نہیں تھی۔ اور نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے جب عورت آزاد ہوئی، اور اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں آیا، تو اب اس کی رضامندی ضروری ہے۔ اسی رضامندی کو واقعی چیز بنانے کے لئے اس کو اختیار دیا گیا۔ پس اگر وہ شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی ہو تو فبہا، ورنہ نکاح ختم ہوجائے گا۔

خیارِ عتق کب تک باقی رہتا ہے؟

حدیث — حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا آزاد کی گئیں تو وہ حضرت مُغیث رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ نبی ﷺ نے ان کو اختیار دیا، اور فرمایا: ''اگر تیرے شوہر نے تجھ سے صحبت کرلی تو تیرا اختیار ختم ہوجائے گا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۰۱)

تشریح: خیار ختم ہونے کے لئے کوئی آخری حد مقرر کرنی ضروری ہے۔ ورنہ عورت کو زندگی بھر اختیار رہوگا۔ جو مقصدِ نکاح کے خلاف ہے۔ نکاح کا مقصد زوجین کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اور جب معاملہ معلق ہے تو فائدہ اٹھانے کی کوئی صورت نہیں۔

اور اختتام خیار کی حد یا تو قولی ہوگی یا فعلی؟ قولی یعنی عورت کا منہ سے کہنا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی ہے یا نہیں؟ اور فعلی یعنی عورت کا شوہر کو اپنے نفس پر قدرت دینا یا نہ دینا — قول کو بچند وجوہ نہایت مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ عورت کو کبھی اپنے کنبہ سے مشورہ کرنا ہوتا ہے، پس وہ فوری فیصلہ نہیں کرسکتی۔ کبھی اس کے دماغ میں خیالات کا زیروبم ہوتا ہے، اور وہ فوری طور پر قطعی فیصلہ نہیں کرسکتی۔ اور کبھی عزم بالجزم کے بغیر اس کے منہ سے رضامندی کی بات نکل جاتی ہے، جس کو اس کا قطعی فیصلہ نہیں قرار دیا جاسکتا — اور عورت کو اس کا پابند کرنا کہ وہ ایسی کچی بات زبان سے نہ نکالے: بہت مشکل ہے — اس لئے فعل ہی کو آخری حد مقرر کرنا موزون ہے یعنی جب تک شوہر صحبت نہ کرے عورت کو اختیار ہوگا۔ اس کے بعد نہیں۔ کیونکہ دلالۃً رضامندی پائی گئی — اور صحبت: آخری حد بنانے کے لئے موزون اس لئے ہے کہ وہی نکاح کا فائدہ اور اس کا مقصد ہے۔ اور وہ مقصدِ نکاح ہی سے تام ہوتا ہے۔

فائدہ: مذکورہ دونوں باتیں مختلف فیہ ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے دونوں مسئلوں میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے قول کے مطابق حکمتیں بیان کی ہیں۔ قارئین کی بصیرت کے لئے دونوں مسئلوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا مسئلہ: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: شوہر غلام ہو تو عورت کو خیار عتق حاصل ہوگا، آزاد ہو تو نہیں ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہ

رحمہ اللہ کے نزدیک: شوہر خواہ غلام ہو یا آزاد: دونوں صورتوں میں عورت کو خیار حاصل ہوگا۔ اوران کے نزدیک خیار کی وجہ ازدیادِ ملک ہے یعنی جب عورت باندی تھی تو شوہر اس کو دو ہی طلاقیں دے سکتا تھا۔ اب تین طلاقیں دے سکے گا۔ یہ جو ایک طلاق کی ملکیت بڑھ رہی ہے: اس کی وجہ سے عورت کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو یہ ملکیت بڑھنے دے، اور نہ چاہے تو نہ بڑھنے دے ——— اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں: غلام تھے اور آزاد تھے: دونوں روایتیں ہیں، اور متفق علیہ ہیں۔ احناف نے دونوں روایتوں کو لیا ہے۔ اور دونوں صورتوں میں خیار ثابت کیا ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے لئے ایک مجبوری تھی، اس لئے انھوں نے کان عبدا والی روایت لی، اور دوسری چھوڑ دی۔

اور وہ مجبوری یہ ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: طلاق میں مرد کی حالت کا اعتبار ہے: اگر مرد غلام ہے تو دو طلاقیں دے گا، عورت خواہ آزاد ہو یا باندی۔ اور مرد آزاد ہے تو تین طلاقیں دے گا، عورت جیسی بھی ہو۔ اور احناف کے نزدیک: طلاق میں عورت کی حالت کا اعتبار ہے: عورت آزاد ہے تو شوہر اس کو تین طلاقیں دے سکتا ہے، اور باندی ہے تو دو ہی دے سکتا ہے۔ مرد کی حالت کا لحاظ نہیں۔ پس ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ازدیادِ ملک کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے انھوں نے کان عبدا والی روایت لی، اور خیار کی علت عار ہٹانا تجویز کی۔

دوسرا مسئلہ: خیارِ عتق میں تراخی ہے، یا عورت کو فوراً مجلس علم میں فیصلہ کرنا ہے؟ احناف کے نزدیک: خیارِ مخیّرہ کی طرح فوراً فیصلہ کرنا ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: تراخی ہے۔ انھوں نے خیار کی نہایت: صحبت کو قرار دیا ہے۔ مگر شوہر کو صحبت سے روکنا جائز نہیں (مغنی) ائمہ ثلاثہ نے مذکورہ حدیث سے استدلال کیا ہے۔ احناف کے نزدیک اس حدیث میں خیار کی نہایت کا بیان نہیں، بلکہ دلالۃ رضا کا بیان ہے یعنی شوہر کے ساتھ رہنے کی رضامندی قول وفعل دونوں سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

[۱۱] وأُعتقت بريرةُ، وكان زوجها عبداً، فخيرها رسول الله صلى الله عليه وسلم، فاختارت نفسها.

أقول: السبب في ذلك: أن كونَ الحرة فِراشا للعبد عارٌ عليها، فوجب دفعُ ذلك العار عنها، إلا أن تَرْضَى به.

وأيضًا: فالأمةُ تحت يدِ مولاها، ليس رضاها رضاً حقيقة، وإنما النكاح بالتراضي، فلما أن كان أمرُها بيدها وجب ملاحظةُ رضاها.

وفي رواية: "إن قَرَّبَكِ فلا خيارَ لكِ" وذلك: لأنه لابد من ضرب حدّ ينتهي إليه الخيارُ، وإلا كان لها الخيار طولَ عُمُرِها، وفي ذلك قلبُ موضوعِ النكاح.

ولايصلح اختيارُها إياه بالكلام: حدًا ينتهي إليه: لأنها ربما تُشاوِر أهلها، وتُقَلِّبُ الأمرَ في نفسها، وكثيرًا مّا يجري عند ذلك صيغةُ الاختيار، وإن لم تجزم به، وفي إلجائها أن لاتتكلم بمثلها حرج، فلا أحقَّ من القِربان، إذ هو فائدة الملك، والشيئُ الذي يُقصد منه، والأمرُ الذي يتم به، والله أعلم.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس کی یعنی شوہر کے غلام ہونے کی صورت میں عورت کو اختیار دینے کی وجہ یہ ہے کہ آزاد عورت کا غلام کے لئے بستر ہونا عورت کے حق میں عار کی بات ہے۔ پس اس عار کو عورت سے ہٹانا ضروری ہے۔ مگر یہ کہ عورت شوہر کے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائے — اور نیز: پس باندی اس کے آقا کے ہاتھ کے نیچے ہے۔ اس کی رضامندی حقیقی رضامندی نہیں۔ اور نکاح باہمی رضامندی ہی سے ہوتا ہے۔ پس جب یہ بات ہوئی کہ اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں آگیا تو اس کی رضامندی کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

اور ایک روایت میں ہے: ''اگر وہ تجھ سے صحبت کرے گا تو تیرے لئے اختیار نہیں ہوگا'' اور یہ بات یعنی اختیار کا علی التراخی ہونا اس لئے ہے کہ کوئی ایسی حد مقرر کرنا ضروری ہے جس تک پہنچ کر اختیار ختم ہوجائے۔ ورنہ تو عورت کے لئے زندگی بھر اختیار رہوگا۔ اور اس میں نکاح کے موضوع کو پلٹنا ہے — اور نہیں صلاحیت رکھتا عورت کا شوہر کو اختیار کرنا کلام کے ذریعہ: ایسی حد بنانا جس پر اختیار ختم ہوجائے۔ کیونکہ عورت کبھی اپنے کنبہ کے لوگوں سے مشورہ کرے گی، اور الٹ پلٹ کرے گی عورت معاملہ کو اپنے دل میں۔ اور بارہا ایسی صورت میں جاری ہوتا ہے اختیار کا لفظ، اگرچہ وہ اس کو بولنے کا پختہ ارادہ نہیں رکھتی۔ اور اس قسم کی بات نہ بولنے پر اس کو مجبور کرنے میں تنگی ہے۔ پس صحبت سے زیادہ حقدار کوئی چیز نہیں کیونکہ وہ ملکِ نکاح کا فائدہ ہے۔ اور ایسی چیز ہے جس کا نکاح سے قصد کیا جاتا ہے۔ اور ایسا امر ہے جو نکاح کی وجہ سے تام ہوتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب — ۸

طلاق کا بیان

طلاق کی ضرورت اور کثرتِ طلاق کی خرابیاں

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو عورت کسی سخت تکلیف کے بغیر اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے'' (جامع الاصول حدیث ۵۷۸۱ مشکوۃ حدیث ۳۲۷۹)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۰)

تشریح: طلاق کی کثرت اور اس کو برا نہ سمجھنے میں بہت سی خرابیاں ہیں:

پہلی خرابی — نفس کا بگاڑ — کچھ لوگ شرمگاہ کی شہوت کے غلام ہوتے ہیں۔ وہ نکاح سے نظامِ خانہ داری قائم کرنے

کا ارادہ نہیں کرتے۔ نہ معاشی معاملات میں معاونت کا قصد کرتے ہیں۔ نہ شرمگاہ کی حفاظت ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ ان کا مطمح نظر بس عورتوں سے لطف اندوز ہونا اور نیا ذائقہ چکھنا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ بکثرت نکاح کرتے ہیں، اور طلاقیں دیتے ہیں۔ ایسے نکاح اور زنا میں نفس کے بگاڑ کے اعتبار سے کچھ فرق نہیں۔ صرف ظاہر داری کا فرق ہے کہ رسم نکاح ادا ہوگئی۔ اور ملکی نظام سے معاملہ ہم آہنگ ہوگیا۔ اسی صورت کے بارے میں حدیث شریف میں ہے: إن الله لایحبُّ الذوّاقین و الذوّاقات: اللہ تعالیٰ چکھنے والے مردوں اور چکھنے والی عورتوں کو پسند نہیں کرتے (کنزالعمال حدیث ۲۷۸۷۳)

دوسری خرابی — معاشرتی بگاڑ — نکاح کا مقصد پاکبازی کے ساتھ شادمانی کی زندگی بسر کرنا ہے۔ اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہوتا ہے جب میاں بیوی دائمی رفاقت ومعاونت کے لئے آمادہ ہوں، اور اپنے آپ کو اس کا خوگر بنائیں۔ اور جب طلاق کا رواج چل پڑتا ہے تو یہ بات باقی نہیں رہتی۔ زوجین کے ذہنوں میں چندروزہ رفاقت کا تصور ہوتا ہے، جس سے یہ معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے کہ معمولی باتیں بھی رنجش کا سبب بن جاتی ہیں۔ اور دونوں جدائی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ پس کہاں تو نکاح میں یہ ضروری تھا کہ دونوں ناگواریوں کو جھیلیں اور تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کریں، اور کہاں یہ زود رنجیاں اور رسّا تڑانے کی فکر!

تیسری خرابی — بے حیائی کا فروغ — اگر عورتیں اس چیز کی عادی بن جائیں۔ وہ ذائقہ چکھ کر چل دیں۔ اور لوگ اس کو برا نہ سمجھیں۔ اور نہ اس پر افسوس کریں نہ نکیر، تو بے حیائی کو فروغ ملے گا۔ اور کوئی دوسرے کے گھر کی بربادی کو اپنے گھر کی بربادی نہیں سمجھے گا۔ اور خیانت کی طرح پڑے گی: ہر ایک اس فکر میں رہے گا کہ جدائی ہوئی تو فلاں سے نکاح کرونگا۔ اور اس میں جو مفاسد ہیں وہ ظاہر ہیں۔

طلاق کی ضرورت: مگر بایں ہمہ طلاق کا دروازہ بند کرنا بھی ممکن نہیں۔ اس میں بھی لوگوں پر تنگی ہے۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میاں بیوی دونوں ہی ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں: بایں وجہ کہ دونوں بداخلاق ہیں۔ یا دونوں کی نظروں میں کسی کا حسن کھپا ہوا ہے۔ یا دونوں معیشت میں تنگی محسوس کرتے ہیں، یا کسی میں حُمق ہے، یا اس قسم کا کوئی اور سبب: پس اگر ایسی حالت میں بھی علحدگی کی راہ نہ ہو، تو دونوں کے لئے زندگی اجیرن اور رشتۂ ازدواج عذاب اور وبال بن جائے گا۔

فائدہ: نکاح ختم کرنے کا اختیار صرف مرد کا نہیں، عورت بھی نکاح ختم کرسکتی ہے، مگر حاکم وقت کے ذریعہ۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نکاح ایک معاہدہ ہے۔ جس میں مرد کی طرف سے مہر، نان نفقہ اور حسن معاشرت شرط ہے۔ اور عورت کی طرف سے نیک چلنی اور فرمانبرداری۔ اور یہ معاہدہ بھی دیگر معاہدوں کی طرح قابل فسخ ہے۔ البتہ مرد خود یہ معاہدہ فسخ کرسکتا ہے۔ اور عورت خود نکاح ختم کرنے کی مجاز نہیں، جیسا کہ وہ خود نکاح کرنے کی مجاز نہیں۔ بلکہ حاکم وقت کے ذریعہ نکاح ختم کراسکتی ہے، جیسا کہ ولی کے ذریعہ اپنا نکاح کرسکتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے خدمتِ نبوی میں اپنا اور اپنے شوہر کا معاملہ پیش کرکے طلاق حاصل کی (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۷۴)

اور عورت پر یہ پابندی اس کی فطری شتابی اور عقل کی کمی کی وجہ سے ہے۔ وضعی قوانین میں بھی عورت کے لئے کورٹ سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اور مردوں میں عام طور پر یہ کمی نہیں ہوتی، اس لئے وہ اپنے اختیار تمیزی سے معاہدۂ نکاح باندھ بھی سکتا ہے اور کھول بھی سکتا ہے۔

﴿الطلاق﴾

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" أيما امرأةٍ سألتْ زوجَها طلاقاً، من غير بأس، فحرامٌ عليها رائحة الجنة" وقال صلى الله عليه وسلم:" أبغضُ الحلال إلى الله الطلاقُ"

اعلم: أن في الإكثارمن الطلاق، وجَرَيَانِ الرسم بعدم المبالاة به: مفاسدَ كثيرةً. وذلك: أن ناساً ينقادون لشهوة الفرج، ولا يقصدون إقامةَ تدبير المنزل، ولا التعاونَ في الارتفاقات، ولا تحصينَ الفرج؛ وإنما مطمحُ أبصارهم التلذذُ بالنساء، وذوقُ لذةِ كل امرأة، فَيُهَيِّجُهم ذلك إلى أن يُكثروا الطلاقَ والنكاح؛ ولا فرقَ بينهم وبين الزُّناة من جهة ما يرجع إلى نفوسهم، وإن تميزوا عنهم بإقامة سنة النكاح، والموافقة لسياسة المدينة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "لعن الله الذوَّاقين والذوَّاقات"

وأيضًا : ففي جريان الرسم بذلك: إهمال لتوطين النفس على المعاونة الدائمة، أو شِبْهِ الدائمة؛ وعسى إن فُتح هذا البابُ أن يَضِيْقَ صدرُه، أو صدرُها، في شيئ من محقَّرات الأمور، فيندفعانِ إلى الفراق؛ وأين ذلك من احتمالِ أَعْبَاءِ الصحبة، والإجماع على إدامة هذا النظم؟

وأيضًا : فإن اعتيادَهنَّ بذلك، وعدمَ مبالاة الناس به، وعدمَ حزنهم عليه: يفتح باب الوَقَاحة، أو لايجعل كلٌّ منهما ضررَ الآخر ضررَ نفسه، وأن يَخُوْنَ كلُّ واحدِ الآخَرَ: يمهِّدُ لنفسه إن وقع الفراق، وفي ذلك مالايخفى.

ومع ذلك: لايمكن سدُّ هذا الباب، والتضييقُ فيه، فإنه قد يصير الزوجان متناشِزَين: إما لسوء خُلُقِهما، أو لطموح عينِ أحدهما إلى حسن إنسانٍ آخَرَ، أو لضيق معيشتِهما، أو لخُرْقِ واحد منهما، ونحوِ ذلك من الأسباب، فيكون إدامةُ هذا النظم مع ذلك بلاءً عظيما وحرجًا.

ترجمہ: جان لیں کہ طلاق کی کثرت میں، اور اس کی پرواہ نہ کرنے کا طریقہ رائج ہونے میں: بہت سی خرابیاں ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ (پہلی خرابی) کچھ لوگ شرمگاہ کی شہوت کی پیروی کرتے ہیں۔ اور وہ نظام خانہ داری قائم کرنے کا ارادہ

نہیں کرتے۔اور نہ معاشی معاملات میں تعاون کا قصد کرتے ہیں۔اور نہ شرمگاہ کی حفاظت کا ارادہ کرتے ہیں۔ان کا مطمح نظر بس عورتوں سے لطف اندوز ہونا اور ہر عورت کا ذائقہ چکھنا ہوتا ہے۔پس یہ چیز ان کو برانگیختہ کرتی ہے اس پر کہ وہ بکثرت نکاح کریں اور طلاقیں دیں۔اور کچھ فرق نہیں ان لوگوں کے درمیان اور زنا کاروں کے درمیان، اس بات کی جانب سے جوان کے نفوس کی طرف لوٹتی ہے یعنی نفس کے بگاڑ میں دونوں باتیں یکساں ہیں۔اگرچہ وہ نکاح کرنے والے اُن زنا کاروں سے جدا ہوئے ہیں سنتِ نکاح قائم کرنے کے ذریعہ،اور ملکی انتظام کی موافقت کے ذریعہ،اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے رحمت سے دور کر دیا چکھنے والے مردوں اور چکھنے والی عورتوں کو'' (لعَن کے لفظ سے حدیث نہیں ملی) ——— (دوسری خرابی) اور نیز: پس اس (طلاق) کا رواج جاری ہونے میں: دائمی معاونت یا دائمی جیسی معاونت کا نفس کو خوگر بنانے کو رائگاں کرنا ہے۔اور اگر یہ دروازہ کھول دیا گیا یعنی لوگوں میں اس کا رواج چل پڑا تو ہوسکتا ہے کہ معمولی باتوں میں سے کسی بات میں مرد کا یا عورت کا سینہ تنگ ہو، پس دونوں بہ پڑیں جدائی کی طرف۔اور کہاں یہ (زود رنجی) رفاقت کی ذمہ داریاں برداشت کرنے سے،اور اس انتظام کو ہمیشہ باقی رکھنے پر اتفاق کرنے سے؟ یعنی دونوں میں آسمان وزمین کا تفاوت ہے ——— (تیسری خرابی) اور نیز: پس عورتوں کا اس چیز کو عادت بنالینا،اور لوگوں کا اس کی کچھ پرواہ نہ کرنا۔اور لوگوں کا اس پر غم نہ کرنا: بے حیائی کا دروازہ کھولتا ہے،اور اس بات کا کہ کوئی بھی ان میں سے دوسرے کے ضرر کو اپنا ضرر نہ سمجھے۔اور اس بات کا کہ ہر ایک دوسرے سے خیانت کرے: وہ اپنی ذات کے لئے تیاری کرے اگر جدائی ہوجائے۔اور اس میں وہ خرابی ہے جو پوشیدہ نہیں۔ (ضرورتِ طلاق) اور اس کے ساتھ ممکن نہیں یہ دروازہ بند کرنا۔اور اس (دروازہ کو بند کرنے) میں تنگی ہے۔پس بیشک شان یہ ہے کہ کبھی دونوں ہی ایک دوسرے سے نفرت کرنے والے ہوتے ہیں: یا تو دونوں کی بداخلاقی کی وجہ سے، یا ہر ایک کی آنکھ کے اٹھنے کی وجہ سے کسی اور انسان کی خوبصورتی کی طرف، یا دونوں کے گذران کی تنگی کی وجہ سے، یا دونوں میں سے ایک کی حماقت کی وجہ سے،اور اس کے مانند اسباب کی وجہ سے: پس اس انتظام کا ہمیشہ رکھنا اس کے ساتھ: بڑی بلا اور تنگی ہوتا ہے۔

لغات: اِنْدَفع إليه: بہنا، تیزی سے جانا...... اِحْتَمَلَ احتمالاً: اٹھانا، برداشت کرنا...... العِبْءُ: بوجھ خواہ کسی بھی چیز کا ہو اور معنوی بوجھ یعنی ذمہ داری جمع أَعْبَاء...... تَنَاشَزَ الزوجان: خاوند اور بیوی کا ناخوش گوار زندگی گزارنا...... الخُرْق: بے وقوفی، اناڑی پن۔

تشریح: دائمی معاونت یعنی زندگی بھر کی معاونت ورفاقت۔اور دائمی جیسی معاونت یعنی جب تک ساتھ رہنا مقدر ہے: اس وقت تک معاونت ورفاقت۔اور چونکہ وقت مقدر کا کسی کو پتہ نہیں، اس لئے یہ بھی گویا دائمی معاونت ہے...... لِضِيقِ معيشتهما: دونوں گذران میں تنگی محسوس کرتے ہیں۔مثلاً مرد جتنا خرچ دیتا ہے: عورت کے لئے کافی نہیں۔اور عورت جتنا مانگتی ہے: مرد کے بس میں نہیں۔

☆ ☆ ☆

تین شخصوں کے مرفوع القلم ہونے کی وجہ

حدیث ــــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تین شخصوں سے قلم اٹھادیا گیا ہے: سونے والے سے یہاں تک کہ بیدار ہو، اور بچے سے یہاں تک کہ بالغ ہو، اور پاگل جیسے کم عقل سے یہاں تک کہ عقل آجائے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۷)

تشریح: مذکورہ تینوں شخص دو وجہ سے مرفوع القلم ہیں:

پہلی وجہ: طلاق وغیرہ تمام معاملات کا نفاذ اس پر موقوف ہے کہ معاملہ کرنے والا ان مصالح کو سمجھتا ہو جو عقود کو چاہنے والے ہیں۔ اور سویا ہوا اور بچہ اور پاگل ان مصالح کی معرفت سے کوسوں دور ہیں۔ اس لئے ان کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ: وقوع طلاق ایک حکم شرعی ہے۔ اور تکلیف شرعی کا مدار عقل تام پر ہے۔ اور نابالغ میں عقل ناقص ہے اور پاگل میں سرے سے مفقود ہے۔ اور سونے والے کی عقل کارگر نہیں، اس لئے ان کی طلاقیں واقع نہیں ہوتیں (یہ وجہ شارح نے بڑھائی ہے)

فائدہ: مرفوع القلم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ سونے والے کو نماز کے لئے بیدار نہ کیا جائے، بعض لوگوں کو ایسی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بخاری شریف (حدیث ۵۱۲) میں صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر پڑھنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اٹھاتے تھے۔ اور بچے سے مرفوع القلم ہونے کے باوجود عادت ڈالنے کے لئے سات سال کی عمر سے نماز شروع کرائی جاتی ہے۔

> [۲] قال صلى الله عليه وسلم: "رُفِعَ القلم عن ثلاثة: عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبى حتى يبلُغَ، وعن المعتوه حتى يعقِلَ"
>
> أقول: السر في ذلك: أن مبنى جواز الطلاق، بل العقودِ كلِّها، على المصالح المقتَضِيَة لها؛ والنائمُ والصبى والمعتوه بمعزلٍ عن معرفة تلك المصالح.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: مَعْزِل (ظرف) علحدگی کی جگہ۔ بمعزِل عن كذا: جدا، الگ، دور۔

☆ ☆ ☆

زبردستی کی طلاق واقع نہ ہونے کی وجہ

حدیث ــــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لاک کرنے میں نہ طلاق ہے نہ آزادی'' تالا لگانے کا مطلب ہے: زبردستی کرنا۔ یعنی اگر کسی کو مجبور اور بالکل بے بس کرکے طلاق دلوائی یا غلام آزاد کرایا تو شریعت میں اس طلاق اور عتاق کا

اعتبار نہیں (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۵)

تشریح: مکرَہ کی طلاق دو وجہ سے رائگاں جاتی ہے:

پہلی وجہ: جو طلاق زبردستی دلوائی جاتی ہے: اس پر طلاق دینے والا راضی نہیں ہوتا۔ نہ اس طلاق دینے میں کوئی خانگی مصلحت پیشِ نظر ہوتی ہے۔ وہ طلاق دینا محض ایک حادثہ کی وجہ سے ہوتا ہے: جس سے مفر نہیں۔ پس جس طرح سونے والے کی طلاق واقع نہیں ہوتی: مکرَہ کی بھی واقع نہیں ہوتی۔

دوسری وجہ: جبر واکراہ کی طلاق کا اعتبار کرلیا جائے گا تو فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ زور آور ظالم جب کسی ضعیف وناتواں کی بیوی ہتھیانا چاہے گا: اس کو چپکے سے اچک لے گا، اور قتل کی دھمکی دے کر، مجبور کر کے طلاق حاصل کرلے گا۔ اور اگر مکرہ کی طلاق کو غیر معتبر قرار دیا جائے گا، اور زبردستی کرنے والے کی امید پر پانی پھیر دیا جائے گا، اور اس کے مقصد کو یکسر پلٹ دیا جائے گا، تو یہ چیز اکراہ کے ذریعہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے کا سبب ہوگی۔ اور اس کی نظیر: قاتل کی میراث سے محرومی ہے، تاکہ مال کی خاطر قتل کا دروازہ بند ہو (رحمۃ اللہ ۴: ۶۵۶)

فائدہ: طلاقِ مکرَہ میں صحابہ کے زمانہ سے اختلاف ہے، اس لئے مجتہدین میں بھی اختلاف ہے: ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کے نزدیک زبردستی کی طلاق واقع نہیں ہوتی۔ ان کا مستدل مذکورہ روایت ہے۔ اور امام ابوحنیفہ وغیرہ فقہاءِ عراق کے نزدیک واقع ہوتی ہے۔ ان کا مستدل حدیث: ثلاثٌ جِدُّهن جِدٌّ، وهَزْلُهن جدٌّ: النكاح، والطلاق، والرجعة ہے۔ یعنی تین چیزیں: ان کی سنجیدگی سنجیدگی ہے، اور ان کی غیر سنجیدگی سنجیدگی ہے: وہ نکاح، طلاق، اور رجعت ہیں (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۴) جب ہنسی مذاق میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، اور اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، حالانکہ اس میں طلاق دینے والا طلاق پر راضی نہیں ہوتا، نہ اس طلاق دینے میں کوئی خانگی مصلحت پیشِ نظر ہوتی ہے: تو مکرَہ کی طلاق بھی واقع ہوگی —— اور مذکورہ روایت محکم الدلالۃ نہیں۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اغلاق کے معنی غصہ کے کئے ہیں یعنی غصہ میں طلاق پر اقدام نہ کیا جائے۔ سوچ سمجھ کر دی جائے۔ اور نہی ارشادی ہے، شرعی نہیں۔ یعنی لوگوں کو ان کی بھلائی کی ایک بات بتائی گئی ہے۔ نیز اس کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ تینوں طلاقیں ایک ساتھ نہ دی جائیں۔

رہی یہ مصلحت کہ اکراہ کی طلاق کو غیر مؤثر کیا جائے گا تو ایک دوسرے پر ظلم کا دروازہ بند ہوگا: قابلِ غور ہے۔ کیونکہ جب ایک شخص کسی کی بیوی کے پیچھے پاگل ہو رہا ہو تو اس کو قتل کرنے میں کیا باک ہوگا؟ پس اکراہ کی طلاق کو مؤثر بنانے میں شوہر کی جان بچ جائے گی۔ اور یہ طلاقِ مکرَہ میں رضا کا ایک پہلو ہے۔

[۳] قال صلى الله عليه وسلم: "لاطلاقَ ولا عَتَاقَ في إغلاقٍ" معناه: في إكراهٍ.

اعلم: أن السبب في هدرِ طلاق المكره شيئان:

أحدهما: أنه لم يرضَ به، ولم يُرِدْ فيه مصلحةً منزليةً، وإنما هو لحادثةٍ لم يجد منها بدًا،

فصار بمنزلة النائم.

وثانيهما: أنه لو اعتبر طلاقُه طلاقا، لكان ذلك فتحًا لباب الإكراه، فعسى أن يختطفَ الجبارُ الضعيفَ من حيث لايعلم الناس، ويُخيفه بالسيف، ويُكرهه على الطلاق: إذا رغب في امرأته، فلو خَيَّبْنَا رجاءَه، وقَلَبْنا عليه مرادَه: كان ذلك سببا لترك تظالم الناس فيما بينهم بالإكراه. ونظيره: ما ذكرنا في قوله صلى الله عليه وسلم: "القاتل لايرث"

ترجمہ: جان لیں کہ مکرہ کی طلاق کورائگاں کرنے کا سبب دو چیزیں ہیں: ایک: یہ کہ وہ طلاق پر راضی نہیں۔ اور اس نے طلاق دینے میں کسی گھریلو مصلحت کا ارادہ نہیں کیا۔ اور وہ طلاق ایک حادثہ ہی کی وجہ سے ہے، جس سے اس کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ پس وہ سونے والے جیسا ہو گیا —— دوسری چیز یہ ہے کہ اگر اس کی طلاق کو طلاق مان لیا جائے گا تو یہ اکراہ کے دروازے کو کھولنا ہوگا۔ پس ہوسکتا ہے کہ سرکش کمزور کو اس طرح اُچک لے کہ لوگوں کو پتہ نہ چلے، اور اس کو تلوار سے ڈرائے، اور اس کو طلاق پر مجبور کرے، جب وہ اس کی بیوی کا خواہش مند ہو۔ پس اگر ہم اس کی امید کو پورا نہ کریں، اور ہم اس پر اس کے مقصد کو پلٹ دیں، تو یہ چیز اکراہ کے ذریعہ لوگوں کے ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنے کا سبب ہوگی۔ اور اس کی نظیر وہ (حکمت) ہے جو ہم نے القاتل لایرث میں ذکر کی ہے۔

☆ ☆ ☆

نکاح سے پہلے طلاق نہ ہونے کی وجہ

حدیث (۱) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس عورت کا انسان مالک نہیں اس کو طلاق نہیں'' یعنی جو عورت ابھی نکاح میں نہیں آئی: اس کو طلاق دینا درست نہیں (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۲)

حدیث (۲) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نکاح سے پہلے طلاق نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۱)

تشریح: طلاق کی دو قسمیں ہیں: مُنَجَّز اور مُعَلَّق یعنی فی الفور دی ہوئی، اور کسی چیز پر آویزاں کی ہوئی۔ پھر معلّق کی دو صورتیں ہیں: نکاح پر معلّق، اور نکاح کے علاوہ کسی اور بات پر معلّق مثلاً دخولِ دار پر معلّق۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بہ ظاہر یہ روایات سب صورتوں کو عام ہیں، یعنی نکاح سے پہلے نہ منجز طلاق دی جاسکتی ہے، نہ معلّق کی جاسکتی ہے:

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کسی مصلحت کی وجہ سے مشروع کی گئی ہے۔ اور مصلحت کا تحقق اسی وقت ہوسکتا ہے جب عورت نکاح میں آئے، اور اس کی سیرت واخلاق سے واقفیت ہو یعنی اگر اس کے اخلاق پسند آئیں تو رکھے، ورنہ چھوڑ دے۔ پس مصلحت کے تحقق سے پہلے عورت کو طلاق دینا ایسا ہے جیسا مسافر کا جنگل میں یا مجاہد کا دار الحرب میں اقامت کی نیت کرنا جس کی دلالتِ حال تکذیب کرتی ہے کہ اس کی نیت درست نہیں، کیونکہ جنگل رہنے کے قابل جگہ نہیں۔ اور دار الحرب

میں مجاہد کا قیام مشکل ہے۔

فائدہ: امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک: طلاق اور عتاق کی تعلیق مطلقاً صحیح نہیں۔ یعنی اگر کسی نے کہا کہ وہ فلاں عورت سے نکاح کرے تو اسے طلاق: یہ تعلیق لغو ہے۔ اور اس سے نکاح کر سکتا ہے ـــــــ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: اگر مِلک یا سببِ ملک پر تعلیق کی ہے تو معتبر ہے، ورنہ نہیں۔ مثلاً مذکورہ تعلیق صحیح ہے۔ اور اگر اجنبی عورت سے کہا: اگر گھر میں گئی تو طلاق: یہ تعلیق لغو ہے ـــ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک: عورت پوری طرح یا کسی درجہ میں متعین ہو تو تعلیق صحیح ہے، ورنہ نہیں۔ مثلاً یہ کہا کہ اگر وہ فاطمہ سے یا فلاں خاندان یا فلاں علاقہ کی عورت سے نکاح کرے تو طلاق: تو یہ تعلیق معتبر ہے۔ اور اگر عورت کی تعیین کے بغیر کہا کہ اگر وہ نکاح کرے تو بیوی کو طلاق: یہ تعلیق معتبر نہیں۔

اور مذکورہ بالا روایات امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک: تنجیز و تعلیق دونوں کو عام ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک: تنجیز کے ساتھ خاص ہیں۔ ان حضرات کی دلیل موطا مالک (۵۵۹:۲ کتاب الطلاق، باب ظهار الحر) کی روایت ہے: قاسم بن محمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا گیا: ایک شخص نے کسی عورت کی طلاق کو اس سے نکاح پر معلّق کیا تو کیا حکم ہے؟ قاسم رحمہ اللہ نے کہا: ایک شخص نے ایک عورت سے ظہار کو اس سے نکاح کرنے پر معلّق کیا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو حکم دیا کہ اگر وہ اس سے نکاح کرے تو پہلے ظہار کا کفارہ ادا کرے، پھر صحبت کرے۔ پس جب ظہار کی تعلیق صحیح ہے تو طلاق کی بھی صحیح ہے۔

اور مذکورہ روایات عام نہیں ہیں۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار (۲۸۱:۱) میں یہ روایت ذکر کی ہے کہ امام زُہری رحمہ اللہ سے کہا گیا: کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''نکاح سے پہلے طلاق نہیں''؟ امام زہری نے کہا: کیوں نہیں! مگر تم نے اس کا وہ مطلب لیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مراد نہیں۔ صورت یہ تھی کہ ایک شخص پر اصرار کیا جاتا کہ فلاں عورت سے نکاح کر، وہ جان بچانے کے لئے کہتا: میں نے اسے طلاق مغلظہ دی! تو یہ کہنا لغو ہے۔ لیکن جو کہے کہ إن تزوجتُ فلانة فهي طالق تو وہ اس کو فی الحال طلاق نہیں دے رہا، بلکہ نکاح کے بعد دے رہا ہے، پس وہ معتبر ہے۔

[٤] وقال صلى الله عليه وسلم: " لاطلاق فيما لايملك" وقال عليه السلام: " لاطلاق قبل النكاح"

أقول: الظاهر أنه يَعُمُّ الطلاقَ المُنَجَّزَ والمعلَّقَ بنكاح وغيره. والسببُ في ذلك: أن الطلاق إنما يجوز للمصلحة، والمصلحةُ لا تتمثل عنده قبل أن يملكها، ويرى منها سيرتها، فكان طلاقُها قبل ذلك بمنزلة نية المسافر الإقامةَ في المفازة، أو الغازي في دار الحرب، مما تُكَذِّبُه دلائلُ الحال.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: نَجَّزَ: بالکل مکمل کرنا یعنی فی الفور طلاق دینا۔

  ☆

رجعی طلاقیں دو ہیں

زمانۂ جاہلیت میں لوگ جس قدر چاہتے تھے طلاقیں دیتے تھے، اور عدت میں رجوع کر لیتے تھے۔ طلاقوں کی کوئی حد نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں عورت پر سراسر ظلم ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ ایک شوہر نے بیوی سے کہا: اَدْھر کردونگا! بیوی نے پوچھا: کیسے؟ اس نے کہا: طلاق دے کر عدت میں بٹھاؤنگا۔ جب عدت پوری ہونے آئے گی: رجوع کرلونگا۔ پھر طلاق دیکر عدت میں بٹھادونگا۔ اس طرح زندگی بھر کرتا رہوں گا۔ عورت نے یہ ماجرا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا۔ اور اپنی الجھن ظاہر کی کہ اگر شوہر ایسا کرنے لگا تو میرا کیا ہوگا؟ حضرت عائشہؓ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا۔ آپؐ نے بھی خاموشی اختیار کی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ: فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ تَسْرِيْحٌ بِإِحْسَانٍ﴾ یعنی ایسی طلاق جس کے بعد رجعت ہوسکتی ہے: دو ہی بار ہے۔ دو تک شوہر چاہے تو رجعت کرسکتا ہے، اور نہ چاہے تو خوبی کے ساتھ رخصت کرے (رواہ الترمذی، جامع الاصول حدیث ۵۷۸۲)

پھر اگر شوہر تیسری طلاق دے تو عورت مغلظہ ہوجائے گی اب جب تک عورت کسی اور سے نکاح نہ کرے، پہلے شوہر کے لئے حلال نہیں۔ اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے نکاح کے ساتھ صحبت کی بھی شرط لگائی۔ صحبت کرنے کے بعد اگر دوسرا شوہر انتقال کرجائے، یا وہ بھی طلاق دیدے: تو عورت عدت کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کرسکتی ہے۔

طلاقیں تین میں محدود ہونے کی وجہ

طلاقیں تین میں محدود ہیں۔ ان سے زیادہ طلاقیں نہیں دی جاسکتیں۔ اور یہ تحدید دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: تین سے کثرت کا آغاز ہوتا ہے۔ اقلِ جمع تین ہیں۔ پس تین طلاقیں بہت ہوگئیں۔ ان سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

دوسری وجہ: قیاس کا مقتضی یہ تھا کہ طلاق ایک ہی ہوتی۔ اسی پر معاملہ ختم ہوجاتا۔ مگر چونکہ طلاق کے بعد غور وفکر اور سوچنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض لوگوں کو بیوی کی قدر وقیمت جدائی کے بعد معلوم ہوتی ہے مشہور ہے: قدرِ نعمت بعد زوالِ نعمت۔ اس لئے ایک سے زیادہ طلاقیں مشروع کی گئیں۔ اور اصل تجربہ ایک سے ہوجاتا ہے۔ اور دوسے اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس لئے تین کے بعد زمامِ اختیار ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔

تین طلاقوں کے بعد دوسرے سے نکاح ضروری ہونے کی وجہ

تین طلاقیں مغلّظ ہیں۔ یعنی ان سے حرمت گاڑھی، سخت اور مضبوط ہوجاتی ہے۔ اب پہلے شوہر سے نکاح کے لئے

دوسرے شوہر سے نکاح شرط ہے۔اور یہ اشتراط تین وجہ سے ہے:

پہلی وجہ — غایت کو محقق کرنے کے لئے — یعنی یہ بات پکی کرنے کے لئے کہ اب شوہر کا حق بالکلیہ ختم ہوگیا۔ اور طلاق کی آخری حد آگئی۔اور یہ بات دوطرح سے محقق کی گئی ہے:

ایک: اس طرح سے کہ اگر دوسرے شخص سے نکاح کئے بغیر، پہلے شوہر سے نکاح درست ہوگا تو وہ ایک طرح کی رجعت ہوگی۔ کیونکہ رجعت کی دوصورتیں ہیں: ایک: تجدید نکاح کے بغیر قول یا فعل سے رجعت۔ یہ جب ہے کہ ایک یا دو رجعی طلاقیں دی ہوں۔اسی کو عرف عام میں رجعت کہتے ہیں۔ دوسری: تجدید نکاح کے ذریعہ رجعت۔ یہ جب ہے کہ ایک یا دو بائنہ طلاقیں دی ہوں۔اور رجعت کا مطلب یہ ہے کہ ابھی شوہر کا حق باقی ہے۔طلاقوں کی آخری حد نہیں آئی۔ پس اگر تین طلاقوں کے بعد بھی نکاح درست ہوگا تو وہ بھی رجعت ہوگی۔اس لئے نہایت کو محقق کرنے کے لئے دوسرے شوہر سے نکاح ضروری قرار دیا گیا۔

دوم: عدت شوہر کے گھر میں گذارنا ضروری ہے۔اور عورت جب تک شوہر کے گھر میں، اس کے زیردست اور اس کے اقرباء کے درمیان ہے: اس کا امکان ہے کہ عورت اپنی رائے کے خلاف مجبور ہوجائے، اور عورت خواہی نخواہی ان کی چکنی چپڑی باتوں پر راضی ہوجائے۔ پس تجدید نکاح پر عورت کی رضامندی حقیقی رضامندی نہیں ہوگی۔اور جب وہ عدت کے بعد ان لوگوں سے جدا ہوگی، اور دوسرا نکاح کرے گی، اور زمانہ کا گرم وسرد چکھے گی، پھر پہلے شوہر سے نکاح پر راضی ہوگی تو وہ اس کی سچی رضامندی ہوگی۔اس طرح تین طلاقوں کا آخری حد ہونا محقق ہوگا۔

دوسری وجہ — شوہر کی تعزیر کے لئے — جب بیوی عدت کے بعد دوسری جگہ نکاح کرے گی تو شوہر اس کی جدائی کا مزہ چکھے گا۔اور یہ بات اس کے لئے سزا ہوگی کہ اس نے اہم مصلحت کو سوچے بغیر ناراضگی اور تنگ دلی کی پیروی کیوں کی؟ اور آخری درجہ کا اقدام کیوں کیا؟

تیسری وجہ — تین طلاقوں کی سنگینی ظاہر کرنے کے لئے — دوسرے نکاح کی شرط لگا کر تین طلاقوں کی سنگینی لوگوں کے ذہنوں میں بٹھائی گئی ہے کہ تین طلاقیں وہی دے گا جس نے قطعی طور پر طے کرلیا ہو کہ اسے بیوی کو چھوڑنا ہی ہے، اور واپس لانا ہے تو ایسی رسوائی اور بے عزتی کے بعد لانا ہے جس سے بڑی کوئی رسوائی اور بے عزتی نہیں ہوسکتی۔

[٥] وكان أهل الجاهلية يطلِّقُون ويُراجعون إلى متى شاء وا، وكان في ذلك من الإضرار مالا يخفى، فنزل قوله تعالى: ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ الآية. معناه: أن الطلاق المُعَقَّبَ للرجعة مرتان، فإن طلقها الثالثة فلا تحل له من بعد حتى تنكح زوجًا غيرَه؛ وألحقتِ السنةُ ذوقَ العُسيلة بالنكاح.

والسرُّ في جعل الطلاق ثلاثا، لايزيد عليها: أنها أولُ حدِّ كثرةٍ، ولأنه لابد من تَرَوٍّ، ومن

الناس من لايتبين له المصلحة حتى يذوق فَقْدًا، وأصلُ التجربةِ واحدةٌ، ويكمِّلُها اثنتان.
وأما اشتراط النكاح بعد الثالثة: فلتحقيق معنى التحديد والإنهاء. وذلك: أنه لوجاز رجوعُها إليه من غير تَخَلُّلِ نكاح الآخر، كان ذلك بمنزلة الرجعة، فإن نكاحَ المطلقةِ إحدى الرجعتين؛ وأن المرأةَ مادامت في بيته، وتحت يده، وبين أظهر أقاربه: يمكن أن يُغلَب على رأيها، وتَضطَرَّ إلى رضا ما يُسَوِّلون لها، فإذا فارقَتْهم، وذاقتِ الحرَّ والقرَّ، ثم رضيتْ بعد ذلك، فهو حقيقةُ الرضا.
وأيضًا: ففيه إذاقةُ الفقد، ومعاقبةٌ على اتباع داعيةِ الضجر، من غير تَرَوِّي مصلحةٍ مهمةٍ.
وأيضًا: ففيه إعظام الطلقات الثلاث بين أعينهم، وجعلُها بحيث لايُبادر إليها، إلا من وَطَّنَ نفسَه على ترك الطمع فيها، إلا بعد ذُلٍّ وإرغام أنف، لامزيد عليه.

ترجمہ: اور اہل جاہلیت طلاق دیا کرتے تھے۔ اور رجوع کیا کرتے تھے۔ جب تک وہ چاہتے۔ اور اس میں جو ایذا رسانی ہے وہ مخفی نہیں۔ پس نازل ہوا...... اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ طلاق جو رجعت کو پیچھے لانے والی ہے یعنی جس کے بعد رجعت درست ہے: دو بار ہے۔ پھر اگر اس کو تیسری طلاق دی تو وہ اس کے لئے حلال نہیں بعد ازیں، تا آنکہ وہ پہلے شوہر کے علاوہ سے نکاح کرے۔ اور حدیث نے تھوڑا شہد چکھنے کو نکاح کے ساتھ ملایا —— اور راز طلاق کو تین مقرر کرنے میں، جن پر زیادتی نہیں ہوسکتی: یہ ہے کہ (۱) تین کثرت کی پہلی حد ہے۔ (۲) اور اس کے لئے غور وفکر ضروری ہے۔ اور بعض لوگ وہ ہیں جن کے لئے مصلحت یعنی بیوی کی خوبی واضح نہیں ہوتی تا آنکہ وہ جدائی کا مزہ چکھیں۔ اور اصل تجربہ ایک طلاق ہے۔ اور دو تجربہ کو مکمل کرتی ہیں —— اور رہا تین کے بعد نکاح کی شرط لگانا: تو وہ حد بندی اور مکمل کرنے کے معنی کو بروئے کار لانے کے لئے ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ (۱) اگر عورت کا شوہر کی طرف لوٹنا درست ہو، دوسرے شخص کے نکاح کے درمیان میں آئے بغیر، تو وہ لوٹنا بمنزلۂ رجعت کے ہوگا۔ کیونکہ مطلقہ سے نکاح دو رجعتوں میں سے ایک ہے (۲) اور یہ کہ عورت جب تک شوہر کے گھر میں، اور اس کے ہاتھ کے نیچے اور اس کے رشتہ داروں کے درمیان ہے: ممکن ہے کہ وہ اس کی رائے کے خلاف مجبور کردی جائے۔ اور وہ اس بات پر خوش ہونے پر مجبور ہوجائے جو وہ لوگ اس کے سامنے مزین کرکے پیش کرتے ہیں۔ پس جب وہ ان سے جدا ہوجائے گی، اور گرم وسرد چکھے گی، پھر اس کے بعد راضی ہوگی تو وہ حقیقی رضامندی ہوگی —— اور نیز: پس اس میں جدائی کا مزہ چکھنا ہے۔ اور اہم مصلحت کو سوچے بغیر تنگ دلی کے تقاضے کی پیروی کرنے پر سزا ہے —— اور نیز: پس اس میں لوگوں کی نگاہوں میں تین طلاقوں کو سنگین بنانا ہے۔ اور تین طلاقوں کو اس طور پر بنانا ہے کہ ان کی طرف سبقت نہ کرے مگر وہ جس نے اپنے نفس کو خوگر بنالیا ہے، اس عورت میں آرزو ترک کرنے کا، مگر ایسی رسوائی اور بے عزتی کے بعد جس پر زیادتی نہیں ہوسکتی۔

لغات: العُسَیلة: العَسل (شہد) کی تصغیر...... تَروّی فی الأمر: غور وفکر کرنا۔ تَرَوٍّ: اسم فاعل۔ تَرَوّی: مصدر ...... فَقد (مصدر) گم ہونا، کھوجانا۔ مراد جدائی...... حَقّقَ الأمر: حقیقت وواقعہ بنانا، سچا کر دکھانا، بروئے کار لانا، پایۂ ثبوت کو پہنچانا...... أنْهیٰ الشیئ: ختم کرنا، مکمل کرنا...... غُلِبَ علی أمرہ: کسی معاملہ میں مجبور ہونا۔

قولہ: إلا بعدذُل: استثناء من الاستثناء الأول. أی لایُبادر إلی طلاقھا إلا من قطع الطمعَ فیھا، إلا ان یصبر علی ذُل وإرغام أنفِ الذی لامزید علیہ (سندی)

☆ ☆ ☆

تحلیل میں صحبت شرط ہونے کی وجہ

حدیث —— حضرت رِفاعہ قُرَظی رضی اللہ عنہ کی بیوی خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئیں۔ اور عرض کیا: میں رفاعہ کے نکاح میں تھی۔ انھوں نے مجھے طلاق دیدی، پس طلاق قطعی کردی یعنی تین طلاقیں دیدیں۔ پھر میں نے عبدالرحمٰن بن الزَّبیر سے نکاح کیا۔ اس کے پاس صرف کپڑے کے پھندنے (جھالر) جیسا ہے یعنی وہ نامرد از کار رفتہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم رفاعہ کی طرف لوٹنا چاہتی ہو؟'' اس نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، یہاں تک کہ تم کچھ اس کا شہد چکھو، اور وہ کچھ تمہارا شہد چکھے!'' یعنی جب تک تم دونوں میں صحبت نہ ہو رفاعہ کی طرف نہیں لوٹ سکتیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۹۵)

تشریح: نبی ﷺ نے نکاح کی تمامیت کو صحبت کے ساتھ مشروط کیا، تاکہ طلاق کی جو نہایت اور آخری حد لوگوں کے لئے مقرر کی گئی ہے: وہ بروئے کار آئے، اور محقق واقعہ بن جائے۔ کیونکہ تحلیل میں اگر صحبت شرط نہیں ہوگی تو لوگ نکاح کا ڈھونگ رچالیں گے۔ زبانی ایجاب وقبول کرکے شوہر ثانی مجلس عقد ہی میں طلاق دیدیگا۔ اور آخری حد مقرر کرنے کا مقصد فوت ہوجائے گا۔

حلالہ کرنے، کرانے والے پر لعنت کی وجہ

حدیث —— حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے پر اور جس کے لئے حلال کی گئی: لعنت فرمائی ہے۔ اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: یہ کہ یہ فعل مکروہ تحریمی ہے۔ دوم: وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی (مشکوٰۃ حدیث ۳۲۹۶)

تشریح: حلالہ کرنا اور کرانا دو وجہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: جو نکاح صرف حلالہ کی غرض سے کیا جاتا ہے، اس میں مقصدِ نکاح —— دنیوی معاملات میں تعاون —— پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ نکاح بے مقصد ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔

دوسری وجہ: تحلیل کے لئے نکاح کروانا بے حیائی ہے۔اس سے غیرت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ برتاؤ بکرا بیوی پر چڑھانا گوارہ کرلیا جاتا ہے۔اور دنیوی معاملات میں تعاون حاصل کرنے کا اس نکاح سے کچھ واسطہ نہیں، اس لئے یہ نکاح منع ہے۔

[٦] وقال صلى الله عليه وسلم لامرأةِ رِفاعة، حين طلقها، فبتَّ طلاقَها، فنكحتْ زوجًا غيره: "أتريدين أن ترجعي إلى رفاعة؟" قالت: نعم، قال: " لا حتى تذوقي عُسَيْلَته، ويذوقَ عُسَيْلَتَكِ"

أقول: إنما شَرَطَ تمامَ النكاح بذوق العسيلة: ليتحقق معنى التحديد الذى ضُرِب عليهم، فإنه لولا ذلك لاحتال رجل بإجراء صيغة النكاح على اللسان، ثم يُطَلِّقُ في المجلس، وهذا مناقضةٌ لفائدة التحديد.

[٧] ولعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المُحَلِّلَ والمُحَلَّلَ له.

أقول: لما كان من الناس من ينكح لمجرد التحليل، من غير أن يقصد منها تعاونًا في المعيشة، ولا يتم بذلك المصلحةُ المقصودةُ؛ وأيضًا: ففيه وقاحةٌ وإهمالُ غيرةٍ، وتسويغُ ازدحامٍ على الموطوءة، من غير أن يدخل في تضاعيف المعاونة: نُهي عنه.

ترجمہ: (٦) میں کہتا ہوں: آپؐ نے نکاح کی تمامیت کو تھوڑا شہد چکھنے کے ساتھ اس لئے مشروط کیا کہ اُس تحدید کی حقیقت بروئے کار آئے جو لوگوں کے لئے لازم کی گئی ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ اگر یہ بات (صحبت کی شرط) نہ ہوگی تو آدمی ضرور حیلہ کرے گا زبان پر نکاح کا لفظ جاری کرنے کے ذریعہ، پھر وہ مجلس میں طلاق دیدے گا۔ اور یہ حیلہ کرنا تحدید کے مقصد کو توڑنا ہے۔

(٧) میں کہتا ہوں: جب بعض لوگ صرف حلالہ کی غرض سے نکاح کیا کرتے تھے، اس کے بغیر کہ وہ عورت سے معیشت میں تعاون کا ارادہ کریں، اور ایسے نکاح سے مصلحتِ مقصودہ تام نہیں ہوتی۔ اور نیز: پس اس نکاح میں بے حیائی اور غیرت کو رائگاں کرنا ہے۔ اور موطوءہ پر بھیڑ کرنے کو جائز قرار دینا ہے، معاونت کو درمیان میں داخل کئے بغیر: تو اس کی ممانعت کی گئی (یہ لما کا جواب ہے)

☆ ☆ ☆

حیض میں طلاق ممنوع ہونے کی وجہ اور اس کی تلافی کا طریقہ

حدیث — حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی گئی۔ آپؐ بہت خفا ہوئے اور فرمایا: "چاہئے کہ وہ عورت کو نکاح میں واپس لے لے۔ پھر اس کو روکے رہے۔

یہاں تک کہ پاک ہوجائے، پھر اسے (دوسرا) حیض آئے۔ پھر پاک ہو، پس اگر اس کی رائے ہو تو پاک ہونے کی حالت میں، چھونے سے پہلے یعنی صحبت کرنے سے پہلے طلاق دے۔ پس یہ وہ عدت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۲۷۵)

تشریح: سورۃ الطلاق کے شروع میں ارشاد پاک ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ ترجمہ: اے پیغمبر! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو یعنی حیض سے پہلے پاکی کی حالت میں طلاق دو (مسلم شریف میں آیت کی ایک قراءت: فطلقوهن فی قُبُلِ عدتهن ہے) اور حدیث نے یہ قید بڑھائی کہ اس پاکی میں عورت سے صحبت نہ کی ہو۔

پس حیض کی حالت میں طلاق دینا جائز نہیں۔ یہ طلاقِ بدعی یعنی گناہ کا کام ہے۔ مگر طلاق واقع ہوجائے گی۔ پھر اگر تلافی ممکن ہو یعنی ایک یا دو رجعی طلاقیں دی ہوں تو تلافی کرنی ضروری ہے۔ جیسے مسجد میں تھوک ڈالنا گناہ ہے، اور اس کی تلافی تھوک صاف کرنا ہے (مشکوۃ حدیث ۷۰۸)

اور حیض کی طلاق کی تلافی کی صورت یہ ہے کہ عورت کو قول کے ذریعہ نکاح میں واپس لیلے یعنی عورت سے کہہ دے کہ میں نے تجھے نکاح میں واپس لیا۔ پھر جب عورت پاک ہو، اور طلاق دینے کی رائے ہو، تو صحبت کئے بغیر طلاق دے۔ اور اگر حیض میں تینوں طلاقیں ایک ساتھ دیدی ہیں تو اب تلافی کی کوئی صورت نہیں۔

اور حیض میں طلاق دینے کی ممانعت: دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: حیض کا زمانہ فطری نفرت کا زمانہ ہے۔ حیض میں عام طور پر عورت میلی کچیلی اور بوسیدہ کپڑوں میں رہتی ہے۔ پس حیض میں طلاق دینے میں احتمال ہے کہ شوہر نے واقعی ضرورت کی بنا پر نہیں، بلکہ فطری نفرت کی بنا پر طلاق دی ہو۔ حالانکہ یہ داعیہ قابل پذیرائی نہیں۔ یہ حالت تو عورت کی ایک مجبوری ہے، اور فطری نفرت کی وجہ سے جو شخص طلاق دیتا ہے وہ پچھتاتا ہے۔ اور ایسی صورت میں رجعت کرنے کی بھی نوبت آتی ہے۔ نیز ایسے سفلی جذبہ کی پیروی کرنے سے نفس کی حالت بھی خراب ہوتی ہے۔ طلاق تو اسی وقت دینی چاہئے جب کوئی ایسی مصلحت سامنے ہو جس کو قائم کرنے کا عقلِ سلیم حکم دیتی ہو۔ مثلاً عورت بدچلن ہو۔ اور سمجھانے اور تنبیہ کرنے پر بھی باز نہ آتی ہو، اور اس سے عقلی نفرت ہوگئی ہو، تو ایسے تقاضے سے طلاق دینے میں نفس خراب نہیں ہوتا۔ یہ نفرت قابل پذیرائی ہے۔ پس پاکی کی حالت میں، جب عورت کی طرف فطری میلان ہوتا ہے: مرد عورت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے طلاق پر اقدام کرے تو یہ حقیقی اور واقعی ضرورت کی علامت ہے۔ اس لئے طلاق دینے کے لئے طہر کا زمانہ متعین کیا ہے۔ اور حیض کی حالت میں طلاق دینے کی ممانعت کردی ہے۔

دوسری وجہ: حیض میں طلاق دینے سے عدت لمبی ہوجاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ احناف قُرءِ سے حیض مراد لیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک وہ حیض جس میں طلاق دی گئی ہے، عدت میں شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بعد مستقل تین حیض

عدت گذارنی پڑتی ہے۔اور شوافع قُرء سے طہر مراد لیتے ہیں۔ان کے نزدیک جس طہر میں طلاق دی گئی ہے، وہ طہر عدت میں شمار ہوتا ہے۔پس جب عورت کو تیسرا حیض آئے گا: عدت پوری ہوجائے گی۔اور اگر حیض میں طلاق دی ہے،تو اس حیض کے ساتھ جب چوتھا حیض آئے گا: تب عدت پوری ہوگی۔پس دونوں صورتوں میں عدت لمبی ہوجائے گی۔اس لئے عورت کو پریشانی سے بچانے کے لئے طہر کا زمانہ طلاق کے لئے متعین کیا گیا،اور حیض میں طلاق کی ممانعت کردی۔

اور جس طہر میں طلاق دی جاتی ہے: اس میں صحبت کی ممانعت دو وجہ سے کی ہے:

پہلی وجہ: حیض کے بعد جب پاکی کا زمانہ آتا ہے تو مرد طبعی طور پر عورت کی طرف راغب ہوتا ہے۔پس اس وقت استمتاع کے بجائے طلاق دینا سچی ضرورت پر دلالت کرتا ہے۔اور صحبت کرلینے سے رغبت سست پڑجاتی ہے اور طبیعت سیر ہوجاتی ہے،پس ایسے وقت میں طلاق دینا ایسا ہے جیسا پیٹ بھر گیا تو دسترخوان بڑھا دیا!

دوسری وجہ: پاکی میں صحبت کرنے کی صورت میں احتمال ہے کہ حمل ٹھہر گیا ہو۔پس عورت اگلا حیض آنے تک پریشان رہے گی کہ اسے عدت حیض سے گذارنی ہے یا وضع حمل سے؟ عورت کو اس الجھن سے بچانے کے لئے اُس طہر میں صحبت کی ممانعت کردی جس میں طلاق دینی ہے (یہ وجہ شارح نے بڑھائی ہے)

درمیان میں ایک طہر خالی چھوڑنے کی وجہ: نبی ﷺ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو بیچ میں ایک طہر خالی چھوڑنے کا حکم دیا تھا۔حالانکہ مسئلہ کی رو سے یہ بات ضروری نہیں۔کسی نے حیض میں طلاق دی ہو، پھر رجوع کرلیا ہو،تو پاک ہونے کے بعد طلاق دے سکتا ہے۔ایک طہر درمیان میں خالی رکھنا ضروری نہیں۔پس یہ حکم دو مصلحتوں کی بنا پر تھا:

پہلی مصلحت —— طلاق کی عقلی مصلحت کو اعلیٰ درجہ میں فائز کرنا —— ابھی یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ ایک نفرت طبعی ہوتی ہے، جو حیض وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔اس کی بنا پر طلاق نہیں دینی چاہئے۔دوسری نفرت: عقلی ہوتی ہے، جو عورت کی بدچلنی وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ہے،اسی نفرت کی وجہ سے طلاق دینی چاہئے۔مگر یہ دونوں نفرتیں بہت سے لوگوں پر مشتبہ ہوجاتی ہیں۔وہ دونوں میں امتیاز نہیں کرسکتے۔اس لئے ضروری ہے کہ کوئی ایسی چیز متعین کی جائے جس سے دونوں نفرتوں میں خوب امتیاز ہوجائے۔

اور یہ بات معلوم ہے کہ حیض نفرت کی احتمالی جگہ ہے،اس لئے حیض میں طلاق دینے کو نبی ﷺ نے ناپسند کیا۔اور طہر رغبت کی احتمالی جگہ ہے۔پس اسی میں طلاق دینی چاہئے۔عقلی مصلحت اور عقلی نفرت اسی صورت میں متحقق ہوتی ہے۔کیونکہ رغبت کے زمانہ میں طلاق پر اقدام کرنا عقلی مصلحت کی احتمالی جگہ ہے۔پھر ایک طہر چھوڑ کر آئندہ طہر میں طلاق دینا عقلی مصلحت کو اعلیٰ درجہ پر فائز کرنا ہے۔کیونکہ لمبے عرصہ تک دل میں طلاق کا خیال باقی رہنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ صریح عقل کا فیصلہ ہے،اس میں نفس کا ذرا دخل نہیں۔اور یہ تدبیر خالص ہے یعنی گھر کو سنوارنے ہی کے لئے طلاق دی ہے۔کیونکہ جب درمیان میں ایک طہر خالی چھوڑے گا،اور آئندہ طہر میں طلاق دے گا تو ماہ ڈیڑھ ماہ کا وقفہ ہوگا۔اس عرصہ میں

احوال میں تبدیلی آتی ہے۔عورت حیض سے پاکی کی طرف، پراگندگی سے آرائش کی طرف،اور مرد کی طبیعت انقباض سے انبساط کی طرف پلٹتی ہے۔پھر بھی دل سے طلاق کا خیال نہ نکلنا عقلی مصلحت کو اعلیٰ درجہ پر فائز کرتا ہے۔چنانچہ نبی ﷺ نے درمیان میں ایک طہر اور ایک حیض کو لانے کا حکم دیا تا کہ عقلی مصلحت (عقلی نفرت) امر واقعہ بن جائے۔

دوسری مصلحت ـــــ یہ جاننا کہ طلاق کی ضرورت باقی ہے یا نہیں؟ ـــــ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے خود طلاق نہیں دی تھی۔ایک مصلحت سے ان سے طلاق دلوائی گئی تھی۔اس لئے نبی ﷺ نے درمیان میں ایک طہر چھوڑنے کا حکم دیا تا کہ اس میں اندازہ کیا جائے کہ طلاق کی ضرورت باقی ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی بیوی سے بے حد تعلق ہو گیا تھا۔نماز کے لئے بھی جدا ہونا شاق گذرتا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو حکم دیا کہ بیوی کو طلاق دیدو۔ابن عمرؓ نے چپڑ چپڑ کی اور نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا۔آپؐ نے بھی فرمایا: أَطِعْ أباك: اپنے والد کا حکم مانو! اب کوئی چارہ نہ رہا۔چنانچہ جب دوسری مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا تو فوراً طلاق دیدی۔اور عرض کیا کہ اس وقت اہلیہ حیض میں ہے۔پہلے یہ بات اس لئے نہیں بتلائی کہ کہیں ابا اس کو حیلہ جوئی خیال نہ کریں۔اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فکر ہوئی۔اور وہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔اور ماجرا بیان کیا۔نبی ﷺ نے وہ حکم دیا جو اوپر حدیث میں آچکا ہے۔پس درمیان میں ایک طہر چھوڑنے کا حکم ایک مصلحت کے لئے تھا۔یعنی یہ حکم اس لئے تھا کہ اس طہر میں تعلقات کی نوعیت کا اندازہ کیا جائے۔چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندازہ ہو گیا کہ اب تعلق میں اعتدال آگیا ہے، پس آپؐ نے خود ہی طلاق دینے کی ممانعت کر دی۔اور وہ بیوی ابن عمرؓ کے نکاح میں عرصہ تک رہی۔یہ بات ترمذی (۱۴۲:۱ أبواب الطلاق، باب ماجاء في الرجل يسأله أبوه أن يطلّق امرأته) کی روایت سے ماخوذ ہے (یہ وجہ شارح نے بڑھائی ہے)

ملحوظہ: شاہ صاحب قدس سرہٗ نے دو باتیں رلا ملا کر بیان کی ہیں، جس کی وجہ سے عبارت پیچیدہ ہو گئی ہے: ایک: حیض میں طلاق کی ممانعت کی وجہ۔دوسری: درمیان میں ایک طہر چھوڑنے کی وجہ۔شرح میں دونوں باتوں کو الگ الگ کیا ہے۔اس لئے تقریر کو کتاب سے ملاتے وقت خیال رکھیں۔

[۸] وطلّق عبدُ اللّٰه بن عمر رضي الله عنه امرأتَه، وهي حائضٌ، وذُكر ذلك للنبي صلى الله عليه وسلم، فتغيَّظَ، وقال:" لِيُراجِعْها، ثم يُمسِكْها حتى تطهُرَ، ثم تحيضَ، ثم تطهرَ، فإن بداله أن يطلقها فليطلقْها طاهرًا قبل أن يمسَّها"

أقول: السر في ذلك: أن الرجل قد يُبْغِض المرأةَ بُغضةً طبيعيةً ـــــ ولا طاعةَ لها ـــــ مثلَ كونها حائضًا، وفي هيئةٍ رَثّةٍ، وقد يُبغضها لمصلحةٍ يَحكم بإقامتها العقلُ السليمُ، مع وجود الرغبة الطبيعية، وهذه هي المتَّبَعَةُ، وأكثر مايكون الندمُ في الأول، وفيه يقع التراجع، وهذه

داعية: يتوقف تهذيبُ النفس على إهمالها، وترك اتباعها، وقد يشتبهُ الأمران على كثير من الناس، فلا بد من ضرب حدٍّ يتحقق به الفرقُ، فَجَعَلَ الطهرَ مظنةً للرغبة الطبيعية، والحيضَ مظنةً للبغضة الطبيعية، والإقدامَ على الطلاق، على حينِ رغبةٍ فيها، مظنةً للمصلحة العقلية، والبقاءَ مدةً طويلةً على هذا الخاطر، مع تحوُّل الأحوال من حيض إلى طهر، ومن رثاثة إلى زينة، ومن انقباض إلى انبساط: مظنةً للعقل الصُّراح والتدبير الخالص؛ فلذلك كرِه الطلاق في الحيض، وأَمَرَ بالمراجعة وتخللِ حيض جديد.

وأيضًا: فإن طلَّقها في الحيض، فإن عُدَّتْ هذه الحيضةُ في العدة، انتقصتْ مدةُ العدة، وإن لم تُعَدَّ تضررت المرأة بطول العدة، سواء كان المراد بالقروء: الأطهار أو الحيض؛ ففي كل ذلك مناقضةٌ للحد الذي ضربه الله في محكم كتابه من ثلاثة قروء.

وإنما أمر أن يكون الطلاقُ في الطهر قبل أن يَمَسَّها للمعنيين:

أحدهما: بقاء الرغبة الطبيعية فيها، فإنه بالجماع تفتر سَورة الرغبة.

وثانيهما: أن يكون ذلك أبعدَ من اشتباه النسب.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس میں یعنی حیض میں طلاق کی ممانعت میں اور درمیان میں ایک طہر خالی چھوڑنے میں راز یہ ہے کہ آدمی کبھی عورت سے نفرت کرتا ہے طبعی طور پر نفرت کرنا۔ اور اس نفرت کے لئے کوئی فرمانبرداری نہیں یعنی اس کی پیروی انسان کو نہیں کرنی چاہئے۔ اور اس نفرت کی بنا پر طلاق نہیں دینی چاہئے۔ جیسے عورت کا حالتِ حیض میں اور بوسیدہ حالت میں ہونا —— اور کبھی آدمی عورت سے نفرت کرتا ہے کسی ایسی مصلحت کی وجہ سے جس کو برپا کرنے کا عقلِ سلیم فیصلہ کرتی ہے، طبعی رغبت موجود ہوتے ہوئے۔ اور یہی وہ نفرت ہے جس کی پیروی کی ہوئی ہے یعنی اس کی بنا پر طلاق دی جاسکتی ہے —— اور عام طور پر پہلی صورت میں پشیمانی ہوتی ہے۔ اور اسی میں رجعت ہوتی ہے۔ اور نفس کی اصلاح اس تقاضے کے ترک کرنے، اور اس کی پیروی نہ کرنے پر موقوف ہے —— اور کبھی بہت سے لوگوں پر یہ دونوں باتیں (نفرتیں) مشتبہ ہوجاتی ہیں۔ پس کوئی حد مقرر کرنی ضروری ہے جس کے ذریعہ فرق امرِ واقعہ بنے —— چنانچہ نبی ﷺ نے طہر کو فطری رغبت کی احتمالی جگہ قرار دیا، اور حیض کو فطری نفرت کی احتمالی جگہ قرار دیا۔ اور عورت میں رغبت کے وقت میں طلاق پر اقدام کو عقلی مصلحت کی احتمالی جگہ قرار دیا۔ اور لمبے وقت تک دل میں اس خیال کے باقی رہنے کو —— احوال کی تبدیلی کے ساتھ: حیض سے پاکی اور پراگندگی سے زیبائش اور انقباض سے انبساط کی طرف —— صریح عقل اور خالص تدبیر کی احتمالی جگہ قرار دیا۔ چنانچہ حالتِ حیض میں طلاق کو ناپسند کیا، اور مراجعت اور نئے حیض کو درمیان میں لانے کا حکم دیا —— اور نیز: پس اگر شوہر نے عورت کو حیض میں طلاق دی: تو اگر یہ حیض عدت میں شمار کیا جائے گا تو عدت کی مدت گھٹ جائے گی۔ اور اگر شمار نہیں کیا

جائے گا تو عورت ضرر اٹھائے گی عدت لمبی ہونے کی وجہ سے، خواہ قُرء سے مراد پاکیاں ہوں یا حیض۔ پس ہر صورت میں اس حد کو توڑنا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں مقرر کیا ہے۔ یعنی تین قروء پر زیادتی ہوگی۔

اور آپ نے حکم دیا کہ طلاق پاکی میں ہو عورت کو چھونے سے پہلے: دو معنی کی وجہ سے: ایک: عورت میں طبعی رغبت کا باقی رہنا۔ کیونکہ صحبت کرنے کی وجہ سے رغبت کی تیزی سست پڑ جاتی ہے ـــــ اور دوسرے: وہ نسب کے اشتباہ سے بہت دور ہے (یہاں نسب کے اشتباہ کا کوئی موقع نہیں، اس لئے شارح نے یہ وجہ بدل دی ہے)

☆ ☆ ☆

طلاق پر گواہ بنانے کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے طلاق پر دو گواہ بنانے کا حکم دیا ہے۔ اس میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: شرمگاہوں کے معاملہ کی اہمیت ظاہر کرنا مقصود ہے، تاکہ نکاح کی طرح فکِّ نکاح بھی لوگوں کے روبرو ہو۔

دوسری حکمت: نسب گڈمڈ نہ ہو یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ عورت طلاق کا جھوٹا دعوی کر کے دوسرا نکاح کرلے اور اس سے اولاد ہو۔ پس یہ اولاد صاحب فراش کی مانی جائے گی جبکہ نفس الامر میں وہ دوسرے کی ہے۔ اور طلاق کے گواہ ہونگے تو یہ صورت پیش نہیں آئے گی۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کل کو شوہر کا نفس شرارت کرے یا بیوی بچوں کی محبت غالب آئے، اور میاں بیوی متفق ہوکر طلاق کو گاؤ خورد کردیں۔ اور طلاق کے گواہ ہوں گے تو ایسا نہیں ہوسکے گا۔

فائدہ: سورۃ الطلاق آیت دو میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَأَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ ترجمہ: اور اپنے لوگوں میں سے یعنی مسلمانوں میں سے دو معتبر آدمی گواہ بنالو۔ یہ حکم عام ہے: نکاح میں گواہ بنانا، طلاق پر گواہ بنانا اور اختتام عدت پر گواہ بنانا: سب کو آیت شامل ہے۔ پھر حدیث نے اضافہ کیا کہ نکاح میں گواہ بنانا صحتِ نکاح کے لئے شرط ہے۔ ارشاد فرمایا: البغایا اللاتی یُنکحن أنفسَهن بغیر بینة: وہ عورتیں رنڈیاں ہیں جو گواہوں کے بغیر اپنا نکاح کرتی ہیں (مشکوۃ حدیث ۳۱۳۲ باب الولی) اور باقی چیزوں میں گواہ بنانا اکثر ائمہ کے نزدیک مستحب ہے۔ طلاق، رجعت اور عدت کا اختتام اس پر موقوف نہیں۔

ایک طہر میں تینوں طلاقیں دینے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک ایسے شخص کے بارے میں اطلاع دی گئی، جس نے اپنی بیوی کو تینوں طلاقیں ایک ساتھ دیدی تھیں۔ آپ غضبناک ہوکر کھڑے ہوئے، اور فرمایا: أیُلعب بکتاب الله عزوجل، وأنا بین أظهر کم! کیا اللہ تعالیٰ کی کتاب کے ساتھ کھلواڑ شروع کردیا گیا: حالانکہ میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں! یعنی قرآن کریم میں ﴿الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ﴾ میں حکم دیا گیا ہے کہ ہر طلاق

الگ دی جائے، لوگوں نے ابھی سے اس کی خلاف ورزی شروع کردی! یہاں تک کہ ایک شخص کھڑا ہوا، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اس کو قتل نہ کردوں! (مشکوۃ حدیث ۳۲۹۲)

تشریح: تینوں طلاقیں ایک ساتھ دینے سے وہ مقصد فوت ہوجاتا ہے جو تفریق طلاق کی مشروعیت میں ملحوظ ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ طلاق دینے والا اپنی کوتاہی کی تلافی کرسکے۔ نیز تینوں طلاقیں ایک ساتھ دینے میں آدمی کا اپنا ہی نقصان ہے، اسی کے لئے معاملہ تنگ ہوجاتا ہے، اور کبھی کفِ افسوس ملنے کی نوبت آتی ہے۔

سوال: تین طہروں میں تین طلاقیں دینا کیوں جائز ہے؟ اس سے بھی تو معاملہ تنگ ہوجاتا ہے!

جواب: تین طہروں میں تین طلاقیں دینا بھی ٹھیک نہیں۔ طلاق دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک طلاق پر اکتفا کی جائے۔ تاکہ عدت کے بعد بھی تدارک کی راہ کھلی رہے۔ اور تین طہروں میں تین طلاقیں دینے سے بھی معاملہ تنگ ہوجاتا ہے۔ اور کبھی کفِ افسوس ملنے کی نوبت آتی ہے۔ مگر بہرحال یہ بات پہلی بات سے ہلکی ہے۔ یعنی ایک طہر میں تینوں طلاقیں دینے سے اخف ہے۔ کیونکہ اس صورت میں غور وفکر کا موقعہ رہتا ہے۔ عدت میں احوال بھی بدلتے ہیں۔ پھر بھی ہر طہر میں طلاق دینا واقعی مصلحت کی دلیل ہے۔ اور کبھی انسان کی مصلحت حرمتِ غلیظہ میں ہوتی ہے۔ مثلاً اندیشہ ہے کہ خاندان تجدید نکاح پر مجبور کرے، اور اسے وہ عورت بالکل نہیں رکھنی پس ایسی صورت میں شوہر کی مصلحت تینوں طلاقیں ختم کرکے عورت کو مغلظہ کرنے میں ہے۔

[۹] وإنما أمر الله تعالى بإشهاد شاهدين على الطلاق لمعنيين:
أحدهما: الاهتمامُ بأمر الفروج، لئلايكون نظمُ تدبير المنزل، ولا فَكُّه، إلا على أعين الناس.
والثاني: أن لا تشتبه الأنسابُ، وأن لايتواضعَ الزوجان من بعدُ، فَيُهْمِلاَنِ الطلاقَ، والله أعلم.
[۱۰] وكره أيضًا جمعَ الطلقات الثلاث في طهر واحد. وذلك: لأنه إهمالٌ للحكمة المرعية في شرعِ تفريقِها، فإنها شُرعت ليتدارك المفرِّطُ، ولأنه تضييقٌ على نفسه، وتعرضٌ للندامة.
وأما الطلقات الثلاث في ثلاثة أطهار: فأيضًا: تضييقٌ، ومظنةُ ندامةٍ، غير أنها أخفُّ من الأول من جهةِ وجودِ التروِّي، والمدةِ التي تتحول فيها الأحوالُ، وربَّ إنسانٍ تكون مصلحته في التحريم المغلَّظ.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: تَوَاضَعَ القوم على الأمر: لوگوں کا کسی کام پر متفق ہونا۔

تصحیح: في التحريم المغلَّظ اصل میں في تحريم المغلَّظ (اضافت کے ساتھ) تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

باب —— ۹

خلع، ظہار، ایلاء اور لعان کا بیان

۱- خلع میں قباحت ہے، مگر بوقتِ حاجت جائز ہے

خلع: کے معنی ہیں: مال کے عوض بیوی کو طلاق دینا۔ خلع میں کچھ قباحت ہے۔ کیونکہ شوہر نے جو مہر عورت کو دیا ہے، اس کے عوض وہ بیوی سے فائدہ اٹھا چکا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بعض ظالم شوہر نہ بیوی کو رکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے حقوق کی فکر کریں، نہ چھوڑتے ہیں۔ بیوی تنگ آجاتی ہے۔ شوہر اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے کہ طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال، یا کم از کم مہر کی معافی، یا اس کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ حالانکہ اس نے بیوی کو جو کچھ دیا ہے اس کے مقابلہ میں وہ بیوی سے صحبت کر چکا ہے، پھر اس مال کو واپس لینے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ سورۃ النساء آیت ۲۱ میں ارشاد پاک ہے: ''اور تم اس کو کیسے لیتے ہو، حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو، اور وہ عورتیں تم سے پکا قول وقرار لے چکی ہیں؟!'' یعنی بوقتِ عقد قطعی طور پر مہر طے ہو چکا ہے۔ پس اب اس قول وقرار کو توڑ کر کل مہر یا اس کا کچھ حصہ واپس کیسے لیتے ہو؟!

اسی بات کا لحاظ کر کے نبی ﷺ نے لعان کے ایک واقعہ میں مہر کی واپسی کا مطالبہ رد کر دیا ہے۔ ایک واقعہ میں جب میاں بیوی لعان سے فارغ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے دونوں میں تفریق کر دی۔ شوہر نے مہر کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تو نے بیوی کے بارے میں سچی بات کہی ہے، تو مہر صحبت کا عوض بن گیا۔ اور جھوٹی بات کہی ہے: تب تو مہر کی واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۰۶)

البتہ ایک صورت میں مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ جائز ہے۔ وہ یہ ہے کہ عورت بھی محسوس کرے کہ مزاجوں میں تخالف اور طبیعتوں میں بُعد کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکے گا، اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی ہوگی یعنی وہ شوہر کے حقوق ادا نہیں کر سکے گی، اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں خلع جائز ہے۔

اس صورت کا بیان سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۹ میں ہے۔ پہلے یہ بات بیان کی ہے کہ طلاق دو ہی مرتبہ ہے یعنی تیسری طلاق استعمال نہیں کرنی چاہئے۔ اور یہ دونوں طلاقیں بھی رجعی دی جائیں، تاکہ نکاح ختم نہ ہو، پھر یا تو دستور کے مطابق رجعت کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں واپس لیلے، یا خوش معاملگی سے اس کی مدت پوری ہونے دے، تاکہ عدت کے بعد وہ آزاد ہو جائے —— پھر تیسری طلاق کے تذکرہ سے پہلے بیچ میں خلع کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ''اور تمہارے لئے یہ

بات جائز نہیں کہ اس مال میں سے کچھ بھی لو جو تم نے ان کو مہر میں دیا ہے، مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل نہیں کر سکیں گے۔ سو اگر تم (حکام) کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں احکام خداوندی کی تعمیل نہیں کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں، اس میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے"

﴿الخلع، والظهار، واللعان، والإيلاء﴾

اعلم: أن الخلع فيه شناعةٌ مّا، لأن الذى أعطاها من المال قد وقع فى مقابلة المسيس، وهو قوله تعالى: ﴿وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهُ وَقَدْ أَفْضٰى بَعْضُكُمْ إِلٰى بَعْضٍ، وَأَخَذْنَ مِنْكُمْ مِيْثَاقًا غَلِيْظًا﴾ واعتبر النبيُّ صلى الله عليه وسلم هذا المعنى فى اللعان، حيث قال: "إن كنتَ صدقتَ عليها فهو بما اسْتَحْلَلْتَ من فرجها". ومع ذلك: فربما تقع الحاجةُ إلى ذلك فذلك قوله تعالى: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ﴾

ترجمہ: واضح ہے۔ البتہ ایک بات جان لیں: عنوان میں لعان کا ذکر ایلاء سے پہلے کیا ہے، مگر باب میں لعان کا تذکرہ ایلاء کے بعد آخر باب میں ہے۔

تصحیح: أعطاها تمام نسخوں میں أعطاه تھا۔ یہ تصحیح شارح نے کی ہے۔ کیونکہ مہر عورت شوہر کو نہیں، بلکہ شوہر عورت کو دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

ظہار اور اس کے متعلقات کی حکمتیں

ظہار: بیوی کو محرّماتِ ابدیہ کے ساتھ، یا ان کے کسی ایسے عضو کے ساتھ تشبیہ دینا جس کا دیکھنا حرام ہے۔ جیسے بیوی سے کہا کہ "تو میرے لئے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے (انتِ عليَّ كظهر أمي) —— زمانۂ جاہلیت میں لوگ ظہار کیا کرتے تھے۔ وہ ان کو ماں کی پیٹھ کی طرح گردانا کرتے تھے۔ پھر وہ کبھی بیوی سے صحبت نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ظہار کی تحریم ان کے نزدیک طلاق کی تحریم سے سخت تھی۔ مگر بیوی دوسرا نکاح بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اس میں عورت بے کے حق میں جو مضرت تھی وہ مخفی نہیں۔ عورت نہ تو محبوبہ رہتی کہ دوسری عورتوں کی طرح شوہر سے متمتع ہو، اور نہ بے نکاحی ہوتی کہ اس کا معاملہ اس کے ہاتھ میں ہو —— پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں حضرت اَوس بن الصامت رضی اللہ عنہ نے —— جو ایک ضعیف البصر بوڑھے آدمی تھے —— اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا سے ظہار کیا۔ اور آپؐ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا، تو سورۃ المجادلۃ کی ابتدائی چار آیتیں نازل ہوئیں۔ جن میں ظہار کا حکم بیان کیا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ظہار سے ابدی

حرمت پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ شوہر نے ایک نامعقول اور جھوٹی بات کہی ہے، اس لئے کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظہار کرنے والوں کا قول (أنتِ علیَّ کظھر أمی) کو نہ تو بالکل نظر انداز کیا، نہ اس کو ابدی حرمت کا موجب قرار دیا۔ بلکہ حرمتِ موقّتہ یعنی کفارہ ادا کرنے تک حرمت کا موجِب قرار دیا۔

اور ظہار کرنے والوں کا قول دو وجہ سے بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا:

پہلی وجہ: ظہار کرنے والے نے خود اس بات کو اپنے اوپر لازم کیا ہے، پس وہ از قبیل التزام عبد ہے۔ اور التزاماتِ عبد قابل مؤاخذہ ہیں۔ جیسے کوئی شخص منت مانے تو اس کا ایفاء ضروری ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۱: ۷۸۸)

دوسری وجہ: وہ ظہار کرنے والے کی پختہ ارادہ سے بولی ہوئی بات ہے، پس وہ بمنزلہ قسم ہے۔ جیسے حلال کو حرام کرنا، یا حرام کو حلال کرنا یمین ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس قول کو ابدی حرمت کا موجب بھی قرار نہیں دیا: جیسا کہ جاہلیت کا تصور تھا۔ کیونکہ اس میں عورت کے حق میں سخت ضرر تھا۔ بلکہ اس قول کو کفارہ کی ادائیگی تک حرمت کا سبب بنایا۔

کفارہ میں دو خصوصیتیں ہیں: ایک: کفارہ گناہ کو مٹاتا ہے۔ دوم: التزام کی خلاف ورزی سے شوہر جو دل میں تنگی محسوس کرے گا: کفارہ اس کو ختم کرے گا۔

اور ظہار میں بولی ہوئی بات جھوٹ اس لئے ہے کہ وہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو خبر ہے یا انشاء[1] خبر یعنی اطلاع دیتا ہے کہ اس کی بیوی اس کی ماں ہے۔ اور انشاء یعنی وہ بیوی کو ماں بناتا ہے —— اگر اطلاع دی ہے تو وہ جھوٹ اس لئے ہے کہ بیوی نہ حقیقۃً ماں ہے نہ مجازاً۔ حقیقۃً ماں نہ ہونا تو ظاہر ہے۔ حقیقی ماں وہی ہے جس نے اس کو جنا ہے۔ اور مجازی ماں اس لئے نہیں کہ بیوی اور ماں میں نہ تو علاقۂ تشبیہ ہے، نہ علاقۂ مجاورت۔ جبکہ مجاز کے لئے ان دو علاقوں میں سے کوئی علاقہ ضروری ہے، جس کی وجہ سے بیوی کو ماں اور ماں کو بیوی کہہ سکیں —— اور اگر یہ قول انشاء ہے یعنی مُظاہر بیوی کو ماں بنا رہا ہے تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ بیوی کو ماں بنانا ایک مضرت رساں معاملہ ہے۔ اور مصلحتِ نکاح سے بھی ہم آہنگ نہیں۔ نہ اس پر کوئی دلیل نقلی موجود ہے، نہ دلیل عقلی، پس یہ بات محض حماقت ہے۔

اور ظہار کرنے والے کا قول نامعقول اس لئے ہے کہ وہ بیوی پر ظلم وستم ڈھانا ہے۔ اور اس کو پریشانی میں مبتلا کرنا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔

اور کفارے ترتیب وار تین مقرر کئے ہیں: غلام آزاد کرنا، مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا، اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا: یہ کفارے اس لئے تجویز کئے گئے ہیں کہ کفارہ کا ایک مقصد زجر و توبیخ ہے۔ کفارہ سے نگاہوں کے سامنے یہ بات متحضر ہو جاتی ہے کہ وہ آئندہ کفارہ کے خوف سے اس فعل پر اقدام نہیں کرے گا۔ اور کفارہ سے یہ مقصد اس وقت حاصل ہو سکتا ہے: جب

---

[1] جملہ أنتِ علیَّ کظھر أمی لفظاً خبر ہے۔ اور عقود میں ہونے کی وجہ سے معنًی انشاء ہے ۱۲

کوتاہی کرنے والے کو کسی سخت عبادت کا مکلّف بنایا جائے، جو اس کے نفس کو زیر کرے: بایں طور کہ اس کو اتنا مال خرچ کرنے کا حکم دیا جائے جس میں لوگ بخیلی کرتے ہیں، یا اس طرح کہ اس کو سخت بھوک پیاس سے دوچار کیا جائے۔

وكان أهل الجاهلية يحرِّمون أزواجَهم، ويجعلونهن كظهر الأم، فلا يَقْرُبُوْنَهن بعد ذلك أبدًا، وفي ذلك من المفسدة مالايخفى، فلاهي حَظِيَّةٌ تتمتع منه كما تتمتع النساء من أزواجهن، ولا هي أَيِّمٌ يكون أمرها بيدها، فلما وقعت هذه الواقعة في زمان النبي صلى الله عليه وسلم، واستُفْتِيَ فيها، أنزل الله عزوجل: ﴿قَدْسَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا﴾ إلى قوله ﴿عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾

والسرُّ فيه: أن الله تعالى لم يَجعل قولَهم ذلك هدرًا بالكلية، لأنه أمرٌ ألزَمَه على نفسه، وأكَّدَ فيه القولَ بمنزلة سائر الأيمان؛ ولم يجعله مؤبَّدًا كما كان في الجاهلية، دفعًا للحرج الذي كان عندهم؛ وجعله موقَّتا إلى كفارة، لأن الكفارة شُرعت دافعةً للآثام، مُنْهِيَةً لما يجده المكلَّف في صدره.

وأما كونُ هذا القول زُورًا : فلأن الزوجة ليست بأم حقيقةً، ولا بينهما مشابهة أو مجاورة تُصَحِّحُ إطلاقَ اسمِ إحداهما على الأخرى، إن كان خبرًا؛ وهو عقدٌ ضارٌّ غيرُ موافقٍ للمصلحة، ولامما أوحاه الله في شرائعه، ولا مما استنبطَه ذوو الرأي في أقطار الأرض، إن كان إنشاءً.

وأما كونُه منكرًا: فلأنه ظلم وجور، وتضييقٌ على من أُمر بالإحسان إليه.

وإنما جُعلت الكفارة : عتقَ رقبة، أو إطعامَ ستين مسكينا، أو صيامَ شهرين متتابعين: لأن من مقاصد الكفارة: أن يكون بين عَيْنَيِ المكلَّف ما يكبَحُه عن الاقتحام في الفعل، خشيةَ أن يلزَمَه ذلك، ولايمكن ذلك إلا بكونها طاعةً شاقةً،تغلب على النفس: إما من جهةِ كونها بذلَ مالٍ يُشَحُّ به، أو من جهة مقاساةِ جوعٍ وعَطَشٍ مُفْرِطَيْن.

ترجمہ: اور اس میں راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو بالکل رائگاں نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کو شوہر نے اپنے اوپر لازم کیا ہے، اور پکی کی ہے اس معاملہ میں بات، جیسے دیگر ایمان — اور نہیں بنایا اس قول کو دائمی حرمت، جیسا کہ وہ جاہلیت میں تھا، اس تنگی کو ہٹانے کے لئے جو جاہلیت کے زمانہ میں تھی۔ اور اس کو کفارہ تک موقّت بنانا: اس لئے کہ کفارہ گناہوں کو مٹانے کے لئے مشروع کیا گیا ہے، اس بات کو ختم کرنے والا ہے جس کو مکلّف

اپنے سینہ میں پاتا ہے ـــــ اور رہا اس بات کا جھوٹ ہونا: پس اس لئے کہ بیوی حقیقت میں ماں نہیں ہے۔ اور نہ دونوں کے درمیان کوئی مشابہت یا کوئی ایسی مجاورت ہے جو درست کرے دونوں میں سے ایک کے نام کے اطلاق کو دوسری پر، اگر یہ بات خبر ہے۔ اور وہ مضرت رساں معاملہ ہے، مصلحت سے ہم آہنگ نہیں، اور نہ وہ ان باتوں میں سے ہے جس کو اللہ نے وحی کیا ہے اپنی شریعتوں میں یعنی اس کی کوئی نقلی دلیل بھی نہیں۔ اور نہ وہ ان چیزوں میں سے ہے جس کو عقلمندوں نے نکالا ہے زمین کے کناروں میں یعنی اس پر کوئی دلیل عقلی بھی قائم نہیں، اگر یہ بات انشاء ہے ـــــ اور رہا اس کا نامعقول بات ہونا: تو اس لئے کہ وہ ظلم وجور ہے، اور اس پر تنگی کرنا ہے جس کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے ـــــ اور کفارہ گردانا گیا ہے: غلام آزاد کرنا، یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا دو ماہ کے مسلسل روزے رکھنا: اس لئے کہ کفارہ کے مقاصد میں سے یہ ہے کہ مکلف کی نگاہوں کے سامنے وہ بات رہے جو اس کو باز رکھے کام میں گھسنے سے اس خوف سے کہ اس پر وہ چیز لازم ہو جائے۔ اور نہیں ممکن ہے یہ بات مگر کفارہ کے سخت دشوار عبادت ہونے کے ذریعہ، جو نفس کو زیر کرے: یا تو کفارہ کے ہونے کی وجہ سے: ایسا مال خرچ کرنا جس میں بخیلی کی جاتی ہے، یا حد سے زیادہ بھوک اور پیاس برداشت کرنے کی وجہ سے۔

لغات: مُنْهِيَة (اسم فاعل از باب افعال) أَنْهَى الشَيءَ: ختم کرنا...... غَلَب علیه: زیر کرنا، غالب ہونا۔

تشریح: مجاز کے لئے علاقۂ تشبیہ یا اس کے علاوہ پچیس علاقوں میں سے کوئی علاقہ ضروری ہے۔ یہی ۲۵ علاقے مجاورت (پڑوس) کہلاتے ہیں۔ تفصیل نور الانوار (ص ۱۰۸) اور اس کے حاشیہ قمر الاقمار میں حقیقت ومجاز کی بحث میں ہے۔

تنبیہ: کفاروں کے ذکر میں: ساٹھ مسکینوں کو کھلانا: مقدم ذکر کیا ہے، تاکہ دونوں مالی کفارے ایک ساتھ ہو جائیں۔

☆ ☆ ☆

ایلاء کا بیان اور مدتِ ایلاء کی حکمت

سورۃ البقرۃ آیات ۲۲۶ و ۲۲۷ میں ارشاد پاک ہے: ''ان لوگوں کے لئے جو اپنی بیویوں سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھاتے ہیں: چار ماہ تک انتظار کرنا ہے۔ پس اگر وہ رجوع کریں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے، بڑے مہربان ہیں۔ اور اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کریں تو اللہ تعالیٰ سننے والے جاننے والے ہیں''

تفسیر: ایلاء کے لغوی معنی ہیں: قسم کھانا۔ اور شرعی معنی ہیں: چار ماہ یا چار ماہ سے زیادہ یا مدت کی تعیین کے بغیر بیوی سے صحبت نہ کرنے کی قسم کھانا۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ قسمیں کھایا کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ یا لمبی مدت تک اپنی بیویوں سے صحبت نہیں کریں گے۔ اس میں عورتوں پر ظلم اور ان کو ضرر پہنچانا تھا۔ چنانچہ مذکورہ آیات نازل ہوئیں، اور چار ماہ کی مدت مقرر کی۔ اب اگر اس مدت میں شوہر نے صحبت کر لی تو قسم کا کفارہ ادا کرے، اور بیوی اس کے نکاح میں رہے گی۔ اور اگر

چار مہینے گذر گئے، اور اس نے بیوی سے صحبت نہ کی تو ایک طلاق بائنہ واقع ہو جائے گی۔ یہ احناف کا مسلک ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: عورت قاضی سے رجوع کرے گی۔ قاضی شوہر کو مجبور کرے گا کہ یا تو بھلائی کے ساتھ چھوڑ دے یعنی طلاق دیدے، یا دستور کے مطابق روک لے یعنی صحبت کرے اور قسم کا کفارہ دے۔

اور مدتِ ایلاء، چار ماہ دو وجہ سے مقرر کی ہے:

پہلی وجہ: چار ماہ ایک ایسی مدت ہے جس میں نفس لامحالہ صحبت کرنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اور اگر اس مدت میں صحبت نہ کی جائے تو صحت کو نقصان پہنچتا ہے، الا یہ کہ آدمی نامرد ہو۔ اور یہی حال عورت کا بھی ہے۔ ایک واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تھا کہ عورت زیادہ سے زیادہ کتنے دنوں تک صبر کرسکتی ہے؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا: چھ ماہ یا چار ماہ (رواہ مالک، درمنثور ۱:۲۷۲) چنانچہ ایلاء کے لئے یہی مدت مقرر کی گئی، تاکہ زوجین میں سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچے۔

دوسری وجہ: مدتِ ایلاء سال بھر مقرر نہیں کی جاسکتی کہ وہ بہت ہی لمبی مدت ہے۔ آدھا سال بھی مقرر نہیں کی جاسکتی کہ وہ بھی لمبا عرصہ ہے۔ اور چوتھائی سال (تین ماہ) بہت ہی کم وقفہ ہے۔ اور نصف اور ربع کے درمیان کسر: ثلث ہی ہے، اس لئے اس کو تجویز کیا کیونکہ یہ ایک معتدل مدت ہے۔

قال الله تعالى: ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ﴾ الآية.

اعلم: أن أهل الجاهلية كانوا يحلفون أن لايطأوا أزواجهم أبدًا، أو مدةً طويلةً، وفي ذلك جَور وضرر، فقضى الله تعالى بالتربص أربعةَ أشهر: ﴿فَإِنْ فَاءُوْا فَإِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

واختلف العلماء في الفيء: فقيل: يُوْقَفُ الْمُوْلِيْ بعد مُضِيِّ أربعةِ أشهر، ثم يجبر على التسريح بالإحسان، أو الإمساك بالمعروف؛ وقيل: يقع الطلاق، ولا يُوقَف.

أما السر في تعيين هذه المدة: فإنها مدة تَتَوَّقُ النفسُ فيها للجماع لامحالة، ويتضرر بتركه، إلا أن يكون مَوْؤُوفًا؛ ولأن هذه المدةَ ثُلُثُ السنةِ، والثلث يُضبط به أقلُّ من النصف، والنصفُ يُعَدُّ مدةً كثيرةً.

ترجمہ: جان لیں کہ اہل جاہلیت قسم کھایا کرتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں سے کبھی بھی یا لمبی مدت تک صحبت نہیں کریں گے۔ اور اس میں ظلم و مضرت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے چار ماہ کے انتظار کا فیصلہ کیا: ''پس اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے نہایت مہربان ہیں'' — اور علماء نے رجوع کرنے میں اختلاف کیا ہے: پس کہا گیا: روکا جائے ایلاء کرنے والا چار ماہ گذرنے کے بعد؛ پھر مجبور کیا جائے: بھلائی کے ساتھ چھوڑنے پر یا دستور کے مطابق روکنے پر (یہ ائمہ ثلاثہ کی رائے ہے)

اور کہا گیا: طلاق واقع ہوگی، اور نہیں روکا جائے گا (یہ احناف کی رائے ہے) ——— رہا اس مدت کی تعیین میں راز: تو بیشک وہ مدت ایک ایسی مدت ہے جس میں نفس لامحالہ صحبت کرنے کا مشتاق ہوتا ہے، اور آدمی کو صحبت نہ کرنے سے ضرر پہنچتا ہے۔ الا یہ کہ آدمی آفت رسیدہ ہو ——— اور اس لئے کہ یہ مدت سال کا تہائی ہے۔ اور تہائی کے ذریعہ نصف سے کم کو منضبط کیا جاتا ہے یعنی اس سے نیچے کسر: ثلث ہے۔ اور نصف بہت مدت شمار کی جاتی ہے (اور چوتھائی بہت کم مدت ہے)

☆ ☆ ☆

لعان کی مشروعیت کی وجہ

سورۃ النور آیات ۶-۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں، اور ان کے پاس اپنی ذاتوں کے علاوہ گواہ نہ ہوں: تو اس کی گواہی کی صورت یہ ہے کہ وہ چار مرتبہ گواہی دے کہ وہ یقیناً سچا ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی پھٹکار! اور عورت سے سزا کو یہ بات ہٹائے گی کہ وہ (بھی) چار مرتبہ گواہی دے: اللہ کی قسم کھا کر وہ گواہی دیتی ہے کہ شوہر جھوٹا ہے۔ اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ سچا ہو تو اس (عورت) پر خدا کا غضب!''

حدیث (۱) ——— حضرت ہلال بن اُمیہ رضی اللہ عنہ نے ——— جو غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین حضرات میں سے ایک ہیں ——— رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی بیوی کو شریک بن سَحْماء کے ساتھ متہم کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''گواہ لاؤ، ورنہ تمہاری پشت پر حد لگے گی'' انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جب کوئی شخص اپنی بیوی پر کسی کو دیکھے تو وہ گواہ تلاش کرنے کے لئے نکلے؟! مگر آپؐ یہی فرماتے رہے کہ ''گواہ لاؤ، ورنہ تمہاری پشت پر حد لگے گی'' انھوں نے عرض کیا: اس ذات کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں یقیناً سچا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ ضرور وہ بات نازل فرمائیں گے جو میری پشت کو حد سے بری کردے گی۔ پھر آیاتِ لعان نازل ہوئیں۔ اور ان دونوں میں لعان کرایا گیا (مشکوۃ حدیث ۳۳۰۷)

حدیث (۲) ——— حضرت عُویمر عَجلانی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو (مشغول) دیکھے تو کیا کرے، اگر وہ اس کو قتل کردے تو وہ قصاصاً قتل کیا جائے گا، پھر وہ کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تمہارے اور تمہاری بیوی کے متعلق حکم نازل ہو چکا ہے، جاؤ اسے لیکر آؤ'' پھر مسجد میں دونوں نے لعان کیا۔ جب فارغ ہوئے تو حضرت عویمرؓ نے کہا: اگر اب بھی میں اس عورت کو رکھوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے جھوٹ کہا۔ پھر انھوں نے اس عورت کو تین طلاقیں دیدیں (مشکوۃ حدیث ۳۳۰۴)

تشریح: زمانۂ جاہلیت میں جب آدمی اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگاتا تھا، پھر ان میں اس سلسلہ میں مناقشہ ہوتا تھا، تو وہ کاہنوں (جنوں سے دریافت کرکے خبریں دینے والوں) کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ

عنہ کی والدہ ہند بنت عُتبہ کے واقعہ میں ہوا تھا[1] پھر جب اسلام کا زمانہ آیا تو:

(الف) اس کا کوئی جواز باقی نہ رہا کہ کاہنوں سے رجوع کیا جائے:

ایک: تو اس وجہ سے کہ اسلام قطعاً کہانت کا روادار نہیں۔ ملتِ حنفی کا مدار کہانت کو چھوڑنے اور اس کو گمنام کرنے پر ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''جو شخص کاہن کے پاس گیا، اور اس کی باتوں کی تصدیق کی، تو اس نے اس دین کا انکار کیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوا ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۵۱ باب الحیض)

دوم: اس وجہ سے کہ کاہنوں سے رجوع کرنا — ان کا صدق وکذب جانے بغیر — سخت نقصان دہ ہے۔ کاہن بھی ایک انسان ہے۔ اس سے غلطی ہوسکتی ہے۔ وہ بَری کو بدکار بتا سکتا ہے۔ اور وہ جنات سے باتیں معلوم کرکے بتاتے ہیں۔ اور جنات بڑی جھوٹی مخلوق ہے۔

(ب) اور یہ بات بھی ممکن نہیں کہ شوہر سے چار گواہ طلب کئے جائیں، ورنہ اس کو حد ماری جائے: کیونکہ زنا تنہائی میں ہوتا ہے۔ اور شوہر اپنے گھر کے احوال جانتا ہے۔ اور اس کے سامنے ایسے قرائن آتے ہیں جو دوسروں کے سامنے نہیں آتے۔ پس اس خانگی معاملہ پر اس سے گواہ کیسے طلب کئے جاسکتے ہیں؟

(ج) اور شوہر کو دوسروں کے برابر بھی نہیں رکھا جاسکتا: جن کو گواہ پیش نہ کرسکنے پر حد ماری جاتی ہے: اور اس کی دو وجہیں ہیں:

پہلی وجہ: شوہر شرعاً وعقلاً مامور ہے کہ اپنی بیوی کی، جو اس کے قبضہ میں ہے، ننگ وعار کی باتوں سے حفاظت کرے۔ شوہر فطری طور پر اس شخص کو برداشت نہیں کرسکتا جو اس کی بیوی پر، جو اس کی نگرانی میں ہے، چڑھنے کی کوشش کرے۔ پس اگر شوہر کوئی شک کی بات دیکھے گا تو ضرور فکر کرے گا۔ اور ضرور معاملہ قاضی کے سامنے لے جائے گا۔

دوسری وجہ: شوہر کا معاملہ دوسرے لوگوں سے اس لئے بھی مختلف ہے کہ شوہر وہ آخری شخص ہے جس کے ذریعہ شک ختم کیا جاتا ہے یعنی اس کے بیوی کے پاس آنے پر کوئی بھی انگلی نہیں اٹھاتا۔ اور اس کے ذریعہ بیوی کی شرمگاہ کی حفاظت مطلوب ہے یعنی وہ بیوی سے صحبت کرتا ہے، دوسرا کوئی اس کا مجاز نہیں۔ پس اگر شوہر بیوی پر دارو گیر کرنے میں دوسروں کی طرح ہوگا تو حرم کی حفاظت ناممکن ہوجائے گی۔ اور بیوی بیسوا بن جائے گی!

پھر جب زمانۂ نبوت میں شوہر کے تہمت لگانے کا واقعہ پیش آیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم متردد رہے: کبھی سکوت اختیار فرمایا،

---

[1] یہ واقعہ بہت تفصیلی ہے۔ ہند بنت عتبہ پہلے فاکِہ بن مغیرہ مخزومی کے نکاح میں تھی۔ شوہر نے ان پر زنا کی تہمت لگائی۔ ان کا باپ عتبہ یمن کے ایک کاہن کے پاس سب کو فیصلہ کے لئے لے گیا۔ کاہن نے فیصلہ دیا کہ یہ عورت گندی اور بدکار نہیں ہے، اور وہ ایک بادشاہ جنے گی، جس کا نام معاویہ ہوگا۔ اس فیصلہ کے بعد فاکِہ نے ان کو رکھنا چاہا۔ مگر وہ تیار نہ ہوئیں۔ اور انھوں نے حضرت ابوسفیان سے نکاح کیا۔ جن سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ تفصیل سیوطی رحمہ اللہ کی تاریخ الخلفاء ص ۱۳۸ ذکر معاویہؓ میں، اور ابن عبد ربہ کی العقد الفرید (۹۵:۶) میں ہے ۱۲

کیونکہ شوہر کا معاملہ دوسروں سے مختلف نظر آیا، اور کبھی حد زنا اور حد قذف کی آیات کے عموم میں شوہر کو بھی شامل کر کے فرمایا: ''گواہ لاؤ، ورنہ تمہاری پشت پر حد لگے گی'' یہاں تک کہ حضرت ہلال رضی اللہ عنہ نے وہ بات کہی جو اوپر آچکی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے لعان کا حکم نازل فرمایا۔

اور بنیادی باتیں لعان میں دو ہیں:

۱ــــ لعان: شوہر کی چند مؤکد قسمیں ہیں کہ وہ سچا ہے۔ اس سے شوہر حد قذف سے بری ہو جائے گا۔ اور شبہ کی سوئی عورت پر رُکے گی۔ اور شوہر انکار کرے تو اس پر حد قذف جاری ہوگی۔

۲ــــ اور عورت کی چند مؤکد قسمیں ہیں کہ شوہر جھوٹا ہے، اس سے عورت حد زنا سے بری ہو جائے گی۔ اور انکار کرے تو اس پر حد زنا جاری ہوگی۔

حاصل گفتگو: یہ ہے کہ ایک ایسے معاملہ میں جس میں کوئی گواہ نہیں، نہ اس کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، نہ سنا جاسکتا ہے: مؤکد قسموں کے ذریعہ فیصلہ کرنے سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ یہی لعان کی مشروعیت کی وجہ ہے۔

فائدہ: محض قسم سے انکار پر حد جاری نہیں کی جائے گی۔ بلکہ انکار کرنے والے کو قید میں رکھا جائے گا۔ تا آنکہ قسمیں کھائے یا جرم کا اعتراف کرے۔ اگر شوہر اعتراف کرے کہ اس نے جھوٹی تہمت لگائی ہے تو اس کو حد قذف ماری جائے۔ اور اگر عورت زنا کا اعتراف کرے تو اس پر حد زنا جاری کی جائے۔

عورت کو فہمائش کی وجہ ــــــ حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ لعان کے وقت خصوصیت سے عورت کو فہمائش کی جائے کہ وہ اللہ سے ڈرے اور جھوٹی قسمیں نہ کھائے۔ یہ فہمائش کرنا اس لئے ضروری ہے کہ قسموں کا مقصود بروئے کار آئے یعنی بظاہر خطا کار عورت ہے۔ کیونکہ بلا وجہ کوئی شخص اپنے گھر کو بدنام نہیں کرتا۔ گھر کی بدنامی آدمی کی اپنی بدنامی ہے مگر یہ بھی احتمال ہے کہ شوہر نے پوری تحقیق کے بغیر، محض شک کی بنیاد پر تہمت لگائی ہو، پس اگر عورت واقعی بے گناہ ہے تو اس کے لئے قسمیں کھانا جائز ہے۔

لعان کے بعد حرمت کی وجہ ــــ اور حدیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ لعان کے بعد عورت ہمیشہ کے لئے شوہر پر حرام ہو جائے گی۔ پس اگر شوہر خود ہی طلاق دیدے تو فبہا، ورنہ قاضی دونوں میں تفریق کردے گا۔ اور یہ حرمتِ مؤبّدہ دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: جب دونوں میں باہم اختلاف ہو گیا، اور دونوں کے دل غیظ وغضب سے بھر گئے، اور شوہر نے عورت کو بدنام کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی: تو اب دونوں میں مودّت وموافقت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اور نکاح جن مصالح کی بنیاد پر مشروع کیا گیا ہے ان کا مدار مودت وموافقت پر ہے۔ پس اب نکاح باقی رکھنا بے معنی ہے۔

دوسری وجہ: یہ ابدی تحریم زوجین کی سرزنش کے لئے ہے کہ انھوں نے ایسے سنگین معاملہ پر اقدام کیوں کیا؟!

قال الله تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ أَزْوَاجَهُمْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ﴾ الآية، واستفاض حديث عُوَيمر العَجْلاني، وهلال بن أمية.

اعلم: أن أهل الجاهلية كانوا إذا قذف الرجل امرأته، وكان بينهما في ذلك مناقشة، رجعوا إلى الكُهَّان، كما كان في قصة هند بنت عتبة. فلما جاء الإسلام:

[الف] امتنع أن يُسَوَّغ لهم الرجوعُ إلى الكهان، لأن مبنى الملة الحنيفية على تركها وإخمالها، ولأن في الرجوع إليهم ــ من غير أن يُعرف صدقُهم من كذبهم ــ ضررًا عظيمًا.

[ب] وامتنع أن يُكَلَّفَ الزوجُ بأربعة شهداء، و إلاضُرِبَ الحدُّ: لأن الزنا إنما يكون في الخلوة، ويَعْرِف الزوجُ ما في بيته، ويقوم عنده من المَخايل مالا يمكن أن يعرفه غيره.

[ج] وامتنع أن يُجعل الزوجُ بمنزلة سائر الناس، يُضربون الحدَّ: لأنه مأمور شرعًا وعقلاً بحفظِ ما في حَيِّزِه من العار والشنار، مجبولٌ على غيرةٍ أن يُزْدَحَمَ على مافي عِصمته، ولأن الزوج أقصى ما يُقطع به الريبةُ، ويُطلب به تحصينُ فرجها، فلو كان هو فيما يؤاخذها به بمنزلة سائر الناس: ارتفع الأمان، وانقلبت المصلحةُ مفسدةً.

وكان النبي صلى الله عليه وسلم ــ لما وقعت الواقعة ــ مترددًا: تارةً لا يقضي بشيئ لأجل هذه المعارضات، وتارةً يستنبط حكمَه مما أنزل الله عليه من القواعد الكلية، فيقول:" البينةَ، أو حدًا في ظهرك" حتى قال المبتلي: والذي بعثك بالحق! إني لصادق، فَلَيُنْزِلَنَّ الله ما يُبَرِّئُ ظهري من الحد، ثم أنزل الله تعالى آية اللعان.

والأصل فيه: أنه:

[١] أيمانٌ مؤكدة: تُبْرِئُ الزوجَ من حد القذف، وتُثبت اللَّوث عليها، فإن نَكل ضُرب الحد.

[٢] وأيمانٌ مؤكدة منها، تُبَرِّئُها، فإن نكلت ضربت الحد.

وبالجملة: فلا أحسنَ فيما ليس فيه بينةٌ، وليس مما يُهدر، ولا يُسمع: من الإيمان المؤكدة.

وجرت السنةُ: أن تُذَكَّرَ المرأةُ: تحقيقا للمقصود من الأيمان.

وجرت السنة: أن لا تعود إليه أبدًا: فإنهما بعد ماحصل بيهنما هذا التشاجر، وانطوت صدورُهما على أشد الوحر، وأشاع عليها الفاحشة: لايتوافقان، ولا يتوادّان غالبا، والنكاحُ إنما شُرع لأجل المصالح المبنية على التوادّ والتوافق. وأيضًا: ففي هذه زجر عليهما، من الإقدام على مثل هذه المعاملة.

ترجمہ: (آیت کے بعد) اورعویمر عجلانی اور ہلال بن امیہ کی حدیث مشہور ہے یعنی لعان کے احکام میں آیت کے ساتھ ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ جان لیں کہ اہل جاہلیت: جب آدمی اپنی بیوی پر تہمت لگاتا، اور دونوں کے درمیان اس سلسلہ میں منازعت ہوتی: تو وہ لوگ کاہنوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ ہند بنت عتبہ کے واقعہ میں ہوا تھا۔ پھر جب اسلام آیا: (الف) تو ممتنع ہوا کہ لوگوں کے لئے جائز قرار دیا جائے کاہنوں سے رجوع کرنا: (۱) اس لئے کہ ملتِ حنفی کا مدار کہانت چھوڑنے اور اس کو گمنام کرنے پر ہے (۲) اور اس لئے کہ ان کی طرف رجوع کرنے میں — ان کے سچ کو ان کے جھوٹ سے پہچانے بغیر — بھاری نقصان ہے — (ب) اور ممتنع ہوا کہ شوہر کو چار گواہوں کا مکلّف کیا جائے، ورنہ وہ حد مارا جائے: کیونکہ زنا تنہائی میں ہوتا ہے۔ اور شوہر اس بات کو جانتا ہے جو اس کے گھر میں ہوتی ہے۔ اور اس کے پاس ایسی علامتیں قائم ہوتی ہیں جو دوسروں کو معلوم نہیں ہوسکتیں — (ج) اور ممتنع ہوا کہ شوہر کو دوسرے لوگوں جیسا بنایا جائے: جو حد مارے جاتے ہیں: (۱) اس لئے کہ شوہر شرعاً اور عقلاً مامور ہے اس چیز (عورت) کی حفاظت کا، جو اس کے قبضہ میں ہے: ننگ وعار سے، شوہر پیدا کیا ہوا ہے اس بات پر غیرت کھانے پر کہ کوئی شخص بھیڑ کرے اس (عورت) پر جو اس کی نگرانی میں ہے (۲) اور اس لئے کہ شوہر وہ آخری چیز (شخصیت) ہے جس کے ذریعہ شک ختم کیا جاتا ہے یعنی اس کے عورت سے ملنے پر کوئی شک نہیں کرتا۔ اور اس کے ذریعہ عورت کی شرمگاہ کی حفاظت ڈھونڈھی جاتی ہے یعنی وہی اس کے ناموس کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ پس اگر شوہر اس بات میں جس کے ذریعہ عورت کی داروگیر کی جاتی ہے: اور لوگوں جیسا ہوگا تو امان اٹھ جائے گا یعنی بیوی کی حفاظت مشکل ہوجائے گی۔ اور مصلحت: مفسدہ میں بدل جائے گی یعنی بیوی ہرجائی ہوکر رہ جائے گی۔

اور نبی ﷺ — جب واقعہ پیش آیا تو — متردد تھے: کبھی کچھ بھی فیصلہ نہیں کرتے تھے ان متعارض باتوں کی وجہ سے (جن کا بیان الف تاج میں آچکا ہے) اور کبھی ان قواعد کلیہ سے اس کا حکم مستنبط فرماتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل کئے تھے یعنی حد زنا اور حد قذف کی آیات کے عموم میں شوہر کے معاملہ کو بھی داخل کرکے اس کا حکم بیان کرتے تھے، پس فرماتے: ''گواہ لاؤ یا تمہاری پشت پر حد ماری جائے گی'' یہاں تک کہ مبتلی شخص یعنی صاحب واقعہ نے کہا الی آخرہ — اور بنیادی بات لعان میں یہ ہے کہ لعان: (۱) چند پختہ قسمیں ہیں جو شوہر کو حد قذف سے بری کرتی ہیں۔ اور شبہ عورت پر ثابت کرتی ہیں۔ پس اگر شوہر قسم کھانے سے انکار کرے تو حد مارا جائے گا — (۲) اور عورت کی طرف سے چند پختہ قسمیں ہیں، جو اس کو (حد زنا سے) بری کردیتی ہیں۔ پس اگر عورت قسمیں کھانے سے انکار کرے تو وہ حد ماری جائے گی — اور حاصلِ کلام: پس کوئی چیز اچھی نہیں، اس چیز میں جس میں کوئی گواہ نہیں، اور نہیں ہے وہ اس میں سے جو رائگاں کی جاتی ہے یعنی جس کو نظر انداز کردیا جاتا ہے، اور نہ وہ سنی جاتی ہے یعنی برداشت کرلی جاتی ہے: پختہ قسموں سے یعنی لعان کے ذریعہ فیصلہ کرنا ہی بہترین طریقہ ہے۔

اور سنت جاری ہوئی ہے کہ عورت فہمائش کی جائے: قسموں (لعان) کے مقصود کو بروئے کار لانے کے لئے ——— اور سنت جاری ہوئی ہے کہ عورت شوہر کی طرف (جب تک لعان باقی ہے) کبھی بھی نہ لوٹے۔ پس بیشک دونوں: اس کے بعد کہ دونوں کے درمیان یہ باہمی جھگڑا پایا گیا، اور دونوں کے سینے سخت غیظ وغضب پر لپٹ گئے، اور شوہر نے عورت کو بدکار مشہور کردیا: عموماً دونوں میں موافقت ومودّت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اور نکاح باہمی مودّت وموافقت پر مبنی مصلحتوں ہی کے لئے مشروع کیا گیا ہے ——— اور نیز: اس (تحریم ابدی) میں دونوں پر زجر ہے، اس جیسے معاملہ پر اقدام کرنے کی وجہ سے۔

لغات: المَخايِل: آثار وعلامات۔ ظهرتْ فيه مَخايِلُ النَّجابة: اس میں خاندانی شرافت کے آثار نمایاں ہوئے۔ مفرد: المَخِيْلَة، مگر مفرد اس معنی میں مستعمل نہیں...... الشنار: عیب، اور برائی میں مشہور بات۔ عَارٌ وَشَنَارٌ: عیب ورسوائی...... تشاجر القومُ: باہم لڑنا جھگڑنا...... انطوى على كذا: مشتمل ہونا، ایک چیز کو اپنے اندر لئے ہوئے ہونا۔

تصحیحات: كان بينهما في ذلك مناقشة مطبوعہ میں مشاقة تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی وغیرہ سے کی ہے ——— وتثبت اللوث عليها کے بعد مطبوعہ میں تُحبَس لأجله، ويُضَيَّقُ عليها به تھا یعنی عورت کو شبہ کی وجہ سے قید میں رکھا جائے گا، اور شبہ کی وجہ سے عورت پر تنگی کی جائے گی۔ یہ بات اول تو صحیح نہیں، کیونکہ قسم سے انکار پر قید میں رکھا جاتا ہے۔ ثانیاً: یہ بے موقع ہے، کیونکہ ابھی عورت کی قسموں کا تذکرہ نہیں آیا۔ چنانچہ مخطوطہ کراچی میں جو شاہ صاحب رحمہ اللہ کے سامنے پڑھا ہوا نسخہ ہے یہ عبارت قلم زد کردی گئی ہے، اس لئے اس کو حذف کیا گیا ہے ——— جرت السنة أن تذكر المرأة مطبوعہ میں تذکرہ تھا۔ یہ تصحیح بھی مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

باب ——— ۱۰

عدت کا بیان

مطلق عدت کی حکمت

عدت: جاہلیت کے مسلّمات مشہورہ میں سے تھی۔ اور ایک ایسی چیز تھی جس کو لوگ چھوڑ ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں:

پہلی مصلحت ——— براءتِ رحم ——— عدت یہ بات جاننے کے لئے ہے کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں؟ اور یہ بات معلوم ہونی اس لئے ضروری ہے کہ انساب میں اختلاط نہ ہو۔ یعنی کسی کا بچہ کسی کی طرف منسوب نہ ہوجائے۔ کیونکہ نسب میں لوگ کنجوسی کرتے ہیں یعنی اپنا بچہ دوسرے کی طرف منسوب نہیں ہونے دیتے۔ اور تمام عقلمند نسب کے طلب گار ہوتے ہیں یعنی

اپنی اولاد چاہتے ہیں۔ اور نسب نوع انسانی کی خصوصیت ہے۔ اس کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔
مسائلِ استبراء میں بھی یہ مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ استبرأ الشیئَ: کے لغوی معنی ہیں: انتہائی کھود کرید کرنا تاکہ شبہ ختم ہوجائے۔
اور اصطلاحی معنی ہیں: جب باندی میں ملکیت بدلے تو ایک حیض آنے تک دوسرا آقا صحبت نہ کرے، تاکہ نسب گڈمڈ نہ ہو۔

دوسری مصلحت —— نکاح کی اہمیت دوبالا کرنا —— نکاح جب منعقد ہوتا ہے تو لوگوں کے اجتماع میں منعقد ہوتا ہے۔ کم از کم دو گواہوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ یہ بات نکاح کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ اسی طرح جب نکاح ختم کیا جاتا ہے تو لمبے انتظار (عدت) کے بعد عورت دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔ یہ بات بھی نکاح کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے ہے۔ ورنہ نکاح بچوں کا گھروندا ہوجائے گا۔ جس سے دل بہلایا پھر توڑ کر برابر کردیا۔

تیسری مصلحت —— ہمیشگی کا پیکر بنانا —— نکاح کی مصلحتیں اس وقت تکمیل پذیر ہوتی ہیں۔ جب میاں بیوی بظاہر اس کو ہمیشہ باقی رکھنے کا پکا ارادہ رکھتے ہوں۔ پھر اگر کوئی ناگہانی بات پیش آئے، اور نکاح ختم کرنا ضروری ہو، تو بھی کسی درجہ میں ہمیشگی کا پیکر بنانا ضروری ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت اتنی مدت انتظار کرے جس کی کچھ اہمیت ہو، اور جس میں عورت کچھ مشقت جھیلے۔ تاکہ یہ ظاہر ہو کہ عورت مجبوراً دوسری جگہ جارہی ہے، ورنہ وہ ٹلنا نہیں چاہتی تھی۔

فائدہ: عدت کی بنیادی مصلحت پہلی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اور مصلحتیں بھی ملحوظ ہیں۔ اس لئے اگرچہ ایک حیض سے براءتِ رحم معلوم ہوجاتی ہے، مگر دوسری مصلحتوں کو بروئے کار لانے کے لئے عدت تین حیض مقرر کی گئی۔

﴿العدة﴾

قال الله تعالى: ﴿وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلاَثَةَ قُرُوْءٍ﴾ إلى آخر الآيات.

اعلم: أن العدة كانت من المشهورات المسلمة في الجاهلية، وكانت مما لايكادون يتركونه، وكان فيها مصالحُ كثيرة:

منها: معرفةُ براءةِ رَحِمِها من مائه، لئلا تختلط الأنساب، فإن النسبَ أحدُ ما يتشاحُّ به، ويطلبُه العقلاءُ، وهو من خواص نوع الإنسان، ومما امتاز به من سائر الحيوان، وهو المصلحةُ المرعية في باب الاستبراء.

ومنها: التنويهُ بفخامة أمر النكاح، حيث لم يكن أمرًا ينتظم إلا بجمع رجال، ولا يَنْفَكُّ إلا بانتظار طويل، ولولا ذلك لكان بمنزلة لَعِبِ الصبيان، ينتظم، ثم يُفَكُّ في الساعة.

ومنها: أن مصالحَ النكاح لا تَتِمُّ حتى يوطِّنا أنفسَهما على إدامة هذا العقد ظاهرًا، فإن حَدَثَ حادثٌ يوجب فكَّ النظام: لم يكن بُدٌّ من تحقيق صورة الإدامة في الجملة: بأن تتربص مدةً تَجِدُ لتربُّصها بالاً، وتُقَاسِي لها عناءً.

ترجمہ: عدت کا بیان: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین قروء'' کئی آیتوں کے ختم تک (اس آیت کا تعلق اگلے مضمون سے ہے۔ اور سب عورتوں کی عدت کا تذکرہ یہاں نہیں، جیسا کہ آگے آرہا ہے) یہ بات جان لیں کہ عدت: جاہلیت میں مانی ہوئی مشہور باتوں میں سے تھی۔ اور وہ ان چیزوں میں سے تھی کہ نہیں قریب تھے لوگ کہ اس کو چھوڑیں۔ اور اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں (اس لئے شریعت نے اس کو برقرار رکھا) ان میں سے: شوہر کے پانی سے عورت کی بچہ دانی کی براءت (پاک ہونے) کو پہچاننا ہے۔ تاکہ نسب خلط ملط نہ ہوں۔ پس نسب ان چیزوں میں سے ایک ہے جن میں کنجوسی کی جاتی ہے۔ اور جس کو عقل مند ڈھونڈھتے ہیں۔ اور وہ نوع انسانی کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور ان چیزوں میں سے ہے جس کے ذریعہ انسان دیگر حیوانات سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اور استبراء کے مسائل میں وہی مصلحت ملحوظ رکھی ہوئی ہے —— اور ان میں سے: نکاح کے معاملہ کی عظمتِ شان کو دوبالا کرنا ہے۔ بایں طور کہ نکاح ایسا امر نہیں ہے جو منظم ہوتا ہو، مگر مردوں کو اکٹھا کرنے کے ذریعہ۔ اور نہیں جدا ہوتا وہ مگر لمبے انتظار کے بعد۔ اور اگر یہ بات (لمبا انتظار یعنی عدت) نہ ہوگی تو نکاح بچوں کے کھیل جیسا ہوگا، جو منظم ہوتا ہے، پھر فوراً ہی کھول دیا جاتا ہے —— اور ان میں سے: یہ بات ہے کہ نکاح کی مصلحتیں تکمیل پذیر نہیں ہوتیں، یہاں تک کہ دونوں خود کو خوگر بنائیں اس معاملہ (نکاح) کو بظاہر ہمیشہ رکھنے کا۔ پھر اگر کوئی نئی بات پیش آئے، جو نظام کو کھولنے کی مقتضی ہو، تو کوئی چارہ نہیں ہوگا: کسی درجہ میں ہیشگی کی صورت کو بروئے کار لانے سے، بایں طور کہ عورت اتنی مدت انتظار کرے جس کی عورت کچھ اہمیت محسوس کرے، اور جس کے لئے کچھ مشقت برداشت کرے۔

نوٹ: آیتِ کریمہ کا تعلق اگلے مضمون سے ہے۔

☆　　☆　　☆

مختلف عورتوں کی مختلف عدتیں اور ان کی حکمتیں

عدت کے تعلق سے عورتوں کی پانچ قسمیں ہیں۔ ان کے احکام اور حکمتیں درج ذیل ہیں:

پہلی قسم —— مطلقہ مدخولہ حائضہ غیر حاملہ —— وہ عورت جس سے صحبت یا خلوت صحیحہ ہو چکی ہو، اور اس کو حیض آتا ہو، اور وہ حاملہ نہ ہو، اور اس کو طلاق دی گئی ہو، تو اس کی عدت امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک: تین حیض ہیں۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک: تین طہر ہیں۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۸ میں ہے: ''اور طلاق دی ہوئی عورتیں اپنے آپ کو تین قُرء تک (نکاح سے) روکیں رکھیں'' پہلے دواماموں کے نزدیک: قروء کے معنی حیض کے ہیں، اور آخری دواماموں کے نزدیک: طہر کے ہیں۔

حکمت برتقدیر طہر —— جن ائمہ نے قُرْء کے معنی طہر کے لئے ہیں: ان کے نزدیک طہروں سے عدت مقرر کرنے کی

وجہ یہ ہے کہ پاکی کا زمانہ شوہر کی رغبت کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں شوہر کے رجوع کرنے کا غالب احتمال ہے۔ اور تین طہر اس لئے مقرر کئے ہیں کہ شوہر کے لئے سوچنے کا موقع رہے۔

اور قروء سے پاکیاں مراد ہیں اس کی دلیل: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ آپؓ نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دی۔ نبی ﷺ نے ان کو حکم دیا کہ وہ رجوع کرلیں۔ پھر درمیان میں ایک طہر چھوڑ کر، اگلے طہر میں اگر وہ چاہیں تو صحبت کئے بغیر طلاق دیں۔ اور فرمایا: فتلك العدة التی أمر الله أن تُطلَّقَ لها النساء: یہی وہ عدت ہے، جس میں طلاق دینے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے (مشکوۃ حدیث ۳۲۷۵) یعنی سورۃ الطلاق کی پہلی آیت میں جو ارشاد پاک ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ، وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ﴾ ترجمہ: اے پیغمبر! جب آپ لوگ عورتوں کو طلاق دیں، تو ان کو ان کی عدت کے وقت میں طلاق دیں، اور آپ لوگ عدت کو یاد رکھیں۔ اور طلاق دینے کا وقت بالا جماع پاکی کا زمانہ ہے، پس وہی عدت کا زمانہ ہے۔ اس لئے دواماموں نے قروء کے معنی طہر کے کئے ہیں۔

حکمت برتقدیر حیض — اور جن ائمہ نے قروء کے معنی حیض کے کئے ہیں: ان کے نزدیک حیض سے عدت مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حیض ہی سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ عورت حمل سے ہے یا نہیں؟ اور عدت براءتِ رحم جاننے ہی کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اور تین حیض اس لئے مقرر کئے گئے ہیں کہ شوہر کے لئے سوچنے کا موقع رہے۔ وہ رجوع کرنا چاہے تو کرسکے۔

فائدہ: قُروء سے حیض مراد ہونے کی دلیل یہ حدیث ہے: طلاق الأمة تطليقتان، وعدتُها حيضتان: باندی کی طلاق: دو طلاقیں ہیں۔ اور اس کی عدت: دو حیض ہیں (مشکوۃ حدیث ۳۲۸۹) پس آزاد عورت کی عدت تین حیض ہوگی — اور فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ میں ایک قراءت فطلقوهن فی قُبُلِ عدتهن ہے (مسلم شریف ۱۰: ۶۹ مصری، کتاب الطلاق) پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ طلاق: عدت (حیض) سے پہلے پاکی کے زمانہ میں دی جائے تاکہ عورتیں حیض سے عدت شروع کریں (فائدہ پورا ہوا)

دوسری قسم — مطلقہ مدخولہ آیسہ یا صغیرہ — وہ عورت جس سے صحبت یا خلوت ہوچکی ہو (صغیرہ کے ساتھ اس وقت خلوت صحیح ہے جب وہ مراہقہ (قریب البلوغ) ہو) اور کبرسنی کی وجہ سے حیض آنا بند ہوگیا ہو، یا کم سنی کی وجہ سے ابھی حیض نہ آیا ہو، اور اس کو طلاق دی جائے تو اس کی عدت تین ماہ ہے۔ سورۃ الطلاق آیت ۴ ہے: ﴿وَالّٰٓـِٔیْ یَئِسْنَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ، وَالّٰٓـِٔیْ لَمْ یَحِضْنَ﴾ ترجمہ: اور تمہاری (مطلقہ) بیویوں میں جو عورتیں (کبرسنی کی وجہ سے) حیض آنے سے مایوس ہوچکی ہوں، اگر تم کو ان کی عدت میں شبہ ہو، تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور اسی طرح جن عورتوں کو (کم سنی کی وجہ سے ابھی) حیض نہیں آیا۔

اور ان کی عدت تین ماہ دو وجہ سے مقرر کی ہے:

ایک: تین مہینے تین حیض کے قائم مقام ہیں۔ کیونکہ عام طور پر تین ماہ میں تین حیض آجاتے ہیں۔

دوسری: آیسہ اور صغیرہ کا حاملہ نہ ہونا بدیہی ہے۔ پس ان کی عدت براءتِ رحم معلوم کرنے کے لئے نہیں ہے۔ دیگر مصالح

کے لئے ہے۔ مثلاً شوہر کے لئے رجوع کا موقع رہے۔ اور تین ماہ ان مصالح کو بروئے کار لانے کے لئے کافی ہیں۔

تیسری قسم —— مطلقہ اور متوفّٰی عنہا زوجہا حاملہ —— وہ عورت جسے طلاق دی گئی ہو، اور وہ عورت جس کے شوہر کی وفات ہوگئی ہو، اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کی عدت وضع حمل ہے۔ سورۃ الطلاق آیت ۴ میں ہے: ﴿وَأُولَاتُ الأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ ترجمہ: اور حاملہ عورتوں کی (خواہ مطلقہ ہوں یا ان کے شوہر کی وفات ہوئی ہو) عدت ان کے حمل کا پیدا ہونا ہے (خواہ کامل بچہ پیدا ہو یا ناقص، بشرطیکہ کوئی عضو بن گیا ہو، گو ایک انگلی ہی سہی)

اور ان کی عدت وضع حمل اس لئے ہے کہ بچہ جننے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورت کی بچہ دانی خالی ہے۔ اور جب عدت کا بنیادی مقصد حاصل ہوگیا۔ تو دیگر ضمنی مصالح کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ کیونکہ حمل کا لمبا زمانہ ہوتا ہے۔ طلاق عام طور پر ایسے وقت میں دی جاتی ہے جب حمل کا احساس نہیں ہوتا۔ پس شوہر کو سوچنے کا کافی موقع مل چکا ہے۔ اور شوہر کی موت کی صورت میں کوئی سوچنے والا نہیں۔

چوتھی قسم —— متوفّٰی عنہا زوجہا غیر حاملہ —— وہ عورت جس کے شوہر کا انتقال ہوا ہو، اور وہ حاملہ نہیں ہے، تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہیں، خواہ وہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ، اور خواہ آیسہ ہو یا صغیرہ۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۴ میں ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ، وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ ترجمہ: اور جو لوگ تم میں سے وفات پاجائیں، اور بیویاں چھوڑ جائیں، تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک (نکاح سے) روکے رکھیں۔

اور اس معتدہ پر زمانۂ عدت میں سوگ کرنا واجب ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ یہ معتدہ نہ رنگین کپڑے پہنے، نہ سرمہ اور خوشبو لگائے، نہ خضاب لگائے، اور نہ زیور پہنے (مشکوٰۃ حدیث ۳۳۳۱ و ۳۳۳۴)

عدتِ وفات میں سوگ کرنے کی وجہ —— شوہر کی وفات کی عدت میں سوگ (ترکِ زینت) کرنا دو وجہ سے واجب ہے[1]

پہلی وجہ: شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی پر عدت: شوہر کے نسب کی حفاظت کے لئے واجب ہے۔ اس کو حکم ہے کہ انتظار کرے، فوراً دوسرا نکاح نہ کرے۔ اور دوسروں کو بھی یہ حکم ہے کہ زمانۂ عدت میں منگنی نہ بھیجیں۔ اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ عورت زمانۂ عدت میں زینت چھوڑ دے۔ کیونکہ زیب وزینت مرد وزن دونوں کی خواہش ابھارتی ہے۔ اور عدت میں شہوت کا ہیجان بڑی خرابی کا باعث ہوسکتا ہے۔

دوسری وجہ: دیرینہ رفاقت اور حُسنِ وفا کا تقاضا یہ ہے کہ شوہر کی وفات پر عورت بدحال ہو جائے، غم کی تصویر بن جائے۔ اس کو نہ کپڑوں کا خیال رہے نہ بالوں کا۔ میلی کچیلی اور پراگندہ ہو جائے۔ اور سوگ کرنے میں حسنِ وفا کے علاوہ بظاہر اپنی نگاہ شوہر پر روکنے کے معنی کو بروئے کار لانا بھی ہے۔ یعنی وہ شوہر ہی کے لئے بنتی سنورتی تھی۔ پس جب پیا ہی نہ

[1] یہاں لف ونشر مشوش ہے۔ پہلے چار ماہ دس دن عدت ہونے کی وجہ بیان کرنی چاہئے تھی۔ مگر چونکہ اس کے ساتھ سوال وجواب ہیں اس لئے اس کو مؤخر کیا ہے ۱۲



رہا تو وہ کس کے لئے سنگار کرے؟!

طلاقِ رجعی میں سوگ نہ کرنے کی وجہ —— جس عورت کو ایک یا دو رجعی طلاقیں دی گئی ہوں: وہ زمانۂ عدت میں سوگ نہیں کرے گی۔ بلکہ خوب بن سنور کر رہے گی۔ تاکہ شوہر کا دل اس کی طرف مائل ہو، اور جو اجتماعیت بکھر گئی ہے اس کی دوبارہ شیرازہ بندی کی شکل پیدا ہو۔

مبتوتہ کا حکم —— جس عورت کو ایک یا دو بائنہ طلاقیں دی گئی ہوں، یا تینوں طلاقیں دیدی ہوں: وہ زمانۂ عدت میں سوگ کرے گی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے: امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اس پر سوگ واجب ہے۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک واجب نہیں۔

یہ مسئلہ روایات میں مصرّح نہیں۔ حدیث میں صرف متوفی عنہا زوجہا کے سوگ کا بیان ہے۔ اس لئے دو اماموں نے حکمت کی طرف نظر کی، اور مبتوتہ پر بھی سوگ واجب کیا۔ حکمت وہی ہے جو پہلے گذر چکی کہ زیب وزینت شہوت ابھارتی ہے۔ اور زمانۂ عدت میں شہوت کا ہیجان بڑی خرابی کا باعث ہے۔ یہ حکمت مبتوتہ میں بھی متحقق ہے۔ وہ شوہر پر حرام ہو چکی ہے۔ اور دوسروں کے لئے بھی عدت کے دوران راہ ورسم پیدا کرنا جائز نہیں۔ پس اگر مبتوتہ بن سنور کر رہے گی تو فساد کا اندیشہ ہے۔ اس کو زمانۂ عدت میں ایسا رہنا چاہئے کہ کسی کا دل اس کی طرف مائل نہ ہو۔

اور دوسرے دو امام کہتے ہیں کہ سوگ کرنے کا حکم حدیث میں متوفی عنہا زوجہا کے لئے ہے۔ اور مطلقہ خواہ رجعیہ ہو یا مبتوتہ اس کے معنی میں نہیں۔ دونوں میں بڑا فرق ہے: شوہر کی وفات ایک سماوی آفت ہے۔ اس سے عورت کو قدرتی طور پر صدمہ ہوتا ہے۔ اور طلاق شوہر اپنے اختیار سے دیتا ہے، اور عورت کو اس پر غصہ آتا ہے۔ پس وفات کی صورت میں سوگ کرنا تو معقول بات ہے۔ طلاق میں سوگ کرنے کے کوئی معنی نہیں۔

عدتِ وفات کی مدت میں حکمت —— متوفی عنہا زوجہا جب حاملہ نہ ہو، تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہیں۔ اور یہ مدت تین وجہ سے مقرر کی گئی ہے:

پہلی وجہ: چار ماہ کے تین چلّے بنتے ہیں۔ یہ ایسی مدت ہے جس میں جنین میں روح پڑتی ہے۔ اور بچہ پیٹ میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ پس اگر عورت حاملہ ہوگی تو اس مدت میں پتہ چل جائے گا۔ اور دس دن کا اضافہ: اس لئے کیا گیا ہے کہ بچہ کی حرکت خوب ظاہر ہو جائے کیونکہ ابتداء میں حرکت ضعیف ہوتی ہے۔

دوسری وجہ: حمل کا معتاد زمانہ نو ماہ ہیں، کبھی چند دن کم بھی رہ جاتے ہیں۔ چار ماہ دس دن اس کا نصف ہیں۔ اس مدت میں جو بھی عورت کو دیکھتا ہے اول وہلہ ہی میں اس کو حمل کا پتہ چل جاتا ہے۔

ملحوظہ: پہلی وجہ میں بچہ کی حرکت سے حمل کا پتہ چلتا ہے، جس کو حاملہ ہی جان سکتی ہے۔ اور دوسری وجہ میں پیٹ بڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے، جو ہر کوئی جان سکتا ہے۔

تیسری وجہ: زمانۂ جاہلیت میں عدتِ وفات ایک پورا سال تھی۔ اور طرح طرح کی پابندیاں تھیں۔ حدیث میں ہے: ایک عورت نے کہا: میری بیٹی کے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے۔ اس کی آنکھیں دُکھتی ہیں، کیا ہم سرمہ لگا سکتے ہیں؟ آپؐ نے منع کیا۔ اس نے بار بار دریافت کیا۔ آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ نہیں لگا سکتی۔ اور فرمایا: إنما هی أربعةُ أشهرٍ وعشرٌ، وقد كانت إحداكن فی الجاهلية ترمی بالبَعْرة علی رأس الحول: وفات کی عدت چار مہینے دس دن ہی ہے۔ جبکہ تم زمانۂ جاہلیت میں سال پورا ہونے پر مینگنیاں بکھیرا کرتی تھیں (مشکوۃ حدیث ۳۳۲۹)

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں شوہر کی وفات کے بعد عورت کو کال کوٹھڑی میں موند دیا جاتا تھا۔ جب سال پورا ہوتا تو نکالا جاتا۔ اور ایک ٹوکرہ مینگنیاں دی جاتیں۔ وہ پوری بستی میں اس کو بکھیرتی تب عدت پوری ہوتی۔

شریعت نے اس معاملہ میں تخفیف کی۔ اور چار ماہ دس دن عدت مقرر کی۔ کیونکہ نصف سال بھی لمبی مدت ہے۔ اور چوتھائی سال (تین ماہ) بہت کم مدت ہے۔ اتنی مدت میں نہ پیٹ بڑھتا ہے، نہ جنین میں روح پڑتی ہے۔ اور نصف اور ربع کے درمیان کسر ثلث ہی ہے۔ اور چار ماہ ایسی مدت ہے جس میں پیٹ بڑھ جاتا ہے، اور جنین میں روح پڑجاتی ہے، اس لئے یہ مدت تجویز کی گئی۔ اور دس دن کا اضافہ اس لئے کیا کہ جنین کی حرکت خوب واضح ہوجائے (یہ وجہ شارح نے بڑھائی ہے)

سوال: جب عدت کی بنیادی مصلحت براءتِ رحم جاننا ہے، تو عدتِ طلاق کی طرح عدتِ وفات بھی حیض سے کیوں متعین نہیں کی؟ رحم کا حال تو حیض ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔

جواب: حیض عورت کا نجی معاملہ ہے۔ دوسروں کو اس کا پتہ عورت کے بتانے ہی سے چل سکتا ہے۔ اس معاملہ میں اس پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ اور عورتیں اس معاملہ میں حیلہ بازیاں بھی کرتی ہیں۔ عدتِ طلاق کے بعد ارشاد پاک ہے: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ ترجمہ: اور مطلقہ عورتوں کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں پیدا کیا ہے یعنی حمل یا حیض اس کو چھپائیں، اگر وہ اللہ تعالیٰ پر اور یوم قیامت پر یقین رکھتی ہیں۔ اس آیت میں عورتوں کی بہانہ بازیوں کی طرف اشارہ ہے۔ البتہ شوہر باطنِ امر کا اندازہ کرسکتا ہے۔ اور وہ بیوی کے مکر کا علاج بھی کرسکتا ہے۔ اس لئے طلاق کی صورت میں چونکہ شوہر موجود ہے: حیض کے ذریعہ عدت متعین کی گئی۔ کیونکہ براءتِ رحم کی معرفت میں وہی اصل ہے۔ اب شوہر خود اپنے معاملہ کو دیکھے گا۔ اپنے بچہ کی مصلحت کو سمجھے گا۔ اور آثار وعلامات سے حیض یا حمل کا اندازہ لگائے گا۔ اور عورت چالبازی کرے گی تو اس کی داروگیر کرے گا۔ اور شوہر کی وفات کی صورت میں چونکہ صاحبِ حق موجود نہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی عدت کسی ایسی ظاہری چیز کے ذریعہ متعین کی جائے، جس میں دو فائدے ہوں: ایک: اس کی تحقیق میں قریب وبعید یکساں ہوں۔ ہر کوئی پیٹ بڑھنے نہ بڑھنے سے اندازہ لگالے کہ عورت کو حمل ہے یا نہیں؟ دوم: وہ ظاہری چیز: حیض کو بھی امرِ واقعہ بنائے۔ کیونکہ چار ماہ دس دن تک عام طور پر یا کبھی بھی طہر دراز نہیں ہوتا۔ اتنی مدت میں دو تین حیض ضرور آجاتے ہیں۔ جس سے براءتِ رحم کا اندازہ ہوجاتا ہے۔



پانچویں قسم ـــ مطلقہ غیر مدخولہ ـــ وہ عورت جس کو صحبت یا خلوت سے پہلے طلاق دی ہو، اس پر کچھ عدت نہیں۔ سورۃ الاحزاب آیت ۴۹ ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ، ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ، فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا﴾ ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو، پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دیدو، تو تمہارے لئے ان پر کوئی عدت (واجب) نہیں، جس کو تم شمار کرنے لگو۔

اور اس عورت پر عدت نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس سے نہ صحبت ہوئی نہ خلوت تو رحم کی حمل کے ساتھ مشغولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو براءتِ رحم جاننے کے لئے عدت مقرر کی جائے۔ نہ اس کے ساتھ رفاقت رہی ہے نہ عہد وفا: جس کی خاطر عورت کو انتظار میں رکھا جائے۔

ملحوظہ: یہ پانچویں قسم چونکہ منفی تھی اس لئے شاہ صاحب نے اس کو بیان نہیں کیا۔ پہلی چار قسمیں جو مثبت ہیں وہی بیان کی ہیں۔ تتمیم فائدہ کے لئے اس کا اضافہ کیا گیا ہے۔

وعدة المطلقة: ثلاثة قروء، فقيل: هي الأطهار، وقيل: هي الحيض:

وعلى أنها طهر: فالسر فيه: أن الطهر محلُّ رغبةٍ كما ذكرنا، فجُعل تكرارُها عدةً لازمةً، لتروِّى المتروِّى، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم في صفة الطلاق: "فتلك العدةُ التي أمر الله بالطلاق فيها"

وعلى أنها حيض: فالحيض هو الأصل في معرفة عدم الحمل.

فإن لم تكن من ذوات الحيض لِصِغَرٍ أو كِبَرٍ: فتقوم ثلاثةُ أشهر مقامَ ثلاثةِ قروء: لأنها مظنتها، ولأن براءةَ الرحم ظاهرةٌ، وسائر المصالح تتحقق بهذه المدة.

وفي الحامل: انقضاءُ الحمل: لأنه معرِّفُ براءة رحمها.

والمتوفى عنها زوجها: تتربص أربعةَ أشهر وعشرًا. ويجب عليها الإحداد في هذه المدة، وذلك لوجوه:

أحدها: أنها لما وجب عليها أن تتربص، ولا تَنكح ولا تُخطب في هذه المدة حفظًا لنسب المتوفى عنها: اقتضى ذلك في حكمة السياسة أن تؤمر بترك الزينة، لأن الزينة تُهَيِّجُ الشهوةَ من الجانبين، وهيجانُها في مثل هذه الحالة مفسدةٌ عظيمة.

وأيضًا: فإن من حُسْنِ الوفاء: أن تَحْزَنَ على فقده، وتصير تَفِلَةً شَعِثَةً، وأن تُحِدَّ عليه، فذلك من حُسْنِ وفائها، وتحقيقِ معنى قصرِ بَصَرِها عليه ظاهرًا.

ولم تؤمر المطلقة بذلك: لأنها تحتاج إلى أن تَتَزَيَّنَ، فيرغبُ زوجها فيها، ويكون ذلك معونةً في جمع ما افترق من شَمْلِهما.

ولذلك اختلف العلماءُ في المطلقة ثلاثا: هل تتزينُ أم لا؟ فمن ناظرٍ إلى الحكمة، ومن ناظرٍ إلى عموم لفظ المطلقة.

وإنما عُيِّنَ في عدتها أربعةَ أشهر وعشرًا: لأن أربعةَ أشهرٍ هي ثلاثُ أربعيناتٍ، وهي مدةٌ تُنفخ فيها الروح في الجنين، ولايتأخر عنها تَحَرُّكُ الجنين غالبًا؛ وزِيد عشرٌ لظهور تلك الحركة.

وأيضًا: فإن هذه المدةَ نصفُ مدةِ الحمل المعتاد، وفيه يظهر الحمل بادى الرأى، بحيث يعرفه كل من يرى.

وإنما شُرِعَ عدةُ المطلقة قروءً، وعدةُ المتوفى عنها زوجُها أربعةَ أشهر وعشرًا: لأن هنالك صاحبَ الحقِّ قائمٌ بأمره، ينظر إلى مصلحة النسب، ويَعرف بالمخايل والقرائن، فجاز أن تؤمر بما تختص به، وتُؤْمَنُ عليه؛ ولا يمكن للناس أن يعلموا منها إلا من جهة خبرها، وههنا ليس صاحبُ الحق موجودًا، وغيرُه لايعرف باطنَ أمرها، ولا يَعرف مكايِدَها كما يعرف هو، فوجب أن يُجعل عدتُها أمرًا ظاهرًا، يتساوى في تحقيقه القريبُ والبعيدُ، ويُحَقِّقُ الحيضَ: لأنه لايمتد إليه الطهر غالبًا، أو دائمًا.

ترجمہ: اور مطلقہ (حائضہ) کی عدت تین قُروء ہیں: پھر کہا گیا: وہ پاکیاں ہیں۔ اور کہا گیا: وہ حیض ہیں ـــــ اور قروء کے طہر ہونے کی تقدیر پر: راز اس میں یہ ہے کہ پاکی رغبت کا موقع ہے، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ پس اطہار کی تکرار یعنی تین طہر لازمی عدت بنائی گئی تا کہ سوچنے والا سوچ لے۔ اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے الی آخرہ ـــــ اور قروء کے حیض ہونے کی تقدیر پر: پس حیض ہی حمل نہ ہونے کو جاننے میں اصل ہے ـــــ پس اگر عورت حیض والیوں میں سے نہ ہو: کم سنی کی وجہ سے یا کبرسنی کی وجہ سے: تو تین مہینے قروء کے قائم مقام ہوں گے۔ اس لئے کہ تین ماہ تین قروء کی احتمالی جگہ ہیں۔ اور اس لئے کہ بچہ دانی کا خالی ہونا بدیہی ہے۔ اور دیگر مصالح اس مدت میں بروئے کار آجاتے ہیں ـــــ اور حاملہ میں (عدت) حمل کا نہ رہنا ہے۔ اس لئے کہ حمل کو جن دینا عورت کی بچہ دانی کی براءت کو پہچانوانے والا ہے ـــــ اور اس عورت کی عدت جس کے شوہر کی وفات ہوگئی: انتظار کرے وہ چار ماہ اور دس دن۔ اور اس مدت میں عورت پر سوگ کرنا واجب ہے۔ اور وہ سوگ کرنا چند وجوہ سے ہے: ان میں سے: یہ ہے کہ جب عورت پر واجب ہے کہ انتظار کرے، اور نکاح نہ کرے، اور وہ اس مدت میں منگنی نہ بھیجی جائے، مرنے والے شوہر کے نسب کی حفاظت کے لئے: تو اس بات نے چاہا انتظامی حکمت میں کہ وہ حکم دی جائے زینت چھوڑنے کا، اس لئے کہ زینت جانبین سے شہوت کو بھڑکاتی ہے۔ اور اس جیسی حالت میں شہوت کا ہیجان بڑی خرابی ہے ـــــ اور نیز: حسنِ وفا سے یہ بات ہے کہ عورت: شوہر کے مرنے پر غمگین ہو، اور وہ میلی کچیلی پراگندہ ہو جائے، اور یہ کہ وہ شوہر پر سوگ کرے، پس وہ عورت کے حسنِ وفا سے ہے، اور بظاہر اپنی نگاہ شوہر پر روکنے کے معنی کو بروئے کار لانے کے لئے ہے۔

اور مطلقہ (رجعیہ) کو سوگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا: اس لئے کہ وہ اس بات کی محتاج ہے کہ مزین ہو، پس اس میں اس کا شوہر رغبت کرے۔ پس یہ بات مددگار ہو اس چیز کے جمع کرنے میں جو بکھر گئی ہے ان دونوں کی اجتماعیت سے —— اور اسی وجہ سے مطلقہ ثلاثہ (اور مطلقہ بائنہ) میں علماء نے اختلاف کیا ہے: پس کوئی تو حکمت کی طرف دیکھنے والا ہے، اور کوئی لفظ مطلقہ کے عموم کی طرف دیکھنے والا ہے۔

اور متوفی عنہا زوجہا (غیر حاملہ) کی عدت میں چار ماہ دس دن اس لئے متعین کئے ہیں کہ چار ماہ: تین چلّے ہیں۔ اور وہ ایسی مدت ہے جس میں جنین میں روح پھونکی جاتی ہے۔ اور عام طور پر اس مدت سے پیچھے نہیں رہتا جنین کا حرکت کرنا۔ اور دس دن زیادہ کئے گئے اس حرکت کے ظاہر ہونے کے لئے —— اور نیز: پس یہ مدت: حمل کی معتاد مدت کا نصف ہے۔ اور اس میں اول وہلہ میں حمل ظاہر ہوتا ہے، بایں طور کہ اس کو جو بھی دیکھتا ہے جان لیتا ہے۔

(سوال کا جواب) اور مطلقہ کی عدت قروء، اور متوفی عنہا زوجہا کی عدت: چاہ ماہ دس دن اس لئے مشروع کی گئی کہ وہاں یعنی طلاق کی صورت میں صاحب حق یعنی شوہر اپنے معاملہ کا انتظار کرنے والا ہے، نسب (بچہ) کی مصلحت میں دیکھتا ہے، اور آثار وعلامات سے جانتا ہے (کہ حمل ہے یا نہیں؟) پس جائز ہے کہ عورت حکم دی جائے (عدت گذارنے کا) ایسی چیز کے ذریعہ جس کے ساتھ وہ خاص ہے یعنی حیض کے ذریعہ جو اس کا پرائیوٹ معاملہ ہے۔ اور جس کے سلسلہ میں عورت پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اور ممکن نہیں ہے لوگوں کے لئے کہ وہ عورت کے حال کو جانیں مگر اس کے بتلانے کی جہت سے —— اور یہاں یعنی عدت وفات میں صاحب حق موجود نہیں ہے۔ اور غیر شوہر عورت کے معاملہ کے باطن کو نہیں جانتا۔ اور وہ عورتوں کے حیلوں کو نہیں جانتا جیسا شوہر جانتا ہے۔ پس ضروری ہوا کہ اس کی عدت کوئی ایسی ظاہر چیز مقرر کی جائے: (۱) جس کی تحقیق میں قریب وبعید یکساں ہوں (۲) اور وہ امر ظاہر حیض کو امر واقعہ بنائے۔ اس لئے کہ شان یہ ہے کہ اس امر ظاہر تک یعنی چار ماہ دس دن تک طہر عام طور پر یا کبھی بھی دراز نہیں ہوتا۔

تصحیح: شملهما مطبوعہ میں شملها تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆　☆　☆

استبراء کی حکمت

حدیث (۱) —— رسول اللہ ﷺ نے اَوطاس کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا: ''کسی حاملہ عورت سے صحبت نہ کی جائے، جب تک اس کا بچہ پیدا نہ ہو جائے، اور کسی غیر حاملہ عورت سے صحبت نہ کی جائے، جب تک اس کو ایک حیض نہ آجائے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۳۸)

حدیث (۲) —— رسول اللہ ﷺ ایک قریب الولادت عورت کے پاس سے گذرے۔ آپؐ نے اس کے بارے

میں دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ فلاں کی باندی ہے۔ آپؐ نے پوچھا: کیا وہ اس سے نزدیک ہوتا ہے؟ یعنی صحبت کرتا ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: ''بخدا! میں نے اس پر ایسی لعنت بھیجنے کا ارادہ کیا جو اس کے ساتھ اس کی قبر میں داخل ہو! وہ اس بچہ سے خدمت کیسے لے گا، جبکہ وہ خدمت لینا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا؟ یا وہ اس کو وارث کیسے بنائے گا، جبکہ وہ وارث بنانا اس کے لئے جائز نہیں ہوگا؟'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۳۷ باب الاستبراء)

تشریح: استبراء کے لغوی معنی ہیں: پاکی طلب کرنا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: جب باندی میں نئی ملکیت پیدا ہو تو ایک حیض کے ذریعہ رحم کی صفائی معلوم کرنا۔ یعنی جب کوئی شخص کسی باندی کا مالک ہو، خواہ جنگ میں گرفتار شدہ عورت حصہ میں آئے، یا باندی کو خریدے یا بخشش میں ملے: تو آقا پر واجب ہے کہ ایک حیض آنے تک، اور حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس سے صحبت نہ کرے۔

اور استبراء کا وجوب دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: استبراء اس لئے ضروری ہے کہ رحم کی صفائی معلوم ہو جائے۔ اور نسب میں اختلاط نہ ہو۔ نسب میں اختلاط کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک باندی آقا سے حاملہ ہے۔ مگر حمل ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے۔ مثلاً ایک ماہ کا ہے۔ اور خود عورت کو بھی اس کا احساس نہیں۔ اور ملکیت بدل گئی۔ اور دوسرے آقا نے فوراً صحبت شروع کر دی۔ پھر آٹھ ماہ بعد بچہ پیدا ہوا تو وہ دوسرے آقا ہی کا سمجھا جائے گا، کیونکہ اس کے فراش پر پیدا ہوا ہے۔ مگر حقیقت میں وہ بچہ اس کا نہیں۔ اور اگر دوسرا آقا ایک حیض آنے تک انتظار کرے گا، تو جب باندی کو حاملہ ہونے کی وجہ سے حیض نہیں آئے گا، تو اس کے حمل کا پتہ چل جائے گا۔ اور آقا وضع حمل تک صحبت کرنے سے رکا رہے گا، اور بچہ صاحب حق کا ہوگا۔

دوسری وجہ: استبراء اس لئے بھی ضروری ہے کہ احکام شرع میں التباس نہ ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب عورت حاملہ ہوتی ہے اور اس سے صاحب حق (شوہر یا آقا) کے علاوہ کوئی شخص صحبت کرتا ہے، تو تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ اس دوسری صحبت کا بچہ کی نشو و نما پر اثر پڑتا ہے۔ اور بچہ میں دو مشابہتیں پیدا ہوتی ہیں: ایک: اس شخص کی مشابہت جس کے نطفہ سے بچہ پیدا ہوا ہے۔ دوسری: اس شخص کی مشابہت جس نے زمانۂ حمل میں عورت سے صحبت کی ہے۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح کی ہے:

حدیث ـــــ سلیمان بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمانۂ جاہلیت کے بچوں کو اس شخص کے ساتھ ملاتے تھے جو زمانۂ اسلام میں اس کا دعوی کرتا تھا۔ چنانچہ آپؓ کے پاس دو شخص آئے۔ دونوں ایک عورت کے بچے کے دعویدار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قیافہ شناس کو بلایا[1] اس نے دونوں شخصوں کو دیکھا اور کہا: دونوں اس بچہ میں شریک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے دُرّہ سے اس کو تنبیہ کی (کیونکہ ایک بچہ دو شخصوں کا نہیں ہو سکتا) پھر آپؓ نے عورت کو بلایا۔ اور اس سے کہا: مجھے اپنا واقعہ بتلا! اس نے کہا: یہ بچہ ان دو میں سے ایک کا تھا۔ وہ میرے پاس آتا تھا جبکہ میں اپنے آقا کے اونٹ چراتی تھی۔ پس وہ

---

[1] قیافہ: ایک علم ہے جس کے ذریعہ خد و خال اور علامات سے نسب کا اندازہ لگاتے ہیں ۱۲

اس عورت سے جدا نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ دونوں نے خیال کیا کہ حمل ٹھہر گیا۔ پھر اس نے آنا بند کردیا۔ پس اس بچہ پر خون بہائے گئے۔ یعنی اس کے خمیر میں عورت کا خون شامل ہوا۔ پھر اس کی جگہ اس دوسرے شخص نے لےلی۔ پس میں نہیں جانتی کہ بچہ ان دو میں سے کس کا ہے؟ راوی کہتے ہیں: قیافہ شناس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اور حضرت عمرؓ نے لڑکے سے کہا: وَالِ أَيُّهُما شئتَ: تو جس سے چاہے موالات (آپس کی دوستی) کر (موطا مالک ۲: ۷۴۰ كتاب الأقضية حديث ۲۲)

یہی بات دو حدیثوں سے بھی مفہوم ہوتی ہے:

پہلی حدیث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی ایسے شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے جائز نہیں کہ وہ اپنا پانی غیر کی کھیتی کو پلائے'' یعنی دوسرے کی حاملہ عورت سے صحبت کرے (مشکوۃ حدیث ۳۳۳۹) اس حدیث میں اشارہ ہے کہ صحبت بچہ کے نشو ونما پر اثر انداز ہوتی ہے۔

دوسری حدیث: وہ ہے جو ابھی گذری کہ وہ اس بچہ سے خدمت کیسے لے گا الی آخرہ۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ غیر شوہر کی صحبت کے بعد حاملہ عورت جو بچہ جنے گی، اس میں دو مشابہتیں ہونگی۔ اور ہر ایک مشابہت کا حکم مختلف ہوگا۔ باندی کے شوہر کی مشابہت بچہ کو غلام، اور آقا کی مشابہت بیٹا بنائے گی۔ اور پہلی مشابہت کا حکم غلامی ہے یعنی بچہ آقا کا غلام ہوگا، اور اس پر آقا کی خدمت واجب ہوگی۔ اور دوسری مشابہت کا حکم آزادی ہے یعنی بچہ آزاد ہوگا، اور باپ کی میراث کا مستحق ہوگا۔ پس چونکہ حاملہ سے جماع کرنا: بچہ میں احکام شرع کے اشتباہ کا باعث ہے اس لئے اس سے جماع کرنے کی ممانعت کردی۔

قال صلى الله عليه وسلم: " لاتوطأُ حاملٌ حتى تَضَعَ، ولا غيرُ ذاتِ حملٍ حتى تحيض حَيضةً"

وقال صلى الله عليه وسلم: " كيف يستَخْدِمُه وهو لايحل له؟ أم كيف يُوَرِّثُه وهو لايحل له؟"

أقول: السر في الاستبراء: معرفةُ براءة الرحم، وأن لا تختلطَ الأنسابُ.

فإذا كانت حاملاً: فقد دلَّت التجربةُ على أن الولدَ في هذه الصورة يأخذ شِبْهَيْنِ: شِبْهُ من خُلق من مائه، وشِبْهُ من جامع في أيام حمله، بيَّنَ ذلك أثرُ عمر رضي الله عنه، وهو إيماءُ قولِه صلى الله عليه وسلم: " لايحلُّ لامرئٍ يؤمن بالله واليوم الآخر: أن يَسْقِيَ ماءَه زَرْعَ غيره" وقولِه عليه السلام: " كيف يستخدمه" إلخ:

معناه: أن الولد الحاصل بعد جماع الحُبلى فيه شِبْهَانِ، لكل شبهٍ حكمٌ يُنَاقِض حكمَ الشِبْهِ الآخر: فَشِبْهُ الأول يَجعل الولد عبدًا، وشِبْهُ الثاني يجعله ابنًا، وحكمُ الأول: الرقُّ، ووجوبُ الخدمة عليه لمولاه، وحكمُ الثاني: الحريةُ، واستحقاقُ الميراث؛ فلما كان الجماع سببَ التباس أحكام الشرع في الولد: نُهي عنه، والله أعلم.

ترجمہ: واضح ہے۔ یہ خیال رہے کہ بچہ ایک ہی کے نطفہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے کی صحبت کا بچہ کی نشو ونما پر عورت کے اس خون کے واسطہ سے جو حمل میں شامل ہوتا ہے: اثر پڑتا ہے۔ واللہ اعلم

باب —— ۱۱

اولاد اور غلام باندیوں کی تربیت

نسب کی اہمیت

نسب کی حفاظت انسانوں کا فطری جذبہ ہے۔ اچھی نشو ونما والے تمام علاقوں کے لوگوں میں دو باتیں ضرور پائی جاتی ہیں: ایک: لوگ باپ دادا کی طرف اپنی نسبت پسند کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس نسبت میں طعن کرے تو اسے ناپسند کرتے ہیں۔ البتہ اگر نسب کی رذالت کی وجہ سے یا کسی غرض سے جیسے جلبِ منفعت یا دفعِ مضرت کی وجہ سے نسبت نہ کرے تو وہ دوسری بات ہے۔ دوم: ہر کوئی ایسی اولاد کا خواہش مند ہوتا ہے جو اس کی طرف منسوب ہو، اور اس کے بعد اس کی قائم مقامی کرے۔ لوگ انتہائی کوشش کرتے ہیں، اور پوری توانائی خرچ کرتے ہیں کہ ان کی اولاد ہوجائے۔ پس دنیا جہاں کے تمام لوگوں کا یہ اتفاق بلاوجہ نہیں ہوسکتا بلکہ لوگ اس پر اس لئے متفق ہیں کہ یہ دونوں مقاصد فطری ہیں۔ انسانوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں۔

اور آسمانی شریعتوں کا مدار تین باتوں پر ہے: ایک: تمام وہ مقاصد جو فطری ہیں، اور جن میں مناقشہ اور جھگڑا ہوتا ہے: ان کو باقی رکھا جائے۔ رائگاں نہ کیا جائے۔ دوم: ان مقاصد میں سے ہر صاحبِ حق کو پورا حق دیا جائے۔ کسی کا حق مارا نہ جائے۔ سوم: ان مقاصد میں ظلم اور حق تلفی کی ممانعت کردی جائے۔ چنانچہ ضروری ہوا کہ شارع علیہ السلام نسب سے بحث کریں۔ اور اس کے احکام منضبط کریں۔

﴿ تربية الأولاد والمماليك ﴾

اعلم: أن النسب أحدُ الأمور التي جُبل على محافظتها البشرُ، فلن ترى إنسانا في إقليم من الأقاليم الصالحة لِنَشْءِ الناس إلا وهو يُحب أن يُنسب إلى أبيه وجده، ويَكره أن يُقدح في نسبته إليهما، اللّٰهم! لعارضٍ: من دَناءة النسب، أو غرضٍ: من دفع ضُرٍّ، أو جلبِ نفعٍ، ونحو ذلك؛ ويُحب أيضًا: أن يكون له أولادٌ يُنسبون إليه، ويقومون بعدَه مقامَه، فربما اجتهدوا أشدَّ الاجتهاد، وبذلوا طاقتَهم في طلب الولد؛ فما اتفق طوائفُ الناس على هذه الخصلة إلا لمعنىً

من جبلتهم؛ ومبنى شرائع الله على إبقاء هذه المقاصد التى تجرى مَجْرَى الجبلة، وتجرى فيها المناقشة والمشاحَّة، والاستيفاءِ لكل ذى حق حقَّه منها، والنهى عن التظالم فيها؛ فلذلك وجب أن يَبحث الشارع عن النسب.

ترجمہ: اولاد اور غلام باندیوں کی پرورش کا بیان: جان لیں کہ نسب ان چیزوں میں سے ایک ہے جن کی حفاظت کرنے پر انسان پیدا کئے گئے ہیں۔ پس آپ ہرگز نہیں دیکھیں گے کسی انسان کو، لوگوں کی نشو ونما کے لئے اچھے علاقوں میں سے کسی علاقہ میں، مگر اس حال میں کہ وہ پسند کرتا ہوگا کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرف منسوب کیا جائے۔ اور وہ ناپسند کرتا ہوگا کہ ان دونوں کی طرف اس کی نسبت میں عیب نکالا جائے۔ اے اللہ! مگر کسی عارض کی وجہ سے: جیسے نسب کی رذالت، یا کسی غرض کی وجہ سے: جیسے کسی مضرت کا ہٹانا، یا کسی منفعت کا حاصل کرنا، اور اس کے مانند۔ اور پسند کرتا ہوگا کہ اس کے لئے ایسی اولاد ہو جو اس کی طرف منسوب کی جائے۔ اور جو اس کے بعد اس کی قائم مقامی کرے۔ پس کبھی لوگ انتہائی کوشش کرتے ہیں، اور اپنی طاقت خرچ کرتے ہیں اولاد کی طلب میں یعنی ہر طرح کا علاج کراتے ہیں۔ پس لوگوں کے گروہ اس بات پر نہیں متفق ہوئے مگر اپنے کسی فطری تقاضہ کی وجہ سے۔ اور اللہ کی شریعتوں کا مدار اُن مقاصد کو باقی رکھنے پر ہے جو فطرت کی راہ پر چلتے ہیں۔ یعنی شریعت فطری مقاصد کو پامال نہیں کرتی۔ اور ان میں مناقشہ اور مخالفت ہوتی ہے یعنی ایسے مقاصد کو شریعت باقی نہیں رکھے گی تو فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور (شریعتوں کا مدار) پورا وصول کرنے پر ہے ہر حق والے کے لئے اس کے حق کو ان مقاصد میں سے، اور ان مقاصد میں باہم ظلم کرنے کی ممانعت پر ہے۔ پس اس وجہ سے ضروری ہوا کہ شارع علیہ السلام نسب سے بحث کریں۔

ترکیب: لِنَشْءٍ متعلق ہے الصالحة سے...... الاستيفاء اور النهى کا عطف إبقاء پر ہے۔

تصحیح: تجری مجری مطبوعہ میں تجری بجری تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

نسب: شوہر سے ثابت ہونے کی وجہ

حدیث ــــــ عتبہ بن ابی وقاص نے مرتے وقت اپنے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ زمعہ کی باندی کا لڑکا میرا بیٹا ہے۔ جب موقعہ ملے اس کو لے لینا۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعدؓ نے اس کو یہ کہہ کر لے لیا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ عبد بن زمعہ آڑے آیا۔ اس نے کہا: میرا بھائی ہے۔ دونوں یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ ہر ایک نے اپنا دعوی پیش کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے عبد بن زمعہ کے حق میں فیصلہ فرمایا یعنی اس کو زمعہ کا بیٹا قرار دیا۔ اور فرمایا: ''بچہ فراش کے لئے ہے، اور زانی کے لئے سنگ ہے!'' پھر آپؐ نے حضرت سودة

رضی اللہ عنہا کو اس لڑکے سے پردہ کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ عتبہ کے مشابہ تھا۔ چنانچہ موت تک حضرت سودہؓ نے اپنے اس بھائی کو نہیں دیکھا۔ اور ایک روایت میں ہے: ''اے عبد بن زمعہ! وہ تیرا بھائی ہے، اس وجہ سے کہ وہ اس کے باپ کے فراش پر پیدا ہوا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۱۲ باب اللعان)

وللعاهر الحجر: زانی کے لئے سنگ ہے: کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں: (۱) نامرادی یعنی زانی کیلئے نامرادی ہے، اس سے نسب ثابت نہیں ہوگا۔ جیسے کہا جاتا ہے: بيده التراب: اس کے ہاتھ میں مٹی ہے! اور کہا جاتا ہے: بيده الحجر: اس کے ہاتھ میں پتھر ہے! یعنی ناکام و نامراد ہے (۲) اور سنگساری یعنی زانی کو سزا دی جائے گی۔

تشریح: منکوحہ عورت کے بچے کا نسب شوہر ہی سے ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ شوہر انکار نہ کرے۔ اور اگر شوہر انکار کرے اور عورت زنا کا اقرار نہ کرے تو لعان کرایا جائے گا، پھر تفریق کے بعد بچہ ماں کی طرف منسوب ہوگا۔ اور جو شخص زنا کی بنیاد پر نسب کا دعوی کرے: اس کو نامراد کیا جائے گا۔ بلکہ اس کو سزا دی جائے گی۔ حدیث کے دوسرے جملہ میں پہلے جملہ کی تعلیل ہے۔ یعنی نسب صاحبِ فراش ہی سے کیوں ثابت ہوتا ہے: اس کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ اور چونکہ دوسرے جملہ کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں، اس لئے وجہیں بھی دو ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں:

زمانۂ جاہلیت میں اولاد حاصل کرنے کی بہت سی ایسی صورتیں رائج تھیں جو شرعاً درست نہیں تھیں۔ ان میں سے بعض کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وضاحت کی ہے۔ جب نبی ﷺ کی بعثت ہوئی تو یہ ساری راہیں مسدود کر دی گئیں۔ اور فیصلہ کر دیا گیا کہ ''بچہ فراش کے لئے ہے'' اور یہ فیصلہ دو وجہ سے کیا گیا:

پہلی وجہ: شوہر کا اپنی بیوی کے ساتھ ایسا اختصاص کہ دوسرا قطعاً اس میں دخل نہ دے سکے: اُن مصالح ضروریہ میں سے ہے جن پر نوعِ انسانی کے افراد کا بقاء موقوف ہے۔ اسی سے خاندانوں کا قوام ہوتا ہے جو نوعِ انسانی کا امتیاز ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ نسب کے دعوی میں اس شخص کو نامراد کیا جائے جو راہِ راست کی خلاف ورزی کر کے: کسی عورت سے بدوں اختصاص اولاد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کا مقصد پامال ہو، اور یہ ناکامی اس فعل کے ارادہ پر اس کے لئے تازیانہ بنے۔ ارشادِ نبوی: ''زانی کے لئے سنگ ہے!'' کا مطلب اگر نامرادی لیا جائے تو یہ وجہ اس سے صاف مفہوم ہوتی ہے۔

دوسری وجہ: حقوق میں جب کشاکشی ہو، اور ہر ایک اپنے لئے بچہ کا دعوی کرے: تو اس شخص کے دعوی کو ترجیح دینا ضروری ہے جو واضح دلیل پیش کرے۔ اور عام لوگوں کے نزدیک قابلِ سماعت بات کہے یعنی شوہر کی بات قبول کی جائے گی جو کہتا ہے کہ یہ میری بیوی کی اولاد ہے۔ اور جو شخص ایسی بات کہتا ہے جو اس کو گنہگار ٹھہراتی ہے، اور سزا دہی کا دروازہ کھولتی ہے یا وہ نسب کے دعوی میں اقرار کرتا ہے کہ اس نے اللہ کی نافرمانی کی ہے یعنی زنا کیا ہے، اور مع ہذا اس کی بات ایسا پوشیدہ امر ہے جس کا پتہ اس کے بتلانے ہی سے چل سکتا ہے: ایسے شخص کا دعوی گاؤ خورد اور گمنام کیا جائے۔ اس کی

بات درخورِ اعتناء نہ سمجھی جائے۔

اس کی نظیر: لعان کا واقعہ ہے: جب شوہر نے مہر کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اگر تو نے عورت پر جھوٹا الزام لگایا ہے: تو مہر کی واپسی بہت ہی دور کی بات ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۰۶) اسی طرح جو زنا کی بنیاد پر نسب کا دعوی کرتا ہے: اس کا دعوی بھی مردود ہے۔

اگر ارشادِ نبوی: ''زانی کے لئے سنگ ہے!'' کا مطلب سنگساری لیا جائے تو اس وجہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جو گناہ کی بات کہتا ہے اور لائق سزا جرم کا اقرار کرتا ہے: اس کی بات کیسے تسلیم کی جائے؟ اور اس سے نسب کیسے ثابت کیا جائے؟ وہ تو سزا کا مستحق ہے!

قال صلى الله عليه وسلم:" الولد للفراش، وللعاهر الحجر" فقيل: معناه الرجم، وقيل: الخَيْبة.

أقول: كان أهل الجاهلية يبتغون الولد بوجوه كثيرة لا تُصَحِّحُها قوانينُ الشرع، وقد بَيَّنَتْ بعضَ ذلك عائشةُ رضي الله عنها، فلما بُعث النبي صلى الله عليه وسلم سُدَّ هذا البابُ، وَخُيِّبَ العاهرُ.

وذلك: لأن من المصالح الضرورية التي لايمكن بقاءُ بني نوع الإنسان إلا بها: اختصاصَ الرجل بامرأته، حتى يُسَدَّ بابُ الازدحام على الموطوء ة رأسا، ومن مقتضى ذلك: أن يُخَيَّبَ من عصى هذه السنة الراشدة، وابتغى الولد من غير اختصاص، إرغامًا لأنفه، وازدراءً بأمره، وزجرًا له أن يَقْصِدَ مثلَ ذلك؛ وإلى هذا الإشارةُ في قوله عليه السلام:" للعاهر الحجر" إن أريد معنى الخيبة، كما يقال: بيده التراب، وبيده الحجر.

وأيضًا: فإذا تزاحمت الحقوقُ، وادعى كلٌّ لنفسه: وجب أن يُرَجَّحَ من يتمسَّك بالحجة الظاهرة المسموعة عند جماهير الناس، والذى يتمسك بمايزيد اللائمةَ عليه، ويفتح باب ضرب الحد، أو يعترف فيه بأنه عصى الله، وكان مع ذلك أمراً خفيا، لا يُعلم إلا من جهة قوله: فمن حق ذلك: أن يُهجر ويُخمل؛ وقد اعتبر النبي صلى الله عليه وسلم مثلَ هذا المعنى، حيث قال في قصة اللعان:" إن كذبتَ عليها فهو أبعدُ لك" وإليه الإشارةُ في قوله:" وللعاهر الحجر" إن أريد معنى الرجم بالحجارة.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: جاہلیت کے لوگ اولاد طلب کیا کرتے تھے ایسے بہت سے طریقوں سے جن کو شریعت کے قوانین درست قرار نہیں دیتے۔ اور ان میں سے بعض کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وضاحت کی ہے۔ پس جب نبی ﷺ مبعوث کئے گئے تو یہ دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور زانی کو نامراد کیا گیا۔

اور وہ بات یعنی شوہر سے نسب ثابت ہونا: اس لئے ہے کہ ان ضروری مصلحتوں میں سے جو کہ ناممکن ہے نوع انسانی کے افراد کا بقاء مگر انہیں مصالح کے ذریعہ: مرد کا اپنی بیوی کے ساتھ اختصاص ہے، یہاں تک کہ بیوی پر بھیڑ کرنے کا دروازہ بالکل ہی بند کر دیا جائے۔ اور اس کے مقتضی سے یہ بات ہے کہ وہ شخص نامراد کیا جائے جو اس راہ ہدایت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور کسی اختصاص کے بغیر اولاد چاہتا ہے۔ اس کی ناک کو خاک آلود کرنے کے لئے، اور اس کے معاملہ (دعویٰ نسب) کی تحقیر کرنے کے لئے، اور اس کو جھڑکنے کے لئے کہ وہ ایسی بات کا ارادہ کرے۔ اور اس وجہ کی طرف اشارہ ہے نبی ﷺ کے ارشاد میں کہ ”زانی کے لئے سنگ ہے!“ اگر نامرادی کے معنی لئے جائیں۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ”اس کے ہاتھ میں مٹی!“ اور ”اس کے ہاتھ میں پتھر!“ (یعنی یہ معنی عربی محاورات کے مطابق ہیں۔ اور یہاں لف ونشر مشوش ہے۔ جو معنی بعد میں بیان کئے ہیں اس کو پہلی وجہ قرار دیا ہے۔ تقریر میں ترتیب بدل دی ہے) —— اور نیز: پس جب حقوق میں کشمکش ہو، اور ہر ایک اپنے لئے بچہ کا دعویٰ کرے، تو ضروری ہے کہ اس شخص کو ترجیح دی جائے جو ایسی بات سے دلیل پکڑتا ہے جو واضح اور عام لوگوں کے نزدیک قابل سماعت ہے۔ اور جو شخص ایسی بات سے دلیل پکڑتا ہے جو اس کے لئے ملامت کو بڑھاتی ہے یعنی گنہ گار ٹھہراتی ہے، اور حد جاری کرنے کا دروازہ کھولتی ہے، یا وہ اس معاملہ میں یعنی بچہ کے نسب کے معاملہ میں اقرار کرتا ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے یعنی وہ اس کی زنا کی اولاد ہے، اور مع ہذا وہ کوئی پوشیدہ امر ہے، جو اس کے بتلانے ہی کے ذریعہ جانا جاتا ہے یعنی اس کی بات شک کے دائرہ میں آتی ہے: تو ایسی بات کے لئے سزاوار یہ ہے کہ وہ رائگاں اور گمنام کی جائے۔ یعنی قبول نہ کی جائے —— اور نبی ﷺ نے اس جیسی بات کا اعتبار کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے لعان کے واقعہ میں فرمایا: ”اگر تو نے عورت پر جھوٹ بولا ہے: تب تو مہر کی واپسی اور بھی دور کی بات ہے“ اور اس (دوسری) وجہ کی طرف اشارہ ہے آپؐ کے ارشاد میں: ”اور زانی کے لئے سنگ ہے!“ اگر سنگسار کرنے کے معنی مراد لئے جائیں۔

☆ ☆ ☆

غیر باپ کی طرف انتساب ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے اپنے باپ کے علاوہ کی طرف اپنا انتساب کیا، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کا باپ نہیں: تو جنت اس پر حرام ہے!“ (مشکوٰۃ حدیث ۳۳۱۴ باب اللعان)

تشریح: کچھ لوگ نکمے مقاصد کے لئے اپنے باپ سے اعراض کرتے ہیں۔ اور غیر باپ کی طرف اپنا انتساب کرتے ہیں جو حرام ہے۔ اور یہ بات دو وجہ سے ممنوع ہے:

پہلی وجہ: اس میں باپ کی حق تلفی اور اس کے ساتھ ناروا سلوک ہے۔ اس لئے کہ یہ باپ کی امیدوں پر پانی پھیرنا

ہے۔ ہر باپ اپنی نسل کا بقاء چاہتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس سے پھوٹنے والی شاخوں کے ذریعہ اس کا نام باقی رہے۔ اور باپ نے اپنے بچہ کی پرداخت میں جو محنت کی ہے اس کی ناشکری اور اس کے ساتھ بدمعاملگی ہے۔ احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔ ناشکری اور بدعہدی نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ: جس طرح بچہ ابتدائے آفرینش میں باپ کی نصرت ومعاونت کا محتاج ہے، باپ بھی ناتوانی کے زمانہ میں اولاد کی نصرت ومعاونت کا محتاج ہے۔ اور یہی بات قبیلہ اور سوسائٹی میں نصرت ومعاونت کو وجود میں لاتی ہے۔ پس اگر باپ سے اولاد کے ہٹ جانے کا سلسلہ چل پڑے گا تو یہ مصلحت رائگاں ہوجائے گی۔ اور ساتھ ہی خاندانوں کے انساب باہم خلط ملط ہوجائیں گے۔ کون کس خاندان کا ہے یہ بات نامعلوم ہوجائے گی۔

قال صلى الله عليه وسلم: "من ادَّعَى إلى غير أبيه، وهو يَعلم أنه غيرُ أبيه، فالجنة عليه حرام"

أقول: من الناس من يقصد مقاصدَ دَنِيَّةً، فيرغب عن أبيه، وينتسب إلى غيره: وهو ظلمٌ وعقوقٌ: لأنه تخييبُ أبيه، فإنه طلب بقاءَ نسلِه المنسوبِ إليه، المتفرعِ عليه، وتركُ شكرِ نعمتِه، وإساءةٌ معه.

وأيضًا: فإن النصرة والمعاونة لابد منها في نظام الحي والمدينة، ولو فُتح باب الانتفاء من الأب لأُهملتْ هذه المصلحةُ، ولاَ خْتَلَطَتْ أنسابُ القبائل.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغت: اِدَّعٰی: انتسب. اِدَّعىٰ إلى فلان: غیر باپ کی طرف اپنے کو منسوب کرنا...... اِنْتَفیٰ: دور ہونا، ہٹنا انتفى من الشيئ: بچ نکلنا۔ بری الذمہ ہوجانا۔

ترکیب: تركُ شكر اور إساءة کا عطف تخييبُ پر ہے۔

☆ ☆ ☆

غیر کا بچہ قوم میں ملانے، اور بچے کے نسب کا انکار کرنے پر وعید کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس عورت نے کسی قوم میں ایسے بچے کو داخل کیا، جو اس قوم کا نہیں، تو اس عورت کا اللہ تعالیٰ سے کچھ تعلق نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز اپنی بہشت میں داخل نہیں کریں گے — اور جس شخص نے اپنے بچہ کا انکار کیا، حالانکہ وہ اس کی طرف (امید بھری نظروں سے) دیکھ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اس سے پردہ کرلیں گے۔ اور اس کو تمام مخلوقات کے سامنے رسوا کریں گے" (مشکوۃ حدیث ۳۳۱۶)

تشریح: غیر کا بچہ قوم میں ملانے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً: عورت کو طلاق ہوئی یا شوہر کی وفات ہوئی، اور

وہ حاملہ تھی۔ مگر اس نے غلط بیانی کی اور عدت ختم ہونے کا دعوی کیا، اور دوسرا نکاح کر لیا۔ پھر چھ ماہ کے بعد بچہ پیدا ہوا تو دوسرے شوہر کا ہوگا۔ حالانکہ وہ اس کا نہیں۔

وعید کی وجہ: مذکورہ عورت کو اس کی اس حرکت پر وعید اس لئے سنائی گئی ہے کہ عدت ونسب وغیرہ معاملات میں عورت پر بھروسہ کیا گیا ہے۔ یعنی اس کی خبر پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ اور اس کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ نسبوں میں اشتباہ پیدا نہ کرے۔ پس جو عورت اس کی خلاف ورزی کرے گی وہ وعید کی مستحق ہے۔

خاص وعید کی وجہ: حدیث میں ایسی عورت کو دو وعیدیں سنائی گئی ہیں: ایک: یہ کہ اس کا اللہ تعالیٰ سے کچھ تعلق نہیں۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی مقبول بندی نہیں۔ دوسری: یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی بہشت میں داخل نہیں کریں گے۔ یہ خاص وعیدیں دو وجہ سے سنائی گئی ہیں:

پہلی وجہ: عورت اپنی اس حرکت سے نظام عالم کو خراب کرتی ہے۔ اور انسانوں کے فطری جذبات کو پامال کرتی ہے۔ اور ایسے لوگوں پر مقرب فرشتوں کی لعنت برستی ہے۔ کیونکہ ملأ اعلیٰ کو انسانوں کی صلاح وفلاح کے لئے دعائیں کرنے کا، اور جو نظام عالم کو خراب کرتے ہیں ان پر لعنت بھیجنے کا حکم ہے۔ اور جس عورت پر ملأ اعلیٰ کی لعنت برستی ہے۔ وہ اللہ کی مقبول بندی نہیں رہتی۔

دوسری وجہ: عورت کی اس حرکت سے بچے کے باپ کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا بچہ دوسرے کو مل جاتا ہے۔ نیز عورت اپنی اس حرکت سے بچہ کی کفالت کا بوجھ دوسروں پر ڈال دیتی ہے، جس کا وہ بچہ نہیں۔ اور حقوق تلفی کرنے والا جنت سے محروم رہتا ہے۔ چنانچہ شہید کا قرضہ بھی معاف نہیں ہوتا۔

نسب کا انکار کرنے پر وعید کی وجہ: جو شخص اپنے بچہ کا انکار کرتا ہے، وہ بچہ کو دائمی ذلت کا، اور ایسے عار کا نشانہ بناتا ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور وہ اس طرح کہ اب بچہ بے باپ کا ہوگیا۔ اور باپ کی اس حرکت سے بچہ کی جان بھی ضائع ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اب اس کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں۔ پس یہ حرکت ایک اعتبار سے قتلِ اولاد کے مترادف ہے۔ نیز وہ بچہ کی ماں کو بھی دائمی ذلت اور ہمیشہ کے لئے باقی رہنے والے عار کا نشانہ بناتا ہے۔ اس لئے وہ وعید کا مستحق ہے۔

وقال صلى الله عليه وسلم:" أيما امرأة أدخلتْ على قوم، من ليس منهم، فليست من الله في شيئ، ولن يُدخلَها الله جنته. وأيما رجل جحد ولدَه، وهو ينظر إليه، احتجب الله منه، وفَضَحَه على رء وس الخلائق"

أقول: لما كانت المرأةُ مُؤْتَمَنَةً في العدة ونحوها، مأمورةً أن لا تُلَبِّسَ عليهم أنسابَهم: وجب أن تُرَهَّبَ في ذلك. وإنما عوقبتْ على هذا: لأنه سعيٌ في إبطال مصلحةِ العالَم، ومناقضةٌ لما في جبلة النوع، وذلك جالبٌ بغضَ الملأ الأعلى، حيث أُمروا بالدعاء لصلاح

النوع. وأيضًا: ففي ذلك تخييبٌ لوالده، وتضييقٌ وحملٌ لِثِقلِ الولد على آخرين.

والرجلُ إذا أنكر ولدَه فقد عَرَضَه للذُّلِّ الدائم، والعارِ الذي لاينتهي، حيث لانسب له، وأضاع نسمتَه، حيث لا مُنفق عليه، وهو يُشبه قتلَ الأولاد من وجه؛ وعَرَّضَ والدتَه للذل الدائم، والعارِ الباقي طَول الدهر.

ترجمہ: جب عورت: عدت اور اس جیسی باتوں میں بھروسہ کی ہوئی تھی، حکم دی ہوئی تھی کہ وہ لوگوں پر ان کے نسبوں کو مشتبہ نہ کرے تو ضروری ہوا کہ وہ اس سلسلہ میں ڈرائی جائے —— اور وہ اس طرح اس لئے سزا دی گئی کہ اس کا یہ عمل دنیا کی مصلحت کو باطل کرنے کی کوشش ہے۔ اور نوع انسانی کی فطرت میں جو بات ہے اس کو توڑنا ہے۔ اور یہ چیز ملأ اعلیٰ کی شدید نفرت کو کھینچنے والی ہے، بایں وجہ کہ وہ حکم دیئے گئے ہیں نوع انسانی کی بہبودی کے لئے دعا کرنے کا —— اور نیز: پس اس عمل میں بچہ کے باپ کی امیدوں کو خاک میں ملانا ہے۔ اور دوسروں پر تنگی کرنا اور ان پر بچے کا بوجھ ڈالنا ہے۔

اور آدمی نے جب اپنے بچے کا انکار کیا تو یقیناً اس نے بچہ کو دائمی ذلت اور ایسے عار کے درپے کیا جو ختم ہونے والا نہیں، بایں طور کہ اس کے لئے کوئی نسب نہیں رہا۔ اور اس نے بچے کی جان ضائع کی، بایں طور کہ اس پر کوئی خرچ کرنے والا نہیں رہا۔ اور اس کا انکار ایک اعتبار سے قتل اولاد کے مشابہ ہے —— اور اس کی ماں کو (بھی) دائمی ذلت اور رہتی دنیا تک عار کے درپے کیا۔

تصحیح: تخییبٌ لوالده اصل میں تخییب لولده تھا۔ اور لثقل الولد اصل میں لنقل الولد تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

عقیقہ کی حکمتیں

زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنی اولاد کا عقیقہ کیا کرتے تھے۔ عقیقہ ان کے نزدیک ایک لازمی بات اور ضروری طریقہ تھا۔ اور اس میں بہت سی ملی، مدنی اور ذاتی مصلحتیں تھیں۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اس کو باقی رکھا۔ خود بھی عقیقہ کیا، اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی۔ عقیقہ کی چند مصلحتیں درج ذیل ہیں:

پہلی مصلحت: عقیقہ سے لطیف پیرایہ میں بچہ کے نسب کی تشہیر ہوتی ہے۔ اور بچہ کے نسب کی تشہیر اس لئے ضروری ہے کہ کل کو کوئی ایسی ویسی بات نہ کہے جو بچہ کو ناپسند ہو یعنی کوئی اس کے نسب میں طعن نہ کرے۔ اور تشہیر کا یہ طریقہ مناسب نہیں کہ باپ گلی گلی چلاتا پھرے کہ میرے یہاں پیدا ہوا ہے۔ بچہ کے نسب کی اشاعت کا بہترین طریقہ عقیقہ کرنا ہے۔ جیسے خانہ آبادی کی تشہیر کا بہترین طریقہ ولیمہ ہے —— یہ مدنی (معاشرتی) فائدہ ہے۔

دوسری مصلحت: عقیقہ کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس سے بخل کا ازالہ ہوتا ہے، اور طبیعت میں فیاضی پیدا ہوتی ہے ــــ یہ ذاتی فائدہ ہے۔

تیسری مصلحت: عیسائیوں کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا تھا، تو وہ اس کو ایک زرد پانی میں رنگتے تھے۔ اور اس کو وہ معمودیہ (Baptism) کہتے تھے۔ اور وہ یہ مانتے تھے کہ اس سے بچہ پکا عیسائی بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے مسلمانوں کے لئے اس کے مقابل عقیقہ مشروع کیا، جو بچہ کے ملتِ حنفی کا فرد ہونے کا اور ملت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے تابع ہونے کا اعلان ہے ــــ یہ ملّی مصلحت ہے۔

فائدہ: سورۃ البقرۃ آیت ۱۳۸ میں جو ارشاد پاک ہے: ''اللہ کا رنگنا! اور اللہ سے بہتر رنگنے والا کون ہے؟!'' یہ ارشاد ہم شکلی کے طور پر نازل ہوا ہے، یعنی اے مسلمانو! کہو ہم نے اللہ کا رنگ (دین حق) قبول کیا، جو اس دین میں داخل ہوا وہ سابقہ تمام گناہوں سے پاک ہو گیا (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

چوتھی مصلحت: عقیقہ: سنتِ ابراہیمی کی یادگار ہے: حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا خاص عمل جوان کی اولاد میں بطور توارث چلا آرہا ہے: وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کرنے کا واقعہ ہے۔ جب آپؑ نے پختہ ارادہ کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ پر انعام عظیم کیا۔ اور ایک بڑا ذبیحہ فدیہ میں عنایت فرمایا (سورۃ الصافات آیت ۱۰۲-۱۰۷) ان کی اولاد بھی بچہ کی قربانی عقیقہ کی شکل میں پیش کرتی ہے ــــ یہ بھی ملّی مصلحت ہے۔

پانچویں مصلحت: عقیقہ اس بات کا اعلان ہے کہ بچہ کے ساتھ وہ عمل کیا گیا جو ملتِ ابراہیمی کا مخصوص عمل ہے: حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی شریعت کی مشہور ترین عبادت: حج ہے۔ اور حج کی تکمیل قربانی اور سر منڈانے سے ہوتی ہے۔ اور عقیقہ میں بھی پہلے قربانی پیش کی جاتی ہے۔ پھر بچہ کا سر منڈایا جاتا ہے۔ پس اس تذکاری عمل کے ذریعہ ان دونوں بزرگانِ ملت کی مشابہت اختیار کی جاتی ہے ــــ یہ بھی ملّی مصلحت ہے۔

چھٹی مصلحت: عقیقہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل کی محاکات ہے، جیسے صفا و مروہ کی سعی حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی مشقت کی محاکات ہے (رحمۃ اللہ ۴: ۲۱۳) ــــ بچہ کی ولادت کے ابتدائی ایام میں عقیقہ کرنا باپ کے دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اس نے بھی بچہ کو اسی طرح قربان کردیا، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صاحب زادے کو قربان کیا تھا۔ پس یہ اکابر ملت کے ساتھ احسان (نیک سلوک) اور ان کی تابعداری ہے ــــ یہ شخصی مصلحت ہے۔

ساتویں مصلحت: عقیقہ میں فدیہ کے معنی بھی ہیں۔ اس سے بچے کی بلائیں دور ہوتی ہیں۔ حدیث میں ہے: ''لڑکا گروی رکھا ہوا ہے'' یعنی لڑکا معرضِ آفات میں رہتا ہے: ''عقیقہ کے ذریعہ اس کو چھڑایا جاتا ہے'' یعنی عقیقہ سے اس کی آفات دور ہوتی ہیں۔

تجربہ: میرا ایک بچہ (مولانا مفتی حسین احمد صاحب پالن پوری استاذ حدیث جامع مسجد امروہہ) پیدائشی بیمار تھا۔

پیٹ کی شکایت تھی۔ عقیقہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہمت کر کے دو بکروں کا عقیقہ کیا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کب وہ بچہ ٹھیک ہوگیا!

واعلم: أن العربَ كانوا يَعُقُّوْن عن أولادهم، وكانت العقيقةُ أمرًا لازمًا عندهم وسنةً مؤكدةً، وكان فيها مصالحُ كثيرة، راجعةٌ إلى المصلحة الملّية، والمدنية، والنَّفْسِيَّة، فأبقاها النبي صلى الله عليه وسلم، وعمل بها، ورغَّب الناس فيها:

فمن تلك المصالح:

التلطُّفُ بإشاعة نسب الولد، إذلا بد من إشاعته، لئلا يقالَ فيه: مالايحبه؛ ولايَحْسُنُ أن يدور في السكك، فينادِي: أنه وُلد لي ولدٌ! فتعين التلطف بمثل ذلك.

ومنها: اتباعُ داعيةِ السخاوة، وعصيانُ داعية الشح.

ومنها: أن النصارى كانوا إذا وُلد لهم ولدٌ صبغوه بماء أصفر، يسمونه المَعْمُوْدِية، وكانوا يقولون: يصير الولد به نصرانيًا ـــــ وفي مشاكلة هذا الاسم نزل قوله تعالى:﴿ صِبْغَةَ اللّٰه، وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً﴾ ـــــ فاستحب أن يكون للحنيفيين فعلٌ بإزاء فعلهم ذلك، يُشعر بكون الولد حنيفيا، تابعا لملة إبراهيم وإسماعيل عليهما السلام.

وأشهر الأفعال المختصة بهما، المتوارثةِ في ذريتهما: ما وقع له عليه السلام من الإجماع على ذبح ولده، ثم نعمة الله عليه: أن فداه بذبح عظيم.

وأشهر شرائعهما: الحج الذي فيه الحلق والذبح، فيكون التشبهُ بهما في هذا تنويها بالملة الحنيفية، ونداءً أن الولد قد فُعل به مايكون من أعمال هذه الملة.

ومنها: أن هذا الفعل في بَدْءِ ولادته يُخَيِّلُ إليه أنه بذل ولدَه في سبيل الله، كما فعل إبراهيم عليه السلام، وفي ذلك تحريكُ سلسلةِ الإحسان والانقياد، كما ذكرنا في السعي بين الصفا والمروة.

ترجمہ: اور جان لیں کہ عرب اپنی اولاد کا عقیقہ کیا کرتے تھے۔ اور عقیقہ ان کے نزدیک ایک لازمی بات تھی اور پختہ طریقہ۔ اور اس میں بہت سی مصلحتیں تھیں جو مذہبی، معاشرتی اور ذاتی مصلحتوں کی طرف لوٹنے والی تھیں۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اس کو باقی رکھا۔ اور خود عقیقہ کیا، اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی ـــــ پس ان مصالح میں سے: (۱) بچہ کے نسب کی اشاعت کا لطیف طریقہ اپنانا ہے۔ کیونکہ بچے کے نسب کی تشہیر ضروری ہے، تاکہ نہ کہی جائے اس کے بارے میں وہ بات جس کو وہ پسند نہ کرے۔ اور اچھا نہیں کہ باپ گلیوں میں گھومے، پس اعلان کرے کہ اس کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔ پس

متعین ہوگیا اس جیسا خوبصورت طریقہ اختیار کرنا ــــــ (۲) اور ان میں سے: جذبۂ سخاوت کی پیروی اور جذبۂ بخل کی نافرمانی ہے ــــ (۳) اور ان میں سے: یہ ہے کہ نصاریٰ: جب ان کے یہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو وہ اس کو ایک زرد پانی سے رنگتے تھے، جس کو وہ معمودیہ کہتے ہیں۔ اور وہ کہا کرتے تھے: اس سے بچہ عیسائی بن جاتا ہے ــــ (فائدہ) اور اس نام کی ہم شکلی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد نازل ہوا: ''اللہ کا رنگنا! اور اللہ سے بہتر رنگنے والا کون ہے؟'' ــــــ پس نبی ﷺ نے پسند کیا کہ دینِ حنیف والوں کے لئے کوئی عمل ہو نصاریٰ کے اس عمل کے مقابلہ میں، جو بچہ کے ملتِ حنفی کا ہونے کی اور ملت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کے تابع ہونے کی آگاہی دے ــــــ (۴) اور ان اعمال میں جو ان دونوں کے ساتھ مختص ہیں، اور جو ان دونوں کی اولاد میں بطور توارث چلے آرہے ہیں: سب سے زیادہ مشہور بات وہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے لئے پیش آئی یعنی ان کا اپنے بچہ کو ذبح کرنے کا پختہ ارادہ کرنا، پھر اللہ تعالیٰ کا ان پر انعام فرمانا، بایں طور کہ ایک بڑا ذبیحہ اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں دیدیا ــــــ (۵) اور ان دونوں کی شریعتوں کا مشہور ترین عمل: وہ حج ہے جس میں سر منڈانا اور قربانی کرنا ہے (تقدیم وتاخیر ہے) پس ان دونوں کے ساتھ اس عمل میں مشابہت اختیار کرنا ملتِ حنفی کی شان بلند کرنا ہے۔ اور اس بات کا اعلان ہے کہ بچہ کے ساتھ وہ عمل کیا گیا جو اس ملت کے اعمال میں سے ہے ــــــ (۶) اور ان میں سے: یہ ہے کہ یہ عمل بچے کی ولادت کے شروع میں باپ کے دل میں یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ اس نے (بھی) اپنے بچہ کو راہ خدا میں خرچ کر دیا، جیسا ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا۔ اور اس میں نیک سلوک اور تابعداری کی زنجیر کو ہلانا ہے، جیسا کہ ہم نے صفا ومروہ کی سعی کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

تصحیح: مذکورہ عبارت سے پہلے مطبوعات میں عنوان العقیقة تھا۔ مگر یہ عنوان کسی مخطوطہ میں نہیں۔ اس لئے حذف کیا گیا ہے۔

☆　☆　☆

ساتویں دن عقیقہ کرنے، بال منڈانے اور نام رکھنے کی وجہ

حدیث (۱) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لڑکے کے ساتھ عقیقہ ہے'' یعنی لڑکے کا عقیقہ ہونا ہی چاہئے۔ لڑکی کی بہ نسبت لڑکے کا عقیقہ مؤکد ہے: ''پس تم اس کی طرف سے خون بہاؤ'' اس میں اشارہ ہے کہ عقیقہ میں اصل مقصود جانور ذبح کرنا ہے۔ پھر دعوت کرے یا گوشت تقسیم کرے: دونوں باتیں برابر ہیں: ''اور اس سے تکلیف دہ چیز دور کرو'' یعنی سر کے بال اور ہاتھ پاؤں کے ناخن کاٹو، اور ممکن ہو تو ختنہ بھی کرادو (مشکوٰۃ حدیث ۴۱۴۹ کتاب الصید والذبائح، باب العقیقة)

حدیث (۲) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لڑکا گروی رکھا ہوا ہے'' یعنی آفات میں محبوس ہے: ''عقیقہ کے ذریعہ وہ چھڑایا جاتا ہے'' یعنی عقیقہ اس کا فدیہ بن جاتا ہے۔ اور وہ آفات سے بچ جاتا ہے: ''پس اس کی طرف سے ساتویں دن

جانور ذبح کیا جائے، اور اس کا نام رکھا جائے، اور اس کا سر منڈایا جائے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۵۳)

تشریح: عقیقہ کے مامور بہ ہونے کی وجوہ ابھی گذریں — اور ساتویں دن کی تخصیص دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: ولادت اور عقیقہ کے درمیان فصل ضروری ہے۔ کیونکہ ولادت کی ابتداء میں اہل خانہ زچہ بچہ کو سنوارنے میں مشغول ہوتے ہیں۔ پس اس وقت میں عقیقہ کرنے کا حکم دینا مناسب نہیں۔ اس سے گھر والوں کی مشغولیت دوچند ہوجائے گی۔

دوسری وجہ: کبھی جانور فوراً مہیا نہیں ہوتا۔ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پس پہلے ہی دن عقیقہ کرنے کا حکم دینے میں تنگی ہے۔ اور سات دن معتد بہ فصل ہے، نہ کم نہ زیادہ، اس لئے ساتویں دن عقیقہ کرنے کا حکم دیا۔

اور جانور ذبح کرنے کے بعد سر منڈانے میں حاجیوں کی مشابہت اختیار کی جاتی ہے، جیسا کہ ابھی گذرا — اور ساتویں دن نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے نام رکھنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

فائدہ: حقیقی ساتویں دن عقیقہ کرنا ضروری نہیں۔ اس سے پہلے بھی کیا جاسکتا ہے، اور بعد میں بھی۔ اور بعد میں حکمی ساتویں دن کا لحاظ مستحب ہے، ضروری نہیں۔ کسی بھی دن عقیقہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی حکم نام رکھنے کا ہے۔ پیدائش سے پہلے بھی نام رکھا جاسکتا ہے۔

قال صلى الله عليه وسلم: "مع الغلام عقيقة، فأهريقوا عنه دمًا، وأميطوا عنه الأذى" وقال صلى الله عليه وسلم: "الغلام مرتَهَنٌ بعقيقته، تُذبح عنه يوم السابع، ويُسمّٰى، ويُحْلَقُ رأسُه"

أقول: أما سببُ الأمر بالعقيقة فقد ذكرنا. وأما تخصيص اليوم السابع:

فلأنه لابد من فصل بين الولادة والعقيقة، فإن أهله مشغولون بإصلاح الوالدة والولد في أول الأمر، فلايكلَّفون حينئذ بما يُضاعِف شغلَهم.

وأيضًا: فرب إنسان لايجد شاةً إلا بسعي، فلو سُنَّ كونُها في أول يوم لضاق الأمر عليهم؛ والسبعةُ أيامٍ: مدةٌ صالحةٌ للفصل المعتد به، غير الكثير.

وأما إماطة الأذى: فللتشبه بالحاج، وقد ذكرنا.

وأما التسمية: فلأن الطفل قبل ذلك لايحتاج أن يسمى.

ترجمہ: واضح ہے..... فإن أهله کی ضمیر ''بچہ کے باپ'' کی طرف عائد ہے..... حدیث میں بعقيقته کا تعلق يُفَكُّ محذوف سے ہے۔

بچہ کے بالوں کو چاندی سے تولنے کی وجہ

حدیث — حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن رضی اللہ عنہ کی طرف سے بکری کا عقیقہ کیا۔ اور فرمایا: ''فاطمہ! اس کا سر مونڈ ادو، اور اس کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کرو'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۵۴) یہ روایت منقطع ہے اور نسائی میں صحیح سند سے روایت ہے کہ آپؐ نے حضرات حسنین کی طرف سے دو دو مینڈھوں کا عقیقہ کیا۔ مشکوۃ حدیث ۴۱۵۵)

تشریح: بچہ کا پیٹ سے باہر آجانا ایسی نعمت ہے جس کا شکر بجالانا ضروری ہے۔ کیونکہ بچہ جب تک پیٹ میں ہے اس کی دید سے محرومی ہے۔ اور جب پیدا (ظاہر) ہوگیا تو اس سے آنکھ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اور شکریہ ادا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ نعمت سے موازنہ کرکے شکر بجالایا جائے۔ جیسے قابلِ زکات مال گن کر اور حساب لگا کر زکوۃ ادا کرنا: ایسے ہی اندازے سے زکوۃ نکالنے سے بہتر ہے۔ اور نو مولود کے بال پیٹ کی زندگی کا بقیہ ہیں۔ اور ان کا دور کرنا نئی مستقل زندگی کی علامت ہے۔ اس لئے جب وہ بال کاٹے گئے، اور نئی زندگی کا آغاز ہوا تو بہترین طریقہ پر شکر بجالانے کے لئے ان کو چاندی سے تولنے کا حکم دیا — اور چاندی کی تخصیص اس لئے کی کہ سونا زیادہ گراں ہے۔ اور وہ مالداروں ہی کو میسر آتا ہے۔ اور کسی اور سامان سے مثلاً غلہ سے بالوں کو تولا جائے گا تو وہ بے قدر مال ہوگا۔ عام طور پر بال چار گرام ہوتے ہیں۔ اتنا گیہوں خیرات کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟! اور اتنی چاندی کی اہمیت ہے!

وعَقَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحسن بشاة، وقال: "يا فاطمةُ! احْلِقِي رأسه، وتصدَّقي بِزِنَةِ شَعرِه فضةً"

أقول: السبب في التصدق بالفضة: أن الولد لما انتقل من الجَنِينِيَّةِ إلى الطفلية: كان ذلك نعمةً يجب شكرها، وأحسنُ ما يَقع به الشكرُ: بما يُؤْذِنُ أنه عِوَضُه، فلما كان شَعر الجنين بقيةَ النشأة الجَنِينِيَّةِ، وإزالتُه أمارةٌ للاستقلال بالنشأة الطفلية: وجب أن يؤمر بوزن الشَعر فضةً.

وأما تخصيص الفضة: فلأن الذهب أغلى، ولايجده إلا غني، وسائر المتاع ليس له بال بزنة شَعْرِ المولود.

ترجمہ: چاندی خیرات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بچہ جب جنین ہونے سے طفل ہونے کی طرف منتقل ہوا تو وہ ایسی نعمت تھی جس کا شکر بجالانا ضروری تھا۔ اور بہترین وہ چیز جس کے ذریعہ شکر ادا ہوتا ہے: ایسی چیز سے شکر ادا کرنا ہے جو آگاہی دے کہ یہ شکر فلاں نعمت کا ہے۔ پس جب جنین کے بال پیٹ کی زندگی کا بقیہ تھے، اور ان کا ازالہ شیر خوارگی کی زندگی کے ساتھ مستقل

ہونے کی علامت تھا، تو ضروری ہوا کہ بالوں کو چاندی سے تولنے کا حکم دیا جائے ـــــ اور رہی چاندی کی تخصیص: پس اس لئے کہ سونا زیادہ گراں ہے۔ اور وہ مالدار ہی کو میسر آتا ہے۔ اور نومولود کے بالوں کے برابر دیگر سامان کی کچھ اہمیت نہیں۔

تصحیح: بما یؤذن مطبوعہ میں مایؤذن تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

بچہ کے کان میں اذان دینے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا: آپؐ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کان میں نماز والی اذان دی، جب ان کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جنا یعنی ولادت کے بعد فوراً اذان کہی (مشکوۃ حدیث ۴۱۵۷)

تشریح: نومولود کے کان میں اذان دو وجہ سے دی جاتی ہے:

پہلی وجہ: وہ ہے جو عقیقہ کی حکمتوں میں آچکی ہے یعنی اس سے ملت کا آوازہ بلند ہوتا ہے۔ کیونکہ اذان اسلام کا شعار اور دین محمدی کا بلند پرچم ہے۔

دوسری وجہ: اذان سے شیطان بھاگتا ہے (مشکوۃ حدیث ۶۵۵ باب فضل الأذان) اور حدیث میں ہے کہ بچہ کو ولادت کے ساتھ ہی شیطان ستاتا ہے، جس سے بچہ چلاتا ہے (بخاری حدیث ۳۴۳۱) پس ولادت کے بعد فوراً اذان دینا شیطان کو بھگانے کے لئے ہے، تاکہ وہ بچہ کو پریشان نہ کرے ـــــ پھر مطلق اذان دینا کافی نہیں۔ بلکہ بچہ کے ساتھ اس کی تخصیص ضروری ہے۔ اس لئے بچہ کے کان میں اس کی آواز پہنچائی جاتی ہے۔

لڑکے کے عقیقہ میں دو بکروں کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت ام کُرز رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کی جائے۔ خواہ بکرا ہو یا بکری، اس میں کچھ حرج نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۵۲)

تشریح: اگر دو بکریاں میسر ہوں تو لڑکے کی طرف سے دو کا عقیقہ کرنا مستحب ہے۔ کیونکہ عربوں کے خیال میں لڑکا لڑکی سے زیادہ مفید ہے، پس اس کا شکر بھی زیادہ ادا کرنا چاہئے۔ اور شکر کے ذریعہ لڑکے کی شان بلند کرنی چاہئے (اور لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ کا بھی یہی تقاضا ہے)

وأَذَّنَ رسول الله صلى الله عليه وسلم في أُذن الحسن بن علي، حين ولدته فاطمةُ: بالصلاة"
أقول: السر في ذلك: ما ذكرنا في العقيقة من المصلحة الملية: فإن الأذان من شعائر

الإسلام، وأعلام الدين المحمدی، ثم لابد من تخصيص المولود بذلك الأذان، ولا يكون إلا بأن يُصَوَّتَ به في أُذنه.

وأيضًا: فقد علمتَ أن من خاصية الأذان أن يفر منه الشيطان، والشيطانُ يؤذی الولد فی أول نشأته، حتی ورد فی الحديث أن استهلالَه لذلك.

قال صلی الله عليه وسلم: "عن الغلام شاتان، وعن الجارية شاة"

أقول: يستحب لمن وجد الشاتين أن يَنْسُكَ بهما عن الغلام؛ وذلك: لما عندهم أن الذُكرانَ أنفعُ لهم من الإناث، فناسب زيادةَ الشكر، وزيادةَ التنويه به.

ترجمہ: واضح ہے...... بالصلاة: أذّن سے متعلق ہے...... أعلام مفرد عَلَم: پرچم، جھنڈا...... صَوَّتَ به: پکارنا، آواز لگانا...... استهلال: چلانا۔

☆ ☆ ☆

اچھے ناموں کی وجہ

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو تمہارے ناموں میں سب سے زیادہ محبوب نام: عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۵۲ کتاب الآداب، باب الأسامی)

تشریح: مذکورہ نام دو وجہ سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں:

پہلی وجہ: شریعت نے اصلاح حال کے لئے جو تدابیر اختیار کی ہیں، ان میں ایک تدبیر یہ ہے کہ دنیوی معاملات میں ذکر الٰہی شامل کیا جائے۔ تاکہ وہ دعوت حق کا ذریعہ بن جائیں (رحمۃ اللہ ۱: ۵۷۲) پس جب بچہ کا نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن رکھا جائے گا، اور اس نام سے پکارا جائے گا تو توحید کی یاد تازہ ہوگی۔

دوسری وجہ: عرب وعجم میں اپنے معبودوں کے نام سے نام رکھنے کا رواج ہے۔ پس جب نبی ﷺ کی بعثت نشانہائے توحید کو قائم کرنے کے لئے ہوئی تو ضروری ہوا کہ ناموں میں بھی اس کا لحاظ کیا جائے یعنی ایسے نام رکھے جائیں جن سے توحید کا اعلان ہو۔

سوال: ان دو ناموں کے علاوہ اور بھی نام ہیں جن میں عَبْد کی اضافت اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی طرف کی جاتی ہے جیسے عبدالعلیم اور عبدالسمیع وغیرہ۔ اور ان سے بھی توحید کا اعلان ہوتا ہے۔ پھر مذکورہ دو نام ہی اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب کیوں ہیں؟

جواب: یہ دو نام اللہ تعالیٰ کے مشہور نام ہیں۔ اللّٰہ تو اسم عَلَم ہے۔ اور الرحمٰن صفتِ خاصہ ہے۔ غیر اللہ پر ان ناموں کا

اطلاق نہیں ہوتا۔ اور دیگر صفات کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے[1] اس لئے یہی دو نام اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہیں۔

محمد اور احمد: پسندیدہ نام ہونے کی وجہ: یہاں سے یہ بات بھی بوجھی جاسکتی ہے کہ محمد اور احمد: تین وجوہ سے پسندیدہ نام ہیں: اول: لوگ قابل احترام اسلاف کے ناموں پر نام رکھتے ہیں۔ اور یہ دونوں سرورِ کونین ﷺ کے نام ہیں۔ دوم: ان ناموں سے بھی دین اسلام کا تعارف ہوتا ہے اور اس کی شان بلند ہوتی ہے۔ سوم: یہ نام رکھنے میں اس بات کا اعتراف ہے کہ نام رکھنے والے اور جس کا نام رکھا گیا ہے: سب حضرت محمد و احمد ﷺ کے لائے ہوئے دین کو ماننے والے ہیں۔

قال صلی الله علیه وسلم:" أحب الأسماء إلی الله عبد الله وعبد الرحمن"

اعلم: أن أعظمَ المقاصدِ الشرعية أن يُدْخَلَ ذكرُ الله في تضاعيف ارتفاقاتهم الضرورية، ليكونَ كلُّ ذلك أَلْسِنَةً تدعو إلى الحق، وفي تسمية المولود بذلك إشعار بالتوحيد.

وأيضًا: فكان العربُ وغيرهم يسمون الأولادَ بمن يعبدونه، ولما بُعث النبي صلى الله عليه وسلم مُقِيْمًا لمراسم التوحيد، وجب أن يُسَنَّ في التسمية أيضًا مثلُ ذلك.

وإنما كان هذان الاسمان أحبَّ من سائر ما يُضاف فيه العبدُ إلى اسم من أسماء الله تعالى: لأنهما أشهر الأسماء، ولا يُطلقان على غيره تعالى، بخلاف غيرهما.

وأنت تستطيع أن تعلم من هذا سِرَّ استحباب تسميةِ المولود بمحمد وأحمدَ، فإن طوائفَ الناس أولعوا بتسمية أولادهم بأسماء أسلافهم المعظَّمين عندهم، وكاد يكون ذلك تنويها بالدين، وبمنزلة الإقرار بأنه من أهله.

ترجمہ: جان لیں کہ شریعت کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد: یہ ہے کہ اللہ کا ذکر لوگوں کے ضروری ارتفاقات کے ضمن میں داخل کیا جائے، تاکہ وہ سب (دنیوی معاملات) ایسی زبانیں ہو جائیں جو دینِ حق کی طرف بلائیں۔ اور نوزائیدہ بچہ کا نام رکھنے میں ان ناموں کے ساتھ: توحید کی آگاہی دینا ہے ـــــ اور نیز: پس عرب وغیرہ اولاد کے نام رکھا کرتے تھے ان معبودوں کے ناموں سے جن کو وہ پوجتے تھے۔ اور جب نبی ﷺ مبعوث کئے گئے، درانحالیکہ آپ توحید کی نشانیوں کو قائم کرنے والے ہیں، تو ضروری ہوا کہ نام رکھنے میں بھی طریقہ رائج کیا جائے، اس قسم کے نام کا ـــــ اور تھے یہ دو نام اسی لئے زیادہ پسندیدہ دیگر ان ناموں سے جن میں عبد کی اضافت کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کسی نام کی طرف: کہ وہ دونوں مشہور ترین نام ہیں۔ اور ان دونوں کا اللہ کے علاوہ پر اطلاق نہیں ہوتا، برخلاف ان کے علاوہ کے ـــــ اور آپ طاقت

[1] سورۃ الاعراف آیت ۱۰۹ میں قوم فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو ﴿سٰحِرٌ عَلِیْمٌ﴾ کہا ہے۔ اور آیت ۱۱۲ میں جادوگروں کو ﴿سٰحِرٍ عَلِیْمٍ﴾ کہا گیا ہے۔ اور سورۃ الدھر آیت ۲ میں اللہ پاک نے انسان پر سمیع کا اطلاق کیا ہے ۱۲

رکھتے ہیں کہ جانیں اس سے: محمد اور احمد کے ساتھ بچہ کے نام رکھنے کے استحباب کا راز: (۱) پس بیشک لوگوں کے گروہ دلدادہ ہیں اپنی اولاد کے نام رکھنے کے اپنے ان اسلاف کے ناموں سے جو ان کے نزدیک قابل احترام ہیں (۲) اور قریب ہے کہ یہ چیز دین کی شان بلند کرنا ہو (۳) اور اِس اقرار کے بمنزلہ ہو کہ وہ اس دین کے ماننے والوں میں سے ہے۔

☆ ☆ ☆

بیہودہ نام اور اس کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہایت بیہودہ نام قیامت کے دن اللہ کے نزدیک: وہ شخص ہے جو شہنشاہ کہلاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۵۵) اور ایک روایت میں ہے کہ: ''اللہ کے علاوہ کوئی بادشاہ نہیں!''

تشریح: شہنشاہ (بڑا بادشاہ) بیہودہ نام (خطاب) اس لئے ہے کہ دین کی بنیادی تعلیم: اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور ان کے برابر کسی کو نہ گرداننا ہے۔ اور چیز کی تعظیم اور اس کے نام کی تعظیم میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی محترم چیز کا نام بھی احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور نام کا احترام ذات کے احترام کا سبب ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ اللہ کا نام کسی کو نہ دیا جائے۔ خاص طور پر وہ نام جو انتہائی تعظیم پر دلالت کرتا ہے یعنی کسی کو بادشاہوں کا بادشاہ نہ کہا جائے، ورنہ وہ نام بادشاہ کی تقدیس تک مفضی ہوگا۔ اور وہ خدا بن جائے گا۔

> **وقال صلى الله عليه وسلم: " أخنى الأسماء يومَ القيامة عند الله: رجلٌ يُسَمّى مَلِكَ الأملاك"**
> **أقول: السبب فيه: أن أصلَ أصول الدين: هو تعظيمُ الله، وأن لا يُسَوّى به غيرُه، وتعظيمُ الشيئِ مُسَاوِقٌ لتعظيم اسمِه، ولذلك وجب أن لايُسمى باسمه، لاسيما هذا الاسمُ الدالُّ على أعظمِ التعظيم.**

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: أخنى (اسم تفضیل) خَنَا (ن) خَنْوًا: بیہودہ بات کرنا ...... مَساوق (اسم فاعل) ساوقہ: دو چیزوں کا ساتھ ساتھ چلنا۔

☆ ☆ ☆

بچوں کی پرورش کے احکام اور ان کی حکمتیں

سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۳ ہے: ''اور مائیں اپنے بچوں کو دو سال کامل دودھ پلائیں، اس کے لئے جو شیر خوارگی کی تکمیل چاہتا ہے۔ اور اس پر جس کا بچہ ہے یعنی باپ کے ذمہ قاعدۂ شرعی کے موافق اُن ماؤں کا کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی شخص کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق۔ کوئی ماں ضرر نہ پہنچائی جائے اس کے بچہ کی وجہ سے۔ اور نہ وہ شخص جس کا بچہ

ہے (ضرر پہنچایا جائے) اس کے بچہ کی وجہ سے۔ اور بچہ کے وارث پر اسی کے مانند ہے۔ پھر اگر والدین باہمی رضامندی اور مشاورت سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو دوسری انا کا دودھ پلوانا چاہو تو (بھی) تم پر کچھ گناہ نہیں۔ جب تم ان (ماؤں) کو دیدو جو کچھ قاعدۂ شرعی کے موافق دینا طے کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں"

تفسیر: اس آیت پاک میں حضانت کے سلسلہ میں چار حکم ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ ان کی حکمتیں بیان کرتے ہیں:

پہلا حکم —— بچہ کی پرورش میں والدین کی حصہ داری —— ماں کے ذمہ دیانۃً بچہ کو دودھ پلانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا واجب ہے، اور باپ کے ذمہ —— اور وہ نہ ہو تو بچہ کے وارث کے ذمہ —— قاعدۂ شرع کے موافق بچہ کی ماں کو کھانا کپڑا دینا واجب ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تناسل کے ذریعہ نوعِ انسانی کی بقاء کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ اور یہی سنتِ الٰہی جاری ہے یعنی انسان بھی اگرچہ دیگر حیوانات کی طرح ابتداء مٹی سے پیدا کیا گیا ہے، مگر آگے کے لئے فیصلۂ خداوندی یہ ہے کہ اس کی نسل چلے۔ اور انسان کا بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ناتواں ہوتا ہے۔ دیگر حیوانات کے بچوں کی طرح پیدا ہوتے ہی خود کفیل نہیں ہو جاتا۔ اس لئے عام طور پر بچہ کے زندہ رہنے کے لئے اسبابِ حیات میں والدین کا تعاون ضروری ہے۔ اور یہ معاونت ایک ایسی طبعی اور فطری چیز ہے جس میں تبدیلی اور جس کی خلاف ورزی اللہ تعالیٰ کی بناوٹ کو بدلنا، اور اس نظام کو درہم برہم کرنا ہے جو نوع کی بقاء کے لئے اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے۔ چنانچہ حکمتِ خداوندی میں ضروری ہوا کہ اس سلسلہ میں احکام نازل کئے جائیں۔ اور والدین پر ان کاموں کو تقسیم کیا جائے جو وہ بسہولت انجام دے سکتے ہیں۔ چنانچہ: ماں کے لئے بچہ کو دودھ پلانا اور اس کی دیکھ بھال کرنا آسان تھا، اس لئے اس پر یہ چیز واجب کی۔ اور باپ کے لئے حسب گنجائش بچہ پر اور اس کی ماں پر خرچ کرنا آسان تھا، اس لئے اس پر یہ چیز واجب کی۔

اور بچہ کا خرچہ باپ کے ذمہ اس لئے ہے کہ وہ **مولود لہ** ہے یعنی بچہ کی تولید میں اگرچہ ماں باپ دونوں شریک ہیں، مگر بچہ باپ کا کہلاتا ہے، اسی سے نسب چلتا ہے، اس لئے اس پر بچہ کا خرچہ واجب ہے۔ اور بچہ کی ماں کا نفقہ اس کے باپ کے ذمہ اس لئے واجب ہے کہ عورت اس کے بچہ کی پرورش اور اس کی سختیاں جھیلنے میں مشغول ہے۔ کمانے کی اس کو فرصت نہیں۔ اور جو جس کے حق میں محبوس ہوتا ہے، اس کا نفقہ اس پر واجب ہوتا ہے۔ پس انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کا خرچہ بچہ کے باپ کے ذمہ ہو۔

دوسرا حکم —— مدتِ رضاعت کی تعیین اور جلدی دودھ چھڑانے کے لئے مشاورت کا حکم —— بعض لوگ بچہ کا دودھ چھڑانے میں جلدی کرتے ہیں۔ اور یہ بات کبھی بچہ کے لئے نقصان رساں ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے دودھ پلانے کے لئے ایک ایسی مدت متعین کردی جو بچہ کی سلامتی کے لئے کافی ہے۔ یہ دو سال کی مدت ہے۔ اس کے بعد بچہ دودھ کا محتاج نہیں رہتا۔

اور دو سال پورے ہونے سے پہلے بھی دودھ چھڑانا جائز ہے۔ کیونکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ بچہ کی نشو ونما اچھی ہوتی ہے، اور وہ دو سال سے پہلے ہی غذا لینے پر قادر ہو جاتا ہے۔ اس لئے جلدی دودھ چھڑانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر اس کا فیصلہ انتہائی غور وفکر اور خوب سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ اور والدین چونکہ بچہ پر انتہائی مہربان اور اس کے اندرونی حالات سے واقف ہوتے ہیں اس لئے باہمی رضامندی اور مشاورت کی شرط لگائی، تاکہ ناوقت دودھ چھڑانے سے بچہ کو ضرر نہ پہنچے۔

تیسرا حکم — جانبین سے ضرر رسانی کی ممانعت — اس لئے کی ہے کہ اس سے دل تنگی پیدا ہوتی ہے۔ اور ہر ایک تعاون سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔

اور جانبین سے ضرر رسانی کی صورتیں یہ ہو سکتی ہیں:

ا — کسی مجبوری کی وجہ سے ماں دودھ پلانے سے انکار کرے تو اس کو مجبور کرنا اس کو ضرر پہنچانا ہے۔ البتہ اگر بچہ دوسری عورت کا یا جانور کا دودھ نہ لے تو مجبور کرنا جائز ہے، ورنہ باپ کو ضرر پہنچے گا۔

۲ — ماں دودھ پلانے کی اجرت مانگے، حالانکہ وہ باپ کے نکاح میں یا عدت میں ہے، اور حق زوجیت کی وجہ سے اس کو خرچہ مل رہا ہے تو باپ پر دُوہرے خرچے کی ذمہ داری ڈالنا اس کو ضرر پہنچانا ہے۔ اور اگر ماں مطلقہ ہے اور عدت گذر چکی ہے یا بچہ کے باپ کی وفات ہو گئی ہے تو عورت کا مطالبہ درست ہے اور اس کو مفت دودھ پلانے پر مجبور کرنا: اس کو ضرر پہنچانا ہے۔

چوتھا حکم — ماں کے علاوہ عورت کا یا باہر کا دودھ پلانا — کبھی ماں کمزور ہوتی ہے، اس کا دودھ ناکافی ہوتا ہے۔ یا وہ کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتی ہے جس سے بچے کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے یا زوجین میں مفارقت ہو چکی ہے یا ایسا ہی کوئی اور سبب ہے تو دوسری عورت کا دودھ پلانا جائز ہے۔ مگر اس صورت میں جانبین سے پورا حق ادا کرنا ضروری ہے یعنی دوسری عورت سے دودھ پلوانے کی صورت میں بچہ کی ماں کا خرچہ بند نہ کرے۔ اس کا خرچہ جو حق زوجیت کی بنا پر واجب ہے: برابر دیتا رہے۔ یہ خیال نہ کرے کہ ماں دودھ تو پلاتی نہیں، پھر اس کا خرچہ کیوں دوں؟!

قال الله تعالى: ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ الآية.

أقول: لما توجهتْ إرادةُ الله تعالى إلى إبقاء نوع الإنسان بالتناسل، وجرى بذلك قضاؤُه، وكان الولد لايعيش في العادة إلا بتعاون من الوالد والوالدة في أسباب حياته، وذلك أمرٌ جبلّي خُلِقَ الناسُ عليه، بحيث يكون عصيانُه ومخالفتُه تغييرًا لخلق الله، وسعيا في نقض ما أوجبته الحكمة الإلٰهية: وجب أن يَبْحث الشرعُ عن ذلك، ويُوَزِّعَ عليهما ما يتيسر، ويتأتى منهما: والمتيسَّر من الوالدة: أن تُرْضِعَ وَتَحْضُنَ، فيجب عليها ذلك؛ والمتيسَّرُ من الوالد: أن يُنفق عليه من طَوله، وينفقَ عليها: لأنه حَبَسَهَا عن المكاسب، وَشَغَلَهَا بحضانة ولده، ومعاناةِ التعب فيها، فكان العدلُ أن تكون كفايتُها عليه.

ولـمـا كـان مـن الناس من يستعجل الفِطامَ، وربما يكون ذلك ضارًا بالولد، حدَّ الله له حدًّا، تَغلِبُ السلامةُ عنده، وهو حولان كاملان، ورخص فيما دون ذلك بشرط تشاور منهما، إذ كثيرًا مايكون الولد بحيث يقدر على التغذى قبلها، لكنه يحتاج إلى اجتهاد وتَحَرٍّ، وهما أرفقُ الناس به، وأعلمهم بسريرته.

ثم حَرَّمَ المضارَّة من الجانبين: لأنه تضييقٌ يُفضى إلى نقصان التعاون:

فإن احتاجوا إلى الاسترضاع لِضُعف الوالدة، أو مرضِها، أو تكون قد وقعت بينهما فرقة، وهى لا تلائمة، ونحوِ ذلك من الأسباب: فلا جناح فيه، ويجب عند ذلك إيفاءُ الحق من الجانبين.

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ کا ارادہ متوجہ ہوا تناسل کے ذریعہ نوع انسانی کو باقی رکھنے کی طرف، اور جاری ہوا اس کے ساتھ اللہ کا فیصلہ، اور بچہ عادۃً زندہ نہیں رہتا، مگر بچہ کے اسبابِ زندگی میں ماں باپ کے تعاون کے ذریعہ، اور وہ معاونت ایک طبعی امر ہے جس پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں بایں طور کہ اس کی نافرمانی اور اس کی خلاف ورزی اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی اور اس چیز کو توڑنے کی سعی ہے، جس کو حکمتِ خداوندی نے واجب کیا ہے: تو ضروری ہوا کہ اس سے شریعت بحث کرے، اور دونوں پر وہ کام تقسیم کرے جن کو وہ بہ سہولت انجام دے سکیں، اور وہ کام دونوں سے حاصل ہو سکیں: (۱) اور ماں کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ دودھ پلائے اور بچہ کی پرورش کرے، پس اس پر یہ چیز واجب ہے۔ اور باپ کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ بچہ پر خرچ کرے اپنی گنجائش سے اور عورت پر خرچ کرے: اس لئے کہ اس نے عورت کو روکا ہے کمائیوں سے۔ اور اس کو مشغول کیا ہے اپنے بچہ کی پرورش میں، اور پرورش میں مشقت برداشت کرنے میں، پس انصاف یہ تھا کہ عورت کا خرچہ بچہ کے باپ پر ہو ـــ (۲) اور جب بعض لوگ بچہ کا دودھ چھڑانے میں جلدی کرتے تھے، اور کبھی یہ چیز بچہ کے لئے نقصان رساں ہوتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے دودھ پلانے کے لئے ایک ایسی مدت متعین کردی جس تک دودھ پلانے سے بچہ کی سلامتی عام طور پر باقی رہتی ہے۔ اور وہ مدت پورے دو سال ہیں۔ اور اس سے کم میں اجازت دی دونوں کے باہم مشورہ کرنے کی شرط کے ساتھ۔ کیونکہ بارہا بچہ ایسا ہوتا ہے کہ دو سال سے پہلے غذا استعمال کرنے پر قدرت پالیتا ہے۔ لیکن یہ بات محتاج ہے انتہائی سوچ اور غور وفکر کی۔ اور وہ دونوں لوگوں میں سب سے زیادہ بچہ پر مہربان ہیں، اور بچہ کے اندرونی حالات کو جاننے والے ہیں ـــ (۳) پھر جانبین سے ضرر رسانی حرام ٹھہرائی: اس لئے کہ وہ ضرر رسانی ایسی تنگی کرنا ہے جو معاونت کے نقصان تک مُفضی ہے ـــ (۴) پس اگر وہ محتاج ہوں بچہ کو دوسری عورت کا دودھ پلوانے کی طرف: ماں کی کمزوری کی وجہ سے یا ماں کی بیماری کی وجہ سے، یا دونوں کے درمیان قطعی جدائی واقع ہوگئی ہے، اور وہ عورت (کا دودھ) بچہ کے لئے مناسب نہیں (اس کا تعلق مـرضها کے ساتھ ہے) یا اس کے مانند اور اسباب: پس کوئی گناہ نہیں دوسری عورت کا دودھ پلوانے میں۔ اور اس صورت میں واجب ہے جانبین سے حق پورا ادا کرنا۔

بردہ دینے سے حق رضاعت ادا ہونے کی وجہ

حدیث ــــ حضرت حجاج اسلمی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: حق رضاعت کس چیز سے ادا ہوسکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''بردہ: غلام یا باندی (دینے سے)(مشکوۃ حدیث ۳۱۷۴ کتاب النکاح، باب المحرمات)

تشریح: دودھ پلانے والی عورت بھی حقیقی ماں کے بعد ماں ہے۔ اور ماں کے ساتھ حسن سلوک کے بعد اس کے ساتھ بھی حسن سلوک ضروری ہے۔ ایک مرسل روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اپنی انّا کے لئے احتراماً اپنی چادر بچھائی ہے[1] (طبقات ابن سعد ۱۱۴:۴ ذکر من أرضع رسول الله إلخ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی یہ واقعہ سند کے بغیر بصیغۂ تمریض ذکر کیا ہے۔ دیکھیں ترمذی ۱۳۸:۱ باب ما يُذهب مَذَمَّة الرضاع)

اور بردہ کی تعیین کی وجہ یہ ہے کہ کبھی شیر خوار بہت دیتا ہے مگر انّا راضی نہیں ہوتی۔ اور کبھی تھوڑا دیتا ہے اور اس کو بہت سمجھتا ہے۔ پس یہ اشتباہ کا محل ہے کہ اس کو کتنا دیا جائے جس سے اس کا حق ادا ہو جائے؟ چنانچہ حضرت حجاجؓ نے تعیین کی درخواست کی، اور آپؐ نے بردہ متعین فرمایا۔

اور بردہ دینے سے حق رضاعت ادا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شیر خوار پر انّا کا حق بایں وجہ قائم ہوا ہے کہ اس کے دودھ سے اس کی باڈی استوار ہوئی ہے۔ اور انّا نے اس کو کامل انسان یعنی توانا تنومند آدمی بنایا ہے۔ نیز اس کی پرورش میں پاپڑ بیلنے کی وجہ سے اس کا حق بنا ہے۔ پس اس کا پورا بدلہ یہ ہے کہ شیر خوار اس کو ایک ایسا خادم بخشے جو دنیوی کاموں کی انجام دہی میں شیر خوار کے ہاتھ پیر بن کر انّا کے کاموں کی کلفت برداشت کرے۔

مسئلہ: یہ بردہ دینا مستحب ہے، واجب نہیں۔ واجب وہ اجرت تھی جو شیر خوار کے باپ نے ادا کر دی ہے۔

قيل: يارسول الله! ما يُذهب عني مَذِمَّةَ الرضاع؟ قال النبي صلى الله عليه وسلم: " غُرَّةٌ: عبدٌ أو أمةٌ"

اعلم: أنّ المرضِعَ أمٌّ بعد الأم الحقيقية، وبِرُّها واجبٌ بعد بر الأم، حتى أن النبي صلى الله عليه وسلم بسط رداءَه لمرضِعِه إكرامًا لها.

وربما لاترضى بما يُهديه إليها، وإن كثر، وربما يَستكثر الذي رَضَعَ القليلَ الذي يَمْنَحُهَا، ويكون في ذلك الاشتباهُ، فسئل النبي صلى الله عليه وسلم عن حدٍّ يَضْرِبُه، فضرب الغرةَ حدًا.

وذلك: أن المرضع إنما أثبتتْ حقًا في ذمته لأجل إقامةِ بنيته، وتصييرها إياه إنسانا كاملاً، ولأجل حضانته، ومقاساةِ التعب فيه، فيكون الجزاءُ الوفاقُ أن يَمْنَحَهَا إنسانا، يكونُ بمنزلة جوارحه فيما يريد من ارتفاقاته، ويتحمل عنها مُؤْنَةَ عملِها؛ وهو حدٌّ استحبابي، لا ضروري.

[1] حلیمہ سعدیہ اور ان کے شوہر حارث بن عبد العزیٰ کے اسلام میں اختلاف ہے (زاد المعاد ۸۳:۱)



ترجمہ: اور کبھی اناراضی نہیں ہوتی اس ہدیہ پر جو دودھ پینے والا اس کو پیش کرتا ہے، اگر چہ وہ زیادہ ہو، اور کبھی شیر خوار زیادہ سمجھتا ہے اس تھوڑے کو جو وہ اس کو بخشتا ہے۔ اور اس میں اشتباہ تھا (اشتباہ: دو چیزوں کا ایسا ہم شکل ہونا کہ دھوکہ ہو جائے) پس نبی ﷺ سے ایسی حد معلوم کی گئی جس کو آپ مقرر کریں۔ چنانچہ آپؐ نے بردہ کو حد مقرر کیا —— اور وہ بات یعنی بردہ کی تعیین اس لئے کی کہ دودھ پلانے والی نے شیر خوار کے ذمہ اس کی باڈی قائم کرنے ہی کی وجہ سے حق قائم کیا ہے، اور اس کے بنانے کی وجہ سے شیر خوار کو کامل انسان۔ اور اس کی پرورش کی وجہ سے اور شیر خوار میں مشقت برداشت کرنے کی وجہ سے۔ پس پورا بدلہ یہ ہوگا کہ شیر خوار انا کو ایک ایسا انسان (خادم) بخشے جو شیر خوار کے اعضا کے قائم مقام ہو جائے ان کاموں میں جو وہ چاہتا ہے اپنے دنیوی کاموں سے اور انا کی طرف سے اس کے کام کی کلفت اٹھائے —— اور وہ استحبابی حد ہے، ضروری نہیں۔

☆ ☆ ☆

عورت کو معروف طریقہ پر خرچ لینے کا اختیار دینے کی وجہ

حدیث —— ہند بنت عتبہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ابو سفیان بخیل آدمی ہیں۔ اور وہ مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے جو میرے اور میرے بچوں کے لئے کافی ہو جائے، مگر جو میں ان سے لے لوں درانحالیکہ ان کو خبر نہ ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم لو جو اپنے اور اپنے بچوں کے لئے معروف طریقہ پر کافی ہو'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۴۲ باب الحضانۃ)

تشریح: چونکہ بیوی بچوں کے مصارف کا صحیح اندازہ کرنا ایک مشکل امر ہے، اس لئے نبی ﷺ نے یہ معاملہ بیوی کے حوالے کر دیا۔ البتہ معروف طریقہ پر لینے کی قید لگائی۔ اور کورٹ سے رجوع کرنے کا حکم اس لئے نہیں دیا، کہ اس میں اور بھی دشواری ہے۔

بچوں سے نماز پڑھوانے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کو جب وہ سات سال کی ہو جائے نماز کا حکم دو۔ اور جب وہ دس سال کی ہو جائے تو نماز (چھوڑنے) پر ان کو مارو، اور ان کی سونے کی جگہیں علحدہ کر دو'' (مشکوۃ حدیث ۵۷۲)

تشریح: بچہ اگر چہ مکلف نہیں مگر تربیت کے لئے اس سے نماز پڑھوانا ضروری ہے۔ تفصیل کتاب الصلاۃ (رحمۃ اللہ ۳: ۲۸۷) میں گذر چکی ہے۔

پرورش کا زیادہ حقدار کون ہے؟

والدین میں اختلاف کی صورت میں: پرورش کے زیادہ حقدار کے بارے میں: نبی ﷺ نے مختلف فیصلے کئے ہیں۔ اس لئے کہ آپؐ کے پیش نظر بچہ اور والدین کا مفاد تھا۔ آپؐ فریقین میں سے جو بھی دوسرے کو ضرر پہنچانے کا ارادہ رکھتا:

اس کا لحاظ نہیں فرماتے تھے، نہ دونوں میں سے کسی ایک کی مصلحت کی طرف دیکھتے تھے۔ کیونکہ بغض وحسد اور ضرر رسانی کے جذبات قابل پذیرائی نہیں۔ اس سلسلہ کے دو فیصلے درج ذیل ہیں:

ایک فیصلہ: حضرت عبداللہ بن عمر و رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی۔ اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرا یہ بیٹا: میرا پیٹ اس کا برتن تھا، میری چھاتی اس کا مشکیزہ تھی، اور میری گود اس کا احاطہ تھی۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دیدی اور چاہتا ہے کہ اس کو مجھ سے چھین لے! آپ نے فرمایا: ''تم اس کی زیادہ حقدار ہو جب تک نکاح نہ کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۷۸)

تشریح: آپ نے ماں کے حق میں فیصلہ دو وجہ سے دیا ہے: ایک: ماں پرورش کے باب میں زیادہ راہ یاب ہے۔ دوم: ماں بچہ پر زیادہ مہربان ہے۔ البتہ اگر عورت کسی ایسے شخص سے نکاح کرلے جو بچہ کا محرم نہیں تو اس کا حق حضانت ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ اب وہ خود شوہر کے زیر دست ہوگی، اس لئے بچہ کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کر سکے گی۔ اور دوسرا شوہر بچہ کے لئے اجنبی ہے، اس لئے وہ بچہ کے ساتھ شفقت کا معاملہ نہیں کرے گا۔

دوسرا فیصلہ: رسول اللہ ﷺ نے ایک لڑکے کو اس کے باپ اور اس کی ماں کے درمیان اختیار دیا (مشکوۃ حدیث ۳۳۷۹) اس واقعہ میں پہلے آپ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ماں باپ دونوں قرعہ اندازی کریں مگر باپ تیار نہ ہوا، تو آپ نے بچہ سے کہا: ''یہ تیرا باپ ہے، اور یہ تیری ماں ہے، تو جس کا چاہے ہاتھ پکڑ لے'' اس نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ چنانچہ ماں اس کو لے کر چلدی (مشکوۃ احادیث ۳۳۸۰ و ۳۳۸۱)

تشریح: ایسا فیصلہ اس صورت میں کیا جائے گا جب بچہ ممیز (بھلے برے کو پہچاننے والا) ہو۔

وقالت هندٌ: إن أبا سفيان رجل شحيح، لا يعطيني، إلا أن آخذ من ماله بغير إذنه، فقال صلى الله عليه وسلم: " خذي ما يكفيكِ وولدَكِ بالمعروف"

أقول: لما كانت نفقة الولد والزوجة يَعْسُرُ ضبطُها: فَوَّضَها النبيُّ صلى الله عليه وسلم إليها، وأكّد في اشتراطِ أخذِها: بالمعروف، وأهمل الرجوعَ إلى القضاة مثلاً، لأنه عسير عند ذلك.

قال صلى الله عليه وسلم: " مُروا أولادكم بالصلاة" الحديث، وقد مر سره فيما سبق.

واختلفت قضاياه صلى الله عليه وسلم في الأحق بالحِضانة عند المشاجرة بينهما: لأنه إنما يَنْظُرُ إلى الأرفق بالولد ووالديه، ولا ينظر إلى من يريد المضارّة، ولا يلتفت إلى المصلحة، فإن الحسد والضِّرَارَ غيرُ مُتَّبَع.

فجاء تـه مرةً امرأةٌ، وقالت: يارسول الله! إن ابني هذا: كان بطني له وِعاءً، وثديي له سِقاءً، وَحِجْري له حِواءً، وإن أباه طلقني، وأراد أن ينزعه مني؟ قال صلى الله عليه وسلم: " أنتِ أحقُّ

به مالم تنكحي"

أقول: وذلك: لأن الأم أهدى للحِضانة، وأرفق به؛ فإذا نكحتْ كانت كالمملوكة تحته، وإنما هو أجنبي لا يُحسن إليه.

وخيَّرَ غلامًا بين أبيه وأمه: وذلك: إذا كان مُميِّزًا.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: جب اولاد اور بیوی کے مصارف کی تعیین دشوار تھی تو نبی ﷺ نے یہ بات ہند کے سپرد کردی۔ اوراس کو معروف طریقہ سے لینے کی تاکید کی۔ اور قاضیوں سے رجوع کرنے کو ــــ مثلاً ــــ رائگاں کردیا۔ اس لئے کہ ان سے رجوع کرنا مصارف لیتے وقت دشوار ہے ــــ اور نبی ﷺ کے فیصلے مختلف ہوئے ہیں والدین کے درمیان اختلاف کی صورت میں پرورش کے زیادہ حقدار کے بارے میں: اس لئے کہ آپ بچہ اور اس کے والدین کے لئے زیادہ مفید بات ہی کی طرف دیکھتے تھے۔ اور آپؐ اس شخص کی طرف جو ضرر رسانی کا ارادہ کرتا ہے: نہیں دیکھتے تھے۔ اور نہ آپؐ اس کی مصلحت کی طرف التفات فرماتے تھے۔ کیونکہ حسد اور ضرر رسانی قابل پذیرائی نہیں ــــ میں کہتا ہوں: اور وہ بات یعنی ماں کے حق میں فیصلہ اس لئے کیا کہ ماں پرورش میں زیادہ راہ یاب ہے، اور بچہ پر زیادہ مہربان ہے۔ پھر جب اس نے نکاح کرلیا تو وہ شوہر کے زیردست مملوکہ جیسی ہوگئی۔ اور شوہر اجنبی ہے، جو بچہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا ــــ اور وہ بات یعنی بچہ کو اختیار دینا: جب ہے کہ بچہ سمجھ دار ہو (الحِواء: وہ جگہ جو کسی چیز کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہو)

فصل

غلاموں کی تربیت کا بیان

معاونت کے مراتب

جان لیں کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ یعنی فطری طور پر ساتھیوں سے مل جل کر رہنے والا ہے۔ اور انسان کی معیشت اس وقت تکمیل پذیر ہوسکتی ہے جب لوگ ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ اور تعاون اس وقت ممکن ہے جب آپس میں مہر و مہربانی ہو۔ اور محبت و مودت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب جانبین سے غم خواری اور دلداری ہو۔ پھر معاونت کا ایک درجہ نہیں، بلکہ اس کے مختلف مدارج ہیں۔ اور مدارج کے اختلاف سے حسن سلوک اور صلہ رحمی مختلف ہوتی ہے:

اور معاونت کا ادنی درجہ ــــ وہ ہے جو اس ارتباط (ربط وضبط) کی بنا پر وجود میں آتا ہے جو مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اِس مرتبہ میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان حسن سلوک کو پانچ باتوں کے ذریعہ منضبط کیا ہے:

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں: سلام کا جواب دینا۔ مریض کی بیمار پرسی کرنا، جنازوں میں شرکت کرنا، دعوت قبول کرنا، اور چھینکنے والے کی تحمید کا جواب دینا (مشکوۃ حدیث ۱۵۲۴ کتاب الجنائز، باب عیادۃ المریض)

اور ایک روایت میں: چھ حق ہیں: چھٹا حق: "جب کوئی مسلمان نصیحت کا خواستگار ہو تو اس کو نصیحت کرنا" (مشکوۃ حدیث ۱۵۲۵) اور بخاری کی ایک روایت میں: دو اور حق آئے ہیں: "بھوکوں کو کھانا کھلانا اور قیدیوں کو چھڑانا" (مشکوۃ حدیث ۱۵۲۳)

تشریح: مذکورہ پانچ یا چھ حق خفیف المؤنت ہیں یعنی گرانبار نہیں۔ اور وہ محبت پیدا کرنے والے ہیں۔ اس لئے وہ متعین کئے گئے ہیں۔

پھر معاونت کا وہ درجہ ہے ــــ جو اس ارتباط کی بنا پر وجود میں آتا ہے جو محلّہ والوں، پڑوسیوں اور قرابت داروں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ ان کے درمیان مذکورہ حقوق مؤکد ہو جاتے ہیں۔ نیز تعزیت (اظہار ہمدردی) تہنیت (مبارکبادی) زیارت (ملاقات) اور ہدیہ لینا دینا بھی مؤکد ہے۔ علاوہ ازیں: نبی ﷺ نے چند اور باتیں بھی لازم کی ہیں۔ خواہ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں ان کا التزام ضروری ہے، مثلاً:

۱ــ ذی رحم محرم ملکیت میں آتے ہی آزاد ہو جائے گا (مشکوۃ حدیث ۳۳۹۲ کتاب العتق)

۲ــ دیت (خون بہا) عاقلہ پر واجب ہے۔

پھر معاونت کا درجہ ــــ وہ ہے جو اس ارتباط کی بنا پر وجود میں آتا ہے جو گھر والوں کے درمیان یعنی بیوی اور غلام باندیوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ بیوی کے ساتھ حسن سلوک کا بیان گذر چکا۔ اور غلام باندیوں کے ساتھ حسن سلوک کے نبی ﷺ نے دو مرتبے قرار دیئے ہیں: ایک: واجب کا درجہ ہے، جو لوگوں پر لازم ہے، خواہ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں اس پر عمل ضروری ہے۔ دوسرا درجہ: مستحب کا ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی دعوت دی ہے اور اس پر ابھارا ہے۔ مگر اس کو ضروری قرار نہیں دیا۔

ممالیک کے ساتھ حسنِ سلوک کا پہلا مرتبہ ــــ مثبت پہلو سے غلام باندیوں کا نان نفقہ اور لباس پوشاک مولیٰ کے ذمہ ہے۔ اور منفی پہلو سے چند باتوں کی ممانعت کی گئی ہے۔ جس کا بیان درج ذیل روایات میں ہے:

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مملوک کے لئے اس کا کھانا اور اس کا کپڑا ہے، اور وہ ایسے ہی کام کا حکم دیا جائے جو اس کے بس میں ہو" (مشکوۃ حدیث ۳۳۴۴ كتاب النكاح، باب النفقات وحق المملوك)

تشریح: چونکہ غلام باندیوں کو مولیٰ کی خدمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے کمانے کی فرصت نہیں ملتی، اس لئے ان کا واجبی خرچہ مولیٰ کے ذمہ واجب ہے۔

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے اپنے مملوک پر تہمت لگائی، درانحالیکہ وہ اس بات سے بری ہے جو آقا کہتا ہے، تو اس کو قیامت کے دن کوڑے مارے جائیں گے" یعنی اس پر حدِ قذف جاری ہوگی (مشکوۃ حدیث ۳۳۵۱)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''من مَثَّلَ بعبده: عتق علیه :جس نے اپنے غلام کی شکل بگاڑی یعنی ناک کان کاٹے وہ اس کی مرضی کے خلاف آزاد ہے (اخرجہ رزین، جامع الاصول ۹:۵۲)

تشریح: غلام کو آزاد کردینا مولیٰ کے لئے زجر وتوبیخ ہے کہ وہ ایسی حرکت نہ کرے۔

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دس سے زیادہ کوڑے نہ مارے جائیں، مگر اللہ کی مقرر کردہ سزاؤں میں سے کسی سزا میں'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۰ کتاب الحدود، باب التعزیر)

تشریح: اس حدیث کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

پہلا مطلب —— حدودِ شرعیہ (زنا وغیرہ) میں تو مقررہ کوڑے مارے جائیں، مگر ان کے علاوہ جرائم میں مثلاً گالی کی سزا میں دس سے زیادہ کوڑے نہ مارے جائیں۔ اس صورت میں یہ ظلم کا سد باب ہے۔ اور تعزیر (گوشمالی، سرزنش) میں دس کوڑوں سے آگے بڑھنے کی ممانعت ہے۔

دوسرا مطلب —— آقا غلام کو کسی کوتاہی کی سزا دینا چاہے، مثلاً کوئی کام بتایا تھا وہ نہیں کیا، تو دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے۔ اس صورت میں حد سے حد شرعی مراد نہیں، بلکہ ہر وہ جرم مراد ہے جس سے حق شرع کی بنا پر روکا گیا ہے۔ حدیث میں یہ لفظ عام بھی استعمال ہوا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، اور اس نے عرض کیا: یا رسول الله! إنی أصبتُ حدًّا فأقمه علیَّ: یا رسول اللہ! میں نے جرم کیا ہے، مجھے سزا دیجئے! آپؐ نے اس سے دریافت نہیں کیا کہ کیا جرم کیا ہے؟ پھر نماز کا وقت ہوگیا۔ اس نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی۔ پھر اس نے وہی بات دُہرائی۔ آپؐ نے دریافت کیا: ''کیا تو نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟'' اس نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: پس بیشک اللہ تعالیٰ نے تیرا گناہ بخش دیا'' یا فرمایا: ''تیری حد معاف کردی!'' (بخاری حدیث ۶۸۲۳ کتاب الحدود، باب ۲۷) ظاہر یہ ہے کہ یہ حدودِ شرعیہ والے جرائم کے علاوہ کوئی جرم ہے۔ کیونکہ حدودِ شرعیہ نماز سے معاف نہیں ہوتیں۔

اور راجح مطلب —— دوسرا ہے۔ کیونکہ خلفائے راشدین حدودِ شرعیہ کے علاوہ دیگر جرائم میں دس سے زیادہ کوڑے مارتے تھے، بلکہ حدیث مرفوع میں بعض گالیوں کی سزا بیس کوڑے آئی ہے (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۲ باب التعزیر)

دوسرا مرتبہ —— جو استحبابی ہے، اس کا بیان درج ذیل احادیث میں ہے:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے لئے اس کا خادم (غلام) کھانا پکائے، پھر وہ اس کو حاضر کرے، درانحالیکہ وہ اس کی گرمی اور دھوئیں کا ذمہ دار بنا ہے، تو چاہئے کہ وہ اس کو اپنے ساتھ بٹھائے، پس چاہئے کہ وہ کھائے۔ پھر اگر کھانا تھوڑا ناکافی ہو تو چاہئے کہ اس میں سے اس کے ہاتھ میں لقمہ دو لقمے رکھے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۴۷ کتاب النکاح، باب النفقات)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا: ''جس نے اپنے غلام کوکوئی ایسی حد ماری جس کا اس نے ارتکاب نہیں کیا، یا اس کوطمانچہ مارا، تو بیشک اس کا کفارہ یہ ہے کہ وہ اس کوآزادکردے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۵۲)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کومارے، پس وہ اللہ کاواسطہ دے توچاہئے کہ رُک جائے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۶۰)

اعلم: أن الإنسان مَدَنِيٌّ بالطبع، ولا يستقيم معاشُه إلا بتعاونٍ بينهم، ولا تعاونَ إلا بالألفة والرحمةِ فيما بينهم، ولا ألفةَ إلا بالمواساة، ومراعاةِ الخواطر من الجانبين؛ وليس التعاونُ على مرتبة واحدة، بل له مراتبُ: يختلف باختلافها البر والصلةُ:

فأدناها: الارتباطُ الواقع بين المسلمين، وحدَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم البرَّ فيما بينهم بخمس، فقال: " حق المسلم على المسلم خمس: ردُّ السلام، وعيادةُ المريض، واتباع الجنائز، وإجابة الدعوة، وتشميت العاطس" وفي رواية: ستةٌ: السادسة: " إذا استنصحك فانصَحْ له" وقال صلى الله عليه وسلم: " أطعموا الجائع، وفُكُّوا العانيَ" يعني الأسير؛ والسر في ذلك: أن هذه الخمس، أوالست: خفيفةُ المؤنةِ، مورثةٌ للألفة.

ثم الارتباط الواقع بين أهل الحي والجيران والأرحام: فتتأكد هذه الأشياء فيما بينهم، وتتأكد التعزيةُ، والتهنئة، والزيارة، والمهاداة؛

وأوجب النبي صلى الله عليه وسلم أمورًا يتقيدون بها، أشاء وا أم أبَوا، كقوله صلى الله عليه وسلم: " من ملك ذَارَحِمٍ مَحْرَمٍ فهو حر" وكتابِ الديات.

ثم الارتباط الواقع بين أهل المنزل، من الزوجة، وما ملكت يمينُه: أما الزوجة: فقد ذكرنا البر معها. وأما ما ملكتِ اليمينُ: فجعل النبي صلى الله عليه وسلم بِرَّه على مرتبتين: إحداهما واجبة، يلزمهم، أشاء وا أم أبَوا، والثانية نَدَبَ إليها، وحثَّ عليها من غير إيجاب.

أما الأول: فقال صلى الله عليه وسلم: " للمملوك طعامُه، وكسوتُه، ولا يُكلَّف من العمل إلا ما يُطيق"

وذلك: أنه مشغول بخدمته عن الاكتساب، فوجب أن تكونَ كفايتُه عليه.

وقال صلى الله عليه وسلم: " من قذف مملوكَه، وهو بريءٌ مما قال: جُلد يومَ القيامة" وقال عليه السلام: " من جَدَّع عبده، فالعبد حر عليه"

أقول: وذلك: أن إفساد ملكه عليه مَزْجَرةٌ عن أن يفعل ما فعل.

وقال صلى الله عليه وسلم: " لايُجلَد فوق عشرِ جَلَدَاتٍ، إلا في حد من حدود الله"

أقول: وذلك سدٌّ لباب الظلم، والإمعانِ في التعزير زيادةً على الحد، أو المرادُ النهيُ عن أن يُعاقِب في حق نفسِه أكثر من عشر جلدات، كترك ما أُمر به، ونحوِ ذلك؛ والمرادُ بالحدِّ: الذنبُ المنهي عنه لحق الشرع، وهو قول القائل: أصبتُ حدًّا؛ وأُرى أن هذا الوجه أقربُ، فإن الخلفاء لم يزالوا يعزِّرون أكثر من عشر في حقوق الشرع.

وأما الثانية: فقوله صلى الله عليه وسلم: " إذا صنع لأحدكم خادمُه طعامَه، ثم جاء به وقد وَلِيَ حَرَّه ودخانَه، فَلْيُقعِدْ معه، فليأكل، فإن كان الطعام مَشْفُوهًا قليلاً فليضع في يده منه أُكلة أو أكلتين" وقولُه صلى الله عليه وسلم: " من ضرب غلامًا له حدًّا لم يأته، أو لَطَمه، فإن كفارتَه أن يعتقه" وقوله صلى الله عليه وسلم: " إذا ضرب أحدُكم خادمَه، فذكر الله فليمسك"

ترجمہ: اور وہ یعنی دس کوڑوں سے زیادہ کی ممانعت: ظلم کا اور حد پر یعنی دس کوڑوں پر زیادتی کرتے ہوئے تعزیر (گوشمالی) میں دور تک جانے کا سدّ باب ہے (یہ پہلا مطلب ہے) یا مراد اس بات کی ممانعت ہے کہ آقا سزا دے اپنے کسی حق کے لئے دس کوڑوں سے زیادہ، جیسے اس کام کو نہ کرنا جس کا غلام کو حکم دیا گیا ہے، اور اس کے مانند (یہ دوسرا مطلب ہے) اور حد سے مراد: وہ جرم ہے جس سے شریعت کے حق کی بنا پر روکا گیا ہے، اور وہ قائل کا قول ہے: "میں نے جرم کیا ہے" —— اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ وجہ (دوسرا مطلب) اقرب (الی الصواب) ہے۔ پس بیشک خلفاء برابر سزا دیا کرتے تھے حقوق شرع میں یعنی دیگر جرائم میں دس سے زیادہ کوڑوں کی۔

نوٹ: حدیث: من جدَّع عبدَه: فالعبد حر عليه: ان لفظوں سے نہیں ہے۔ اس لئے شرح میں اس کے ہم معنی حدیث ذکر کی گئی ہے۔

☆ ☆ ☆

غلام آزاد کرنے کی ایک خاص فضیلت کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے کوئی مسلمان غلام آزاد کیا تو اللہ تعالیٰ اس غلام کے بدلے اس کے ایک ایک عضو کو جہنم سے آزاد کریں گے" (مشکوۃ حدیث ۳۳۸۲)

تشریح: مسلمان غلام کو آزاد کرنے میں دو باتیں ہیں: ایک: اس میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہے یعنی وہ آزاد ہو کر جماعت مسلمین میں شامل ہوگا اور جماعتی کاموں (جہاد، تحصیل علم وغیرہ) میں مشغول ہوگا۔ دوم: یہ ایک مسلمان کو غلامی کی قید سے رہائی دلانا ہے، اس لئے جہنم سے رستگاری کی شکل میں اس کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

عتق متجزی نہ ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے غلام میں اپنے کسی حصہ کو آزاد کیا تو وہ سارا آزاد کیا جائے گا اگر اس کے پاس (اتنا) مال ہو (کہ وہ دوسرے شریک کے حصہ کا ضمان ادا کر سکے) (مشکوۃ حدیث ۳۳۸۹)

تشریح: عتق میں عدم تجزی کی وجہ اسی مضمون کی ایک دوسری روایت میں صراحۃً وارد ہوئی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے غلام میں اپنا حصہ آزاد کیا۔ نبی ﷺ سے اس بات کا تذکرہ کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کا کوئی شریک نہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹۷) یعنی آزاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اللہ کے لئے کر دیا۔ پس یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے کہ اس میں کوئی حصہ دار رہے۔

ذی رحم محرم کی آزادی کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے ذی رحم محرم کا مالک ہوا تو وہ آزاد ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹۳)

تشریح: یہ آزادی صلہ رحمی کی بنا پر ہے۔ صلہ رحمی اگرچہ مستحب ہے، مگر اس کے بعض افراد کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر واجب کیا ہے، خواہ لوگ چاہیں یا نہ چاہیں پس ذی رحم محرم ملکیت میں آتے ہی آزاد ہو جائے گا۔ کیونکہ مثال کے طور پر ماں یا باپ کا مالک ہونا، اور اس سے غلاموں کی طرح خدمت لینا بڑی جفا (زیادتی) ہے۔

ام ولد کی آزادی کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی کی باندی اس سے بچہ جنے تو وہ اس کے مرے پیچھے آزاد ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۹۴)

تشریح: ام ولد کی آزادی بچہ کے ساتھ حسن سلوک کی بنا پر ہے۔ کیونکہ مولیٰ کی موت کے بعد اگر وہ آزاد نہیں ہوگی تو کسی اور کی ملکیت میں جائے گی۔ اور یہ بات بچہ کے لئے ننگ و عار کی ہے کہ اس کی ماں کا اس کے باپ کے علاوہ کوئی اور مالک ہو۔

بھاگنے کی حرمت کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو نسا غلام بھاگا تو یقیناً اس کی ذمہ داری ختم ہوگئی'' (مشکوۃ حدیث ۳۳۵۰)

تشریح: غلام پر مولیٰ کی خدمت واجب ہے، اور بھاگنا حرام ہے۔ اگر کوئی غلام مولیٰ کے پاس سے بھاگ گیا تو اس کی جان کی حفاظت و صیانت کی مولیٰ کی ذمہ داری ختم ہوگئی۔ اب وہ جانے اس کا کام! پس بھاگنا اس لئے حرام ہے کہ اس کی جان محفوظ رہے۔

غیر مولیٰ سے موالات (دوستی) کی حرمت کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "من ادَّعی إلی غیر أبیه، أو تولّی غیر موالیه فعلیه لعنة الله والملائکة والناس أجمعین، لا یُقبل منه صَرْفٌ ولا عدل: جس نے خود کو غیر باپ کی طرف منسوب کیا یا اپنے آزاد کرنے والے آقاؤں کے علاوہ سے تعلق قائم کیا تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی پھٹکار ہے! اس کی نہ کوئی فرض عبادت قبول کی جائے گی، نہ نفل! (مشکوۃ حدیث ۲۷۲۸ باب حرم المدینة، کتاب المناسك)

تشریح: آزاد شدہ غلام یا باندی پر حرام ہے کہ وہ اپنے آقاؤں کے علاوہ سے موالات (دوستی) کرے۔ کیونکہ وَلاء بھی نسبی رشتہ کی طرح ایک رشتہ ہے۔ پس جیسے خود کو غیر باپ کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، غیر معتِق سے موالات بھی جائز نہیں۔ ایسا کرنا کفرانِ نعمت ہے۔

[۱] قال صلی الله علیه وسلم: " من أعتق رقبةً مسلمةً: أعتق الله بکل عضو منه عضوًا من النار"

أقول: العتق: فیه جمعُ شملِ المسلمین وفَكُّ عانیهم، فجوزی جزاءً وفاقًا.

[۲] قال صلی الله علیه وسلم: " من أعتق شِقْصًا فی عبد: أُعتق کلُّه، إن کان له مال"

أقول: سببه: ما وقع التصریح به فی نفس الحدیث، حیث قال علیه السلام: " لیس لله شریك" یرید أن العتق جَعْلُه لله، ولیس من الأدب أن یبقی معه مِلكٌ لأحد.

[۳] قال صلی الله علیه وسلم: "من ملك ذارَحِمٍ مَحْرَمٍ فهو حر"

أقول: السبب فیه صلة الرحم، فأوجب الله تعالی نوعًا منها علیهم، أشاء وا أم أَبَوا؛ وإنما خَصَّ هذا: لأن ملکه، والتصرفَ فیه، واستخدامَه بمنزلة العبید: جفاءٌ عظیم.

[٤] قال صلی الله علیه وسلم: " إذا ولدتْ أمةُ الرجل منه، فهی معتَقَةٌ عن دُبُرٍ منه"

أقول: السر فیه: الإحسان إلی الولد لئلا یملك أمَّه غیرُ أبیه، فیکون علیه عارٌ من هذه الجهة.

[٥] وأوجب علی العبد خدمةَ المولی، وحَرَّمَ علیه الإباق، قال صلی الله علیه وسلم: " أیُّما عبدٍ أبقَ فقد برئتْ منه الذِّمَّةُ"

[٦] وحَرَّمَ علی المعتَقِ أن یُوَالِیَ غیرَ موالیه.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: الشَّمْل: اجتماعیت، شیرازہ جَمْعُ الشَّمْل: شیرازہ بندی...... العانی: قیدی...... الشِقْص: کسی چیز کا ٹکڑا، حصہ...... میں کہتا ہوں: اس کا سبب یعنی سارا غلام آزاد ہونے کی وجہ: وہ ہے جس کی صراحت آئی

ہے اسی (مضمون کی) حدیث میں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کا کوئی ساجھی نہیں'' آپؐ مراد لے رہے ہیں کہ آزاد کرنا: غلام کو اللہ کے لئے گردانتا ہے۔ اورادب (سلیقہ مندی) میں سے یہ بات نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کے لئے ملکیت باقی رہے..... بمنزلة العبيد: غلاموں کی طرح۔

☆ ☆ ☆

والدین کے حق کی حرمت

اس باب کی سب سے اہم بات: والدین کے حق کی حرمت وعظمت ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''بڑے گناہوں میں سے: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی قسم کھانا ہے'' (مسند احمد ۳: ۴۹۵)

اور والدین کے ساتھ نیک سلوک چند باتوں کے ذریعہ تکمیل پذیر ہوتا ہے: ۱- والدین کے پاس مال نہ ہو تو ان کو نان ونفقہ اور کھانا کپڑا دینا ۲- اگر والدین جسمانی خدمت کے محتاج ہوں تو ان کی خدمت کرنا ۳- جب باپ بلائے تو حاضر ہونا ۴- جب باپ کوئی حکم دے تو اس کی تعمیل کرنا، بشرطیکہ وہ کوئی گناہ کی بات نہ ہو ۵- بکثرت والدین کے پاس آمد ورفت رکھنا ۶- ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرنا ۷- ان کو اُف نہ کہنا ۸- ان کو نام لے کر نہ پکارنا ۹- ان کے پیچھے چلنا ۱۰- کوئی ان کی غیبت کر رہا ہو یا ستا رہا ہو تو مدافعت کرنا ۱۱- اپنی مجلس میں باپ کی تعظیم کرنا ۱۲- ان کے لئے دعائے مغفرت کرنا۔

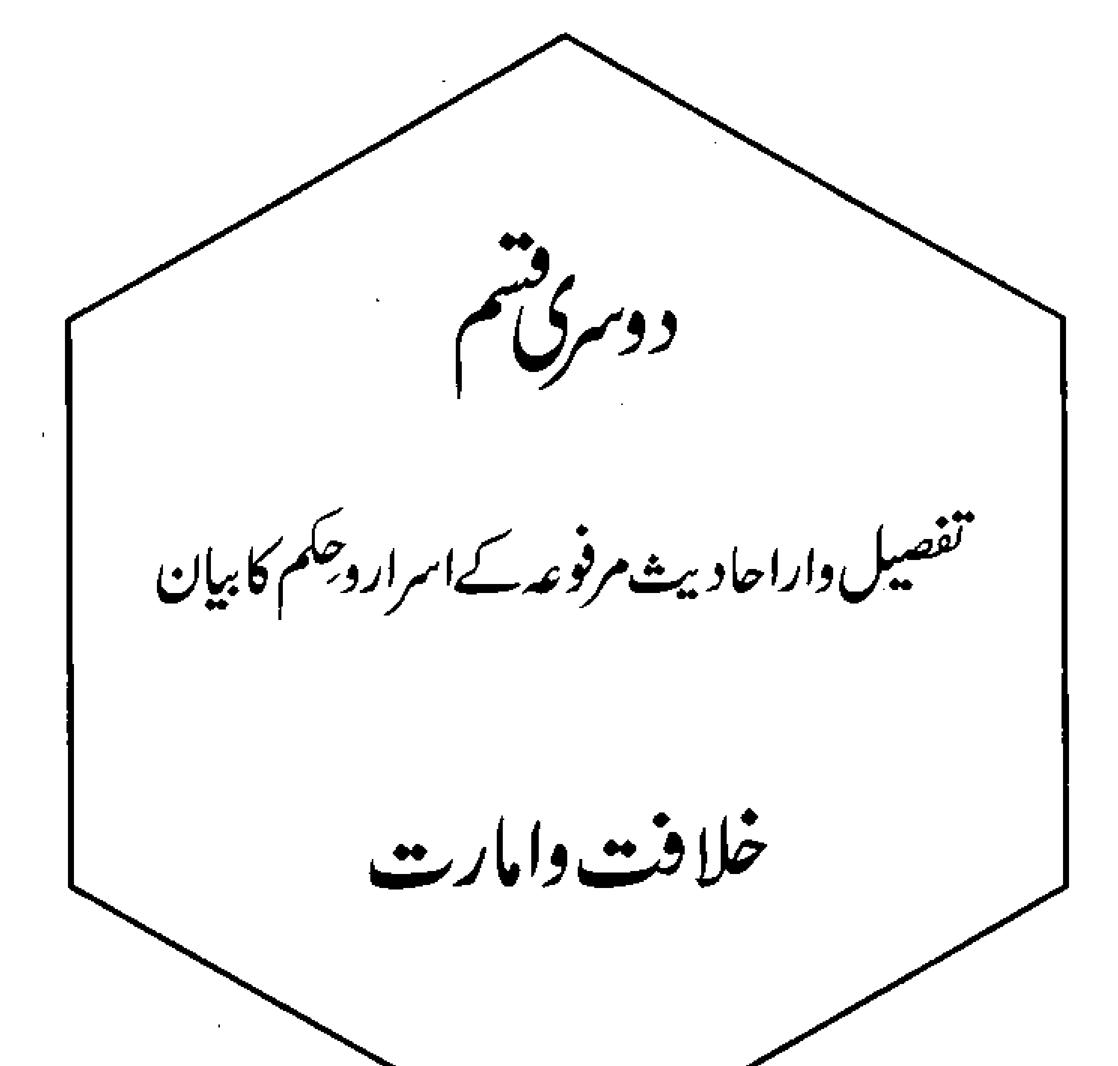
وأعظمُ ذلك كلِّه حرمةُ حق الوالدين؛ قال صلى الله عليه وسلم: ''من أكبر الكبائر عقوق الوالدين''

وبِرُّهما يَتِمُّ بأمور: الإطعام، والكسوةُ، والخدمة إن احتاجا، وإذا دعاه الوالد أجاب، وإذا أمره أطاع، مالم يأمر بمعصية، ويُكثر زيارتَه، ويتكلم معه بالكلام اللَّيِّنِ، ولا يقول أف، ولا يدعوه باسمه، ويمشي خلفَه، ويذب عنه من اغتابه، أو آذاه، ويوقِّره في مجلسه، ويدعو له بالمغفرة، والله أعلم.

ترجمہ: واضح ہے..... إن احتاجا کی قید اطعام وکسوۃ اور خدمت تینوں کے ساتھ ہے۔

بحمدہ تعالیٰ جمعہ ۹ رجمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ مطابق ۸ راگست ۲۰۰۳ء کو ''نکاح وطلاق'' کی شرح مکمل ہوئی۔





دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

خلافت وامارت

باب (۱) نظام حکومت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) خلافت کا بیان

باب (۳) مظالم کا بیان

باب (۴) حدود کا بیان

باب (۵) نظام عدالت کا بیان

باب (٦) جہاد کا بیان

باب ــــــ ۱

نظام حکومت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

پہلی بات: سربراہِ مملکت کی ضرورت

جماعتِ مسلمین کے لئے کوئی خلیفہ (سربراہ) ہونا ضروری ہے۔ چند ایسی مصلحتیں ہیں جو خلیفہ کے وجود ہی سے تکمیل پذیر ہوسکتی ہیں۔ وہ مصلحتیں اگرچہ بہت ہی زیادہ ہیں مگر دو قسمیں ان کا احاطہ کرتی ہیں:

پہلی قسم: وہ مصلحتیں جو نظام مملکت سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی اگر مسلمانوں پر دشمن حملہ آور ہو، اور ان کو زیر کرنا چاہے تو اس کو ہٹانا، مظلوم سے ظالم کو روکنا، اور جھگڑوں کے فیصلے کرنا، وغیرہ۔ تفصیل رحمۃ اللہ (۱: ۳۶۲) میں گذر چکی ہے۔

دوسری قسم: وہ مصلحتیں جو ملت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دین اسلام کی دوسرے ادیان کے مقابلہ میں شان اسی وقت بلند ہوسکتی ہے جب مسلمانوں کا کوئی خلیفہ ہو، اور وہ دو کام کرے:

ایک: اس شخص کو سخت سرزنش کرے جو ملت سے نکل جائے، اور ایسے کام کرنے لگے جو صریح حرام ہیں، جیسے سود لینا، چوری کرنا وغیرہ۔ یا وہ کام چھوڑ دے جو قطعی فرض ہیں، جیسے نماز پڑھنا، زکوۃ دینا وغیرہ۔

دوم: دیگر ادیان والوں کو زیر کرے اور ان سے اس طرح جزیہ وصول کرے کہ وہ بذاتِ خود ذلت سے دیں۔

اگر ایسا خلیفہ نہیں ہوگا تو سب لوگ مساوی ہوجائیں گے، گیہوں اور گھن برابر ہوجائیں گے۔ اور ایک فریق کی دوسرے فریق پر فوقیت ظاہر نہیں ہوگی، اور سرکشوں کو لگام دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اور نبی ﷺ نے مذکورہ دونوں قسم کی مصلحتوں کو چار عنوانوں میں یعنی مظالم، حدود، قضایا اور جہاد کے عنوانات میں جمع کیا ہے۔ یہی اس مبحث کے ابواب ہیں۔

﴿من أبواب سياسة المُدُن﴾

اعلم: أنه يجب أن يكون في جماعة المسلمين خليفةٌ، لمصالحَ لاتتم إلا بوجودِه، وهي كثيرة جدًا، يجمَعُها صنفان:

أحدهما: ما يرجع إلى سياسة المدينة: من ذَبِّ الجنود التي تَغْزُوهم وتَقْهرهم، وكفِّ

الظالم عن المظلوم، وفصلِ القضايا، وغير ذلك، وقد شرحنا هذه الحاجاتِ من قبلُ.

وثانيهما: ما يرجع إلى الملة: وذلك: أن تنويهَ دينِ الإسلام على سائر الأديان، لا يُتصور إلا بأن يكون في المسلمين خليفة: يُنكر على من خرج من الملة، وارتكب ما نَصَّتْ على تحريمه، أو تَرَكَ ما نَصَّتْ على افتراضه: أشدَّ الإنكار، ويذلِّلُ أهلَ سائر الأديان، ويأخذُ منهم الجزيةَ عن يدوهم صَاغرون، وإلا كانوا متساوِيْنَ في المرتبة، لا يظهر فيهم رجحانُ إحدى الفرقتين على الأخرى، ولم يكن كابحٌ يَكْبَحُهُمْ عن عُدوانهم.

والنبي صلى الله عليه وسلم جمع تلك الحاجاتِ في أبواب أربعة: باب المظالم، وباب الحدود، وباب القضاء، وباب الجهاد.

ترجمہ: نظام مملکت کے سلسلہ کی اصولی باتیں: یہ بات جان لیں کہ جماعت مسلمین میں کوئی خلیفہ ہونا ضروری ہے، چند ایسی مصلحتوں کی وجہ سے جو تکمیل پذیر نہیں ہوتیں مگر خلیفہ کے وجود سے۔ اور وہ مصلحتیں بہت ہی زیادہ ہیں، جن کو دو قسمیں جمع کرتی ہیں: ان میں سے ایک وہ مصلحتیں ہیں جو نظام حکومت کی طرف لوٹتی ہیں یعنی ان لشکروں کو ہٹانا جو مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، اور ان کو زیر کرنا، اور مظلوم سے ظالم کو روکنا، اور مقدمات کے فیصلے کرنا، اور ان کے علاوہ باتیں۔ اور ہم نے ان مصلحتوں کی وضاحت کی ہے قبل ازیں —— اور ان میں سے دوسری وہ مصلحتیں ہیں جو ملت (دین) کی طرف لوٹتی ہیں۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ دیگر ادیان پر دین اسلام کی شان بلند کرنا متصور نہیں مگر بایں طور کہ مسلمانوں میں ایسا خلیفہ ہو جو: (۱) اس شخص پر نکیر کرے جو ملت سے نکل جاتا ہے، اور اُس بات کا ارتکاب کرتا ہے جس کے حرام ہونے کی ملت (دین) نے صراحت کی ہے۔ یا اس کام کو چھوڑتا ہے جس کے فرض ہونے کی ملت نے صراحت کی ہے: سخت نکیر کرنا (۲) اور دیگر ادیان والوں کو زیر کرے، اور ان سے جزیہ وصول کرے، ان کے ہاتھ سے درانحالیکہ وہ ذلیل ہونے والے ہوں —— ورنہ سب لوگ مرتبہ میں مساوی ہوں گے۔ ان میں ظاہر نہیں ہوگی دو فرقوں میں سے ایک کی برتری دوسرے پر (اس کا تعلق (۲) کے ساتھ ہے) اور کوئی لگام کھینچنے والا نہیں ہوگا جو ان کو ان کی سرکشی سے روکے (اس کا تعلق (۱) کے ساتھ ہے) —— اور نبی ﷺ نے ان حاجتوں کو (جو دو قسموں میں گھیری گئی ہیں) چار ابواب میں جمع کیا ہے: مظالم کا باب، حدود کا باب، قضایا کا باب اور جہاد کا باب۔

لغات: غَزَ العَدُوّ (ن) غَزْوًا: لڑنے کے لئے دشمن کی طرف جانا اور لوٹنے کے لئے ان کے ملک میں گھسنا، حملہ آور ہونا ...... قَهَرَه (ف) قَهْرًا: کسی پر غالب ہونا، مغلوب وزیر کرنا ...... كَبَحَ (ف) الدابة: چوپائے کو روکنے کے لئے لگام کھینچنا۔ کابح: لگام کھینچنے والا۔

تصحیح: یذلل مطبوعہ میں یذل تھا، تصحیح مطبوعہ صدیقی اور مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔



دوسری بات: کلیات کے انضباط کی ضرورت

شریعت نے خلافت وامارت کے مذکورہ چار ابواب (مظالم، حدود، قضایا اور جہاد) کے اصول وکلیات کو منضبط کیا ہے۔ اور جزئیات کو خلفاء کی آراء پر چھوڑ دیا ہے۔ اور اجمالاً یہ ہدایت کی ہے کہ خلفاء جماعتِ مسلمین کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔

اور اصول وکلیات کے انضباط کی ضرورت بچند وجوہ پیش آئی ہے:

پہلی وجہ —— خلفاء کو ضوابط کا پابند بنانا —— بارہا ایسا ہوتا ہے کہ حکومت کا ذمہ دار ظالم وجابر شخص ہوتا ہے۔ وہ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ حق کی پیروی نہیں کرتا۔ ایسے امراء لوگوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اور لوگوں کے حق میں ان کا ضرر ان کے نفع سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ اور جب ایسے خلیفہ کو کسی بات پر ٹوکا جاتا ہے تو وہ اپنے فعل کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس نے برحق کام کیا ہے۔ اور ملکی مصلحت بھی وہی ہے جو اس نے کیا ہے۔ ایسے خلیفہ کو قواعد وضوابط کا پابند بنانا ضروری ہے تاکہ ان کی خلاف ورزی پر نکیر کی جاسکے، اور ان قواعد کے ذریعہ اس کی داروگیر کی جاسکے۔ اور لوگ خلیفہ کے خلاف دلیل قائم کرنا چاہیں تو ان اصولِ موضوعہ سے قائم کرسکیں۔

دوسری وجہ —— خلیفہ کے خلاف عنصر پیدا نہ ہو —— خلیفہ کے لئے دو باتیں ضروری ہیں:

ایک: کسی ظالم کو سزا دے تو پہلے لوگوں کے سامنے اس کے ظلم کو صحیح دلائل سے ثابت کرے۔ اور یہ بھی ثابت کرے کہ جو سزا اس کو دی جارہی ہے وہ ضرورت کی مقدار سے زائد نہیں ہے۔

دوم: نزاعات کا جو فیصلہ کرے اس کے بارے میں بھی یہ ثابت کرے کہ اس نے حق کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔

اگر یہ دو باتیں نہیں ہونگی تو خلیفہ سے لوگوں کو اختلاف پیدا ہوگا۔ اور جس شخص کو سزا دی گئی ہے اور جس کے خلاف فیصلہ ہوا ہے: وہ اور اس کے حمایتی اپنے دلوں میں ایسا غیظ وغضب پائیں گے جو بغاوت تک پہنچائے گا۔ وہ لوگ خلیفہ کے خلاف اپنے دلوں میں کینہ کپٹ چھپائیں گے، اور اس معاملہ میں خود کو حق بجانب سمجھیں گے۔ اور یہ سخت خرابی کی بات ہے۔

تیسری وجہ —— خلفاء کے فیصلے ایک نہج پر صادر ہوں —— بہت سے خلفاء یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ نظام حکومت کے لئے کیا بات مناسب ہے؟ پس وہ اجتہاد کرتے ہیں اور دائیں بائیں ڈگیں بھرتے ہیں۔ یعنی غلط سلط فیصلے کرتے ہیں۔ اور خلفاء کے مزاج مختلف ہوتے ہیں، مثلاً:

۱— کوئی خلیفہ کڑا سخت مزاج ہوتا ہے: وہ جرم کی انتہائی سزا کو بھی معمولی سمجھتا ہے۔

۲— کوئی سہل گیر نرم مزاج ہوتا ہے: وہ تھوڑی سزا کو بھی بہت سمجھتا ہے۔

۳— کوئی خلیفہ کان کا کچا اور ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہوتا ہے: وہ ہر اس دعویدار کی بات مان لیتا ہے جو اس تک اپنی بات پہنچادیتا ہے۔

۴— کوئی حاکم ضدی اڑیل ہوتا ہے: وہ لوگوں کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرتا ہے۔
اور نظام حکومت کے سلسلہ کی تمام جزئیات کا احاطہ ممکن نہیں۔ یہ محال جیسی بات ہے۔ پس اصول وکلیات کا انضباط ضروری ہے تا کہ خلفاء کے فیصلے ایک نہج پر صادر ہوں۔ اور اختلاف ہو تو فروع میں ہو، اصول میں نہ ہو۔ کیونکہ فروع میں اختلاف: اصول میں اختلاف سے سہل ہے۔

چوتھی وجہ — ارتفاقات کو عبادت بنانا — نظام حکومت بظاہر ایک دنیوی معاملہ ہے۔ اگر اس کے لئے بھی شریعت قواعد وضوابط وضع کرے گی تو وہ نماز روزے کی طرح عبادت بن جائیں گے۔ ان ارتفاقات (دنیوی معاملات) کے ذریعہ بھی اللہ کا تقرب حاصل کیا جاسکے گا۔ اور وہ بھی دین کی دعوت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ صحابہ کے نظام حکومت سے — جو شریعت کے اصول کے مطابق تھا — متاثر ہو کر ایک خلقت مسلمان ہوئی ہے۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ عیاش اور درندہ خو بادشاہوں کے لئے بھی اور نیک سیرت انصاف پرور حاکموں کے لئے بھی نظام حکومت کے سلسلہ میں قواعد وضوابط ضروری ہیں۔ ورنہ اول: رعایا کا ناس ماریں گے، اور ثانی کے کونسے فیصلے ظلم کی حدود کو چھو گئے ہیں ان کا پتہ چلانا مشکل ہوگا۔

ملحوظہ: نظام حکومت کے سلسلہ میں آئندہ ابواب میں جو اصول وکلیات بیان کئے جائیں گے ان کے علاوہ پہلے جو قانون سازی اور مقادیر کے انضباط کے اصول بیان کئے گئے ہیں: امراء وحکام کے لئے ضروری ہے کہ ان کو بھی پیش نظر رکھیں۔ یہ مباحث رحمۃ اللہ جلد دوم صفحہ ۱۳۸ تا ۲۲۶ میں پانچ ابواب میں بیان ہوئے ہیں۔

ثم وقعت الحاجةُ إلى ضبط كلياتِ هذه الأبواب، وتركِ الجزئيات إلى رأى الأئمة، ووَصِيَّتِهم بالجماعة خيرًا، وذلك لوجوه:

منها: أن متولى الخلافة كثيرًا ما يكون جائرًا ظالمًا، يتبع هواه، ولا يتبع الحق، فَيُفْسِدُهم، وتكون مَفْسَدَتُه عليهم أشدَّ مما يُرْجى من مصلحتهم، ويَحتجُّ فيما يفعل أنه تابع للحق، وأنه رأى المصلحة في ذلك؛ فلا بد من كلياتٍ يُنْكَرُ على من خالفها، ويُؤاخَذُ بها، ويرجع احتجاجهم عليه إليها.

ومنها: أن الخليفة يجب أن يصحِّحَ على الناس ظلمَ الظالم، وأن العقوبة ليست زائدةً على قدر الحاجة؛ ويُصَحِّحَ في فصل القضايا: أنه قضى بالحق، وإلا كان سببا لاختلافهم عليه، وأن يجد الذى كان الضررُ عليه وأولياؤُه في أنفسهم وَحَرًا، راجعًا إلى غَدَرٍ، ويضمروا عليه حِقدًا يرون فيه أن الحق بأيدهم، وذلك مفسدة شديدة.

ومنها: أن كثيرًا من الناس لايدركون: ماهو الحق في سياسة المدينة؟ فيجتهدون فَيُخْطِئُوْن

يـمينـا وشـمـالاً: فـمـن صُلْبٍ شديدٍ يرى البالغ في المزجرة قليلاً، ومن سَهْلٍ لَيِّنٍ يرى القليل كثيـرًا، ومـن أُذُنٍ إِمَّعَةٍ يرى كلَّ ما أنهى إليه المدعي حقا، ومن ممتنعٍ كَوُّوْدٍ يظن بالناس ظنونا فـاسـدة؛ ولا يمكن الاستقصاءُ فإنه كالتكليف بالمحال، فيجب أن تكون الأصولُ مضبوطةً، فإن اختلافهم في الفروع أخفُّ من اختلافهم في الأصول.

ومنها: أن القوانين إذا كانت ناشئة من الشرع: كانت بمنزلة الصلاة والصيام في كونها قُربةً إلى الحق، وأَلْسِنَةً تُذَكِّرُ الحقَّ عند القوم.

وبالجملة: فلا يمكن أن يفوَّض الأمر بالكلية إلى أولي أنفسٍ شهوية أو سبعية، ولا يمكن معرفةُ العصمة والحفظ عن الجور في الخلفاء؛ والمصالحُ التي ذكرناها في التشريع وضبط المقادير كلُّها مُتَأَتِّيَةٌ ههنا، والله أعلم.

ترجمہ: پھر ضرورت پیش آئی اُن ابواب اربعہ کے کلیات کو منضبط کرنے کی، اور جزئیات کو خلفاء کی رائے پر چھوڑنے کی، اور ان کو جماعتِ مسلمین کے ساتھ بہتر برتاؤ کرنے کی وصیت کرنے کی — اور وہ بات یعنی کلیات کے انضباط کی ضرورت بچند وجوہ ہے: ازانجملہ: یہ ہے کہ خلافت کا ذمہ دار بارہا ظالم جفا پیشہ ہوتا ہے۔ اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے، اور حق کی پیروی نہیں کرتا، پس وہ رعایا کو بگاڑ دیتا ہے۔ اور لوگوں کے حق میں خلفاء کا بگاڑ زیادہ سخت ہوتا ہے لوگوں کی اس مصلحت سے جس کی امید باندھی گئی ہے۔ اور وہ حجت پیش کرتا ہے اس کام میں جو وہ کرتا ہے کہ وہ حق کی تابعداری کرنے والا ہے، اور یہ کہ اس نے اس میں مصلحت دیکھی ہے۔ پس ایسے قواعد کلیہ ضروری ہیں جن کی مخالفت کرنے والے پر نکیر کی جائے، اور جن کے ذریعہ اس کی داروگیر کی جائے۔ اور لوٹے لوگوں کا دلیل پکڑنا خلیفہ کے خلاف ان کلیات کی طرف — اور ازانجملہ: یہ ہے کہ خلیفہ: (۱) ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ظالم کے ظلم کو صحیح ثابت کرے۔ اور یہ بات ثابت کرے کہ جو سزا اس کو دی جارہی ہے وہ ضرورت کی مقدار سے زیادہ نہیں ہے (۲) اور صحیح ثابت کرے جھگڑوں کے فیصلوں میں کہ اس نے حق کے مطابق فیصلہ کیا ہے — ورنہ یہ باتیں خلیفہ سے لوگوں کے اختلاف کا سبب ہونگی، اور اس بات کا سبب ہونگی کہ پائے وہ شخص جسے نقصان پہنچا ہے، اور اس کے حمایتی اپنے دلوں میں ایسا غیظ وغضب جو بغاوت کی طرف لوٹنے والا ہے۔ اور وہ دلوں میں پوشیدہ رکھیں خلیفہ کے خلاف کینہ۔ اس کینہ میں وہ خیال کریں کہ حق ان کی جانب ہے یعنی ان کا کینہ رکھنا درست ہے۔ اور یہ سخت خرابی کی بات ہے — اور ازانجملہ: یہ ہے کہ بہت سے لوگ (خلفاء) اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں کہ نظام حکومت میں برحق بات کیا ہے؟ پس وہ اجتہاد کرتے ہیں۔ پس وہ دائیں اور بائیں قدم اٹھاتے ہیں — پس (۱) کوئی سخت مضبوط ہوتا ہے جو انتہائی سزا کو بھی معمولی سمجھتا ہے (۲) اور کوئی آسان نرم ہوتا ہے جو تھوڑی سزا کو بھی بہت سمجھتا ہے (۳) اور کوئی کان کا کچا ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہوتا ہے جو ہر اس بات کو جو مدعی اس تک پہنچاتا ہے حق سمجھ لیتا

ہے(۴)اور کوئی ضدی اڑیل ہوتا ہے جو لوگوں کے بارے میں فاسد گمان باندھتا ہے —— اور احصاء ممکن نہیں یعنی نظام حکومت کے سلسلہ کی تمام جزئیات بیان نہیں کی جاسکتیں۔ کیونکہ وہ محال کا حکم دینے کی طرح ہے۔ پس ضروری ہے کہ اصول منضبط ہوں۔ اس لئے کہ خلفاء کا فروع میں اختلاف ہلکا ہے ان کے اصول میں اختلاف سے —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ قوانین: جب شریعت سے پیدا ہونے والے ہوتے ہیں یعنی وہ قوانین اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ ہوتے ہیں تو وہ بمنزلہ نماز روزہ کے ہوتے ہیں، ان کے اللہ کی طرف نزدیکی میں، اور ان کے ایسی زبانیں ہونے میں جو قوم کو اللہ کی یاد دلاتے ہیں —— اور حاصل کلام: پس ممکن نہیں کہ معاملہ بالکلیہ سپرد کردیا جائے عیاش درندہ خو نفوس (خلفاء) کی طرف، اور ممکن نہیں خلفاء میں ظلم سے عصمت وحفاظت کا پہچاننا —— اور وہ مصلحتیں جو ہم نے قانون سازی اور مقادیر شرعیہ کے انضباط کے سلسلہ میں ذکر کی ہیں وہ سب یہاں حاصل ہونے والی ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: صَحَّحَہ: صحیح قرار دینا، درست ثابت کرنا...... خطا(ن)خطوًا: چلنا، قدم اٹھانا۔ ڈگ بھرنا...... المَزْجَرَۃ: زجر کا ذریعہ، بھگانے اور دھتکارنے کا ذریعہ...... الأُذُن: بات کو سن کر مان لینے والا، کان کا کچا...... الإِمَّع: ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملانے والا، ضعیف الرائے...... أنْھیٰ إلیہ الخبرَ والکتابَ: پہنچانا...... الکَؤُود: اڑیل۔ عقبةٌ کَؤُوْدٌ: دشوار گذار گھاٹی۔

تصحیح: وأنہ رأی المصلحۃ مطبوعہ میں وأن إلخ تھا۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

باب —— ۲

خلافت کا بیان

خلافت کی تعریف حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ازالۃ الخفاء کے شروع میں یہ کی ہے: **ھی الرئاسۃُ العامّۃُ فی التَّصَدِّی لإقامۃ الدین: بإحیاء العلوم الدینیَّۃ، وإقامۃِ أرکان الإسلام، والقیام بالجھاد، وما یتعلَّق بہ من ترتیب الجیوش، والفرضِ للمُقاتِلۃ، وإعطاءِ ھم من الفَیْءِ، والقیامِ بالقضاء، وإقامۃ الحدود، ورفع المظالم، والأمر بالمعروف، والنھی عن المنکر، نیابۃً عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم** ترجمہ: خلافت: عمومی سربراہی ہے: اقامت دین کے لئے درپے ہونے میں: علوم دینیہ کو زندہ کرنے کے ذریعہ، ارکانِ اسلام کو برپا کرنے کے ذریعہ، جہاد کا اہتمام کرنے کے ذریعہ اور ان کاموں کے ذریعہ جو جہاد سے تعلق رکھتے ہیں: یعنی لشکروں کو تیار کرنے، مجاہدین کے لئے وظائف مقرر کرنے، ان کو مال غنیمت میں سے دینے، خصومات میں فیصلوں کا اہتمام کرنے، حدود قائم کرنے، ظلم وزیادتی کو دور کرنے، اچھے کاموں کا حکم دینے اور برے کاموں سے روکنے کے ذریعہ: نبی ﷺ کے نائب ہونے کی حیثیت سے۔

تفصیل: ملتِ اسلامیہ کے بارے میں یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت تمام خلقت کی طرف ہوئی

ہے۔ آپؐ نے بعثت کے بعد مخلوق کے ساتھ بہت سے معاملات وتصرفات کئے ہیں۔ ان معاملات میں جب ہم غور کرتے ہیں، اور جزئیات سے کلیات کی طرف، پھر کلیات سے ایک کلی کی طرف ـــــ جو سب کو شامل ہو ـــــ منتقل ہوتے ہیں، تو جنس عالی: اقامتِ دین منتج ہوتی ہے، جو تمام کلیات کو متضمن ہے۔ ان میں سے ایک کلی: علوم دینیہ کی اشاعت ہے یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم دینا، اور وعظ ونصیحت کرنا۔ دوسری کلی: ارکانِ اسلام کو قائم کرنا ہے۔ نبی ﷺ بذاتِ خود نمازوں کی امامت کرتے تھے، زکوتیں وصول کرتے تھے، اور ان کے مصارف میں خرچ کرتے تھے وغیرہ۔ اور آنحضرت ﷺ کا جہاد کو قائم کرنا، قبائل پر سرداروں کو مقرر کرنا، بڑے اور چھوٹے لشکروں کو بھیجنا، خصومات میں فیصلے کرنا، بلاد اسلامیہ میں قاضیوں کو مقرر کرنا، حدود کو قائم کرنا، اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا محتاج بیان نہیں۔ اور یہ سب اقامتِ دین کی جزئیات ہیں۔

پھر جب نبی ﷺ رفیق اعلی کی طرف منتقل ہوگئے تو مذکورہ تفصیل کے ساتھ دین کا قائم رکھنا ضروری ہوا۔ جو ایک ایسے شخص کو مقرر کرنے پر موقوف ہے، جو ان امور کا اہتمام عظیم کرے، ہر علاقہ میں اپنے نائب بھیجے، لوگوں کے احوال سے خبردار رہے، اس کے نائب اس کے حکم سے انحراف نہ کریں اور اس کے اشارہ پر چلتے رہیں۔ یہی شخص آنحضرت ﷺ کا خلیفہ اور آپ کا نائب ہے (ترجمہ وتلخیص ازالۃ الخفاء)

خلافتِ عامہ اور خاصہ: پھر خلافت کی دو قسمیں ہیں: عامہ اور خاصہ۔ خلافتِ عامہ: مذکورہ تفصیل کے مطابق عمومی سربراہی کا نام ہے۔ اس کا زمانۂ نبوت سے اتصال ضروری نہیں۔ اور خلافت خاصہ: خلفائے راشدین کی خلافت ہے۔ اور خلافت میں بنیادی بات یہ ہے کہ خلیفہ کے ذہن میں ملکیت کا کوئی تصور نہ ہو، وہ خلافت کو ایک امانت سمجھتا ہو۔ پھر اگر اس میں ملکیت کا تصور شامل ہوجائے تو وہ ملوکیت ہے۔ اور ملکیت کے تصور کے ساتھ ظلم وزیادتی بھی ہو تو وہ مُلکِ عَضُوض (کٹ کھنی حکومت) ہے اور کبھی سب پر خلافت کا اطلاق کیا جاتا ہے یعنی اسلامی حکومت کی سربراہی خلافت ہے، خواہ اس کی جو بھی نوعیت ہو۔

خلیفہ کے لئے ضروری اوصاف

خلیفہ: یعنی اسلامی حکومت کے سربراہ کے لئے درج ذیل اوصاف ضروری ہیں:

پہلا وصف: خلیفہ عاقل بالغ ہو، مجنون اور نابالغ نہ ہو۔ کیونکہ مجنون اور نابالغ اپنے معاملات میں بھی تصرف کا مُجاز نہیں۔ اس کے کاموں کی انجام وہی کے لئے ولی مقرر کیا جاتا ہے۔ پس وہ مسلمانوں کے جان ومال میں بدرجۂ اولی تصرف کا مجاز نہ ہوگا۔ نیز خلیفہ بنانے سے جو مقاصد مقصود ہیں: وہ بھی مجنون اور نابالغ کو خلیفہ بنانے سے حاصل نہیں ہوسکتے، اس لئے خلیفہ کا عاقل بالغ ہونا شرط ہے۔

دوسرا وصف: خلیفہ آزاد ہو، غلام نہ ہو۔ کیونکہ غلام: مقدمات میں گواہی دینے کے قابل نہیں، اور وہ عام لوگوں کی نظر میں ذلیل وحقیر ہوتا ہے۔ نیز اس پر اپنے آقا کی خدمت میں مشغول رہنا واجب ہے، پس وہ بھی مقاصدِ خلافت کی انجام دہی سے قاصر ہے، اس لئے خلیفہ کا آزاد ہونا شرط ہے۔

تیسرا وصف: خلیفہ مرد ہو، عورت نہ ہو۔ کیونکہ عورت عقل ودین میں کمزور ہوتی ہے۔ میدانِ جنگ کے لئے بے کار ہوتی ہے۔ اور مجالس ومحافل میں جانے کے قابل نہیں، اس لئے وہ حکومت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ بخاری کی روایت ہے کہ جب ایران کے لوگوں نے کسری کی بیٹی کو بادشاہ بنایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے امور کا ذمہ دار کسی عورت کو بنایا!'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۹۳ کتاب الامارۃ)

چوتھا وصف: خلیفہ بہادر ہو، بزدل نہ ہو۔ ذی رائے ہو، بے وقوف اور ناتجربہ کار نہ ہو۔ کیونکہ مہماتِ سلطنت کی انجام دہی کے لئے یہ اوصاف ضروری ہیں۔ خاص طور پر جہاد کا فریضہ: بزدل خلیفہ جہاد قائم نہیں کرسکتا۔ حالانکہ وہ مقاصدِ خلافت میں سب سے اہم مقصد ہے۔

پانچواں وصف: خلیفہ شنوا، بینا اور گویا ہو۔ بہرہ، اندھا اور گونگا نہ ہو۔ کیونکہ خلیفہ پر لازم ہے کہ جو حکم دے: ایسا واضح ہو کہ اس کا مقصد سمجھنے میں لوگوں کو اشتباہ نہ ہو۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ مدعی مدعی علیہ کو، مقر مقرلہ کو اور شاہد ومشہود کو پہچانے، اور ان لوگوں کے بیانات سنے۔ نیز خلیفہ پر لازم ہے کہ بلاد محروسہ میں قاضیوں اور حاکموں کو مقرر کرے اور لشکروں کو جنگ کی تربیت دے۔ اور یہ سب باتیں اعضاء مذکورہ کی درستگی کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے خلیفہ کا سمیع وبصیر اور متکلم ہونا شرط ہے۔

چھٹا وصف: خلیفہ ان لوگوں میں سے ہو: جس کی اور جس کی قوم کی بزرگی لوگوں نے تسلیم کر رکھی ہو، تاکہ لوگ اس کی فرمانبرداری سے نفرت نہ کریں۔

ساتواں وصف: خلیفہ کے بارے میں لوگوں کو اعتماد ہو کہ وہ نظامِ حکومت میں حق کی پیروی کرے گا۔ من مانی نہیں کرے گا۔

یہ سب اوصاف عقل کی راہ نمائی سے ثابت ہیں۔ اور دنیا کے تمام لوگ سربراہِ مملکت میں: ان کے شرط ہونے پر متفق ہیں۔ حالانکہ ان کے ملک ایک دوسرے سے دور ہیں۔ اور ان کے مذاہب مختلف ہیں۔ اور اس اتفاق کی وجہ یہ ہے کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ بادشاہ مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے: وہ ان اوصاف کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اگر لوگ مذکورہ اوصاف میں سے کسی وصف کی بادشاہ میں کمی دیکھتے ہیں تو وہ اس بادشاہ کو نامناسب تصور کرتے ہیں۔ اور اس کو ان کے دل ناپسند کرتے ہیں۔ اور اگر وہ خاموش رہتے ہیں تو غصہ کے ساتھ خاموش رہتے ہیں۔

اور ملتِ اسلامیہ نے خلافتِ نبوت یعنی خلافتِ راشدہ کے لئے چند اور اوصاف کا بھی لحاظ کیا ہے:

آٹھواں وصف: خلیفہ مسلمان، ذی علم (مجتہد) اور متقی ہو۔ کیونکہ ملی مصالح بالبداہت ان امور کے بغیر تکمیل پذیر نہیں



ہو سکتے۔ اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اور اس کی دلیل سورۃ النور کی آیت ۵۵ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ”اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کئے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا ان سے پہلے والوں کو حکومت دی تھی۔ اور جس دین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے نفع کے لئے جما دے گا۔ اور ان کے موجودہ خوف کو ضرور امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے۔ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو شخص ظہور وعدہ کے بعد ناشکری کرے گا وہی لوگ اطاعت سے باہر ہونے والے ہیں“

تفسیر: اس آیت کریمہ میں خطاب زمانۂ نبوت میں موجود لوگوں سے ہے۔ مِنکُم کا مصداقِ اولیں وہی ہیں۔ ان سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تم میں سے جو اعلیٰ درجہ کے نیک ہیں، ان کو نبی ﷺ کی وفات کے بعد، اللہ تعالیٰ حکومت عطا فرمائیں گے۔ اور ان کے ہاتھوں سے اسلام کو جماؤ نصیب ہوگا، اور دنیا میں امن وامان قائم ہوگا۔ چنانچہ نبی ﷺ کے ذریعہ جس حکومتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی تھی: وہ کام ابھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ آپؐ پردہ فرماگئے۔ حکومت کی تنظیم وتمکین خلفاء راشدین کے ہاتھوں مقدر تھی۔ حدیث میں جو خلفاء راشدین کے طریقوں کو مضبوط تھامنے کا حکم ہے وہ خاص طور پر جماعتی اور حکومتی نظم وانتظام کے بارے میں ہے۔ اس آیت میں خلفاء راشدین کی بڑی بھاری منقبت ہے۔ یہ وعدہ ان کے زمانہ میں پورا ہوا اور دنیا نے اس عظیم الشان پیشین گوئی کو حرف بحرف اپنی آنکھوں سے پورا ہوتا ہوا دیکھ لیا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب کام علم واجتہاد کے بغیر ممکن نہیں: اس لئے مسلمانوں کا اجماع ہے کہ خلیفہ راشد میں یہ اوصاف بھی ضروری ہیں[1]

نواں وصف: خلیفہ راشد کا قریشی ہونا ضروری ہے۔ حدیث میں ہے: ”ائمہ قریش میں سے ہیں“[2] اور خلیفہ راشد کا قریشی ہونا تین وجوہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ — قریشی خلیفہ راشد کے ذریعہ دین کی تمکین خوب ہو سکتی ہے — وہ دین حق جو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے ذریعہ ظاہر فرمایا ہے، وہ قریش کی زبان میں اور ان کی عادتوں میں آیا ہے یعنی قرآن کریم قریش کی زبان میں نازل ہوا ہے، اور قوانین شرعیہ کا مواد بھی قریش کی عادتیں ہیں۔ اور بیش تر مقادیر وحدود جو متعین ہوئی ہیں: وہ بھی وہ ہیں جو قریش میں رائج تھیں۔ مثلاً: قتل کی دیت سو اونٹ حضرت عبدالمطلب نے مقرر کی تھی، جس کو اسلام نے باقی رکھا۔ اور احکام کے بہت سے معدّات (سابقہ اسباب) بھی وہ باتیں ہیں جو قریش میں موجود تھیں۔ اس لئے وہی دین کو سب سے زیادہ قائم کرنے والے، اور وہی لوگوں میں دین اسلام نے سب سے زیادہ تمسک کرنے والے ہیں۔ پس اگر خلیفہ راشد

[1] خلفاء راشدین کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس نمونہ کے خلفاء ہوئے ہیں، اور ہوتے رہیں گے۔ جیسے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ۔ اور آخری خلیفہ راشد مہدی ہوں گے، جو زمین کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ اور جہاد کر کے اسلام کا بول بالا کریں گے ۱۲

[2] سنن بیہقی (۱۲۱:۳) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: یہ حدیث چالیس صحابہ سے مروی ہے۔ اور انھوں نے ایک رسالہ میں اس کے طُرُق جمع کئے ہیں (فتح الباری ۳۲:۷) شاہ صاحب فرماتے ہیں: اس حدیث پر امت کا اجماع ہے (ازالۃ الخفاء)

قریشی ہوگا تو دین کی تمکین خوب ہوگی۔

دوسری وجہ — قریشی خلیفہ راشد دین کی سب سے زیادہ حفاظت کرے گا — قریش نبی ﷺ کی قوم اور آپؐ کی جماعت ہے۔ان کے لئے سب سے بڑا فخر حضرت محمد ﷺ کے دین کی سربلندی میں ہے۔سورۃ الزخرف آیت ۴۴ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ﴾ اور بیشک قرآن آپؐ کے لئے اور آپؐ کی قوم کے لئے بڑے شرف کی چیز ہے۔پس قریش میں دینی حمیّت (دفاع کا جذبہ) اور نسبی حمیت جمع ہوگئیں، اس لئے وہ احکام شرعیہ کی حفاظت وصیانت اور تمسک کی احتمالی جگہ ہیں۔

تیسری وجہ — قریش میں حکومت کرنے کی صلاحیت دوسروں سے زیادہ ہے — خلیفہ میں تین باتیں ضروری ہیں:

۱ — خلیفہ ان لوگوں میں سے ہونا ضروری ہے جس سے لوگ نفرت نہ کریں۔جس کی لوگ حسب ونسب کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اتباع کریں۔کیونکہ جس کے لئے نسبی شرافت نہیں: لوگ اس کو حقیر وذلیل سمجھتے ہیں۔

۲ — خلیفہ ان لوگوں میں سے ہونا ضروری ہے جو ریاست وعظمت کے مالک رہے ہوں۔جن کو لشکر جمع کرنے کی اور جنگ وپیکار کی مہارت حاصل ہو۔

۳ — خلیفہ ایسے لوگوں میں سے ہونا ضروری ہے جو طاقتور ہوں۔تاکہ وہ دین کی نصرت وحمایت کریں، اور اس کے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے تیار رہیں۔

اور یہ تینوں باتیں صرف قریش میں مجتمع تھیں۔خاص طور پر نبی ﷺ کی بعثت کے بعد۔کیونکہ نبی ﷺ کے ذریعہ قریش کی عظمت دوبالا ہوگئی تھی۔حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ معاملہ (حکومت) نہیں پہچانا گیا، مگر قریش کے لئے: وہ نسب ووطن کے اعتبار سے اشرف ہیں (بخاری حدیث ۶۸۳۰) یعنی ان کا نسب عرب میں عالی ہے۔اور ان کا وطن مکہ مکرمہ ہے، جو عربوں کی عقیدت کا مرجع ہے[1]۔

﴿الخلافة﴾

اعلم: أنه يشترطُ في الخليفة: أن يكون عاقلاً، بالغاً، حرًا، ذكرًا، شجاعًا، ذارأيٍ وسمعٍ وبصرٍ ونُطقٍ، وممن سَلَّمَ الناسُ شرفَه وشرفَ قومه، ولا يستنكفون عن طاعته، قد عُرِف منه أنه يتّبع الحقَّ في سياسة المدينة؛ هذا كُلُّه يدل عليه العقل، واجتمعت أممُ بني آدم — على تباعد بلدانهم واختلاف أديانهم — على اشتراطها، لِمَا رَأَوا أن هذه الأمور لاتتم المصلحةُ المقصودةُ من نصب الخليفة إلا بها؛ وإذا وقع شيئ من إهمال هذه رأوه خلافَ ما ينبغي،

[1] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول حدیث الأئمة من قريش کے ہم معنی ہے۔پس یہ حدیث گویا بخاری کی ہوگئی ۱۲



وكرهه قلوبهم، وسكتوا على غيظ؛ وهو قوله صلى الله عليه وسلم فى الفارس لَمَّا وَلَّوْا عليهم امرأةً: " لن يَفلَح قومٌ وَلَّوْا أمرهم امرأةً"

والملة المصطفوية اعتبرت فى خلافة النبوة أمورًا أخرى:

منها: الإسلام، والعلم، والعدالة؛ وذلك: لأن المصالح الملية لاتتم بدونها ضرورةً: أجمع المسلمون عليه، والأصل فى ذلك قوله تعالى: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ إلى قوله تعالى: ﴿فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾

ومنها: كونه من قريش. قال النبى صلى الله عليه وسلم: " الإئمة من قريش"

والسبب المقتضى لهذا: أن الحقَّ الذى أظهره الله على لسان نبيه صلى الله عليه وسلم إنما جاء بلسان قريش، وفى عاداتهم، وكان أكثرُ ما تعيَّنَ من المقادير والحدود: ماهو عندهم، وكان المُعِدُّ لكثير من الأحكام: ماهو فيهم، فهم أَقْوَمُ به، وأكثرُ الناس تمسكا بذلك.

وأيضًا: فإن القريش قومُ النبى صلى الله عليه وسلم، وحِزْبُه، ولا فخر لهم إلا بعلوِّ دينِ محمد صلى الله عليه وسلم، وقد اجتمع فيهم حميةٌ دينية، وحميةٌ نسبيةٌ، فكانوا مظنةَ القيام بالشرائع والتمسك بها.

وأيضًا: فإنه يجب:

[۱] أن يكون الخليفةُ ممن لايستنكف الناس من طاعته، لجلالةِ نسبه وحَسَبه، فإن من لانسب له يراه الناس حقيرًا ذليلاً.

[۲] وأن يكون ممن عُرِفَ منهم الرياساتُ والشرفُ، ومَارَسَ قومُه جمعَ الرجال ونصبَ القتال.

[۳] وأن يكون قومُه أقوياءَ يَحْمُوْنَه وينصرونه، ويبذلون دونه الأنفسَ.

ولم تجتمع هذه الأمور إلا فى قريش، لاسيما بعد ما بُعث النبى صلى الله عليه وسلم، ونَبُهَ بِهِ أمرُ قريشٍ، وقد أشار أبو بكر الصديق رضى الله عنه إلى هذه، فقال: ولن يُعْرَفَ هذا الأمرُ إلا لقريش: هم أوسط العرب نسبًا وداراً إلخ.

ترجمہ: خلافت کا بیان: جان لیں کہ خلیفہ کے لئے شرط ہے کہ وہ عقل مند، بالغ، آزاد، مذکر، بہادر، ذی رائے، سننے والا، دیکھنے والا اور بولنے والا ہو۔ اور ان لوگوں میں سے ہو جس کی اور جس کی قوم کی بزرگی لوگوں نے تسلیم کر رکھی ہو، اور لوگ اس کی اطاعت سے نفرت نہ کرتے ہوں۔ اس کے بارے میں یہ بات معلوم ہو کہ وہ نظام حکومت میں حق کی پیروی کرے گا۔ اور ان سب باتوں پر عقل دلالت کرتی ہے۔ اور ان باتوں کے شرط ہونے پر، انسانوں کے تمام گروہوں نے اتفاق کیا

ہے، ان کے ملکوں کے ایک دوسرے سے دور ہونے، اوران کے مذاہب کے مختلف ہونے کے باوجود، بایں وجہ کہ دیکھا انھوں نے کہ یہ چیزیں: خلیفہ مقرر کرنے سے جو مصلحت مقصود ہے: وہ ان چیزوں کے بغیر تام نہیں ہوتی۔ اور جب واقع ہوتی ہے کوئی چیز ان اوصاف کو رائگاں کرنے سے تو لوگ اس کو نامناسب سمجھتے ہیں۔ اوراس کو ان کے دل ناپسند کرتے ہیں۔ اوروہ خاموش رہتے ہیں غصہ کے ساتھ۔ اوروہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے ایران والوں کے بارے میں، جب انھوں نے اپنے اوپر ایک عورت کو بادشاہ بنایا: ''ہرگز فلاح نہیں پائے گی وہ قوم جس نے اپنے معاملہ کا ذمہ دار کسی عورت کو بنایا''

اور ملتِ مصطفویہ نے خلافتِ نبوت یعنی خلافتِ راشدہ کے لئے چند اور باتوں کا بھی لحاظ کیا ہے: —— ازانجملہ: اسلام، علم اور عدالت ہے، اور وہ بات یعنی یہ اوصاف اس لئے بڑھائے ہیں کہ ملی مصلحتیں بالبداہت ان اوصاف کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوسکتیں۔ مسلمانوں نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ اوراس کی اصل اللہ پاک کا ارشاد ہے...... اور ازانجملہ: خلیفہ کا قریش سے ہونا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ائمہ قریش میں سے ہیں'' اور وہ سبب جو اس بات کو چاہنے والا ہے: یہ ہے کہ وہ دینِ حق جس کو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی زبان پر ظاہر کیا ہے: وہ قریش کی زبان اوران کی عادتوں میں آیا ہے۔ اور بیشتر وہ مقداریں اور حدیں جو متعین ہوئی ہیں: وہ وہ ہیں جو ان کے پاس تھیں۔ اور تھیں تیار کرنے والی بہت سے احکام کو: وہ باتیں جو ان میں تھیں۔ پس قریش اس دین کا زیادہ اہتمام کرنے والے، اور لوگوں میں اس سے زیادہ تمسک کرنے والے (چمٹنے والے) ہیں۔

اور نیز: پس بیشک قریش نبی ﷺ کی قوم اوراُن کی جماعت تھے۔ اوران کے لئے کوئی فخر نہیں بجز محمد ﷺ کے دین کی سربلندی کے۔ اور تحقیق اکٹھا ہوگئی ان میں دینی حمیت اور نسبی حمیت۔ پس وہ احکام شرعیہ کی حفاظت اوران سے چمٹنے کی احتمالی جگہ تھے۔

اور نیز: پس بیشک ضروری ہے: (۱) کہ خلیفہ ان لوگوں میں سے ہو جس کی اطاعت سے لوگ نفرت نہ کریں، اس کے نسب اور حسب کی جلالت کی وجہ سے۔ پس بیشک وہ شخص جس کے لئے نسب نہیں: اس کو لوگ حقیر وذلیل سمجھتے ہیں (۲) اور یہ کہ ہو وہ ان لوگوں میں سے جن سے جانی گئی ہو ریاست وعظمت، اور مہارت رکھتی ہو اس کی قوم لوگوں کو اکٹھا کرنے میں اور لڑائی کھڑی کرنے میں (۳) اور یہ کہ اس (نبی ﷺ) کی قوم طاقتور ہو، حمایت کریں وہ اس کی اور مدد کریں اس کی، اور اس کے لئے اپنی جانیں قربان کریں —— اور نہیں اکٹھا ہوئیں یہ باتیں مگر قریش میں، خاص طور پر نبی ﷺ کی بعثت کے بعد، اور نبی ﷺ کے ذریعہ قریش کی شان بلند ہونے کے بعد۔ اور تحقیق اشارہ فرمایا ہے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف۔ پس فرمایا: ''اور ہرگز نہیں جانا گیا یہ معاملہ مگر قریش کے لئے۔ وہ عربوں میں نسب اور وطن کے اعتبار سے افضل ہیں الی آخرہ۔

لغات: المُعِدّ: کے معنی کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۱: ۳۲۹)...... نَبُهَ (ک، ن) نَبَاهَةً: معزز ہونا، نیک نام ہونا۔





خلیفہ کے لئے ہاشمی ہونا شرط نہ ہونے کی وجہ

شیعوں کے نزدیک: خلیفہ راشد کا ہاشمی بلکہ علوی ہونا شرط ہے۔ ان کا خیال صحیح نہیں۔ خلیفہ کا ہاشمی وغیرہ ہونا دو وجہ سے شرط نہیں:

پہلی وجہ ـــــ بدگمانی دور کرنا ـــــ اگر خلیفہ راشد کے لئے ہاشمی یا علوی ہونا شرط ہوگا، اور نبی ﷺ کی وفات کے بعد خاندانِ بنو ہاشم سے خلیفہ منتخب کیا جائے گا تو لوگ شک میں پڑیں گے، اور کہیں گے کہ یہ نیا دین اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لئے ہے، جیسے دوسرے بادشاہ کرتے ہیں! پس یہ شبہ لوگوں کے لئے ترکِ دین کا سبب بن جائے گا۔ اور اس کی نظیر: کعبہ کی کنجی کا مسئلہ ہے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کنجی مانگی، اور عرض کیا کہ ہمارے لئے سِقایہ (حجاج کو پانی پلانے کی خدمت) کے ساتھ حِجابہ (کعبہ کی کلید برداری) کو بھی جمع کردیا جائے تو آپؐ نے قبول نہیں کیا۔ اور عثمان بن طلحہ کو، جس کے پاس پہلے سے چابی تھی، اور جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، یہ فرما کر چابی سپرد کردی کہ: ''آج کا دن نیکی اور وفاداری کا دن ہے!'' بلکہ یہ بھی فرمایا کہ: ''اسے ہمیشہ ہمیش کے لئے لے لو، تم سے ظالم ہی اس کو چھینے گا!'' (زاد المعاد ۳: ۴۰۸) اس کی دوسری نظیر: خاندان نبوت کے لئے صدقات کی حرمت ہے۔ تفصیل کتاب الزکوٰۃ (رحمۃ اللہ ۴: ۸۷) میں گذر چکی ہے۔

دوسری وجہ ـــــ تنگی ہٹانا ـــــ خلافت کے لئے اہم بات یہ ہے کہ خلیفہ ایسا شخص ہو جس سے لوگ خوش ہوں، جس کے گرد جمع ہوں، جس کی تعظیم کریں، اور خلیفہ حدود قائم کرے، ملت کا دفاع کرے اور احکام شرعیہ نافذ کرے۔ اور یہ اوصاف کسی کسی میں جمع ہوتے ہیں۔ آسانی سے ایک آدمی میں جمع نہیں ہوتے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے   بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پس اگر خلیفہ کے لئے کسی مخصوص خاندان سے ہونے کی شرط لگائی جائے گی تو حرج اور تنگی پیدا ہوگی۔ ممکن ہے اس خاندان میں ایسا آدمی نہ ہو، اور دوسرے خاندان میں ہو۔ اور قریش، بہت بڑا قبیلہ ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی ان صفات کا حامل ہوگا۔

اور اس کی نظیر: بیع سلم کا معاملہ ہے۔ اگر مُسْلَم فیہ یعنی بیع سلم میں مبیع کے بارے میں یہ طے پائے کہ وہ فلاں گاؤں کی پیداوار ہو، اور وہ گاؤں چھوٹا ہو تو یہ شرط جائز نہیں۔ کیونکہ امکان ہے کہ اس گاؤں میں کسی کے یہاں مبیع مثلاً گیہوں یا چاول نہ پیدا ہوں۔ البتہ اگر وہ گاؤں بڑا ہے تو ایسی شرط لگانا جائز ہے، کیونکہ بڑے گاؤں میں کسی نہ کسی کے یہاں وہ چیز ضرور پیدا ہوگی۔

وإنما لم يُشترط كونُه هاشميا ـــ مثلاً ـــ لوجهين:

أحدهما: أن لا يقع الناس في الشك، فيقولوا: إنما أراد مُلْكَ أهلِ بيته كسائر الملوك،

فيكون سببا للارتداد؛ ولهذه العلة لم يُعْطِ النبيُّ صلى الله عليه وسلم المفتاح لعباس بن عبد المطلب رضى الله عنه.

والثاني: أن المهمَّ في الخلافة رضا الناس به، واجتماعُهم عليه، وتوقيرُهم إياه، وأن يقيم الحدود، ويُناضِلَ دون الملة، ويُنَفِّذَ الأحكامَ؛ واجتماعُ هذه الأمور لايكون إلا في واحد بعد واحد؛ وفي اشتراط أن يكون من قبيلة خاصة تضييقٌ وحرجٌ، فربما لم يكن في هذه القبيلة من تجتمع فيه الشروط، وكان في غيرها؛ ولهذه العلة ذهب الفقهاءُ إلى المنع عن اشتراطِ كون المُسْلَم فيه من قرية صغيرة، وجوزوا كونَه من قرية كبيرة.

ترجمہ: اور نہیں شرط کیا گیا خلیفہ کا ہاشمی ہونا — مثال کے طور پر — دو وجہ سے: ایک: یہ کہ لوگ شک میں نہ پڑیں پس کہیں: آپؐ نے اپنے گھرانے کی حکومت ہی کا ارادہ کیا ہے، دیگر بادشاہوں کی طرح، پس وہ شبہ لوگوں کے ارتداد کا سبب بن جائے۔ اور اسی علت کی وجہ سے نبی ﷺ نے چابی عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو نہیں دی (سیرت ابن ہشام میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چابی مانگنے کا تذکرہ ہے)

اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ خلافت میں اہم بات: لوگوں کا خلیفہ سے خوش ہونا، اور لوگوں کا اس کے گرد جمع ہونا، اور لوگوں کا اس کی تعظیم کرنا ہے۔ اور یہ بات ہے کہ خلیفہ حدود کو قائم کرے، اور ملت کی طرف سے دفاع کرے اور احکام شرعیہ کو نافذ کرے۔ اور ان باتوں کا اجتماع نہیں ہوتا مگر ایک کے بعد ایک میں۔ اور اس بات کے شرط کرنے میں کہ خلیفہ مخصوص قبیلہ کا ہو: تنگی اور حرج ہے۔ پس کبھی نہیں ہوتا اس قبیلہ میں وہ شخص جس میں شرطیں اکٹھا ہوں، اور وہ شخص اس قبیلہ کے علاوہ میں ہوتا ہے — اور اسی علت کی وجہ سے فقہاء گئے ہیں کسی چھوٹے گاؤں سے مُسْلَم فیہ (بیع سلم میں مبیع) ہونے کی شرط لگانے کے عدم جواز کی طرف۔ اور جائز قرار دیا ہے انھوں نے کسی بڑے گاؤں سے مُسْلَم فیہ ہونے کی (شرط لگانے کو)

☆ ☆ ☆

انعقادِ خلافت کے مختلف طریقے

انعقاد خلافت کے چار طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: اربابِ حل وعقد یعنی علماء، قبائل کے سردار اور فوج کے امراء کے بیعت کرنے سے خلیفہ متعین ہوتا ہے۔ یہ حضرات اصحاب الرائے اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں (اور سب کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ جو لوگ بآسانی موجود ہوسکیں ان کا بیعت کرنا کافی ہے) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح منعقد ہوئی ہے۔

دوسرا طریقہ: موجودہ خلیفہ بعد والے خلیفہ کو نامزد کرے۔ اور لوگوں کو اس کی اتباع کی وصیت کرے۔ حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح منعقد ہوئی ہے۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ان کو نامزد کیا تھا۔ اور ایک تحریر کے ذریعہ مسلمانوں کو ان کی اتباع کی تاکید کی تھی۔

تیسرا طریقہ: خلیفہ ایک جماعت میں خلافت کو دائر کرے، اور کہہ دے کہ ان میں سے ایک کو منتخب کیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی طرح منعقد ہوئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ شخصوں میں خلافت دائر کی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تجویز کیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت: اور حضرت علیؓ کی خلافت کس طرح منعقد ہوئی؟ اس میں اختلاف ہے:

ا۔ اکثر علماء کی رائے یہ ہے کہ آپؓ اُن مہاجرین وانصار کے بیعت کرنے سے خلیفہ ہوئے ہیں جو بروقت مدینہ میں موجود تھے۔ یعنی پہلے طریقہ پر آپؓ کی خلافت منعقد ہوئی ہے۔ آپؓ نے جو خطوط اہل شام کو لکھے ہیں وہ اس پر شاہد ہیں۔ ازالۃ الخفا میں شاہ صاحب قدس سرہ نے اس رائے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لئے یہی رائے صحیح ہے۔

۲۔ دوسری رائے یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد بذریعہ شوری ہوا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد مشورہ میں یہ بات طے پائی تھی کہ خلیفہ حضرت عثمان ہوں یا حضرت علی ــــ اللہ تعالیٰ دونوں سے راضی ہو ــــ پھر حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے۔ پس جب حضرت عثمانؓ نہ رہے تو حضرت علیؓ خلافت کے لئے متعین ہو گئے۔ مگر شاہ صاحب قدس سرہ نے ازالۃ الخفا میں اس قول کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ اس مشورہ میں یہ بات طے نہیں پائی تھی کہ دونوں یکے بعد دیگرے خلیفہ ہوں گے۔ بلکہ مشورہ میں صرف یہ بات طے ہوئی تھی کہ بالفعل حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوں گے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہاں یہی قول ذکر کیا ہے۔ مگر یہ ضعیف قول ہے۔

چوتھا طریقہ: استیلاء ہے یعنی ایسا شخص جو خلافت کی شرطوں کا جامع ہے، لوگوں پر غلبہ پالے اور حکومت پر قبضہ جمالے، تو اس سے بھی خلافت منعقد ہو جاتی ہے۔ خلفاء راشدین کے بعد کے تمام خلفاء کی خلافتیں اسی طرح منعقد ہوئی ہیں۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ازالۃ الخفا میں چوتھے طریقہ پر بننے والے خلفاء کی دو قسمیں کی ہیں:

ایک: یہ کہ قابض خلافت کی شرطوں کا جامع ہو، اور کسی ناجائز امر کے ارتکاب کے بغیر، صلح وتدبیر سے لوگوں کو اپنے ساتھ کرلے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت حسنؓ کی مصالحت کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس طرح خلیفہ ہوئے ہیں۔ یہ صورت بوقتِ ضرورت جائز ہے (اور خلیفہ راشد ہی کی طرح اس کی پیروی ضروری ہے)

دوسری قسم: حکومت پر قبضہ جمانے والا خلافت کی شرائط کا جامع نہ ہو، اور حکومت میں نزاع کرنے والوں کو قتل وقتال اور ارتکابِ حرام کے ذریعہ زیر کرے۔ عبدالملک بن مروان اور پہلے عباسی خلیفہ کی خلافت کا انعقاد اسی طرح ہوا ہے۔ یہ صورت جائز نہیں۔ اور ایسا کرنے والا عاصی ہے۔ لیکن اس کے بھی وہ احکام قبول کرنا واجب ہے جو شرع کے موافق ہوں۔ اس کے عامل زکوٰۃ وصول کریں گے تو مالکان اموال سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی۔ اس کے قاضیوں کے فیصلے نافذ ہوں گے، اور اس

کے ساتھ مل کر جہاد کرنا درست ہے۔اور ایسے خلیفہ کو معزول نہیں کیا جائے گا جیسا کہ آئندہ عنوان کے تحت آرہا ہے۔

وتنعقد الخلافة بوجوه:

[۱] بيعةِ أهل الحل والعقد: من العلماء، والرؤساء، وأُمراء الأجناد، ممن يكون له رأىٌ ونصيحةٌ للمسلمين، كما انعقدت خلافةُ أبي بكر رضي الله عنه.

[۲] وبأن يُوْصِي الخليفةُ الناسَ به، كما انعقدت خلافةُ عمر رضي الله عنه.

[۳] أو يجعل شورى بين قوم، كما كان عند انعقاد خلافة عثمان، بل عليٍّ أيضًا، رضي الله عنهما.

[٤] أو استيلاءِ رجلٍ جامع للشروط على الناس، وتسلُّطِه عليهم، كسائر الخلفاء بعدَ خلافة النبوة.

ترجمہ: اور خلافت چند طریقوں سے منعقد ہوتی ہے: (۱) اربابِ حل وعقد کی بیعت کے ذریعہ یعنی علماء، قبیلوں کے سرداراور فوج کے امراء، ان میں سے جن کے لئے رائے اور مسلمانوں کے لئے خیر خواہی ہو یعنی ہر عالم، ہر سرداراور ہر امیر مراد نہیں، بلکہ جو ذی رائے اور جماعت مسلمین کا خیر خواہ ہو اسی کی بیعت سے خلیفہ نامزد ہوگا۔ جیسا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی ہے (۲) اور بایں طور کہ خلیفہ لوگوں کو بعد کے خلیفہ کے بارے میں وصیت کرے۔ جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی ہے (۳) یا خلیفہ قوم کی شوری مقرر کرے۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کے وقت ہوا تھا، بلکہ علی کی بھی، اللہ دونوں سے راضی ہو (۴) یا کسی ایسے آدمی کے غلبہ پانے کے ذریعہ جو شرائط کا جامع ہو، اور لوگوں پر اس کے تسلط کے ذریعہ۔ جیسے خلفاء راشدین کے بعد کے تمام خلفاء۔

☆ ☆ ☆

متغلِّب کا اقتدار کب تک برداشت کیا جائے؟

اگر کوئی ایسا شخص زبردستی حکومت پر غلبہ حاصل کرلے جو شرائطِ خلافت کا جامع نہ ہو، تو اس کی مخالفت میں جلدی نہ کی جائے۔ کیونکہ اس کو معزول کرنے میں مسلمانوں کی جانیں تلف ہونگی۔ اور سخت فتنہ برپا ہوگا۔ اور یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ نتیجہ کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے اس سے بھی بدتر کوئی شخص غالب آجائے۔ پس ایک موہوم مصلحت کے لئے ایسے امر کا ارتکاب نہ کیا جائے جس کی قباحت یقینی ہے۔

حدیث ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین پیشواوہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور جو تم سے محبت کریں۔ اور جن کے لئے تم دعا کرو، اور جو تمہارے لئے دعا کریں۔ اور بدترین پیشواوہ ہیں جن سے تم بغض رکھو، اور جو تم سے بغض رکھیں۔ اور جن پر تم لعنت بھیجو، اور جو تم پر لعنت بھیجیں'' صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! تو کیا ہم ایسی صورت میں ان سے ترک تعلق

نہ کرلیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں! جب تک وہ تمہارے اندر نماز قائم کریں۔ سنو! جس پر کوئی حاکم مقرر کیا گیا، پس اس نے دیکھا کہ وہ کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے، تو وہ اس معصیت کو ناپسند کرے جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے۔ اور ہرگز اپنا ہاتھ اس کی اطاعت سے نہ کھینچے! (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۳۶۷۰)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے حکومت کے ذمہ داروں سے جھگڑا کرنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور فرمایا: ''مگر یہ کہ تم کھلا کفر دیکھو، تمہارے پاس اللہ کی طرف سے اس کی دلیل ہو'' یعنی دلیل نقلی سے اس کا کفر ثابت ہو (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۳۶۶۶)

حاصل کلام: جب خلیفہ ضروریات دین میں سے کسی ضروری امر کے انکار کی وجہ سے کافر ہوجائے، مثلاً نماز کی فرضیت کا انکار کردے یا پانچ نمازوں کی فرضیت کا قائل نہ ہو، تو اس سے جنگ کرنا جائز ہے، بلکہ واجب ہے۔ ورنہ نہیں۔ اور جواز یا وجوب اس لئے ہے کہ ایسی صورت میں خلیفہ مقرر کرنے کی جو مصلحت ہے یعنی اقامتِ دین وہ فوت ہوجائے گی۔ بلکہ وہ پوری قوم کو لے ڈوبے گا، اس لئے اس سے برسرِ پیکار ہونا راہِ خدا میں جہاد کرنا ہے۔

ثم إن استولى من لم يَجْمَعِ الشروطَ: لاينبغي أن يُبادر إلى المخالفة، لأن خَلْعَهُ لايُتصوَّر غالبًا إلا بحروب ومضايقاتٍ، وفيها من المفسدة أشدُّ مما يُرجى من المصلحة.

وسُئل رسولُ الله صلى الله عليه وسلم، فقيل: أفلا ننا بذهم؟ قال: " لا، ماأقاموا فيكم الصلاة" وقال: "إلا أن تروا كفرًا بَوَاحًا، عندكم من الله فيه برهان"

وبالجملة: فإذا كفر الخليفةُ بإنكار ضروريٍ من ضروريات الدين: حلَّ قتالُه، بل وجب، وإلا لا؛ وذلك: لأنه حينئذ فاتت مصلحةُ نصبِه، بل يُخاف مفسدتُه على القوم، فصار قتاله من الجهاد في سبيل الله.

ترجمہ: پھر اگر غلبہ حاصل کرلیا اس شخص نے جو شرائط کو اکٹھا نہیں کرتا تو مناسب نہیں کہ مخالفت کی طرف سبقت کی جائے اس لئے کہ اس کی برطرفی عام طور پر متصور نہیں مگر جنگوں اور تنگیوں کے ذریعہ۔ اور ان میں خرابی میں سے زیادہ سخت ہے اس مصلحت سے جس کی امید کی جاتی ہے۔

اور حاصل کلام: پس جب خلیفہ کافر ہوجائے ضروریاتِ دین میں سے کسی ضروری بات کے انکار کی وجہ سے تو اس سے جنگ کرنا جائز ہے، بلکہ واجب ہے۔ ورنہ نہیں۔ اور وہ بات اس لئے ہے کہ اس وقت خلیفہ کو مقرر کرنے کی مصلحت فوت ہوجائے گی۔ بلکہ قوم پر اس کی خرابی کا اندیشہ کیا جائے گا۔ پس اس سے جنگ کرنا راہِ خدا میں جہاد ہوگا۔

لغات: نَابَذَ فلانًا: کسی سے اختلاف یا بغض کی بنا پر ترک تعلق کرنا ...... الباح والبوح: کھلا، ظاہر ...... ضروریاتِ

دین (دین کی بدیہی باتیں) وہ ہیں جن کو دین سے واقف ہر مسلمان جانتا ہے، ان سے کوئی مسلمان ناواقف نہیں۔

☆ ☆ ☆

امیر کی اطاعت وعدم اطاعت

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امیر کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے، خواہ وہ بات اس کو پسند ہو یا ناپسند، جب تک وہ کسی گناہ کی بات کا حکم نہ دے۔ پس جب وہ معصیت کا حکم دے تو نہ سننا ہے نہ اطاعت کرنا'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۶۴)

تشریح: امیر کی اطاعت درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جو شخص امیر کی اطاعت کرتا ہے، اس نے یقیناً میری اطاعت کی۔ اور جو میرے امیر کی نافرمانی کرتا ہے، اس نے یقیناً میری نافرمانی کی'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۶۱)

اور باب اول میں یہ بات گذر چکی ہے کہ نبی ﷺ کی بعثت دو مقاصد کے لئے ہوئی ہے: ایک: ملت کی شان بلند کرنا۔ دوم: مملکت کی تنظیم کرنا۔ پس نصب امام کے بھی یہی دو مقاصد ہیں۔ کیونکہ خلیفہ نبی ﷺ کا نائب اور آپ ؐ کے معاملہ کو آگے بڑھانے والا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی طرح امام کی اطاعت بھی واجب ہے۔ اور رسول کی نافرمانی کی طرف امام کی نافرمانی بھی حرام ہے۔

البتہ اگر امام کسی گناہ کے کام کا حکم دے تو اس میں اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ وہ اللہ ورسول کی اطاعت نہیں۔ اور گناہ کے کام میں وہ رسول اللہ ﷺ کا نائب نہیں، نہ وہ اللہ کا حکم ہے۔ پس اس میں اس کی اطاعت جائز نہیں۔

امام ڈھال ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امام ڈھال ہے۔ اس کی آڑ میں لڑا جاتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ بچاؤ کیا جاتا ہے۔ پس اگر وہ اللہ سے ڈرنے کا حکم دے، اور انصاف کرے تو یقیناً اس کے لئے اس کی وجہ سے ثواب ہے۔ اور اگر وہ اس کے علاوہ بات کہے تو یقیناً اس پر اس کا وبال ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۶۱)

تشریح: امام کے ڈھال ہونے کی وجہ اس حدیث میں بیان کی گئی ہے کہ ڈھال کی طرح امام کی آڑ میں لڑا جاتا ہے۔ اور ڈھال کی طرح امام کے ذریعہ بچاؤ کیا جاتا ہے۔ کیونکہ امام مسلمانوں کے کلمہ کے اکٹھا ہونے، اور مسلمانوں کی طرف سے مدافعت کا ذریعہ ہے۔

وضاحت: سورۃ الانفال آیت ۱۶ میں دشمن سے مقابلہ کے وقت پیٹھ پھیرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ مگر دو صورتوں کا استثناء کیا گیا ہے: ایک: لڑائی کیلئے پینترا بدلنے کا۔ دوم: جماعت کی طرف پناہ لینے کا ـــــ اور امام مسلمانوں کی جماعت ہے۔ حدیث میں یہ واقعہ مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ایک سریہ بھیجا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو (دشمن کی کثرت کی وجہ سے) مسلمانوں کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ لوگ مدینہ واپس آئے، اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور دل شکستگی سے عرض کیا کہ ہم بھگوڑے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''نہیں! تم پلٹ کر حملہ کرنے والے ہو! اور میں تمہاری جماعت ہوں'' اور ایک روایت میں ہے: ''میں مسلمانوں کی جماعت ہوں!'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۵۸) یعنی امام مسلمانوں کا مرکز ہے۔ بوقتِ ضرورت فوج اس سے مدد طلب کرتی ہے، اور جب مسلمانوں پر زد آتی ہے تو وہ مدافعت کرتا ہے۔ پس وہ مسلمانوں کی ڈھال ہے۔

ملت سے جدا ہونے والا جاہلی موت مرنے والا ہے

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اپنے امیر[1] کوئی ایسی بات دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے تو صبر کرے۔ کیونکہ جو بھی شخص جماعت سے بالشت بھر جدا ہوا، پھر وہ اس حالت میں مرا تو وہ جاہلیت کی موت مرا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۶۶۸)

تشریح: اسلام کا جاہلیت سے امتیاز دو باتوں کے ذریعہ ہے: ایک: دین رحمت کے ذریعہ۔ دوم: مملکت کی تنظیم کے ذریعہ یعنی زمانۂ جاہلیت کے لوگ دین سے نا آشنا تھے۔ اور ان کی کوئی اجتماعی حکومت نہیں تھی۔ انارکی اور قبائلی حکومتوں کا دور دورہ تھا۔ اور خلیفہ ان دونوں باتوں میں رسول اللہ ﷺ کا نائب ہے۔ پس جو شخص دونوں مصلحتوں کو بروئے کار لانے والے خلیفہ سے جدا ہوا وہ یقیناً جاہلیت کے مشابہ ہو گیا اور جاہلیت کی موت مرا!

رعیت کی حفاظت نہ کرنے پر وعید

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس بندے کو بھی رعایا کی حفاظت سونپیں، پھر وہ خیر خواہی کے ساتھ اس کی حفاظت نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو نہیں پائے گا!'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۶۸۷)

تشریح: شارع کا یہ طریقہ ہے کہ جو معاملہ دو فریقوں سے متعلق ہو: اس معاملہ میں دونوں فریقوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلائی جاتی ہیں۔ چنانچہ جب رعایا کو حکم دیا کہ وہ امیر کی اطاعت کریں تو امیر کو بھی حکم دیا کہ وہ اپنی ذمہ داری بجالائے، ذرا کوتاہی نہ کرے، ورنہ وہ جنت سے محروم ہوگا۔ اس طرح فریقین کو احکام دینے سے جانبین سے مصلحتیں تکمیل پذیر ہوتی ہیں۔

[1] قال صلى الله عليه وسلم: "السمع والطاعة على المرء المسلم فيما أحبَّ وكرِه، مالم يؤمر بمعصية، فإذا أمر بمعصية فلا سمعَ ولاطاعةَ"

أقول: لما كان الإمام منصوبًا لنوعين من المصالح، اللذَيْن بهما انتظامُ الملة والمدن، وإنما بُعث النبيُّ صلى الله عليه وسلم لأجلهما، والإمامُ نائبُه، ومُنفِذُ أمرِه: كانت طاعتُه طاعةَ رسول الله، ومعصيتُه معصيةَ رسول الله؛ إلا أن يأمر بالمعصية، فحينئذ ظهر أن طاعته ليست بطاعة الله، وأنه ليس نائبُ رسول الله صلى الله عليه وسلم؛ ولذلك قال عليه السلام:" ومن يُطع الأميرَ فقد أطاعني، ومن يعصِ الأميرَ فقد عصاني"

[۲] قال صلى الله عليه وسلم:" إنما الإمام جُنَّة: يُقَاتَلُ من ورائه، ويُتَّقَى به، فإن أمر بتقوى الله وعَدَل: فإن له بذلك أجرًا؛ وإن قال بغيره فإن عليه منه"

أقول: إنما جعله بمنزلة الجُنَّةِ: لأنه سبب اجتماع كلمة المسلمين، والذَّبِّ عنهم.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم:" من رأى من أميره شيئًا يكرَهُه فليصبِرْ، فإنه ليس أحدٌ يفارق الجماعةَ شبرًا، فيموتُ، إلا مات مِيْتَةً جاهليةً"

أقول: وذلك لأن الإسلام إنما امتاز من الجاهلية بهذين النوعين من المصالح، والخليفةُ نائبُ رسول الله صلى الله عليه وسلم فيهما، فإذا فارق مُنَفِّذَهما ومُقيمهما أشْبَهَ الجاهليةَ.

[٤] قال صلى الله عليه وسلم:" ما من عبد يسترعيه اللّهُ رعيةً، فلم يَحُطْها بنصيحة، إلا لم يجد رائحة الجنة"

أقول: لما كان نصب الخليفة لمصالح: وجب أن يؤمر الخليفة بإيفاء هذه المصالح، كما أُمر الناسُ أن يَنْقَادوا له، لتتم المصالح من الجانبين.

ترجمہ:(۱)جب امام ایسی دوقسم کی مصلحتوں کے لئے مقرر کیا ہوا تھا جن کے ساتھ ملت اور مملکت کا نظم وانتظام وابستہ ہے۔اور نبی ﷺ انہی دومصالح کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔اور امام آپؐ کا نائب ہے۔اور آپؐ کے معاملہ کو آگے بڑھانے والا ہے تو امام کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے۔اور امام کی نافرمانی رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی ہے۔مگر یہ کہ وہ معصیت کا حکم دے۔پس اس وقت یہ بات ظاہر ہوگی کہ امام کی اطاعت اللہ کی اطاعت نہیں۔اور یہ بات ظاہر ہوگی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا نائب نہیں۔اور اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا الی آخرہ (شرح میں ترتیب بدلی ہوئی ہے)

(۲)امام کو بمنزلۂ ڈھال اسی لئے بنایا کہ وہ مسلمانوں کے کلمہ کے اکٹھا ہونے،اور مسلمانوں کی طرف سے دفاع کرنے کا سبب ہے۔

(۳) اور وہ بات یعنی جاہلی موت مرنا: اس لئے ہے کہ اسلام اِن دوقسم کی مصلحتوں کے ذریعہ ہی جاہلیت سے ممتاز ہوا ہے۔ اور خلیفہ ان دونوں مصلحتوں میں رسول اللہ ﷺ کا نائب ہے۔ پس جب وہ شخص ان دونوں مصلحتوں کو نافذ کرنے والے سے، اوران کو برپا کرنے والے سے جدا ہوا تو وہ جاہلیت کے مشابہ ہوگیا۔

(۴) جب خلیفہ کا مقرر کرنا چند مصلحتوں کے لئے تھا تو ضروری ہوا کہ خلیفہ حکم دیا جائے اُن مصلحتوں کے ایفاء کا، جیسا کہ لوگ حکم دیئے گئے ہیں کہ وہ خلیفہ کی تابعداری کریں، تاکہ جانبین سے مصلحتیں تکمیل پذیر ہوں۔

☆ ☆ ☆

عملہ کی تنخواہ گورنمنٹ کے ذمہ

چونکہ خلیفہ بذاتِ خود زکاتوں کی وصولی، عُشر کی فراہمی اور ملک کے مختلف حصوں میں پیش آنے والے نزاعات کے فیصلے نہیں کرسکتا، اس لئے عُمّال و قُضات کا بھیجنا ضروری ہے۔ اور چونکہ یہ عملہ عام لوگوں کی مصلحتوں میں مشغول ہوگا اس لئے ان کی تنخواہ حکومت کے ذمہ ہوگی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جب وہ خلیفہ منتخب کئے گئے فرمایا کہ میری قوم اچھی طرح جانتی ہے کہ میرا پیشہ (تجارت) میرے اہل وعیال کا بار اٹھانے سے قاصر نہیں۔ مگر اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول کردیا گیا ہوں۔ پس میرے گھر کا خرچہ بیت المال کے ذمہ ہوگا، اور میں بیت المال کے مفاد کے لئے کام کرونگا (مشکوۃ حدیث ۳۷۴۷) اور یہ مضمون رحمۃ اللہ (۴۸۲:۱) میں بھی گذرا ہے۔

عمال اور صارفین زکوۃ کے لئے ہدایات

چونکہ زکوۃ کی وصولی دو فریقوں سے متعلق تھی، اس لئے شارع نے دونوں کو ایسی ہدایات دیں جن سے یہ کام آسان ہوجائے۔ عامل کو حکم دیا کہ وہ زکوۃ کی وصولی میں آسانی کرے۔ اور حکومت کے مال میں خیانت نہ کرے۔ اور ارباب اموال سے رشوت نہ لے۔ اور لوگوں کو یہ حکم دیا کہ وہ عامل کی اطاعت کریں اور اس کو خوش کرکے واپس کریں۔ دونوں کو یہ ہدایتیں اس لئے دی ہیں کہ مصلحتِ مقصودہ تکمیل پذیر ہو۔ اس سلسلہ کی روایات یہ ہیں:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ لوگ ناحق اللہ کے مال میں گھسیں گے، پس ان کے لئے قیامت کے دن آگ ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۴۶) اس حدیث میں سرکاری خزانہ میں خیانت پر شدید وعید ہے۔

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو ہم نے کسی کام کے لئے مقرر کیا، پس ہم نے اس کو کچھ تنخواہ دی، اب جو کچھ اس کے بعد لے گا: خیانت ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۴۸)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۵۳)

لعنت بھیجنے کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے کسی بھی معاملہ میں رشوت دینا یا لینا مصلحتِ مقصودہ کو فوت کردیتا ہے۔اور مفاسد کا دروازہ کھولتا ہے۔

حدیث — ایک واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لن نَستعملَ علی عملنا من أراده: ہم ہرگز اس شخص کو سرکاری کام نہیں دیتے جو اس کو چاہتا ہے (بخاری حدیث ۲۲۶۱) کیونکہ عہدہ کا طالب، خاص طور پر مالیات سے متعلق کام کا خواستگار نفسانی داعیہ سے خالی نہیں ہوتا، وہ ضرور بدعنوانی کرے گا۔اس لئے طلب گار کو کام نہ دیا جائے۔

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إذا أتاكم المصدِّق فَلْيَصْدُرْ عنكم، وهو عنكم راضٍ: جب تمہارے پاس زکوۃ وصول کرنے والا آئے تو چاہئے کہ وہ تمہارے پاس سے لوٹے، درانحالیکہ وہ تم سے خوش ہو (مشکوۃ حدیث ۱۷۷۶ کتاب الزکوۃ)

تنخواہ ایسی مقرر کی جائے جس میں سے کچھ بچ رہے

سرکاری عملہ کی تنخواہ کے لئے گریڈ مقرر کرنا ضروری ہے۔تاکہ امام اس سے تجاوز نہ کرے۔اس میں کمی کرے نہ زیادتی۔اور عامل خود بھی اس سے تجاوز نہ کرے یعنی نہ زیادہ کا مطالبہ کرے، نہ خیانت کرے۔پھر اگر ملازم سال بھر کا ہو تو اتنی تنخواہ مقرر کرے جو اس کے مصارف کے لئے کافی ہو، اور کچھ بچ بھی رہے۔تاکہ اندوختہ سے وہ اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرے۔کیونکہ لگزری (LUXURY) ضروریات کے لئے تو کوئی حد نہیں۔اور مطلق زیادتی کے بغیر تنخواہ مقرر کی جائے گی تو عامل محنت نہیں کرے گا، اور نہ وہ ایسی ملازمت پسند کرے گا۔اور بنیادی ضروریات کا تذکرہ درج ذیل حدیث میں ہے:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص ہمارے لئے عامل ہو یعنی سرکاری ملازم ہو تو وہ بیوی حاصل کرے۔اور اگر اس کے لئے نوکر نہ ہو تو نوکر حاصل کرے، اور اگر اس کے لئے گھر نہ ہو تو گھر حاصل کرے“ (مشکوۃ حدیث ۳۷۵۱)

ثم إن الإمام لما كان لايستطيع بنفسه أن يباشر جِبايَةَ الصدقاتِ، وأخذَ العشور، وفصلَ القضاء في كل ناحية: وجب بَعْثُ العمال والقضاة؛ ولما كان أولئك مشغولين بأمر من مصالح العامَّة: وجب أن تكون كفايتُهم في بيت المال، وإليه الإشارةُ في قول أبي بكر الصديق رضي الله عنه لَمَّا استُخْلف: " لقد علم قومي أن حِرفتي لم تكن تَعْجِزُ عن مَؤُوْنةِ أهلي، وشُغِلْتُ بأمر المسلمين، فسيأكل آلُ أبي بكر من هذا المال، ويَحْتَرِفُ للمسلمين فيه"

ثم وجب أن يؤمر العاملُ بالتيسير، ويُنهى عن الغلول والرشوة، وأن يُؤمر القومُ بالانقياد له، لتتم المصلحةُ المقصودةُ، وهذا قوله صلى الله عليه وسلم: " إن رجالاً يَتَخَوَّضُوْنَ في مال الله

بغير حق، فلهم النار يوم القيامة" وقال صلى الله عليه وسلم:" من استعملناه على عمل، فرزقناه رزقًا، فما أخذ بعد ذلك فهو غلول" .

ولعن رسول الله صلى الله عليه وسلم الراشيَ والمرتشيَ: والسر في ذلك : أنه ينافي المصلحة المقصودةَ، ويفتح بابَ المفاسد.

وقال صلى الله عليه وسلم:" لانستعمل من طلب العملَ"

أقول: وذلك: لأنه قلما يخلو طلبُه من داعية نفسانية.

وقال صلى الله عليه وسلم:" إذا جاء كم العامل فَلْيَصْدُرْ وهو عنكم راضٍ"

ثم وجب أن يُقَدَّرَ القدرُ الذى يُعطَى العمالُ في عملهم، لئلا يُجاوزه الإمامُ، فَيُفْرِط أو يُفَرِّطَ، ولا يعدوه العاملُ بنفسه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" من كان لنا عاملاً فليكتسب زوجةً، فإن لم يكن له خادم فليكتسب خادما، فإن لم يكن له مسكن فليكتسب مسكنا"

فإذا بعث الإمام العاملَ في صدقاتِ سنةٍ: فليجعل له فيها مايكفي مؤونَتَه، ويَفْضُلُ فضلٌ يَقْدِرُ به على حاجة من هذه الحوائج، فإن الزائد لاحدَّ له، والمؤونةُ بدون زيادة لا يتعانىٰ لها العاملُ، ولايرغب فيها.

ترجمہ: پھر بیشک امام: جب وہ بذاتِ خود طاقت نہیں رکھتا کہ خود کرے صدقات کی وصولی، اور عشروں کی فراہمی، اور ملک کے ہر گوشہ میں جھگڑوں کے فیصلے کرے تو ضروری ہوا عمال وقضات کا بھیجنا۔ اور جب یہ لوگ عام لوگوں کی مصلحتوں کے معاملہ میں مشغول ہیں تو ضروری ہوا کہ ان کی تنخواہ بیت المال میں ہو —— پھر ضروری ہے کہ عامل کو آسانی کرنے کا حکم دیا جائے۔ اور حکومت کے مال میں خیانت اور رشوت ستانی سے روکا جائے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جائے عامل کی اطاعت کا، تاکہ مصلحتِ مقصودہ تکمیل پذیر ہو —— پھر ضروری ہے کہ اندازہ کیا جائے اس مقدار کا جو ملازمین ان کے کام پر دیئے جائیں گے، تاکہ امام اس سے تجاوز نہ کرے، پس وہ نہ زیادتی کرے نہ کوتاہی کرے۔ اور عامل بذاتِ خود بھی اس سے تجاوز نہ کرے —— پس جب امام عامل کو سال کے صدقات کی وصولی کے لئے بھیجے یعنی وہ مستقل سال بھر کا ملازم ہو تو چاہئے کہ اس کے لئے صدقات میں سے مقرر کرے وہ جو اس کے مصارف کے لئے کافی ہو، اور کچھ بچ رہے۔ جس کے ذریعہ وہ قادر ہو ان حوائج میں سے (جن کا حدیث میں تذکرہ ہے) کسی حاجت پر۔ پس بیشک (حدیث میں مذکور حوائج سے) زائد کے لئے کوئی حد نہیں۔ اور (بالکل) زیادتی کے بغیر تنخواہ: نہیں مشقت برداشت کرے گا اس کے لئے عامل، اور نہ وہ اس میں رغبت کرے گا۔

باب ــــــ ۳

مظالم کا بیان

ظلم وزیادتی کے سلسلہ میں اصولی بات

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد ظلم وزیادتی کا ازالہ ہے۔ ناانصافیاں نظام زندگی کو درہم برہم کردیتی ہیں۔ اور لوگوں کو تنگیوں میں مبتلا کردیتی ہیں۔ اور یہ بات اتنی واضح ہے کہ مزید وضاحت کی ضرورت نہیں۔

اور ظلم وزیادتی تین قسم کی ہے: جان پر زیادتی، اعضاء انسانی پر زیادتی اور لوگوں کے اموال پر زیادتی۔ پس حکمت خداوندی نے چاہا کہ ان سب مظالم پر ایسی سخت تنبیہ کی جائے کہ لوگ آئندہ ایسی حرکتوں سے باز آجائیں۔

اور یہ بات مناسب نہیں کہ تنبیہات ایک درجہ کی ہوں۔ کیونکہ جرم جرم برابر نہیں: قتل اعضاء کاٹنے کی طرح نہیں، اور اعضاء کاٹنا مال ہلاک کرنے کی طرح نہیں۔ اور جن جذبات سے یہ مظالم وجود میں آتے ہیں وہ بھی ایک درجہ کے نہیں۔ جان بوجھ کر قتل کرنا، اور لاپروائی برتنا جس سے قتل ہوجائے یکساں نہیں۔

اور مظالم میں سب سے سنگین قتل ہے۔ وہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ تمام مذاہب کے لوگ اس پر متفق ہیں۔ اور اس کی سنگینی کی وجہ یہ ہے کہ قتل: سخت غصہ کے تقاضے کی پیروی میں ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے لوگوں میں سخت فساد برپا ہوتا ہے۔ وہ تخلیق الٰہی میں تبدیلی، اللہ کی عمارت کو گرانا اور نوع انسانی کے پھیلنے کا جو فیصلۂ خداوندی ہے اس کو توڑنا ہے۔

﴿المظالم﴾

اعلم: أن من أعظم المقاصد التي قُصدتْ ببعثة الأنبياء عليهم السلام: دفع المظالم من بين الناس، فإن تظالُمَهم يُفسد حالَهم، ويُضَيِّقُ عليهم، ولاحاجة إلى شرح ذلك.

والمظالم على ثلاثة أقسام: تَعَدٍّ على النفس، وتعدٍّ على أعضاء الناس، وتعدٍّ على أموال الناس، فاقتضت حكمةُ الله أن يُزْجَرَ عن كل نوع من هذه الأنواع بزواجرَ قويةٍ تَرْدَعُ الناس عن أن يفعلوا ذلك مرةً أخرى.

ولا ينبغي أن يُجعل هذه الزواجرُ على مرتبةٍ واحدةٍ: فإن القتلَ ليس كقطع الطرف، ولا قطعَ الطرف كاستهلاك المالِ؛ وإن الدواعي التي تنبعث منها هذه المظالم لها مراتب: فمن البديهيِّ أن تَعَمُّدَ القتلِ ليس كالتساهل المُنْجَرِّ إلى الخطأ.

فأعظمُ المظالم القتلُ، وهو أكبر الكبائر، أجمع عليه أهل الملل قاطبتُهم؛ وذلك: لأنه طاعةُ النفس في داعية الغضب، وهو أعظمُ وجوهِ الفساد فيما بين الناس، وهو تغييرُ خلق الله، وهدمُ بُنيان الله، ومناقضةُ ماأراد الحقُّ في عباده من انتشار نوع الإنسان.

ترجمہ: واضح ہے۔ **لغات**: الزواجر جمع الزَّاجر: دھمکانے والا، جھڑکی، تنبیہ..... اِنْجَرَّ: کھچنا، گھسٹنا۔ ترجمہ: اس لاپروائی کی طرح جو چوک تک گھسٹنے والی ہے۔ یعنی جس کے نتیجہ میں چوک ہوجاتی ہے..... وهو تغيير سے آخر تک۔ سب جملوں کا ایک مطلب ہے۔

☆ ☆ ☆

قتل کی تین قسمیں

قتل تین قسموں کا ہوتا ہے: قتلِ عمد، قتلِ خطا اور قتلِ شبہ عمد:

قتلِ عمد: وہ قتل ہے جو (بظاہر) جان سے ختم کرنے کے ارادہ سے کسی ایسے آلہ سے کیا گیا ہو، جس سے عام طور پر آدمی مرجاتا ہے، خواہ وہ زخمی کرنے والا ہتھیار ہو، خواہ کوئی وزنی چیز جیسے بڑا پتھر۔

قتلِ خطا: وہ قتل ہے جس میں آلۂ قتل مارنے کا ارادہ نہ ہو، غلطی سے لگ جائے، اور مرجائے۔ جیسے کوئی کسی پر گر پڑے اور وہ مرجائے۔ یا کوئی درخت کو تیر مارے اور وہ آدمی کو لگ جائے اور وہ مرجائے۔

قتلِ شِبہ عمد: وہ قتل ہے جس میں کسی شخص کو کوئی ایسا آلہ مارا جائے جس سے عام طور پر آدمی نہیں مرتا، پس وہ مرجائے۔ جیسے کوڑا یا لاٹھی ماری پس وہ مرگیا۔

اور قتل کی یہ تین قسمیں اس لئے ہیں کہ ابھی یہ بات بیان کی گئی ہے کہ قتل کی سزا ایسی ہونی چاہئے جو داعیۂ قتل اور اس کی پیدا کی ہوئی خرابی کی مقاومت (مقابلہ، برابری) کرے۔ اور جذبہ اور خرابی کے درجات ہیں۔ پس چونکہ قتل عمد میں خرابی زیادہ اور جذبہ نہایت قبیح ہے، اس لئے ضروری ہے کہ سزا ایسی سخت دی جائے کہ نانی یاد آجائے۔ اور قتل خطا کی خرابی کم اور داعیہ ہلکا ہوتا ہے، اس لئے سزا میں تخفیف ضروری ہے۔ اس طرح قتل کی دو قسمیں ہوگئیں۔

پھر نبی ﷺ نے قرآن کریم سے عمد وخطا کے درمیان ایک اور قسم مستنبط فرمائی۔ اور وہ شِبہ عمد ہے۔ جس کی دونوں سے مشابہت ہے یعنی اس میں آلہ مارنے کا ارادہ ہوتا ہے، اس لئے عمد کے مشابہ ہے۔ اور آلہ قاتل نہیں ہوتا، اس لئے خطا کے مشابہ ہے۔ پس وہ دونوں کے بیچ کا درجہ ہے۔ اس لئے اس کو علحدہ قسم قرار دینا ضروری ہے۔ اس طرح قتل کی تین قسمیں ہوگئیں۔

وضاحت: قتل درحقیقت دو ہی ہیں: عمد اور خطا۔ پھر قتل خطا کی دو قسمیں ہیں: خطا محض اور خطا مشابہ عمد۔ اور جاری مجری خطا اور قتل بالسبب درحقیقت قتل خطا محض ہیں۔ قرآن کریم نے سورۃ النساء آیت ۹۳ میں قتل عمد اور آیت ۹۲ میں قتل

خطا کا تذکرہ کیا ہے۔اسی قتل خطا کی نبی ﷺ نے دو قسمیں کی ہیں ـــــ اور وزنی چیز سے قتل صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عمد ہے۔امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک شبہ عمد ہے۔

والقتلُ على ثلاثة أقسام: عمد، وخطأ، وشِبْهُ عمد:

فالعمد: هو القتل الذى يُقْصَدُ فيه إزهاقُ روحه، بما يَقْتُلُ غالبًا، جارحًا أو مُثَقَّلاً.

والخطأ: مالا يُقصد فيه إصابتُه، فيصيبُه فيقتُله، كما إذا وقع على إنسان، فمات، أو رمى شجرةً فأصابه، فمات.

وشِبْهُ العمد: أن يَقصد الشخصَ بمالا يُقْتَلُ غالبًا، فيقتُله، كما إذا ضرب بسوط أوعصا، فمات.

وإنما جُعل على ثلاثة أقسام لِما أشرنا من قبلُ: أن الزاجرَ ينبغي أن يكون بحيث يقاوم الداعيةَ والمفسدة، ولهما مراتبُ، فلما كان العمدُ أكثرَ فسادًا، وأشدَّ داعيةً: وجب أن يُغَلَّظ فيه بما يَحْصُلُ زيادةَ الزجر؛ ولما كان الخطأُ أقلَّ فسادًا، وأخفَّ داعيةً: وجب أن يُخفَّف في جزائه؛ واستنبط النبيُّ صلى الله عليه وسلم بين العمد والخطأ نوعًا آخر، لمناسبة منهما، وكونه برزخًا بينهما، فلا ينبغي أن يُدخل في أحدهما.

ترجمہ:اورقتل تین قسموں پر ہے: عَمْد (میم کے سکون کے ساتھ)اور خطااور شِبہ عمد ـــــ پس عمد: وہ قتل ہے جس میں (بظاہر حال) ارادہ کیا گیا ہو آدمی کی روح نکالنے کا یعنی جان سے مار ڈالنے کا، ایسے آلہ کے ذریعہ جو عام طور پر مار ڈالتا ہے، زخمی کرنے والا یعنی اعضاء جدا کرنے والا ہو یا کوئی بھاری چیز ـــ اور خطا: وہ قتل ہے جس میں آدمی کو پہنچنے کا ارادہ نہ کیا گیا ہو، پس وہ اس کو پہنچ جائے، پس وہ اس کو مار ڈالے، جیسا کہ جب کوئی شخص کسی انسان پر گر پڑے، پس وہ مر گیا، یا کسی درخت کو تیر مارا، پس وہ آدمی کو لگ گیا، پس وہ مر گیا ـــ اور شبہ عمد: وہ ہے کہ ارادہ کرے آدمی کسی شخص کا ایسی چیز کے ذریعہ جو عام طور پر مار نہیں ڈالتی، پس وہ چیز اس شخص کو مار ڈالے، جیسا کہ جب کوڑے یا لاٹھی سے مارا، پس وہ مر گیا۔

اور قتل تین ہی قسموں پر گردانا گیا ہے: اس بات کی وجہ سے جس کی طرف ہم نے قبل ازیں اشارہ کیا ہے کہ جھڑکنے والا یعنی سزا: مناسب ہے کہ ہو وہ بایں طور کہ مقابلہ (برابری) کرے وہ داعیہ (جذبۂ قتل) اور خرابی کی۔اور ان دونوں (جذبہ رخرابی) کے لئے درجات ہیں۔پس جب قتل عمد خرابی کے اعتبار سے زیادہ اور جذبہ کے اعتبار سے سخت تھا تو ضروری ہوا اس میں سختی کی جائے، ایسی سزا کے ذریعہ جو جھڑکی کی زیادتی کو اکٹھا کرے یعنی اس میں زجر مع زیادتی ہو یعنی سخت ہو۔ اور جب قتل خطا خرابی کے اعتبار سے کم اور جذبہ کے اعتبار سے ہلکا تھا تو ضروری ہوا کہ اس کی سزا میں تخفیف کی جائے۔اور نبی ﷺ نے عمد و خطا کے درمیان ایک دوسری قسم (قرآن کریم سے) مستنبط فرمائی۔دونوں سے مناسبت کی وجہ سے، اور

دونوں کے درمیان برزخ ہونے کی وجہ سے، پس مناسب نہیں کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک میں داخل کی جائے۔

☆ ☆ ☆

قتلِ عمد کا بیان

قتلِ عمد قابلِ معافی کبیرہ گناہ ہے

سورۃ النساء آیت ۹۳ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہونگے، اور اس کو اپنی رحمت سے دور کردیں گے، اور اس کو بڑا سخت عذاب دیں گے''

تفسیر: اس ارشاد پاک سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمداً کسی مؤمن کو قتل کرنے والے کی بخشش نہیں ہوگی۔ اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا مسلک ہے۔ مگر جمہور کے نزدیک قتل عمد بھی دیگر کبائر کی طرح ہے۔ جو سچی توبہ سے معاف ہوسکتا ہے۔ ظاہر احادیث سے یہی بات مفہوم ہوتی ہے۔

جمہور کی دلیل: (۱) سورۃ النساء آیت ۴۸ و ۱۱۶ میں ارشاد پاک ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَايَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ، وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ ترجمہ: اللہ تعالیٰ اس بات کو تو یقیناً نہیں بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے علاوہ اور جتنے گناہ ہیں: جس کے لئے منظور ہوگا بخش دیں گے۔ اور عمداً قتلِ مؤمن شرک کے علاوہ گناہ ہے، پس وہ قابل معافی ہے۔

(۲) حدیث میں ایک اسرائیلی کا واقعہ آیا ہے جس نے ننانوے قتل کئے تھے۔ پھر اس کو ندامت ہوئی۔ اس نے ایک عابد سے دریافت کیا کہ میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ اس نے نفی میں جواب دیا۔ اس شخص نے اس عابد کو بھی نمٹا دیا، اور سو کی تعداد پوری کردی۔ پھر اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے ایک عالم سے دریافت کیا کہ کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ عالم نے جواب دیا: نعم! ومن یحولُ بینه وبین التوبة: جی ہاں قبول ہوسکتی ہے! اور بندے اور توبہ کے درمیان بھلا کون حائل ہوسکتا ہے؟! (مسلم شریف ۱۷: ۸۳ مصری کتاب التوبۃ)

آیت کی تاویل: اور آیت پاک میں جو وعیدیں ہیں وہ زجر و توبیخ کے لئے ہیں۔ اور خلود سے مراد: مدتِ دراز تک جہنم میں رہنا ہے۔ یا خلود اس کے لئے ہے جو مؤمن کے قتل کو حلال سمجھتا ہے، یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ قاتل مستحق تو اسی سزا کا ہے، آگے اللہ مالک ہیں، جو چاہیں کریں!

ابن عباسؓ کے مسلک کی حقیقت: اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما مصلحۃً سختی کرتے تھے۔ روایت ہے کہ حضرت

ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو مؤمن کو قتل کرے اس کی توبہ مقبول ہے۔ راوی کہتے ہیں: پھر آپؓ کے پاس ایک شخص آیا، اور دریافت کیا: کیا اس شخص کے لئے جو کسی مؤمن کو قتل کرے توبہ ہے؟ آپؓ نے فرمایا: ''نہیں! مگر دوزخ!'' جب وہ چلا گیا تو حاضرین نے عرض کیا: آپؓ ہمیں یہ فتوی تو نہیں دیا کرتے تھے! آپؓ تو ہمیں یہ فتوی دیا کرتے تھے کہ جو مؤمن کو قتل کرے اس کی بھی توبہ مقبول ہے۔ پھر آج کیا بات ہوئی؟ ابن عباسؓ نے فرمایا: ''میرا خیال ہے کہ یہ شخص کسی پر غضبناک ہے وہ کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے'' چنانچہ تحقیق حال کے لئے اس کے پیچھے ایک آدمی بھیجا گیا تو ایسا ہی نکلا (درمنثور ۲: ۱۹۸)

کفارہ کا مسئلہ: قتل خطا کی طرح قتل عمد میں بھی کفارہ (مسلمان غلام آزاد کرنا اور وہ نہ ملے تو دو ماہ کے متواتر روزے رکھنا) واجب ہے یا نہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ کیونکہ قتل عمد: قتل خطا سے بھاری گناہ ہے۔ اور قتل خطا میں کفارہ کی صراحت ہے۔ پس قتل عمد میں بدرجۂ اولی کفارہ ہوگا۔ اور باقی تین ائمہ کے نزدیک کفارہ واجب نہیں۔ دے تو بہتر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قتل عمد میں کفارہ کی صراحت نہیں کی۔ اور قتلِ خطا پر قیاس درست نہیں۔ کیونکہ وہ ہلکا گناہ ہے۔ کفارہ سے اس کی معافی ہوسکتی ہے: قتل عمد کا گناہ معاف نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے سچی پکی توبہ ضروری ہے۔ اور اس کی نظیر یمینِ غَموس ہے۔ اس میں بھی ایسا ہی اختلاف ہے۔

فالعمد : فيه قوله تعالى: ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ هُ جَهَنَّمُ، خَالِدًا فِيْهَا، وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ، وَلَعَنَهُ، وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ ظاهره: أنه لايُغفر له، وإليه ذهب ابن عباس رضى الله عنهما، لكنَّ الجمهورَ وظاهرَ السنةِ: على أنه بمنزلة سائر الذنوب، وأن هذه التشديداتِ للزجر، وأنها تشبيهٌ لطولِ مكثه: بالخلود؛ واختلفوا فى الكفارة: فإن الله تعالى لم يَنُصَّ عليها فى مسألة العمد.

ترجمہ: ...... لیکن جمہور اور احادیث کا ظاہر اس پر ہے کہ (۱) وہ بمنزلہ دیگر گناہوں کے ہے (۲) اور یہ کہ یہ وعیدیں جھڑکنے کے لئے ہیں (۳) اور یہ کہ وعیدیں اس کے لمبے زمانہ تک ٹھہرنے کو خلود (ہمیشہ رہنے) کے ساتھ تشبیہ دینا ہے۔ اور علماء نے کفارہ میں اختلاف کیا ہے۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ نے قتل عمد کے مسئلہ میں (سورۃ النساء آیت ۹۳ میں) کفارہ کی صراحت نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

قصاص کے معنی برابری کرنا

سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸ میں ارشاد پاک ہے: ''اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کرنا فرض کیا گیا ہے: آزاد آزاد کے بدل، اور غلام: غلام کے بدل، اور عورت: عورت کے بدل'' الی آخرہ۔

شانِ نزول: اسلام سے کچھ پہلے عرب کے دو قبیلوں میں جنگ ہوئی۔ طرفین کے بہت سے آدمی: آزاد، غلام اور عورتیں قتل ہوئیں۔ ابھی ان کے معاملہ کا تصفیہ نہیں ہوا تھا کہ اسلام کا زمانہ آ گیا۔ اور دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے۔ پھر ان میں قصاص کی گفتگو شروع ہوئی۔ جو قبیلہ قوت وشوکت والا تھا، اس نے کہا: ''ہم ضرور غلام کے بدلے میں آزاد کو، اور عورت کے بدلے میں مرد کو قتل کریں گے۔ اور زخم بھی ایک کے بدل چند لگائیں گے'' اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اور ان کا مطالبہ رد کر دیا گیا (ابن کثیر و درمنثور)

آیت کا مطلب: عام طور پر قصاص کے اصطلاحی معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ قصاص کے اصطلاحی معنی ہیں: قَوَد۔ یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل کو قتل کرنا فرض ہے۔ مگر شاہ صاحب رحمہ اللہ اس کے لغوی معنی مراد لیتے ہیں۔ قصاص کے لغوی معنی ہیں: برابری کرنا۔ مجرم سے برابر کا بدلہ لینا۔ زیادتی نہ کرنا۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ مقتولوں کے مخصوص اوصاف: جیسے عقل وفہم، حسن وجمال، چھوٹا بڑا ہونا، مقتول کا معزز یا مالدار ہونا وغیرہ امور کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ سب جانیں برابر ہیں۔ بلکہ ناموں اور کلی احتمالی جگہوں کا اعتبار کیا جائے گا۔ پس مرد مرد برابر ہیں۔ اور غلام غلام برابر ہیں۔ اور عورت عورت برابر ہیں۔ چنانچہ سب عورتوں کی ایک دیت ہے، اگرچہ اوصاف میں تفاوت ہو۔ پس قصاص کے معنی ہیں: برابری کرنا۔ یعنی دو شخصوں کو ایک ہی حکم میں رکھنا۔ ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دینا۔ اصطلاحی معنی مقتول کی جگہ قاتل کو قتل کرنا مراد نہیں۔

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے الفوز الکبیر میں اس تفسیر کا فائدہ یہ بیان کیا ہے کہ الأنثیٰ بالأنثیٰ میں تاویلات رکیکہ سے نجات مل جائے گی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے الحر بالحر میں مفہوم مخالف لیا ہے۔ ان کے نزدیک: غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔ احناف کے نزدیک: غیر کے غلام کے بدلہ میں آزاد کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ ان کے نزدیک مفہوم مخالف حجت نہیں۔ پھر جب و العبد بالعبد میں مفہوم مخالف لینے کا نمبر آیا تو شوافع نے کہا کہ آزاد کے بدلے میں غلام کو قتل کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ ترقی ہے۔ پھر جب الأنثیٰ بالأنثیٰ میں مفہوم مخالف لینے کا نمبر آیا تو شوافع کے لئے چارۂ کار نہ رہا۔ کیونکہ عورت کے بدلے میں مرد کو بالاجماع قتل کیا جائے گا۔ اور انھوں نے ایسی تاویلات کیں جو معمولی توجہ سے لغو ثابت ہوتی ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے اس کا دروازہ بند کر دیا کہ آیت میں برابری کرنے کا بیان ہے۔ اور الحر بالحر الخ اسی برابری کی مثالیں ہیں۔ یہ مسائل نہیں ہیں۔ جو مفہوم مخالف لینے نہ لینے کا سوال پیدا ہو (الخیر الکثیر ص ۴۶۱)

قال الله تعالى: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى: اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ، وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ، وَالْأُنْثٰى بِالْأُنْثٰى﴾ الآيَةَ: نزلت في حَيَّيْنِ من أحياء العرب: أحدهما أشرفُ من الآخر، فقتل الأَوْضَعُ من الأشرف قَتْلٰى، فقال الأشرف: لَنقتُلَنَّ الحرَّ بالعبد، والذكر بالأنثى، ولَنُضَاعِفَنَّ الجِرَاحَ.

ومعنى الآية ــــ والله أعلم ــــ أن خصوصَ الصفات لايُعتبر في القتلى، كالعقل، والجَمال، والصِغَر والكبر، وكونِهِ شريفًا، أو ذامال، ونحوِ ذلك؛ وإنما تُعتبر الأسامي والمظانُّ الكليةُ: فكل امرأةٍ مكافئةٌ لكل امرأةٍ، ولذلك كانت دياتُ النساء واحدةً، وإن تفاوت الأوصافُ؛ وكذلك الحرُّ يكافِئُ الحرَّ، والعبدُ يكافئُ العبد؛ فمعنى القصاص: التكافُؤُ، وأن يُجعلَ اثنان في درجة واحدة من الحُكم، لايُفضَّلُ أحدهما على الآخر، لا القتلُ مكانَه ألبتةَ.

ترجمہ: یہ آیت عرب کے قبائل میں سے دو قبیلوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ دوسرے سے معزز تھا۔ پس فروتر قبیلہ نے معزز قبیلہ کے چند آدمیوں کو قتل کیا۔ پس معزز نے کہا: ''ہم ضرور غلام کے بدلہ میں آزاد کو قتل کریں گے، اور عورت کے بدلہ میں مرد کو۔ اور ہم ضرور زخموں کو دوچند کریں گے'' ــــ اور آیت کے معنی ــــ اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں ــــ یہ ہیں کہ مقتولوں میں مخصوص اوصاف معتبر نہیں۔ جیسے عقل، جمال، چھوٹا بڑا ہونا، اور مقتول کا معزز یا مالدار ہونا۔ اور اس کے مانند اوصاف۔ اور اعتبار ناموں اور کلی احتمالی جگہوں ہی کا کیا جائے گا۔ پس ہر عورت: ہر عورت کے برابر ہے۔ اور اسی وجہ سے عورتوں کی دیت ایک ہے، اگرچہ اوصاف میں تفاوت ہو۔ اور اسی طرح آزاد: آزاد کے برابر ہے۔ اور غلام: غلام کے برابر ہے۔ پس قصاص کے معنی: ''دو چیزوں کا برابر ہونا'' ہیں۔ اور یہ معنی ہیں کہ حکم میں دونوں ایک درجہ میں ہیں۔ ان میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جائے۔ نہیں ہیں معنی: ''قطعاً مقتول کی جگہ میں قتل کرنا'' (کیونکہ قصاص حد نہیں، اس کی معافی درست ہے)

قوله: المظانُّ الكلية اي ما صدقت عليه الأسماء صدقًا كليا، كاسم العبد مثلاً، فإنه يصدق على كل إنسان مملوك صدقا كليا، لاتفاوت فيه، بخلاف العاقل، والجميل، والشريف مثلاً (سندي)

☆　☆　☆

مسلمان کو کافر کے بدلہ میں قتل نہ کرنے کی وجہ

کافر چار ہیں:

ذمّی: وہ غیر مسلم ہے جس کو اسلامی ملک کی شہریت (NATIONALITY) حاصل ہے۔ وہ ذمّی اس لئے کہلاتا ہے کہ اس کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی گورنمنٹ نے لی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کی ہے: أُوصِيه بذمة الله وذمة رسوله صلى الله عليه وسلم أن يُوْفِي لهم بعهدهم إلخ یعنی میں بعد والے خلیفہ کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ غیر مسلم رعایا کے ساتھ کی ہوئی اللہ ورسول کی ذمہ داری پوری کرے (بخاری حدیث ۱۳۹۲)

مستأمن: (امن طلب کرنے والا) وہ غیر مسلم ہے جو ویزا لے کر اسلامی ملک میں آیا ہے۔

مُعاہد: (عہدو پیمان کرنے والا) وہ غیر مسلم ہے جس کے ساتھ اسلامی مملکت نے ناجنگ معاہدہ کر رکھا ہے۔

حربی: وہ غیر مسلم ہے جو دارالحرب کا باشندہ ہے۔

مُستأمن، معاہد اور حربی کے بارے میں اتفاق ہے کہ اس کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اور ذمی میں اختلاف ہے: احناف کے نزدیک قتل کیا جائے گا۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اسکی دیت ادا کی جائے گی۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل: بخاری شریف کی روایت (حدیث ۱۱۱) ہے: لایُقتل مسلم بکافر: کسی کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل نہ کیا جائے۔ اس میں ''کافر'' عام ہے۔ چاروں قسموں کو شامل ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کا ایک اہم مقصد: ملتِ اسلامیہ کی شان بلند کرنا ہے۔ اور یہ مقصد اس وقت حاصل ہوسکتا ہے جب مسلمان کو کافر پر ترجیح دی جائے، اور دونوں میں برابری نہ کی جائے۔ پس اگر کافر کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کیا جائے گا تو گھوڑے گدھے برابر ہوجائیں گے۔ اور شریعت کا ایک اہم مقصد فوت ہوجائے گا۔

فائدہ: اور احناف کے نزدیک یہ حدیث ذمی کو شامل نہیں، کیونکہ متعدد ضعیف روایات میں یہ بات مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاءِ راشدین میں سے حضرات عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم نے ذمی کے بدلہ میں مسلمان کو قتل کیا ہے، یا اس کا حکم دیا ہے۔ یہ روایات اعلاء السنن (۱۸: ۹۴-۱۰۵) میں ہیں۔ اور ان کی سندوں پر تفصیلی کلام بھی ہے۔ یہ روایات اگرچہ متکلم فیہ ہیں، مگر سب مل کر قوی قابل استدلال ہیں۔ اور اتنی بات جاننے کے لئے کافی ہیں کہ مذکورہ روایت ذمی کو شامل نہیں۔

اور مسلمان سے ذمی کا قصاص دو وجہ سے لینا ضروری ہے:

پہلی وجہ: قصاص کی علت: ابدا محقون الدم ہونا ہے یعنی جس کا خون ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو، اس کو اگر کوئی شخص عمداً ہتھیار سے یا کسی بھاری چیز سے قتل کرے تو قاتل کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ اور ذمی میں یہ علت موجود ہے۔ جب اس کو اسلامی ملک کی شہریت حاصل ہے تو اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ پس اس کے قاتل کو حکومت قصاصاً قتل کرے گی۔

دوسری وجہ: ذمی کا مسلمان سے قصاص نہ لینا سیاستِ مدنیہ یعنی ملکی انتظام کی رو سے بھی درست نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی بھی غیر مسلم اسلامی ملک میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ وہ خود کو دوسرے درجہ کا شہری تصور کرے گا۔ اور ہر وقت اس کو دھڑکا لگا رہے گا کہ کوئی مسلمان اسے قتل کردے۔ رہی ملتِ اسلامیہ کی شان بلند کرنے کی بات تو ایفائے عہد سے بھی اسلام کی شان بلند ہوتی ہے۔

آزاد کو غلام کے بدلہ میں قتل نہ کرنے کی وجہ

آقا اگر اپنے غلام کو قتل کرے تو بالاتفاق آقا کو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا۔ ملکیت سے شُبہ پیدا ہوگا، اور حد اٹھ جائے

گی۔البتہ انتظامی نقطۂ نظر سے جو سزا مناسب ہوگی وہ دی جائے گی۔حدیث میں ہے: جو اپنے غلام کو قتل کرے گا: ہم اس کو قتل کریں گے۔اور جو اپنے غلام کے اعضاء کاٹے گا: ہم اس کے اعضاء کاٹیں گے (ابوداؤد حدیث ۴۵۱۵) یہ ارشاد باب سیاست وتعزیر سے ہے۔

اور اگر دوسرے کے غلام کو عمداً قتل کرے تو اس میں اختلاف ہے: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: آزاد کو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا۔اور حنفیہ کے نزدیک کیا جائے گا۔ائمہ ثلاثہ نے یہ مسئلہ ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ کے تقابل سے اخذ کیا ہے۔اور اس مسئلہ میں حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ضعیف روایات بھی ہیں کہ کوئی آزاد کسی غلام کے بدلہ میں قتل نہ کیا جائے (دیکھیں سنن بیہقی ۸:۳۴)

اور حنفیہ کی دلیل حدیث: اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَکَافَأُ دِمَائُهُمْ ہے یعنی تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۳۴۷۵) اور مسلمان غلام ہمیشہ کے لئے محقون الدم بھی ہے۔پس اس کے بدلہ میں آزاد کو قتل کیا جائے گا۔اور مذکورہ روایات ضعیف ہیں۔نیز ان میں اپنا غلام مراد ہونے کا احتمال ہے، اور مفہوم مخالف احناف کے نزدیک حجت نہیں، اس لئے قصاص جاری ہوگا (شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس مسئلہ میں کچھ نہیں لکھا)

مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کرنے کی وجہ

اگر کوئی مرد کسی عورت کو عمداً قتل کرے تو مرد کو بالاتفاق قصاصاً قتل کیا جائے گا۔اور اس کی دلیل دو حدیثیں ہیں:

پہلی حدیث —— ایک باندی جنگل میں بکریاں چرا رہی تھی۔اس نے چاندی کے زیورات پہن رکھے تھے۔ایک یہودی نے زیورات کے لالچ میں دو پتھروں سے اس کا سر کچل دیا۔اور زیورات لیکر چل دیا۔اتفاق سے وہ باندی مری نہیں تھی۔اس کا نزعی بیان لیا گیا۔پوچھا گیا: کیا تجھے فلاں نے مارا ہے؟ فلاں نے مارا ہے؟ یہاں تک کہ اس یہودی کا نام لیا گیا۔باندی نے اشارہ سے کہا: ہاں۔وہ یہودی پکڑا گیا۔اس نے قتل کا اعتراف کیا۔اور وہ زیورات بھی اس کے پاس سے برآمد ہوئے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اس کا سر پتھر سے کچل دیا گیا (مشکوٰۃ حدیث ۳۴۵۹)

دوسری حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے ہمدان وغیرہ قبائل کے نوابوں کو ایک تحریر بھیجی ہے، جس میں فرائض، سنن اور دیات کا تذکرہ ہے۔اس میں ہے کہ: ''مرد کو عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے'' (نسائی ۸:۵۸ کتاب القسامۃ، ذکر حدیث عمرو بن حَزْم في العقول)

تشریح: عورت میں دو جہتیں ہیں۔اور دونوں کے تقاضے مختلف ہیں:

ایک جہت یہ ہے کہ عورت مرد کے برابر نہیں۔مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔کیونکہ مرد عورت پر حاکم بنایا گیا ہے۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل نہ کیا جائے۔

اور دوسری جہت: یہ ہے کہ عورت مرد دونوں برابر ہیں۔ دونوں انسان ہیں۔ اور دونوں میں صنفی تفاوت بس ایسا ہے جیسا بچے اور بڑے کا تفاوت، یا موٹے اور دبلے کا تفاوت۔ اور ایسے فرق کا قصاص میں لحاظ کرنا سخت دشوار ہے۔ بلکہ بعض عورتیں خصالِ حمیدہ میں مردوں سے آگے ہوتی ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ مرد سے قصاص لیا جائے۔

پس دونوں جہتوں کو روبعمل لانا ضروری ہے۔ کسی بھی جہت سے صرفِ نظر نہیں کرسکتے۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ قصاص میں برابری کا اعتبار کیا جائے، اور دیت میں نابرابری کا۔ چنانچہ عورت کی دیت: مرد کی دیت سے آدھی ہے۔

اور ایسا اس لئے کیا گیا کہ عورتوں پر مردوں کے ظلم کا دروازہ بند ہوجائے۔ اگر مرد کو قصاصاً قتل نہیں کیا جائے گا تو وہ عورتوں پر زیادتی کریں گے۔ کیونکہ عورت ناتواں کمزور ہوتی ہے۔ اس کو قتل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مرد کا قتل کرنا مشکل ہے۔ وہ دوبدو مقابلہ کرے گا۔ عورت بے چاری کیا مقابلہ کرسکتی ہے۔ پس مرد کو قصاصاً قتل کرکے: ان کو عورتوں پر ظلم سے باز رکھنا نہایت ضروری ہے۔

ثم أثبتت السنةُ: أن المسلم لايُقتل بالكافر، وأن الحر لايُقتل بالعبد؛ والذكر يُقتل بالأنثى: لأن النبي صلى الله عليه وسلم قتل اليهوديّ بجارية، وفي كتاب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أَقْيَالِ همدانَ: "ويُقتل الذكر بالأنثى"

وسِرُّه: أن القياس فيه مختلف:

[الف] ففضلُ الذكور على الإناث، وكونُهم قوَّامين عليهن، يقتضي أن لايُقادَبها.

[ب] وأن الجنس واحد، وإنما الفرقُ بمنزلة فرق الصغير والكبير، وعظيمِ الجثة وحقيرِها، ورعايةُ مثلِ ذلك عسيرة جدًا، وربَّ امرأةٍ: هي أتمُّ من الرجال في محاسن الخصال: يقتضي أن يُقاد.

فوجب أن يُعمل على القياسين: وصورةُ العمل بهما: أنه اعتُبر المقاصَّةُ في القَوَدِ، وعدمُ المقاصَّةِ في الدية.

وإنما فُعل ذلك: لأن صاحبَ العمد قَصَدَها، وَقَصَدَ التعدّى عليها، والمتعمِّدُ المتعدى ينبغي أن يُذَبَّ عنها أتمَّ ذَبٍّ، فإنها ليست بذاتِ شوكة، وقتلُها ليس فيه حرجٌ، بخلاف قتل الرجال، فإن الرجل يُقاتِلُ الرجلَ، فكانت هذه الصورةُ أحقَّ بإيجاب القَوَدِ، ليكون رَدْعًا وزجرًا عن مثله.

وقال صلى الله عليه وسلم: "لا يُقتل مسلم بكافر"

أقول: والسر في ذلك: أن المقصودَ الأعظمَ في الشرع تنويهُ الملة الحنيفية، ولا يحصل إلا بأن يُفضَّلَ المسلمُ على الكافر، ولا يُسوَّى بينهما.

ترجمہ: پھر احادیث نے ثابت کیا کہ (۱) مسلمان کافر کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا (۲) اور یہ کہ آزاد غلام کے بدلہ میں قتل نہیں کیا جائے گا (۳) اور مرد عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا: اس لئے کہ نبی ﷺ نے یہودی کو باندی کے بدلہ میں قتل کیا ہے (مگر یہ قتل: محاربہ یعنی ڈاکہ زنی کی سزا تھی، پس اس سے استدلال محل نظر ہے) اور قبیلۂ ہمدان کے نوابوں کی طرف رسول اللہ ﷺ کے خط میں ہے: ''اور مرد عورت کے بدلہ میں قتل کیا جائے'' — اور اس کا راز یہ ہے کہ اس بارے میں قیاس مختلف ہیں: (الف) پس مردوں کی عورتوں پر برتری، اور مردوں کا عورتوں پر حاکم ہونا: چاہتا ہے کہ عورت کے بدلہ میں قصاص نہ لیا جائے —— (ب) اور یہ بات کہ جنس یعنی نوع ایک ہے، اور فرق ایسا ہی ہے جیسا بچہ اور بڑے میں اور موٹے اور دبلے میں۔ اور (قصاص میں) اس قسم کے امور کا لحاظ نہایت دشوار ہے۔ اور کوئی عورت خصالِ حمیدہ میں مردوں سے زیادہ تام ہوتی ہے: چاہتا ہے کہ قصاص لیا جائے۔

پس ضروری ہے کہ دونوں قیاسوں پر عمل کیا جائے۔ اور دونوں پر عمل کی شکل یہ ہے کہ قصاص میں برابری کا اعتبار کیا جائے، اور دیت میں نابرابری کا — اور ایسا اس لئے کیا گیا کہ بالقصد قتل کرنے والا عورت کا قصد کرتا ہے، اور اس پر زیادتی کا ارادہ کرتا ہے اور بالقصد زیادتی کرنے والا: مناسب یہ ہے کہ عورت سے ہٹایا جائے خوب ہٹانا۔ پس بیشک عورت شوکت (زور، قوت) والی نہیں ہے۔ اور اس کے قتل میں کچھ دشواری نہیں، برخلاف مرد کے، پس بیشک مرد مرد سے جنگ کرتا ہے۔ پس یہ صورت یعنی عورت کے بدلہ میں مرد کو قصاصاً قتل کرنا زیادہ حقدار تھی قصاص واجب کرنے کی تاکہ قصاص باز رکھنے والا اور جھڑکنے والا ہو اس کے مانند سے — میں کہتا ہوں: اور اس میں راز یہ ہے کہ شریعت کے پیش نظر ایک بڑا مقصد: ملتِ حنیفیہ کی شان بلند کرنا ہے۔ اور نہیں حاصل ہوتا شان بلند کرنا، مگر بایں طور کہ مسلمان کو کافر پر برتری دی جائے اور دونوں کے درمیان برابری نہ کی جائے (اس کو شرح میں اوپر لیا گیا ہے)

☆ ☆ ☆

باپ سے بیٹے کا قصاص نہ لینے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اولاد کے بدلے میں ماں باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا'' (ترمذی ۱:۱۶۸ مشکوۃ حدیث ۳۴۷۰)

حدیث —— حضرت سُراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے سامنے یہ دو واقعے پیش آئے ہیں: (۱) رسول اللہ ﷺ نے باپ کے لئے اس کے بیٹے سے قصاص لیا (۲) اور بیٹے کے لئے اس کے باپ سے قصاص نہیں لیا (مشکوۃ حدیث ۳۴۷۲)

تشریح: اگر اولاد: ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی کو عمداً قتل کرے تو اولاد کو قصاصاً قتل کیا جائے گا۔ اور ماں باپ، دادا

دادی، نانا نانی: اولاد کو عمداً قتل کریں تو قصاص نہیں لیا جائے گا۔ البتہ انتظام مملکت کے تقاضے سے جو سزا مناسب ہوگی وہ دی جائے گی۔ اور وجہ فرق دو ہیں:

پہلی وجہ: اولاد پر آباء کی شفقت کامل، اور ان کی طرف میلان بے حد ہوتا ہے۔ پس آباء کے اولاد کو قتل کرنے میں دو احتمال ہیں: ایک: یہ کہ اس نے عمداً قتل نہ کیا ہو، اگرچہ بظاہر قتل عمد نظر آتا ہو، پس یہ قتل درحقیقت قتل خطا ہے۔ دوم: یہ کہ در پردہ کوئی ایسی وجہ موجود رہی ہو جس سے قتل جائز ہوگیا ہو۔ پس یہ قتل خطا بھی نہ رہا۔ اور یہ علامات: شبہِ عمد کی علامات سے کم تر نہیں۔ شبہ عمد: میں جس آلہ سے قتل کیا جاتا ہے: وہ صالح للقتل نہیں ہوتا۔ اس لئے قصاص نہیں لیا جاتا۔ پس یہاں بھی قصاص مرتفع ہوجائے گا۔ کیونکہ ابوّت وشفقت کی دلالت فروتر نہیں۔

دوسری وجہ: آباء: اولاد کے وجود ظاہری کا سبب ہیں۔ پس اولاد ان کے عدم کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہ کفرانِ نعمت ہے۔ اور اولاد کے آباء کو قتل کرنے میں یہ بات نہیں۔ بلکہ اس کا برعکس ہے کہ آباء نے تو اولاد کو وجود بخشا، اور اولاد نے آباء کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ یہ بھی کفرانِ نعمت ہے، پس اولاد کو آباء کے قصاص میں قتل کیا جائے گا (یہ وجہ شارح نے ہدایہ (۵۶۳:۴) سے بڑھائی ہے)

وقال صلى الله عليه وسلم: " لايُقاد الوالد بالولد"

أقول: السبب في ذلك: أن الوالد شفقته وافرةٌ، وحَدْبُه عظيمٌ، فإقدامُه على القتل مظنةٌ:

[الف] أنه لم يتعَمَّدْه، وإن ظهرت مخايلُ العَمْد.

[ب] أو كان لمعنىً أباح قتلَه.

وليست دلالةُ هذه أقلَّ من دلالةِ استعمال مالا يَقْتُلُ غالبًا: على أنه لم يقصُد إزهاقَ الروح.

ترجمہ: اس کا سبب یہ ہے کہ باپ کی شفقت کامل اور اس کا میلان بے حد ہے۔ پس باپ کا قتل پر اقدام احتمالی جگہ ہے: (الف) کہ اس نے اولاد کو عمداً قتل نہ کیا ہو، اگرچہ عمد کی علامتیں ظاہر ہوں (ب) یا وہ قتل کسی ایسی وجہ سے ہو جس نے اس کو جائز کردیا ہو —— اور ان دونوں باتوں کی دلالت کم تر نہیں: اس آلہ کے استعمال کی دلالت سے جو عام طور پر مار نہیں ڈالتا: اس بات پر کہ اس نے روح نکالنے کا ارادہ نہیں کیا (مثلاً استاذ نے بچہ کو چھڑی سے مارا، جس سے عام طور پر آدمی مرتا نہیں، مگر اتفاقاً مر گیا، تو یہ قتل عمد نہیں۔ کیونکہ چھڑی سے مارنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جان سے مارنے کا قصد نہیں تھا۔ اسی طرح آباء کا اولاد کو قتل کرنا: اس پر دلالت کرتا ہے کہ عمداً قتل کرنا مقصود نہیں ہوگا۔ اور یہ دلالت اُس دلالت سے کم تر نہیں۔ پس جب اُس دلالت سے قصاص مرتفع ہوجاتا ہے، تو اِس دلالت سے بھی مرتفع ہوجائے گا)

☆ ☆ ☆

شِبہِ عمد اور قتلِ خطا کے احکام

شِبہِ عمد: کے سلسلہ میں یہ حدیث ہے: ''جو شخص بے بصیرتی میں مارا گیا: لوگوں میں پتھر، کوڑے اور لاٹھیاں چلیں: تو وہ قتلِ خطا ہے، اور اس کی دیت: قتلِ خطا کی دیت ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۷۸)

تشریح: یہ قتل: شبہ عمد ہے۔ اور اس کی دیت: خطا کی دیت سے بھاری ہے۔ اور مذکورہ حدیث میں جو اس کو قتلِ خطا کہا گیا ہے: تو مقصود قتلِ عمد کی نفی کرنا ہے، اور اس کو قتلِ خطا کے مشابہ قرار دینا ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ''اس کی دیت: قتلِ خطا کی دیت ہے'' اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک: یہ کہ دراصل اس کی دیت: قتلِ خطا کی دیت ہے۔ کیونکہ دونوں کی دیت سو اونٹ ہیں۔ اور ہلکا بھاری ہونا اونٹوں کی حالت کے اعتبار سے ہوتا ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ دوسرا مطلب: یہ ہو سکتا ہے کہ دراہم و دنانیر سے دیت ادا کی جائے تو دونوں کی دیت یکساں ہے۔ ان میں دیت ہلکی بھاری نہیں ہوتی۔

اور دیتِ مغلظہ میں روایات مختلف ہیں:

پہلی روایت: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ دیت مغلظہ چہار گانہ ہے: ۲۵ جذعہ، ۲۵ حقہ، ۲۵ بنت لبون اور ۲۵ بنتِ مخاض (ابوداؤد حدیث ۴۵۵۲ یہی قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ابوداؤد حدیث ۴۵۵۳) اسی کو امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ نے لیا ہے۔ یہ روایت حکماً مرفوع ہے۔

دوسری روایت: صراحۃً مرفوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سنو! اس قتلِ عمد میں جو خطا ہے: جو کوڑے اور لاٹھی سے ہوا ہے: سو اونٹ ہیں: ان میں سے چالیس حاملہ ہوں، جن کے پیٹ میں بچے ہوں'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۹۰) باقی ساٹھ اس حدیث میں مسکوت عنہ ہیں۔ ان کا تذکرہ دوسری روایت میں ہے: ''۳۰ حِقّے، ۳۰ جَذَعے، اور ۴۰ حاملہ، یا وہ چیز جس پر انھوں نے مصالحت کی، پس وہ ان کے لئے ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۷۴)

قتلِ خطا کی دیت: ہلکی ہے۔ اس میں پانچ طرح کے اونٹ ہیں: ۲۰ بنت مخاض، ۲۰ ابن مخاض، ۲۰ بنت لبون، ۲۰ حقے اور ۲۰ جذعے (مشکوۃ حدیث ۳۴۹۷) اسی کو حنفیہ نے لیا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: ابن مخاض کے بجائے ۲۰ ابن لبون ہیں۔

مسئلہ: شبہ عمد اور قتلِ خطا میں دیت عاقلہ (اہل نُصرت) پر واجب ہوتی ہے۔ اور تین سال میں وصول کی جاتی ہے۔

> **وأما القتل شِبْهُ العمد : فقال فيه صلى الله عليه وسلم:" من قُتل في عِمِّيَّة، في رَمْي، يكون بينهم بالحجارة، أو جلدٍ بالسِّيَاطِ، أو ضربٍ بعصا، فهو خطأ، وعقلُه عقلُ الخطأ"**
>
> **أقول: معناه: أنه يُشبه الخطأ، وأنه ليس من العمد، وأن عقلَه مثلُ عقله في الأصل، وإنما تمايزا في الصفة، أو أنه لافرقَ بينه وبينه في الذهب والفضة.**



واختلفت الروايةُ في الدية المغلَّظةِ:

[الف] فقولُ ابن مسعود رضي الله عنه: إنها تكون أرباعًا: خمسًا وعشرين جَذَعَةً، وخمسًا وعشرين حِقَّةً، وخمسا وعشرين بنتَ لَبُونٍ، وخمسًا وعشرين بنتَ مخاضٍ.

[ب] وعنه صلى الله عليه وسلم: "ألا! إن في قتل العمدِ الخطأ: بالسوط والعصا: مائة من الإبل: منها أربعون خَلِفَةً، في بطونها أولادُها" وفي رواية: "ثلاثون حِقَّةً، وثلاثون جَذَعَةً، وأربعون خَلِفَةً، وما صالحوا عليه فهو لهم"

وأما القتلُ خطأً: ففيه الديةُ المخففةُ المخمَّسةُ: عشرون بنت مخاض، وعشرون ابنَ مخاض، وعشرون بنتَ لبون، وعشرون حقة، وعشرون جذعة.

وفي هذين القسمين إنما تجب الدية على العاقلة، في ثلاث سنين.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: عِمِّيَّة: عَمىٰ سے ہے: الأمر الذي لايستبين وجهُه، ولا يُعرف أمرُه (مرقات) یعنی بے بصیرتی سے قتل ہوا، جیسا بلوہ فساد میں ہوتا ہے ...... في رمي: حرف جار کے اعادہ کے ساتھ بدل ہے ...... يكون أي الرميُ یعنی پتھر مارنا ...... أو جَلْدٍ کا عطف رمی پر ہے ...... سِيَاط: سَوْط کی جمع ...... في قتل العمد الخطأ: الخطأ بدل ہے العمد سے أي قتل هو عَمْد صورةً، خطأ معنى، وهو المسمى بشبه العمد ...... في بطونها أولادها: بيان لِخَلِفَةٍ، أو بدل منه.

☆ ☆ ☆

انواعِ قتل میں تغلیظ وتخفیف کی صورتیں اور ان کی حکمتیں

قتل کی تین قسمیں ہیں: عمد، شبہ عمد اور خطا۔ گناہ اور کوتاہی کے اعتبار سے یہ اقسام ہلکی بھاری ہیں۔ شدید ترین جان بوجھ کر قتل کرنا ہے۔ پھر شبہ عمد ہے، پھر قتل خطا۔ اس لئے ان کے احکام بھی ہلکے بھاری تجویز کئے گئے ہیں۔ اور تغلیظ وتخفیف تین طرح سے کی گئی ہے:

پہلی صورت: قتل عمد میں قصاص واجب ہے، اور باقی دو میں دیت۔ پھر قصاص میں یہ تخفیف کی گئی ہے کہ اس کو حد نہیں قرار دیا۔ حد میں معافی اور تبدیلی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اور قصاص میں معافی کی گنجائش ہے۔ وہ بالکل بھی معاف کیا جاسکتا ہے، اور اس کے بدل دیت بھی لی جاسکتی ہے۔

قصاص واجب کرنے کی حکمت قرآن کریم میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں بڑی زندگانی ہے (سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۹) یعنی گو قصاص بظاہر بھاری حکم معلوم ہوتا ہے، مگر اس میں ہزار جانوں کا بچاؤ ہے۔ اور قصاص میں تخفیف کا تذکرہ اس سے

پہلی آیت میں ہے۔ یہ سہولت یہود کی شریعت میں نہیں تھی (بخاری حدیث ۴۴۹۸) اور اس تخفیف میں چند مصلحتیں ہیں: مقتول کے وارث کی مصلحت یہ ہے کہ اس کے حق میں کبھی دیت زیادہ سودمند ہوتی ہے۔ اور قاتل کی مصلحت یہ ہے کہ اس کی جان بچ جاتی ہے۔ اور ملت کی مصلحت یہ ہے کہ ایک مسلمان بندہ زندہ رہ جاتا ہے، جس سے نفع کی توقع کی جاسکتی ہے۔

دوسری صورت: قتل عمد میں دیت خود قاتل کو ادا کرنی پڑتی ہے، کوئی دوسرا اس میں حصہ دار نہیں ہوتا۔ اور شبہ عمد اور خطا میں دیت عاقلہ ادا کرتا ہے۔ یہ تغلیظ و تخفیف ہے۔ اور قتل عمد میں تشدید کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز قاتل کے لئے سخت جھڑکی اور بھاری ابتلاء ہو، اور اس کو بہت مالی خسارہ ہو، تاکہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کرے۔ اور باقی دو قتلوں میں دیت کے وجوب کی وجہ یہ ہے کہ کسی خون کو رائگاں کرنا بڑی خرابی کی بات ہے، کیونکہ قاتل کے ورثاء کی تشفی ضروری ہے، ورنہ ان کے دلوں کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوگی، اور وہ کوئی بھی حرکت کر بیٹھیں گے۔ اور یہ قتل اگرچہ عمداً نہیں ہوا، مگر قتل جیسے سنگین معاملہ میں لاپروائی برتنا بھی قابل گرفت ہے۔ اس لئے اگر قصاص معاف کردیا گیا تو دیت ضرور لی جائے گی۔

اور دیت عاقلہ پر دو وجہ سے رکھی گئی ہے:

پہلی وجہ: قتل خطا میں لاپروائی برتنا اگرچہ قابل گرفت ہے، اور قاتل کو اس کی سزا ملنی ضروری ہے۔ مگر اس سزا کو آخری درجہ تک پہنچانا یعنی دیت تنہا اس پر واجب کرنا مناسب نہیں۔ اس لئے اس میں قاتل کے رشتہ داروں کو بھی شریک کیا گیا۔

دوسری وجہ: عرب اس کے خوگر تھے کہ کٹھن حالات میں اپنے آدمی کی جان و مال سے مدد کریں۔ وہ اس کو صلہ رحمی اور حق مؤکد سمجھتے تھے۔ اور مدد نہ کرنے کو بدسلوکی اور قطع رحمی تصور کرتے تھے۔ ان کی اس عادت نے واجب و لازم جانا کہ دیت کا بار عاقلہ پر ڈالا جائے۔

تیسری صورت: قتل عمد میں دیت فوری طور پر ایک سال میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور باقی دو قتلوں میں عاقلہ سے تین سال میں وصول کی جاتی ہے۔ یہ تغلیظ و تخفیف بھی قتل کی نوعیت کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔

ولما كانت هذه الأنواع مختلفةَ المراتب، رُوعي في ذلك التخفيفُ والتغليظُ من وجوهٍ:

منها: أنّ سَفْكَ دمِ القاتل لم يُحكم به إلا في العمد، ولم يُجعل في الباقيين إلا الدية؛ وكان في شريعة اليهود القصاصُ، لاغيرَ، فَخَفَّفَ الله على هذه الأمة، فجعل جزاءَ القتل العمد عليها أحدَ الأمرين: القتلَ والمالَ، فلربما كان المالُ أنفعَ للأولياء من الثأر، وفيه إبقاءُ نَسَمَةٍ مسلمةٍ.

ومنها: أنْ كانت الديةُ في العمد واجبةً على نفس القاتل، وفي غيره تؤخذ من عاقلته، لتكون مزجرةً شديدةً، وابتلاءً عظيمًا للقاتل، تَنْهكُ مالَه أشدَّ إنهاكٍ.

وإنما تؤخذ في غير العمد من العاقلة: لأن هدر الدم مفسدةٌ عظيمةٌ، وجبرُ قلوبِ المُصَابِيْنَ مقصودٌ، والتساهلُ من القاتل في مثل هذا الأمر العظيم ذنبٌ، يَستحق التضييق عليه، ثم لما

كانت الصلةُ واجبةً على ذوى الأرحام، اقتضت الحكمة الإلهية أن يوجب شيئٌ من ذلك عليهم، أشاء وا أم أبَوا.

وإنما تعين هذا لمعنيين:

أحدهما: أن الخطأ وإن كان مأخوذًا به لمعنى التساهل، فلا ينبغى أن يُبلغ به أقصى المبالغ، فكان أحقُّ ما يوجب عليهم عن ذى رحمهم: مايكون الواجب فيه التخفيفُ عليه.

والثانى: أنَّ العرب كانوا يقومون بنصرة صاحبهم بالنفس والمال عندما يَضِيقُ عليه الحالُ، ويرون ذلك صلةً واجبةً، وحقًا مؤكدًا، ويرون تركه عقوقًا، وقطعَ رَحِمٍ، فاستوجب عادتُهم تلك أن يعيَّن لهم ذلك.

ومنها: أن جعلَ دية العمد معجلةً فى سَنَةٍ واحدة، وديةَ غيره مؤجلةً فى ثلاثِ سنين، لِمَا ذكرنا من معنى التخفيف.

ترجمہ: اور جب یہ اقسام مختلف المراتب تھیں تو ان میں بچند وجوہ تخفیف وتغلیظ ملحوظ رکھی گئی —— از انجملہ: یہ ہے کہ قاتل کا خون بہانا یعنی قصاصاً قتل کرنا: اس کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا مگر قتل عمد میں۔ اور باقی دو قتلوں میں دیت ہی مقرر کی جائے گی۔ اور یہود کی شریعت میں قصاص تھا، اور بس، پس اللہ تعالیٰ نے اس امت پر آسانی کی۔ پس اس امت پر قتل عمد کی جزاء دو چیزوں میں سے ایک چیز مقرر کی: قتل یا مال (واؤ بمعنی أو ہے) پس کبھی اولیاء کے لئے مال یقیناً انتقام جان سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ اور مال لینے میں ایک مسلمان کی جان کو باقی رکھنا ہے —— اور از انجملہ: یہ ہے کہ (أن مخففہ من المثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے) قتل عمد میں دیت خود قاتل پر واجب تھی، اور اس کے علاوہ میں اس کے عاقلہ سے لی جاتی ہے، تاکہ وہ دیت سخت جھڑکی اور قاتل کے لئے بھاری آزمائش ہو، دیت کم کرے اس کے مال کو بہت زیادہ کم کرنا۔

اور غیر عمد میں دیت عاقلہ ہی سے لی جاتی ہے: اس لئے کہ خون کو رائگاں کرنا بڑی خرابی کی بات ہے، اور دیت لینے سے مصیبت زدوں کے دلوں کی تشفی مقصود ہے۔ اور قتل جیسے امر عظیم میں قاتل کی لاپروائی گناہ ہے، وہ اس پر تنگی کرنے کا مستحق ہے۔ پھر جب ذوی الارحام (رشتہ داروں) پر صلہ رحمی واجب تھی تو حکمتِ خداوندی نے چاہا کہ اس دیت میں سے ان پر کوئی چیز واجب کی جائے۔ خواہ وہ چاہیں یا انکار کریں —— اور یہ بات دو معنی ہی کی وجہ سے متعین ہوئی ہے: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ خطا اگرچہ تساہل کی وجہ سے قابل گرفت ہے، پس مناسب نہیں کہ اس کو انتہائی درجہ تک پہنچایا جائے۔ پس تھی زیادہ حقدار اس بات کی جو اُن (رشتہ داروں) پر واجب ہو، ان کے رشتہ دار (قاتل) کی طرف سے: وہ جس میں قاتل پر تخفیف واجب ہے۔ یعنی قتل عمد کی دیت تو رشتہ داروں پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ کیونکہ اس میں **تغلیظ پیش نظر** ہے۔ مگر شبہ عمد اور خطا کی دیت قاتل کے رشتہ داروں پر ڈالی جاسکتی ہے، کیونکہ اس میں قاتل پر تخفیف مقصود ہے —— اور

دوسرے معنی: یہ ہیں کہ عرب کھڑے ہوتے تھے یعنی تیار رہتے تھے اپنے آدمی کی مدد کے لئے جان و مال کے ذریعہ، جبکہ ان کے ساتھی پر یعنی قبیلہ کے آدمی پر حالت تنگ ہوجائے۔ اور وہ اس کو ضروری صلہ رحمی اور مؤکد حق سمجھتے تھے۔ اور اس کے چھوڑنے کو بدسلوکی اور قطع رحمی جانتے تھے۔ پس ان کی اس عادت نے واجب ولازم جانا کہ ان کے لئے یہ بات (دیت) معین کی جائے ـــ اور ازانجملہ: یہ ہے کہ قتل عمد کی دیت کو ایک سال میں معجّل گردانا، اور اس کے علاوہ کی دیت کو تین سالوں میں مؤجّل گردانا: اس بات کی وجہ سے ہے جو ہم نے تخفیف کے معنی سے ذکر کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

دیت کی تشکیل کس طرح عمل میں آئی؟

دیت: کا تذکرہ قرآن کریم (سورۃ النساء آیت ۹۲) میں ہے۔ مگر اس کی تفصیلات احادیث میں ہیں۔ دیت کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ اتنا زیادہ مال ہونا چاہئے جس کی ادائیگی لوگوں پر بھاری ہو، جو ان کے اموال میں نمایاں کمی کرے۔ جس کی لوگوں کے نزدیک بڑی اہمیت ہو، اور جس کو لوگ مشقت برداشت کرکے ادا کریں، تاکہ وہ زاجر بنے۔ دیت معمولی مال مقرر کی جائے گی تو وہ بے سود ہوگی۔

اور مال کی یہ مقدار اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں دیت دس اونٹ تھی۔ آنحضرت ﷺ کے جدامجد حضرت عبدالمطلب نے دیکھا کہ لوگ اس ہلکی دیت سے قتل سے باز نہیں آتے تو انھوں نے دیت سو اونٹ کردی۔ جس کو نبی ﷺ نے برقرار رکھا (کتاب الفقہ ۵: ۳۶۶)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب اس زمانہ میں اونٹ پالتے تھے۔ اونٹوں کی ان کے یہاں فراوانی تھی۔ چنانچہ اونٹوں سے دیت مقرر کی گئی۔ مگر آپ ﷺ جانتے تھے کہ آپؐ کی شریعت عرب وعجم اور سب لوگوں کے لئے ہے۔ اور دنیا میں سب لوگ اونٹ نہیں پالتے، اس لئے آپؐ نے دیگر اموال سے بھی دیت مقرر فرمائی: سونے سے ایک ہزار دینار، چاندی سے دس ہزار دینار، گایوں سے دو سو گائیں اور بکریوں سے دو ہزار بکریاں تجویز کیں۔ (مشکوۃ حدیث ۳۵۰۰ و ۳۴۹۸)

اور اتنی دیت مقرر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ دیت عاقلہ پر واجب ہوتی ہے۔ اور عرب میں اہل تناصر آدمی کا اپنا قبیلہ ہوتا تھا۔ اور قبائل چھوٹے بڑے تھے۔ چھوٹا قبیلہ پچاس آدمیوں کا ہوتا تھا۔ کیونکہ ان سے گاؤں آباد ہوجاتا ہے (اور ان پر جمعہ واجب ہوجاتا ہے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳: ۶۱۹) اور قسامہ میں بھی پچاس آدمیوں سے قسمیں لی جاتی ہیں۔ اور بڑا قبیلہ اس کا دوچند یعنی سو آدمیوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ دیت سو اونٹ مقرر کی، تاکہ اگر قبیلہ چھوٹا ہو تو ہر شخص کے ذمے دو اونٹ پڑیں۔ اور قبیلہ بڑا ہو تو ایک اونٹ لازم ہو، اور سو اور پچاس کے درمیان تعداد ہوگی تو ایک اونٹ اور کچھ حصہ میں آئے گا۔ اور یہ اس وقت ہے جبکہ قبیلہ درمیانی حالت کا ہو، اگر بہت بڑا یا پچاس سے چھوٹا ہو تو کم وبیش اونٹ لازم ہوں گے۔

اور ہزار دینار سو آدمیوں سے تین سال میں وصول کئے جائیں تو ہر شخص کو سالانہ تین دینار اور تہائی دینار ادا کرنا پڑے گا (۱۰۰۰÷۱۰۰=۱۰÷۳=۳/۳۳) اور دس ہزار درہم وصول کئے جائیں تو ہر شخص کو سالانہ ۳۳ درہم اور تہائی درہم ادا کرنا پڑے گا (۱۰۰۰۰÷۱۰۰=۱۰۰÷۳=۳۳/۳۳) اور یہ مال کی اتنی مقدار ہے جس کی لوگوں کے نزدیک اہمیت ہے، اس لئے سونے چاندی میں سے یہ دیت مقرر کی۔

سوال: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ جب اونٹ ارزاں ہوتے تو نبی ﷺ دیت کم کردیتے۔ اور جب گراں ہوتے تو دیت بڑھادیتے (مشکوۃ حدیث ۳۵۰۰) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل اونٹوں کی دیت ہے۔ پھر سونے چاندی کی دیت کو مستقل دیت قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

جواب: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اونٹوں والے اگر سونے چاندی سے دیت ادا کرنا چاہتے تو ان کے حق میں قیمت کا اعتبار کیا جاتا۔ سب لوگوں کے لئے نہیں۔ دنیا میں سب لوگ اونٹ نہیں پالتے۔ آپ ممالک کا جائزہ لیں تو لوگ دوطرح کے نظر آئیں گے: تجارت پیشہ ارباب اموال۔ یہ شہری ہیں۔ اور مویشی پالنے والے۔ یہ دیہاتی ہیں۔ عام طور پر لوگ ان دو قسموں سے تجاوز نہیں کرتے۔ اس لئے اول کے لئے سونے چاندی سے دیت مقرر کی اور ثانی کے لئے مویشی سے، اور یہ سب مستقل اندازے ہیں۔

فائدہ: دو مسئلوں میں اختلاف ہے: (۱) دیت صرف اونٹوں سے مقرر کی گئی ہے یا دیگر اموال سے بھی؟ امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ جدید یہ ہے کہ صرف اونٹوں سے مقرر کی گئی ہے۔ دیگر اموال میں قیمت کا اعتبار ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک تین اصناف سے یعنی اونٹ، سونے اور چاندی سے دیت مقرر کی گئی ہے، باقی اموال میں قیمت کا اعتبار ہے۔ اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک دیگر اموال سے بھی دیت مقرر کی گئی ہے۔ اور یہ سب مستقل اندازے ہیں۔ قیمت کا اعتبار نہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے صاحبین کا قول لیا ہے۔

(۲) چاندی سے دیت کی مقدار کیا ہے؟ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بارہ ہزار درہم ہیں۔ اور احناف کے نزدیک دس ہزار درہم ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے معلوم نہیں کس کا قول لیا ہے۔ آپ کی عبارت غیر واضح ہے۔ تفصیل ترجمہ کے بعد آرہی ہے۔

والأصل في الدية: أنها تجب أن تكون مالاً عظيما، يغلبُهم وينقِص من مالهم، ويجدون له بالاً عندهم، ويكون بحيث يُؤَدُّوْنَه بعد مقاساة الضيقِ، ليحصل الزجر.

وهذا القدرُ يختلف باختلاف الأشخاص، وكان أهل الجاهلية قَدَّروها بعشرة من الإبل، فلما رأى عبد المطلب أنهم لاينزجرون بها بلَّغها إلى مائة، وأبقاها النبي صلى الله عليه وسلم على ذلك، لأن العرب يومئذ كانوا أهلَ إبلٍ، غير أن النبي صلى الله عليه وسلم عرف أن شرعه

لازمٌ للعرب والعجم وسائرِ الناس، وليسوا كلُّهم أهلَ إبل، فقدَّر من الذهب ألف دينار، ومن الفضة اثنى عشر ألف درهم، ومن البقر مائتى بقرة، ومن الشاء ألفى شاة.

والسبب فى هذا: أن مائةَ رجلٍ: إذا وُزِّعَ عليهم ألفُ دينار فى ثلاث سنين: أصابَ كلَّ واحد منهم فى سنة: ثلاثةُ دنانير وشيئ، ومن الدراهم ثلاثون درهمًا وشيئ، وهذا شيئٌ لايجدون لأقل منه بالاً.

والقبائل تتفاوت فيما بينها: يكون منها الكبيرة، ومنها الصغيرة، وضُبِطَتِ الصغيرةُ بخمسين، فإنهم أدنى ما تَتَقَرَّى بهم القريةُ، ولذلك جُعل القسامةُ خمسين يمينًا، مُتَوَزَّعَةً على خمسين رجلاً؛ والكبيرةُ ضِعْفُ خمسين، فجعلت الديةُ مائةً، ليصيبَ كل واحد بعيرٌ أو بعيران، أو بعير وشيئ فى أكثر القبائل عند استواء حالهم.

والأحاديث التى تدل على أن النبى صلى الله عليه وسلم كان إذا رَخُصَتِ الإبلُ خَفَضَ من الدية، وإذا غَلَتْ رفع منها، فمعناها عندى: أنه كان يقضى بذلك على أهل الإبل خاصةً، وأنت إن فَتَّشْتَ عامَّةَ البلاد وجدتهم ينقسمون إلى أهل تجاراتٍ وأموالٍ، وهم أهلُ الحضر، وأهلِ رعيٍ، وهم أهل البدو، لايُجاوِزُهم حالُ الأكثرين.

ترجمہ: اور دیت میں بنیادی بات: یہ ہے کہ دیت: ضروری ہے کہ بڑا مال ہو، جوان پر غالب آئے۔ اور ان کے مال کو گھٹائے، اور وہ اس مال کے لئے اپنے نزدیک بڑی اہمیت پاتے ہوں۔ اور ہو وہ مال بایں طور کہ لوگ اس کو ادا کریں تنگی برداشت کرنے کے بعد، تاکہ جھڑکنا حاصل ہو ــــ اور یہ مقدار مختلف ہوتی ہے اشخاص کے اختلاف سے۔ اور زمانۂ جاہلیت کے لوگ دیت کا اندازہ مقرر کرتے تھے دس اونٹوں سے، پس جب عبدالمطلب نے دیکھا کہ لوگ اس دیت کی وجہ سے باز نہیں آتے تو انھوں نے اس کو سوتک پہنچا دیا۔ اور اسی پر نبی ﷺ نے دیت کو باقی رکھا۔ اس لئے کہ عرب اس زمانہ میں اونٹوں والے تھے۔ البتہ یہ بات ہے کہ نبی ﷺ نے جانا کہ آپؐ کی شریعت عرب وعجم اور سب لوگوں پر لازم ہے۔ اور سب لوگ اونٹوں والے نہیں، تو آپؐ نے اس کا اندازہ ٹھہرایا: سونے سے ہزار دینار۔ اور چاندی سے بارہ ہزار درہم، اور گایوں سے دوسو گائیں، اور بکریوں سے دو ہزار بکریاں ــــ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سو آدمی: جب ان پر ہزار دینار تقسیم کئے جائیں تین سالوں میں: تو ان میں سے ہر ایک کو ایک سال میں تین دینار اور کچھ پہنچے گا۔ اور دراہم سے تیس درہم اور کچھ (یہاں عبارت میں کچھ گڑبڑ ہے۔ حساب سے ہر ایک کو چالیس درہم پہنچتے ہیں) اور یہ ایسی چیز ہے جس سے کم کے لئے لوگ کچھ اہمیت محسوس نہیں کرتے ــــ اور قبائل باہم متفاوت تھے۔ ان میں سے کوئی بڑا اور کوئی چھوٹا تھا۔ اور چھوٹا متعین کیا گیا پچاس کے ذریعہ۔ پس پچاس کم سے کم تعداد ہے جس سے گاؤں آباد ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے قسامہ: ایسی پچاس قسمیں

گردانا گیا ہے جو پچاس آدمیوں پر تقسیم ہونے والی ہیں۔ اور بڑا قبیلہ پچاس کا دوگنا ہے۔ پس دیت سو اونٹ مقرر کی گئی، تا کہ ہر ایک کو ایک یا دو اونٹ پہنچیں۔ یا ایک اونٹ اور کچھ پہنچے، اکثر قبائل میں: ان کا حال معتدل ہونے کی صورت میں۔

اور وہ حدیثیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ نبی ﷺ جب اونٹ ارزاں ہوتے تھے تو دیت پست کر دیتے تھے اور جب گراں ہوتے تھے تو دیت اونچی کر دیا کرتے تھے۔ پس اس کے معنی میرے نزدیک: یہ ہیں کہ آپؐ اس کا فیصلہ فرمایا کرتے تھے خاص طور پر اونٹ والوں پر۔ اور اگر آپ تفتیش کریں عام ممالک کی تو آپ لوگوں کو پائیں گے کہ وہ منقسم ہوتے ہیں: (۱) تجارتوں اور اموال والوں میں، اور وہ شہری ہیں (۲) اور ریوڑ پالنے والوں میں، اور وہ دیہاتی ہیں۔ اکثر لوگوں کا معاملہ اس سے متجاوز نہیں ہوتا۔

ملحوظہ: قوله: ثلاثون درهما وشيئ: تمام نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے۔ مگر یہ عبارت صحیح نہیں۔ کیونکہ بارہ ہزار کو تقسیم کرتے ہیں تو فی نفر پورے چالیس درہم بیٹھتے ہیں۔ پس اگر یہ خیال کیا جائے کہ صحیح أربعون ہوگا، تو شیئ رہ جاتا ہے۔ اس لئے خیال یہ ہے کہ صحیح ثلاثة وثلاثون وشيئ ہے۔ اور اوپر بارہ ہزار تسامح ہے۔ دس ہزار کو تقسیم کریں گے تو فی نفر ۳۳ اور تہائی: بیٹھے گا (۱۰،۰۰۰÷۱۰۰=۱۰۰÷۳=۳۳٫۳۳) اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ جب شاہ صاحب نے پہلے مسئلہ میں صاحبین کا مسلک اختیار کیا ہے تو دوسرے مسئلہ میں بھی انہیں کا مسلک لیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔ اوپر مسئلہ کی تقریر اسی خیال پر کی ہے۔ اور عبارت میں تقدیم وتاخیر بھی ہے۔

☆ ☆ ☆

کفارۂ قتل کی حکمت

سورۃ النساء آیت ۹۲ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کرے، اس پر ایک مسلمان بردہ (غلام یا باندی) کا آزاد کرنا ہے'' پھر دیت کے احکام ہیں۔ اس کے بعد ارشاد پاک ہے: ''پھر جس شخص کو بردہ نہ ملے تو متواتر دو ماہ کے روزے ہیں۔ توبہ کے طور پر، منجانب اللہ یہ کفارہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے، بڑی حکمت والے ہیں''

تشریح: شبہ عمد اور قتل خطا میں دیت کے ساتھ کفارہ بھی واجب ہے۔ کفارہ: ایک مسلمان بردہ کو آزاد کرنا، اور وہ دستیاب نہ ہو تو متواتر دو ماہ کے روزے رکھنا ہے۔ یہ کفارہ اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ وہ ایک عبادت ہے، جس سے قتل کا گناہ دُھل جاتا ہے۔ دیت تو ڈانٹ ہے۔ چونکہ دیت عاقلہ کو ادا کرنی پڑتی ہے، اس لئے وہ قاتل کو خوب لعن طعن کرتے ہیں، اور اس کی جان کھا جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ پشیمان ہوتا ہے، اور آئندہ ایسی حرکت نہیں کرتا۔ دیت کا یہی فائدہ ہے۔ اس سے گناہ معاف نہیں ہوتا۔ اور کفارہ سے بندے اور اللہ کے درمیان پشیمانی پیدا ہوتی ہے۔ بندہ خدا کے سامنے شرمسار ہوتا ہے، اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا عزم کرتا ہے۔ یہی توبہ ہے۔ آیت پاک میں ''بطور توبہ'' کا یہی مطلب ہے۔

قال الله تعالى: ﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ﴾ الآية.

أقول: إنما وجب في الكفارة تحرير رقبة مؤمنة، أو إطعام ستين مسكينا: ليكون طاعةً مُكَفِّرَةً له فيما بينه وبين الله؛ فإن الدية مَزْجَرَةٌ، تورث الندم بحسب تضييق الناس عليه، والكفارةَ فيما بينه وبين الله تعالى.

ترجمہ: کفارہ میں ایک مسلمان بردہ کا آزاد کرنا، یا ساٹھ مسکینوں کو کھلانا (یہ تسامح ہے) اسی لئے واجب ہوا ہے کہ وہ (تحریر یا اطعام) اس کے لئے گناہ مٹانے والی عبادت بن جائے، اس کے اور اللہ کے مابین۔ پس بیشک دیت زجر کا ذریعہ ہے، وہ پشیمانی پیدا کرتی ہے اس پر لوگوں کے تنگی کرنے کے اعتبار سے۔ اور کفارہ (پشیمانی پیدا کرتا ہے) اس کے اور اللہ کے مابین۔

ملحوظہ: قوله: أو إطعام ستين مسكينا: تمام نسخوں میں اسی طرح ہے مگر یہ تسامح ہے۔ ساٹھ مسکینوں کو کھلانا ظہار کے کفارہ میں ہے۔ قتل کے کفارہ میں بردہ نہ ملنے کی صورت میں دو ماہ کے متواتر روزے ہیں۔ پس أَوْ (حرفِ تخییر) بھی صحیح نہیں۔

☆ ☆ ☆

قتل تین ہی صورتوں میں جائز ہے

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی ایسے مسلمان کا خون کرنا جائز نہیں جو گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، مگر تین باتوں میں سے کسی ایک بات کی وجہ سے: جان کے بدلہ میں جان، شادی شدہ زنا کار، اور اپنے دین سے جدا ہونے والا، جماعتِ مسلمین کو چھوڑنے والا'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۴۴۶)

تشریح: تمام ادیان کا یہ متفقہ اصول ہے کہ کسی کا قتل ایسی مصلحتِ کلیہ (مفادِ عامہ) ہی کی وجہ سے جائز ہے جو قتل کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی ہو۔ اور اس مصلحت کو نظر انداز کرنا قتل سے زیادہ خرابی پیدا کرنے والا ہو۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۷ میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ ''فتنہ پردازی قتل سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے!'' یعنی فتنہ وفساد روکنے کے لئے قتل روا ہے۔ چنانچہ جب قرآن کریم میں قوانینِ شرعیہ اور حدود الٰہیہ نازل ہونی شروع ہوئیں تو ضروری ہوا کہ اس سلسلہ میں ضابطہ بنا دیا جائے۔ اور اس مصلحتِ کلیہ کا انضباط کیا جائے جس کی رو سے کسی کو قتل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اگر انضباط نہیں کیا جائے گا، اور بات یونہی چھوڑ دی جائے گی تو حکام ایسے لوگوں کو قتل کریں گے جن کا قتل کرنا مصلحت نہیں ہے۔ وہ غلط فہمی سے اس کے قتل کو مصلحت کلیہ کے دائرہ میں لے آئیں گے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے درج ذیل تین چیزوں سے اُن مصالح کلیہ کو منضبط فرمایا:

پہلی مصلحت — بطور قصاص قتل کرنا — قصاص زجر کا ذریعہ ہے۔ اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ جن کی طرف سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۹ میں اشارہ ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اور تمہارے لئے قصاص میں بڑی زندگانی ہے، اے عقلمندو!''

کیونکہ قصاص کے خوف سے ہر کوئی کسی کو قتل کرنے سے رُک جائے گا پس دونوں کی جان محفوظ رہے گی۔ اور قصاص کے سبب قاتل ومقتول کے قبائل بھی محفوظ ومطمئن رہیں گے۔ کیونکہ لوگ قاتل غیر قاتل کا لحاظ نہیں کرتے، جو بھی ہاتھ آتا ہے اس کو نمٹا دیتے ہیں۔ اور جواب اور جواب الجواب کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، اور فریقین کی ہزاروں جانیں چلی جاتی ہیں، پس ایک قصاص میں ہزاروں جانوں کا بچاؤ ہے۔ اسی مصلحتِ کلیہ کی وجہ سے قصاصاً قتل کرنا جائز ہے۔

دوسری مصلحت — شادی شدہ زنا کار کو سنگسار کرنا — زنا تمام مذاہب میں بہت بڑے گناہوں میں شمار ہے۔ اور شادی شدہ زانی کو قتل کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسان اگر سلیم المزاج ہوتو وہ اس پر غیرت کھاتا ہے کہ اس کی بیوی میں کوئی اس کے ساتھ مزاحمت کرے، جیسے دوسرے چوپایوں کا حال ہے۔ مگر جانور ایسے مواقع میں لڑتے ہیں۔ اور مرتے مارتے ہیں۔ اور انسان جانتا ہے کہ باہم لڑنا مملکت کو ویران کرتا ہے، اس لئے وہ قانون کا سہارا لیتا ہے۔ چنانچہ ان پر یہ بات واجب کی گئی کہ محصن زانی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تاکہ عورتوں کو خراب کرنے کا سلسلہ موقوف ہو (رحمۃ اللہ ۱: ۸۱۲)

تیسری مصلحت — دین سے پھر جانے والے کو قتل کرنا — مرتد: اللہ کے دین کے مقابلہ میں بے باکی اختیار کرتا ہے۔ اور دین کے قیام اور رسولوں کی بعثت میں جو مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہے اس کو پامال کرتا ہے۔ پس اس کو چلتا کرنا ایک اہم مصلحت ہے۔

فائدہ: فقہ میں اِن تین شخصوں کے علاوہ بھی چند لوگوں کا قتل جائز رکھا گیا ہے۔ مثلاً حملہ آور کو قتل کرنا جائز ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس راہ زن کو بھی جس نے کسی کو قتل نہیں کیا: قتل کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک امام کو اختیار ہے کہ چاروں سزاؤں میں سے جو سزا مناسب خیال کرے، دے (رحمۃ اللہ ۴: ۵۴۵) اسی طرح جادوگر اور اغلام کرنے والے کو قتل کرنے کا احادیث میں ذکر آیا ہے: پس ان کو تاویل کے ذریعہ مذکورہ تین مصالح کلیہ کی طرف لوٹایا جائے گا۔ مثلاً: حملہ آور: النفس بالنفس میں شامل ہے۔ آدمی اپنی جان بچانے کے لئے حملہ آور کو قتل کرتا ہے۔ اور راہ زن: مرتد کے ساتھ ملحق ہے، کیونکہ دونوں فتنہ پرداز ہیں (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

فائدہ: مرتد کا قتل محض ارتداد کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کی فتنہ پردازی کے اندیشہ سے ہے۔ چنانچہ مرتدہ کو قتل نہیں کیا جاتا۔ نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسری عورتوں کو اس سے ملنے سے روک دیا جاتا ہے۔ اور مرد کو نظر بند نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات مرد کے موضوع کے خلاف ہے۔ اور جب اس کو گھومنے پھرنے کی آزادی ہوگی تو وہ لوگوں کے ذہن بگاڑے گا، اور فتنہ میں مبتلا کرے گا، اس لئے اس کو قتل کرنا ضروری ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لايحل دمُ امرئٍ مسلم يشهد أن لا إله إلا الله وأنى رسول الله، إلا بإحدى ثلاثٍ: النفسُ بالنفسِ، والثيبُ الزانى، والمفارِقُ لدينه: التاركُ للجماعة"

أقول: الأصل المُجْمَعُ عليه في جميع الأديان: أنه إنما يجوز القتلُ لمصلحةٍ كليةٍ، لا تتأتى

بدونه، ويكون تركها أشدَّ إفسادًا منه، وهو قوله تعالى: ﴿وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾

وعندما تَصَدَّى النبي صلى الله عليه وسلم للتشريع وضربِ الحدود: وجب أن يَضْبِطَ المصلحةَ الكليةَ المُسَوِّغَةَ للقتل؛ ولو لم يَضْبِطْ وترك سُدىً: لقتل منهم قاتلٌ من ليس قتلُه من المصلحة الكلية، ظنًا أنه منها، فضبط بثلاث:

[۱] القصاصُ: فإنه مزجرةٌ، وفيه مصالحُ كثيرةٌ، قد أشار الله تعالى إليها بقوله: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَّا أُوْلِي الْأَلْبَابِ﴾

[۲] والثيب الزاني: لأن الزنا من أكبر الكبائر في جميع الأديان، وهو من أصلِ ما تقتضيه الجبلةُ الإنسانيةُ، فإن الإنسان عند سلامة مزاجه يُخلق على الغيرة: أن يُزاحمَه أحدٌ على موطوءته كسائر البهائم، إلا أن الإنسان استوجب أن يَعْلم ما به إصلاح النظام فيما بينهم، فوجب عليهم ذلك.

[۳] والمرتد: اجْتَرأَ على الله ودينه، وناقض المصلحةَ المرعيةَ في نصب الدين وبعثِ الرسل.

وأما ماسوى هؤلاء الثلاث: مما ذهبت إليه الأمة، مثلُ الصائل، ومثلُ المحارب، من غير أن يَقْتُلَ أحدًا، عند من يقول بالتخيير بين أَجْزِيَةِ المحارب: فيمكن إرجاعُه إلى أحد هذه الأصول.

ترجمہ: تمام مذاہب میں متفق علیہ اصول یہ ہے کہ قتل کسی ایسی مصلحت کلیہ ہی کی وجہ سے جائز ہے جو بدوں قتل حاصل نہ ہوسکتی ہو۔ اور اس مصلحت کو نظر انداز کرنا خرابی پیدا کرنے کے اعتبار سے قتل سے زیادہ سخت ہو —— اور جب نبی ﷺ قانون سازی اور سزائیں مقرر کرنے کے درپے ہوئے تو ضروری ہوا کہ آپؐ اس مصلحتِ کلیہ کو منضبط فرمائیں جو قتل کو جائز کرنے والی ہے۔ اور اگر آپؐ اس کو منضبط نہ فرماتے، اور آپؐ اس کو مہمل چھوڑ دیتے تو قتل کرنے والا قتل کرتا لوگوں میں سے اس شخص کو جس کا قتل کرنا مصلحتِ کلیہ نہیں ہے، گمان کرتے ہوئے کہ وہ قتل کرنا مصلحتِ کلیہ سے ہے۔ پس آپؐ نے تین چیزوں سے تعیین فرمائی: —— (۱) قصاص: پس بیشک وہ تنبیہ کا ذریعہ ہے، اور اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں —— (۲) اور شادی شدہ زناکار: اس لئے کہ زنا تمام مذاہب میں بڑے گناہوں سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ اس بات کی اصل سے ہے جس کو انسانی جبلّت چاہتی ہے۔ پس بیشک انسان مزاج کی درستگی کی صورت میں اس بات پر غیرت کھانے پر پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ساتھ اس کی بیوی میں کوئی مزاحمت کرے۔ جیسے حیوانات کا حال ہے۔ مگر یہ بات ہے کہ انسان واجب و لازم جانتا ہے کہ وہ اس بات کو جانے جس کے ذریعہ لوگوں کے درمیان نظام کی اصلاح ہوتی ہے (اور وہ قانون کی پابندی کرنا ہے) پس واجب ہوئی ان پر یہ بات یعنی ان کے لئے قتل زانی کا قانون بنادیا گیا، تاکہ بدوں مزاحمت مسئلہ حل ہوجائے —— (۳) اور مرتد: دلیری کی اس نے اللہ اور اللہ کے دین کے خلاف، اور اس مصلحت کو توڑا جو ملحوظ رکھی ہوئی

ہے دین کے قیام اور رسولوں کی بعثت میں — (فائدہ) اور رہے وہ قتل جوان تین کے علاوہ ہیں: ان قتلوں میں سے جن کی طرف امت گئی ہے، جیسے حملہ آور، اور جیسے راہ زن، بدوں اس کے کہ وہ کسی کو قتل کرے، اس امام کے نزدیک جو راہ زنوں کی سزاؤں میں تخییر کے قائل ہیں: پس ممکن ہے اس کو لوٹانا اُن اصولوں میں سے کسی ایک کی طرف۔

☆　　☆　　☆

قَسامہ کی حکمت اور اس کا سبب

حدیث — حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں قَسامہ کا پہلا واقعہ بنو ہاشم میں پیش آیا تھا۔ ایک ہاشمی کو قریش کی ایک دوسری شاخ کے آدمی نے مزدور رکھا۔ اور سفر میں لے گیا۔ مزدور نے اونٹ کے پیر باندھنے کی رسّی ایک دوسرے ہاشمی کو دیدی۔ اس پر مزدور رکھنے والے نے اس کو قتل کر دیا، اور معاملہ چھپا دیا۔ مگر مرنے والے نے ایک یمنی کو وصیت کی کہ وہ اس قتل کی خبر ابو طالب کو پہنچائے۔ جب ابو طالب کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ قاتل کے پاس گئے۔ اور کہا: تین باتوں میں سے ایک بات پسند کر: یا تو دیت کے سو اونٹ ادا کر کہ تو نے ہمارے آدمی کو قتل کیا ہے۔ یا تیری قوم کے پچاس آدمی قسمیں کھائیں کہ تو نے اس کو قتل نہیں کیا، یا ہم تجھے اس کے بدلہ میں قتل کریں گے۔ اس نے اپنی قوم سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس کی قوم قسمیں کھانے کے لئے تیار ہوگئی۔ مگر ایک عورت نے اپنے لڑکے کے لئے ابو طالب سے معافی لے لی، اور ایک شخص نے قسم کے بدل دو اونٹ پیش کر دیئے۔ باقی اڑتالیس آدمیوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں۔ ابن عباس قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ سال پورا نہیں ہوا تھا کہ سب کے سب مر گئے (بخاری حدیث ۳۸۴۵)

حدیث — عبداللہ بن سہل اور ان کا چچا مُحیصہ بن مسعود خیبر گئے۔ یہ واقعہ صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے۔ وہاں پہنچ کر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اور اپنی اپنی جائدادیں دیکھنے چلے گئے۔ پھر جب مُحیصہ: عبداللہ کے پاس پہنچے تو وہ مرے ہوئے اپنے خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ وہ ان کو دفن کر کے مدینہ آئے۔ اور مقتول کا بھائی عبدالرحمٰن اور محیصہ اور ان کے بھائی حوَیّصہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ اور ماجرا بیان کیا۔ آپؐ نے فرمایا: تم قسمیں کھاؤ گے کہ عبداللہ کو فلاں شخص نے قتل کیا ہے؟ اور ایک روایت میں ہے کہ تم گواہ پیش کرو گے کہ اس کو فلاں نے قتل کیا ہے؟ انھوں نے کہا: جب ہم وہاں موجود نہیں تھے، اور ہم نے اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تو ہم قسمیں کیسے کھائیں؟! اور ایک روایت میں ہے کہ ہمارے پاس گواہ نہیں ہیں! آپؐ نے فرمایا: تو یہود پچاس قسمیں کھا کر تمہارے مطالبہ سے سبکدوش ہو جائیں گے! ان لوگوں نے کہا: ہم ان کی قسمیں کیسے مانیں وہ تو کفار ہیں! چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کی دیت اپنے پاس سے ادا فرمائی۔ اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں کیا کہ عبداللہ کا خون رائگاں جائے، چنانچہ زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ دیت میں ادا فرمائے (جامع الاصول حدیث ۷۷۸۹)

تشریح: قَسامہ اور قسم کے معنی ہیں: حلف برداری۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی جگہ مقتول پایا جائے۔ اور ہر چند کوشش کے باوجود قاتل کا پتہ نہ چلے، تو قاتل کا پتہ چلانے کی آخری صورت یہ ہے کہ جہاں لاش ملی ہے وہاں کے پچاس آدمیوں سے قسم لی جائے کہ نہ انھوں نے قتل کیا ہے، نہ وہ قاتل کو جانتے ہیں۔ اگر وہ قسمیں کھالیں تو بستی والوں پر دیت لازم ہوگی۔

قسامہ کا رواج زمانۂ جاہلیت سے چلا آرہا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ سب سے پہلے ابو طالب نے قسامہ کے ذریعہ جھگڑا نمٹایا ہے۔ اور قسامہ میں بڑی مصلحت ہے۔ کیونکہ قتل کبھی مخفی جگہ میں یا تاریک رات میں ہوتا ہے، جہاں کوئی گواہ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں قاتل کا پتہ چلانے کی ایک صورت قسامہ ہے۔ کیونکہ مقتول کے ورثاء قسمیں کھانے کے لئے معتبر لوگوں کا انتخاب کریں گے، اور پچاس کی تعداد بہت بڑی تعداد ہے۔ اس سے گاؤں آباد ہوتا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں اگر کوئی بھی قاتل سے واقف ہوگا تو وہ ضرور نشاندہی کرے گا۔ جھوٹی قسم نہیں کھائے گا۔ اور اگر اس قسم کے مخفی قتل کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا جائے کہ گواہ نہیں لہٰذا معاملہ رفع دفع! تو لوگ قتل پر دلیر ہوجائیں گے، اور بگاڑ عام ہوجائے گا — اور اگر بے دلیل مقتول کے ورثاء کا دعوی مان لیا جائے، تو ہر کوئی اپنے دشمن پر دعوی ٹھوک دیگا، اس لئے ضروری ہے کہ قسامہ سے فیصلہ کیا جائے۔

قسامہ کی علت: قسامہ کے سبب میں اختلاف ہے کہ کس صورت میں قسامہ ہوگا، اور کس صورت میں نہیں ہوگا؟:

احناف کے نزدیک: اگر کوئی ایسی لاش ملی ہے جس پر زخم کا نشان ہے، مثلاً اس کو پیٹا گیا ہے یا گلا گھونٹا گیا ہے، اور وہ لاش ایسی جگہ ملی ہے جو کسی قوم کی حفاظت ونگرانی میں ہے، جیسے محلّہ یا مسجد یا کسی گھر میں ملی ہے (یا بستی سے اتنی قریب ملی ہے کہ فریاد کرنے والے کی آواز لوگوں تک پہنچ سکتی ہے) تو قسمیں کھلائی جائیں گی۔ اور اگر لاش پر کوئی نشان نہیں، اور ڈاکٹری رپورٹ بھی طبعی موت کی ہے یا گاؤں سے بہت دور ویرانہ میں ملی ہے تو قسامہ نہیں ہوگا۔ احناف نے یہ علت عبداللہ بن سہل کے واقعہ سے اخذ کی ہے۔ کیونکہ وہ واقعہ زمانۂ اسلام کا ہے۔

اور شوافع وغیرہ کے نزدیک: اگر کوئی مقتول پایا گیا ہے، اور کسی شخص پر شبہ ہے کہ اس نے قتل کیا ہے۔ اور یہ شبہ یا تو مقتول کے نزعی بیان سے پیدا ہوا ہے، یا نا تمام شہادت (ایک شخص کی گواہی) سے، یا اس قسم کی کسی اور بات سے، مثلاً قتل کی جگہ سے ایک شخص خون آلود خنجر لیکر بھاگا تو قسامہ ہوگا۔ اور اگر کسی پر کوئی شبہ نہیں تو قسامہ نہیں ہوگا۔ ان حضرات نے یہ علت: ابو طالب کے فیصلہ والے واقعہ سے اخذ کی ہے۔ اس واقعہ میں ایک شخص نے خبر دی تھی، جس سے شبہ پیدا ہوا تھا۔

واعلم: أنه كان أهل الجاهلية يحكمون بالقسامة، وكان أولُ من قضى بها أبو طالب، كما بين ذلك ابن عباس رضي الله عنهما، وكان فيها مصلحةٌ عظيمة: فإن القتلَ ربما يكون في المواضع الخفية وَاللَّيَالي المظلمة، حيث لاتكون البينة، فلو جُعل مثلُ هذا القتل هدرًا، لاجترأ الناس عليه، وَلَعَمَّ الفسادُ؛ ولو أُخذ بدعوى أولياءِ المقتول بلاحجة، لادَّعى ناسٌ على

كل من يُعَادُوْنَه، فوجب أن يؤخذ بأيمانِ جماعةٍ عظيمةٍ، تَتَقرّى بها قريةٌ، وهم خمسون رجلاً، فقضى بها النبى صلى الله عليه وسلم، وأثْبَتَهَا.

واختلف الفقهاءُ فى العلة التى تُدار عليه القَسامةُ:

فقيل: وجودُ قتيل، به أثرُ جراحةٍ، من ضرب أو خَنِقٍ، فى موضع هو فى حفظ قوم، كمحلة، ومسجد، ودار، وهذا مأخوذ من قصة عبد الله بن سهل، وُجد قتيلاً بخيبر، يَتَشَحَّطُ فى دمه.

وقيل: وجودُ قتيلٍ وقيامِ لوثٍ على أحدٍ أنه القاتل، بإخبار المقتولِ، أو شهادةٍ دون النصاب، ونحوه، وهذا مأخوذ من قصة القسامة التى قضى بها أبو طالب.

ترجمہ: اور جان لیں کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ قسامہ کے ذریعہ فیصلہ کیا کرتے تھے۔ اور سب سے پہلے جس نے قسامہ کے ذریعہ فیصلہ کیا، وہ ابوطالب تھے، جیسا کہ ابن عباسؓ نے یہ بات بیان کی ہے۔ اور قسامہ میں بڑی مصلحت ہے: کیونکہ قتل کبھی مخفی جگہوں میں اور تاریک راتوں میں ہوتا ہے جہاں گواہ نہیں ہوتے، پس اگر اس قسم کے قتل کو رائگاں کر دیا جائے تو لوگ قتل پر دلیر ہو جائیں گے، اور فساد عام ہو جائے گا۔ اور اگر بے دلیل مقتول کے ورثاء کا دعوی مان لیا جائے، تو لوگ ہر اس شخص پر دعوی کریں گے جس سے وہ دشمنی رکھتے ہیں۔ پس ضروری ہوا کہ ایسی بڑی جماعت کی قسموں کو لیا جائے جن سے گاؤں آباد ہوتا ہے۔ اور وہ پچاس مرد ہیں (عورتوں بچوں سے قسمیں نہیں لی جائیں گی) پس نبی ﷺ نے اس کا فیصلہ کیا، اور اس کو ثابت رکھا ـــــ اور فقہاء نے اُس علت میں اختلاف کیا ہے جس پر قسامہ گھومایا جاتا ہے: پس کہا گیا: علت: ایسے مقتول کا پایا جانا ہے جس پر کسی زخم کا نشان ہو، جیسے پیٹنا یا گلا گھونٹنا، ایسی جگہ میں (لاش ملی ہو) جو کسی قوم کی حفاظت میں ہو، جیسے محلّہ اور مسجد اور گھر۔ اور یہ بات عبداللہ بن سہل کے واقعہ سے لی ہوئی ہے جو خیبر میں مرے ہوئے پائے گئے تھے، جو اپنے خون میں لتھڑے ہوئے تھے ـــــ اور کہا گیا: مقتول کا پایا جانا اور کسی پر شبہ کا موجود ہونا ہے کہ وہی قاتل ہے: مقتول کے بتلانے سے، یا نصاب سے کم گواہی سے، اور اس کے مانند سے۔ اور یہ بات قسامہ کے اس واقعہ سے لی ہوئی ہے جس میں ابوطالب نے فیصلہ کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

ذمی کی نصف دیت ہونے کی وجہ

حدیث ـــــ حضرت عبداللہ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ''کافر (ذمی) کی دیت: مسلمان کی دیت سے آدھی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۹۶) اور نسائی اور ترمذی کی روایت میں ہے: عَقْلُ أهلِ الذمة: نصف عقل المسلمين: وهم اليهود والنصارى: ذمیوں کی یعنی یہود ونصاری کی دیت: مسلمانوں کی دیت سے آدھی ہے (جامع

الاصول حدیث ۲۴۹۴ کتاب الدیات)

تشریح: ذمیوں کی دیت: مسلمانوں کی دیت سے آدھی دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اسلام کی عظمت ظاہر کرنا ضروری ہے۔ اور وہ اس طرح ظاہر ہوگی کہ مسلمان کو کافر پر ترجیح دی جائے، ورنہ صدف اور خزف ایک مول ہو جائیں گے۔

دوسری وجہ: ذمی کے قتل سے مسلمانوں میں بہت کم بگاڑ پیدا ہوتا ہے، اور اس میں گناہ بھی زیادہ نہیں۔ کیونکہ کافر درحقیقت مباح الدم ہے۔ اس کا خون عارضی طور پر عقد ذمہ کی وجہ سے محفوظ ہوا ہے، پس اس کا قتل: خس کم جہاں پاک کی مثال ہے۔

مگر بایں ہمہ ذمی کا قتل گناہ، غلطی اور زمین میں فساد پھیلانا ہے۔ اس لئے اس کی ہلکی دیت یعنی آدھی دیت ادا کرنی ضروری ہے۔

فائدہ: یہ حکمت امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک پر بیان فرمائی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ذمی کی دیت اور بھی کم ہے: اگر وہ یہودی یا عیسائی ہے تو اس کی دیت چار ہزار درہم یعنی مسلمان کی تہائی دیت ہے، اور مجوسی یا ہندو ہے تو کل آٹھ سو درہم ہیں۔

اور احناف کے نزدیک: ذمی اور مسلمان کی دیت ایک ہے۔ اور روایات اس باب میں مختلف ہیں۔ احناف کی دلیل درج ذیل دو روایتیں ہیں:

پہلی روایت: مراسیل ابی داؤد (ص ۱۲ باب دیة الذمی) میں حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے مروی ہے: **دیةُ کلِّ ذی عهد فی عهده ألف دینار**: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر وہ شخص جس سے عہد و پیمان ہو: زمانۂ عہد میں اس کی دیت ایک ہزار ہے"

دوسری روایت: ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ واقعہ روایت کیا ہے کہ قبیلۂ بنی عامر کے دو شخص نبی ﷺ سے عہد و پیمان کر کے لوٹ رہے تھے: حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری اور ان کے ساتھی کو اس عہد کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ انھوں نے ان کو قتل کر دیا۔ نبی ﷺ نے دونوں کی مسلمانوں والی دیت ادا فرمائی (جامع الاصول حدیث ۲۴۹۳ کتاب الدیات)

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذمی کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لی ہے۔ پس حکومت اس ذمہ داری سے اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب ذمی کی جان کا مسلمان سے قصاص لیا جائے، اور اس کی دیت بھی مسلمانوں والی ادا کی جائے۔ غیر مسلم اسی صورت میں اسلامی حکومت میں اطمینان سے رہ سکتے ہیں۔ رہی اسلام کی عظمت تو وہ ایفائے عہد سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

قال صلی اللہ علیه وسلم: "دیةُ الکافر نصفُ دیة المسلم"

أقول: السبب فی ذلك ماذکرنا قبلُ. أنه یجب أن یُنَوَّهَ بالملة الإسلامیة، وأن یُفَضَّلَ



المسلمُ على الكافر، ولأن قتل الكافر أقلُّ إفسادًا بين المسلمين، وأقلُّ معصيةً، فإنه كافر مباحُ الأصـل، يَندفع بقتله شعبةٌ من الكفر، وهو مع ذلك ذنبٌ وخطيئةٌ وإفساد فى الأرض، فناسب أن تخفف ديته.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: سبب (حکمت) اس میں وہ بات ہے جس کو ہم نے قبل ازیں ذکر کیا ہے کہ (۱) ضروری ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی شان بلند کی جائے۔ اور یہ بات ہے کہ مسلمان کو کافر پر ترجیح دی جائے (۲) اور اس لئے کہ کافر کا قتل: بہت کم ہے مسلمانوں کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے کے اعتبار سے یعنی مسلم معاشرہ پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اور بہت کم ہے گناہ کے اعتبار سے، پس بیشک وہ مباح الاصل کافر ہے۔ اس کے قتل سے دفع ہوتی ہے کفر کی ایک شاخ۔ اور وہ قتل بایں ہمہ گناہ اور غلطی اور زمین میں بگاڑ پھیلانا ہے، پس مناسب ہے کہ اس کی دیت ہلکی کی جائے۔

☆ ☆ ☆

جَنین میں بُردہ واجب ہونے کی وجہ

حدیث ــــ دو عورتیں لڑیں۔ ایک نے دوسری کو پتھر یا ڈنڈا مارا۔ جس سے اس کا پیٹ کا بچہ گر گیا۔ نبی ﷺ نے اس میں بُردہ: غلام یا باندی کا فیصلہ فرمایا (مشکوۃ احادیث ۳۴۸۷ تا ۳۴۸۹)

تشریح: جَنین (پیٹ کے بچہ) میں دو جہتیں ہیں: ایک اس کے مستقل جان ہونے کی۔ اس لحاظ سے جان کے بدلہ میں جان ہونی چاہئے۔ دوم: اس کے ماں کا جزء اور عضو ہونے کی۔ کیونکہ ابھی وہ ماں کے تابع تھا، مستقل نہیں۔ اس لحاظ سے جنین کو جُروح (زخموں) کے بمنزلہ قرار دینا چاہئے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے دونوں جہتوں کا لحاظ کر کے بردہ واجب کیا، جو جان بھی ہے اور مال بھی۔ پس قربان جایئے اس عدل وانصاف کے!

وقضى صلى الله عليه وسلم فى الإملاص بِغُرَّةٍ: عبدٍ أو أمةٍ.

اعلم: أن الجنين فيه وجهان:

[١] كونه نفساً من النفوس البشرية، ومقتضاه: أن يقع فى عوضه النفسُ.

[٢] وكونه طرفًا وعضوًا من أمه، لايستقل بدونها، ومقتضاه: أن يُجعل بمنزلة سائر الجروح فى الحكم بالمال، فَرُوْعِىَ الوجهان: فَجُعل دِيتُه مالاً: هو آدمى، وذلك غاية العدل.

ترجمہ: جان لیں کہ جنین میں دو پہلو ہیں: (۱) اس کا جان ہونا انسانی جانوں میں سے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بدلہ میں نفس واقع ہو (۲) اور اس کا اپنی ماں کا ٹکڑا اور عضو ہونا۔ وہ اپنی ماں کے بغیر مستقل نہیں۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے،

کہ گردانا جائے وہ دیگر زخموں کے بمنزلہ، مال کے ذریعہ فیصلہ کرنے میں ــــ پس دونوں جہتوں کی رعایت کی گئی: پس اس کی دیت ایسا مال گردانی گئی جو کہ وہ انسان ہے۔ اور یہ انتہائی درجہ کا انصاف ہے!

☆ ☆ ☆

زخموں کے احکام اور ان کی حکمتیں

جو ظلم وتعدی انسان کے اعضاء پر کی جائے یعنی جان کر یا غلطی سے کوئی عضو کاٹ دیا جائے، یا زخم لگایا جائے، اور اس سے آدمی کی موت واقع نہ ہو تو اس کا حکم تین اصولوں پر مبنی ہے:

اصلِ اول ــــ زخم عمداً ہو اور مساوات ممکن ہو تو قصاص واجب ہے ــــ اگر زخم عمداً لگایا ہو، یا کوئی عضو کاٹا ہو، اور برابری ممکن ہو، اور زخم کے سرایت کرنے کا، اور آدمی کی ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو تو قصاص واجب ہے۔ اور اس کی بنیاد: سورۃ المائدہ کی آیت ۴۵ ہے۔ ارشاد پاک ہے: "اور ہم نے اُن (یہود) پر اُس (تورات) میں فرض کیا کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت، اور زخموں میں بدلہ ہے" اور گذشتہ شریعتوں کے وہ احکام جو ہماری شریعت میں بلا نکیر نقل کئے گئے ہیں وہ ہمارے لئے بھی حجت ہیں۔ اور ایسے زخموں میں قصاص کی وجہ وہی ہے جو نفس میں قصاص کی وجہ ہے کہ اس میں بڑی زندگی ہے، ورنہ یہ سلسلہ لامتناہی حد تک چلتا رہے گا۔

آنکھ کا قصاص: گرم آئینہ کے ذریعہ لیا جائے ــــ اگر کسی نے آنکھ پر کوئی چیز ماری، جس سے بصارت زائل ہوگئی، اور آنکھ سالم رہی تو اس کے چہرے پر بھیگی ہوئی روئی رکھی جائے، اور اس کی آنکھ سورج کی طرف کردی جائے۔ اور گرم کیا ہوا آئینہ اس کی آنکھ کے قریب کیا جائے: آنکھ باقی رہے گی، اور بصارت زائل ہوجائے گی۔ یہ ترکیب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتائی ہے (نصب الرایہ ۴: ۳۵۰)

دانت کا قصاص: ریتی (رندے) کے ذریعہ لیا جائے ــــ اگر کسی نے دوسرے کا دانت توڑ دیا تو سوہن سے اس کا دانت ریت دیا جائے، اکھاڑا نہ جائے کہ اس میں زیادہ تکلیف ہے (مگر اب انجکشن دیکر اکھاڑنا زیادہ آسان ہے)

دیگر زخموں کا قصاص: جو زخم موضحہ جیسے ہیں یعنی ان میں مساوات ممکن ہے تو ان میں بھی قصاص واجب ہے۔ اور ان میں قصاص کا طریقہ یہ ہے کہ زخم کی گہرائی کا اندازہ کرکے، اس کے بقدر چھری پکڑی جائے۔ پھر اتنا زخم لگایا جائے ــــ اور اگر زخم ایسا لگایا ہے کہ ہڈی ٹوٹ گئی ہے تو قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ دیت واجب ہوگی، کیونکہ ہڈی توڑنے میں ہلاکت کا اندیشہ ہے۔

تھپڑ اور چٹکی کا قصاص: اگر کسی کو طمانچہ مارا یا چٹکی بھری تو بعض تابعین کے نزدیک قصاص ہے۔ مگر ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ چیزیں قابل قصاص نہیں۔ کیونکہ طمانچہ مارنا اور چٹکی بھرنا یکساں نہیں ہوتا۔ ضعیف اور قوی کا معاملہ مختلف ہے۔ اس لئے دیت واجب ہوگی۔

اصلِ دوم — زخم غلطی سے لگا ہو، یا زخم میں برابری ممکن نہ ہو، تو زخم کے لحاظ سے دیت واجب ہوگی — اور اس کی چند صورتیں ہیں:

پہلی صورت: زخم ایسا لگایا ہو کہ اس سے انسان کی کوئی قوت نافعہ، مثلاً پکڑنا، چلنا، دیکھنا، سننا، عقل اور قوتِ باہ زائل ہوگئی ہو، اور اس درجہ زائل ہوگئی ہو کہ وہ شخص لوگوں پر بار ہوگیا ہو، اپنے دنیوی کام خود انجام نہ دے سکتا ہو، اس زخم کی وجہ سے لوگوں کے درمیان آنے میں اس کو عار محسوس ہوتا ہو، اس کی شکل بگڑ گئی ہو، اللہ کی بناوٹ میں فرق آگیا ہو، اور اس زخم کا اثر اس کے جسم میں زندگی بھر باقی رہنے والا ہو، تو پوری دیت واجب ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا زخم ظلم عظیم ہے۔ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی، شکل بگاڑنا، اور اس کے ساتھ عار لاحق کرنا ہے۔ اور لوگ زخموں سے بچانے میں ویسی دلچسپی نہیں لیتے جیسی قتل کے معاملہ میں لیتے ہیں۔ لوگ مظلوم کو قتل سے تو بچاتے ہیں، مگر زخموں سے بچانے کے لئے کوئی نہیں آتا۔ حاکم، ظالم اور اس کا جتھہ، بلکہ مظلوم کا جتھہ بھی اس معاملہ کو بہت ہی معمولی سمجھتا ہے۔ اس لئے زخموں کے معاملہ کو غیر معمولی اہمیت دینی ضروری ہے۔ اور اس میں آخری درجہ کی سزا مقرر کرنی ضروری ہے۔ اس لئے جنس منفعت فوت ہونے کی صورت میں پوری دیت واجب کی گئی۔

اور اس کی بنیاد: وہ نامۂ مبارک ہے جو یمن والوں کو لکھا گیا تھا۔ اس میں ہے: ''ناک میں جبکہ وہ جڑ سے کاٹ دی جائے پوری دیت ہے۔ اور دانتوں میں پوری دیت ہے۔ اور دو ہونٹوں میں پوری دیت ہے۔ اور دو خصیوں میں پوری دیت ہے۔ اور مرد کے آلۂ تناسل میں پوری دیت ہے۔ اور پشت (بیکار کردینے) میں پوری دیت ہے۔ اور آنکھوں میں پوری دیت ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۴۹۲) اور فرمایا: ''عقل (زائل کرنے) میں پوری دیت ہے'' (بیہقی ۸:۸٦)

دوسری صورت: اگر زخم لگانے سے آدھی جنس منفعت زائل ہوئی ہو تو اس میں آدھی دیت ہے۔ مثلاً ایک پیر میں آدھی دیت ہے۔ اور ایک ہاتھ میں آدھی دیت ہے۔

تیسری صورت: اگر زخم سے جنس منفعت کا دسواں حصہ تلف ہوا ہو، تو دیت کا دسواں حصہ واجب ہے۔ جیسے ہاتھوں کی یا پیروں کی ایک انگلی کاٹ دی تو دس اونٹ واجب ہوں گے۔

چوتھی صورت: اور اگر ایک دانت یا ایک ڈاڑھ توڑ دی تو دیت کا بیسواں حصہ یعنی پانچ اونٹ واجب ہوں گے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دانتوں کی اولاً دو قسمیں ہیں: ایک: عارضی یعنی کچے اور دودھ کے دانت۔ یہ بیس ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر چھ ماہ کی عمر سے لیکر پانچ برس کی عمر تک نکل آتے ہیں۔ دوم: مستقل اور پکے دانت۔ یہ سات برس کی عمر سے شروع ہوکر بیس بائیس برس کی عمر تک پورے ہوجاتے ہیں۔ اور یہ دانت بالعموم ۳۲ ہوتے ہیں۔ بعض کے ۳۱ بعض کے ۲۹ اور بعض کے ۲۸ ہوتے ہیں۔ اور ۳٦ تک پائے گئے ہیں، مگر ۲۸ سے کم اور ۳٦ سے زائد نہیں ہوتے۔ اور یہ اختلاف عقل والی ڈاڑھوں کے تفاوت سے ہوتا ہے (کمال الفرقان شرح جمال القرآن صفحہ ۲۷ تصنیف مولانا قاری محمد طاہر رحیمی)

اور ان اعداد کے اعتبار سے دیت کے سو اونٹوں میں سے ایک دانت کا حصہ نکالنا دشوار ہے، حساب کی گہرائی میں اترنے کا محتاج ہے۔ اس لئے بیس کی تعداد لے لی۔ اور دیت کا بیسواں حصہ: پانچ اونٹ واجب کئے۔

اصل سوم — مندمل اور بھر جانے والے زخموں کا حکم — اگر زخم ایسا ہے جس سے کوئی مستقل قوت ضائع نہیں ہوئی۔ نہ آدھی قوت ختم ہوئی ہے اور اس سے شکل بھی نہیں بگڑی۔ وہ زخم بس مندمل ہو جانے والے، اور بھر جانے والے ہیں تو ان کو بمنزلہ نفس قرار دینا، اور پوری دیت واجب کرنا مناسب نہیں۔ اور ایک ہاتھ اور ایک پیر کے بمنزلہ قرار دیکر آدھی دیت واجب کرنا بھی مناسب نہیں۔ اور ان کو بالکل رائگاں کر دینا، اور ان کے مقابلہ میں کچھ واجب نہ کرنا بھی مناسب نہیں۔ اس لئے ایسے زخموں کے احکام درج ذیل ہیں:

۱۔ موضحہ کا حکم: موضحہ ایسے زخموں کا ادنی درجہ ہے۔ موضحہ میں ہڈی کھل جاتی ہے، اور نظر آنے لگتی ہے۔ اس سے کم خَدَش (خراش) اور خُمش (رگڑ) کہلاتا ہے۔ جُرح (زخم) نہیں کہلاتا۔ اس لئے موضحہ میں دیت کا بیسواں حصہ: پانچ اونٹ واجب ہیں۔ کیونکہ بیسواں حصہ ہی وہ کم از کم حصہ ہے جو حساب کی گہرائی میں اترے بغیر جانا جا سکتا ہے۔ تیسواں، چالیسواں حصہ نکالیں گے تو کسر آئے گی۔ مثلاً سو کا چالیسواں ڈھائی اونٹ ہیں۔ اور قوانینِ شرعیہ کا مدار ایسے سہام (حصوں) پر ہے جن کی مقدار حساب داں اور غیر حساب داں یکساں طور پر جان سکیں۔

۲ — منقِلہ کا حکم: منقلہ: وہ زخم ہے جس میں ہڈی کھل بھی جاتی ہے، ٹوٹ بھی جاتی ہے، اور ہٹ بھی جاتی ہے۔ پس وہ تین موضحہ زخموں کے برابر ہے۔ اس لئے اس میں پندرہ اونٹ واجب ہیں۔

۳و۴ — جائفہ اور آمّہ کا حکم: جائفہ: جوف (اندر) تک پہنچنے والی چوٹ۔ آمّہ: دماغ تک پہنچنے والی چوٹ۔ یہ دونوں: زخموں میں سب سے بڑے ہیں۔ اس لئے ہر ایک میں تہائی دیت واجب ہے۔ کیونکہ نصف اور چوتھائی کے درمیان ثلث ہی کا عدد ہے۔

سب انگلیاں اور سب دانت برابر ہونے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ اور یہ یکساں ہیں'' یعنی چھوٹی انگلی اور انگوٹھا (مشکوۃ حدیث ۳۴۸۶)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انگلیاں یکساں ہیں۔ اور دانت یکساں ہیں، اگلے دانت اور ڈاڑھ یکساں ہیں، یہ اور یہ (چھوٹی انگلی اور انگوٹھا) یکساں ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۹۵)

تشریح: ہر انگلی اور ہر دانت کا اگرچہ ایک مخصوص فائدہ ہے۔ مگر اس کی تعیین مشکل ہے۔ اس لئے حکم نام اور نوع پر دائر کیا گیا ہے۔ یعنی چھوٹی انگلی بھی انگلی کہلاتی ہے، اور انگوٹھا بھی، دونوں کی نوع ایک ہے۔ اسی طرح دانت بھی دانت کہلاتا ہے، اور ڈاڑھ بھی، اور ان کی نوع بھی ایک ہے۔ پس سب کا حکم ایک ہے۔



وأما التعدّى على أطراف الإنسان: فحكمه مبنى على أصول:

أحدها: أن ماكان منها عمدًا ففيه القصاص، إلا أن يكون القصاص فيه مُفضيا إلى الهلاك، فذلك مانع من القصاص، وفيه قوله تعالى: ﴿النَّفْسَ بِالنَّفْسِ، وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ، وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ، وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ، وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ، وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ﴾ فالعين: بمرآةٍ مُحماةٍ، والسنُّ: بالمِبْرد، ولا تُقلَعُ، لأن فى القلع خوفَ زيادةِ الأذى. وفى الجروح — إذا كان كالموضِحَة — القصاصُ: يُقبض على السكين بقدر عُمْقِ الموضحة؛ فإن كان كَسْرَ العظمَ فلا قصاص: لأنه يُخاف منه الهلاكُ، وجاء عن بعض التابعين: لطمةٌ بلطمة، وقَرْصَةٌ بقرصة.

والثانى: أن ماكان إزالةً لقوةٍ نافعةٍ فى الإنسان، كالبطش، والمشى، والبصر، والسمع، والعقل، والباء ة، ويكون بحيث يصير الإنسان به كَلاًّ على الناس، ولايقدر على الاستقلال بأمر معيشته، ويَلحق به عار فيما بين الناس، ويكون مُثْلَةً، يتغير بها خلقُ الله، ويبقى أثرها فى بدنه طول الدهر، فإنه يجب فيها الدية كاملةً.

وذلك: لأنه ظلم عظيم، وتغيير لخلقه، ومُثلة به، وإلحاقُ عارٍ به، وكان الناس لا يقومون بنصرة المظلوم بأمثال ذلك، كما يقومون فى باب القتل، ويُحَقَّرُ أمرَه الظالمُ والحاكمُ، وعصبةُ الظالم وعصبةُ المظلوم، فاستوجب ذلك أن يُؤَكَّدَ الأمرُ فيه، ويُبَلَّغَ مَزْجَرَتُه أقصى المبالغ.

والأصل فيه: قوله صلى الله عليه وسلم فى كتابه إلى أهل اليمن:" فى الأنف إذا أُوْعِبَ جَدْعُه الديةُ، وفى الأسنان الدية، وفى الشفتين الدية، وفى البيضتين الدية، وفى الذكر الدية، وفى الصلب الدية، وفى العينين الدية" وقال عليه السلام:" فى العقل الدية"

ثم ماكان إتلافاً لنصف هذه المنفعة: ففيه نصفُ الدية: فى الرِّجل الواحدة نصف الدية، وفى اليد الواحدة نصفُ الدية؛ وماكان إتلافا لِعُشْرِها — كأصبع من أصابع اليدين أو الرجلين — ففيه عُشر الدية؛ وفى كل سِنٍّ نصفُ عُشر الدية.

وذلك: لأن الأسنان تكون ثمانيةً وعشرين، أو ستةً وثلاثين؛ والكسر الذى يكون بإزاء نسبةِ الواحد إلى ذلك العدد خفيٌّ، محتاجٌ إلى التعمق فى الحساب، فأخذنا العشرين، وأوجبنا نصفَ عُشر الدية.

والثالث: أن الجروحَ التى لاتكون إبطالاً لقوة مستقلة، ولالنصفها، ولا تكون مُثْلَةً، وإنما هى تَبْرَأُ وتَنْدَمِلُ: لاينبغى أن تُجعل بمنزلة النفس، ولا بمنزلة اليد والرِّجل، فَيُحكم بنصف

الدية، ولا ينبغي أن يُهْدَرَ ولا يُجعل بإزائه شيئٌ:

فأقلها الموضحة : إذ ما كان دونها: يقال له خَدَشٌ وَخَمْشٌ، لا جرحٌ؛ والموضحة ـــ ما يوضح العظمَ ـــ ففيه نصفُ العُشر: لأن نصفَ العشر أقلُّ حصةٍ يُعرف من غير إمعان في الحساب، وإنما يُبنى الأمر في الشرائع على السهام المعلوم مقدارُها عند الحاسب وغيره.

والمنَقِّلَةُ: فيها خمسة عشر بعيرًا: لأنها إيضاحٌ وكسرٌ ونقلٌ، فصار بمنزلة ثلاثة إيضاحات.

والجائفة والآمَّة :أَعْظَمَا الجراحات، فمن حقهما: أن يُجعل في كل واحدة منهما ثُلُثُ الدية؛ لأن الثلث يُقدر به مادون النصف.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" هذه وهذه سواءٌ" يعني الخِنصر والإبهام، وقال: "الثَنِيَّةُ والضِرْسُ سواء"

أقول: والسبب: أن المنافعَ الخاصةَ بكل عضو عضو لَمَّا صعب ضبطُها: وجب أن يدار الحكمُ على الأسامي والنوع.

ترجمہ: اور رہی اعضائے انسانی پر تعدی (زیادتی) تو اس کا حکم چند ضابطوں پر مبنی ہے: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ جو زخموں میں سے عمداً ہو تو اس میں قصاص ہے۔ مگر یہ کہ اس عضو میں قصاص ہلاکت تک پہنچانے والا ہو۔ پس وہ افضاء قصاص سے مانع ہے...... پس آنکھ: گرم کئے ہوئے آئینہ کے ذریعہ، اور دانت ریتی کے ذریعہ۔ اور وہ اکھاڑا نہ جائے۔ اس لئے کہ اکھاڑنے میں تکلیف کی زیادتی کا اندیشہ ہے۔ اور زخموں میں ـــ جبکہ زخم موضحہ جیسا ہو ـــ قصاص ہے۔ پکڑی جائے چھری موضحہ کی گہرائی کے بقدر۔ پھر اگر زخم نے ہڈی توڑ دی ہو تو قصاص نہیں۔ اس لئے کہ ہڈی توڑنے سے ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اور بعض تابعین سے مروی ہے: "طمانچہ کے بدلے طمانچہ، اور چٹکی کے بدلے چٹکی" (انگوٹھے اور انگلی سے بدن کے حصہ کو پکڑ کر دبانا)

اور دوسرا ضابطہ: یہ ہے کہ جو زخم انسان میں کسی مفید قوت کو زائل کرنا ہو، جیسے پکڑنا، اور چلنا، اور دیکھنا، اور سننا، اور عقل (سمجھنا) اور قوتِ باہ۔ اور وہ ازالہ اس طور پر ہو کہ اس کی وجہ سے انسان لوگوں پر بوجھ ہو جائے۔ اور وہ مستقلاً اپنی معیشت کے معاملہ میں قادر نہ رہے، اور اس کی وجہ سے عار لاحق ہو لوگوں کے درمیان، اور وہ زخم شکل بگاڑنا ہو، بدل جائے اس کی وجہ سے انسان کی بناوٹ۔ اور باقی رہے اس کا اثر اس کے جسم میں زندگی بھر، پس بیشک ان زخموں میں پوری دیت واجب ہے۔

اور وہ بات (پوری دیت کا وجوب) اس وجہ سے ہے کہ وہ بڑا بھاری ظلم ہے۔ اور وہ اس کی بناوٹ کو بدلنا ہے۔ اور اس کی شکل بگاڑنا ہے، اور اس کے ساتھ عار لاحق کرنا ہے۔ اور لوگ نہیں کھڑے ہوا کرتے مظلوم کی مدد کے لئے اس قسم کی زیادتیوں میں، جیسا کہ وہ قتل کے معاملہ میں کھڑے ہوا کرتے ہیں۔ اور زخم کے معاملہ کو معمولی سمجھتا ہے ظالم اور حاکم، اور

ظالم کا گروہ اور مظلوم کا گروہ۔ پس اس بات نے واجب ولازم جانا کہ زخم میں معاملہ (دیت کا وجوب) پختہ کیا جائے۔ اور زخم کے ذریعۂ زجر کو پہنچنے کی جگہ کی انتہاء تک پہنچایا جائے۔ یعنی پوری دیت واجب کی جائے۔

پھر جو زخم اس منفعت کے نصف کو تلف کرنا ہو تو اس میں آدھی دیت ہے...... اور جو زخم منفعت کے دسویں حصہ کو تلف کرنا ہو — جیسے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی انگلیوں میں سے ایک انگلی — تو اس میں دیت کا دسواں حصہ ہے۔ اور ہر دانت میں دیت کا بیسواں حصہ ہے —— اور وہ بات یعنی ہر دانت میں دیت کا بیسواں حصہ اس لئے ہے کہ دانت ۲۸ یا ۳۶ ہوتے ہیں۔ اور وہ کسر جو ایک کی نسبت کے مقابلہ میں ہوتی ہے اس عدد کے ساتھ: پوشیدہ ہے، حساب میں گہرائی میں اترنے کی محتاج ہے (مثلاً ایک شخص کے منہ میں ۲۹ دانت ہیں۔ ان میں سے ایک کسی نے توڑ دیا۔ پس ۲۹ میں تو پوری دیت واجب ہے۔ اور ایک میں ۲۹ واں حصہ واجب ہے۔ پس جب سو کو ۲۹ پر تقسیم کریں گے تو تین صحیح اور کچھ کسر آئے گی جو بہت خفی حساب ہے) پس ہم نے بیس کو لیا (اس لئے کہ ۲۰ سے کم دانت نہیں ہوتے۔ کچے بھی نہیں ہوتے) اور ہم نے دیت کا بیسواں حصہ واجب کیا جو پانچ اونٹ ہیں۔

اور تیسرا ضابطہ: یہ ہے کہ وہ زخم جو کسی مستقل قوت کو باطل نہیں کرتے، اور نہ اس کے آدھے کو، اور وہ شکل نہیں بگاڑتے اور وہ ٹھیک ہی ہو جاتے ہیں، اور مندمل ہو جاتے ہیں: مناسب نہیں کہ وہ بمنزلہ نفس کے گردانے جائیں، اور نہ بمنزلہ ہاتھ اور پاؤں کے، کہ فیصلہ کیا جائے آدھی دیت کا۔ اور مناسب نہیں کہ وہ رائگاں کر دیئے جائیں، اور ان کے مقابلہ میں کچھ بھی مقرر نہ کیا جائے — پس ان زخموں کا ادنیٰ درجہ موضحہ ہے: کیونکہ جو زخم اس سے کم ہے اس کو خراش اور رگڑ کہا جاتا ہے، زخم نہیں کہا جاتا۔ اور موضحہ: وہ زخم ہے جو ہڈی کو کھول دے۔ پس اس میں بیسواں حصہ ہے۔ اس لئے کہ بیسواں کم سے کم وہ حصہ ہے جو حساب کی گہرائی میں اُترے بغیر جانا جاتا ہے۔ اور قوانینِ شرعیہ میں معاملہ کا مدار ایسے سہام پر رکھا جاتا ہے جن کی مقدار حساب دانوں اور ان کے علاوہ کے نزدیک جانی ہوئی ہو — اور منقلہ: پس اس میں پندرہ اونٹ ہیں۔ اس لئے کہ وہ ہڈی کھولنا، اور توڑنا، اور ہڈی کو اس کی جگہ سے ہٹانا ہے۔ پس وہ تین موضحہ زخموں کے بمنزلہ ہو گیا —— اور جائفہ اور آمّہ: زخموں میں سب سے بڑے ہیں، پس ان دونوں کے حق سے ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک میں تہائی دیت مقرر کی جائے۔ کیونکہ نصف سے کم کا تہائی سے اندازہ کیا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: اور وجہ یہ ہے کہ ہر ہر عضو کے ساتھ مخصوص منفعت: جب اس کا انضباط دشوار ہو تو ضروری ہے کہ حکم ناموں اور توع پر دائر کیا جائے۔

تصحیح: أو ستةٌ و ثلاثين مطبوعہ میں و ستة و عشرين تھا۔ مخطوط کراچی میں واؤ کی جگہ أو ہے، اور وہی صحیح ہے۔ البتہ ثلاثين کی جگہ مخطوط کراچی میں بھی عشرين ہے۔ مگر یہ سبقتِ قلم ہے۔ کیونکہ دانت ۲۸ سے کم نہیں ہوتے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ ۳۶ ہوتے ہیں۔ پس اگر صحیح عشرين ہوتا تو اس کو ثمانية و عشرين سے پہلے آنا چاہئے تھا۔

وہ قتل یا زخم جو رائگاں ہیں

بعض قتل اور بعض زخم رائگاں ہوتے ہیں۔ اور ایسا دو صورتوں میں ہوتا ہے:

پہلی صورت: کسی ایسے شر کو دفع کرنے کے لئے قتل کیا ہو، یا زخم لگایا ہو کہ اگر وہ اس طرح مدافعت نہ کرتا تو وہ شر اس کو پہنچتا یعنی جان یا مال کی حفاظت کے لئے اقدام کیا ہو تو قصاص یا دیت واجب نہیں۔ اور اس کی دلیل درج ذیل تین حدیثیں ہیں:

حدیث — حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص آیا، اور اس نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! اگر کوئی شخص (ناحق) میرا مال لینا چاہے تو؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اس کو اپنا مال مت دے'' اس نے پوچھا: اگر وہ مجھ سے لڑے تو؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو (بھی) اس سے لڑ!'' اس نے پوچھا: اگر وہ مجھے قتل کردے تو؟ آپؐ نے فرمایا: ''پس تو شہید ہے!'' اس نے پوچھا: اگر میں اس کو قتل کردوں تو؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ جہنم میں جائے گا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۱۳)

حدیث — حضرت یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کا ایک مزدور تھا۔ وہ کسی سے لڑا۔ پس ایک نے دوسرے کا ہاتھ کاٹا۔ پس اس شخص نے جو کاٹا گیا تھا اپنا ہاتھ اس کے منہ سے کھینچا۔ جس سے اس کا سامنے کا دانت گر گیا۔ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ نے اس کا دانت رائگاں کردیا، اور فرمایا: ''کیا وہ اپنا ہاتھ تیرے منہ میں دیئے رہتا کہ تو اس کو سانڈ کی طرح چباتا رہتا؟!'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۱۱)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی شخص تیرے گھر میں جھانکے، اور تو نے اس کو اجازت نہیں دی پس تو نے اس کو کنکری ماری، جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی، تو تجھ پر کوئی گناہ نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۱۴)

تشریح: انسان کے نفس، یا عضو، یا مال پر جو حملہ آور ہو، اس کو ہر ممکن طریقہ سے ہٹانا جائز ہے۔ اور اگر قتل کی نوبت آجائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ درندہ خو بار ہا زمین میں اپنا زور چلاتے ہیں۔ پس اگر ان کو ہٹایا نہیں جائے گا تو آفت آجائے گی اور مدافعت میں قتل یا زخم لگانے کی نوبت آسکتی ہے، اس لئے اس کو رائگاں کردیا۔

دوسری صورت: کسی ایسے سبب سے مرا ہو یا زخمی ہوا ہو، جس میں کسی کی زیادتی نہ ہو، بلکہ وہ ایک طرح کی سماوی آفت ہو تو وہ رائگاں ہے۔ اور اس کی دلیل آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ چوپائے کا زخم رائگاں ہے۔ اور کان رائگاں ہے، اور کنواں رائگاں ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۱۰)

تشریح: یہ قتل یا زخم رائگاں اس لئے ہے کہ چوپائے چرنے کے لئے چھوڑے جاتے ہیں۔ پس اگر وہ کسی کو نقصان پہنچائیں، تو وہ اس کے مالک کا فعل نہیں، اس لئے اس پر ضمان واجب نہیں۔ اسی طرح کسی کے کنویں میں کوئی گر کر مرجائے، یا کان بیٹھ جائے اور مزدور دب کر مرجائے، تو اس میں کان اور کنویں والے کا کچھ قصور نہیں، اس لئے اس پر ضمان واجب نہیں۔

واعلم: أن من القتل والجَرْح مايكون هدْرًا؛ وذلك لأحد وجهين:

[۱] إما أن يكون دفعًا لشرٍّ يَلحق به؛ والأصل فيه:

[الف] قولُه صلى الله عليه وسلم في جواب من قال: يارسول الله! أرأيتَ إن جاء رجلٌ يريد أخذَ مالي؟ قال: " فلا تُعطه" قال: أرأيتَ إن قاتلني؟ قال: " قَاتِلْه" قال: أرأيتَ إن قتلني؟ قال: "فأنت شهيد" قال: أرأيتَ إن قتلتُه؟ قال: " هو في النار!"

[ب] وعَضَّ إنسانٌ إنسانًا، فانتزعَ المعضوضُ يدَه من فمه، فَأَنْدَرَ ثَنِيَّته، فأهدرها صلى الله عليه وسلم.

فالحاصل: أن الصائل على نفس الإنسان، أو طرفه، أو ماله: يجوز دَفْعُه بما أمكن، فإن انْجَرَّ إلى القتل: لا إثم فيه؛ فإن الأنفسَ السبعية كثيرًا ما يتغلَّبون في الأرض، فلو لم يُدفعوا لضاق الحال.

[ج] وقال صلى الله عليه وسلم: " لو اطَّلع في بيتك أحدٌ، ولم تأْذَنْ له، فخذفتَه بحصاة، ففقأتَ عينه: ماكان عليك من جناح"

[۲] وإما أن يكون بسبب ليس فيه تعدٍّ لأحد، وإنما هو بمنزلة الآفات السماوية؛ والأصل فيه قولُه صلى الله عليه وسلم: " العجماءُ جُبَارٌ، والمعدِنُ جبار، والبئر جبار"

أقول: وذلك: لأن البهائمَ تُسرح للمرعى، فإذا أصابتْ أحدًا، لم يكن ذلك من صُنع مالكها، وكذلك إذا وقع في البئر، أو انطبق عليه المعدِن.

ترجمہ: اور جان لیں کہ قتل وزخم میں سے بعض وہ ہیں جو رائگاں ہوتے ہیں۔ اور وہ (رائگاں جانا) دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے ہوتا ہے — (۱) یا تو یہ کہ وہ (قتل یا زخم) کسی ایسی برائی کی مدافعت کے طور پر ہو جو اس کو لاحق ہو رہی ہو۔ اور بنیاد اس میں:...... پس حاصل یہ ہے کہ انسان کے نفس، یا اس کے عضو، یا اس کے مال پر حملہ کرنے والا: اس کو دفع کرنا جائز ہے، جس طرح بھی ممکن ہو۔ پس اگر وہ دفع کرنا قتل تک کھنچ جائے تو اس میں کچھ گناہ نہیں۔ پس بیشک درندہ صفت لوگ بار ہا زمین میں زور چلاتے ہیں۔ پس اگر وہ نہ ہٹائے جائیں تو حالت تنگ ہو جائے گی۔ (اس کے بعد تیسری حدیث ہے جس کو شرح میں اوپر لیا گیا ہے)

(۲) اور یا یہ کہ وہ قتل یا زخم کسی ایسے سبب سے ہو جس میں کسی کی زیادتی نہیں۔ اور وہ بمنزلہ آسمانی آفتوں کے ہے......

میں کہتا ہوں: اور وہ بات اس لئے ہے کہ چوپائے چرنے کے لئے چھوڑے جاتے ہیں۔ پس جب وہ کسی کو زد پہنچائیں تو یہ بات اس کے مالک کے فعل سے نہیں، اور اسی طرح جب کنویں میں گر پڑا، یا اس پر کان ڈھہ پڑی۔

☆ ☆ ☆

ہتھیاروں میں احتیاط برتنا

نبی ﷺ نے لوگوں کو نہایت تاکید کی ہے کہ وہ ہتھیاروں میں احتیاط برتیں، تاکہ غلطی سے کوئی زخمی نہ ہوجائے۔ حدیث میں ہے: مِن القَرَف التلف: نزدیکی میں ہلاکت ہے (ابوداؤد حدیث ۳۹۲۳) یعنی دوری میں سلامتی ہے! درج ذیل روایات میں اسی احتیاط کی تعلیم ہے:

حدیث (۱) — حضرت عبداللہ بن المغفل رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو کنکری پھینکتے ہوئے دیکھا تو اس کو منع کیا۔ اور فرمایا کہ نبی ﷺ نے کنکری پھینکنے سے منع کیا ہے، اور فرمایا ہے: اس سے نہ تو کوئی شکار کیا جاسکتا ہے، اور نہ اس کے ذریعہ دشمن کو زخمی کیا جاسکتا ہے یعنی اس میں کوئی دنیوی فائدہ ہے نہ دینی! البتہ وہ کبھی دانت توڑ دیتی ہے، اور آنکھ پھوڑ دیتی ہے پس احتیاط لازم ہے۔

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد یا بازار میں یعنی لوگوں کے مجمع میں گذرے، اور اس کے ہاتھ میں تیر ہو، تو چاہئے کہ وہ اس کو پیکان (پھل) سے پکڑے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے کوئی مسلمان زخمی ہوجائے!''

حدیث (۳) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کی طرف (مذاق کے طور پر) ہتھیار سے اشارہ نہ کرے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا: ہوسکتا ہے شیطان تیر اس کے ہاتھ سے چھین لے (اور وہ اس کو مار دے یعنی لگ جائے) پس وہ جہنم کے کھڈ میں جا گرے!''

حدیث (۴) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے ہم پر ہتھیار اٹھایا: وہ ہم میں سے نہیں!''

حدیث (۵) — حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس بات سے منع کیا کہ تلوار سونتی ہوئی دی جائے'' بلکہ اس کو میان میں بند کر کے دینا چاہئے۔

حدیث (۶) — حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دو انگلیوں کے درمیان تسمہ (رکھ کر) کاٹنے سے منع کیا۔

نوٹ: یہ سب حدیثیں مشکوۃ، کتاب القصاص، باب مالا یضمن من الجنایات میں ہیں۔

ثم إن النبيَّ صلى الله عليه وسلم سَجَّلَ عليهم أن يَحتاطوا، لئلا يُصيب أحدًا منهم بخطأ، فإن من القَرَفِ التلفَ، ومنه نهيُه صلى الله عليه وسلم عن الخَذْفِ، قال: " إنه لايُصاد به صَيدٌ، ولا يُنْكَأُ به عدوٌّ، ولكنه قد يَكسر السنَّ، ويفقأ العينَ" وقال صلى الله عليه وسلم: " إذا مر أحدُكم في مسجدنا، أو في سوقنا، ومعه نَبْلٌ: فليمسك على نِصَالِها: أن يُصيب أحدًا من المسلمين منها

شيئ!" وقال صلى الله عليه وسلم: " لايُشير أحدُكم إلى أخيه بالسِّلاح، فإنه لايدرى لعل الشيطانَ ينزع من يده، فيقعُ في حفرة من النار!" وقال صلى الله عليه وسلم: " من حمل علينا السِّلاح فليس منا" ونهى عليه السلام أن يُتعاطى السيفُ مسلولاً، ونهى أن يُقَدَّ السَّيْرُ بين أصبعين.

ترجمہ: واضح ہے۔لغات: سَجَّل عليه: کسی بات کی سخت تاکید کرنا..... القَرَف: نزدیکی..... الخذف: کنکری وغیرہ پھینکنا..... نَكَأ(ف) العدوَّ: دشمن کو زخمی کر کے مار ڈالنا..... قَدَّ(ن) الشيئَ: کاٹنا۔لمبائی بھی پھاڑنا..... السَيْرُ من الجلد وغيره: لمبا تراشا ہوا چمڑے وغیرہ کا ٹکڑا، تسمہ۔

☆ ☆ ☆

غصب اور اتلاف میں سزائیں نہ ہونے کی وجہ

اموال پر زیادتی چند قسم کی ہوتی ہے۔ جیسے غصب، اتلاف، چوری اور لوٹ۔ چوری اور لوٹ کا بیان آئندہ باب میں آئے گا:

اور غصب: کے لغوی معنی ہیں: کسی کی کوئی چیز جبراً قہراً لے لینا۔ اور اصطلاحی معنی ہیں: کسی بوگس شبہ کی وجہ سے، جو شرعاً غیر معتبر ہے، کسی کی کوئی چیز ہتھیا لینا، یا مطلق شبہ کے بغیر زبردستی قبضہ کر لینا، یہ خیال کر کے کہ مالک اپنا حق ثابت نہیں کر سکے گا، اور حکام کو حقیقتِ حال کا پتہ نہیں چلے گا۔ یا ایسی ہی کسی اور وجہ سے غیر کے مال پر قبضہ کر لینا۔

غصب میں سزا نہ ہونے کی وجہ: غصب کو معاملات میں شامل کرنا ضروری ہے، اس پر حدود قائم نہیں کی جاسکتیں اور اس کی وجہ آئندہ باب کے شروع میں آرہی ہے۔ چنانچہ ہزار درہم غصب کرنے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اور تین درہم (یا دس درہم) چُرانے میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔

اتلاف میں سزا نہ ہونے کی وجہ: مال برباد کرنا عمداً بھی ہوتا ہے، عمد جیسا بھی ہوتا ہے، اور غلطی سے بھی ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اموال جانوں سے کم درجہ ہیں، اس لئے کسی بھی طرح سے مال برباد کرنے پر کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی۔ زجر و توبیخ کے لئے تاوان واجب کرنے کو کافی سمجھا گیا۔

زمین غصب کرنے پر ایک خاص سزا کا راز

حدیث ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے بالشت بھر زمین ظلم سے لی، اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سات زمینوں کی مالا پہنائیں گے!" (مشکوۃ حدیث ۲۹۳۸ باب الغصب، کتاب البیوع)

تشریح: یہ بات بار بار بیان کی جاچکی ہے کہ جو عمل نظام مملکت کو تباہ کرتا ہے، اور جس میں ایذا رسانی اور زیادتی ہوتی ہے: اس کام کے کرنے والے پر مقرب فرشتوں کی پھٹکار برستی ہے۔ اور اس کی سزا اس عمل کی یا اس کے قریب ہی قریب

صورت اختیار کرتی ہے۔ چنانچہ زمین غصب کرنے کی سزا میں زمین ہی کا طوق پہنایا جائے گا۔ اور ایک زمین کا نہیں، ساتوں زمینوں کا!

غصب وعاریت کے ضمان کا ضابطہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاتھ پر وہ چیز لازم ہے جو اس نے لی ہے۔ یہاں تک کہ ہاتھ اس چیز کو (مالک تک) پہنچادے'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۹۵۰ باب الغصب)

تشریح: غصب وعاریت کے ضمان کا یہی ضابطہ ہے کہ بعینہ اس چیز کو لوٹانا واجب ہے۔ اور اگر چیز ہلاک ہونے کی وجہ سے یہ بات ممکن نہ ہو تو اس کا مثل (مانند) لوٹانا ضروری ہے۔

فائدہ: غصب میں ضمان مطلقاً واجب ہے۔ اور عاریت میں اگر اس کو ہلاک کیا ہے تو بالا جماع ضمان واجب ہے۔ اور اگر بغیر تعدّی کے چیز ہلاک ہوگئی ہے تو احناف کے نزدیک ضمان واجب نہیں۔ ان کے نزدیک مستعار چیز: مستعیر کے پاس امانت ہوتی ہے۔ پس اس پر امانت کے احکام جاری ہوں گے اور دیگر ائمہ کے نزدیک: اس صورت میں بھی ضمان واجب ہے۔ ان کے نزدیک مستعار چیز بہر حال مضمون ہے۔

اور ضمان کا مسئلہ حدیث کے عموم سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور حدیث کا ماسیق لاجلہ الکلام: ایک معاشرتی خرابی کی اصلاح ہے۔ لوگ عام طور پر برتنے کے لئے چیزیں لیتے ہیں۔ پھر رکھ چھوڑتے ہیں۔ فائدہ اٹھانے کے بعد واپس نہیں کرتے۔ یہ بڑی خرابی کی بات ہے۔ لوگ اسی وجہ سے جھوٹ بول کر عاریت دینے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اس حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ عاریت پر لی ہوئی چیز کو واپس پہنچانے کی ذمہ داری مستعیر کی ہے۔ اس کو چاہئے کہ فائدہ اٹھانے کے بعد فوراً واپس پہنچادے۔

ضمان بالمثل کا بیان اور مثل میں وسعت

حدیث — حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن نبی ﷺ کی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں تھی۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے ایک لکڑی کے پیالے میں حَیس (کھجور، ستو اور گھی ملا کر بنایا ہوا کھانا) بھیجا۔ جب خادم لیکر پہنچا تو حضرت عائشہؓ نے خادم کے ہاتھ پر ہاتھ مارا، جس سے پیالہ گر پڑا، اور ٹوٹ گیا۔ نبی ﷺ نے پیالے کے ٹکڑے جمع کئے۔ اور اس میں کھانا چننا شروع کیا، اور فرمایا: ''تمہاری ماں کو غیرت آگئی!'' پھر خادم کو روک لیا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر سے پیالہ لایا گیا۔ اور اس ٹوٹے ہوئے پیالہ کے بدلے میں وہ سالم پیالہ دیا، اور ٹوٹا ہوا پیالہ روک لیا (بخاری حدیث ۲۴۸۱ مشکوٰۃ حدیث ۲۹۴۰)

تشریح: غصب واتلاف میں ضمان کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر ہلاک شدہ چیز کا مثل صوری ومعنوی ہوتو ضمان میں مثل دیا جائے گا۔ اور مثلیات: تمام مکیلی اور موزونی چیزیں ہیں۔ اور جس چیز کا مثل صوری ومعنوی نہ ہو، جیسے جانور تو ان میں مثل معنوی یعنی قیمت ضمان میں دی جائے گی۔ ایسی چیزیں متقومات اور ذوات القیم کہلاتی ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

اتلاف میں ضمان کا یہی ضابطہ ہے کہ مثلیات میں ویسی ہی چیز ضمان میں دی جائے۔ مگر احادیث سے بظاہر یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ ذوات القیم میں بھی ایسی چیز تاوان میں دی جاسکتی ہے جو عرف میں ہلاک شدہ چیز کے مانند سمجھی جاتی ہو، جیسے پیالہ کے بدلے پیالہ۔ یعنی مثلیت میں وسعت ہے۔ بالکل ایک ہی طرح کی چیز ہونا ضروری نہیں۔ عرفِ عام میں جو چیز مثل (مانند) سمجھی جاتی ہے، وہ ضمان میں دی جاسکتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک باندی نے خود کو آزاد ظاہر کیا۔ ایک شخص نے اس سے نکاح کرلیا۔ اور اولاد ہوئی۔ پھر اس باندی کے آقا نے دعوی کیا۔ باندی کی اولاد اس کے آقا کی غلام ہوتی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیا کہ باندی تو اس کا آقا لے، مگر اولاد غلام نہیں ہوگی۔ البتہ باپ اولاد کا ان کے مانند کے ذریعہ فدیہ دے یعنی لڑکے کے بدلے غلام، اور لڑکی کے بدلے باندی دے (سنن بیہقی ۷:۲۱۹) حالانکہ حیوان ذات القیم ہے۔ جس میں ضمان میں قیمت دی جاتی ہے۔ مگر عرف کا لحاظ کرکے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے غلام باندی کو اولاد کا مثل قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ مثلیت میں وسعت ہے۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا ہے: ''احادیث سے بظاہر یہ بات مفہوم ہوتی ہے'' یہ تعبیر اس لئے اختیار فرمائی ہے کہ حدیث سے استدلال میں احتمال ہے۔ کیونکہ وہ ضمان کا واقعہ نہیں۔ دونوں ہی گھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تھے۔ اور دونوں ہی پیالے آپؐ کے تھے۔ چنانچہ ٹوٹا ہوا پیالہ چاندی کے تار سے جُڑوادیا گیا تھا۔ اور آپؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کے متروکات تبرکات میں تقسیم کئے تھے تو یہ پیالہ حضرت انس خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ پیالہ آپؐ کا مملوکہ تھا۔ اور اس کے عوض میں جو پیالہ بھیجا گیا تھا وہ بھی آپؐ کا تھا۔ کیونکہ ضمان میں غیر کی چیز نہیں دی جاتی۔

اور ولد مغرور کے واقعہ میں لڑکے کے بدلے میں دو غلام اور لڑکی کے بدلے میں دو باندیاں دلوائی گئی تھیں (مصنف عبد الرزاق ۷:۲۷۹ حدیث نمبر ۱۳۱۵۷ موسوعہ آثار الصحابہ حدیث ۳۸۹۸) چنانچہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وذلك یرجع إلی القیمة إلخ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ضمان بالقیمت کی طرف راجع ہے۔ یعنی ضمان میں غلام باندی: اولاد کی قیمت کے لحاظ سے دلوائے گئے تھے، مثلیت کے لحاظ سے نہیں۔ کیونکہ غلام: نہ تو آزاد کے برابر ہوسکتا، نہ قریب قریب۔ پس یہ فیصلہ ضمان بالقیمت کی طرف راجع ہے (سنن بیہقی ۷:۲۱۹)

> وأما التعدی علی أموال الناس: فأقسام: غصبٌ، وإتلاف، وسرِقةٌ، ونَهْبٌ.
> أما السرقة والنهب فستعرفهما.

وأما الغصب: فإنما هو تسلُّطٌ على مال الغير، معتمِدًا على شبهة واهية، لا يُثبتها الشرع، أو اعتمـاذا علـى أن لا يَظْهَـرَ علـى الحـكّام جَلِيَّةُ الحال، ونحو ذلك، فكان حريًّا أن يُعدَّ من المـعـاملات، ولا يُبتنى عليه الحدود، ولذلك كان غصبُ ألف درهم لايوجب القطع، وسرِقةُ ثلاثةِ دراهمِ توجبه.

وأما الإتلاف: فيكون عمدًا، وشِبْهَ عمدٍ، وخطأً، لـكن الأموال لما كانت دون الأنفس: لم يُجعل لكل واحد منها حُكما، وكفى الضمانُ عن جميعها زاجرًا.

[۱] قـال رسـول الله صـلـى الله عـليه وسلم:" من أخذ شِبرًا من الأرض ظلمًا، فإنه يُطوَّقُه يوم القيامة من سبع أرضين"

أقول: قـد عـلـمـتَ مـرارًا: أن الـفـعـلَ الذى يَنقض المصلحةَ المدنية، ويحصل به الإيذاءُ والتعدّى: يستوجب لعنَ الملأ الأعلى، ويَتصور العذاب بصورة العمل، أو مُجاوره.

[۲] وقال صلى الله عليه وسلم:" على اليد ما أخذتْ!"

أقول: هذا هو الأصل في باب الغصب والعارية، يجب ردُّ عينه، فإن تعذّر فردُّ مثله.

[۳] ودفع عليه السلام صَحْفَةً في موضع صحفةٍ كُسِرَتْ، وأمسك المكسورة.

أقول: هـذا هـو الأصـل فـي بـاب الإتـلاف؛ والـظـاهـر مـن السنة: أنـه يجوز أن يُغرمَ في المتقوماتِ بما يَحْكُمُ به العامةُ والخاصةُ أنه مثلُها، كالصحفة مكان الصحفة.

وقـضـى عثمانُ رضى الله عنه بمحضرٍ من الصحابة رضى الله عنهم على المغرور: أن يَفْدِىَ بمثلِ أولاده.

ترجمہ: اور رہی لوگوں کے اموال پر زیادتی: تو اس کی کئی قسمیں ہیں: غصب، اتلاف، چوری کرنا اور لوٹنا ـــــ رہا چوری کرنا اور لوٹنا تو آپ دونوں کو عنقریب جان لیں گے ـــ اور رہا غصب: تو وہ دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا ہے، تکیہ کرتے ہوئے کسی بوگس دلیل پر، جس کو شریعت تسلیم نہیں کرتی۔ یا اس بات پر تکیہ کرتے ہوئے کہ حکام پر حقیقت حال ظاہر نہیں ہوگی۔ اور اس کے مانند (کسی بنیاد پر قبضہ کرنا) پس غصب اس بات کے لائق تھا کہ وہ معاملات میں شمار کیا جائے (جرائم میں شمار نہ کیا جائے) اور اس پر حدود وتعزیر نہ کی جائیں۔ اور اسی وجہ سے ہزار درہم غصب کرنا قطع ید کو واجب نہیں کرتا۔ اور تین دراہم کو چرانا واجب کرتا ہے ـــ اور رہا مال برباد کرنا: تو وہ جان کر ہوتا ہے، اور جاننے جیسا ہوتا ہے، اور غلطی سے ہوتا ہے۔ لیکن جب اموال جانوں سے کم تر تھے تو نہیں مقرر کیا گیا ان (عمد، شبہ عمد اور خطا) میں سے کسی کے لئے بھی کوئی حکم۔ اور ضمان (تاوان) ان سب کی طرف سے زجر کے لئے کافی سمجھا گیا ـــ (۱) آپ بار بار جان چکے ہیں کہ وہ فعل جو مصلحت مدنیہ کو توڑتا ہے۔ اور

اس کی وجہ سے ایذا رسانی اور زیادتی حاصل ہوتی ہے: وہ فعل واجب ولازم جانتا ہے ملأ اعلی کی لعنت کو، اور متصور ہوتا ہے عذاب: عمل کی صورت میں یا اس کے پڑوس کی صورت میں — (۲) میں کہتا ہوں: یہی بات ضابطہ ہے غصب وعاریت کے سلسلہ میں: بعینہ اس چیز کو لوٹانا واجب ہے۔ پس اگر دشوار ہو تو اس کے مانند کو لوٹانا ضروری ہے — (۳) میں کہتا ہوں: یہی ضابطہ ہے اتلاف کے سلسلہ میں۔ اور احادیث سے بظاہر یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ جائز ہے کہ تاوان دیا جائے، متقوم چیزوں میں (بھی) اس چیز کے ذریعہ جس کے بارے میں عوام وخواص فیصلہ کریں کہ وہ اس کے مانند ہے، جیسے پیالے کی جگہ پیالہ۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی موجودگی میں فیصلہ کیا فریب خوردہ پر کہ وہ فدیہ دے اپنی اولاد کے مثل کے ذریعہ۔

☆ ☆ ☆

جو اپنا مال بعینہ کسی کے پاس پائے: وہ اس کا زیادہ حقدار ہے

حدیث — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اپنا مال بعینہ کسی کے پاس پایا: وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اور خریدار اس کا پیچھا کرے جس نے اس کو بیچا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۹۴۹)

تشریح: کسی کا کوئی مال چوری ہوگیا، یا کسی نے غصب کرلیا، یا گم ہوگیا۔ پھر وہ مال بعینہ کسی کے پاس ملا، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، تو مال کا مالک قاضی کے یہاں استحقاق ثابت کرکے وہ مال لے سکتا ہے۔ اور جس کے پاس وہ مال ملا ہے: اگر وہ کہے کہ اس نے اس کو کسی سے خریدا ہے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ بائع کا پیچھا کرے — اس حکم میں اشکال یہ ہے کہ اس میں مشتری کے نقصان کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ممکن ہے وہ بائع کو نہ پائے پس اس کا نقصان ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

جب ایسی صورت پیش آئے تو عقلاً دو ہی فیصلے ہو سکتے ہیں:

پہلا فیصلہ: مشتری کو مہلت دی جائے یعنی مال اس کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ اور مالک خود بائع کو تلاش کرے، اور اس کو قاضی کے پاس حاضر کرکے اپنا استحقاق ثابت کرے، پھر مشتری سے وہ مال لے۔ تو اس میں چند وجوہ مالک کا نقصان ہے:

پہلی وجہ: ممکن ہے یہی شخص جس کے پاس مال ملا ہے: چور، غاصب یا گم شدہ چیز پانے والا ہو۔ اور جب اس کی خیانت طشت از بام ہوئی تو وہ کہنے لگا: میں نے یہ چیز کسی سے خریدی ہے۔ اس طرح وہ اپنا بچاؤ کرتا ہو۔ پس اگر مالک سے کہا جائے گا کہ وہ بائع کو تلاش کرے، تو وہ کہاں پائے گا؟

دوسری وجہ: کبھی چور اور غاصب کسی کو اس چیز کے بیچنے کا وکیل بناتے ہیں۔ تاکہ وہ پکڑے جائیں نہ وکیل۔ وکیل یہ کہہ کر بچ جائے گا کہ مجھے کسی نے یہ مال بیچنے کے لئے دیا ہے۔ اور چور اور غاصب یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم کیا جانیں؟!

جس نے بیچا ہے اس کو پکڑو۔ پس حقوق ضائع ہونگے۔ اور مالک کا نقصان ہوگا۔

تیسری وجہ: اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مالک نے جب بائع کو تلاش کرلیا تو مشتری غائب ہوگیا۔ جب اسے ڈھونڈھ نکالا تو سامان ندارد! پس نامرادی کے سوا مالک کے ہاتھ کیا آئے گا؟

دوسرا فیصلہ: یہ کیا جاسکتا ہے کہ مالک اپنا استحقاق ثابت کر کے وہ چیز فوراً لیلے۔ اور مشتری سے کہا جائے کہ وہ بائع کو پکڑے اس میں بچند وجوہ مشتری کا ضرر ہے:

پہلی وجہ: کبھی مشتری بازار سے ایک چیز خریدتا ہے، اور اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ بائع کون ہے؟ اور کہاں رہتا ہے؟ پس اگر وہ مال مستحق لے لیگا، اور مشتری کو بائع نہیں ملے گا تو اس کا نقصان ہوگا۔ نامرادی ہی اس کے نصیب میں آئے گی!

دوسری وجہ: اور کبھی مشتری کو سامان کی فوری ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً وہ کھانے پینے یا پہننے کی چیز ہے۔ پس اگر مالک وہ چیز لے لیگا، اور مشتری بائع کے پیچھے جائے گا تو اس کی حاجت فوت ہوجائے گی۔

غرض دونوں صورتوں میں ضرر ہے۔ اور ایک نہ ایک کو ضرر برداشت کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر فیصلہ ممکن نہیں۔ پس جو بات لوگوں کے نزدیک واضح اور کھلی ہوئی ہے، جس کو اُن کے اذہان بے کھٹک قبول کرتے ہیں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اسی کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اور یہاں واضح بات یہ ہے کہ وہ مال مالک کے حوالے کیا جائے۔ کیونکہ جب اس نے اپنا استحقاق ثابت کردیا تو اس کا حق اس چیز کے ساتھ متعلق ہوگیا۔ کورٹ میں بھی گواہوں کے ذریعہ جب کوئی شخص کسی چیز میں اپنا حق ثابت کرتا ہے، اور معاملہ بالکل صاف ہوجاتا ہے، کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا تو مدعی کے حق میں فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ اور مال اس کو دلوادیا جاتا ہے۔ مدعیٰ علیہ کے ضرر کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ سارے ہی فیصلے اس انداز پر ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ فیصلہ بھی اُسی طرح کیا گیا ہے۔

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: " من وجدَ عينَ مالِه عند رجل فهو أحقُّ به، ويتَّبِع البَيِّعُ من باعه"

أقول: السبب المقتضى لهذا الحكم: أنه إذا وقعت هذه الصورةُ، فيحتمل أن يكون في كل جانب الضررُ والجَوْرُ؛ فإذا وجدَ متاعَه عند رجل:

[١] فإن كانت السنةُ أن يُهمله حتى يجد بائعَه، ففيه ضرر عظيم لصاحب الحق:

[الف] فإن الغاصب، أو السارق إذا عُثِرَ على خيانته: ربما يحتجُّ بأنه اشترى من إنسان، يَذُبُّ بذلك عن نفسه.

[ب] وربما يكون السارقُ والغاصبُ وَكَّلَ بعضَ الناس بالبيع، لئلايؤاخذ هو ولا البائع، وفي ذلك فتحُ بابِ ضياعِ حقوق الناس.

[ج] وربما لايجد البائعَ إلا عند غيبةِ هذا المشترى، فيؤاخِذُه، فلا يجد عنده شيئًا، فيسكت

علی خيبة.

[۲] وإن كانت السنةُ أن يقبضه فى الحال، ففيه ضرر للمشترى:

[الف] لأنه ربما يبتاع من السوق: لايدرى من البائع؟ وأين محله؟ ثم يُستحقُّ مالُه، ولايجد البائعَ، فيسكت على خيبة.

[ب] وربما يكون له حاجةٌ إلى المتاع، ويكون فى قبض المستحِقِّ إياه، وحوالتِه على البائع: فوتُ حاجته.

فلما دار الأمر بين ضررين، ولم يكن بدٌّ من وجود أحدهما: وجب أن يُرجع إلى الأمر الظاهر الذى تقبله أفهامُ الناس من غير رِيبة، وهو هنا: أن الحقَّ تعلَّق بهذه العين، والعينُ تُحبس فى الحق المتعلّق بها، إذا قامت البينة، وارتفع الإشكال؛ وعلى هذا القياس ينبغى أن تُعتبر القضايا.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس حکم کو چاہنے والا سبب یعنی وجہ یہ ہے کہ جب یہ صورت پیش آئے تو احتمال ہے کہ ہر جانب ضرر اور ظلم ہو۔ پس جب مالک نے اپنا سامان کسی شخص کے پاس پایا: (۱) تو اگر طریقہ ہو یعنی یہ فیصلہ کیا جائے کہ مالک مشتری کو مہلت دے، یہاں تک کہ مالک اس کے بائع کو پائے تو اس میں بھاری ضرر ہے صاحب حق کا: (الف) پس بیشک غاصب یا چور جب اس کی خیانت کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ کبھی حجت پکڑتے ہیں کہ اس نے ایک شخص سے خریدا ہے۔ وہ اس طرح اپنی ذات سے مدافعت کرتا ہے (ب) اور کبھی چور اور غاصب کسی شخص کو فروخت کرنے کے لئے وکیل بناتے ہیں۔ تاکہ نہ وہ (غاصب اور چور) پکڑا جائے، نہ بیچنے والا وکیل۔ اور اس میں لوگوں کے حقوق کے ضیاع کا دروازہ کھولنا ہے (ج) اور کبھی مالک نہیں پاتا بائع کو، مگر اس مشتری کے غائب ہونے کے وقت۔ پس وہ اس مشتری کو پکڑتا ہے، پس وہ اس مشتری کے پاس کچھ نہیں پاتا، پس وہ نامرادی کے ساتھ خاموش رہتا ہے (۲) اور اگر طریقہ ہو کہ مالک اس پر فوراً قبضہ کرلے، تو اس میں مشتری کا ضرر ہے: (الف) اس لئے کہ وہ کبھی بازار سے خریدتا ہے: وہ نہیں جانتا کہ بیچنے والا کون ہے؟ اور اس کی جگہ کہاں ہے؟ پھر اس کا مال استحقاق میں لے لیا جاتا ہے۔ اور وہ بائع کو نہیں پاتا تو وہ نامرادی کے ساتھ خاموش رہتا ہے (ب) اور کبھی مشتری سامان کا محتاج ہوتا ہے۔ اور مستحق کے چیز پر قبضہ کرنے میں، اور مشتری کو بائع کے حوالے کرنے میں، مشتری کی حاجت فوت ہوجاتی ہے۔

پس جب معاملہ دو ضرروں کے درمیان دائر ہوا۔ اور ان دو میں سے ایک کے پائے جانے سے کوئی چارہ نہیں تو ضروری ہوا کہ اس امر ظاہر کی طرف رجوع کیا جائے جس کو لوگوں کے اذہان بے کھٹک قبول کریں۔ اور وہ یہاں یہ ہے کہ مالک کا حق اس چیز کے ساتھ متعلق ہوگیا ہے (کیونکہ اس نے قاضی کے یہاں اپنا استحقاق ثابت کردیا ہے) اور چیز روکی جاتی ہے اس حق میں جو چیز کے ساتھ متعلق ہونے والا ہے۔ جب گواہ پیش ہوجائیں، اور اشتباہ ختم ہوجائے یعنی جب

گواہوں کے ذریعہ مدعی اپنا دعوی ثابت کردے، اور بات بالکل واضح ہوجائے، تو جس چیز میں اس کا دعوی ہے وہ مدعی علیہ سے لیکر اس کو دیدی جاتی ہے۔ اور اسی انداز پر مناسب ہے کہ تمام قضایا کو قیاس کیا جائے۔ یعنی سارے فیصلے اسی انداز پر ہوتے ہیں۔ پس یہ فیصلہ بھی اسی انداز پر کیا گیا ہے۔

تصحیح: قوله: والعین تُحبس في الحق المتعلق بها مطبوعہ میں **والعین تُحبس في العین المتعلق به** تھا۔ اس میں دوسری جگہ **العین** تصحیف ہے۔ صحیح **الحق** ہے۔ یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔ اور **به** کو **بها** شارح نے کیا ہے۔ کیونکہ ضمیر **العین** کی طرف عائد ہے۔ اور **المتعلق** کو اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں پڑھ سکتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

مویشی کھیتوں کا نقصان کریں تو اس کا حکم

حدیث — حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی اونٹنی ایک باغ میں گھس گئی، اور اس نے نقصان کردیا۔ نبی ﷺ نے اس واقعہ میں دو باتوں کا فیصلہ کیا: ایک یہ کہ دن میں باغوں کی حفاظت کی ذمہ داری باغ والوں کی ہے۔ دوم: یہ کہ رات میں مویشی جو نقصان کریں اس کا تاوان مویشی والوں پر ہے (مشکوۃ حدیث ۲۹۵۱ موطا ۲: ۷۴۷)

تشریح: یہ فیصلے اس وجہ سے کئے ہیں کہ جب مویشی لوگوں کے کھیتوں میں نقصان کرتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کو الزام دیتا ہے، اور اپنی صفائی پیش کرتا ہے:

جانور کا مالک: کہتا ہے: جانوروں کو چراگاہ میں چھوڑنا ضروری ہے۔ ورنہ وہ بھوکے مریں گے۔ اور ہر جانور کے ساتھ رہنے میں اور اس کی حفاظت کرنے میں حرج ہے۔ اس صورت میں جانور والا اپنا کوئی کام نہیں کرسکے گا۔ اور جانور نے جو نقصان کیا ہے اس میں مالک کا کیا قصور ہے؟ کھیت والے ہی نے کوتاہی کی ہے کہ اس نے اپنے کھیت کی حفاظت نہیں کی۔ اور اس کو بربادی کے لئے چھوڑ دیا!

اور کھیت والا: کہتا ہے: کھیت بستی سے باہر ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا، لوگوں کے جانوروں کو ان سے روکنا، اور ان کی نگرانی کرنا کھیت والے کے بس میں نہیں۔ اس صورت میں وہ اپنا کوئی کام نہیں کرسکے گا۔ پس کوتاہی جانور والے کی ہے۔ اس نے خود جانور کھیت میں چھوڑ دیئے ہیں، یا ان کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے۔

پس جب صورتِ حال یہ ہے تو ضروری ہے کہ عرف وعادت کا اعتبار کیا جائے۔ اور اس سے تجاوز کو ظلم وزیادتی قرار دیا جائے۔ اور اس پر حکم مرتب کیا جائے۔ اور لوگوں کی عادت یہ ہے کہ دن میں کوئی نہ کوئی کھیت میں ہوتا ہے۔ جو کھیت کا کام کرتا ہے۔ اس کو سنوارتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے، رات میں یہ لوگ گھر چلے آتے ہیں۔ اور جانور والوں کی عادت یہ ہے کہ وہ رات میں مویشی گھر لے آتے ہیں اور باندھ دیتے ہیں، پھر دوسرے دن چرنے کے لئے کھولتے ہیں۔ پس اگر دن

میں جانور نقصان کرتے ہیں تو اس میں کھیت والے کی کوتاہی ہے۔اس لئے ضمان واجب نہیں۔اور رات میں نقصان کرتے ہیں تو اس میں جانور والے کی کوتاہی ہے،اس لئے تاوان واجب ہے۔

[٥] وقضى صلى الله عليه وسلم: أن على أهلِ الحوائط حفظَها بالنهار، وأن ما أفسدتِ المواشي بالليل، ضامِنٌ على أهلها"

أقول: السبب المقتضي لهذا القضاء: أنه إذا أفسدت المواشي حوائطَ الناس، كان الجورُ والعذرُ مع كل واحد:

فصاحب الماشية: يحتج بأنه لابد أن يَسْرَحَ ماشيته في المرعى، وإلا هلكت جوعًا، واتِّبَاعُ كلِّ بهيمة وحفظُها يُفسد عليهم الارتفاقاتِ المقصودةَ، وأنه ليس له اختيار فيما أتلفته بهيمتُه، وأن صاحبَ الحائط هو الذي قصَّرَ في حفظِ ماله، وتَرَكَه بمَضْيَعَةٍ.

وصاحب الحائط: يحتج بأن الحوائط لاتكون إلا خارج البلاد، فحفظُها والذَّبُّ عنها والإقامةُ عليها: يُفسد حالَه، وأن صاحب الماشية هو الذي سَرَحَهَا في الحائط، أو قَصَّرَ في حفظها.

فلما دار الأمر بينهما، وكان لكل واحد جورٌ وعذرٌ: وجب أن يُرْجع إلى العادة المألوفة الفاشية بينهم، فَيُبنى الجورُ على مجاوزتها؛ والعادة: أن يكون في كل حائط في النهار من يعمل فيه، ويُصلح أمرَه، ويحفظُه، وأما في الليل فيتركونه، ويبيتون في القرى والبلاد؛ وأن أهل الماشية يجمعون ماشيتهم بالليل في بيوتهم، ثم يُسْرِحونها في النهار للرعي، فاعتُبر الجَوْرُ: أن يجاوِزَ العادةَ الفاشية بينهم.

ترجمہ:(۵)اور رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا:(۱) کہ دن میں باغ والوں کے ذمہ باغوں کی حفاظت ہے(۲)اور یہ کہ رات میں مویشی جو نقصان کریں،مویشی والوں پر اس کا تاوان ہے — میں کہتا ہوں:اس فیصلہ کو چاہنے والا سبب:یہ ہے کہ جب مویشی لوگوں کے باغوں میں نقصان کریں تو ظلم اور عذر ہر ایک کے ساتھ ہوگا۔یعنی ہر ایک اپنی صفائی پیش کرے گا،اور دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائے گا — پس جانور والا:حجت پیش کرے گا کہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو چراگاہ میں چھوڑے،ورنہ وہ بھوک سے مر جائیں گے۔اور ہر جانور کے پیچھے رہنا،اور اس کی حفاظت کرنا:لوگوں پر ان کے ضروری دنیوی کاموں کو خراب کردے گا۔اور یہ کہے گا کہ اس کا کوئی اختیار نہیں اس چیز میں جس کو اس کے جانور نے خراب کیا ہے۔اور یہ کہے گا کہ باغ والا ہی وہ ہے جس نے اپنے مال کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے۔اور اس کو ہلاکت کے

لئے چھوڑ دیا ہے ـــــ اور باغ والا: حجت پیش کرے گا کہ باغات آبادیوں سے باہر ہوتے ہیں۔پس ان کی حفاظت کرنا، اوران سے ہٹانا،اوران کی نگرانی کرنا: باغ کے مالک کے حال کو بگاڑ دے گا۔اور یہ کہے گا کہ جانور والا ہی وہ ہے جس نے اس کو باغ میں چھوڑا ہے، یا اس کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے۔

پس جب معاملہ دو شخصوں کے درمیان دائر ہوا،اور ہر ایک کے لئے ظلم اور عذر تھا،تو ضروری ہے کہ لوگوں کے درمیان مالوف ومشہور عادت کی طرف لوٹا جائے۔پس اس عادت سے تجاوز کرنے پر ظلم کی عمارت کھڑی کی جائے ـــــ اور عادت یہ ہے کہ دن میں ہر باغ میں وہ شخص ہوتا ہے جو اس میں کام کرتا ہے،اور اس کے معاملہ کو سنوارتا ہے،اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔اور رہا رات میں: تو لوگ باغ کو چھوڑ دیتے ہیں۔اور لوگ گاؤں اور شہروں میں رات بسر کرتے ہیں۔اور عادت یہ ہے کہ جانور والے رات میں اپنے گھروں میں اپنے جانوروں کو اکٹھا کرتے ہیں۔پھر ان کو دن میں چرنے کے لئے کھولتے ہیں۔پس یہ بات ظلم قرار دی گئی کہ وہ آپسی معاملات میں عادتِ مشہورہ کی خلاف ورزی کریں۔

لغات: حدیث میں ضامنٌ بمعنی مضمون ہے ..... المَضْيَعَة و المَضِيْعَة: ہلاکت،تباہی،اضاعت واتلاف۔

☆ ☆ ☆

پھل کھانے کا حکم اور اس کی وجہ

حدیث ـــــ نبی ﷺ سے باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا،آپؐ نے فرمایا:''جس حاجت مند نے اپنے منہ سے کھایا،پلّہ نہیں بھرا تو اس پر کچھ تاوان نہیں۔اور جو پھلوں میں سے کچھ لیکر نکلا تو اس پر اس کا دُونا: تاوان اور سزا ہے۔اور جس نے پھلوں میں سے کچھ چرایا،کھلیان میں محفوظ ہوجانے کے بعد،پس وہ ڈھال کی قیمت کے بقدر ہوگیا تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا'' (ابوداؤد حدیث ۱۷۱۰ کتاب اللُّقَطَة)

حدیث ـــــ حضرت رافع بن عَمرو غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں لڑکا تھا،انصار کے باغوں پر پتھر پھینکا کرتا تھا۔ وہ مجھے نبی ﷺ کے پاس لے گئے۔آپؐ نے فرمایا:''لڑکے! کھجور کے درختوں پر ڈھلے کیوں پھینکتا ہے؟'' میں نے عرض کیا: کھاتا ہوں! آپ نے فرمایا:''ڈھلے نہ پھینکا کر،جو نیچے گری ہوئی ہوں ان کو کھا'' پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا،اور دعا دی:''اے اللہ! اس کو شکم سیر فرما!'' (مشکوۃ حدیث ۲۹۵۷)

تشریح: طریقہ یہ تھا کہ جب کھجور کے خوشے پکنے پر آتے تو ان کو کاٹ کر اتار لیا جاتا۔اور باغ ہی میں لکڑیاں گاڑ کر ان پر لٹکا دیا جاتا۔جب وہ دھوپ میں پک کر اور سوکھ کر چھوہارے بن جاتیں تو ان کو کھلیان میں جمع کر لیا جاتا۔اور کوٹ کر کوڑا نکال کر بوروں میں بھر لیا جاتا۔

اب پھل کھانے کی چند صورتیں ہیں: حاجت مند کا کھانا،اور بے ضرورت کھانا۔پھر ہر ایک کی چار صورتیں ہیں:

درختوں کے نیچے گرا ہوا پھل کھانا، درختوں پر سے توڑ کر کھانا، لکڑیوں پر سوکھنے کے لئے باغ میں لٹکایا ہوا پھل کھانا، اور کھلیان میں محفوظ کیا ہوا پھل کھانا: پھر ہر ایک کی دو صورتیں ہیں: مالک کی اجازت سے کھانا اور بغیر اجازت کے کھانا۔ پس کل سولہ صورتیں ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ بے ضرورت اور بے اجازت کھانا کسی صورت میں درست نہیں۔ حدیث میں ہے: ألا لاتَظلموا، ألا لايحلُّ مالُ امرىءٍ إلا بطيب نفسٍ منه: سنو! ظلم وزیادتی مت کرو۔ سنو! کسی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں (مشکوۃ حدیث ۲۹۴۶ باب الغصب) اور یہ جو عام خیال ہے کہ درخت کے نیچے گرا ہوا پھل کھانا مطلقاً جائز ہے: یہ خیال درست نہیں۔

البتہ حاجت مند اور فاقہ مست کے لئے لوگ چشم پوشی کرتے ہیں۔ حضرت رافع رضی اللہ عنہ فاقہ ہی کی وجہ سے کھاتے تھے۔ پس بوقتِ حاجت درخت کے نیچے گرے ہوئے پھل کھانا جائز ہے۔ مگر لے نہیں جاسکتا۔ یہی حکم سوکھنے کے لئے باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں کا ہے۔ اور درخت پر سے توڑ کر کھانا، درختوں پر پتھر پھینکنا، جیب یا پلّہ میں بھر کر لے جانا، یا کھلیان میں محفوظ کیا ہوا پھل کھانا یا لے جانا جائز نہیں۔ بلکہ جو پھل کھلیان وغیرہ میں محفوظ کر دیا گیا ہے، اس میں سے نصابِ سرقہ کے بقدر کھانا یا لے جانا موجبِ حد ہے۔ اور اس سے کم میں تاوان اور سزا ہے۔ اب یہی باتیں حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کے الفاظ میں پڑھیں:

ایک دوسرے پر ظلم وزیادتی روکنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس شخص کا ہاتھ پکڑا جائے جو لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور ان پر زیادتی کرتا ہے۔ لوگوں کو مطلق العنان چھوڑ دینا اور من مانی کرنے دینا ظلم وجور کا علاج نہیں۔ پس اگر کوئی فاقہ زدہ ہے، اور باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں سے جو غیر محفوظ ہیں اور وافر مقدار میں ہیں، پیٹ بھر کر کھائے تو لوگ اس میں تنگی نہیں کرتے۔ بشرطیکہ وہ حد سے تجاوز نہ کرے، پلّہ بھر کر نہ لے جائے، اور درختوں پر پتھر نہ پھینکے۔ عرف میں ایسی صورت میں چشم پوشی برتی جاتی ہے۔ پس ایسی صورت میں اگر کوئی باغ والا دعوی کرے کہ کھانے والے نے حرص وآز سے پھل کھائے ہیں، یا نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ اور کھانے والے کو کوئی سرزنش نہیں کی جائے گی۔ البتہ اگر پھل توڑا ہو، یا پلّہ بھر کر لے گیا ہو، یا درخت پر ڈھیلے مارے ہوں، یا کسی بھی طرح پھل خراب کرنے میں حد سے تجاوز کیا ہو، تو سزا اور تاوان دونوں واجب ہیں۔

[٦] وسئل صلى الله عليه وسلم عن الثمر المعلَّق، فقال: "من أصاب بفيه، من ذى حاجة، غيرَ مُتَّخِذٍ خُبْنَةً، فلاشيئ عليه"

اعلم: أن دفع التظالم بين الناس: إنما هو أن يُقبض على يدمن يَضُرُّ بالناس، ويتعدى عليهم، لا أن يُتَّبَعَ شُحُّهم وغَمْرُ نفوسِهم: ففى صورة الأكل من الثمر المعلَّق، غيرِ المُحْرَزِ، الكثير الذى لا يُشَحُّ منه بِشِبَعِ إنسانٍ محتاجٍ، إذا لم يكن هناك مجاوزةُ حدِّ العرف، ولا اتخاذ خُبنةٍ، ولا رميُ الأشجار بالحجارة: فإن العرف يوجب المسامحة فى مثله؛ فمن ادَّعى فى مثل ذلك:

أنه اتبع الشُّحَّ وقصد الضرار فلا يُتبع.

وأما ما كان من ثمر مَشْفُوْهٍ، أو اتخاذِ خُبنةٍ، أو رمي أشجارٍ، أو مجاوزة الحد في الإتلاف بوجه من الوجوه: ففيه التعزير والغرامة.

ترجمہ: (۶) نبی ﷺ سے (باغ میں) لٹکائے ہوئے پھلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا: پس آپؐ نے فرمایا: ''جس حاجت مند نے اپنے منہ سے کھایا، درانحالیکہ وہ پلّہ بھرنے والا نہیں، تو اس پر کچھ (سرزنش یا تاوان) نہیں — جان لیں کہ لوگوں کے درمیان ایک دوسرے پر زیادتی کو ہٹانا: وہ یہی ہے کہ اس شخص کا ہاتھ پکڑا جائے جو لوگوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اور ان پر زیادتی کرتا ہے۔ یہ طریقہ نہیں ہے کہ ان کی حرص وآز کی اور ان کے دلوں کی کھوٹ کی پیروی کی جائے۔ پس اُن لٹکائے ہوئے پھلوں سے کھانے کی صورت میں جو محفوظ کئے ہوئے نہیں ہیں، جو اتنے زیادہ ہیں کہ اس سے کوئی محتاج انسان پیٹ بھر کھائے تو اس میں کنجوسی نہیں کی جاتی، جبکہ وہاں عرف وعادت کی حد سے تجاوز کرنا نہ ہو، اور نہ پلّہ بھرنا ہو، اور نہ درختوں پر پتھر پھینکنا ہو: پس بیشک عرف اس جیسی صورت میں چشم پوشی کو واجب کرتا ہے۔ پس جو شخص دعوی کرے اس جیسی صورت میں کہ کھانے والے نے حرص وآز کی پیروی کی ہے، اور نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا ہے تو وہ پیروی نہیں کیا جائے گا — اور رہی وہ صورت جبکہ پھل توڑا ہو، یا پلّہ بھرنا ہو، یا تیر پھینکنا ہو، یا کسی بھی شکل سے حد سے تجاوز کرنا ہو، پھل برباد کرنے میں: تو اس میں سزا اور تاوان ہے۔

لغات: الخُبْنَة: دامن یا لنگی کو موڑ کر بنایا ہوا پلّہ ..... المَشْفُوْہ: تھوڑا بچا ہوا۔ ماء مشفوہ: کثیر الورود پانی۔

☆ ☆ ☆

دودھ نکالنے کا حکم اور اس کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی شخص کسی کے جانور کا دودھ اس کی اجازت کے بغیر ہرگز نہ نکالے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ بات پسند کرتا ہے کہ کوئی شخص اس کے کمرے میں آئے، اس کی الماری توڑے، اور اس کا کھانا لے جائے؟ لوگوں کے لئے ان کے مویشی کے تھن ہی ان کی غذاؤں کو جمع کرتے ہیں'' یعنی دودھ مویشی کے مالکان کے نزدیک قیمتی چیز ہے (مشکوۃ حدیث ۲۹۳۹)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص جانوروں پر گذرے، تو اگر ان کے ساتھ ان کا رکھوالا ہے تو اس سے اجازت لے، اور نہ ہو تو تین بار زور سے پکارے، پس اگر کوئی جواب دے تو اس سے اجازت لے، اور کوئی جواب نہ دے، تو دودھ نکالے، اور پیئے، اور ساتھ نہ لے جائے'' (مشکوۃ حدیث ۲۹۵۳)

تشریح: جنگل میں چرنے والے جانوروں کا دودھ نکال کر استعمال کرنے کے سلسلہ میں روایات مختلف ہیں۔ پہلی

روایت میں تھن کے دودھ کو اس سامان کا حکم دیا گیا ہے جو گھروں میں ذخیرہ کیا ہوا ہے۔ جسے اجازت کے بغیر لینا جائز نہیں۔ پس بے اجازت جانور کو دوہنا بھی جائز نہیں۔

اور دوسری حدیث میں اس کو باغ میں لٹکائے ہوئے غیر محفوظ پھلوں کے حکم میں رکھا ہے، اور بوقت حاجت بقدر حاجت استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، جبکہ بکریوں کے ساتھ رکھوالا نہ ہو۔ اور اگر مالک موجود ہو تو اجازت لینا ضروری ہے۔

اور رفع تعارض کا ضابطہ یہ ہے کہ اگر روایات میں اختلاف ہو، اور حکم کی وجہ بیان کی گئی ہو، تو اس کا لحاظ کر کے حدیثوں کو جمع کیا جائے گا۔ یہاں پہلی حدیث میں ممانعت کی وجہ بیان کی گئی ہے کہ دودھ لوگوں کے نزدیک قیمتی چیز ہے۔ پس عرف میں جہاں وسعت برتی جاتی ہو، اور جتنی مقدار استعمال کرنے میں کنجوسی اور تنگی نہ کی جاتی ہو، اور حاجت بھی ہو، تو جائز ہے، ورنہ نہیں۔

یہی ضابطہ دو اور مسئلوں میں بھی ملحوظ رکھنا چاہئے: ایک: بیوی شوہر کے مال میں سے کیا خرچ کرسکتی ہے؟ دوسرا: غلام آقا کے مال میں سے کیا خرچ کرسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ جتنا خرچ کرنے میں چشم پوشی برتی جاتی ہے، اور کنجوسی اور تنگی نہیں کی جاتی، اور شوہر اور آقا سے اجازت لینے کا موقع نہیں ہے، اور خرچ کرنے کی ضرورت ہے تو خرچ کرسکتے ہیں، ورنہ نہیں۔

[۷] وأما لبنُ الماشية: فـالأقيسةُ فيه متعارضة، وقد بينها النبيُّ صلى الله عليه وسلم: فقاسها تارةً على المتاع المخزون في البيوت: فنهى عن حلبه؛ وتارةً على الثمر المعلَّق، والأشياءِ غيرِ المحرزة: فأباح منه بقدر الحاجة لمن لم يجد صاحبَ المال ليستأذنه.

والأصل فيما اختلف فيه الأحاديث، وأُظهرتِ العللُ: أن يُجمع باعتبار تلك العلل فحيثما جرتِ العادة ببذل مثله، وليس هناك شُحٌّ وتضييقٌ، وكانت حاجةٌ: جاز، وإلافلا.

وعلى مثل ذلك: ينبغي أن يُعتبر تصرف الزوجة في مال الزوج، والعبدِ في مال سيده.

ترجمہ: (۷) اور رہا جانوروں کا دودھ: پس قیاس اس میں متخالف ہیں۔ اور ان مختلف قیاسوں کو نبی ﷺ نے بیان کیا ہے: پس کبھی ان کو قیاس کیا اس سامان پر جو گھروں میں ذخیرہ کیا ہوا ہے، پس دودھ دوہنے سے منع کیا۔ اور کبھی لٹکائے ہوئے پھلوں پر اور غیر محفوظ چیزوں پر قیاس کیا۔ پس اس میں سے بقدر حاجت کی اجازت دی، اس شخص کے لئے جو مال والے کو نہ پائے کہ اس سے اجازت لے۔

اور ضابطہ اس میں جس میں احادیث مختلف ہوں، اور وجوہ ظاہر کی گئی ہوں: یہ ہے کہ ان وجوہ کا لحاظ کر کے روایات میں تطبیق دی جائے۔ پس جہاں عادت جاری ہو اس جیسی چیز کے خرچ کرنے کی، اور وہاں بخیلی اور تنگی نہ کی جاتی ہو، اور حاجت ہو تو جائز ہے، ورنہ نہیں —— اور اس کے مانند پر مناسب ہے کہ شوہر کے مال میں بیوی کے تصرف کا، اور آقا کے مال میں غلام کے تصرف کا لحاظ کیا جائے۔ یعنی وہی حکم یہاں بھی جاری کیا جائے۔

باب ــــــ ۴

حدود کا بیان

حدود کے سلسلہ کی عمومی باتیں

وہ جرائم جن میں سخت سزائیں ضروری ہیں

حدود: وہ سزائیں ہیں جو قرآن، حدیث یا اجماع سے ثابت ہیں، اور جو حق اللہ کے طور پر واجب ہوتی ہیں: **عقوبۃ مقدّرۃ، وجبت حقًّا للّٰہ تعالی** (درمختار) اور ''حق اللہ'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ سزائیں مفاد عامہ کے لئے مشروع کی گئی ہیں۔ یعنی لوگوں کے انساب، اموال، عقول اور اعراض (آبرو) کی حفاظت کے لئے مقرر کی گئی ہیں۔ یہ سزائیں گناہ سے پہلے گناہ سے روکنے والی، اور گناہ کے بعد سرزنش ہوتی ہیں۔ یہ نہ معاف کی جاسکتی ہیں، نہ ان میں سفارش کی گنجائش ہے۔

شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

چند جرائم ایسے ہیں جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے سزائیں مقرر فرمائی ہیں۔ چنانچہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کا کسی کو حق نہیں۔ یہ وہ جرائم ہیں جن میں مختلف جہتوں سے مفاسد جمع ہیں۔ ان سے زمین میں بگاڑ پھیلتا ہے۔ مسلمانوں کا چین سکون غارت ہوتا ہے۔ ان جرائم کے جذبات لوگوں کے دلوں میں برابر ابھرتے رہتے ہیں۔ وہ انسان پر حملہ کرتے ہیں۔ جب وہ دل میں رچ بس جاتے ہیں تو لوگ ان سے بچ نہیں سکتے۔ ان میں ایسا ضرر ہے کہ مظلوم اس کو اپنی ذات سے ہٹا نہیں سکتا۔ اور وہ جرائم کثیر الوقوع ہیں۔

اس قسم کے جرائم میں عذاب آخرت سے ڈرانا کافی نہیں۔ ان پر سخت ملامت اور دردناک سزا ضروری ہے۔ تاکہ وہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے رہے۔ اور وہ ان کو ارتکابِ جرم سے باز رکھے۔

ایسے سنگین جرائم پانچ ہیں:

پہلا جرم: زنا ہے۔ یہ گناہ شہوت کی زیادتی اور عورتوں کی خوبصورتی میں دلچسپی سے صادر ہوتا ہے۔ بدکاروں کے دلوں میں اس کی آز ہوتی ہے۔ عورت کے خاندان کے لئے اس میں سخت عار ہے۔ اور بیوی میں دوسرے کی مزاحمت انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اس سے قتل وقتال اور جنگ وجدال کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور زنا عام طور پر باہمی رضامندی اور تنہائی میں ہوتا ہے، جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہوسکتے کہ وہ روک ٹوک کریں۔ پس اگر اس کے لئے دردناک سزا مقرر نہیں کی جائے گی تو لوگ اس سے باز نہیں آئیں گے۔

دوسرا جرم: چوری ہے۔ بارہا انسان اچھا پیشہ نہیں پاتا تو وہ چوری کا دھندا شروع کر دیتا ہے۔ اور یہ جذبہ بھی انسان پر حملہ کرتا ہے۔ اور چوری اس طرح مخفی طور پر ہوتی ہے کہ لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ روکیں۔ اس لئے اس جرم کی بھی سخت سزا ضروری ہے، تاکہ لوگوں کے اموال محفوظ رہیں۔

چوری اور غصب میں فرق: غصب ایسی دلیل اور بوگس حجت کی بنیاد پر ہوتا ہے جس کو شریعت تسلیم نہیں کرتی۔ اور غصب: فریقین کے درمیان معاملات کے ضمن میں ہوتا ہے۔ اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو مجملۂ معاملات قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی۔ غاصب پر تاوان لازم کیا گیا ہے۔ اور اس کو مناسب سزا دی جائے گی۔ اور چوری مخفی طور پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی روک تھام ممکن نہیں، اس لئے اس کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔

تیسرا جرم: راہ زنی ہے۔ راہ زنی میں مظلوم راہ زن کو اپنی ذات اور اپنے مال سے ہٹا نہیں سکتا۔ کیونکہ راہ زنی مسلمانوں کے شہروں میں اور ان کے دبدبہ والے علاقوں میں نہیں ہوتی کہ پولس مدد کرے۔ اس لئے ڈاکہ زنی کے لئے چوری سے بھی بھاری سزا ضروری ہے۔

چوتھا جرم: شراب نوشی ہے۔ شرابی: شراب نوشی کا رسیا ہوتا ہے۔ اس سے زمین میں بگاڑ پھیلتا ہے۔ اور لوگوں کی عقلیں از کار رفتہ ہو جاتی ہیں، جبکہ عقل ہی پر دنیا و آخرت کی صلاح موقوف ہے۔ اس لئے یہ جرم بھی قابل سزا ہے۔

پانچواں جرم: زنا کی تہمت لگانا ہے۔ کیونکہ جس پر زنا کی تہمت لگائی جاتی ہے: اس کو سخت اذیت پہنچتی ہے۔ اور وہ تہمت لگانے والے کو دفع کرنے پر قادر نہیں۔ کیونکہ اگر وہ اس کو قتل کرے گا تو قصاصاً مارا جائے گا۔ اور ضرب و حرب کرے گا تو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے گا۔ پس اس جرم کے لئے بھی سخت سزا ضروری ہے۔

فائدہ: شراب نوشی کی سزا حدیثوں سے ثابت ہے۔ باقی حدود قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ اور یہی چند جرائم ہیں جن کی سزائیں ''حدود'' کہلاتی ہیں۔ باقی چھوٹے بڑے جرائم کی سزائیں ''تعزیرات'' کہلاتی ہیں۔ جو قاضی کی صوابدید پر موقوف ہیں۔ اور قصاص میں چونکہ معاف کرنے کا اختیار ہے، اس لئے وہ ''حدود'' میں شامل نہیں۔

﴿ الحدود ﴾

اعلم: أن من المعاصي ما شرع الله فيه الحدَّ؛ وذلك: كل معصية جمعتْ وجوهًا من المفسدة: بأن كانت فسادًا في الأرض، واقتضابا على طُمَأْنينة المسلمين، وكانت لها داعيةٌ في نفوس بني آدم، لاتزال تَهيجُ فيها، ولها ضَرَاوَةٌ لايستطيعون الإقلاعَ منها، بعد أن أُشربت قلوبُهم بها، وكان فيه ضررٌ لايستطيع المظلومُ دفعَه عن نفسه في كثير من الأحيان، وكان كثيرَ الوقوع فيما بين الناس.

فـمثـلُ هذه المعاصي: لايكفي فيها الترهيب بعذاب الآخرة، بل لابد من إقامة ملامةٍ شديدة عليها وإيلامٍ، ليكون بين أعينهم ذلك، فَيَرْدَعُهم عما يريدونه:

كالزنا: فإنها تَهِيْجُ من الشبق والرغبة في جمال النساء، ولها شِرّةٌ، وفيها عارٌ شديد على أهلها، وفي مزاحمة الناس على موطوأةٍ تغييرُ الجبلة الإنسانية، وهي مَظِنَّةُ المقاتلات والمحاربات فيما بينهم، ولايكون غالباً إلا برضا الزانية والزاني، وفي الخلوات، حيث لا يطّلعُ عليها إلا البعضُ، فلو لم يُشرع فيها حدٌّ وجيع لم يَحْصُل الردعُ.

وكالسرقة: فإن الإنسان كثيرًا مّا لايجد كَسْبا صالحًا، فَيَنْحَازُ إلى السرقة، ولها ضَراوةٌ في نفوسهم، ولا يكون إلا اختفاءً، بحيث لايراه الناس، بخلاف الغصب: فإنه يكون باحتجاج وشبهةٍ، لا يُثبتها الشرعُ، وفي تضاعيفِ مُعاملاتٍ بينهما، وعلى أعين الناس، فصار معاملةً من المعاملات.

وكقطع الطريق: فإنه لايستطيع المظلومُ ذَبَّه عن نفسه وماله، ولايكون في بلاد المسلمين وتحت شوكتهم، فَيَدْفعوا، فلا بد لمثله أن يُزاد في الجزاء والعقوبة.

وكشرب الخمر: فإن لها شَرَهًا، وفيها فسادًا في الأرض، وزوالاً لِمُسْكَةِ عقولهم التي بها صلاح معادِهم ومعاشهم.

وكالقذف: فإن المقذوف يتأذّى أذًى شديدًا، ولا يقدر على دفعه بالقتل ونحوه، لأنه إن قَتَلَ قُتل به، وإن ضَرب ضُرب به، فوجب في مثله زاجر عظيم.

ترجمہ: حدود کا بیان: جان لیں کہ بعض گناہ وہ ہیں: جن میں اللہ تعالیٰ نے سزا مقرر کی ہے۔ اور وہ: ہر وہ گناہ ہے جو خرابی کی مختلف صورتوں کو اکٹھا کرتا ہے۔ بایں طور کہ وہ زمین میں فساد ہو، اور مسلمانوں کے سکون کو غارت کرتا ہو۔ اور اس معصیت کے لئے انسانوں کے دلوں میں ایسا داعیہ ہو جو برابر دلوں میں ابھرتا رہتا ہو۔ اور اس معصیت کے لئے حملہ ہو، لوگ اس گناہ کو چھوڑنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں، اس کے بعد کہ لوگوں کے دل وہ گناہ پلا دیئے گئے ہوں۔ اور اس گناہ میں ایسا ضرر ہو کہ مظلوم اس ضرر کو اپنی ذات سے ہٹانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، اوقات میں سے اکثر اوقات میں۔ اور وہ گناہ لوگوں کے درمیان کثیر الوقوع ہو —— پس اس قسم کے گناہ: ان میں عذابِ آخرت سے ڈرانا کافی نہیں۔ بلکہ ضروری ہے ان پر سخت ملامت برپا کرنا اور دکھ دینا، تاکہ رہے سزا ان کی آنکھوں کے سامنے، پس روکے وہ ان کو اس چیز سے جس کا وہ ارادہ کریں —— جیسے زنا: پس بیشک یہ معصیت ابھرتی ہے شدتِ شہوت اور عورتوں کی خوبصورتی میں دلچسپی سے، اور اس معصیت کے لئے حرص وشوق ہے۔ اور اس میں عورت کے خاندان کے لئے سخت عار ہے۔ اور بیوی پر لوگوں کی مزاحمت میں فطرتِ انسانی کو بدلنا ہے یعنی یہ بات جانوروں میں پائی جاتی ہے، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ اور وہ باہمی قتل

وقتال اور جنگ وجدل کی احتمالی جگہ ہے۔ اور زنا عام طور پر نہیں ہوتا، مگر زانی اور زانیہ کی رضامندی سے، اور تنہائیوں میں ہوتا ہے، جہاں معصیت پر مطلع نہیں ہوتے مگر بعض لوگ۔ پس اگر اس میں دردناک سزا مقرر نہ کی جائے گی تو باز رہنا حاصل نہ ہوگا ـــــ اور جیسے چوری: پس بیشک انسان بارہا نہیں پاتا اچھا پیشہ، پس وہ چوری کی طرف ڈھلتا ہے۔ اور چوری کے لئے لوگوں کے دلوں میں حملہ ہے (مشہور ہے: ''چور چوری سے جاتا ہے، ایرا پھیری سے نہیں جاتا'' یعنی توبہ کرنے کے بعد بھی دل اس کا ہوکا کرتا ہے، پس توبہ سے پہلے کا حال نہ پوچھ!) اور چوری نہیں ہوتی مگر مخفی طور پر، بایں طور کہ نہیں دیکھتے اس کو لوگ (پس کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں ہوتا، اس لئے سخت سزا ہی کے ذریعہ روکنا ضروری ہے) برخلاف غصب کے: پس بیشک وہ ہوتا ہے دلیل قائم کرنے اور کمزور دلیل کے ذریعہ، جس کو شریعت ثابت نہیں کرتی یعنی وہ دلیل صحیح نہیں ہوتی۔ اور غصب دونوں کے درمیان معاملات کے ضمن میں ہوتا ہے، اور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ پس غصب معاملات میں سے ایک معاملہ ہوگیا (تفصیل گذشتہ باب میں گذر چکی) ـــــ اور جیسے راہ زنی: پس بیشک شان یہ ہے کہ مظلوم راہ زن کو اپنی ذات اور اپنے مال سے ہٹانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور راہ زنی: مسلمانوں کے شہروں میں اور ان کے دبدبہ والے علاقوں میں نہیں ہوتی کہ وہ ان کو دفع کریں۔ پس ضروری ہے اس جیسے گناہ کے لئے کہ جزاءِ سزا میں اضافہ کیا جائے ـــــ اور جیسے شراب نوشی: پس بیشک اس معصیت کے لئے حرص وشوق ہے۔ اور اس میں فساد فی الارض ہے۔ اور لوگوں کی عقول کو زائل کرنا ہے، وہ عقول جن کے ذریعہ لوگوں کی آخرت اور ان کی دنیا سنورتی ہے ـــــ اور جیسے تہمت لگانا: پس بیشک وہ شخص جس پر تہمت لگائی گئی ہے سخت تکلیف اٹھاتا ہے۔ اور قادر نہیں قاذف کو ہٹانے پر قتل وغیرہ کے ذریعہ: اس لئے کہ اگر وہ قتل کرے گا تو اس کی وجہ سے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر مارے گا تو وہ اس کی وجہ سے مارا جائے گا۔ پس اس جیسے جرم میں بڑی جھڑکی ضروری ہے۔

لغات: اِقْتَضَبَ الشیئَ اقتِضَاباً: کاٹنا، توڑنا...... الضَّراوۃ: مَنلہ، خونخواری...... اس عبارت میں بعض مذکر ضمیریں المعصیۃ کی طرف بتاویل الاثم لوٹائی ہیں۔

☆ ☆ ☆

حدود میں جسمانی ایذاء کے ساتھ عار کی بات ملانے کی وجہ

حدود میں جسمانی ایذاء کے ساتھ عار کی بات بھی ملائی گئی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس دو طرح سے متاثر ہوتا ہے:

۱ـــ جو نفس بہیمیت میں غلطاں پیچاں ہوتا ہے: اس کو جسمانی ایذاء جرائم کے ارتکاب سے روکتی ہے، جیسے منہ زور بیل اور اونٹ کو سخت مار شرارت سے روکتی ہے۔

۲ـــ اور جو نفس جاہ پسند اور عزت کا طالب ہوتا ہے: اس کو ایسی عار جو گلے کا ہار بن جائے: جسمانی ایذاء سے بھی

زیادہ گناہ سے روکتی ہے۔

اور جس شخص پر حد جاری کی جاتی ہے: اس کا حال معلوم نہیں کہ اس کا نفس کس قسم کا ہے؟ اس لئے حدود میں جسمانی تکلیف کے ساتھ عار کی بات بھی ملائی گئی ہے، تا کہ کسی کو یہ چیز گناہ سے روکے، اور کسی کو وہ چیز — اور حدود (سزائیں) تین ہیں:

۱— قتل یعنی جان سے ختم کرنا۔ قتلِ عمد میں قاتل قصاصاً قتل کیا جاتا ہے۔ اور راہ زن کو ایک صورت میں قتل کیا جاتا ہے، اور ایک صورت میں سولی دی جاتی ہے۔ اور شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی عار کی بات نہیں ملائی گئی۔ کیونکہ قتل ایک ایسی سزا ہے، جس سے اوپر کوئی سزا نہیں۔ قتل سے قصہ ہی نمٹ جاتا ہے۔

۲— جسم کا کوئی حصہ کاٹنا: چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اور راہ زن کا بھی ایک صورت میں ایک ہاتھ اور ایک پیر مخالف جانب سے کاٹا جاتا ہے۔ اور قطع ید سے مجرم کو سخت جسمانی تکلیف پہنچتی ہے۔ یہ جسمانی ایذاء وہی ہے۔ اس کے ساتھ عار کی بات یہ ملائی گئی ہے کہ قطع ید سے زندگی بھر کے لئے ایک ایسی قوت کا ازالہ ہو جاتا ہے جس کے بغیر وہ بذاتِ خود امور معاش انجام نہیں دے سکتا۔ اور اس سے جسم بدنما ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایک ایسی عار کی بات ہے جس کا اثر لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔ اور وہ ایسا اثرِ لازم ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ جو بھی دست بُریدہ کو دیکھتا ہے، فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس نے کبھی چوری کی ہے۔

۳— کوڑوں کی مار: یہ سزا مذکورہ دو سزاؤں سے کم تر ہے۔ یہ مار جسمانی ایذاء رسانی ہے۔ اس کے ساتھ عار کی بات یہ ملائی گئی ہے کہ غیر شادی شدہ زانی کو سال بھر کے لئے جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ اور تہمت لگانے والے کی گواہی قبول نہیں کی جاتی۔ اور شراب کی سزا دینے کے بعد اس کو سخت ڈانٹا جاتا ہے۔

ثم الحدُّ: إما قتلٌ، وهو زجر لازَجْرَ فوقه؛ وإما قطعٌ، وهو إيلام شديد، وتفويتُ قوةٍ لايتم الاستقلال بالمعيشة دونها طولَ عُمرِه، ومُثْلَةٌ، وعارٌ، وظاهِرٌ أثرُه بمرأى الناس، لا ينقضي، فإن النفس إنما تتأثر من وجهين: النفسُ الواغلة في البهيمية: يمنعها الإيلامُ، كالبقر والجمل، والتي فيها حُبُّ الجاهِ: يردعها العارُ اللازمُ له، أشدَّ من الإيلام؛ فوجب جمعُ هذين الوجهين في الحدود.

ودون ذلك: إيلامٌ بضرب، يُضَمُّ معه مافيه عارٌ، وَظَهَرَ أثرُه، كالتغريب، وعدم قبول الشهادة، والتبكيت.

ترجمہ: پھر حد (۱) یا تو قتل ہے۔ اور وہ ایسی سرزنش ہے جس کے اوپر کوئی سرزنش نہیں (اس لئے اس کے ساتھ عار کی بات نہیں ملائی گئی) (۲) اور یا کاٹنا ہے۔ اور وہ سخت تکلیف پہنچانا ہے (یہ جسمانی ایذاء ہے) اور زندگی بھر کے لئے ایسی قوت کو ضائع کر دینا ہے جس کے بغیر امور معاش بالاستقلال تکمیل پذیر نہیں ہوتے۔ اور وہ شکل بگاڑنا ہے۔ اور ایسا عار ہے جس کا اثر لوگوں کے سامنے ظاہر ہونے والا ہے۔ جو اثر کبھی ختم ہونے والا نہیں (یہ عار کی بات ہے جو قطع ید کے ساتھ ملائی گئی ہے) پس بیشک

نفس دو ہی صورتوں میں متاثر ہوتا ہے:(الف) بہیمیت میں دور تک نکل جانے والا نفس: اس کو تکلیف دہی روکتی ہے۔ جیسے بیل اور اونٹ (ب) اور وہ نفس جس میں حبِّ جاہ ہے: اس کو وہ عار کی بات جو اس کے ساتھ لازم ہو: تکلیف دہی سے بھی زیادہ باز رکھتی ہے۔ پس حدود میں ان دونوں صورتوں کو جمع کرنا لازم ہے (۳) اُن سے کم تر: مار کے ذریعہ تکلیف پہنچانا ہے۔ اس کے ساتھ وہ چیز ملائی جائے گی جس میں عار ہو، اور جس کا اثر ظاہر ہو۔ جیسے جلاوطن کرنا۔ اور گواہی قبول نہ کرنا۔ اور خوب ڈانٹ پلانا (وَغَلَ یَغِلُ وُغُوْلاً فِی الشیئِ: کسی چیز میں آگے تک نکل جانا، دور تک چلے جانا، غلو کرنا۔ حد سے بڑھ جانا)

☆ ☆ ☆

حدود کی تشکیل کس طرح عمل میں آئی ہے؟

گذشتہ شریعتوں میں تین حدود تھیں: قتل میں قصاص، زنا میں رجم، اور چوری میں ہاتھ کاٹنا۔ یہ تین سزائیں آسمانی شریعتوں میں بطور توارث چلی آ رہی ہیں۔ اور ان پر تمام انبیاء اور امتیں متفق ہیں۔ اور اس قسم کی بات کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑنا ضروری ہے۔ کسی حال میں بھی اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہی سزائیں ہماری شریعت میں بھی باقی رکھی گئیں۔ البتہ ہماری شریعت نے ان میں تین تصرفات کئے ہیں۔ ایک: سخت سزاؤں میں تخفیف کی۔ دوم: مزید چند جرائم کے لئے یہی سزائیں تجویز کیں۔ سوم: ڈاکہ زنی کی سزا سخت کردی۔ تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا تصرف: ہماری شریعت نے اولاً مذکورہ سزاؤں کے دو درجے مقرر کئے:

ایک: وہ سزا جو سختی کی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے یعنی قتل اور سنگسار کرنا۔ ان سزاؤں کو سنگین جرائم کے لئے تجویز کیا۔

دوم: وہ سزا جو کم درجہ کی ہے، اس کو فروتر درجہ کے جرائم کے لئے مقرر کیا۔

پھر سخت سزاؤں میں درج ذیل تخفیف کی:

۱— قتل عمد میں متعین طور پر قصاص واجب نہیں کیا۔ بلکہ اس میں معافی اور دیت کی گنجائش رکھی۔ سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۸ میں قصاص کا حکم بیان کرنے کے بعد ارشاد پاک ہے: ''پس جس کو اس کے بھائی (مقتول کے وارث) کی طرف سے کچھ معافی مل جائے: تو معقول طور پر خون بہا کا مطالبہ کرنا ہے۔ اور قاتل کے ذمے خوبی کے ساتھ خون بہا اس بھائی کے پاس پہنچانا ہے۔ یہ (عفو و دیت کی گنجائش) تمہارے پروردگار کی جانب سے سزا میں تخفیف اور مہربانی ہے'' —— اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات بیان کی ہے کہ بنی اسرائیل میں قصاص ہی تھا، دیت نہیں تھی۔ ہماری شریعت میں جو دیت کی گنجائش رکھی گئی ہے، وہ گذشتہ امتوں کے اعتبار سے تخفیف ہے (بخاری حدیث ۴۴۹۸ کتاب التفسیر)

۲— زنا کی سزا گذشتہ امتوں میں سنگساری تھی۔ ہماری شریعت میں یہ سزا صرف شادی شدہ زانی کے لئے رکھی گئی، اور غیر شادی شدہ زانی کے لئے سو کوڑے تجویز کئے گئے۔ یہ اس امت کے لئے تخفیف ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہود کی شریعت میں ہر زانی کے لئے رجم کی سزا تھی۔ مگر جب ان کی شوکت ختم ہوئی، اور حکومت کمزور پڑی، اور وہ زانی کو سنگسار کرنے پر قادر نہ رہے، تو انھوں نے رجم کی سزا موقوف کردی۔ اور اس کی جگہ زانی زانیہ کا منہ کالا کرکے، گدھے پر اوندھے منہ بٹھا کر بستی میں گھمانے کی سزا تجویز کی۔ اور اس طرح انھوں نے اپنی شریعت میں تحریف کرڈالی۔ پس ہماری شریعت میں گذشتہ شریعتوں کی دونوں سزاؤں: اصلی اور بدعی کو جمع کیا گیا۔ اور شادی شدہ زانی کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اور غیر شادی شدہ زانی کو زندہ رکھا گیا۔ اور اس کے لئے برسرِ عام کوڑے مارنے کی سزا تجویز کی گئی۔ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی غایت درجہ مہربانی ہے۔

۳ــــ اور چوری کی سزا میں یہ تصرف کیا کہ سزا کے علاوہ مسروقہ مال کا دوگنا تاوان واجب کیا۔ ابوداؤد کی حدیث (نمبر ۱۷۱۰) میں ہے: ومن خرج بشيئ منه فعليه غرامة مثليه والعقوبة یعنی جو باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں میں سے کچھ لیکر نکلے تو اس پر اس کا دوگنا تاوان اور سزا ہے۔

دوسرا تصرف: ہماری شریعت نے متعدد جرائم کو مذکورہ تین جرائم پر محمول کیا۔ اور ان کے لئے بھی وہی سزائیں تجویز کیں۔ جیسے تہمت لگانے اور شراب پینے کی سزا اسّی درّے تجویز کی۔ کیونکہ یہ گناہ بھی خرابی پیدا کرنے میں مذکورہ تین گناہوں کے برابر ہیں۔ اس لئے ان کے لئے بھی سزا ضروری ہے۔

تیسرا تصرف: ہماری شریعت نے ڈاکہ زنی کی سزا سخت کردی۔ کیونکہ ڈاکہ زنی کا معاملہ قتل اور چوری سے سنگین ہے، اس لئے اس کی سزا سخت ہونی ضروری ہے۔

فائدہ: چوری کی سزا میں جس تصرف کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کی دلیل میں جو حدیث پیش کی ہے، اس کی تقریب تام نہیں۔ کیونکہ باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں کو لے جانا چوری نہیں۔ وہ پھل محفوظ مال نہیں ہیں۔ اور حدیث میں العقوبة سے مطلق سرزنش مراد ہے، قطع ید مراد نہیں۔

واعلم: أنه كان مِن شريعة مَنْ قَبْلَنَا: القصاصُ في القتل، والرجمُ في الزنا، والقطعُ في السرقة؛ فهذه الثلاثُ كانت متوارثةً في الشرائع السماوية، وأطبق عليها جماهير الأنبياء والأمم؛ ومِثْلُ هذا يجب أن يؤخذ عليه بالنواجذ، ولا يُترك، ولكن الشريعة المصطفوية تصرفت فيها بنحوٍ آخر:

[۱] فجعلتْ مَزْجرَةَ كلِّ واحد على طبقتين:

إحداهما: الشديدةُ البالغةُ أقصى المبالغ. ومن حقها: أن تُجعل في المعصية الشديدة.

والثانية: دونَها، ومن حقها: أن تُجعل فيما كانت المعصية دونها:

[الف] ففي القتل: القَوَدُ والديةُ، والأصل فيه قوله تعالى: ﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ قال ابن

عباس رضی اللہ عنہما: کان فیهم القصاصُ، ولم یکن الدیة.

[ب]وفی الزنا: الجَلْد؛ وکان الیهودُ لما ذهبت شوکتُهم، ولم یقدروا علی الرجم، ابتدعوا التَّجْبِیَةَ والتَّسْخِیْمَ، فصار ذلك تحریفًا لشریعتهم، فَجُمعتْ لنا بین شرِیْعَتَیْ مَنْ قبلَنا السماویةِ والابتداعیة؛ وذلك غایةُ رحمةِ الله بالنسبة إلینا.

[ج] وفی السرقة: العقوبةُ وغرامةُ مثلَیْه، علی ماجاء فی الحدیث.

[۲] وأن حَمَلَتْ أنواعًا من الظلم علیها، کالقذف والخمر، فجَعَلَتْ لهما حدًّا، فإن هذه أیضًا بمنزلة تلك المعاصی.

[۳] وأن زادتْ فی عقوبة قطع الطریق.

ترجمہ: اور جان لیں کہ ہم سے پہلی شریعتوں میں: قتل میں قصاص، زنا میں رجم، اور چوری میں ہاتھ کاٹنا تھا۔ پس یہ تین سزائیں آسمانی شریعتوں میں بطور توارث چلی آرہی تھی۔ اور ان پر تمام انبیاء اور امتیں متفق تھیں۔ اور اس قسم کی بات: ضروری ہے کہ اس کو ڈاڑھوں سے پکڑا جائے۔ اور نہ چھوڑی جائے۔ مگر شریعتِ مصطفویہ نے ان میں دوسرے انداز سے تصرف کیا: (۱) پس ہر ایک کی جھڑکی کا ذریعہ یعنی سزا دو درجوں پر گردانی ——— ان میں سے ایک: وہ سخت سزا ہے جو سختی کی انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے۔ اور اس کے حق سے ہے یعنی اس کے لئے سزاوار یہ ہے کہ وہ سخت معصیت میں مقرر کی جائے ——— اور دوسری: جو اس سے کم تر ہے۔ اور اس کے حق سے ہے کہ وہ ان جرائم میں مقرر کی جائے جو پہلی قسم کے جرائم سے کم درجہ کے ہیں ——— (الف) پس قتل میں قصاص اور دیت ہے۔ اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی کرنا ہے'' ابن عباسؓ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل میں قصاص تھا، اور دیت نہیں تھی'' ——— (ب) اور زنا میں کوڑے مارنا ہے۔ اور یہود نے جب ان کی شوکت ختم ہوئی، اور وہ سنگسار کرنے پر قادر نہیں رہے تو انھوں نے اوندھے منہ بٹھانا، اور منہ کالا کرنا ایجاد کیا۔ پس یہ چیز ان کی شریعت میں تحریف ہوگئی۔ پس ہمارے لئے جمع کیا گیا ہم سے پیشتر لوگوں کی دونوں شریعتوں: آسمانی اور ایجادی کے درمیان۔ اور یہ اللہ کی انتہائی رحمت ہے ہماری بہ نسبت ——— (ج) اور چوری میں سزا، اور چرائی ہوئی چیز کا دوگنا تاوان ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے ——— (۲) (اور شریعتِ مصطفویہ نے مذکورہ بالا تین سزاؤں میں تصرف کیا) بایں طور کہ شریعتِ مصطفویہ نے ظلم (جرائم) کی متعدد انواع کو ان تین سزاؤں پر محمول کیا۔ جیسے اتہام اور شراب۔ پس شریعتِ مصطفویہ نے ان دونوں کے لئے (بھی) سزا مقرر کی۔ کیونکہ یہ گناہ بھی اُن گناہوں کے بمنزلہ ہیں ——— (۳) اور بایں طور کہ شریعتِ مصطفویہ نے اضافہ کیا ڈاکہ زنی کی سزا میں۔

لغات: سَخَّم الشیئَ: کالا کرنا...... جَبّٰی: اوندھا کرنا۔ زانی زانیہ کا منہ کالا کر کے گدھے پر اس طرح بٹھاتے تھے کہ منہ ایک دوسرے کے خلاف رہیں۔ پھر ان کو رسوا کرنے کے لئے بستی اور بازار میں پھراتے تھے۔

ترکیب: أن حملت اور أن زادت کا عطف نحوٍ آخر پر ہے۔ پس تقدیر عبارت یہ ہے: وتصرفتْ فیها بأن حملت اور بأن زادت.

☆ ☆ ☆

غلاموں کو حد مارنے کا حق مولیٰ کو دینے کی وجہ

غلام باندی کو حد مارنے کا حق صرف حاکم کا ہے یا آقا کو بھی یہ حق حاصل ہے؟ اس میں اختلاف ہے: احناف کے نزدیک: یہ حق صرف حاکم کا ہے۔ البتہ حاکم کی اجازت سے آقا بھی حد جاری کرسکتا ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: یہ حق آقا کو بھی حاصل ہے۔ مگر اس کے لئے چند شرائط ہیں (مغنی ۱۰: ۱۴۷) مثلاً: آقا زنا، شراب اور تہمت میں کوڑے مارسکتا ہے۔ اور ارتداد میں قتل اور چوری میں ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ ان کے نزدیک بھی یہ حق صرف امام کو حاصل ہے۔

احناف کے مسلک پر وجہِ فرق بیان کرنی ضروری نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک تمام حدود کا اختیار —— خواہ آزاد کی ہو یا غلام کی، اور خواہ کوڑوں کی سزا ہو، یا قتل وغیرہ کی —— حاکم ہی کو ہے۔ البتہ ائمہ ثلاثہ کے مسلک پر دو فرق بیان کرنے ضروری ہیں: ایک: آزاد کو تو حاکم ہی حد مارسکتا ہے، اور غلام پر آقا بھی حد جاری کرسکتا ہے۔ وجہِ فرق کیا ہے؟ دوسرا: آقا صرف کوڑے مارسکتا ہے، قتل اور ہاتھ نہیں کاٹ سکتا۔ وجہِ فرق کیا ہے؟ شاہ صاحب قدس سرہٗ یہ دونوں فرق بیان کرتے ہیں، اور ساتھ ہی غلاموں کی سزا میں تنصیف کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں:

لوگوں کے دو طبقات ہیں۔ اور دونوں کی سیاست یعنی اصلاح کا طریقہ مختلف ہے:

پہلا طریقہ: آزاد لوگوں کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مستقل بالذات ہیں۔ جن کا معاملہ خود ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ان کی داروگیر کی جائے۔ برسرِ عام ان کو سزا دی جائے۔ ان پر سخت عار لازم کیا جائے۔ اور ان کی تحقیر وتذلیل کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام حاکم ہی کرسکتا ہے۔ پس وہی ان پر حدود جاری کرنے کا مُجاز ہے۔

دوسرا طبقہ: غلام باندیوں کا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ہاتھوں میں قید ہیں۔ ان کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے آقا کو حکم دیا جائے کہ وہ ان کو برائی سے محفوظ رکھے۔ کیونکہ آقا ان کو برائی سے روکنے کا بہتر طریقہ جانتا ہے۔ اس لئے ان کو سزا دینے کا اختیار آقا کو دیا گیا۔ اور اس کی دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی باندی زنا کرے، اور اس کا زنا واضح ہوجائے، تو چاہئے کہ مولیٰ اس کو حد مارے، اور اس کو ملامت نہ کرے یعنی اس پر اکتفا نہ کرے۔ پھر اگر وہ زنا کرے تو اس کو حد مارے، اور اس کو ملامت نہ کرے۔ پھر اگر تیسری مرتبہ زنا کرے، اور اس کا زنا واضح ہوجائے تو اس کو بیچ دے، اگرچہ بالوں کی رسّی

کے عوض ہو!'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۵۶۳)

اور فروخت کرنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ یہ آقا اس پر کنٹرول نہیں کرسکتا، اور اس کو برائی سے نہیں بچاسکتا۔ دوسرے آقا کے پاس جائے گی تو وہ اس کو سیدھا کردے گا۔ درج ذیل حدیث میں بھی اسی مصلحت سے غلام کو بیچ دینے کا حکم دیا ہے۔

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کا غلام چوری کرے تو اس کو بیچ دے، چاہے آدھے اُوقیہ (۲۰ درہم) کے عوض فروخت ہو!'' (مسند احمد ۲: ۳۳۷)

اور بعض آقا غلاموں پر ظلم کرتے تھے۔ اور جب ان کو ٹوکا جاتا تھا تو بہانہ بناتے تھے کہ غلام زنا یا چوری وغیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے دو باتیں ضروری ہوئیں: ایک: غلام کے لئے آزاد سے کم سزا رکھی جائے۔ تاکہ اس قسم کے ظلم کی جڑ کٹ جائے۔ دوسری: آقا کو قتل اور قطع ید کا اختیار نہ دیا جائے۔ اس سے کم سزا یعنی کوڑے مارنے ہی کا ان کو اختیار دیا جائے۔

واعلم: أن الناس على طبقتين، ولسياسة كلِّ طبقة وجهٌ خاص:

[۱] طبقة: هم مستقلون: أمرُهم بأيديهم؛ وسياسةُ هؤلاء: أن يُؤاخذوا على أعين الناس، ويُوْجَعوا، ويُلْزَمَ عليهم عارٌ شديد، ويُهَانوا، ويحقَّروا.

[۲] وطبقة: هم بأيدى ناسٍ آخرين، أُسراءُ عندهم؛ وسياسةُ هؤلاء: أن يُؤمر سادتُهم: أن يَّحفظوهم عن الشر، فإنه يَظهر لهم وجهٌ، فيه حبسُهم عن فعلهم ذلك، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم: "إذا زنتْ أمةُ أحدكم فليضربها" الحديث، وقولُه عليه السلام: "إذا سرق عبدُ أحدِكم فبيعوه، ولو بِنَشٍّ!"

فَضُبطَتِ الطبقتانِ بوصفٍ ظاهر، فالأولى: الأحرار، والثانية: الأرقّاء.

ثم كان من السَّادة: من يتعدى على عبيده، ويحتجُّ بأنه زنى أو سرق ونحو ذلك، فكان الواجب في مثله: أن يُشرع على الأرقاءِ دونَ ماعلى الأحرار، لِيُقطع هذا النوعُ؛ وأن لا يُخَيَّرُوْا في القتل والقطع، وأن يُخَيَّرُوْا فيما دون ذلك.

ترجمہ: اور جان لیں کہ لوگوں کے دو طبقے ہیں۔ اور ہر طبقہ کی اصلاح کا الگ طریقہ ہے: (۱) ایک طبقہ: وہ مستقل لوگ ہیں۔ ان کا معاملہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور ان لوگوں کا انتظام: یہ ہے کہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ان کی دارو گیر کی جائے۔ اور وہ تکلیف دیئے جائیں۔ اور ان پر سخت عار چپکایا جائے۔ اور وہ ذلیل کئے جائیں۔ اور ان کی تحقیر کی جائے (۲) اور دوسرا طبقہ: وہ لوگ ہیں جو دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ قیدی (غلام) ہیں ان کے پاس۔ اور ان

لوگوں کا انتظام یہ ہے کہ ان کے آقا حکم دیئے جائیں کہ وہ ان کو برائی سے محفوظ رکھیں یعنی ان کی اصلاح کا ذمہ دار آقاؤں کو بنایا جائے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ آقاؤں کے لئے ایک ایسی صورت ظاہر ہوتی ہے جس میں ان کو ان کے اس فعل سے روکنا ہے یعنی آقا ان کی اصلاح کا بہتر طریقہ جانتا ہے (اس کے بعد دو حدیثیں ہیں) پس دونوں طبقے ایک واضح وصف کے ذریعہ متعین کئے گئے۔ پس پہلا طبقہ: آزاد لوگوں کا ہے۔ اور دوسرا: غلاموں کا۔

پھر بعض آقا اپنے غلاموں پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اور یہ حجت پیش کیا کرتے تھے کہ غلام زنا یا چوری یا اس کے مانند کا مرتکب ہوا ہے۔ پس اس جیسی صورت میں ضروری تھا کہ (۱) غلاموں پر مشروع کی جائے اس سے کم سزا جو آزادوں کے لئے ہے، تاکہ اس قسم کے ظلم کی جڑ کٹ جائے (۲) اور یہ کہ آقا اختیار نہ دیئے جائیں قتل کرنے اور ہاتھ کاٹنے کے۔ اور یہ کہ آقا اختیار دیئے جائیں ان سزاؤں کے جو ان سے کم ہیں۔

☆ ☆ ☆

حد کے کفارہ ہونے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کوئی گناہ کیا، پس اس پر اس گناہ کی حد جاری کی گئی، تو وہ حد اس گناہ کا کفارہ ہے: من أصاب ذنبا، أُقيم عليه حدُّ ذلك الذنب، فهو كفارته (مشکوۃ حدیث ۳۶۲۸ باب مالايُدعى على المحدود)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کسی حد کو پہنچا، پس اس کی سزا جلدی دنیا میں دیدی گئی، تو اللہ کے انصاف سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنے بندے کو آخرت میں دوبارہ سزا دیں: من أصاب حدًّا، فَعُجِّلَ عقوبتُه في الدنيا، فاللّٰهُ أعدَلُ من أن يُثَنِّيَ على عبده العقوبةَ في الآخرة (مشکوۃ حدیث ۳۶۲۹)

تشریح: حدود: دو صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں کفارہ بنتی ہیں:

پہلی صورت: حد جاری ہونے سے پہلے یا بعد میں گنہ گار نے سچی پکی توبہ کرلی ہو، تو یہ توبہ ہی اس کے گناہ کا کفارہ ہے۔ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے بارے میں ارشاد نبوی ہے: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ایک گروہ پر بانٹ دی جائے تو وہ سب کے لئے کافی ہوجائے!'' لقد تابَ توبةً لو قُسِّمَتْ بين أمةٍ لَوَسِعَتْهم! (مشکوۃ حدیث ۳۵۶۲) اور ایک دوسری روایت میں: ایک دوسرے شخص کے بارے میں ارشاد نبوی ہے: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک شہر کے لوگ ایسی توبہ کریں تو سب کی طرف سے قبول کرلی جائے!'' لقد تاب توبةً لو تابَها أهلُ المدينةِ لَقُبِل منهم (مشکوۃ حدیث ۳۵۷۲)

دوسری صورت: حد محض سزا ہو، اس کو تکلیف پہنچانا، اور اس کو زبردستی گناہ سے باز رکھنا ہو یعنی محض زجر و توبیخ ہو، گناہ گار نے گناہ سے توبہ نہ کی ہو، تو اس صورت میں حد: کفارہ اس طرح بنتی ہے کہ گناہ حکمتِ خداوندی میں سزا کو چاہتا ہے۔ خواہ سزا

جانی ہو، جسمانی ہو، یا مالی ہو۔ پس حاکم وقت جو سزا دیتا ہے: وہ سزا دینے میں اللہ کا نائب ہے۔ اس کا سزا دینا اللہ ہی کا سزا دینا ہے۔ پس اگر اس کو آخرت میں بھی اس گناہ کی سزا ملے تو گویا اللہ تعالیٰ نے ایک گناہ کی سزا دو مرتبہ دی! یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف سے بعید ہے! اس وجہ میں غور کرلیں۔ اس میں کوئی اشکال تو نہیں؟!

فائدہ: اس میں اشکال یہ ہے کہ سورۃ الفرقان آیات ۶۸-۷۱ میں شرک، قتل اور زنا کے لئے توبہ ضروری قرار دی گئی ہے۔ نیز اس پر اجماع ہے کہ کبیرہ کی معافی کے لئے توبہ ضروری ہے۔ اگرچہ وہ توبہ فعلی ہو یعنی آئندہ اس کی زندگی سنور جائے۔ اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ما أدری الحدود کفارات أم لا؟ میں نہیں جانتا کہ حدود سے گناہ معاف ہوتے ہیں یا نہیں؟ (مجمع الزوائد ۶: ۲۶۵) اور حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کو رجم کے بعد ایک شخص نے کوسا تھا تو آپؐ نے اس کو ان کی توبہ کا حوالہ دے کر روکا تھا۔ حد جاری کرنے کو ممانعت کی بنیاد نہیں بنایا تھا۔ پس اگر حد کے ساتھ توبہ جمع ہو، گو فعلی ہو، تو وہ ضرور کفارہ ہوگی۔ ورنہ قطعی فیصلہ مشکل ہے۔

> والحدُّ يكون كفارةً لأحد وجهين: لأن العاصِيَ:
> [۱] إما أن يكون منقادًا لأمر الله وحكمِه، مُسْلِمًا وجهَه لله؛ فالكفارة في حقه: توبةٌ عظيمةٌ، وهو حديثُ:" لقد تاب توبةً لو قُسِّمَتْ على أمةِ محمدٍ لَوَسِعَتْهم"
> [۲] وإما أن يكون إيلامًا له وقسرًا عليه؛ وسر ذلك: أن العمل يقتضي في حكمة الله: أن يجازى في نفسه أو ماله، فصار مقيمُ الحد خليفةَ الله في المجازاة؛ فتدبر.

ترجمہ: اور حد کفارہ ہوتی ہے دو وجہوں میں سے کسی ایک وجہ سے: اس لئے کہ گنہ گار: (۱) یا تو یہ کہ وہ تابعدار ہوگا اللہ کے امر کا، اور اس کے حکم کا، سپرد کرنے والا ہوگا اپنی ذات اللہ کو، پس کفارہ اس کے حق میں: بڑی توبہ ہے یعنی اس کا اپنی عملی زندگی کو سنوار لینا ہی بڑی توبہ ہے، وہی گناہ کا کفارہ ہے۔ اور وہ حدیث ہے: "البتہ واقعہ یہ ہے کہ اس (ماعزؓ) نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ محمد (ﷺ) کی امت پر بانٹ دی جائے تو وہ سب کے لئے کافی ہوجائے" (اس حدیث میں اسم شریف محمد یاد نہیں پڑتا۔ حدیث کے صحیح لفظ وہ ہیں جو اوپر شرح میں لکھے گئے ہیں۔ اور لفظ أمة لغوی معنی میں ہے۔ یعنی گروہ، جماعت) —— (۲) اور یا یہ کہ ہو وہ سزا اس کے لئے تکلیف پہنچانا، اور اس پر زبردستی کرنا۔ یعنی حد کے ساتھ توبہ مقترن نہ ہو۔ اور اس کا راز یہ ہے یعنی اس صورت میں بھی گناہ معاف ہوجانے کی وجہ یہ ہے کہ عمل یعنی گناہ اللہ کی حکمت میں چاہتا ہے کہ گنہ گار سزا دیا جائے اس کی جان یا اس کے مال میں۔ پس ہوگیا حد قائم کرنے والا (حاکم) سزا دینے میں اللہ کا نائب۔ پس سوچ لے!



حدِّ زنا کا بیان

مُحصن کے لئے رجم اور غیر محصن کے لئے دُرّوں کی سزا کی وجہ

سورۃ النور آیت ۲ میں ارشاد پاک ہے: ''زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد: تم ان میں سے ہر ایک کو سو دُرے مارو۔ اور تم کو ان دونوں پر اللہ کے معاملہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہئے، اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہئے'' تا کہ سزا کی تشہیر ہو، اور لوگوں کو عبرت ہو۔

تفسیر: یہ سزا اس زانی اور زانیہ کی ہے جو آزاد، عاقل، بالغ ہوں۔ اور نکاح کئے ہوئے نہ ہوں۔ یا نکاح تو ہو گیا ہو مگر ہمبستری نہ ہوئی ہو۔ اور جو آزاد نہ ہو اس کی سزا پچاس دُرّے ہے۔ اور جو عاقل یا بالغ نہ ہو وہ مکلف نہیں۔ اور جو مسلمان آزاد، عاقل، بالغ ہو، اور وہ مسلمان، آزاد، عاقلہ، بالغہ عورت سے نکاح صحیح کر کے ہم بستری کر چکا ہو، وہ محصن ہے، اس کی سزا رجم ہے۔ اور جو بیماری کی وجہ سے کوڑوں کا متحمل نہ ہو اس کی صحت کا انتظار کیا جائے گا۔

حدیث ——— حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو دینِ حق کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ اور آپؐ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ پس اللہ تعالیٰ نے جو آیات اُتاریں ان میں آیتِ رجم بھی تھی۔ اور خود رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا۔ اور آپؐ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ اور رجم اللہ کی شریعت میں برحق ہے۔ اس پر جس نے زنا کیا: جبکہ وہ شادی شدہ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت: جب گواہ قائم ہو جائیں، یا حمل ہو، یا اقرار'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۵۵۷)

آیتِ رجم: جس کی تلاوت منسوخ ہوگئی ہے، اور حکم باقی ہے: یہ ہے: الشیخُ والشیخۃ إذا زَنَیا فارجُموهما البتَّۃَ، نکالاً من اللہ، واللہُ عزیز حکیم: محصن مرد اور محصن عورت: جب دونوں زنا کریں تو دونوں کو قطعی طور پر سنگسار کرو، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے طور پر، اور اللہ تعالیٰ زبردست، حکمت والے ہیں۔ یہ آیت سورۃ الاحزاب میں تھی (فتح الباری ۱۲: ۱۴۳)

تشریح: محصن کے لئے رجم اور غیر محصن کے لئے کوڑوں کی سزا تین وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: بچپن اور بلوغ کے احکام مختلف ہیں: بلوغ سے پہلے عقل ناتمام اور جسم ناتواں ہوتا ہے۔ اور انسان بچہ شمار کیا جاتا ہے، مرد نہیں ہوتا، اس لئے وہ احکام شرعیہ کا مکلف نہیں۔ اور بلوغ کے بعد عقل تام اور جسم طاقتور ہو جاتا ہے۔ اور انسان مرد کہلانے لگتا ہے، اس لئے اس پر احکام شرعیہ لازم ہوتے ہیں۔ اسی طرح شادی سے پہلے اور شادی کے بعد کے احوال مختلف ہیں۔ شادی سے پہلے اگرچہ آدمی: عاقل بالغ اور مرد ہوتا ہے، مگر ناتجربہ کار اور دوسرے کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور شادی کے بعد عقل میں اضافہ ہوتا ہے۔ آدمی تجربہ کار اور (کامل) مرد ہو جاتا ہے، اور اپنے معاملات میں مستقل اور خود مختار ہو جاتا ہے۔

اس لئے دونوں کے احکام متفاوت ہیں۔ غیر شادی شدہ کا زنا بھی اگر چہ جرم ہے مگر ہلکا۔ اس لئے اس کے لئے کوڑوں کی سزا تجویز کی گئی۔ اور شادی شدہ کا زنا سنگین جرم ہے، اس لئے اس کی سزا سنگسار مقرر کی گئی۔

دوسری وجہ: آزاد شادی شدہ: کامل انسان ہے۔ اور آزاد غیر شادی شدہ ناقص، اور غلام انقص۔ پس آزاد غیر شادی شدہ درمیانی حالت کا ہوا۔ اس لئے اس کی سزا بھی درمیانی ہے۔ آزاد متزوج سے ہلکی، اور غلام سے بھاری۔

وضاحت: غلام کا انقص ہونا تو بدیہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اور غلام وصفِ حریت کے فقدان کی وجہ سے مملوک ہوا ہے۔ اور آزاد غیر متزوج ناقص اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو "زوج" پیدا کیا ہے (یٰسٓ آیت ۳۶ الذاریات آیت ۴۹) اور زوج کے معنی ہیں: جوڑا۔ فرد کی ضد یعنی ہم جنس دو چیزیں۔ اور ایسی ہی دو چیزیں زوجین کہلاتی ہیں۔ کیونکہ ہر ایک دوسرے کو جوڑا بناتی ہے۔ پس انسان کا مجرد ہونا ناقص حالت ہے۔ کیونکہ وہ خلافِ فطرت ہے۔

سوال: اس کامل وناقص حالت کا لحاظ قصاص اور چوری وغیرہ کی سزاؤں میں کیوں نہیں کیا گیا؟ ان میں سزائیں دونوں کے لئے یکساں کیوں ہیں؟

جواب: اس تفاوت کا لحاظ صرف رجم میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ رجم سخت ترین سزا ہے، اور حق اللہ کے طور پر مشروع ہوئی ہے۔ اور قصاص میں اس کا لحاظ اس لئے نہیں کیا کہ وہ حق العبد ہے۔ اور بندے محتاج ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ غنی (بے نیاز) ہیں۔ پس اگر قتل عمد میں غیر متزوج کی سزا کم کردی جائے گی تو بندہ کا حق ضائع ہوگا۔ اور بندے کی حق تلفی اس کی احتیاج کی وجہ سے مناسب نہیں۔ اور رجم اللہ کا حق ہے۔ اس میں تخفیف میں کچھ حرج نہیں۔ اور چوری، شراب نوشی اور تہمت کی سزائیں رجم کے بمنزلہ نہیں۔ اس لئے ان میں غیر متزوج کے لئے تخفیف نہیں کی گئی۔

تیسری وجہ: آزاد شادی شدہ کا زنا کرنا جس پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کئے ہیں، اور اس کو اپنی مخلوق میں بہت سوں پر فوقیت دی ہے: نہایت قبیح اور گھناؤنا فعل ہے۔ اور شدید ترین کفرانِ نعمت ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی سزا میں اضافہ کیا جائے۔

وضاحت: انسان کے لئے انسانیت ہی سب سے بڑا شرف ہے۔ پھر آزاد متزوج کو اللہ تعالیٰ نے پانچ مزید خوبیوں سے مالا مال فرمایا ہے۔ اس کو آزادی، عقل، بلوغ اور دولتِ اسلام سے سرفراز فرمایا، اور ایسی ہی بیوی بھی عنایت فرمائی جس کی صحبت سے سیری ہوجاتی ہے۔ پھر بھی اس کا حرمتِ خداوندی کی پردہ دری کرنا کتنا بڑا کفرانِ نعمت ہے؟! پس ایسے شخص کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی مناسب ہے۔

کنوارے کی سزا میں سو کے عدد کی حکمت

اور کنوارے کی سزا سو کوڑے اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ یہ بہت اور متعین عدد ہے۔ اس کے ذریعہ زجر وایلام کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے، اور متعین ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا بھی آسان ہے۔

وضاحت: عربوں کے یہاں چار ہی اعداد مستعمل تھے: اکائی (ایک تا نو) دہائی (دس تا نوے) سیکڑہ (ایک سو تا نو سو) اور ہزار۔ اس سے اوپر ان کے یہاں کوئی عدد نہیں تھا۔ اور کنوارے کی سزا میں اکائی متعین کرنا تو لا حاصل تھا۔ البتہ باقی تین عدد لئے جاسکتے ہیں، کیونکہ وہ سب ''کثیر'' ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان میں سے درمیانی عدد تجویز فرمایا اس لئے کہ درمیانی چیز بہتر ہوتی ہے۔ اور سیکڑہ میں سے بھی پہلا سیکڑہ لیا۔ کیونکہ اس سے زجر و توبیخ خوب ہوجاتی ہے، اور بیخ کنی نہیں ہوتی۔

کنوارے کو جلا وطن کرنے کی حکمت

کنوارے کو سو دُرّے مار کر سال بھر کے لئے جلاوطن کیا جائے گا۔ یہ سزا اس لئے دی گئی ہے کہ سزا دو ہی طرح مؤثر ہوتی ہے: ایک: جسمانی تکلیف پہنچانا۔ دوم: حیا، شرم اور عار لاحق کرنا اور نفس کو مالوف و مانوس سے محروم کرنا۔ دُرّے مارنا: پہلی قسم کی سزا ہے، اور جلاوطن کرنا: دوسری قسم کی، اور سزا اسی وقت تام ہوتی ہے جب اس میں دونوں ہی باتیں جمع ہوں۔

فائدہ: کنوارے کو دُرّے مار کر سال بھر کے لئے جلاوطن کرنا حد کا جزء ہے، یا یہ تعزیر بر بنائے مصلحت ہے؟ اس میں اختلاف ہے: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: یہ حد کا جزء ہے۔ اور عورت کے ساتھ اس کا ولی جائے گا۔ البتہ غلام باندی کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک عورت کو بھی جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے جلاوطن کرنے کی یہاں حکمت بیان کی ہے۔ مگر آگے فرمائیں گے کہ جلاوطنی کی سزا معاف بھی کی جاسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حد کا جزء نہیں۔ کیونکہ حد معاف نہیں کی جاسکتی۔

اور احناف کے نزدیک: جلاوطنی حد میں شامل نہیں۔ کنوارے کی پوری سزا سو کوڑے ہیں۔ اور جلاوطنی کسی مصلحت کی بنا پر تعزیر ہے، جو معاف بھی کی جاسکتی ہے۔ اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں، جہاں حدود نافذ ہوں۔ خبث نفس کی بنا پر زنا کا صدور نادر ہے۔ یہ حرکت معاشقہ کے نتیجہ میں وجود میں آسکتی ہے۔ پس اگر حد جاری کرنے کے بعد دونوں ایک جگہ رہنے دیا جائے گا تو گناہ کا امکان باقی رہے گا۔ اس لئے زانی کو سال بھر کے لئے جلاوطن کردیا جائے تاکہ رشتۂ چاہ ٹوٹ جائے — رہا سزا کے ساتھ عار کو ملانا: تو سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مجرم کی رسوائی ہو۔

[۱] قال الله تعالى: ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ الآية.
وقال عمر رضي الله عنه: إن الله بعث محمدًا صلى الله عليه وسلم بالحق، وأنزل عليه الكتابَ، فكان مما أنزل الله آيةُ الرجم: رَجَمَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم، ورجمْنا بعدَه؛ والرجمُ في كتاب الله حقٌّ على من زنى: إذا أُحْصَنَ من الرجال والنساء.
أقول: إنما جُعل حدُّ المحصنِ الرجمَ، وحدُّ غير المحصنِ الجَلْدَ:

[۱] لأنه كما يَتِمُّ التكليفُ ببلوغ خمس عشرة سنةً، أو نحوه؛ ولا يتم دون ذلك لعدم تمام العقل، وتمامِ الجثة، وكونه من الرجال، فكذلك ينبغي أن تتفاوتَ العقوبةُ المترتبةُ على التكليف: بأتمية العقل، وصيرورتِه رجلاً كاملاً، مستقلا بأمره، مستَبِدًّا برأيه.

[۲] ولأن المحصن كامل، وغيرَ المحصن ناقص، فصار واسطةً بين الأحرارِ الكاملين وبين العبيد.

ولم يُعتبر ذلك إلا في الرجم خاصةً: لأنه أشدُّ عقوبةً، شُرعت في حق الله؛ وأما القصاص: فحقُّ الناس، وهم محتاجون، فلا يُضَيَّعُ حقوقهم؛ وأما حدُّ السرقة وغيرِها: فليس بمنزلة الرجم.

[۳] ولأن المعصية ممن أنعم الله عليه، وفضَّله على كثير من خلقه: أقبحُ وأشنعُ، لأنها أشدُّ الكفرانِ، فكان من حقها: أن يُزاد في العقوبة.

وإنما جُعل حدُّ البكر مائةَ جَلدة: لأنه عدد كثيرٌ مضبوطٌ، يحصل به الزجرُ والإيلامُ.

وإنما عوقب بالتغريب: لأن العقوبة المؤثرة تكون على وجهين: إيلامٍ في البدن، وإلحاقِ حياءٍ وخجالةٍ وعارٍ، وفقدِ مألوفٍ في النفس؛ والأول: عقوبةٌ جسمانية، والثانية: عقوبة نفسانية، ولاتتم العقوبةُ إلا بأن تَجمع الوجهين.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: شادی شدہ کی حد سنگسار کرنا، اور غیر شادی شدہ کی حد دُرّے مارنا: اسی وجہ سے مقرر کی گئی ہے کہ (۱) جس طرح مکلّف ہونا تکمیل پذیر ہوتا ہے پندرہ سال عمر ہوجانے سے، اور اس کے مانند (بلوغ کی دوسری علامتوں) سے، اور اس سے کم میں تکلیف تام نہیں ہوتی عقل پوری نہ ہونے کی وجہ سے، اور جسم کامل نہ ہونے کی وجہ سے، اور اس کے مردوں میں سے نہ ہونے کی وجہ سے۔ پس اسی طرح مناسب ہے کہ وہ سزا متفاوت ہو جو مکلّف ہونے پر مرتب ہونے والی ہے، عقل کے زیادہ تام ہونے کی وجہ سے، اور آدمی کے مردِ کامل ہونے کی وجہ سے، اور اپنے معاملہ میں مستقل ہونے کی وجہ سے، اور اپنی رائے میں خود مختار ہونے کی وجہ سے —— (۲) اور اس لئے کہ شادی شدہ کامل ہے۔ اور غیر شادی شدہ ناقص ہے۔ پس ہوگیا وہ (غیر شادی شدہ) واسطہ: احرار کاملین اور غلاموں کے درمیان —— (سوال کا جواب) اور نہیں اعتبار کیا اس بات (تفاوت) کا مگر خاص طور پر رجم میں، اس لئے کہ وہ شدید ترین سزا ہے جو اللہ کے حق کی بنا پر مشروع کی گئی ہے۔ اور رہا قصاص: تو وہ لوگوں کا حق ہے، اور لوگ محتاج ہیں، پس ان کے حقوق ضائع نہیں کئے جائیں گے۔ اور رہی چوری وغیرہ کی سزا تو وہ بمنزلۂ رجم نہیں ہے —— (۳) اور اس لئے کہ گناہ اس شخص سے جس پر اللہ نے انعام کیا ہے، اور اس کو اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر برتری بخشی ہے: نہایت قبیح اور نہایت برا ہے۔ اس لئے کہ وہ شدید ترین کفرانِ نعمت ہے۔ پس اس کے حق میں سے تھا کہ سزا میں اضافہ کیا جائے۔ آگے ترجمہ واضح ہے۔

نوٹ:قوله: لعدم تمام العقل مخطوطہ کراچی میں:لمعنی تمام العقل ہے۔مگر جو مطبوعہ میں ہے وہ واضح ہے۔ اس لئے اسی کو باقی رکھا گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

زنا میں غلاموں کے لئے آدھی سزا ہونے کی وجہ

سورۃ النساء آیت ۲۵ میں ارشاد پاک ہے:''پھر جب وہ باندیاں منکوحہ بنائی جائیں: پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (زنا) کریں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد عورتوں پر ہے''

تشریح: زنا میں غلام باندیوں کی سزا دو وجہ سے آدھی رکھی گئی ہے:

پہلی وجہ: باب کے شروع میں عمومی باتوں کے ضمن میں یہ بات آچکی ہے کہ غلام باندیوں کی سزا دہی کا معاملہ ان کے آقاؤں کے حوالے کیا گیا ہے۔ پس اگر ان کے حق میں انتہائی درجہ کی سزا مشروع کی جائے گی تو ظلم وعدوان کا دروازہ کھل جائے گا۔ مولیٰ اپنے غلام کو قتل کرے گا، اور جب اس کو پکڑا جائے گا تو حجت پیش کرے گا کہ وہ زنا کار تھا۔ اور اس کی دارو گیر ممکن نہ ہوگی۔ اس لئے قتل کرنے اور ہاتھ کاٹنے کا اختیار تو ان کو دیا ہی نہیں گیا، کوڑوں کی سزا میں بھی کمی کی گئی، اور اتنی مقدار تجویز کی گئی جو ہلاکت تک مفضی نہ ہو۔

دوسری وجہ: ابھی اوپر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ آزاد شادی شدہ کامل، غیر شادی شدہ ناقص، اور غلام انقص ہے۔ چنانچہ ناقص کی سزا کا نصف انقص کے لئے تجویز کیا گیا۔

فائدہ: حَصُن (ک) حَصَانَةً کے اصل معنی ہیں: مضبوط ومحفوظ ہونا۔ اور حَصُنَتِ المرأةُ اور أَحْصَنَتِ المرأة کے تین معنی ہیں: (۱) شادی شدہ ہونا۔ جیسے ﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ اور وہ عورتیں جو شوہر والی ہیں (النساء آیت ۲۴) (۲) پاک دامن ہونا۔ جیسے ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ﴾ الآية: بیشک جو لوگ تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں کو جو پاک دامن ہیں (سورۃ النور آیت ۲۳) (۳) آزاد ہونا، جیسے ﴿مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ﴾ میں آزاد عورتیں مراد ہیں۔ یہ تینوں صورتیں مضبوط ومحفوظ ہونے کی ہیں۔

[۲] قال الله تعالى: ﴿فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾

أقول: السر في تنصيف العقوبة على الأرِقَّاء: أنهم يُفَوَّض أمرهم إلى مواليهم، فلو شُرع فيهم مزجرةٌ بالغةٌ أقصى المبالغ، لفتح ذلك بابَ العدوان، بأن يقتل المولى عبدَه، ويحتجُّ بأنه زانٍ، ولا يكون سبيل المواخذة عليه، فنُقِص من حدهم، وجُعل ما لايُفضي إلى الهلاك؛ والذى ذكرناه في الفرق بين المحصن وغيره يتأتى هنا.

ترجمہ: واضح ہے۔ أنهم يفوّض: بعض نسخوں میں ضمیر جمع کے ساتھ ہے۔ اور ضمیر ارقاء کی طرف عائد ہے۔ اور اظہر أنه ضمیر شان کے ساتھ ہے۔

☆ ☆ ☆

رجم کے ساتھ دُرّے مارنے کی، اور دُرّوں کے ساتھ جلاوطن کرنے کی روایت

حدیث — حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''مجھ سے لو! مجھ سے لو! یعنی یہ حکم خداوندی جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کے لئے (جن کو سورۃ النساء آیت ۱۵ میں گھروں میں مقید رکھنے کا حکم دیا ہے تا آنکہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ تجویز فرمائیں) راہ تجویز کردی: کنوارا کنواری زنا کریں تو سو کوڑے اور ایک سال جلاوطنی ہے۔ اور محصن محصنہ زنا کریں تو سو کوڑے اور سنگساری ہے'' (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۵۵۸)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شراحہ نامی عورت کو پہلے کوڑے مارے، پھر اس کو سنگسار کیا۔ اور فرمایا: جلدتُها بكتاب الله، ورجمتُها بسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم: میں نے اس کو کتاب اللہ (سورۃ النور آیت ۲) کی وجہ سے کوڑے مارے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق رجم کیا (مغنی ابن قدامہ ۱۰: ۱۲۶)

تشریح: حضرت امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ محصن محصنہ کو پہلے دُرّے مارے جائیں، پھر ان کو رجم کیا جائے۔ باقی ائمہ کے نزدیک: صرف رجم کیا جائے گا۔ دُرّے نہیں مارے جائیں گے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے اور اکثر خلفائے راشدین نے صرف رجم کیا ہے، کوڑے نہیں مارے۔ اور کنوارے کنواری کو دُرّے مارنے کے ساتھ جلاوطن کرنے میں بھی اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

یہ روایت مجتہدین کے لئے باعثِ الجھن ہوگئی ہے۔ ان کے خیال میں یہ روایت فعلِ نبوی سے متعارض ہے۔ اس لئے انھوں نے اس روایت کو نہیں لیا۔ اور میرے نزدیک آپ ﷺ کے قول وفعل میں کوئی تخالف نہیں۔ اور سورۃ النور کی آیت ۲ ہر زانی زانیہ کے لئے عام ہے۔ لیکن طریقہ یہ رائج کیا گیا کہ جب دونوں سزائیں واجب ہوں تو صرف رجم کیا جائے۔ دُرّوں سے درگذر کیا جائے۔ جیسے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سفر میں اتمام جائز ہے۔ مگر قصر مسنون ہے۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رجم بڑی سزا ہے، اور دُرّے مارنا چھوٹی۔ اور یہ چھوٹی سزا بڑی سزا کے ضمن میں پائی جاتی ہے۔ پس بڑی سزا جاری کرنا کافی ہے۔ اور یہ قولِ نبوی (حضرت عبادۃ کی مذکورہ روایت) اور فعلِ علیؓ کے درمیان، اور فعل نبوی اور فعلِ اکثر خلفاء کے درمیان تطبیق کی صورت ہے۔ یعنی آنحضرت ﷺ اور خلفاء بڑی سزا پر اکتفا کیا کرتے تھے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چھوٹی سزا بھی جاری کی۔

اور رجم کے ساتھ دُرّے مارنے کا جواز ایک اور روایت سے بھی مفہوم ہوتا ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

حدیث —— حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت کے ساتھ زنا کیا۔ نبی ﷺ نے آدمی کو کوڑے مارنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اس کو کوڑے مارے گئے۔ پھر آپؐ کو بتلایا گیا کہ وہ محصن ہے۔ تو آپؐ نے اس کو سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ سنگسار کیا گیا (مشکوۃ حدیث ۳۵۷۳)

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر زانی کو دُرّے مارنا جائز ہے۔ ورنہ آپ ﷺ تفتیش کر کے دُرّے مارنے کا حکم دیتے۔ اسی طرح میرے نزدیک جلاوطن کرنا بھی معافی کا احتمال رکھتا ہے۔ اس سے آثار کا اختلاف بھی دور ہو جائے گا۔

[۳] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " خذوا عني! خذوا عني! قد جعل الله لهن سبيلاً: البِكر بالبكر: جَلْدُ مائةٍ، وتغريبُ عام، والثيب بالثيب: جلد مائة والرجم" وعمل به علي رضي الله عنه.

أقول: اشتبه هذا على الناس، وظنوه مناقضًا مع رجمه الثيب وعدمِ جَلْدِه. وعندي: أنه ليس مناقضًا له، وأن الآيةَ عامةٌ، لكن يُسَنُّ للإمام الاقتصارُ على الرجم عند وجوبهما؛ وإنما مَثَلُه مثل القصر في السفر، فإنه لو أتمَّ جاز، لكن يُسَنُّ له القصر.

وإنما شُرِع ذلك: لأن الرجم عقوبةٌ عظيمةٌ، فتضمَّنَتْ ما دونَها؛ وبهذا يُجمع بين قوله صلى الله عليه وسلم هذا، وعملِ علي رضي الله عنه، وبين عمله صلى الله عليه وسلم، وأكثرِ الخلفاء في الاقتصار على الرجم.

وحديثُ جابر: " أمر بالجَلْدِ، ثم أُخبر أنه محصِنٌ، فأمر به فرجم": يدل عليه، فإنه ما أقدم على الجَلْد إلا لجواز مثله مع كل زانٍ.

وعندي: أن التغريب يحتمل العفو، وبه يُجمع بين الآثار.

ترجمہ: (۳) میں کہتا ہوں: یہ روایت لوگوں (مجتہدین) پر مشتبہ ہو گئی ہے۔ اور انھوں نے اس روایت کو مخالف خیال کیا: نبی ﷺ کے شادی شدہ کو رجم کرنے اور اس کو دُرّے نہ مارنے کے ساتھ۔ اور میرے نزدیک: یہ بات ہے کہ یہ حدیث مخالف نہیں آپؐ کے اس عمل سے، اور یہ کہ آیت عام ہے۔ لیکن حاکم کے لئے مسنون کیا گیا ہے رجم پر اکتفا کرنا، دونوں سزاؤں کے وجوب کے وقت۔ اور اس کا حال سفر میں قصر کے حال جیسا ہے۔ پس بیشک مسافر اگر نماز پوری پڑھے تو جائز ہے۔ مگر اس کے لئے قصر مسنون کیا گیا ہے —— اور یہ بات (رجم پر اکتفا کرنا) اس لئے مشروع کی گئی ہے کہ رجم بڑی سزا ہے۔ پس وہ شامل ہے اس کو جو اس سے کم تر ہے۔ اور اس (توجیہ) کے ذریعہ جمع کیا جائے گا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عمل کے درمیان، اور آنحضرت ﷺ اور اکثر خلفائے راشدین کے رجم پر اکتفا کرنے کے عمل کے درمیان —— اور حضرت جابرؓ کی حدیث:...... اس (جواز جمع) پر دلالت کرتی ہے۔ پس بیشک

نبی ﷺ نے دُرّے مارنے پر اقدام نہیں کیا، مگر اس کے جواز کی وجہ سے ہر زانی کے ساتھ (اس میں لفظ مثل زائد ہے)
——— اور میرے نزدیک: یہ ہے کہ جلاوطن کرنا معافی کا احتمال رکھتا ہے۔ اور اس (توجیہ) کے ذریعہ جمع کیا جائے گا روایاتِ (مختلفہ) کے درمیان۔

فائدہ: فإنه ما أقدم إلخ پر مخطوطہ کراچی میں یہ حاشیہ ہے: أي ما أقدمَ على الجَلْد قبلَ تفتيش حاله، إلا لجواز فعله مع كل زانٍ لعموم الحكم في آية: ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ اى بكرًا كان أو ثيبًا.

☆ ☆ ☆

اقرار کی صورت میں حد جاری کرنے میں احتیاط

حدیث ——— جب حضرت ماعز بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے زنا کیا ہے، مجھے پاک کردیجئے! آپؐ نے فرمایا: ''شاید تو نے چوما ہوگا؟ یا تو نے آنکھ ماری ہوگی؟ یا تو نے دیکھا ہوگا؟'' انھوں نے کہا: نہیں، یا رسول اللہ! آپؐ نے پوچھا: ''کیا تو نے اس کو چودا ہے؟'' کنایہ نہیں کیا۔ انھوں نے کہا: ہاں! تب آپؐ نے ان کو رجم کرنے کا حکم دیا (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۳۵۶۱)

تشریح: یہاں یہ خلجان ہوسکتا ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے زنا کا اقرار کیا ہے۔ اور زنا واضح لفظ ہے۔ پھر نبی ﷺ نے بال کی کھال کیوں نکالی؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حد جاری کرنے میں احتیاط ضروری ہے۔ اور زنا خاص لفظ نہیں ہے۔ اس کا اطلاق کبھی شرمگاہ کے علاوہ سے فائدہ اٹھانے پر بھی ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے: زنا العين النظر، وزنا اللسان النُّطق: آنکھ کا زنا دیکھنا، اور زبان کا زنا بات چیت کرنا ہے (مشکوۃ حدیث ۸۵ باب الایمان بالقدر) پس زنا جیسے معاملہ میں ضروری ہے کہ احتیاط سے کام لیا جائے۔ اور جب بات یقینی ہوجائے تبھی حد جاری کی جائے۔

[٤] لما قال ماعِزُ بنُ مالكٍ: زنيتُ فَطَهِّرْني، قال له صلى الله عليه وسلم: " لعلَّك قَبَّلْتَ، أو غَمَزْتَ، أو نظرتَ؟ قال: لا، يارسول الله! قال: " أَنِكْتَها؟" قال: نعم، فعند ذلك أمر برجمه.
أقول: الحد موضِعُ الاحتياط، وقد يُطلَق الزنا على مادون الفرج، كقوله صلى الله عليه وسلم: "فزنا اللسان كذا، وزنا الرِّجْل كذا" فوجب التثبُّتُ والتَّحقُّقُ في مثل ذلك.

لغات: نَاكَ يَنِيْكُ نَيْكًا: جامعها، وهو أصرح من الجماع (تاج العروس)..... غَمَزه بالعين: آنکھ مارنا۔ الغمز: اشارۂ چشم و ابرو..... تثبّت في الأمر: احتیاط سے کام لینا..... تحقّق الأمر: یقینی ہوجانا، پایۂ ثبوت کو پہنچ جانا۔

☆ ☆ ☆

جب اقرارِ زنا توبہ ہے پھر حد کیوں معاف نہیں ہوتی؟

سوال: اپنی ذات پر زنا کا اقرار کرنا، اور خود کو حد جاری کرنے کے لئے پیش کر دینا: توبہ ہے۔ اور حدیث میں ہے: ''توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں!'' (مشکوۃ حدیث ۲۳۶۳ کتاب الدعوات، باب الاستغفار) پس ایسا شخص اس امر کا مستحق ہے کہ اس پر حد جاری نہ کی جائے اس کو معاف کر دیا جائے۔ حالانکہ اس پر بھی حد جاری کی جاتی ہے۔ وجہ کیا ہے؟

جواب: توبہ کرنے والے پر بھی بچند وجوہ حد جاری کرنی ضروری ہے:

پہلی وجہ: اگر اظہارِ توبہ اور اقرارِ زنا کی وجہ سے حد اٹھا دی جائے گی تو ہر شخص آسانی سے اعترافِ زنا کو حیلہ بنا لے گا۔ جب بدکار کو احساس ہوگا کہ اس کے جرم کا پتہ چل گیا ہے۔ اور پولس ہاتھ ڈالنے والی ہے، تو وہ حاکم کے پاس حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کر لے گا۔ اور سزا سے بچ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات مصلحتِ اقامتِ حدود کے خلاف ہے۔ اس لئے توبہ کرنے والے پر بھی حد جاری کرنی ضروری ہے۔

دوسری وجہ: تمامیتِ توبہ کے لئے ضروری ہے کہ کسی شاق عمل سے اس کی تائید ہو۔ ورنہ زبانی جمع خرچ کر لینا تو بہت آسان ہے۔ مثلاً: توبہ کے ساتھ کفارہ ادا کرے، کوئی بڑا صدقہ کرے، اپنی زندگی کی ڈگر بدل دے، یا جرم کی سزا پائے۔ اور یہ کام وہی کرتا ہے جو توبہ میں مخلص ہوتا ہے۔ چنانچہ جب حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے خود کو سنگساری کے لئے پیش کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر وہ ایک گروہ کے درمیان بانٹ دی جائے تو سب کے لئے کافی ہو جائے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۶۲) اور نبی ﷺ نے قبیلۂ غامد کی عورت کے بارے میں فرمایا: ''اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ٹیکس وصول کرنے والا ایسی توبہ کرے تو اس کی بھی بخشش کر دی جائے'' (حوالہ بالا) ان دونوں کی توبہ کو یہ مقام اس لئے نصیب ہوا کہ نہایت شاق عمل سے اس کو تقویت حاصل ہوئی تھی۔ یعنی ان پر حد جاری کی گئی تھی۔ غرض توبہ کے بعد اجرائے حد: توبہ کے منافی نہیں، بلکہ مقوّی ہے۔

مگر بایں ہمہ: تین باتیں مستحب ہیں:

۱۔ جو شخص زانی کے جرم سے واقف ہو: اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ پردہ پوشی کرے۔ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے حضرتِ ہزّال ؓ کی باندی سے زنا کیا تھا۔ اور ہزّالؓ نے ماعزؓ کو اقرارِ زنا پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ رجم کئے گئے۔ بعد میں جب نبی ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو آپؐ نے ہزّالؓ سے فرمایا: ''اگر تو اس کو اپنے کپڑے میں ڈھانک لیتا تو تیرے لئے بہتر ہوتا!'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۶۷)

۲۔ زانی اگر کسی سے مشورہ کرے تو اس کو یہ مشورہ دیا جائے کہ وہ اپنے طور پر توبہ کرے، قاضی کے سامنے نہ جائے۔ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو یہی مشورہ دیا تھا (ترمذی ۱:۱۷۳)

۴—حاکم کے لئے مستحب یہ ہے کہ حد ہٹانے کے لئے حیلہ کرے۔کیس میں کوئی بھی کمزوری پیدا ہو جائے تو حد جاری نہ کرے۔حدیث میں ہے: اِدْرَءُوْا الحدودَ عن المسلمین ما استطعتم: جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود کو ہٹاؤ! (مشکوۃ حدیث ۳۵۷۰)

[۵] واعلم: أن الـمُقِرَّ علـى نفسه بالزنا، المُسْلِمُ نفسَه لإقامة الحد: تائبٌ، والتائبُ كمن لاذنب له، فمن حقه: أن لايُحَدَّا لكن هنا وجوهٌ مقتضية لإقامة الحد عليه:

منها: أنه لو كان أظهارُ التوبة والإقرارُ دَرْءاً للحد، لم يَعْجِزْ كُلُّ زانٍ أن يحتال، إذا استشعر بمؤاخذة الإمام: بأن يعترف، فيندرئُ عنه الحدُّ، وذلك مناقضة للمصلحة.

ومنها: أن التوبة لاتتم إلا أن يعتضد بفعلٍ شاق عظيمٍ، لا يتأتى إلا من مخلصٍ، ولذلك قال النبي صلى الله عليه وسلم في ماعزٍ، لَمَّا أسلَمَ نفسَه للرجم: " لقد تاب توبةً لو قُسِّمَتْ بين أمةِ محمد لَوَسِعَتْهم!" وقال عليه السلام في الغامدية:" لقد تابت توبةً لوتابها صاحبُ مكس لَغُفِر له"

ومع ذلك: فيستحب الستر عليه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم لِهَزَّالٍ:" لو سترتَه بثوبك لكان خيرًا لك" وأن يؤمرهو أن يتوب فيما بينه وبين الله، وأن يحتالَ في درء الحدّ.

ترجمہ: اور جان لیں کہ اپنی ذات پر زنا کا اقرار کرنے والا، اپنی جان کو حد قائم کرنے کے لئے سپرد کرنے والا: توبہ کرنے والا ہے۔ اور توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں۔ پس اس کے حق سے یہ بات ہے کہ وہ حد نہ مارا جائے۔ لیکن یہاں چند (اور) وجوہات ہیں جو اس پر حد جاری کرنے کو چاہنے والی ہیں: — از انجملہ: یہ ہے کہ توبہ تام نہیں ہوتی مگر بایں طور کہ قوی ہو وہ کسی بڑے دشوار عمل سے، جو نہ پایا جا سکتا ہو مگر توبہ میں مخلص سے...... اور بایں ہمہ: پس مستحب ہے اس پر پردہ ڈالنا...... اور یہ کہ خود زانی کو حکم دیا جائے کہ وہ اپنے اور اللہ کے درمیان میں توبہ کرے۔ اور یہ کہ حاکم حد دفع کرنے کا حیلہ کرے۔

☆ ☆ ☆

باندی کو سزا دینے کا اختیار: مولی کو دینے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کی باندی زنا کرے، پس اس کا زنا کھل جائے، تو چاہئے کہ مولی اس کو حد کے دُرّے مارے، اور اس کو بگاڑ نہ دے۔ پھر اگر زنا کرے تو مولی اس کو حد کے دُرّے مارے، اور اس کو بگاڑ نہ دے۔ پھر اگر تیسری مرتبہ زنا کرے، اور اس کا زنا کھل جائے تو چاہئے کہ وہ اس کو بیچ دے، اگرچہ بالوں

کی رسّی کے عوض فروخت ہو" (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۶۳) یہ حدیث باب کے شروع میں بھی گذر چکی ہے۔

تشریح: باندی کو زنا کی سزا دینے کا اختیار مولی کو دینے کی وجہ یہ ہے کہ انسان شرعاً مامور ہے کہ اپنے گھر والوں کو گناہ سے محفوظ رکھے۔ یہ انسان کے خمیر میں گوندھی ہوئی بات ہے۔ اور باندی بھی گھر کا فرد ہے۔ پس اگر باندی کو سزا دینے کا اختیار حاکم ہی کو ہوگا، اور مولی کو کوئی اختیار نہیں ہوگا، تو بہت سی صورتوں میں آقا اپنی باندی پر حد قائم نہیں کرواسکے گا۔ وہ بدنامی کے خوف سے معاملہ دبائے رہے گا۔ حاکم تک نہیں لے جائے گا۔ اور فساد بڑھتا رہے گا۔ اور وہ اپنی قابلِ حفاظت چیز سے دفاع نہیں کر پائے گا۔

رہا یہ اندیشہ کہ مولی غصہ میں مار مار کر باندی کا بھرکس نکال دے گا: درست نہیں۔ کیونکہ آقا جتنی چاہے سزا نہیں دے سکتا۔ شریعت نے باندی کی سزا متعین کردی ہے۔ اتنے ہی دُرّے مار سکتا ہے۔ حد کی یہ تعیین اسی حکمت سے ہے کہ تجاوز کرنے والا حد سے آگے نہ بڑھے، اور ہلاکت تک یا حد سے زائد ایذا دہی تک نہ پہنچ جائے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس کو بگاڑ نہ دے" یعنی تباہ نہ کردے۔

فائدہ: تشریب کے دو معنی ہیں: (۱) ملامت کرنا۔ اس صورت میں حدیث کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک: یہ کہ ملامت پر اکتفا نہ کرے، بلکہ حد جاری کرے۔ دوم: یہ کہ حد جاری کرنے پر اکتفا کرے۔ اس کے بعد کوستا نہ رہے کہ اس سے باندی ڈھیٹ ہوجائے گی (۲) بگاڑ دینا اور برباد کرنا: الإفساد والتخليط (لسان العرب) شاہ صاحب قدس سرہ نے یہی معنی کئے ہیں۔ مگر عام طور پر پہلے معنی کئے جاتے ہیں۔

> [٦] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إذا زنتْ أمةُ أحدِكم، فَتَبيَّن زناها، فَلْيُجْلِدْها الحدَّ، ولا يُثَرِّبْ عليها، ثم إن زنت فليجلدها الحدَّ، ولا يُثرِّبْ"
>
> أقول: السر في ذلك: أن الإنسان مأمور شرعًا أن يَذُبَّ عن حريمه المعاصيَ، ومجبولٌ على ذلك خلقةً، ولو لم يُشرع الحدُّ إلا عند الإمام: لَمَا استطاعَ السيدُ إقامتَه في كثير من الصور، ولم يتحقق الذب عن الذمار؛ ولو لم يُحَدَّ مقدارٌ معين للحد: لتجاوزَ المتجاوزُ إلى حد الإهلاك، أو الإيلام الزائد على الحد، فلذلك قال النبي صلى الله عليه وسلم:" لايُثرِّبْ"

ترجمہ: میں کہتا ہوں: راز اس میں یعنی باندی کی سزا کا اختیار مولی کو دینے میں: یہ ہے کہ انسان شرعاً مامور ہے کہ اپنے حرم (بیوی) سے گناہوں کو دفع کرے۔ اور وہ اس پر فطری طور پر پیدا کیا ہوا ہے۔ اور اگر حد مشروع نہیں کی جائے گی مگر امام کے پاس، تو یقیناً آقا بہت سی صورتوں میں حد کو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھے گا۔ اور قابل حفاظت چیز (بیوی باندی) سے دفع کرنا متحقق نہیں ہوگا۔ اور اگر نہ متعین کی جاتی حد کے لئے کوئی معین مقدار: تو یقیناً تجاوز کرنے والا: تجاوز

کرتا ہلاک کرنے کی حد تک، یا حد سے زائد ایذاء دہی تک۔ پس اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا: "ہلاک نہ کرے"

☆ ☆ ☆

حدود کے علاوہ سزاؤں میں آبرودار کے ساتھ رعایت کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "حدود کے علاوہ باحیثیت لوگوں کی لغزشیں معاف کرو" (مشکوۃ حدیث ۳۵۶۹)

تشریح: عزت و وجاہت دینی بھی ہوتی ہے اور دنیوی بھی:

دینی وجاہت: اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو کہ وہ دیندار ہے۔ اگر اس سے خلاف عادت کوئی لغزش صادر ہو جائے، اور وہ اس پر پشیمان ہو، تو اس سے درگذر کرنا چاہئے، کوئی سزا نہیں دینی چاہئے۔

دنیوی وجاہت: بہادر، منتظم اور شان و مرتبہ والے لوگوں سے لغزش سرزد ہو، تو اس سے بھی درگذر کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو اگر ہر چھوٹے بڑے گناہ پر سزا دی جائے گی، تو باہمی بغض و عداوت، حاکم کی مخالفت اور بغاوت کا دروازہ کھل جائے گا۔ کیونکہ بہت سے نفوس ایسی بات برداشت نہیں کرتے — رہی حدود: تو وہ بہر حال نافذ کی جائیں گی۔ ان کو رائگاں کرنا مناسب نہیں۔ البتہ اگر کوئی سبب شرعی پایا جائے جس سے کیس کمزور ہو جائے تو حد مرتفع ہو جائے گی۔ اور حدود رائگاں کرنا نامناسب اس لئے ہے کہ یہ بات مصلحتِ حدود کے خلاف ہے۔ اور اس سے حدود کا فائدہ ختم ہو جاتا ہے۔

[۷] قال صلى الله عليه وسلم: " أقيلوا ذوى الهيئات عثراتِهم، إلا الحدودَ"

أقول: المراد بذوى الهيئات: أهلُ المروءات:

[الف] إما أن يُعلم من رجل صلاحٌ في الدين، وكانت العثرةُ أمرًا فَرَطَ منه على خلاف عادته، ثم ندم، فمثلُ هذا ينبغي أن يُتجاوز عنه.

[ب] أو يكونوا أهلَ نجدة وسياسة وكُبْرٍ في الناس، فلو أقيمت العقوبةُ عليهم في كل ذنب، قليلٍ أو كثيرٍ، لكان في ذلك فتحُ بابِ التشاحنِ واختلافِ على الإمام وبغيٍ عليه، فإن النفوس كثيرًا مَّا لاتحتمل ذلك.

وأما الحدود: فلا ينبغي أن تهمل، إلا إذا وُجد لها سببٌ شرعي تندرئ به، ولو أُهملتْ لتناقضت المصلحةُ، وبطلت فائدةُ الحدود.

ترجمہ: (۷) ذوی الہیئات سے مراد ارباب مروّت ہیں (مروّت: بھل منسائی) — (الف) یا تو یہ کہ کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ دیندار ہے۔ اور لغزش ایک ایسی بات ہو جو اس سے خلافِ عادت سرزد ہو گئی ہو۔ اور وہ پشیمان ہوا ہو۔ پس

اس طرح کی بات: مناسب یہ ہے کہ اس سے درگذر کیا جائے ـــــ (ب) یا ارباب مروّت بہادر (فوجی) منتظم (سیاسی) اور شان ومرتبہ والے لوگ ہوں۔ پس اگر ان کو ہر گناہ کی سزا دی جائے گی، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، تو اس سے باہمی بغض وعداوت، اور امام سے اختلاف، اور اس سے سرکشی کا دروازہ کھلے گا۔ کیونکہ بارہا نفوس اس چیز کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اور رہی حدود: پس مناسب نہیں کہ وہ رائگاں کی جائیں۔ مگر جب پائی جائے ان کے لئے کوئی ایسی شرعی وجہ جس کی بنا پر حدود مندفع ہوجاتی ہیں۔ اور اگر حدود رائگاں کی جائیں گی تو وہ مصلحت کے خلاف ہوگا، اور حدود کا فائدہ باطل ہوجائے گا۔

لغات: اَقَالَ اللهُ عَثْرَتَه: اللہ کا کسی کی لغزش وغلطی کو معاف کرنا...... العثرات: اگر عام ہے تو استثناء متصل ہے۔ اور اگر معمولی غلطیاں مراد ہیں تو استثناء منقطع ہے ـــ حدیث ضعیف ہے۔ مگر متعدد طرق سے مروی ہے۔ اور مخطوطہ کراچی کے حاشیہ میں معلوم نہیں کس نے لکھا ہے: هذا حديث ضعيف جدًا، يُسقط من الكتاب.

☆ ☆ ☆

جو شخص حد کا تحمل نہ کرسکے، اس پر حد جاری کرنے کی صورت

حدیث ـــــ حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بیمار نیم انسان نبی ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، جو قبیلہ کی ایک باندی سے زنا کرتا ہوا پایا گیا تھا۔ آپؐ نے حکم دیا: ''تم اس کے لئے کھجور کا ایک بڑا خوشہ لو، جس میں سو چھوٹی شاخیں ہوں، پس اس سے ایک مرتبہ مارو'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۷۴)

تشریح: جو شخص پیدائشی ناقص الخلقت ہو، اور وہ حد کا تحمل نہ کرسکتا ہو: اس پر بھی حد قائم کرنی ضروری ہے۔ اگر اس کو حد سے مستثنیٰ کیا جائے گا تو یہ بات حدود کی اہمیت کے خلاف ہوگی۔ اور وہ احکام جن کو اللہ تعالیٰ نے طبعی امور کی طرح لازم کیا ہے: ان کے لائق یہ بات ہے کہ ان کو مؤثر بالخاصیت بنایا جائے، اور ان پر بھی ضرور عمل کیا جائے۔ یعنی حدود قائم کرنا فطری امور کی طرح لازم ہے، پس کسی بھی صورت سے حد قائم کی جائے۔ اور یہ خیال کہ ایسا حیلہ کرکے حد قائم کرنے میں کیا فائدہ؟ تو اس کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: حد قائم کرنا بہر حال مفید ہے۔ خواہ حیلہ ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ حد اپنی خاصیت سے اثر انداز ہوتی ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳: ۲۲۱)

دوسرا جواب: مذکورہ طریقہ پر حد جاری کرنے سے بھی مجرم کو کچھ تکلیف ضرور پہنچے گی۔ اور قاعدہ ہے: مَا لا يُدرك كلُّه لا يُترك كلُّه پس جتنی بات آسان ہے اس کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: اگر بیماری وغیرہ کی وجہ سے مجرم کمزور ہو، اور اندیشہ ہو کہ حد جاری کرنے سے ہلاک ہوجائے گا، اور امید ہو کہ وہ آئندہ تندرست ہوجائے گا تو اس کی حد مؤخر کی جائے۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک باندی کو کوڑے مارنے

کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ اس کو ابھی ولادت ہوئی ہے۔ آپؓ نے اس حال میں حد جاری نہ کی، اور واپس آکر صورت حال عرض کی، تو نبی ﷺ نے ان کے عمل کی تحسین فرمائی (مشکوۃ حدیث ۳۵۶۴)

اغلام کا حکم: اغلام کے حکم میں اختلاف ہے: امام مالک، امام شافعی اور صاحبین کے نزدیک وہ زنا ہے۔ مگر اس کو لازماً سنگسار کیا جائے گا۔ کوڑوں پر اکتفا نہیں کیا جائے گا۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: وہ سخت قابل تعزیر جرم ہے۔ پس دونوں کو قتل کیا جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''جس کو تم قوم لوط والا کام کرتے دیکھو، تو کرنے والے کو اور جس کے ساتھ کیا گیا: دونوں کو قتل کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۷۵)

[۸] قال صلى الله عليه وسلم في مُخْدَجٍ يَزْني: " خذوا له عِثْكالاً، فيه مائة شِمْراخٍ، فاضربوه به ضربة"

اعلم: أن من لايستطيع أن يقام عليه الحدودُ، لضعفٍ في جبلته: فإن تُرِكَ سُدى كان مناقضًا لتأكُّد الحدود، فإنما اللائق بالشرائع اللازمة التي جعلها الله تعالى بمنزلة الأمور الجبلية: أن يُجعل كالمؤثر بالخاصية، ويُعَضَّ عليها بالنواجذ. وأيضًا: فإن فيه بعض الألم، والميسورُ لاضرورة في تركه.

[۹] واختُلف في حد اللواطة: فقيل: هي من الزنا، وقيل: يقتل، لحديث: " من وجدتموه يعمل عملَ قوم لوط: فاقتلوا الفاعل والمفعول به"

ترجمہ: (۸) جان لیں کہ جو شخص طاقت نہیں رکھتا کہ اس پر حدود قائم کی جائیں۔ اس کی پیدائش میں کمزوری کی وجہ سے: تو اگر وہ مہمل چھوڑ دیا جائے گا تو وہ بات حدود کی اہمیت کے خلاف ہوگی۔ پس ان احکام کے لائق جن کو اللہ تعالیٰ نے طبعی امور کے بمنزلہ لازم کیا ہے: (۱) یہی بات ہے کہ اس حکم کو خاصیت کے ذریعہ اثر انداز ہونے والی چیز کی طرح گردانا جائے، اور ان کو ڈاڑھوں سے مضبوط پکڑا جائے (۲) اور نیز: پس اس میں کچھ تکلیف ہے۔ اور جو آسان بات ہے اس کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں (باقی ترجمہ واضح ہے)



حد قذف کا بیان

سورۃ النور آیات ۴ و ۵ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں، پھر چار گواہ پیش نہ کریں، تو ان کو اسّی کوڑے مارو، اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو۔ اور یہی لوگ فاسق ہیں۔ مگر جو لوگ اس کے بعد توبہ کرلیں، اور اپنی حالت سنوار لیں، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والے مہربانی فرمانے والے ہیں''



اس آیت کے ذیل میں شاہ صاحب قدس سرہٗ نے سات باتیں بیان کی ہیں: ۱ — مردوں پر تہمت لگانے کا بھی وہی حکم ہے، جو عورتوں پر تہمت لگانے کا ہے ۲ — احصانِ قذف کیا ہے؟ اور محصن کون ہے؟ ۳ — ثبوتِ زنا کے لئے چار گواہ کیوں ضروری ہیں؟ ۴ — ایک سوال کا جواب ۵ — حد قذف اسّی کوڑے ہونے کی وجہ ۶ — محدود فی القذف کے مردود الشہادۃ ہونے کی وجہ ۷ — توبہ کے بعد محدود فی القذف کی شہادت کا حکم

مردوں پر تہمت لگانے کا بھی وہی حکم ہے، جو عورتوں پر تہمت لگانے کا ہے

آیت کریمہ میں خاص شانِ نزول کی بنا پر یعنی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کی بنا پر تہمت زنا اور اُس کی سزا کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے مرد ہوں، اور جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ پاک دامن عورت ہو، مگر حکم اشتراکِ علت کی بنا پر عام ہے۔ عورت: عورت پر یا مرد پر، اسی طرح مرد: مرد پر یا عورت پر زنا کی تہمت لگائے، پھر شرعی ثبوت (چار گواہ) نہ پیش کر سکے تو اس پر حد قذف جاری ہوگی۔ اور حکم کا یہ عموم اجماعِ امت سے ثابت ہے، جو قطعی دلیل ہے۔ اور اجماع کا مستند: ایک دوسرے معاملہ میں خلفائے راشدین کا عمل ہے۔ سورۃ النساء آیت ۲۵ میں ارشاد پاک ہے: ﴿فَإِذَا أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ﴾ اس آیت میں باندیوں کے لئے حد زنا میں تنصیف کا جو حکم ہے، وہ غلاموں کو بھی عام ہے۔ چنانچہ خلفائے راشدین غلاموں کو بھی پچاس کوڑے مارتے تھے۔ اسی طرح حد قذف کی آیت بھی مردوں کو شامل ہے۔

احصانِ قذف کیا ہے؟

احصان کی دو قسمیں ہیں: احصانِ رجم اور احصانِ قذف۔ احصان رجم کا تذکرہ پہلے آچکا ہے کہ مرد اور عورت: دونوں عاقل، بالغ، آزاد اور مسلمان ہوں، اور نکاح صحیح کر کے ہم بستر ہو چکے ہوں، تو وہ محصن اور محصنہ ہیں۔ اور زنا میں ان کی سزا رجم ہے۔ اور احصانِ قذف یہ ہے کہ جس پر زنا کا الزام لگایا گیا ہے وہ عاقل، بالغ، آزاد، مسلمان اور عفیف (پاک دامن) ہو یعنی پہلے کبھی اس پر زنا کا ثبوت نہ ہوا ہو۔ ایسا مرد اور ایسی عورت بابِ قذف میں محصن اور محصنہ ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اگر کوئی زنا کی بات کرے تو شرعی ثبوت پیش کرے، ورنہ حد قذف لگے گی۔ اور اگر کوئی شخص پاگل، بچے، غلام، غیر مسلم یا غیر عفیف پر تہمت لگائے تو حد قذف جاری نہ ہوگی۔

ثبوتِ زنا کے لئے چار گواہ کیوں ضروری ہیں؟

زنا اور تہمتِ زنا کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ زنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ اس کو مٹانا، اس پر حد جاری کرنا، اور اس کی وجہ

سے دارو گیر کرنا ضروری ہے۔اسی طرح زنا کی تہمت لگانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔اس سے مقذوف کی سخت بدنامی ہوتی ہے، پس اس پر بھی دارو گیر ضروری ہے۔

اور زنا کی تہمت اور زنا کی گواہی کی سرحدیں بھی ملی ہوئی ہیں۔اگر تہمت لگانے والے کی گرفت کی جائے، تاکہ اس پر حد جاری کی جائے تو وہ کہے گا: ''میں تو زنا کا گواہ ہوں، تہمت نہیں لگا رہا'' یوں وہ حد قذف سے بچ جائے گا۔ اور اگر کوئی زنا کی گواہی دے تو مشہود علیہ یہ کہہ کر اپنی مدافعت کرے گا کہ: ''یہ تہمت لگا رہا ہے، اس کو حد قذف ماری جائے'' یوں وہ حد زنا سے بچ جائے گا۔

پس جب حکام کے نزدیک یہ دونوں باتیں متشابہ ہیں، تو ضروری ہے کہ کسی ''واضح بات'' کے ذریعہ دونوں میں امتیاز کیا جائے۔ اور وہ مخبرین کی کثرت ہے۔ جب کسی بات کی خبر دینے والے زیادہ ہوتے ہیں تو گواہی اور سچائی کا گمان قوی ہوتا ہے، اور تہمت کا گمان ضعیف ہوتا ہے۔یعنی جب بہت سے لوگ زنا کی خبر دیں گے تو ظن غالب یہ قائم ہوگا کہ یہ لوگ گواہ ہیں، تہمت لگانے والے نہیں ہیں، نیز: سچے ہیں، جھوٹے نہیں ہیں۔ کیونکہ تہمت لگانے والے میں دو باتیں پائی جاتی ہیں: دین کی کمزوری، اور مقذوف سے دشمنی۔یعنی دیندار آدمی اتہام تراشی نہیں کرتا۔ یہ حرکت بددین لوگ کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اس وقت کرتے ہیں جب ان کے دل میں مقذوف سے کینہ ہو۔ اور ان دونوں باتوں کا مسلمانوں کی جماعت میں جمع ہونا عقل سے بعید ہے۔ پس چار شخصوں کی گواہی میں تہمت کا احتمال باقی نہیں رہتا، گواہی کا پہلو متعین ہو جاتا ہے۔

ایک سوال کا جواب

سوال: ثبوتِ زنا کے لئے دو گواہوں کی عدالت پر کیوں اکتفا نہیں کیا گیا؟ نصابِ شہادت کو دُونا کرنے کی کیا وجہ ہے؟

جواب: گواہوں کی عدالت تو سبھی معاملات میں ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ زنا اور تہمت زنا میں امتیاز نہیں ہوسکتا۔ اشتباہ دور کرنے کے لئے کوئی اور امرِ ظاہر ضروری ہے۔ اور وہ مخبرین کی کثرت ہے۔ اس لئے نصاب شہادت دونا کیا گیا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

سوال: جب ثبوتِ زنا کے لئے چار کی گواہی شرط ہوگی، تو مجرموں کو کھلی چھوٹ مل جائے گی۔ وہ زنا کریں گے۔ اور اس کا ثبوت دشوار ہوگا۔ کیونکہ چار عینی مشاہد ملنا سخت دشوار ہے۔ اور اس کے بغیر زبان کھولنے پر حد قذف لگے گی، تو مجرموں کے مزے آئیں گے!

جواب: یہ خیال صحیح نہیں۔ کیونکہ زنا کی حد شرعی جاری کرنے کے لئے تو بیشک چار گواہ ضروری ہیں۔ مگر غیر محرم

مردوزن کو یکجا قابل اعتراض حالت میں دیکھنے کی، یا بے حیائی کی باتیں کرنے کی گواہی دینے میں چار کی گواہی شرط نہیں۔ اور ایسے تمام امور جو زنا کے مقدمات ہیں: وہ بھی قابل سزا گناہ ہیں۔ قاضی اپنی صوابدید سے ان کی بھی سزا دے گا۔ پس ایسی صورت میں لفظ زنا سے شہادت نہ دے، بلکہ ناجائز تعلقات اور بے حجابانہ میل جول کی گواہی دے، تاکہ قاضی ان کا علاج کرے۔ اس صورت میں گواہوں پر حد قذف نہیں لگے گی (یہ سوال وجواب شارح نے بڑھایا ہے)

حد قذف اسّی کوڑے ہونے کی وجہ

تہمت زنا سے فاحشہ کی تشہیر ہوتی ہے (سورۃ النور آیت ۱۹) اور زنا خود فاحشہ ہے (بنی اسرائیل آیت ۳۲) پس دونوں کا درجہ مساوی نہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ حد قذف: حد زنا سے کم ہو۔ اور کمی پانچواں حصہ (۲۰ کوڑے) اس لئے کی گئی کہ یہی سب سے چھوٹا حصہ ہے جو آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔

محدود فی القذف کے مردود الشہادہ ہونے کی وجہ

حد قذف کا تکملہ ردّ شہادت کو بنایا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تکلیف دینے کی دو صورتیں ہیں: جسمانی اور نفسانی۔ کوڑے جسمانی سزا ہیں۔ اور گواہی قبول نہ کرنا نفسانی۔ اور شریعت نے تمام حدود میں دونوں قسم کی سزاؤں کو جمع کیا ہے:

(الف) حد زنا کے ساتھ جلاوطنی کو ملایا ہے۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں جہاں حدود نافذ ہوں۔ اور اولیاء میں غیرت باقی ہو: زنا جیسا گناہ معاشقہ کے نتیجہ ہی میں سرزد ہو سکتا ہے۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ مرد کو سال بھر کے لئے وطن سے دور کر دیا جائے، تاکہ رشتہ ٹوٹ جائے، اور آئندہ یہ گناہ صادر نہ ہو۔

(ب) اور حد قذف کے ساتھ رد شہادت کو جمع کیا گیا ہے۔ کیونکہ تہمت لگانا بھی خبر دینا ہے، اور گواہی بھی خبر دینا ہے۔ پس قاذف کو ایسے عار کے ذریعہ سزا دی گئی جو گناہ (تہمت لگانے) کی جنس سے ہے۔

سوال: فاسق کی گواہی بھی تو قبول نہیں کی جاتی، پھر قاذف کی کیا خصوصیت رہی؟

جواب: قاذف کی گواہی قبول نہ کرنا اس کے گناہ کی سزا کے طور پر ہے۔ یہی اس کی خصوصیت ہے۔ اور دوسرے گناہگاروں کی گواہی قبول نہ کرنا وصفِ عدالت نہ ہونے اور پسندیدہ گواہ نہ ہونے کی بنا پر ہے۔ عدالت کی شرط سورۃ الطلاق آیت ۲ میں ہے: ﴿وَأَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ اور اپنوں میں سے دو معتبر شخصوں کو گواہ کر لو۔ اور سورۃ المائدہ آیت ۱۰۶ میں ہے: ﴿اِثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ تم میں سے ایسے دو شخص جو دیندار ہوں۔ اور پسندیدہ گواہ ہونے کا تذکرہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲ میں ہے: ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾ ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔

(ج) اور شراب کی سزا کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کو ملایا گیا ہے۔ جیسا کہ آگے روایت میں آرہا ہے۔

توبہ کے بعد محدود فی القذف کی شہادت کا حکم

محدود فی القذف اگر گناہ سے توبہ کرلے، اور مقذوف سے معافی حاصل کرکے توبہ کی تکمیل کرلے، تو اب اس کی گواہی قبول کی جائے گی یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے: امام اعظم کے نزدیک: اب بھی اس کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ وہ أَبَـدًا مردود الشہادۃ ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک قبول کی جائے گی۔ کیونکہ جب توبہ سے اس کا فسق ختم ہوگیا، تو ضروری ہے کہ اس کا اثر اور اس کی سزا بھی ختم ہوجائے۔ اور اختلاف اس وجہ سے ہوا ہے کہ استثناء ﴿إِلاَّ الَّذِينَ﴾ سابقہ دونوں جملوں کی طرف راجع ہے یا صرف جملہ اخیرہ کی طرف؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں جملوں کی طرف راجع ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: چونکہ واؤ سے عطف کیا گیا ہے، اس لئے صرف جملہ اخیرہ کی طرف راجع ہے۔

[۱۰] قال الله تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ، ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ، فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً، وَّلاَ تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا، وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ. إِلاَّ الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوْا، فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ وفي حكم المحصَنات المحصِنونَ بالإجماع؛ والمحصِن: حر، مكلَّف، مسلِم، عفيفٌ عن وَطْءٍ يُحَدُّ به.

واعلم: أن ههنا وجهين متعارضين: وذلك: أن الزنا معصية كبيرة، يجب إخمالُها، وإقامة الحد عليها، والمواخذةُ بها. وكذلك القذفُ معصية كبيرة، وفيه إلحاقُ عارٍ عظيمٍ، يجب إقامة الحد عليها.

ويشتبهُ القذفُ: بالشهادة على الزنا:

[الف] فلو أخذنا القاذفَ لنقيم عليه الحدَّ، يقول: أنا شاهد على الزنا؛ وفيه: بطلانٌ لحد القذف.

[ب] والذى هو شاهدٌ على الزنا: يَذُبُّه عن نفسه المشهودُ عليه: بأنه قاذف يستحق الحدَّ.

فلما تعارض الحدَّان فى هذه الجملة عند سياسة الأمة: وجب أن يفرَّق بينهما بأمرٍ ظاهرٍ، وذلك: كثـرةُ المخبرين: فإنهم إذا كثروا قوى ظن الشهادةِ والصدق، وضَعُفَ ظن القذف؛ فإن القذف يستدعى جمعَ صفتين: ضعفٍ فى الدين، وغِلٍّ بالنسبة إلى المقذوف، ويبعُد أن يجتمعا فى جماعة من المسلمين.

وإنما لم يكتفِ بعدالة الشاهدين: لأن العدالة مأخوذة فى جميع الحقوق، فلا يظهر للتعارض أثر.

وضُبطتِ الكثرةُ بضِعف نصاب الشهادة.

وإنـمـا جُعل حد القذف ثمانين: لأنه ينبغي أن يكون أقلَّ من الزنا، فإن إشاعةَ فاحشةٍ ليست بمنزلة فعلِها، وضُبِطَ النقصانُ بمقدار ظاهر، وهو عشرون، فإنه خُمس المائة.

وإنـمـا جُـعـل مـن تمام حدِّه عدمُ قبولِ الشهادة: لِمَا ذكرنا: أن الإيلامَ قسمان: جسماني، ونفساني، وقد اعتبر الشرعُ جمعَهما في جميع الحدود، لكن:

[الف] جُمِعَ مع حد الزنا التغريب: لأن الزنا عند سياسةِ وُلاةِ الأمور وغيرة الأولياء لايُتصور إلا بعدَ مخالطةٍ، ومما زجةٍ، وطولِ صحبةٍ، وائتلافٍ، فجزاؤه المناسبُ له: أن يُجْلَى عن محل الفتنة.

[ب] وجُـمـع مع حد القذف عدمُ قبول الشهادة: لأنه إخبـارٌ، والشهادةُ إخبارٌ، فجوزي بعار من جنس المعصية، فإن عدم قبول الشهادة من القاذِف عقوبةٌ، وعدمُ قبولها من سائر العصاة لفوات العدالة والرضا.

[ج] وجُمع في حد الخمر التبكيت.

واختـلـفـوا فـي قـولـه تعالى: ﴿إِلَّا الَّذِيْنَ﴾ هل الاستثناء راجع إلى عدم قبول الشهادة أم لا؟ والـظـاهـر مـمـا مَهَّدْنا: أن الفسق لما انتهى وجب أن ينتهِيَ أثرُه وعقوبتُه؛ وقد اعتبره الخلفاءُ لحد الزنا في تنصيف العقوبة على الأرِقَّاء.

ترجمہ: (۱) اور پارسا عورتوں کے حکم میں پارسا مرد (بھی) ہیں بہ اجماعِ امت (اس کی دلیل بالکل آخر میں ہے) (۲) اور محصن: آزاد، مکلّف (عاقل بالغ) مسلمان، ایسی وطی سے پاک آدمی ہے جس کی وجہ سے حد ماری جاتی ہے —— (۳) اور جان لیں کہ یہاں (حدِ قذف میں) دو متخالف جہتیں ہیں۔ یعنی دو ایسی باتیں ہیں جن کے تقاضے مختلف ہیں۔ اور اس کی تفصیل: یہ ہے کہ زنا کبیرہ گناہ ہے، اس کو گم کرنا، اور اس پر حد قائم کرنا، اور اس کی بنا پر دارو گیر کرنا ضروری ہے۔ اور اسی طرح تہمت لگانا کبیرہ گناہ ہے۔ اور اس میں بڑا عار لاحق کرنا ہے۔ اور اس معصیت پر دارو گیر کرنا ضروری ہے — اور زنا کی تہمت لگانا: زنا کی گواہی کے ساتھ مشتبہ ہے: (الف) پس اگر تہمت لگانے والے کو پکڑیں، تا کہ اس پر حد قائم کریں تو وہ کہتا ہے: ''میں زنا کا گواہ ہوں'' اور اس میں حدِ قذف کا بطلان ہے یعنی یہ کہہ کر وہ حدِ قذف سے بچ جائے گا (ب) اور وہ شخص جو زنا کا گواہ ہے، اس کو مشہود علیہ اپنی ذات سے ہٹائے گا، بایں طور کہ وہ تہمت لگانے والا ہے، سزا کا مستحق ہے (یہ دو مخالف جہتیں ہیں) پس جب دونوں حدیں یعنی حدِ قذف اور حدِ زنا اس معاملہ میں امت کے نظم وانتظام کے وقت متعارض ہوئیں تو ضروری ہوا کہ دونوں کے درمیان تفریق کی جائے، کسی واضح بات کے ذریعہ۔ اور وہ واضح بات: خبر دینے والوں کی کثرت ہے۔ پس بیشک جب خبر دینے والے زیادہ ہوتے ہیں تو گواہی اور سچائی کا گمان قوی ہوتا ہے، اور تہمت کا گمان کمزور پڑتا ہے۔ کیونکہ تہمت لگانا دو صفتوں کے اکٹھا ہونے کو چاہتا ہے: دین میں کمزوری، اور اس شخص کی بہ نسبت کینہ جس پر تہمت

لگائی گئی ہے۔ اور بعید ہے کہ یہ دونوں باتیں اکٹھا ہوں مسلمانوں کی جماعت میں ـــــــ (سوال کا جواب) اور شاہدین کی عدالت پر اس وجہ سے اکتفا نہیں کیا گیا کہ عدالت (تو) سبھی حقوق میں لی ہوئی ہے یعنی ضروری ہے۔ پس تعارض کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا یعنی زنا میں بھی دو عادل گواہ کافی ہوں گے تو تہمت زنا اور شہادت زنا میں تعارض کا کچھ اثر ظاہر نہ ہوگا ـــــ اور کثرت کا انضباط: نصاب شہادت کے دُونے سے کیا گیا ہے ـــ (۵) اور تہمت لگانے کی سزا اسّی کوڑے اس وجہ سے مقرر کی گئی کہ مناسب بات یہ ہے کہ وہ سزا زنا کی سزا سے کم ہو۔ کیونکہ فاحشہ کی تشہیر: فاحشہ کے ارتکاب کے بمنزلہ نہیں۔ اور کمی کا انضباط ایک واضح مقدار کے ذریعہ کیا گیا۔ اور وہ بیس ہیں۔ پس وہ سو کا پانچواں ہے ـــ (۶) اور قذف کی حد کی تمامیت سے: گواہی کا قبول نہ کرنا تجویز کیا گیا۔ اس بات کی وجہ سے جو ہم نے ذکر کی کہ تکلیف پہنچانے کی دو صورتیں ہیں: جسمانی اور نفسانی۔ اور شریعت نے تمام ہی حدود میں دونوں کو جمع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ لیکن: (الف) حد زنا کے ساتھ جلاوطنی جمع کی گئی ہے۔ اس لئے کہ زنا: معاملات کے ذمہ داروں کے انتظام اور اولیاء کی غیرت کے وقت: متصور نہیں مگر میل جول، گھل مل، درازئ رفاقت و موافقت کے بعد۔ پس اس کے لئے مناسب سزا یہ ہے کہ وہ (زانی) فتنہ کی جگہ سے دور کر دیا جائے (یعنی زانیہ کو جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔ یہی امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے) ـــــ (ب) اور حد قذف کے ساتھ جمع کیا گیا گواہی قبول نہ کرنے کو۔ کیونکہ تہمت لگانا خبر دینا ہے، اور گواہی (بھی) خبر دینا ہے، اس لئے وہ ایسے عار کے ساتھ سزا دیا گیا جو گناہ کی جنس سے ہے ـــ (سوال کا جواب) پس قاذف کی گواہی قبول نہ کرنا ایک سزا ہے۔ اور دوسرے گنہ گاروں کی گواہی قبول نہ کرنا: عدالت اور پسندیدہ نہ ہونے کی وجہ سے ہے ـــ (ج) اور شراب کی سزا میں ڈانٹ ڈپٹ کو ملایا گیا ـــ (۷) اور مجتہدین نے اختلاف کیا ہے اللہ کے ارشاد: ﴿إِلَّا الَّذِيْنَ﴾ میں کہ استثناء گواہی قبول نہ کرنے کی طرف (بھی) لوٹنے والا ہے یا نہیں؟ اور ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں ان سے ظاہر یہ ہے کہ جب فسق ختم ہو گیا، تو ضروری ہے کہ اس کا اثر اور اس کی سزا بھی ختم ہو جائے ـــــ اور تحقیق اعتبار کیا ہے اس کا یعنی مرد کو عورت پر قیاس کیا ہے خلفائے راشدین نے زنا کی سزا کے وقت: غلاموں پر سزا کو آدھا کرنے میں (اس کا تعلق سب سے پہلی بات سے ہے)

☆ ☆ ☆

چوری کی سزا کا بیان

چوری کی حقیقت کیا ہے؟ اور کتنی چوری پر سزا دی جائے گی؟

سورۃ المائدہ آیت ۳۸ میں ارشاد پاک ہے: ”چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت: دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو، یہ ان کی بدکرداری کا بدلہ ہے، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والے ہیں“

تفسیر: قرآن کریم دین وشریعت کی اصل واساس ہے، مگر اس میں عام طور پر اصول مذکور ہیں۔ اور بعض باتیں وضاحت طلب بھی ہیں۔ جیسے قرآن کریم میں ''دیت'' کا ذکر ہے، مگر قرآن میں اس کی تفصیل نہیں اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں قرآن کی وضاحت اور بیان بھی ہے۔ سورۃ النحل آیت ۴۴ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ ترجمہ: اور ہم نے آپ پر یہ قرآن اتارا تاکہ آپ لوگوں کو وہ کتاب واضح کر کے سمجھادیں جو ان کے پاس بھیجی گئی ہے۔ یہ وضاحتِ نبوی بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ سورۃ القیامہ آیت ۱۹ میں ارشاد پاک ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ ترجمہ: پھر اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے۔

چوری کی سزا لفظ سارق بول کر بیان کی گئی ہے۔ اور جب اسم مشتق پر کوئی حکم مرتب کیا جاتا ہے تو وصفِ عنوانی حکم کی علت ہوتا ہے۔ پس حد سرقہ کی علت وصفِ سرقہ ہے۔ مگر اس وصف کی جامع مانع تعریف ہم کو معلوم نہیں کہ چوری کیا چیز ہے؟ کیونکہ دوسرے کا مال لینے کی کئی صورتیں ہیں۔ اور ان کے لئے عربی میں الگ الگ الفاظ ہیں۔ مثلاً: سرقہ (چوری) قطع طریق (ڈاکہ زنی) اختطاف (جھپٹا مارنا) خیانت (بددیانتی) التقاط (پڑی ہوئی چیز اٹھالینا) غصب (زبردستی لے لینا) قلتِ مبالات اور قلتِ ورع (لاپروائی اور بے احتیاطی) یہ سب صورتیں ملتی جلتی ہیں۔ پس ضروری ہے کہ نبی ﷺ چوری کی حقیقت بیان فرمائیں۔ اور اس طرح بیان فرمائیں کہ وہ دوسری چیزوں سے ممتاز ہوجائے۔

اور امتیاز کا طریقہ: یہ ہے کہ پہلے سرقہ کے علاوہ دیگر الفاظ کی ذاتیات میں غور کیا جائے، جو انھیں میں پائی جاتی ہیں، سرقہ میں نہیں پائی جاتیں، اور جن کے ذریعہ سرقہ اور غیر سرقہ میں امتیاز ہوتا ہے۔ پھر سرقہ کی ذاتیات میں غور کیا جائے، جن کو اہل عرف لفظ سرقہ سے سمجھتے ہیں۔ پھر سرقہ کو چند معلوم امور کے ذریعہ منضبط کیا جائے، تاکہ وہ دوسری چیزوں سے ممتاز ہوجائے۔ پس:

۱— قطع طریق (راہ زنی) نہب (لوٹ) اور حرابہ (لڑائی) ایسے الفاظ ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ظالموں کے پاس مظلوموں کی بہ نسبت طاقت زیادہ ہے۔ اور وہ کارروائی کے لئے ایسی جگہ اور ایسا وقت منتخب کرتے ہیں جس میں مظلوموں کو جماعتِ مسلمین کی طرف سے مدد نہ پہنچ سکے۔ اس طرح وہ بے بس لوگوں کو لوٹ لیتے ہیں۔

۲— اختلاس (ربودگی) یہ ہے کہ مالک کی آنکھوں میں دھول جھونک کر، لوگوں کے دیکھتے سنتے مال اڑالیا جائے۔

۳— خیانت: خبر دیتی ہے کہ پہلے مالک اور خائن میں تجارت وغیرہ میں ساجھا رہا ہوگا، یا دونوں میں بے تکلفی ہوگی، یا مالک نے خائن کو چیز میں تصرف کی اجازت دی ہوگی، یا یونہی اس کے پاس حفاظت کے لئے چھوڑ دی ہوگی، جس میں اس نے خیانت کی، اور وہ اس چیز سے مکر گیا۔

۴— التقاط (زمین سے اٹھانا) آگاہی دیتا ہے کہ کوئی چیز غیر محفوظ جگہ سے لی گئی ہے۔ جیسے گری پڑی چیز اٹھالی۔

۵— غصب: سے مظلوم کی بہ نسبت ظالم کا غالب ہونا سمجھا جاتا ہے۔ غاصب لڑتا بھڑتا اور بھاگ نہیں جاتا، بلکہ جھگڑا

کر کے ہتا مارتا ہے۔اور خیال کرتا ہے کہ معاملہ حکام تک نہیں پہنچے گا،اور ان کو حقیقتِ حال کا پتہ نہیں چلے گا۔

۶ــــ قلّتِ مبالات (لا پروائی) اور قلّتِ ورع (بے احتیاطی) کا اطلاق معمولی چیزوں پر ہوتا ہے۔جیسے دوسرے کا پانی اور سوختہ لے لیا۔جنھیں لوگ خرچ کیا کرتے ہیں۔اور جن کے ذریعہ باہمی تعاون کی عادت ہے۔ایسی معمولی چیز کسی نے بے اعتنائی اور بے احتیاطی سے اٹھالی ہوتو وہ سرقہ نہیں۔

پس چونکہ دوسرے کا مال لینے کی بہت سی صورتیں ہیں،اس لئے نبی ﷺ نے درج ذیل احادیث میں سرقہ کو مثبت ومنفی پہلوؤں سے منضبط کیا ہے،تاکہ چوری کی حقیقت واضح ہوجائے،اور مذکورہ مشتبہ چیزوں سے احتراز بھی ہوجائے۔

حدیث ــــ (۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''چور کا ہاتھ نہ کاٹا جائے مگر چوتھائی دینار میں،یا اس سے زیادہ میں''اور مروی ہے کہ اتنے مال میں ہاتھ کاٹا جائے جو ڈھال کی قیمت کو پہنچ جائے۔اور روایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے ڈھال چرانے میں ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی۔اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مالٹا (ایک مشہور پھل جو ترش وشیریں ہوتا ہے) چرانے میں ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی،بارہ درہم کے چینج سے یعنی بارہ درہم مساوی ایک دینار کے حساب سے (یہ سب روایات مشکوٰۃ باب قطع السرقہ میں ہیں۔البتہ آخری روایت موطا میں ہے۔جامع الاصول ۴:۳۱۳)

تشریح: یہ تینوں اندازے (چوتھائی دینار،ڈھال،اور اس کی قیمت تین درہم) نبی ﷺ کے زمانہ میں ایک ہی چیز پر منطبق تھے۔پھر آپؐ کے بعد اندازے بدل گئے۔اور قیمت کی تعیین نہ ہونے کی وجہ سے ڈھال بھی معیار نہ رہی۔اس لئے مجتہدین کرام میں چوتھائی دینار اور تین درہم کی روایات میں اختلاف ہوا۔امام شافعی رحمہ اللہ نے چوتھائی دینار نصابِ سرقہ تجویز کیا۔اور امام مالک رحمہ اللہ نے تین درہم نصاب مقرر کیا۔اور امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ دونوں ہی معیار ہیں۔چوری کی مالیت دونوں میں سے ادنی کو پہنچ جائے تو ہاتھ کاٹا جائے گا۔یہی رائے حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک راجح ہے۔

فائدہ: اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: نصابِ سرقہ: ایک دینار یا دس درہم ہیں۔اس سے کم مالیت میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔اور ان کی دلیل یہ ہے کہ ڈھال کی قیمت کا اندازہ کرنے میں صحابہ میں اختلاف ہوا ہے: چوتھائی،تہائی،آدھا اور پورا دینار اندازہ کیا گیا ہے،اور قولی روایت ہے کہ دس درہم سے کم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے (یہ سب روایات صحاح کی ہیں اور جامع الاصول ۴:۳۱۳ و۳۱۴ و۳۱۳ میں مذکور ہیں) یہ روایات گو اعلی درجہ کی نہیں،مگر معاملہ حدود کا ہے،جس میں احتیاط ضروری ہے۔حدیث میں ہے:''ادرءُوا الحدودَ عن المسلمین ما استطعتُم، فإن كان له مَخْرَجٌ فَخَلُّوا سبيلَه، فإن الإمام أن يُخطِئَ في العفو خيرٌ من أن يُخطِئَ في العقوبة: جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں سے حدود کو ہٹاؤ،پس اگر مجرم کے لئے کوئی بچنے کی راہ ہو تو اس کو چھوڑ دو۔کیونکہ حاکم معاف کرنے میں غلطی کرے یہ بہتر ہے اس سے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۷۰) اس لئے احناف نے دس درہم نصاب تجویز کیا ہے (فائدہ تمام ہوا)

نقد کے ذریعہ نصاب سرقہ کی تعیین کی وجہ: اور نبی ﷺ نے چوتھائی دینار یا تین درہم کے ذریعہ نصاب سرقہ اس لئے متعین کیا کہ معمولی چیز اور قیمتی چیز میں تفریق ہو جائے۔ اس لئے کہ اجناس (اشیاء) کے ذریعہ اندازہ مقرر کرنے میں دشواری ہے۔ اجناس کے نرخ مختلف شہروں میں مختلف ہوتے ہیں۔ اور نفاست اور نکما ہونے میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ ایک چیز ایک قوم کے نزدیک یا ایک علاقہ میں معمولی اور مباح ہوتی ہے، وہی چیز دوسروں کے نزدیک یا دوسرے علاقہ میں پیارا مال ہوتی ہے۔ اس لئے نقد ہی کے ذریعہ اندازہ مقرر کرنا ضروری ہے۔ اور ایک رائے (امام احمد رحمہ اللہ کی) یہ ہے کہ نقد اور جنس (ڈھال) دونوں کا لحاظ کیا جائے۔ اور دوسری وجہ نقد سے تعیین نصاب کی یہ ہے کہ ہر جنس کے ذریعہ اندازہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً: سوختہ (جلانے کی لکڑی) چرانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا، چاہے اس کی مالیت دس درہم سے زیادہ ہو۔ حالانکہ لوگوں کے نزدیک اس کی اہمیت ہے۔ لوگ اس کو گھر میں بھر کر رکھتے ہیں۔ پس کس جنس کو معیار بنایا جائے؟ اس کی تعیین بھی دشوار ہے، اس لئے نقد ہی کو معیار بنانا ضروری ہے۔

حدیث —— (۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں کو چرانے کی وجہ سے، اور پہاڑ پر سے بکری چرانے کی وجہ سے ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ البتہ جب بکریاں باڑے میں آجائیں، اور پھل کھلیان میں جمع کر لئے جائیں، تو اب ان کو چرانے کی وجہ سے ہاتھ کاٹا جائے گا، بشرطیکہ چوری کی مقدار ڈھال کی قیمت کے بقدر ہو'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۹۵)

حدیث —— (۳) رسول اللہ ﷺ سے باغ میں سوکھنے کے لئے لٹکائے ہوئے پھلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو پھل میں سے کچھ چرائے ان کے کھلیان میں آجانے کے بعد، پس وہ ڈھال کی قیمت کے بقدر ہو، تو اس میں ہاتھ کاٹا جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۹۶)

تشریح: ان روایات میں نبی ﷺ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ چوری کا تحقق اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز محفوظ جگہ سے لی جائے۔ اسی صورت میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر محفوظ مال لینا سرقہ نہیں، بلکہ التقاط (پڑی چیز اٹھا لینا) ہے۔ پس اس سے احتراز ضروری ہے یعنی منفی پہلو سے سرقہ وہ ہے جو التقاط نہ ہو۔

حدیث —— (۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خیانت کرنے والے، مال لوٹنے والے، اور جھپٹا مار کر لینے والے کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۹۷)

تشریح: اس حدیث میں انتہاب واختلاس کی نفی کے ذریعہ نبی ﷺ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ چوری جب ہے کہ خفیہ طور پر مال لیا جائے، ورنہ لوٹنا اور جھپٹا مارنا ہے۔ اور خیانت کی نفی کے ذریعہ یہ بات سمجھائی ہے کہ اگر پہلے سے چرائے ہوئے مال میں شرکت ہو، اور حق ثابت ہو، تو وہ چوری نہیں۔ بلکہ خیانت یا اپنا حق وصول کرنا ہے، پس اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

روایت: ایک شخص اپنا غلام لیکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا: اس کا ہاتھ کاٹئے، اِس نے میری بیوی کا آئینہ چرایا ہے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: لاقطعَ علیه، وهو خادمکم، أخذ متاعکم: اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ وہ تمہارا خادم ہے۔ اس نے تمہارا سامان لیا ہے (مشکوۃ حدیث ۳۶۰۸)

تشریح: چونکہ عرف میں غلام کو گھر میں آنے کی اجازت ہوتی ہے، اس لئے گھر میں سے اس کا کوئی چیز لینا محفوظ جگہ سے لینا نہیں، پس اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کی چیز چرائیں تو بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ ایک دوسرے کی چیزوں میں بے تکلفی ہونے کی وجہ سے۔

فائدہ: خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ عرف میں جس کو چوری کہا جاتا ہے: وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے۔ اس کی تمام صورتوں میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ بلکہ حد شرعی صرف اس صورت میں نافذ کی جائے گی: جب سرقہ کی حقیقت پائی جائے، اور اس کی شرائط متحقق ہوں۔ اور وہ یہ ہیں:

۱۔ مالِ مسروقہ کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چرانے والے کی نہ اس میں ملکیت ہو، نہ ملکیت کا شبہ۔
۲۔ مال محفوظ ہو۔ مقفل ہو، یا ایسی جگہ ہو جہاں آنے کی اجازت ہو نہ لینے کی۔
۳۔ بے اجازت لے۔ اگر اجازت کا شبہ بھی پیدا ہو جائے گا تو حد جاری نہ ہوگی۔
۴۔ چپکے سے لے۔ علانیہ لینا سرقہ نہیں، غصب ہے۔
۵۔ قیمتی چیز لے۔ شرعاً یا عرفاً جو چیزیں معمولی سمجھی جاتی ہیں، ان کا لینا سرقہ نہیں۔
۶۔ بقدر نصاب چرائے۔ اس سے کم میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔

فائدہ: جن صورتوں میں چوری کی حد جاری نہیں ہوتی: اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجرم کو چھٹی مل گئی۔ بلکہ حاکم اپنی صوابدید کے مطابق اس کو تعزیری سزا دے گا۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ چیز اس کے لئے جائز وحلال ہوگئی۔ کسی کا کوئی بھی مال بے اجازت لینا حرام ہے۔

[۱۱] قال الله تعالى: ﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا، نَكَالاً مِّنَ اللهِ، وَاللهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

واعلم: أن النبي صلى الله عليه وسلم بُعث مُبَيِّنًا لِمَا أُنزل إليه، وهو قوله تعالى: ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ وكان أخذُ مالِ الغير أقسامًا: منه السرقة، ومنه قطع الطريق، ومنه الاختلاس، ومنه الخيانة، ومنه الالتقاط، ومنه الغصب، ومنه مايقال له: قلةُ المبالاة والورع، فوجب أن يُبَيِّنَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم حقيقةَ السرقة، متميزةً عن هذه الأمور.

وطـريقُ التميُّز : أن يُـنـظـر إلـى ذاتيـاتِ هـذه الأسـامي، التي لاتوجد في السرِقة، ويقع بها التـفـارق فـي عـرف الناس؛ ثم تُضبط السرقةُ بأمور مضبوطة معلومة، يحصل بها التمييز منها، والاحتراز عنها.

فـقـطـعُ الـطريق، والنهبُ، والحِرَابة: أسماءٌ تنبئُ عن اعتماد القوة بالنسبة إلى المظلومين، واختيارِ مكانٍ أو زمانٍ لايلحق فيه الغوثُ من جماعة المسلمين.

والاختلاس: ينبئُ عن اختطافٍ على أعين الناس، وفي مرأى منهم ومسمَعٍ.

والخيانة: تنبئ عن تقدُّم شركةٍ، أو مباسطةٍ وإذنٍ بالتصرف فيه، ونحو ذلك.

والالتقاط: ينبئ عن وجدانِ شيئٍ في غير حِرْزٍ.

والـغصب: ينبئ عن غلبة بالنسبة إلى المظلوم، لا معتمدًا على الحرب والهرب، ولكن على الجدل، وظنِّ أن لايُرفع قضيتُه إلى الولاة، ولاينكشف عليهم جليةُ الحال.

وقـلة الـمبـالاة والورع: يقال في الشيئ التافهِ، الذي جرى العرف ببذله، والمواساةِ به بين الناس. كالماء والحطبِ.

فضبط النبيُّ صلى الله عليه وسلم الاحترازَ عن ذاتياتِ هذه الأسامي:

[الف] قـال رسـول الله صـلـى الله عـليـه وسلم:" لاتُقطع يدُ السارق إلا في رُبع دينار" ورُوى القطعُ فيما بلغ ثمنَ المِجَنِّ؛ ورُوى أنه قَطع في مِجَنٍّ ثمنُه ثلاثةُ دراهم؛ وقطع عثمان رضي الله عنه في أُتْرُجَّةٍ ثمنها ثلاثةُ دراهم، من صرف اثنى عشر درهما.

والحاصل : أن هـذه التـقـديـراتِ الـثـلاث كانت منطبقة على شيئٍ واحد في زمانه صلى الله عليه وسلم، ثم اختلفت بعدَه، ولم يصلُح المِجَنُّ للاعتبار، لعدم انضباطه، فاختلف المسلمون فـي الـحـديثـين الآخـريـن: فـقـيـل: ربع دينار، وقيل: ثلاثةُ دراهم، وقيل: بلوغُ المالِ إلى أحدِ القدرين، وهو الأظهر عندي.

وهـذا شـرعـه الـنـبيُّ صلى الله عليه وسلم فرقًا بين التافه وغيره، لأنه لايصلُح للتقدير جنسٌ دون جـنـس، لاختـلاف الأسـعـار فـي البُـلدان، واختلافِ الأجناس نفاسةً وخَساسةً، بحسب اختـلاف البلاد، فمباحُ قومٍ وتافِهُهم مالٌ عزيز عند آخَرين، فوجب أن يُعتبر التقدير في الثمن، وقيل: يُعتبر فيهما؛ وأن الحطب وإن كان قيمتُه عشرةَ دراهم لايُقطع فيه.

[ب] وقـال صـلـى الله عـليـه وسـلـم:" لاقَطْعَ في ثمر معلَّق، ولا في حريسة الجبل، فإذا آواه

المُـراح والـجَرِيْنُ، فالقطع فيما بلغ ثمنَ المِجَنِّ" وسئل عن الثمر المعلّق، فقال عليه السلام: "من سرق منه شيئًا بعدَ أن يُؤْوِيَهُ الجرين، فبلغ ثمن المِجَنِّ فعليه القطع"

أقول: أفهـم النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن الحِرْزَ شرطُ القطع؛ وسببُ ذلك: أن غير المحرز يقال فيه الالتقاط، فيجب الاحتراز عنه.

[ج] قال صلى الله عليه وسلم: "ليس على خائن، ولا منتهب، ولا مختلس: قطع"

أقول: أفهـم الـنبيُّ صلى الله عليه وسلم أنه لابد فى السرقة من أخذ المال مختفيا، وإلا كان نُهبةً، أو خطفةً، وأن لايتقدمها شركةٌ، ولزومُ حق، وإلا كان خيانةً، أو استيفاءً لحقه.

وفى الآثار: فى العبد يَسْرِقُ مالَ سيده: إنما هو مَالُكَ: بعضُه فى بعض.

ترجمہ: اس عبارت کا شروع کا حصہ: قسم اول، مبحث ۶ باب ۱۳ رحمۃ اللہ (۲:۲۶۹-۲۷۶) میں گذر چکا ہے۔ وہاں ترجمہ ہے۔ ضرورت ہوتو وہاں دیکھ لیا جائے، باقی عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

پس نبی ﷺ نے ان ناموں کی ذاتیات سے احتراز کو منضبط کیا: (الف) اور ماحصل: یہ ہے کہ یہ تینوں اندازے ایک چیز پر منطبق تھے نبی ﷺ کے زمانہ میں۔ پھر وہ اندازے آپؐ کے بعد مختلف ہوگئے۔ اور ڈھال لحاظ کے قابل نہ رہی، اس کی قیمت کی تعیین نہ ہونے کی وجہ سے۔ پس مسلمانوں نے باقی دو حدیثوں میں اختلاف کیا: پس کہا گیا: چوتھائی دینار، اور کہا گیا: تین درہم، اور کہا گیا: مال مسروقہ کا دو اندازوں میں سے ایک کو پہنچنا۔ اور وہ میرے نزدیک زیادہ ظاہر ہے —— اور اس کو نبی ﷺ نے مشروع کیا: معمولی چیز اور اس کے علاوہ کے درمیان تفریق کرنے کے لئے۔ اور اس لئے کہ تقدیر کی صلاحیت نہیں رکھتی ایک جنس نہ کہ دوسری جنس، شہروں میں نرخوں کے اختلاف کی وجہ سے۔ اور اجناس کے اختلاف کی وجہ سے عمدہ اور نکما ہونے کے اعتبار سے، شہروں کے اختلاف کے اعتبار سے۔ پس ایک قوم کی مباح چیز اور ان کی معمولی چیز: پیارا مال ہے دوسروں کے نزدیک: پس ضروری ہوا کہ قیمت میں اندازے کا لحاظ کیا جائے۔ اور کہا گیا کہ دونوں باتوں میں لحاظ کیا جائے۔ اور اس لئے کہ جلانے کی لکڑی اگرچہ اس کی قیمت دس درہم ہو، اس میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا —— (ب) نبی ﷺ نے یہ بات سمجھائی کہ ہاتھ کاٹنے کے لئے حفاظت شرط ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر محفوظ: اس میں کہا جاتا ہے: پڑی چیز اٹھالینا۔ پس اس سے احتراز ضروری ہے —— (ج) نبی ﷺ نے سمجھایا کہ چوری میں ضروری ہے خفیہ طور پر لینا۔ ورنہ وہ لوٹنا یا جھپٹا مارنا ہوگا۔ اور یہ بات سمجھائی کہ مقدم نہ ہو شرکت اور حق کا لزوم، ورنہ وہ خیانت یا اپنا حق وصول کرنا ہوگا —— اور صحابہ کے اقوال میں ہے: اس غلام میں جو اپنے آقا کا مال چراتا ہے: وہ تیرا مال ہے: بعض در بعض (ترکیب: أن الحطب کا عطف لأنه لايصلح میں أنه پر ہے)

☆ ☆ ☆

ہاتھ کاٹنے کے بعد زخم داغنے کی وجہ

حدیث —— چور کا ہاتھ کاٹنے کے بارے میں نبی ﷺ سے مروی ہے کہ: ''اس کا ہاتھ کاٹو، پھر اس کو داغ دو''
(مشکوۃ حدیث ۳۶۰۴)

تشریح: ہاتھ کاٹنے کے بعد اگر زخم کو داغا نہیں جائے گا تو اندیشہ ہے کہ زخم سرایت کرے اور آدمی ہلاک ہو جائے۔ جبکہ ہلاک کرنا مقصود نہیں۔ اور زخم کو داغنا عدم سرایت کا سبب ہے۔ پس یہ سبب اختیار کیا جائے گا (بلکہ اب تو اس سے بہتر طریقے وجود میں آگئے ہیں۔ وہ اختیار کئے جائیں۔ خون کا دوران روک کر، جگہ سُن کر کے ہاتھ کاٹا جائے۔ پھر علاج کر کے اچھا ہونے کے بعد رخصت کیا جائے)

کٹے ہوئے ہاتھ کا ہار پہنانے کی وجہ

حدیث —— نبی ﷺ کے پاس ایک چور لایا گیا۔ پس اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر نبی ﷺ نے حکم دیا کہ وہ ہاتھ اس کی گردن میں لٹکایا جائے (مشکوۃ حدیث ۳۶۰۵)

تشریح: یہ عمل دو مقاصد سے کیا گیا ہے: ایک: اس کے عمل کی تشہیر کرنے کے لئے، تاکہ لوگ جان لیں کہ وہ چور ہے۔ دوم: ظلماً ہاتھ کاٹنے اور سزا کے طور پر ہاتھ کاٹنے کے درمیان امتیاز کرنے کے لئے (مگر یہ حد کا جزء نہیں۔ تعزیر ہے اور قاضی کی صوابدید پر موقوف ہے)

نصاب سے کم چوری میں دُونا تاوان واجب ہونے کی وجہ

حدیث —— ابوداؤد (حدیث ۴۳۹۰) کے حوالے سے پہلے یہ حدیث آچکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے باغ میں لٹکائے ہوئے پھلوں کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''جو حاجت مند اپنے منہ سے کھائے، اور پلے میں نہ لے جائے اس پر کوئی سزا نہیں۔ اور جو اس میں سے کچھ لیکر باغ سے نکلے تو اس پر اس کا دُونا تاوان اور سزا ہے۔ اور جو کھلیان میں پہنچ جانے کے بعد پھل میں سے کچھ چُرائے، پس وہ ڈھال کی قیمت کے بقدر ہو تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا''

تشریح: دونا تاوان واجب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چور کو مالی اور بدنی سزا دیکر چوری سے روکنا ضروری ہے۔ کیونکہ کبھی مالی سزا: بدنی سزا سے زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ اور کبھی معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ پس دونوں سزاؤں کو جمع کیا گیا۔ کیونکہ اگر چوری کے بقدر تاوان واجب کرتے تو وہ کوئی سزا نہ ہوتی۔ اتنا ضمان تو بہرحال واجب ہے۔ اس لئے ایک گونہ اور بڑھایا، تاکہ وہ مالی سزا ہو، اور اس کو چوریاں کرنے سے روکے۔

فائدہ: اس حدیث میں عقوبت سے ہاتھ کاٹنا مراد نہیں ہے۔ بلکہ دوگنا تاوان ہی عقوبت ہے، اور عطف تفسیری

ہے۔ کیونکہ باغ سے چرانا مالِ محفوظ چرانا نہیں ہے۔

چوری کا اقرار کرنے والے کو رجوع کی تلقین کرنے کی وجہ

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک چور لایا گیا۔ جس نے اپنے طور پر چوری کا اقرار کیا۔ اور اس کے پاس چوری کا سامان نہیں پایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: "میرا خیال یہ ہے کہ تو نے چوری نہیں کی!" اس نے کہا: کیوں نہیں۔ آپؐ نے یہ بات دو بار یا تین بار دُوہرائی۔ اس نے ہر بار اقرار کیا۔ پس آپؐ نے حکم دیا، اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ پھر اس کو آپؐ کے پاس لایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ سے بخشش طلب کر اور توبہ کر!" اس نے کہا: میں اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ آپؐ نے تین بار فرمایا: "اے اللہ! اس کی توبہ قبول فرما!" (رواہ ابوداؤد والنسائی، جامع الاصول حدیث ۱۸۷۹)

تشریح: جو مجرم نادم ہو کر جرم کا اعتراف کرے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی حد کو دفع کرنے کے لئے حیلہ کیا جائے۔ کیونکہ ندامت اور توبہ سے اس کا گناہ معاف ہو گیا ہے، جیسا کہ باب کے شروع میں گذرا اور رجوع کی تلقین بھی ایک حیلہ ہے۔ جسے آپؐ نے اختیار فرمایا۔

[۱۲] وقال صلى الله عليه وسلم في سارق: " اقطعوه، ثم احسِمُوه"

أقول: إنما أمر بالحَسْم لئلا يَسْرِىَ فَيُهْلِكَ، فإن الحَسْمَ سببُ عدمِ السراية.

[۱۳] وأمر عليه السلام باليد، فَعُلِّقَتْ في عنق السارق.

أقول: إنما فعل هذا للتشهير، وليعلم الناس أنه سارقٌ، وفرقًا بين ما تُقطع اليدُ ظلما، وبين ما تُقطع حدًّا.

[۱٤] وقال صلى الله عليه وسلم في سرقة مادون النصاب: " عليه العقوبةُ وغرامةُ مثلَيْه"

أقول: إنما أمر بغرامة المثلين: لأنه لابد له من رَدْعٍ، وعقوبةٍ ماليةٍ وبدنيةٍ، فإن الإنسان ربما يرتدع بالمال أكثر من ألم الجسد، وربما يكون الأمر بالعكس، فجمع بين ذلك؛ ثم غرامةُ مثله يُجعل كأن لم يكن سرقٌ، وليس فيه عقوبةٌ، ولذلك زيدت غرامةٌ أخرى، لتكون مناقضةً لقصده في السرقة.

[۱۵] وأُتى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بِلِصٍّ، قد اعترف اعترافًا، ولم يوجد معه متاعٌ، فقال: " ما إِخَالُكَ سَرَقْتَ!" قال: بلى! فأعاد عليه مرتين أو ثلاثًا، فأمر به فقطع، وجيئ به، فقال: استَغْفِرِ اللّهَ! وتُبْ إليه!" فقال: أستغفر الله! وأتوب إليه! قال: " اللهم تب عليه!" ثلاثا.

أقول: السبب في ذلك: أن العاصىَ المعترفَ بذنبه، النادمَ عليه، يستحق أن يحتال في درء الحد عنه، وقد ذكرنا.

ترجمہ:(۱۲) داغنے کا حکم اس لئے دیا تاکہ زخم سرایت نہ کرے، پس وہ ہلاک ہوجائے۔ پس بیشک داغنا سرایت نہ کرنے کا سبب ہے ـــــ (۱۳) یہ عمل تشہیر کی غرض سے کیا ہے، اور تاکہ لوگ جان لیں کہ وہ چور ہے (عطف تفسیری ہے) اور امتیاز کرنے کے لئے کیا ہے: اس ہاتھ کے درمیان جو ظلماً کاٹا جاتا ہے، اور اس ہاتھ کے درمیان جو سزا کے طور پر کاٹا جاتا ہے ـــــ (۱۴) دُونے تاوان کا حکم اس لئے دیا کہ ضروری ہے چور کو باز رکھنا، اور مالی اور بدنی سزا دینا۔ پس انسان کبھی مال کے ذریعہ رکتا ہے: جسم کی تکلیف سے زیادہ۔ اور کبھی معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ پس دونوں کے درمیان جمع کیا گیا۔ پھر چوری کا ایک مانند تاوان: تو گویا اس نے چرایا ہی نہیں۔ اور اس میں کچھ سزا نہیں۔ اور اسی وجہ سے دوسرا تاوان زیادہ کیا، تاکہ وہ تاوان توڑنے والا یعنی روکنے والا ہو، اس کے چوری کے ارادہ کو ـــــ (۱۵) اس میں سبب یہ ہے کہ وہ گنہ گار جو اپنے گناہ کا اقرار کرنے والا ہو، اس پر نادم ہو، وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی حد کو دفع کرنے کا حیلہ کیا جائے۔ اور ہم یہ بات ذکر کرچکے ہیں۔

☆ ☆ ☆

راہ زنی کی سزا کا بیان

سورۃ المائدۃ آیت ۳۳ میں ارشاد پاک ہے: ''جو لوگ اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور ملک میں فساد (بدامنی) پھیلاتے ہیں: ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا سولی دیئے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور ان کے پیر مخالف جانب سے کاٹ دیئے جائیں، یا وہ زمین سے دور کردیئے جائیں یعنی قید کردیئے جائیں۔ یہ سزا ان کے لئے دنیا میں سخت رسوائی ہے۔ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے''

اس آیت کے تحت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے تین باتیں بیان کی ہیں: ۱ـــــ حِرابہ کے معنی، اور محاربہ اور مقاتلہ میں فرق ۲ـــ راہ زن کی سزا: چور کی سزا سے سخت ہونے کی وجہ ۳ـــ سزاؤں میں تقسیم ہے یا تخییر؟

حِرابہ کے معنی، اور محاربہ و مقاتلہ میں فرق

حرابہ: ان لوگوں کی بہ نسبت جن پر ظلم وعدوان واقع ہوا ہے: قتال ہی پر اعتماد کرنے والا ہے۔

وضاحت: حرابہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اور حَرْب سے ماخوذ ہے۔ جس کے اصلی معنی: سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: حَرَبْتُه ماله: میں نے اس کا مال چھین لیا۔ اور کہا جاتا ہے: حُرِبَ ماله: اس کا مال لوٹ لیا گیا۔ حَرْب: سَلْم کی ضد ہے۔ جس کے معنی ہیں: امن وسلامتی۔ پس محاربہ کے معنی ہیں: لوٹ کھسوٹ کرنا، اور بدامنی پھیلانا ـــــ اور مقاتلہ: قتل سے ہے، جس کے معنی ہیں: مارڈالنا ـــــ مگر محاربہ میں قتل کا مفہوم اور مقاتلہ میں مال لینے کا مفہوم بھی شامل

ہے۔ محاربہ میں بھی ان لوگوں کو قتل کرنے کی نوبت آتی ہے جن کو راہ زن لوٹتے ہیں۔ اور مقاتلہ خون ریزی کے لئے ہوتا ہے، گو کوئی قتل نہ ہو، اور اس میں ضمناً مالِ غنیمت بھی لوٹا جاتا ہے۔ پس آیت کریمہ میں جنگ جوئی کا بیان نہیں، بلکہ راہ زنی کا بیان ہے۔

راہ زن کی سزا: چور کی سزا سے سخت ہونے کی وجہ

راہ زن کی سزا: چور کی سزا سے سخت اس لئے تجویز کی گئی ہے کہ راہ زن اکادکا نہیں ہوتے۔ ان کا بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اور جہاں فسادیوں کا بھاری اجتماع ہو، کچھ لوگ درندہ خُو ضرور ہوتے ہیں۔ ان میں دلیری و بے باکی، مارکاٹ کا جذبہ اور سنگھٹن ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بے پرواہ ہو کر قتل وقتال اور لوٹ کھسوٹ کرتے ہیں۔ اور اس میں دو طرح سے چوری سے بڑی خرابی ہے۔

اول: مالدار: چور چکار سے تو اپنے اموال کی حفاظت کر سکتے ہیں، مگر راہ رَو: ڈاکوؤں سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتے، نہ اس جگہ اور اس وقت میں پولس اور مسلمان مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

دوم: چور کی بہ نسبت ڈاکو میں لوٹ کھسوٹ کا جذبہ سخت اور بھاری ہوتا ہے۔ کیونکہ ڈاکو جری اور قوی ہوتے ہیں۔ اور ان کا جتھا اور اتحاد واتفاق ہوتا ہے۔ اور چوری کرنے والوں میں یہ بات نہیں ہوتی — پس ضروری ہے کہ ڈاکوؤں کی سزا: چوروں کی سزا سے بھاری ہو۔

ڈاکوؤں کی سزاؤں میں تقسیم ہے یا تخییر؟

آیت کریمہ میں راہ زنوں کی چار سزائیں مذکور ہیں: ان کو قتل کیا جائے۔ سولی دی جائے۔ مخالف جانب سے ہاتھ پیر کاٹے جائیں۔ اور زمین سے دور کر دیئے جائیں: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک: قید کر دیئے جائیں، تا آنکہ توبہ کریں، اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: جلاوطن کئے جائیں۔

ان چاروں سزاؤں کے درمیان حرفِ أو لایا گیا ہے، جو تقسیم کار کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور چند چیزوں میں اختیار دینے کے لئے بھی۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک أو: تخییر کے لئے ہے۔ ان کے نزدیک: امام کو اختیار ہے: ڈاکوؤں کی قوت وشوکت اور جرم کی شدت وخفّت پر نظر کر کے جو مناسب سمجھے سزا دے۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ أو کے یہی حقیقی معنی ہیں۔ اور تمام کفارات میں أو کے یہی معنی مراد ہیں (نور الانوار ص ۱۲۵) پس راہ زنوں کی سزاؤں میں بھی یہی معنی لئے جائیں گے۔

اور باقی ائمہ کے نزدیک: أو تقسیم کار کے لئے ہے۔ پس اگر راہ زنوں نے صرف قتل کیا ہے، مال نہیں لوٹا تو ان کو قتل کیا جائے۔ اور اگر مال بھی لوٹا ہے تو ان کو سولی دی جائے۔ اور اگر صرف مال لوٹا ہے تو مخالف جانب سے ہاتھ پیر کاٹے

جائیں۔اور صرف ڈرایا دھمکایا ہے تو قید کیا جائے۔یا ملک بدر کیا جائے۔ان حضرات کی دلیل شانِ نزول کی روایت ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے(معارف القرآن ۳:۱۲۱)

اب حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی بات ملاحظہ فرمائیں:

اکثر مجتہدین کے نزدیک یہ سزائیں بالترتیب ہیں۔اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ صرف تین ہی وجوہ سے کسی مسلمان کا قتل جائز ہے۔پس جن راہ زنوں نے قتل کیا ہے یا مال بھی لوٹا ہے: ان کو تو قتل کیا جاسکتا ہے۔مگر باقی دو قسموں کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کی رائے تخییر کی ہے۔اور یہ رائے لفظ أو کے حقیقی معنی کے موافق ہے۔اور جمہور کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث کا آخری جملہ: المارق لدينه، المفارق للجماعة میں قتل کی دو علتوں کو جمع کیا گیا ہے۔اور ان میں سے ہر ایک مفید حکم ہے یعنی اس کی وجہ سے قتل کیا جاسکتا ہے۔المارق لدينه سے ارتداد، اور المفارق للجماعة سے محاربہ مراد ہے۔اور دونوں میں سے جو بھی علت پائی جائے۔قتل کرنا جائز ہوگا۔اور اس کی نظیر یہ حدیث ہے: لا يخرج الرجلان يضربان الغائط، كاشِفَيْن عن عورتهما، يتحدثان، فإن الله يمقت ذلك (مشکوۃ حدیث ۳۵۶ آداب الخلاء) یعنی ستر کھولنا بھی اللہ کی سخت ناراضگی کا سبب ہے، اور اس حالت میں باتیں کرنا بھی۔دونوں میں سے ایک بھی بات پائی جائے تو اس پر مقت مرتب ہوگا۔اسی طرح مذکورہ حدیث میں بھی ارتداد اور محاربہ: دونوں علتوں کو جمع کیا گیا ہے۔پس امام مالک رحمہ اللہ کی رائے اس حدیث سے رد نہیں ہوتی۔

[١٦] قال الله تعالى: ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ﴾ الآية.

أقول: الحرابةُ لاتكون إلا معتمِدَةً على القتال بالنسبة إلى الجماعة التي وقع العدوانُ عليها.

والسببُ في مشروعيةِ هذا الحدِّ أشدَّ من حد السرقة: أن الاجتماع الكثير من بني آدم لايخلو من أنفس تغلب عليهم الخصلة السبعية، لهم جرأة شديدة، وقتال، واجتماعٌ، فلا يبالون بالقتل والنهب، وفي ذلك مفسدةٌ أعظمُ من السرقة:

[الف] لأنه يتمكن أهل الأموال من حفظ أموالهم من السُّرَّاقِ، ولايتمكن أهل الطريق من التمنُّع من قطاع الطريق، ولايتيسر لِوُلاةِ الأمور وجماعة المسلمين نصرتُهم في ذلك المكان والزمان.

[ب] ولأن داعية الفعل من قطاع الطريق أشدُّ وأغلظ، فإن القاطع لايكون إلا جريءَ القلب قوي الجُثمان، ويكون فيما هنالك اجتماعٌ واتفاقٌ، بخلاف السراق: فوجب أن تكون عقوبتُه أغلظَ من عقوبته.

والأكثرون على أن الجزاء على الترتيب، وهو الموافقُ لقوله صلى الله عليه وسلم: "لايُقتل المؤمنُ إلا لإحدى ثلاث" الحديثَ. وقيل: على التخيير، وهو الموافقُ لكلمة: "أو".

وعندى: أن قوله صلى الله عليه وسلم: "المفارقُ للجماعة" يحتمل أن يكون قد جمع العلتين، والمرادُ: أن كلَّ علة تفيد الحكم، كما جمع النبيُّ صلى الله عليه وسلم بين العلتين، فقال: "لايخرج الرجلان، يضربان الغائط، كاشفين عن عورتهما، يتحدثان" فكشْفُ العورةِ سببُ اللعن، والتحديثُ في مثل تلك الحالة أيضًا سبب اللعن.

ترجمہ: (۱) حِرابة (لڑائی) نہیں ہوتا مگر اعتماد کرنے والا اقتال پر: اس جماعت کے تعلق سے جس پر عدوان (ظلم) واقع ہوا ہے یعنی جن کو لوٹا گیا ہے یعنی ڈاکو ہاتھ میں ریوالور لے کر لوٹتے ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پر تو قتل بھی کر دیتے ہیں — (۲) اور حدِ سرقہ سے سخت: اس حد کی مشروعیت کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں (فسادیوں) کا بھاری اجتماع خالی نہیں ہوتا ایسے لوگوں سے جن پر درندگی کی خُو غالب ہو۔ جن میں سخت بے باکی اور پکار اور اتحاد ہو۔ پس وہ قتل اور لوٹ کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور اس میں چوری سے بڑی خرابی ہے: — (الف) اس لئے کہ شان یہ ہے کہ مال والے چوروں سے اپنے مالوں کی حفاظت کرنے پر قادر ہیں۔ اور راستہ چلنے والے ڈاکوؤں سے بچاؤ کرنے پر قادر نہیں۔ اور معاملات کے ذمہ داروں کے لئے یعنی پولس کے لئے اور مسلمانوں کی جماعت کے لئے آسان نہیں ان کی مدد کرنا اس جگہ اور اس وقت میں — (ب) اور اس لئے کہ ڈاکوؤں میں عمل کا داعیہ زیادہ سخت اور زیادہ گاڑھا ہوتا ہے۔ پس بیشک ڈاکو نہیں ہوتا مگر دل کا بہادر اور جسم کا طاقتور۔ اور اس چیز میں جو وہاں ہوتا ہے یعنی ڈاکہ زنی میں اجتماع اور اتفاق ہوتا ہے، برخلاف چوروں کے یعنی ان میں یہ سب باتیں نہیں ہوتیں۔ پس ضروری ہے کہ ڈاکو کی سزا چور کی سزا سے زیادہ بھاری ہو — (۳) اور اکثر حضرات اس پر ہیں کہ سزا بالترتیب ہے۔ اور یہ رائے نبی ﷺ کے اس ارشاد کے موافق ہے (روایت بالمعنی لکھی ہے) اور کہا گیا: تخییر ہے۔ اور وہ لفظ أو کے موافق ہے — اور میرے نزدیک: یہ ہے کہ آپ کا ارشاد: المفارقُ للجماعة: احتمال رکھتا ہے کہ اس نے دو علتوں کو جمع کیا ہو۔ اور مراد یہ ہو کہ ہر علت مفیدِ حکم ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے دو علتوں کے درمیان جمع کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ "نہ نکلیں دو شخص، درانحالیکہ دونوں قضائے حاجت کے لئے جارہے ہوں، دونوں اپنے ستر کھولے ہوئے ہوں، دونوں باتیں کر رہے ہوں پس بیشک اللہ تعالیٰ اس کو سخت ناپسند کرتے ہیں" پس ستر کا کھولنا لعنت کا سبب ہے، اور اس جیسی حالت میں باتیں کرنا بھی لعنت کا سبب ہے (یہ ایک دوسری روایت کی طرف ذہن چلا گیا ہے یعنی اتقوا الملاعن الثلاثة إلخ کی طرف، جو مشکوٰۃ میں اس روایت سے اوپر ہی آئی ہے کیونکہ اس حدیث میں صرف مقت کا ذکر ہے، لعنت کا ذکر نہیں)

☆ ☆ ☆

شراب نوشی کا بیان

شراب کے مفاسد: دینی اور دنیوی

سورۃ المائدہ آیات ۹۰و۹۱ میں ارشاد پاک ہے: ''اے ایمان والو! خمر اور میسر (جوا) اور غیر اللہ کے لئے قربانی کے تھان اور فال کے تیر: گندی چیزیں، شیطانی کام ہیں، پس تم ان سے بچو، تاکہ تم کامیاب ہو۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ خمر اور میسر کے ذریعہ تم میں عداوت اور شدید بغض پیدا کرے، اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے، تو کیا تم باز آؤگے؟!'' (اے پروردگار! ہم ان سب چیزوں سے باز آگئے!)

تفسیر: دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی دو خرابیاں بیان فرمائی ہیں: دینی اور دنیوی:

دنیوی خرابی: شراب میں یہ ہے کہ شرابی لوگوں سے جھگڑتا، اور ان پر زیادتی کرتا ہے یعنی جب اس کی عقل ماری جاتی ہے تو وہ گالی گلوچ کرتا ہے۔ اور دنگا فساد مچاتا ہے۔ دوسروں کا مال ضائع کرتا ہے، اور کبھی نوبت قتل تک پہنچ جاتی ہے۔

اور دینی خرابی: شراب میں یہ ہے کہ شرابی نفس کے تقاضوں میں گھستا چلا جاتا ہے۔ اس کو نماز یاد رہتی ہے نہ وہ اللہ کو کرتا ہے۔ کیونکہ شراب سے وہ عقل ہی ناکارہ ہوجاتی ہے جو نیکیوں کی بنیاد ہے۔

ہر نشہ آور چیز حرام ہے

نشیلی چیزوں میں یہ خاصیت ہے کہ ان کا تھوڑا زیادہ کی دعوت دیتا ہے۔ جب اس کا چسکا پڑ جاتا ہے تو آدمی تھوڑے پر نہیں رُکتا۔ اس لئے سیاستِ ملیہ (مذہبی راہ نمائی) میں ضروری ہے کہ حرمت کا مدار ''نشہ آور'' ہونے پر رکھا جائے۔ اور جو بھی چیز نشہ آور ہو اس کو حرام قرار دیا جائے۔ اور قلیل وکثیر: ہر مقدار کو ناجائز ٹھہرایا جائے۔ حرمت کا مدار ''نشہ ہونے'' پر نہ رکھا جائے یعنی نشہ آور چیز کی اتنی مقدار کھانا پینا جس سے نشہ ہوجائے: اسی کو حرام نہ کیا جائے۔ یہ بات ملت کے مفاد میں نہیں ہے۔ چنانچہ درج ذیل احادیث میں شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا گیا ہے:

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أسکرَ کثیرُہ فقلیلُہ حرام: جس کی زیادہ مقدار نشہ کرے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۵)

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما أسکرَ الفَرْقُ منه فَمِلْءُ الکفِّ منه حرام: جس کا ایک فَرَق (تقریباً دس لیٹر) نشہ کرے اس کا چلّو بھر بھی حرام ہے (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۶)

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نشہ آور اور بدن سست کرنے والی چیز سے منع فرمایا (مشکوۃ حدیث ۳۶۵۰) یہ

حدیث ضعیف ہے)

خمر کیا چیز ہے؟

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’ہر نشہ آور چیز: خمر ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے‘‘ (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۸)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’خمر: ان دو درختوں سے ہے یعنی کھجور کا درخت اور انگور کا درخت‘‘ (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۴) بیان میں ان دو کی تخصیص اس وجہ سے کی ہے کہ عرب میں یہی دو شرابیں رائج تھیں۔

حدیث — رسول اللہ ﷺ سے شہد کی شراب کے بارے میں دریافت کیا گیا؟ آپؐ نے فرمایا: **کلُّ شراب أسکَرَ فهو حرام**: جو بھی شراب نشہ آور ہو: وہ حرام ہے (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۷)

حدیث — ایک شخص یمن سے آیا، اور اس نے مکئی کی شراب کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے پوچھا: ’’کیا وہ نشہ آور ہے؟‘‘ اس نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: ’’ہر نشہ آور چیز حرام ہے‘‘ (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۹)

تشریح: یہ روایات مستفیض (مشہور) ہیں۔ جو ہر نشہ آور چیز کو حرام قرار دے رہی ہیں۔ اور روایاتِ مشہورہ سے کتاب اللہ پر اضافہ جائز ہے (نورالانوار ص ۱۷۷ باب أقسام السنة) پس حنفیہ جو انگوری شراب اور دوسری شرابوں میں فرق کرتے ہیں: میں اس کی وجہ نہیں سمجھ سکا! جب خمر کی تحریم ان دو وجوہ سے نازل ہوئی ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں: تو یہ فرق بے معنی ہے۔ وہ مفاسد انگوری اور غیر انگوری شرابوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔

فائدہ: احناف نے نجاست، سزا اور کفر کے معاملات میں انگوری اور غیر انگوری شرابوں میں تین وجہ سے فرق کیا ہے:
اول: قرآن کریم نے لفظ خمر استعمال کیا ہے۔ اور خمر: لغت میں انگوری شراب ہی کو کہتے ہیں۔ اور احادیث نے دوسری شرابوں کو خمر کے ساتھ لاحق کیا ہے۔ پس ملحق اور ملحق بہ میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوم: دیگر شرابوں کی حرمت کی روایات: مشہور نہیں ہیں، بلکہ اخبار آحاد ہیں۔ پس ان سے کتاب اللہ پر زیادتی ان کے مرتبہ ہی میں درست ہے، قرآن کے مرتبہ میں درست نہیں۔ چنانچہ پینے کے معاملہ میں احناف نے کچھ فرق نہیں کیا۔ فتوی مطلقاً شراب کی حرمت پر ہے، خواہ کسی چیز کی ہو، فرق صرف ان امور میں کیا ہے جن میں احتیاط مطلوب ہے۔ سوم: مذکورہ روایات میں خمر کی حقیقت کا بیان ہے یا وہ الحاق کے لئے ہیں؟ احناف کے نزدیک: وہ سب روایات بیانِ الحاق کے لئے ہیں۔ خمر کی حقیقت (ماہیت) کے بیان کے لئے نہیں ہیں — ان تینوں باتوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

① — خمر کیا چیز ہے؟ خمر کے معنی ہیں: انگوری شراب۔ لسان العرب میں ہے: **الخَمْر: ما أسكَرَ من عصير العنب**: انگور کا وہ شیرہ جس میں نشہ پیدا ہو گیا ہو خمر ہے۔ اور امام لغت ابو حنیفہ دینوری نے جب کہا کہ خمر: غلّوں کی بھی ہوتی ہے، تو ابن سیدہ نے اس کی تردید کی: **قال: أظنه تَسَمُّحًا منه، لأن حقيقة الخمر إنما هي العنب، دون سائر**

الأشيـاء (لسان) ابن سیدہ نے کہا: میرے خیال میں یہ ابوحنیفہ دینوری کا تسامح ہے۔ اس لئے کہ خمر کے حقیقی معنی انگوری شراب ہی کے ہیں۔ دوسری چیزوں کی شرابیں خمر نہیں ہیں۔ اور سورۂ یوسف آیت ۳۶ میں ہے: ﴿قَالَ أَحَدُهُمَا: إِنِّيْ أَرَانِيْ أَعْصِرُ خَمْرًا﴾ یعنی ایک قیدی نے کہا: میں خواب میں خودکو دیکھتا ہوں کہ انگور نچوڑ رہا ہوں۔ اس آیت میں انگور پر خمر کا اطلاق کیا گیا ہے، کیونکہ وہ آئندہ خمر بننے والے ہیں۔ اور بلاقرینہ خمر سے انگور اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے، جب لفظ خمر انگوری شراب کے لئے خاص ہو۔ اور لسان العرب میں یہ واقعہ بھی مذکور ہے کہ ایک یمنی انگور لئے جارہا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا: کیا لے جارہا ہے؟ اس نے جواب دیا: خمر! یعنی انگور۔ اور عربی میں دوسری شرابوں کے لئے دوسرے الفاظ ہیں۔ مثلاً: سَکَر: کھجور کی شراب، بِتْع: شہد کی شراب۔ مِزْر: مکئی کی شراب، اسی طرح اور چیزوں کی شرابوں کے لئے بھی نام ہیں۔

پھر احادیث نے دیگر شرابوں کو اشتراک علت (نشہ) کی بنا پر خمر کے ساتھ لاحق کیا۔ اور سب کو حرام قرار دیا۔ اگر سب مسکرات خمر کا مصداق ہوتے تو ان روایات کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ قرآن کے مخاطب خالص عرب تھے۔ اور وہ اپنے محاورات سے پوری طرح واقف تھے۔ پس مختلف صحابہ کا مختلف شرابوں کے بارے میں حکم دریافت کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خمر کے حقیقی مصداق نہیں ہیں۔

(۲) — حدیث مشہور: وہ حدیث ہے جو دور صحابہ میں تو خبر واحد ہو، مگر زمانۂ تابعین میں اور اس کے بعد اس کے روایت کرنے والے اتنے ہوجائیں کہ ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا احتمال نہ رہے۔ اس کے بعد کی شہرت کا اعتبار نہیں۔ کیونکہ زمانۂ مابعد میں تو بیشتر اخبار آحاد مشہور ہوگئی تھیں، کوئی روایت خبر واحد باقی نہیں رہی تھی (نورالانوار ص ۱۷۶) اب آپ دیگر شرابوں کی حرمت کی روایات کا جائزہ لیں، صرف ایک روایت متفق علیہ ہے۔ باقی روایات مسلم شریف یا دیگر کتابوں کی ہیں۔ پس یہ روایات اخبار آحاد ہی ہیں۔ درجۂ شہرت کو نہیں پہنچیں۔

(۳) — اور دیگر شرابوں کی حرمت کی روایات بیانِ الحاق کے لئے ہیں: اُس کا قرینہ اُن روایات ہی میں ہے۔ مثلاً:

ا — حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن الخَمْر، والميسر، والكُوْبَة، والغُبَيْراء، وقال: كل مسكر حرام: نبی ﷺ نے خمر کی، میسر کی، سارنگی وغیرہ آلات غنا کی، اور مکئی کی شراب کی ممانعت فرمائی۔ اور فرمایا: "ہر نشہ آور چیز حرام ہے" (مشکوٰۃ ۳۶۵۲) خمر کے تذکرہ کے بعد مکئی کی شراب کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ لفظ خمر اس کو شامل نہیں۔

۲ — یہ حدیث ابھی گذری ہے کہ "خمر: ان دو درختوں یعنی کھجور اور انگور سے ہے" اس حدیث کا مقصد بھی کھجور کی شراب کو انگور کی شراب کے ساتھ ملانا ہے۔ احوالِ دیار کی بنا پر ان دو چیزوں کی تخصیص نہیں کی۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر میں یہ بات بیان کی ہے کہ جب خمر کی حرمت نازل ہوئی تو لوگوں میں پانچ چیزوں کی شراب کا رواج تھا: انگور، کھجور، گیہوں، جَو اور شہد کی شرابیں رائج تھیں (یعنی حرمت کا بیان اگرچہ خاص لفظ سے ہے، مگر حکم عام ہے۔ اور ان پانچ کی بھی

تخصیص نہیں:) الخمر ماخامر العقل: ہروہ شراب جوعقل کو چھپائے خمر کے حکم میں ہے (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۵)

قاعدہ: قرآن کریم میں جس لفظ کے ساتھ حکم بیان کیا جاتا ہے، اس کے ساتھ دوسری چیزوں کو لاحق کرنے کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ اقوی چیز کے لئے تو صراحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اہل لسان دلالۃ النص سے خود ہی سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے ماں باپ کو اُف کہنے کی ممانعت کی گئی، تو حرمتِ شتم وضرب کے لئے کسی صراحت کی ضرورت نہیں۔ یا جیسے اسی آیت میں انصاب کو نجس قرار دیا، تو اصنام کی حرمت کی صراحت ضروری نہیں، یا جیسے احصار (بیماری وغیرہ مانع پیش آنے کی صورت) میں احرام کھولنے کی اجازت دی، تو حَصَر (دشمن کے روکنے کی صورت) میں صراحت کی ضرورت نہیں۔ نبی ﷺ کا عمل ہی اس کے لئے کافی ہے۔

البتہ اضعف کو حکم میں شامل کرنے کے لئے صراحت ضروری ہے۔ جیسے زنا کی حرمت میں دواعی زنا کو شامل کرنے کے لئے صراحت ضروری ہے، اسی طرح دیگر شرابوں کو، جو خمر سے اضعف ہیں، خمر کے حکم میں شامل کرنے کے لئے صراحت ضروری ہے۔

خلاصہ کلام: احناف نے مذکورہ وجوہِ ثلاثہ کی وجہ سے انگوری اور غیر انگوری شرابوں کے احکام میں فرق کیا ہے: انگوری شراب کو نجاست غلیظہ قرار دیا ہے۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس کو رجس (گندگی) قرار دیا ہے۔ اور اس کے حلال ماننے والے کو کافر قرار دیا ہے، کیونکہ اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے۔ اور اس کا ایک قطرہ پینے پر بھی حد واجب ہے۔ اس میں علت (نشہ) کا اعتبار نہیں۔ اور دیگر شرابوں کی حرمت کا انکار کرنے والے کو گمراہ کہا ہے، اور ان میں حد اس وقت واجب ہوگی، جب ان سے نشہ آجائے۔ کیونکہ ان کی حرمت اخبار آحاد سے ثابت ہے۔ جو مفید ظن ہیں، یقین کا فائدہ نہیں دیتیں۔ اس لئے ان کا منکر گمراہ ہے۔ اور جس علّت کی بنا پر ان کو خمر کے ساتھ لاحق کیا گیا ہے: جب اس کا تحقق ہو: اس وقت حد جاری کی جائے گی۔

البتہ تناول (کھانے پینے) کے سلسلہ میں تمام منشیات کا ایک حکم ہے۔ فتوی اسی پر ہے کہ کسی بھی شراب کا ایک قطرہ پینا حرام ہے۔ احناف نے یہ فرق بر بنائے احتیاط کیا ہے: حد وغیرہ میں احتیاط کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں جس لفظ سے حرمت نازل ہوئی ہے، اس میں علت (نشہ) کا لحاظ نہ کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ملحق چیزوں میں علت کا لحاظ کیا جائے۔ اور تناول میں احتیاط کی بات یہ ہے کہ تمام منشیات کو مطلقاً حرام قرار دیا جائے۔

نوٹ: چونکہ یہ مسئلہ طلباء کے لئے مشکل تھا، اس لئے تفصیل کی گئی۔ ورنہ شاہ صاحب کے کلام کو سمجھنے کے لئے اتنی تفصیل کی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ مسئلہ آگے معیشت کے بیان میں بھی مسکرات کے باب میں آئے گا۔

[۱۷] قال الله تعالى: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ، وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ، وَعَنِ الصَّلَاةِ، فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُوْنَ؟﴾

أقول: بين الله تعالى أن في الخمر مفسدتين: مفسدةٌ في الناس: فإن شاربَها يُلاحي القومَ، ويَعْدُوْ عليهم، ومفسدة فيما يرجع إلى تهذيب نفسه: فإن شاربَها يغوص في حالة بهيمية، ويزول عقلُه الذي به قِوام الإحسان.

[۱۸] ولما كان قليلُ الخمر يدعو إلى كثيره: وجب عند سياسة الأمة: أن يُدار التحريمُ على كونها مسكرةً، لا على وجود السكر في الحال.

[۱۹] ثم بين النبي صلى الله عليه وسلم أن الخمر ما هي؟ فقال:" كل مسكر خمر، وكل مسكر حرام" وقال:" الخمر من هاتين الشجرتين: النخلةِ والعِنَبة" وتخصيصهما بالذكر: لِمَا كان حالُ تلك البلاد. وسئل عليه السلام عن المِزْرِ والبِتْعِ؟ فقال:" كل مسكر حرام" وقال صلى الله عليه وسلم:" ما أسكر كثيرُه فقليله حرام"

أقول: هذه الأحاديث مستفيضة، ولا أدري أيُّ فرقٍ بين العنبيِّ وغيرِه؟ فلأن التحريم ما نزل إلا للمفاسد التي نص القرآن عليها، وهي موجودةٌ فيها وفيما سواها سواءً.

ترجمہ: (۱۷) اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ شراب میں دوخرابیاں ہیں (یہی دونوں خرابیاں جوے میں بھی ہیں) ایک خرابی: لوگوں میں (رونما ہونے والی ہے) پس بیشک شرابی لوگوں سے جھگڑتا ہے، اوران پر زیادتی کرتا ہے۔ اور دوسری خرابی: اس چیز میں (رونما ہوتی ہے) جو اس کے نفس کو سنوارنے کی طرف لوٹتی ہے یعنی اس کی دینی حالت خراب کردیتی ہے۔ پس بیشک شرابی بہیمی حالت میں گھستا ہے، اور اس کی وہ عقل زائل ہوجاتی ہے جس کے ذریعہ نیکوکاری کا وجود ہوتا ہے —— (۱۸) پھر جب تھوڑی شراب: زیادہ شراب کی طرف بلایا کرتی تھی تو امت کے نظم وضبط کے وقت ضروری ہوا کہ تحریم اس کے نشہ آور ہونے پر دائر کی جائے، نہ کہ فی الحال نشہ پائے جانے پر —— (۱۹) پھر نبی ﷺ نے بیان کیا کہ خمر کیا چیز ہے؟ پس فرمایا: ''ہر نشہ آور خمر ہے، اور ہر نشہ آور حرام ہے'' اور فرمایا: ''خمر ان دو درختوں سے ہے یعنی کھجور اور انگور کے درخت'' اور بیان میں ان دو درختوں کی تخصیص: اس حالت کی وجہ سے کی ہے جو ان بلاد کی تھی۔ اور نبی ﷺ سے مکی کی شراب اور شہد کی شراب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''ہر نشہ آور حرام ہے'' —— میں کہتا ہوں: یہ حدیثیں مستفیض ہیں۔ اور میں نہیں جانتا کہ کیا فرق ہے انگوری شراب اور اس کے علاوہ کے درمیان؟ پس اس لئے کہ تحریم نہیں نازل ہوئی، مگر ان مفاسد کی وجہ سے جن کی قرآن نے صراحت کی ہے۔ اور وہ مفاسد انگوری شراب میں اور اس کے علاوہ میں یکساں موجود ہیں (لَاحَاہ مُلَاحَاۃً وَلِحَاءً: جھگڑا کرنا)

تصحیح: آخری جملہ مطبوعہ میں موجودة فيهما وفيما سواهما سواءٌ: تثنیہ کی ضمیروں کے ساتھ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔

شرابی شرابِ جنت سے محروم!

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں شراب پی، اور وہ اس حال میں مرا کہ شراب کا عادی تھا۔ توبہ نہیں کی تھی تو وہ آخرت میں شراب نہیں پیئے گا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۶۳۸)

تشریح: شرابی شرابِ جنت سے محروم تین وجوہ سے ہوگا:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ شرابی جنت کی سبھی نعمتوں سے محروم ہوگا۔ اس کو جنت میں دخولِ اوّلی نصیب نہیں ہوگا۔ کیونکہ جنت اور اس کی نعمتیں متقیوں کے لئے ہیں۔ جو شخص نفس کے تقاضوں کی پیروی کرتا ہے، اور نیکوکاری سے اعراض کرتا ہے: اس کا جنت کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں۔ اور حدیث شریف میں کلی حکم بصورتِ جزئی بیان کیا گیا ہے۔ شراب پینے، اس کا عادی ہونے، اور اس سے توبہ نہ کرنے کو بہیمیت میں غوطہ زنی کی علامت قرار دیکر اس پر حکم مرتب کیا گیا ہے۔ یہی حکم ہر مرتکبِ کبیرہ کا ہے۔ اور جنت کی نعمتوں میں سے ''شراب'' کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ مخمور جان لے کہ وہ دنیا کی گندی شراب پی کر جنت کی کیسی ستھری نعمت سے محروم ہوگیا!

دوسری وجہ: یہ ہے کہ جو شخص نفس کے تقاضے سے کسی خاص گناہ میں منہمک رہتا ہے، اور اس کی لذت سے سرشار رہتا ہے۔ مثلاً شراب کا عادی ہے۔ یا زنا کا خوگر ہے اور یہی تصورات ہر وقت اس کے دماغ پر چھائے رہتے ہیں۔ اور اچھے خیالات کے لئے اس کے دماغ کے تمام دریچے بند ہوجاتے ہیں۔ تو جب وہ مرتا ہے تو بھی یہی صورتِ حال باقی رہتی ہے۔ اس کو دنیا کی گندی شراب کا تصور ہی گھیرے رہتا ہے۔ جنت کی پاکیزہ شراب کا اسے خیال ہی نہیں آتا، اس لئے وہ اس سے محروم رہتا ہے۔

تیسری وجہ: یہ ہے کہ آخرت کی جزاء میں مماثلت ملحوظ رہتی ہے۔ اور مماثلت مثبت پہلو سے یہ ہے کہ جو کرے وہ پائے۔ غریبوں کو کھلایا پلایا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی نعمتیں ملیں گی۔ اور منفی پہلو سے مماثلت یہ ہے کہ وہ گناہ کے مماثل (ہم شکل) نعمتوں سے محروم رہے گا جبکہ وہ ان نعمتوں کا محتاج اور شدید مشتاق ہوگا۔ پس جس نے دنیا میں شراب پی کر اللہ کی نافرمانی کی اس کی سزا یہی ہے کہ آخرت میں جب وہ جنت کی شراب کا محتاج اور بے حد مشتاق ہو اس نعمتِ بے بہا سے محروم رکھا جائے۔

> [۲۰] قال صلى الله عليه وسلم: "من شرب الخمر فى الدنيا، فمات وهو يُدْمِنُها لم يَتُبْ: لم يَشْرَبْهَا فى الآخرة"
>
> أقول: وسبب ذلك: أن الغائصَ فى الحالة البهيمية، والمُدْبِرَ عن الإحسان: ليس له فى لذات الجنان نصيب، فَجُعل شربُ الخمر وإدمانها، وعدمُ التوبة منها: مظنةً للغوص، وأدير

الحكمُ عليها؛ وخَصَّ من لذاتِ الجنانِ الخمرَ، ليظهر تخالف اللذتين بادى الرأى.

وأيضًا: إن النفس إذا انهمكتْ في اللذة البهيمية في ضمن فعلٍ: تمثَّل هذا الفعلُ عندها شَبَحًا لتلك اللذة، يتذكرها بتذكره، فلا يستحق أن تتمثل اللذةُ الإحسانية بصورتها.

وأيضًا: فأمر الجزاءِ على المناسبة، فمن عصى بالإقدام على شيئ، فجزاؤه أن يؤلم بفقد مثلِ تلك اللذة، عند طلبه لها، واستشرافه عليها.

ترجمہ: اس کا (شراب جنت سے محرومی کا) سبب یہ ہے کہ بہیمی حالت میں غوطہ لگانے والا، اور نیکوکاری سے پیٹھ پھیرنے والا: اس کے لئے جنتوں کی لذتوں میں کوئی حصہ نہیں (یعنی کسی بھی مرتکب کبیرہ کو جنت میں دخولِ اوّلی نصیب نہیں ہوگا) پس شراب کا پینا، اور اس کا عادی ہونا، اور اس سے توبہ نہ کرنا: (بہیمیت میں) غوطہ لگانے کی احتمالی جگہ قرار دیا گیا۔ اور اس مظنہ پر حکم دائر کیا گیا (یعنی اس جزئی کی صورت میں کلی حکم بیان کیا گیا پس جب شرابی کو جنت میں داخلہ ہی نہیں ملے گا تو وہ جنت کی ساری ہی نعمتوں سے بشمول شراب محروم ہوگا) اور جنتوں کی لذتوں میں سے شراب کو خاص کیا گیا تاکہ سرسری نظر ہی میں ظاہر ہو دونوں لذتوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا — اور نیز: جب نفس منہمک ہوتا ہے بہیمی لذتوں میں کسی فعل کے ضمن میں (مثلاً شراب یا زنا سے لطف اندوز ہوتا ہے) تو وہ فعل نفس کے پاس متمثل ہوتا ہے اس لذت کا پیکر محسوس اختیار کرنے کے طور پر، اس بہیمی لذت کو اس فعل کے یاد کرنے کے ذریعہ یاد کرتا ہے (یعنی وہی گناہ اور اس کا مزہ اس پر چھایا رہتا ہے، دنیا میں بھی اور مرنے کے بعد بھی) پس وہ شخص مستحق نہیں کہ نیکوکاری کی لذت اس کی صورت کے ساتھ متمثل ہو یعنی جنت کی شراب اور اس کی لذت سے آشنا ہو —— اور نیز: پس جزاء کا معاملہ مناسبت پر ہے، پس جو شخص کسی گناہ پر اقدام کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کی جزاء یہ ہے کہ وہ تکلیف دیا جائے اس لذت کے مانند کے فقدان کے ذریعہ، آدمی کے اس لذت کو طلب کرنے کے وقت، اور آدمی کے اس لذت کی طرف جھانکنے کے وقت یعنی جب شرابی کو آخرت میں شراب جنت کی حاجت ہوگی اور وہ اس کا مشتاق ہوگا تو شراب طہور سے محروم رکھا جائے گا، یہی منفی پہلو سے اس کے گناہ کی مماثل سزا ہے۔

تصحیح: قوله: يتذكرها بتذكره: تمام نسخوں میں بتذكرها ضمیر مؤنث کے ساتھ تھا۔ تصحیح میں نے کی ہے۔ کیونکہ ضمیر الفعل کی طرف عائد ہے۔

☆ ☆ ☆



شرابی کو جہنمیوں کی پیپ پلانے کی صورت

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے خود ہی یہ عہد و پیمان کیا ہے کہ جو شخص نشہ آور چیز پیئے



گا: اس کو زہر آلود مٹی پلائیں گے۔ اور زہر آلود مٹی: دوزخیوں کا دُھوَن ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۹)

تشریح: انسانوں کے نزدیک سیّال چیزوں میں پیپ اور خون: قبیح ترین اور بدترین چیزیں ہیں۔ طبائع سلیمہ ان سے سخت نفرت کرتی ہیں۔ اور شراب بھی ایک سیال چیز ہے۔ پس اس کے مناسب سزا زہرناک مٹی ہے، جو پیپ کی صورت میں نمودار ہوگی۔ اور وہ مٹی اِس صورت میں اُس وجہ سے ظاہر ہوگی جو منکر نکیر کے نیلی پیلی آنکھوں کے ساتھ مقبور کے سامنے آنے کی روایت میں بیان کی گئی ہے کہ عربوں کو نیلا رنگ ناپسند تھا۔ اس لئے فرشتے اس نامانوس صورت میں نمودار ہوں گے۔ اسی طرح انسانوں کو بھی پیپ اور خون سے نفرت ہے، اس لئے وہ زہرناک مٹی اس صورت میں نمودار ہوگی۔ اور یہ بات کتاب کی قسم اول، مبحث ثانی، باب چہارم (رحمۃ اللہ ۱:۲۰۶) میں گذر چکی ہے کہ آخرت میں واقعات تمثیلی رنگ میں ظاہر ہوں گے، جیسے خواب میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پس دنیا کی شراب آخرت میں جہنمیوں کے زخموں کی دھوَن کی صورت میں متمثل ہوگی۔ أعَاذَنَا اللّٰهُ منها!

[۲۱] قال صلى الله عليه وسلم: "إن على الله عهدًا لمن يشربُ المُسْكِرَ: أن يسقِيَه من طِينَةِ الخَبال؛ وطينةُ الخبال: عُصارةُ أهل النار"

أقول: السر في ذلك: أن القَيْحَ والدمَ أقبحُ الأشياء السيَّالة عندنا، وأحقرُها، وأشدُّها نفرةً بالنسبة للطبائع السليمة؛ والخمرُ شيئٌ سيَّال، فناسب أن يتمثل مقرونا بصفة القَيْح في صورة طينة الخبال؛ وذلك كما قالوا في المنكر والنكير: إنهما إنما كانا أزرقين: لأن العرب يكرهون الزُّرْقَةَ؛ وقد ذكرنا أن بعضَ الوقائع الخارجية بمنزلة المنام في ذلك.

ترجمہ: (۲۱) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ کے ذمّے اس شخص کے لئے عہد ہے جو نشہ آور چیز پیتا ہے کہ اللہ اس کو زہرناک مٹی پلائیں۔ اور زہر آلود مٹی: دوزخیوں کا نچوڑ ہے'' ——— میں کہتا ہوں: اس میں راز یہ ہے کہ پیپ اور خون ہمارے نزدیک یعنی انسانوں کے نزدیک سیّال چیزوں میں: قبیح ترین اور بدترین چیزیں ہیں۔ اور طبائع سلیمہ کے تعلق سے شدید ترین نفرت کی چیزیں ہیں۔ اور شراب ایک سیال چیز ہے۔ پس مناسب ہے کہ وہ متمثل ہو زہرناک مٹی کی صورت میں، پیپ کی صفت کے ساتھ۔ اور یہ بات ویسی ہی ہے جیسی لوگ کہتے ہیں یعنی علماء بیان کرتے ہیں منکر نکیر کے بارے میں کہ وہ دونوں نیلی پیلی آنکھوں والے اس لئے ہوں گے کہ عرب نیلا رنگ ناپسند کرتے ہیں۔ اور ہم نے یہ بات ذکر کی ہے کہ بعض خارجی واقعات اس معاملہ میں بمنزلۂ خواب کے ہوتے ہیں۔

لغات: الطِينَة: اتنا گارا جو ہاتھ میں اٹھایا جائے ..... الخَبَال: زہرناک ..... طينةُ الخبال: اضافت بیانیہ ہے۔

☆ ☆ ☆

شرابی کی نماز قبول نہ ہونے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے شراب پی: اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہیں فرماتے۔ پس اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ پھر اگر اس نے دوبارہ پی: تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہیں فرماتے، پس اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ پھر اگر اس نے سہ بارہ پی: تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہیں فرماتے۔ پس اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔ پھر اگر اس نے چوتھی بار پی: تو اللہ تعالیٰ چالیس دن تک اس کی کوئی نماز قبول نہیں فرماتے، پس اگر وہ توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول نہیں فرماتے، اور اس کو زہرناک نہر سے پلائیں گے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۳)

تشریح: نماز کا قبول نہ ہونا: نماز کا اس کے حق میں نفع بخش نہ ہونا ہے۔ جس طرح صاف برتن پر قلعی کھلتی ہے، اور میلے برتن پر کارگر نہیں ہوتی۔ اسی طرح نیکوکاری کی حالت میں عبادت سودمند ہوتی ہے۔ اور نفس کے گندہ ہونے کی حالت میں نفع بخش نہیں ہوتی۔ پس جب آدمی معصیت پر مثلاً شراب پینے پر اقدام کرتا ہے، اللہ کے سامنے بے باکی اور دلیری دکھاتا ہے، اور اس کا نفس رذیل حالت میں غوطہ زن ہوتا ہے تو بہیمیت کا ملکیت پر غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور نفس کی حالت بگڑ جاتی ہے۔ بدکاری کی یہ حالت نیکوکاری کی حالت کی ضد اور اس کے منافی ہے۔ اس لئے جس طرح نیکوکاری کی حالت میں نماز وغیرہ عبادات سودمند ہوتی ہیں، اور دوسری نیکیوں کا شوق پیدا کرتی ہیں: تلویثِ نفس کی اس حالت میں اثر نہیں کرتیں۔ اور جب تک نفس کی یہ حالت رہتی ہے: یہی صورتِ حال باقی رہتی ہے۔ اور نفس کی یہ کیفیت بہت دنوں تک (چالیس دن تک) باقی رہتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ نمازوں کے اثر سے یہ حالت بدل جاتی ہے، اور نماز نفع بخش ہونے لگتی ہے۔ البتہ اگر اس گناہ سے توبہ کرلے تو جلد گناہ کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اور نماز قبول ہونے لگتی ہے۔ اور بار بار توبہ کرنا اور گناہ کرنا ایک کھیل ہے یا اس میں کھیل کا احتمال ہے، اس لئے توبہ قبول نہیں ہوتی۔

[۲۲] وقال صلى الله عليه وسلم: " من شرب الخمر، لم يقبل اللهُ له صلاةً: أربعين صباحًا، فإن تاب تاب الله عليه"

أقول: السر في عدم قبول صلاته: أن ظهورَ صفة البهيمية، وغلبتَها على الملكية، بالإقدام على المعصية، اجْتِرَاءً على الله، وغوصَ نفسه في حالة رذيلة: تنافي الإحسان وتُضادُّه، ويكون سببًا لفقد استحقاقِ أن تنفع الصلاةُ في نفسه نفعَ الإحسان، وأن تنقاد نفسُه للحالة الإحسانية.

ترجمہ: شرابی کی نماز قبول نہ کرنے میں راز یہ ہے کہ صفت بہیمیت کا ظہور، اور ملکیت پر اس کا غلبہ، گناہ پر اقدام

کرنے کی وجہ سے، اللہ کے سامنے دلیری کرتے ہوئے، اور رذیل حالت میں نفس کے غوطہ لگاتے ہوئے: نیکوکاری کے منافی اور اس کے مخالف ہے۔ اور یہ ظہور سبب ہوجاتا ہے اس بات کے استحقاق کے فقدان کے لئے کہ نماز نفع بخش ہو اس کی ذات میں: نیکوکاری کے نفع کی طرح، اور اس بات کے استحقاق کے فقدان کے لئے کہ اس کا نفس تابعداری کرے نیکوکاری کی حالت کی یعنی اس میں نیک کاموں کا شوق ہی باقی نہیں رہتا۔

☆ ☆ ☆

شراب نوشی کی سزا دوسری سزاؤں سے ہلکی ہونے کی وجہ

حدیث — نبی ﷺ کی خدمت میں شراب پیا ہوا شخص لایا جاتا تو آپ فرماتے: ''اس کو مارو'' چنانچہ کوئی چپلوں سے مارتا، کوئی چادروں سے، اور کوئی ہاتھ سے، یہاں تک کہ مار چالیس تک پہنچتی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اس کو سرزنش کرو'' پس لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے، اور کہنے لگے: تو اللہ سے نہیں ڈرا! تو نے اللہ کا خوف نہیں کھایا! تجھے رسول اللہ ﷺ کی شرم نہیں آئی! یہاں تک کہ ایک نے کہا: تجھے اللہ رسوا کریں! آپؐ نے فرمایا: ''ایسا مت کہو، اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو، بلکہ کہو: اے اللہ اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ اس پر رحم فرما! (مشکوۃ حدیث ۳۶۲۱)

حدیث — ایک اور روایت میں اس مضمون کے بعد ہے: ''پھر رسول اللہ ﷺ نے زمین سے مٹی لی اور اس کے منہ پر پھینکی'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۲۰)

تشریح: شراب نوشی کی سزا دوسری سزاؤں سے ہلکی: اس لئے ہے کہ دیگر حدود میں خرابی بالفعل پائی جاتی ہے: چوری، راہ زنی اور اتہام سرِ دست پایا جاتا ہے۔ اور شراب نوشی میں فساد کا احتمال ہوتا ہے کہ شرابی نشہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھے۔ اس لئے اس کی سزا سو کوڑوں سے ایک خمس کم کردی گئی۔

اور دورِ نبوی میں چالیس مرتبہ ہی اس لئے مارا جاتا تھا کہ شراب نوشی: تہمت لگانے کی احتمالی جگہ تھی۔ اور احتمالی جگہ میں واقعی تہمت لگانے کی آدھی سزا ہی مناسب ہے۔ پھر جب خرابی بڑھ گئی یعنی نئے ایمان لانے والوں میں شراب نوشی کا رجحان بڑھتا نظر آیا، تو صحابہ نے اسّی کوڑے سزا تجویز کی۔ دورِ فاروقی میں اس سلسلہ میں مشورہ کیا گیا تو دو باتیں سامنے آئیں: ایک: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جو سب سے ہلکی سزا ہے، وہ دی جائے۔ کیونکہ شراب نوشی کی سزا قرآن میں منصوص نہیں۔ پس اس کو منصوص سے نہیں بڑھانا چاہئے۔ دوسری بات: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہی کہ شرابی جب مخمور ہوتا ہے تو اُول فول بکتا ہے، اور کبھی نوبت تہمت لگانے کی بھی آجاتی ہے، لہٰذا اس کو اسّی کوڑے مارے جائیں۔ یہ دونوں مشورے ایک بات پر متفق تھے کہ شرابی کو اسّی کوڑے مارے جائیں۔ اختلاف صرف تخریج میں تھا۔ چنانچہ دورِ فاروقی سے یہی سزا باجماعِ امت جاری ہوگئی۔ اور سرزنش: سزا کے ساتھ ملامت کو جمع کرنے کے لئے ہے،

جیسا کہ پہلے گذرا۔

فائدہ: اب اس مسئلہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا ذرا سا اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شراب نوشی کی حد تو چالیس دُرّے ہی ہے۔ باقی چالیس تعزیر ہیں۔ اور قاضی کی صوابدید پر موقوف ہیں۔ اور دیگر ائمہ کے نزدیک اسّی کے اسّی حد ہیں، ان میں کمی کرنا جائز نہیں۔

[۲۳] وكان الشاربُ يؤتى به إلى النبي صلى الله عليه وسلم، فيأمر بضربه، فَيُضرب بالنعال والأردية واليد حتى يبلغ أربعين ضربةً، ثم قال:" بَكِّتُوْه!" فأقبلوا عليه، يقولون: ما اتَّقَيْتَ الله! ما خشيتَ الله! ما اسْتَحْيَيْتَ من رسول الله صلى الله عليه وسلم! ورُوِى أنه صلى الله عليه وسلم أخذ ترابا من الأرض، فرمى به في وجهه.

أقول: السبب في نقصان هذا الحد بالنسبة إلى سائر الحدود: ان سائر الحدود لوجود مفسدةٍ بالفعل: أن يكون سرق متاعًا، أو قطع الطريق، أو زنى، أو قذف؛ وأما هذا: فقد أتى بمظنة الفساد، دون الفساد، فلذلك نُقص عن المائة.

وإنما كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يضرب أربعين: لأنه مظنة القذف؛ والمظنةُ ينبغي أن تكون أقلَّ من نفس الشيئ بمنزلةِ نصفه.

ثم لما كثر الفسادُ جَعل الصحابةُ رضي الله عنهم حدَّه ثمانين: لأنه أخفُّ حدٍ في كتاب الله، فلايُجَاوَزُ غيرُ المنصُوص عن أقل الحدود؛ وإما لأن الشارب يقذف غالبًا، إن لم يكن زنى، أو قتل، والغالبُ حكمُه حكمُ المتيقن؛ وأما سر التبكيت: فقد ذكرنا من قبلُ.

ترجمہ: اور شرابی نبی ﷺ کے پاس لایا جاتا۔ پس آپؐ اس کو مارنے کا حکم دیتے۔ پس وہ چپلوں، چادروں اور ہاتھ سے مارا جاتا۔ یہاں تک کہ مار چالیس بار کو پہنچتی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اس کو خوب ڈانٹو!'' پس لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے، کہہ رہے ہیں: ''تو اللہ سے نہیں ڈرا! تو نے اللہ کا خوف نہیں کھایا! تو رسول اللہ ﷺ سے نہیں شرمایا'' یعنی تو نے شراب پیتے وقت یہ نہیں سوچا کہ تجھے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ تو آپؐ کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا! اور روایت کیا گیا کہ آپؐ نے زمین سے مٹی لی، اور اس کے منہ پر ماری!

میں کہتا ہوں: دیگر حدود کی بہ نسبت اس حد کے کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دیگر حدود سرِ دست خرابی پائے جانے کی وجہ سے: بایں طور کہ اس نے کوئی سامان چرایا، یا راہ زنی کی، یا زنا کیا، یا تہمت لگائی، اور رہا یہ: پس وہ فساد کا احتمال لایا، نہ کہ فساد، پس اس وجہ سے حد سو سے کم کی گئی ـــــ اور نبی ﷺ چالیس ہی اس لئے مارتے تھے کہ شراب پینا تہمت لگانے کی

احتمالی جگہ ہے۔ اور احتمال: مناسب ہے کہ کم ہو نفس گناہ سے، اس کے آدھے کے بمنزلہ —— پھر جب فساد زیادہ ہو گیا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے شراب نوشی کی حد اسّی کر دی۔ اس لئے کہ وہ (اسّی درّے) اللہ کی کتاب میں سب سے ہلکی حد ہے۔ پس غیر منصوص حد: اقل حدود سے بڑھائی نہیں جائے گی۔ اور اس لئے کہ شرابی عام طور پر تہمت لگاتا ہے: اگر اس نے زنا نہیں کیا یا قتل نہیں کیا (تو کم از کم تہمت ضرور لگاتا ہے) اور غالب کا حکم متیقن کے حکم کی طرح ہے یعنی تہمت لگانا غالب ہے پس گویا واقعۃً تہمت لگائی۔ اور رہا سرزنش کرنے کا راز: تو ہم اس کو پہلے بیان کر چکے ہیں۔

ملحوظہ: قوله: أن سائر الحدود (إلى قوله) دون الفساد: یہ عبارت سب نسخوں میں اسی طرح ہے، اور صحیح ہے مگر اس میں تعقید ہے۔

☆ ☆ ☆

حدود میں سفارش ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث —— مکہ مکرمہ ابھی ابھی فتح ہوا تھا کہ قریش کی ایک عورت کی چوری پکڑی گئی۔ قریش نے سوچا: اگر آج قریشی عورت کا ہاتھ کٹ گیا تو سب کی ناک کٹ جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے اس معاملہ میں سفارش کروائی۔ آپؐ نے پہلے تو حضرت اسامہ کو ڈانٹا۔ اور فرمایا: أتشفع في حد من حدود الله! کیا تم حدودِ شرعیہ میں سفارش کرتے ہو! پھر عام خطاب فرمایا کہ: ''گذشتہ لوگ اسی وجہ سے ہلاک ہوئے کہ جب ان میں کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو اُسے چھوڑ دیتے۔ اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ قسم بخدا! اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا!'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۱۰)

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص جس کی سفارش حدود اللہ میں سے کسی حد میں رکاوٹ بنے: اس نے یقیناً اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی!'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۱۱)

تشریح: نبی ﷺ یہ بات جانتے تھے کہ شرفاء کے مرتبہ کا تحفظ، ان کے ساتھ چشم پوشی، ان کی طرف سے مدافعت، اور ان کے معاملہ میں سفارش: ایک ایسی بات ہے جس پر تمام قومیں متفق ہیں۔ اور اگلے پچھلے تمام ان کے لئے سفارش کرنے کے خوگر ہیں۔ مگر حدود کے معاملہ میں یہ باتیں مشروعیت حدود کے منافی ہیں۔ حدود ہر کہ ومہ پر جاری کرنی ضروری ہیں، جبھی ان کا فائدہ ہے، اس لئے آپؐ نے خطاب عام فرما کر لوگوں کو تاکید کی اور بات مضبوط کی کہ لوگ ایسا ہرگز نہ کریں۔

[۲٤] قال النبي صلى الله عليه وسلم: " إنما أهلك الذين قبلَكم: أنهم كانوا إذا سرق فيهم الشريف تركوه، وإذا سرق فيهم الضعيفُ أقاموا عليه الحدَّ، وأيم الله! لو أن فاطمةَ بنتَ محمدٍ سرقتْ لقطعتُ يدها!" وقال صلى الله عليه وسلم: " من حالتْ شفاعتُه دون حد من حدود الله،

فقد ضادَّ اللهَ!"

أقول: عَلِمَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن حِفظَ جاهِ الشرفاء، والمسامحةَ معهم، والذبَّ عنهم، والشفاعةَ في أمرهم: أمرٌ تواردَ عليه الأمم، وانقادَ لها طوائفُ الناس من الأولين والآخرين، فأكّدَ في ذلك وسَجَّلَ، فإن الشفاعةَ والمسامحةَ بالشرفاء مناقَضَةٌ لِشرْعِ اللهِ الحدودَ.

ترجمہ: واضح ہے۔ یہ خیال رہے کہ فتح مکہ تک آپؐ کی صاحبزادیوں میں سے صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حیات تھیں۔ دیگر بناتِ طیبات اس سے پہلے وفات پاچکی تھیں، اس لئے آپؐ نے ان کا نام لیا ہے۔ شیعوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ کی یہی ایک صاحب زادی تھی۔

☆ ☆ ☆

محدود کو لعن طعن کرنے کی ممانعت کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے محدود (جس پر حد جاری کی گئی) کو لعنت کرنے کی، اور اس کی برائی کرنے کی ممانعت فرمائی (اس سلسلہ میں متعدد روایات ہیں جو مشکوٰۃ کتاب الحدود باب مالایُدعی علی المحدود میں مذکور ہیں)

تشریح: محدود کو دو وجہ سے لعن طعن کرنا جائز نہیں:

پہلی وجہ: ایسا کرنے میں اندیشہ ہے کہ لوگ جرم کا اعتراف کرنے سے رُک جائیں، یہ خیال کرکے کہ بدنام ہونگے، اور لوگ برا کہیں گے۔ پس یہ بات مشروعیتِ حدود کے مناقض ہوگی۔

دوسری وجہ: حد کفارہ ہے یعنی حد جاری ہوجانے سے گناہ معاف ہوجاتا ہے۔ اور جب کسی گناہ کا کفارہ کے ذریعہ تدارک کردیا گیا تو وہ گناہ نہ رہا۔ پس اس پر لعن طعن کیسے روا ہوسکتا ہے؟! حضرت ماعز رضی اللہ عنہ پر حد جاری ہوجانے کے بعد: جب ان کو کسی نے کوسا تو آپؐ نے اس کو سخت ڈانٹا۔ اور فرمایا: "وہ اب جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے!" (مشکوٰۃ حدیث ۳۶۲۷) یعنی اللہ کے نزدیک اس کا گناہ معاف ہوگیا، مگر تیرے نزدیک وہ اب بھی مجرم ہے!

[۲۵] ونهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن لعن المحدود، والوقوعِ فيه، لئلا يكون سببًا لامتناع الناس من إقامة الحد، ولأن الحدَّ كفارةٌ، والشيئُ إذا تُدورِكَ بالكفارة صار كأن لم يكن؛ وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" والذى نفسى بيده! إنه الآن لفى أنهار الجنة، يَنْغَمِسُ فيها"

ترجمہ: اور رسول اللہ ﷺ نے محدود کو لعنت کرنے کی اور اس کی برائی کرنے کی ممانعت کی: (۱) تاکہ وہ لوگوں کے

لئے (اپنے نفس پر) حد قائم کرنے سے رکنے کا سبب نہ ہوجائے (۲) اور اس لئے کہ حد کفارہ ہے۔ اور جب کسی چیز کا کفارہ کے ذریعہ تدارک کرلیا گیا تو وہ چیز ایسی ہوگئی گویا باقی ہی نہیں۔ اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:......

☆ ☆ ☆

ارتداد اور بغاوت کی سزائیں

دو اور سزائیں حدود کے ساتھ ملائی گئی ہیں۔ یعنی وہ حدود اللہ تو نہیں ہیں، مگر حدود سے کم بھی نہیں ہیں۔ یہ سزائیں بھی لازماً دی جائیں گی۔ ایک: ملّت کی بے حرمتی یعنی ارتداد کی سزا۔ دوسری: امامت یعنی خلافتِ کبریٰ سے بغاوت کی سزا۔

ارتداد کی سزا کی بنیاد: رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''جو شخص اپنا دین یعنی دین اسلام بدل دے یعنی اس کو چھوڑ دے، اس کو قتل کردو'' (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۳۶۳۳)

تشریح: ارتداد کی یہ سزا اس لئے ہے کہ ملت کو چھوڑنے پر سخت نکیر ضروری ہے، ورنہ ملت کی بے حرمتی کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ دین سماوی لوگوں کے لئے اس فطری امر کی طرح ہوجائے، جس سے جدا نہیں ہوا جاتا۔ یعنی جو شخص اسلام قبول کرے وہ دل و جان سے قبول کرے۔ اور فطری امور کی طرح اس کو اپنائے رہے۔ پس جو اللہ کی مرضی کی خلاف ورزی کرے، وہ سخت سزا کا مستحق ہوگا۔

اور ارتداد کے تحقق کی صورتیں: یہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کا انکار کرنا (۲) رسولوں کا انکار کرنا (۳) نبی ﷺ کی تکذیب کرنا (۴) قصداً کوئی ایسا فعل کرنا جس سے دین کا کھلا استہزاء ہو (۵) دین کی موٹی موٹی باتوں کا انکار کرنا۔

دلائل: ارتداد کی پہلی تین صورتیں بدیہی ہیں۔ دلائل کی محتاج نہیں۔ چوتھی صورت کی دلیل یہ ہے:

سورۃ التوبہ آیت ۱۲ میں ارشاد پاک ہے: ''اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں، اور تمہارے دین میں طعن کریں تو تم کفر کے سرغنوں سے لڑو'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام پر طعن کرنے والا: اگر ذمی ہو تو اس کا عہد و پیمان ختم ہوجاتا ہے۔ اور مسلمان ہو تو اس کا قتل واجب ہے۔ یہی بات درج ذیل حدیث سے بھی ثابت ہوتی ہے۔

حدیث ــــ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودی عورت نبی ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ اور آپؐ کی برائی کیا کرتی تھی۔ ایک شخص نے اس کا گلا دبایا، یہاں تک کہ وہ مرگئی، پس نبی ﷺ نے اس کا خون رائگاں کردیا'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۵۵۰)

تشریح: دین اسلام پر طعن کرنے، نبی ﷺ کو گالیاں دینے، اور مسلمانوں کو برملا تکلیف پہنچانے کی وجہ سے اس عورت کا عقد ذمہ باطل ہوگیا۔ اور اس کو قتل کرنا جائز ہوگیا۔ اس لئے نہ اس کا قصاص دلوایا، نہ دیت ادا کروائی۔ یہی حکم مسلمان کا بھی ہے۔ اِس حرکت سے اس کا ایمان ہی ختم ہوجاتا ہے۔ اور اس کا قتل واجب ہوجاتا ہے۔

بلکہ درج ذیل حدیث میں تو مشرکین کے ساتھ اختلاط اور ان کی تعداد بڑھانے کو بھی ایک طرح سے ان کی مدد قرار دیا گیا ہے، اور مسلمانوں کو ان سے علحدہ رہنے کا حکم دیا ہے:

حدیث —— نبی ﷺ نے قبیلۂ خثعم کی طرف ایک سریہ بھیجا۔ جنگ شروع ہوئی تو کچھ لوگوں نے سجدہ کرکے اپنا بچاؤ کرنا چاہا۔ مگر وہ بھی قتل ہوگئے۔ جب نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے ان کی آدھی دیت ادا کرنے کا حکم دیا۔ اور عام اعلان کردیا: ''میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان اقامت پذیر ہے!'' پوچھا گیا: کیوں اے اللہ کے رسول؟ فرمایا: ''دونوں کی آگیں ایک دوسرے کو نہ دیکھیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۵۴۷)

تشریح: مسلمان مشرکین سے اتنے دور رہیں کہ اگر ان کے شہر میں یا ان کے محلہ میں کسی اونچی جگہ پر آگ روشن کی جائے تو وہ دوسری جگہ سے نظر نہ آئے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بستی کی آگ مشرکین کو نظر نہ آئے۔ جب مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مشرکین سے اتنے فاصلہ پر رہیں تو جو شخص اسلام اور مسلمانوں سے نکل کر کفار میں مل جاتا ہے، اور ان کی تعداد بڑھاتا ہے، اس کا اسلام اور مسلمانوں سے کیا تعلق رہ جاتا ہے! ایسا شخص واجب القتل ہے۔

بغاوت کی سزا کی بنیاد: سورۃ الحجرات آیت ۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف لوٹ آئے''

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو خلیفوں سے بیعت کی جائے تو ان میں سے بعد والے کو قتل کردو'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۷۶)

تشریح: حکومت اور بادشاہت فطری طور پر مرغوب فیہ ہے۔ اور بڑے ملکوں میں جہاں لوگ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں: بعض لوگ حکومت حاصل کرنے کے لئے قتل وقتال سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اور ان کو مددگار بھی مل جاتے ہیں۔ پس اگر بعد والے بادشاہ کو قتل نہیں کیا جائے گا تو وہ پہلے بادشاہ کو قتل کردے گا۔ پھر کوئی اور اس دوسرے کو قتل کردے گا۔ اور یہ سلسلہ چل پڑے گا۔ اور اس میں مسلمانوں کی تباہی ہے۔ اور اس کے سدّباب کی یہی صورت ہے کہ یہ طریقہ رائج ہو کہ جب ایک خلیفہ کی خلافت مکمل ہوجائے تو جو بھی اس سے مزاحمت کرے اس کو قتل کردیا جائے۔ یہی اس کی سزا ہے۔ اور مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس سلسلہ میں پہلے خلیفہ کی مدد کریں۔

بغاوت کی دو صورتیں اور ان کے احکام: پھر بغاوت کرنے والے دو طرح کے لوگ ہیں:

ایک: وہ لوگ ہیں جو کسی تاویل کی بنا پر بغاوت کرتے ہیں۔ مثلاً:

(الف) ان کا خیال ہے کہ ان پر یا ان کی قوم پر خلیفہ ظلم کررہا ہے۔ بغاوت سے ان کا مقصد: خلیفہ کے ظلم کو اپنی ذات سے یا اپنی قوم سے ہٹانا ہے۔

(ب) یا وہ لوگ اس لئے بغاوت کرتے ہیں کہ وہ خلیفہ میں کوئی کمی پاتے ہیں۔ اور وہ اس کی حجت پیش کرتے ہیں۔ اگر چہ وہ دلیل عام مسلمانوں کے نزدیک قابل پذیرائی نہیں ہوتی، اور قرآن وحدیث سے اس کی کوئی ایسی مضبوط دلیل نہیں ہوتی جس کی تردید نہ کی جاسکے۔ مثلاً خوارج نے بغاوت کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قضیہ صفین میں حکم بنانا درست نہیں تھا۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا حکم کسی کا نہیں (سورۃ الانعام آیت ۵۷ سورہ یوسف آیت ۴۰) پس حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما نے حکم مقرر کر کے اس حکم قرآنی کی مخالفت کی، اس لئے دونوں کافر ہو گئے۔

دوسرا: وہ شخص ہے جو زمین میں بگاڑ پھیلانے کے لئے یا حکومت حاصل کرنے کے لئے بغاوت کرتا ہے۔ وہ تلوار سے فیصلہ کرنا چاہتا ہے، شریعت سے فیصلہ کرانا نہیں چاہتا۔

ان دونوں قسم کے باغیوں کا حکم یکساں نہیں:

پہلی قسم کے باغیوں کا حکم: یہ ہے کہ امیر المؤمنین ان کے پاس کسی عقلمند خیر خواہ عالم کو بھیجے، جو ان کے شبہات کو دور کرے، یا ان سے ظلم کو ہٹائے۔ جیسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خوارج کے پاس بھیجا تھا۔ پھر افہام وتفہیم سے باغی مطیع ہو جائیں تو فبہا، ورنہ ان سے جنگ کرے، مگر واپس جانے والوں کو، قیدیوں کو اور زخمیوں کو قتل نہ کرے۔ کیونکہ مقصد شر دفع کرنا، اور ان کی جمعیت کو منتشر کرنا ہے، جو حاصل ہو گیا۔

اور دوسری قسم کے باغیوں کا حکم: یہ ہے کہ وہ درحقیقت راہ زن ہیں۔ پہلے راہ زنوں کے جو احکام گذرے ہیں وہی ان کے احکام ہیں۔

[۲۶] ويُلحق بالحدود مزجرتان أخريان: إحداهما: عقوبةُ هتكِ حرمة الملة، والثانية: الذَّبُّ عن الإمامة:

والأصل في الأولى: قوله صلى الله عليه وسلم: "من بدَّل دينَه فاقتلوه" وذلك: لأنه يجب أن يقام اللائمة الشديدةُ على الخروج من الملة، وإلا لانفتح بابُ هتكِ حرمةِ الملة؛ ومرضِي اللهِ تعالى أن تُجعل الملةُ السماوية بمنزلة الأمر المجبول عليه، الذى لاينفك عنه.

وتَثْبُتُ الـــردةُ بقولٍ يدلُّ على نفي الصانع، أو الرسل، أو تكذيبِ رسولٍ، أو فعلٍ تُعُمِّدَ به اسْتِهْزَاءً صريحا بالدين وكذا إنكار ضروريات الدين؛

[الف] قال الله تعالى: ﴿وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ وكانت يهوديةٌ تَشْتِمُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم، وتقع فيه، فَخَنَقَهَا رجلٌ حتى ماتت، فأبطل النبيُّ صلى الله عليه وسلم دمَها.

وذلك: لانقطاع ذمةِ الذمي بالطعن في دينِ المسلمين، والشتم والإيذاء الظاهر.

[ب] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أنا بريءٌ من كل مسلم مقيمٍ بين أظهر

المشركين، لا تتراءى ناراهما"

أقول: السبب في ذلك: أن الاختلاط معهم،وتكثيرَ سوادهم: إحدى النصرتين لهم؛ ثم ضبط النبيُّ صلى الله عليه وسلم البُعْدَ من أحياء الكفار: بأن يكون منهم بحيث لو أُوقدت نارٌ على أرفع مكانٍ في بلدهم، أو حِلّتِهم، لم تظهر للآخرين.

والأصل في الثانية: قوله تعالى: ﴿فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوْا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْءَ إِلٰى أَمْرِ اللّٰهِ﴾ وقوله صلى الله عليه وسلم:" إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخِر منهما"

أقول: السبب في ذلك: أن الإمامة مرغوب فيها طبعًا، ولايخلو اجتماعُ الناس في الأقاليم من رجلٍ يجترئُ لأجلها على القتال، ويجتمع لنصرته الرجالُ، فلو تُرك، ولم يُقتل، لقتل الخليفةَ، ثم قاتله آخر فقتله، وهلم جرًّا، وفيه فساد عظيم للمسلمين، ولا يَنْسَدُّ بابُ هذه المفسدة إلا بأن تكون السنةُ بين المسلمين: أن الخليفةَ: إذا انعقدتْ خلافتُه، ثم خرج آخَرُ ينازِعُه: حلَّ قتلُه، ووجب على المسلمين نصرةُ الخليفة عليه.

ثم الذي خرج بتأويلٍ:

[الف] لمظلمةٍ: يريد دفعَها عن نفسه وعشيرته.

[ب] أو لنقيصة: يُثبتُها في الخليفة، ويحتج عليها بدليل شرعي، بعدَ أن لايكون مسلّما عند جمهور المسلمين، ولايكون أمرًا من الله فيه عندهم برهانٌ، لايستطيعون إنكاره.

فأمره دون الأمر الذي خرج يُفسد في الأرض، ويحكّمُ السيفَ دون الشرع، فلا ينبغي أن يُجعلا بمنزلةٍ واحدة:

فلذلك كان حكم الأول: أن يبعث الإمامُ إليهم فَطِنًا ناصحًا عالمًا يكشف شبهتهم، أو يدفع عنهم مظلمتَهم، كما بعث أمير المؤمنين عليٌّ رضي الله عنه عبدَ الله بنَ عباسٍ رضي الله عنه إلى الحَرُورِيَّة؛ فإن رجعوا إلى جماعة المسلمين فبها، وإلاقاتلهم، ولا يقتل مُدْبِرَهم، ولا أسيرَهم، ولا يُجْهِزُ على جريحهم، لأن المقصودَ: إنما هو دفعُ شرهم، وتفريقُ جمعهم، وقد حصل.

وأما الثاني: فهو من المحاربين، وحكمُه حكمُ المحارب.

ترجمہ: اور ملائی جاتی ہیں حدود کے ساتھ دوسری دو سزائیں: ایک: ملت کی بے حرمتی کی سزا، اور دوسری: امامت کی مدافعت۔ اور پہلی سزا کی بنیاد: نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''جو اپنا دین بدل دے اس کو قتل کردو'' اور وہ سزا اس لئے ہے کہ ملت سے نکلنے پر سخت ملامت برپا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ملت کی بے حرمتی کا دروازہ کھل جائے گا۔ اور اللہ کی پسند یہ ہے

کہ آسمانی دین کو اس امر کی طرح بنایا جائے جس پر آدمی پیدا کیا گیا ہے، جس سے آدمی جدا نہیں ہوتا ہے ـــــ اور ارتداد ثابت ہوتا ہے ایسی بات کے ذریعہ جو صانع کی یا رسولوں کی نفی پر دلالت کرتی ہو، یا (ارتداد ثابت ہوتا ہے) رسول کی تکذیب کے ذریعہ، یا کسی ایسے عمل کے ذریعہ جس کو قصداً کیا گیا ہو، دین کا صراحۃً مذاق کرنے کے طور پر۔ اور اسی طرح دین کی بدیہی باتوں کا انکار ـــــ (آیت اور حدیث کے بعد) اور وہ بات یعنی خون کا رائگاں کرنا: ذمی کا ذمہ منقطع ہونے کی وجہ سے ہے، مسلمانوں کے دین پر طعن کرنے، اور شتم کرنے، اور برملا تکلیف پہنچانے کے ذریعہ ـــــ (حدیث کے بعد) میں کہتا ہوں: اس کا سبب یہ ہے کہ مشرکین کے ساتھ اختلاط اور ان کی جماعت کو بڑھانا: ان کی دو مددوں میں سے ایک مدد ہے (ایک ظاہری مدد، دوسری در پردہ۔ تکثیر سواد: در پردہ مدد ہے) پھر نبی ﷺ نے کفار کے محلوں سے دوری کو منضبط کیا: اس طرح کہ ہو مسلمان ان سے ایسی جگہ کہ اگر آگ جلائی جائے ان کے شہر یا ان کے محلّہ میں کسی اونچی جگہ پر تو وہ دوسرے کو نظر نہ آئے ـــ اور دوسری سزا کی بنیاد: (آیت اور حدیث کے بعد) میں کہتا ہوں: اس کا سبب یہ ہے کہ امامت فطری طور پر مرغوب فیہ ہے۔ اور ممالک میں لوگوں کا اجتماع خالی نہیں ہوتا ایسے آدمی سے جو امامت کے لئے قتال پر دلیری کرے۔ اور اس کی مدد کے لئے آدمی اکٹھا ہو جائیں۔ پس اگر وہ چھوڑ دیا جائے، اور قتل نہ کیا جائے تو البتہ وہ خلیفہ کو قتل کر دے گا۔ پس اس سے دوسرا شخص لڑے گا، تو وہ اس کو قتل کر دے گا۔ اور یونہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ اور اس میں مسلمانوں کے لئے بڑی خرابی ہے۔ اور اس خرابی کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ہو مسلمانوں کے درمیان طریقہ کہ جب ایک خلیفہ کی خلافت منعقد ہو جائے، پھر دوسرا نکلے جو اس سے جھگڑے تو اس کو قتل کرنا جائز ہو، اور مسلمانوں پر واجب ہو، اس دوسرے کے خلاف خلیفہ کی مدد کرنا ـــــ پھر وہ شخص جس نے خروج کیا ہے کسی تاویل کی بنا پر: (الف) کسی ظلم کی وجہ سے جس کو وہ اپنی ذات اور اپنے خاندان سے ہٹانا چاہتا ہے (ب) یا کسی کمی کی وجہ سے: جس کو وہ خلیفہ میں ثابت کرتا ہے۔ اور اس کمی کو دلیل شرعی سے ثابت کرتا ہے، بعد ازیں کہ وہ دلیل جمہور مسلمین کے نزدیک مانی ہوئی نہیں ہے، اور اللہ کی طرف سے کوئی ایسی دلیل بھی نہیں جس کے انکار کی گنجائش نہ ہو ـــ پس ایسے باغی کا معاملہ اس باغی کے معاملہ سے کم تر ہے جو بغاوت کرتا ہے درانحالیکہ وہ زمین میں بگاڑ پھیلانے والا ہے۔ اور تلوار کو ثالث بناتا ہے، نہ کہ شریعت کو، پس مناسب نہیں کہ دونوں کو ایک درجہ میں رکھا جائے ـــ پس اسی وجہ سے پہلے کا حکم یہ ہے کہ امام ان کی طرف عقل مند خیر خواہ عالم کو بھیجے جو ان کے شبہ کو دور کرے، یا ان سے ظلم کو ہٹائے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو حروریہ کی طرف بھیجا۔ پس اگر وہ جماعت مسلمین کی طرف لوٹ جائیں تو کیا ہی خوب! ورنہ ان سے لڑے، اور ان میں سے پیٹھ پھیرنے والے کو قتل نہ کرے۔ اور نہ ان کے قیدی کو، اور ان کے زخمیوں کو جلدی سے قتل نہ کر ڈالے۔ اس لئے کہ مقصود: ان کے شر کو دفع کرنا، اور ان کی جمعیت کو منتشر کرنا ہی ہے۔ اور وہ مقصد حاصل ہو گیا ـــ اور رہا دوسرا: تو وہ محاربین میں سے ہے۔ اور اس کا حکم محارب کا حکم ہے۔

باب ــــــ ۵

نظام عدالت کا بیان

لوگوں کے درمیان نزاعات بکثرت پیش آتے ہیں، جو سخت ضرر رساں ہوتے ہیں۔ وہ بغض وعداوت پیدا کرتے ہیں، اوران سے آپسی تعلقات خراب ہوتے ہیں۔ حقوق کی پامالی کی شدید حرص پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اس بات پر ابھارتی ہے کہ آدمی کسی دلیل کی پیروی نہ کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر علاقہ میں ایسے حضرات بھیجے جائیں جو حق کے ساتھ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کریں۔ اور طاقت کے ذریعہ لوگوں کو مجبور کریں کہ وہ ان فیصلوں پر عمل کریں۔ خواہ فیصلے ان کو پسند ہوں یا نہ ہوں۔ چنانچہ نبی ﷺ قاضیوں کو بھیجنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ اور بعد میں بھی مسلمان برابر اس کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔

وضاحت: نظام عدالت انسانی معاشرہ کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دین کے دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی اپنے عمل اور ارشادات کے ذریعہ پوری راہ نمائی فرمائی ہے۔ ہجرت کے بعد جب اجتماعیت کی شکل پیدا ہوئی تو آپؐ نے نظام عدالت قائم فرمایا۔ آپؐ بذاتِ خود قاضی تھے۔ نزاعی معاملات آپؐ کے سامنے پیش ہوتے، اور آپ ان کا فیصلہ فرماتے۔ اور روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مدینہ طیبہ میں قاضی کی حیثیت سے مقدمات کے فیصلے فرماتے تھے۔ پھر جب یمن کا علاقہ اسلامی قلم رو میں آگیا تو آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وہاں کا قاضی بنا کر روانہ فرمایا۔ پھر بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ خلفائے راشدین نے ہمیشہ ہی نظام عدالت کی طرف خصوصی توجہ مبذول رکھی ہے تاکہ حقداروں کو ان کے حقوق ملتے رہیں (ماخوذ از معارف الحدیث ۷: ۱۹۸)

قضاء کے لئے ہدایات وقوانین

لوگوں کے درمیان فیصلے کرنے میں چونکہ ظلم وجور کا احتمال ہے، اس لئے نبی ﷺ نے قاضیوں کو سخت تاکید فرمائی ہے کہ وہ قضا کی ذمہ داری امکان بھر عدل وانصاف اور خدا ترسی کے ساتھ انجام دیں۔ اور جانبداری اور ناانصافی کرنے والوں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا، اور سخت وعیدیں سنائیں۔ اور ایسی ہدایات اور ایسے قوانین بنائے جو فیصلوں کے لئے بنیاد بنیں۔ درج ذیل روایات اسی سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں:

(۱) ــــ قضاء بھاری ذمہ داری ہے ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو قاضی (لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا) بنایا گیا: وہ یقیناً بغیر چھری کے ذبح کیا گیا'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۴۳)

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قضاء گرانبار بوجھ اور بھاری ذمہ داری ہے۔ اور یہ بات بھی بیان کی ہے کہ

قضاء پر پیش قدمی کرنے میں ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کی مدد اور حفاظت فرمائیں: وہی قضاء کی ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہوسکتا ہے (اور ''بغیر چھری کے'' یعنی چھری کے علاوہ کسی اور چیز سے: یہ عربی محاورہ ہے۔ اردو محاورہ: الٹی چھری سے، جدھر دھار نہیں ہوتی ذبح کرنا ہے۔ یعنی وہ سخت اذیت وتکلیف میں مبتلا کردیا گیا)

(۲) — عہدہ کا طلب گار مخلص کم ہوتا ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جو کوئی قضاء کا طلب گار ہوگا، اور درخواست کرکے اس کو حاصل کرے گا، وہ اس کے نفس کے سپرد کردیا جائے گا کہ خود اس کی ذمہ داری سے نمٹ! اور جس کو مجبور کرکے قاضی بنایا جائے گا: اللہ تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ نازل فرمائیں گے، جو اس کو ٹھیک ٹھیک چلائے گا'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۳۴)

تشریح: جو شخص عہدہ کا طلب گار ہوتا ہے: وہ عام طور پر کوئی پنہاں خواہش رکھتا ہے۔ مثلاً مال ومنال یا جاہ ومرتبہ حاصل کرنا، یا اس عہدہ کے ذریعہ اپنے کسی دشمن سے انتقام لینے کا جذبہ، یا ایسی ہی کوئی اور خواہش رکھتا ہے۔ پس نیت میں اخلاص نہ رہا جو برکتوں کے نزول کا سبب ہے۔ نفس کے سپرد کرنے کا یہی مطلب ہے۔

(۳) — دیندار خداترس عالم ہی قاضی بنایا جائے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''قاضی تین قسم کے ہیں: ان میں سے ایک جنت کا مستحق، اور دو دوزخ کے مستحق ہیں: جنت کا مستحق وہ قاضی ہے جس نے حق کو جانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اور وہ آدمی جس نے حق جاننے کے باوجود ناحق فیصلہ کیا وہ دوزخی ہے۔ اسی طرح وہ آدمی جو بے علم ہونے کے باوجود فیصلے کرتا ہے: وہ بھی جہنمی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۳۵)

تشریح: اس حدیث میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ قضاء کا مستحق وہ شخص ہے جس میں دو باتیں ہوں: ایک: دیندار، ظلم وجور کے جذبے سے پاک ہو۔ اور اس کی یہ خوبی لوگ بخوبی جانتے ہوں۔ دوسری: عالم ہو، جو حق بات کو جان سکتا ہو، خاص طور پر قضاء کے مسائل سے بخوبی واقف ہو۔ اور ایسا ہی شخص قضاء کا اہل کیوں ہے: یہ بات واضح ہے۔ کیونکہ قاضی کے تقرر سے جو مقصد پیش نظر ہے: وہ ان دو باتوں کے ذریعہ ہی تکمیل پذیر ہوسکتا ہے۔

(۴) — غصہ کی حالت میں صحیح فیصلہ نہیں کیا جاسکتا — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا: ہرگز غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۳۱)

تشریح: غصہ کی حالت میں چونکہ ذہنی توازن صحیح نہیں رہتا، اس لئے قاضی دلائل وقرائن میں غور کرنے پر، اور حق بات کو پہچاننے پر قادر نہیں ہوتا، لہٰذا اس حال میں قاضی کو فیصلہ نہیں کرنا چاہئے۔ اعتدال وسکون کی حالت میں غور وفکر کرکے رائے قائم کرے، اور فیصلہ کرے۔ اور اگر غصہ مقدمہ کے کسی فریق پر آیا ہے، تب تو اور بھی خطرہ ہے کہ ناانصافی ہوجائے۔ پس ایسی صورت میں فیصلہ مؤخر کردے۔

(۵) — قاضی کی اجتہادی غلطی بھی باعث اجر ہے — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے، پس وہ خوب غور وفکر کرے، اور صحیح فیصلہ کرے تو اس کے لئے دُوہرا اجر ہے۔ اور جب فیصلہ کرے، اور خوب

غور وفکر کرے، مگر غلطی ہوجائے تو اس کے لئے ایک اجر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۷۳۲)

تشریح: اس حدیث میں اجتہاد کے معنی: دلیل کی پیروی میں اپنی طاقت خرچ کرنا ہیں۔ یعنی قرآن وحدیث میں غور کرکے حکم شرعی نکالنا مراد نہیں۔ بلکہ مقدمہ کا فیصلہ فقہ کے جس جزئیہ سے، اور مقدمہ میں پیش ہونے والے جن دلائل وقرائن سے کرے اس میں خوب غور وفکر کرنا مراد ہے۔

اور قاضی کی اجتہادی غلطی میں بھی اجر اس لئے ملتا ہے کہ تکلیف بقدرِ وسعت ہوتی ہے: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ اور انسان کے بس میں صرف یہ بات ہے کہ وہ حق کو پانے کے لئے انتہائی کوشش کرے۔ بالیقین حق کو پالینا اس کے بس کی بات نہیں۔ پس وہ اس کا مکلف بھی نہیں۔ اور جب قاضی نے اپنی ذمہ داری پوری کرلی تو وہ اجر کا مستحق ہے (اور حق پانے والے کو جو دوہرا اجر ملتا ہے، وہ ترغیب کے لئے ہے، تاکہ قاضی حق پانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے)

فائدہ: اس حدیث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مسائلِ خلافیہ میں حق نفس الامر میں ایک ہے۔ جس مجتہد نے اس کو پالیا: دُوہرے اجر کا مستحق ہے۔ اور جو چوک گیا وہ بھی اجر کا مستحق ہے۔ شامی میں ہے: المختار: أن حکم الله فی کل مسئلة واحد معین، وجب طلبُه: فمن أصابه فهو المصیبُ، ومن لا فهو المخطیٔ (۳۹:۱) البتہ عمل کے اعتبار سے حق متعدد ہیں۔ کیونکہ مجتہدین اتنے ہی کے مکلف ہیں جتنا ان کے بس میں ہے۔ پس جیسے قاضی کے دونوں قسم کے فیصلے نفاذ کے اعتبار سے برابر ہیں، اسی طرح مجتہدین کی مختلف آراء عمل کے اعتبار سے یکساں ہیں، البتہ مجتہدین کا ثواب مختلف ہوگا۔

فائدہ: المجتهد یُخطیٔ ویُصیب: کوئی حدیث نہیں، بلکہ مذکورہ حدیث سے بنایا ہوا ضابطہ ہے، جو حدیث کے طور پر مشہور ہوگیا ہے۔

⑥ —— فریقین کی بات سن کر فیصلہ کرے —— رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجنا چاہا، تو وہ گھبرائے۔ اور عرض کیا کہ میری عمر کم ہے، میں کس طرح فیصلے کرسکونگا؟! آپ نے فرمایا: میں تمہیں ایک گُر بتاتا ہوں: ''جب دو شخص آپ سے فیصلہ کرانا چاہیں، تو آپ پہلے کے لئے فیصلہ نہ کریں یعنی رائے قائم نہ کریں، یہاں تک کہ دوسرے کی بات سن لیں۔ پس یہ زیادہ لائق ہے اس کے کہ آپ کے لئے فیصلہ واضح ہوجائے'' (ترمذی ۱۵۹:۱ ابوداؤد حدیث ۳۵۸۲)

تشریح: دونوں فریقوں کی بات سننے کے بعد جب دونوں کی دلیلوں میں غور کیا جاتا ہے تو فیصلہ کی صحیح صورت سمجھ میں آجاتی ہے۔ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے یہ اصول اپنایا تو مجھے کبھی کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔

﴿القضاء﴾

اعلم: أن من الحاجات التی یکثر وقوعُها، وتشتد مفسدتُها: المناقشاتُ فی الناس؛ فإنها تکون باعثةً علی العداوة والبغضاء، وفسادِ ذات البین، وتَهَیُّجُ الشحِّ علی غَمْطِ الحق، وأن لا ینقاد للدلیل، فوجب أن یُبعث فی کل ناحیة من یفصل قضایاهم بالحق، ویَقْهَرُهم علی العمل

بـه، أشـاء وا أم أبـوا؛ ولذلك كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يعتني ببعث القضاة اعتناءً شديدًا، ثم لم يزل المسلمون على ذلك.

ثـم لـمـا كان القضاء بين الناس مظنةَ الجَور والحيفِ: وجب أن يُرَهَّبَ الناسُ عن الجور في القضاء، وأن يُضْبَطَ الكلياتُ التي يرجع إليها الأحكامُ.

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" من جُعل قاضيًا بين الناس فقد ذُبح بغير سكين"

أقول: هذا بيانُ أن القضاءَ حملٌ ثقيلٌ، وأن الإقدامَ عليه مظنةٌ للهلاك، إلا أن يشاء الله.

[۲] وقـال صـلـى الله عـليه وسلم:" من ابتغى القضاء وسأل، وُكِّلَ إلى نفسه، ومن أُكره عليه أنزل الله عليه مَلَكًا يسدِّده"

أقول: السر فيـه: أن الـطالب لايخلو غالباً من داعية نفسانية من مال أوجاهٍ، أو التمكنِ من انتقام عدوّ، ونحو ذلك، فلا يتحقق منه خلوص النية، الذى هو سببُ نزول البركات.

[۳] قال صلى الله عليه وسلم:" القضاة ثلاثة: واحد في الجنة، واثنان في النار: فأما الذى في الـجنة: فرجلٌ عرف الحقَّ وقضى به؛ ورجل عرف الحق فجار في الحكم فهو في النار، ورجل قضى للناس على جهل فهو في النار"

أقول: فـي هـذا الـحديث: أنه لايستوجب القضاء إلا من كان عدلاً بريئًا من الجور والميلِ، قـد عُـرف مـنه ذلك؛ وعالمًا يعرف الحق، لاسيما في مسائل القضاء؛ والسر في ذلك واضح، فإنه لايتصور وجودُ المصلحة المقصودة إلابهما،

[٤] قال صلى الله عليه وسلم:" لايقضِيَنَّ حَكَمٌ بين اثنين وهو غضبانُ"

أقول: السبـب الـمـقـتـضـى لـذلك: أن الـذى اشتغل قلبُه بالغضب، لايتمكن من التأمل في الدلائل والقرائن، ومعرفةِ الحق.

[۵] قـال صلى الله عليه وسلم:" إذا حكم الحاكم، فاجتهد، فأصاب، فله أجران؛ وإذا حكم، فاجتهد، فأخطأ فله أجر واحد"

أقول: اجتهد يعنى بذل طاقتَه في اتباع الدليل. وذلك: لأن التكليف بقدر الوسع، وإنمافى وسع الإنسان أن يجتهد، وليس في وسعه أن يصيب الحق البتة.

[٦] وقال صلى الله عليه وسلم لعلى رضى الله عنه:" إذا تقاضى إليك رجلان فلا تقضِ للأول حتى تسمع كلامَ الآخر، فإنه أحرى أن يتبين لك القضاء"

أقول: وذلك: لأنه عند ملاحظة الحجتين يظهر الترجيح.

ترجمہ: جان لیں کہ ان حاجات میں سے جن کا بکثرت وقوع ہوتا ہے، اور جن کے مفاسد سخت ہیں: لوگوں کے باہمی جھگڑے ہیں۔ وہ عداوت وبغض اور باہمی تعلقات کے بگاڑ کا باعث ہوتے ہیں۔ اور حق کی پامالی کی شدید حرص کو ابھارتے ہیں۔ اور اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ کسی دلیل کی تابعداری نہ کرے۔ پس ضروری ہے کہ ہر علاقہ میں ان لوگوں کو بھیجا جائے جو حق کے ساتھ لوگوں کے مقدمات کے فیصلے کریں۔ اور اس فیصلہ پر عمل کرنے پر لوگوں کو مجبور کریں، خواہ وہ چاہیں یا انکار کریں۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ اہتمام کیا کرتے تھے قاضیوں کو بھیجنے کا بہت زیادہ اہتمام کرنا۔ پھر مسلمان برابر یہ کام کرتے رہے —— پھر جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ظلم وجور کی احتمالی جگہ تھا تو ضروری ہوا کہ لوگوں کو خوف زدہ کیا جائے فیصلہ میں ظلم کرنے سے۔ اور یہ بھی ضروری ہوا کہ ایسے قواعد کلیہ متعین کئے جائیں جن کی طرف احکام لوٹیں۔ (۱) میں کہتا ہوں: یہ اس امر کا بیان ہے کہ قضا گرانبار بوجھ ہے۔ اور اس بات کا بیان ہے کہ قضاء پر پیش قدمی کرنا ہلاکت کی احتمالی جگہ ہے۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہیں —— (۲) میں کہتا ہوں: راز اس میں یہ ہے کہ طلب گار اکثر خالی نہیں ہوتا نفسانی جذبہ سے یعنی مال یا مرتبہ یا (خالی نہیں ہوتا) دشمن سے انتقام لینے پر قادر ہونے کے جذبہ سے، اور اس کے مانند سے، پس اُس سے وہ خلوصِ نیت نہیں پایا جاسکتا جو کہ وہ برکتوں کے نزول کا سبب ہے —— (۳) میں کہتا ہوں: اس حدیث میں یہ بات ہے کہ قضاء کا مستحق نہیں ہے، مگر: (۱) جو دیندار ظلم وجور سے پاک ہو، اس کی یہ بات جانی پہچانی ہوئی ہو (۲) اور عالم ہو جو حق بات کو جان سکتا ہو، خاص طور پر قضاء کے مسائل میں۔ اور اس کی حکمت واضح ہے، پس بیشک شان یہ ہے کہ نہیں تصور کیا جاسکتا مصلحتِ مقصودہ کا پایا جانا، مگر ان دو باتوں کے ذریعہ (بھما مطبوعہ میں بھا تھا۔ تصحیح مخطوط کراچی سے کی ہے) —— (۴) میں کہتا ہوں: اس بات کو چاہنے والا سبب یہ ہے کہ جس کا دل غصہ میں مشغول ہوتا ہے، وہ قادر نہیں ہوتا دلائل وقرائن میں غور کرنے پر، اور حق بات کو پہچاننے پر —— (۵) میں کہتا ہوں: اجتہاد کے معنی ہیں: دلیل کی پیروی میں اپنی طاقت خرچ کرنا۔ اور وہ بات اس لئے ہے کہ تکلیف بقدر وسعت ہوتی ہے۔ اور انسان کی وسعت میں یہی بات ہے کہ انتہائی کوشش کرے۔ اور اس کی وسعت میں نہیں ہے کہ یقینی طور پر حق کو پالے —— (۶) میں کہتا ہوں: اور وہ بات اس لئے ہے کہ دونوں دلیلوں کو پیش نظر لانے کے وقت ترجیح ظاہر ہو جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

قضاء میں دو مقام

حقیقتِ حال جاننا اور منصفانہ فیصلہ کرنا

کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں دو باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے: ایک: جس چیز میں نزاع ہے اس کی حقیقتِ حال جاننا۔ دوسری: منصفانہ فیصلہ کرنا۔ قاضی کبھی دونوں باتیں جاننے کا محتاج ہوتا ہے، اور کبھی ایک کا۔ مثلاً:

۱ـــ اگر کوئی شخص دوسرے کے خلاف کسی چیز کے غصب کا دعوی کرے، اور دوسرا انکار کرے۔ اور مغصوبہ چیز کی حالت بدل گئی ہو، مثلاً گیہوں پسوالیا ہو، تو قاضی کے لئے دو باتیں جاننی ضروری ہونگی: ایک: حقیقتِ حال جاننی ضروری ہوگی کہ غصب کا واقعہ پیش آیا بھی ہے یا نہیں؟ دوم: مغصوبہ چیز بعینہ لوٹانے کا فیصلہ کیا جائے یا اس کی قیمت دلوائی جائے!

۲ـــ دو شخص کسی جانور کا دعوی کریں۔ اور ہر ایک یہ کہے کہ یہ جانور میرے قبضہ میں پیدا ہوا ہے۔ یا کسی پتھر کا دعوی کریں، اور ہر ایک یہ کہے کہ وہ اس کو فلاں پہاڑ سے لایا ہے۔ تو اس صورت میں صرف حقیقتِ حال جاننے کی ضرورت ہوگی، کیونکہ فیصلہ واضح ہے۔

۳ـــ اور حضرات علی وزید وجعفر رضی اللہ عنہم میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی کی پرورش کے سلسلہ میں جو نزاع واقع ہوا تھا، اس کی حقیقتِ حال معلوم تھی۔ صرف منصفانہ فیصلہ کی ضرورت تھی (بخاری حدیث ۲۶۹۹ تفصیل آگے آرہی ہے)

نبی ﷺ نے قضاء کے ان دونوں ہی مقامات کو قواعد کلیہ کے ذریعہ منضبط کیا ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔

واعلم أن القضاء فيه مقامان: أحدهما: أن يعرف جليّةَ الحال التي تشاجرا فيه؛ والثاني: الحُكمُ العَدْلُ في تلك الحالة.

والقاضي قد يحتاج إليهما، وقد يحتاج إلى أحدهما فقط:

[۱] فإذا ادَّعى كلُّ واحد: أن هذا الحيوان ــ مثلاً ــ مِلكُه، قد وُلد في يده، وهذا الحَجَرُ التقَطَه من جبل: ارتفع الإشكالُ لمعرفةِ جلية الحال.

[۲] والقضيةُ التي وقعتْ بين علي وزيدٍ وجعفرٍ ــ رضي الله عنهم ــ في حِضانة بنتِ حمزة رضي الله عنه، كانت جليةُ الحال معلومةً، وإنما كان المطلوبَ الحكمُ.

[۳] وإذا ادَّعى واحد على الآخر الغصبَ، والمالُ متغير صفتُه، وأنكر الآخَرُ: وقعت الحاجة أولاً: إلى معرفة جلية الحال، هل كان هناك غصبٌ أولا؟ وثانياً: إلى الحكم، هل يُحكم بردِّ عينِ المغصوب، أو قيمته.

وقد ضبط النبي صلى الله عليه وسلم كلا المقامين بضوابطَ كليةٍ.

ترجمہ: اور جان لیں کہ قضاء میں دو مقام ہیں: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ قاضی اس حال (واقعہ) کی حقیقت جانے، جس میں ان دونوں میں جھگڑا ہے۔ دوسرا: اس حالت میں منصفانہ فیصلہ ہے ـــ اور قاضی کبھی دونوں باتوں کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے۔ اور کبھی دونوں میں سے صرف ایک بات کو جاننے کا محتاج ہوتا ہے (پھر تین مثالیں ہیں۔ مگر ان میں لف ونشر مشوش ہے۔ اوپر تقریر میں ان مثالوں کو مرتب ذکر کیا ہے) (۱) پس جب ہر ایک دعوی کرے کہ یہ جانور ـــ مثال کے طور پر ـــ اس کی

ملک ہے، وہ اس کے قبضہ میں جنا گیا ہے، اور اس پتھر کو وہ کسی پہاڑ سے اٹھا کر لایا ہے، تو اشتباہ اوپر ہو جاتا ہے حقیقت حال کو جاننے کے لئے (یعنی اس صورت میں نیچے والی بات (منصفانہ فیصلہ) جاننی ضروری نہیں، وہ تو واضح ہے صرف اوپر والی بات یعنی حقیقت حال جاننی ضروری ہے "اوپر ہونے" کا یہی مطلب ہے) (۲) اور وہ جھگڑا جو حضرات علی وزید وجعفر رضی اللہ عنہم میں پیش آیا تھا، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کی پرورش کے سلسلہ میں: اس کی حقیقت معلوم تھی۔ اور مطلوب صرف حکم تھا (کہ وہ بچی کس کی تربیت میں دی جائے) (۳) اور جب ایک شخص نے دوسرے کے خلاف غصب کا دعوی کیا۔ اور مال (مغصوبہ چیز) کی حالت میں تبدیلی آچکی ہے، اور دوسرا غصب کا انکار کرتا ہے، تو اولاً: ضرورت پیش آئے گی حقیقتِ حال کو جاننے کی کہ آیا غصب ہوا بھی ہے یا نہیں؟ اور ثانیاً: فیصلہ جاننے کی کہ کیا بعینہٖ مغصوبہ چیز کو لوٹانے کا فیصلہ کیا جائے یا اس کی قیمت کا؟ — اور تحقیق نبی ﷺ نے دونوں ہی مقامات کو قواعد کلیہ کے ذریعہ منضبط فرمایا ہے۔

☆ ☆ ☆

پہلا مقام

حقیقتِ حال کی معرفت

گواہیاں اور قسم

حقیقتِ حال جاننے کا بہترین ذریعہ گواہیاں اور قسم ہے۔ کیونکہ صورتِ حال کا پتہ یا تو اس شخص کی اطلاع سے ہوسکتا ہے جو واقعہ میں حاضر تھا۔ یہی گواہ ہے۔ یا جو شخص حال سے واقف ہے وہ قسم کھا کر اطلاع دے۔ کیونکہ جب وہ قسم کھا کر بات بتلائے گا تو ظن غالب یہ قائم ہوگا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ چنانچہ درج ذیل حدیث میں فیصلہ کا مدار انہی دو باتوں پر رکھا گیا ہے:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اگر لوگ (صرف) دعوے پر دیئے جائیں تو وہ لوگوں کے خون اور اموال کا دعوی کریں گے، بلکہ مدعی کے ذمہ گواہ ہیں، اور مدعی علیہ کے ذمہ قسم (مشکوۃ حدیث ۳۷۵۸)

تشریح: مدعی: وہ ہے جو خلاف ظاہر بات کہتا ہے، اور کوئی زائد چیز ثابت کرتا ہے۔ اور مدعی علیہ: وہ ہے جو اپنی بات کے جلو میں اصل کو لئے ہوئے ہے، اور امر ظاہر کو دلیل میں پیش کرتا ہے۔ مثلاً ایک مکان زید کے قبضہ وتصرف میں ہے۔ دوسرا شخص کہتا ہے: یہ میرا ہے۔ پہلا اس کا انکار کرتا ہے، وہ اس کو اپنا بتلاتا ہے۔ اور اپنے قبضہ کو دلیل میں پیش کرتا ہے۔ تو یہ مدعی ہے اور زید مدعی علیہ ہے۔

اور گواہ مدعی کے ذمہ اور قسم مدعی علیہ کے ذمہ: اس لئے ہے کہ یہی بات انصاف کی ہے۔ جب مدعی خلاف ظاہر

بات کہتا ہے تو وہ ثبوت پیش کرے۔ اگر وہ ثبوت پیش نہ کر سکے تو مدعی علیہ سے قسم لی جائے۔ اس کو گواہ پیش کرنے کا مکلف نہ بنایا جائے۔ کیونکہ ظاہر حال اس کے لئے گواہ ہے۔ پھر وہ کسی بات کا دعویدار بھی نہیں۔ وہ تو دوسرے کا دعوی اپنی ذات سے ہٹا رہا ہے۔ پس وہ گواہ کس بات پر پیش کرے گا؟

اور مدعی گواہ پیش کرے، ورنہ مدعی علیہ کی قسم پر فیصلہ کیا جائے: اس ضابطہ کی وجہ حدیث میں مصرح ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر بے ضابطہ فیصلے کئے جائیں گے تو ظلم کا دروازہ کھل جائے گا۔ اس لئے ظلم کے سدّباب کے لئے یہ ضابطہ تجویز کیا گیا ہے۔

أما المقام الأول: فلا أحقَّ فيه من الشهادات والأيمان؛ فإنه لايمكن معرفةُ الحال إلا بإخبار من حضرها، أو بإخبار صاحبِ الحال مؤكَّدًا بما يُظَنُّ أنه لايكذِبُ معه.

قال صلى الله عليه وسلم: "لو يُعطَى الناسُ بدعواهم، لَادَّعىٰ ناسٌ دِمَاءَ رجالٍ وأموالَهم، ولكن البينةَ على المدعي، واليمينَ على المدَّعىٰ عليه".

فالمدَّعي: هو الذي يَدَّعي خلافَ الظاهر، ويُثْبِتُ الزيادة؛ والمدعى عليه: هو مُسْتَصْحِبُ الأصلَ والمتمسك بالظاهر.

ولا أعدلَ ثَمَّ مِنْ أن يُعتبر فيمن يَدَّعي: بينةٌ، وفيمن يتمسك بالظاهر، ويدرأُ عن نفسه: اليمينُ، إذا لم تَقُمْ حجةُ الآخر.

وقد أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم إلى سبب مشروعية هذا الأصل، حيث قال: "لو يُعطَى الناسُ" إلخ يعني كان سببًا للتظالم، فلا بد من حجةٍ.

ترجمہ: رہا پہلا مقام: پس اس میں (یعنی حقیقتِ حال کی معرفت میں کوئی چیز) زیادہ حقدار نہیں گواہیوں اور قسموں سے یعنی معرفت کے بہترین ذرائع یہی ہیں۔ کیونکہ حالت کا جاننا ممکن نہیں مگر اس شخص کی اطلاع سے جو واقعہ میں حاضر ہو (یہی گواہ ہے) یا حالت سے واقف کی اطلاع سے درانحالیکہ وہ اطلاع کو پختہ کرنے والا ہو ایسی بات (قسم) کے ساتھ کہ گمان کیا جائے کہ وہ اس بات (قسم) کے ساتھ جھوٹ نہیں بولے گا (یعنی مدعی علیہ قسم کھا کر جو بات کہے وہ مان لی جائے۔ حقیقت حال کی معرفت کے یہی دو بہترین ذرائع ہیں۔ اس لئے شریعت نے ان کا اعتبار کیا ہے) (حدیث کے بعد) پس مدعی: وہ ہے جو خلاف ظاہر کا دعوی کرتا ہے، اور زیادتی ثابت کرتا ہے یعنی جو ملکیت بظاہر ثابت نہیں: اس کو ثابت کرتا ہے۔ اور مدعی علیہ: وہ ہے جو اصل کے ساتھ لینے کو چاہنے والا ہے یعنی اس کی بات کے جلو میں اصل بھی ہے یعنی مدعی علیہ: وہ ہے جو استصحاب سے دلیل پکڑتا ہے۔ اور ظاہر سے تمسک کرنے والا یعنی دلیل پکڑنے والا ہے —— اور نہیں زیادہ انصاف کی بات وہاں (یعنی حقیقت حال کی معرفت میں یا ثبوت دعوی میں یا اقتضاء حکم میں، جو چاہیں کہیں) اس

سے کہ (۱) گواہوں کا اعتبار کیا جائے اس شخص کے حق میں جو دعوی کرتا ہے یعنی گواہ پیش کرنا اسی کے ذمہ ہونا چاہئے (۲) اور قسم کا اعتبار کیا جائے اس شخص کے حق میں جو ظاہر سے تمسک کرتا ہے، اور اپنی ذات سے ہٹاتا ہے، جبکہ دوسرے کی دلیل قائم نہ ہو یعنی مدعی گواہ پیش نہ کر سکے۔

اور نبی ﷺ نے اس اصل یعنی مدعی سے گواہ لیکر، ورنہ مدعی علیہ کی قسم کے ذریعہ فیصلہ کرنے کی مشروعیت کے سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے بایں طور کہ فرمایا: ''اگر لوگ دیئے جائیں'' الی آخرہ یعنی وہ (بے دلیل) دینا ایک دوسرے پر ظلم کرنے کا سبب ہوگا، پس فیصلہ کے لئے کوئی دلیل ضروری ہے۔

تصحیح: ولا أعدلَ ثَمَّ من إلخ تمام نسخوں میں ولا عَدْل إلخ ہے۔ یہ تصحیح شارح نے کی ہے۔ مِن تفضیلیہ اسم تفضیل کا واضح قرینہ ہے۔

☆ ☆ ☆

گواہوں کے اعتبار کے لئے چند اوصاف

پھر ضروری ہے کہ گواہ پسندیدہ اور معتبر لوگ ہوں۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲ میں ارشاد پاک ہے کہ گواہ ایسے لوگ ہوں جن کو تم پسند کرتے ہو۔ اور گواہوں کی پسندیدگی ان کی چند خوبیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً عقلمند ہونا، پوری عمر کا ہونا، معاملہ فہم ہونا، قوتِ گویائی کا مالک ہونا، مسلمان ہونا (جبکہ مدعی علیہ مسلمان ہو) دیندار ہونا، بامروت ہونا، اور متہم نہ ہونا وغیرہ۔ اور ان اوصاف کا لحاظ درج ذیل حدیث وآیت سے ثابت ہے:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خائن، خائنہ، زانی، زانیہ، اور اپنے (مسلمان) بھائی سے عداوت رکھنے والے کی شہادت مقبول نہیں!'' اور آپؐ نے کسی گھر والوں کے ساتھ قناعت کرنے والے (طفیلی) کی گواہی رد فرمادی (مشکوٰۃ حدیث ۳۷۸۲)

آیت کریمہ: سورۃ النور آیات ۴ و ۵ میں تہمت لگانے والوں کے بارے میں ارشاد پاک ہے: ''اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو، اور یہی لوگ فاسق ہیں۔ مگر جو اس (تہمت لگانے) کے بعد توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہیں'' اور تہمت وزنا کے حکم میں دیگر کبائر ہیں۔ یعنی ہر کبیرہ کے ارتکاب سے عدالت (دینداری) باقی نہیں رہتی، اس لئے ان کی گواہی معتبر نہیں۔

اور گواہوں کے معتبر ہونے کے لئے یہ اوصاف اس لئے ضروری ہیں کہ خبر فی نفسہ صدق وکذب کا احتمال رکھتی ہے یعنی ان کی بتلائی ہوئی بات سچی بھی ہوسکتی ہے اور جھوٹی بھی۔ پس کسی قرینہ ہی سے کسی ایک احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اور قرینہ یا تو مُخبِر (خبر دینے والے) میں ہوگا، یا مخبرعنہ (بیان کی ہوئی بات) میں، یا ان کے علاوہ میں۔ اور مخبر کی صفات کے

علاوہ دوسری کوئی ایسی متعین چیز نہیں ہے جس پر فیصلہ شرعی کا مدار رکھا جا سکے۔ چنانچہ گواہی کے معتبر ومقبول ہونے کے لئے مخبر کی مذکورہ صفات ہی کو شرط قرار دیا گیا۔

اور مخبر (گواہ) کی صفات میں ظاہر واستصحاب کا اعتبار نہیں۔ یعنی اگر وہ اس بنیاد پر گواہی دیتا ہے کہ ''پہلے سے ایسا ہی ہے'' تو یہ گواہی معتبر نہیں۔ کیونکہ اس صفت کا ایک بار مدعیٰ علیہ کے حق میں اعتبار کیا جا چکا ہے۔ پس دوسری مرتبہ مدعی کے گواہوں میں اس صفت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

ثـم إنـه يُعتبـر في الشاهد صفةُ كونِه مرضِيًّا عنه، لقوله تعالى: ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾ وذلك: بالعقل، والبلوغ، والضبط، والنطق، والإسلام، والعدالة، والمروءة، وعدم التهمة.

قال صلى الله عليه وسلم: " لاتجوز شهادةُ خائنٍ، ولاخائنة، ولازانٍ ولازانية، ولا ذي غِمْرٍ على أخيه، وتُرَدُّ شهادةُ القانع لأهل البيت" وقال الله تعالى في القَذَفَةِ: ﴿وَلَاتَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا، وَأُوْلٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ، إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا﴾ الآيةَ، وفي حكم القذف والزنا سائرُ الكبائر.

وذلك: لأن الخبر يحتمل في نفسه الصدقَ والكذبَ، وإنما يترجَّح أحدُ المحتملَين بالقرينة؛ وهي: إما في المُخْبِر، أو في المُخْبَرِ عنه، أو غيرِهما؛ وليس شيئٌ من ذلك مضبوطًا يَحِقُّ أن يُدارَ عليه الحكمُ التشريعيُّ إلا صفاتُ المُخْبِرِ، غيرَ ماذكرنا من الظاهر والاستصحاب؛ وقد اعتُبر مرةً: حيثُ شُرِعَ للمدعي البينةُ، وعلى المدعى عليه اليمينُ.

ترجمہ: پھر بیشک یہ بات ہے کہ گواہ میں لحاظ کیا جائے گا اس کے پسندیدہ ہونے کی حالت کا (آیت) اور وہ پسندیدگی عقل سے ہے۔ الی آخرہ (حدیث میں لفظ رَدَّ ہے یعنی یہ جزء قول نہیں، بلکہ فعل نبوی ہے) —— اور وہ بات یعنی اوصاف کا اعتبار اس لئے ہے کہ خبر فی نفسہ صدق وکذب کا احتمال رکھتی ہے۔ اور قرینہ ہی کے ذریعہ دو احتمالوں میں سے ایک احتمال ترجیح پاتا ہے۔ اور وہ قرینہ: یا تو خبر دینے والے میں ہوتا ہے یا مخبر عنہ یعنی بتلائی ہوئی بات میں، یا ان دونوں کے علاوہ میں۔ اور ان میں سے کوئی چیز متعین نہیں جو اس بات کے لائق ہو کہ اس پر حکم تشریعی کا مدار رکھا جائے، سوائے خبر دینے والے کی صفات کے۔ ان کے علاوہ جن کو ہم نے ذکر کیا ہے یعنی ظاہر واستصحاب (یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں) اور تحقیق اعتبار کیا گیا ایک مرتبہ بایں طور کہ مشروع کیا گیا مدعی کے لئے گواہوں کو اور مدعی علیہ پر قسم کو (ظاہر واستصحاب کے معنی ہیں: پہلے سے ایسا ہی ہے۔ عربی تعریف ہے: الحكم بثبوتِ أمر في الزمن اللاحق بناءً على ثبوته في الزمن السابق، أو العكس اھ معجم لغة الفقهاء)

ملحوظہ: قبولِ شہادت کے لئے مثبت ومنفی پہلوؤں سے بیس سے زیادہ شرائط ہیں۔ جو فقہ میں کتاب الشہادات میں

بیان کی گئی ہیں۔شاہ صاحب نے ان شرائط کا استقصا نہیں کیا۔کیونکہ آپ کے پیشِ نظر حکمت کا بیان ہے۔اوراس سوال کا جواب دینا ہے کہ شریعت نے مخبر عنہ وغیرہ میں پائے جانے والے قرائنِ صدق کا اعتبار کیوں نہیں کیا، مخبر (گواہ) کی صفات ہی کا اعتبار کیوں کیا ہے؟اور یہ بات بیان کرنے کے لئے بطورِ مثال چند اوصاف کا بیان کرنا کافی ہے۔

☆ ☆ ☆

مختلف معاملات میں گواہوں کی مختلف تعداد کی وجہ

پھرمختلف معاملات میں گواہوں کی مختلف تعداد مطلوب ہوتی ہے:

۱۔ زنا اور تہمتِ زنا میں چار مرد گواہ ضروری ہیں۔سورۃ النور آیت ۴ میں ارشاد پاک ہے: ''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں کو تہمت لگائیں، پھر وہ چار گواہ نہ لائیں'' آخر آیت تک۔اوراس کی وجہ گذشتہ باب میں بیان کی جاچکی ہے۔

۲۔ حدود وقصاص میں مردوں ہی کی گواہی ضروری ہے۔عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔امام زہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ: ''رسول اللہ ﷺ کے عہد سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ حدود میں عورتوں کی گواہی قبول نہ کی جائے'' (المدونۃ الکبریٰ ۴: ۸۴)

۳۔ اموال میں ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی بھی معتبر ہے۔سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۲ میں ارشاد پاک ہے: ''پس اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں'' (گواہ بنالی جائیں) اور ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی ضرورت کی وجہ اسی آیت میں اللہ پاک نے بیان کردی ہے۔فرمایا: ''تاکہ اگر ان دو عورتوں میں سے کوئی بھی ایک بھول جائے تو ان میں سے ایک دوسری کو یاد دلائے'' یعنی عورتوں کی قوتِ یادداشت کمزور ہوتی ہے۔اس کی تلافی عدد کی زیادتی سے کی گئی ہے۔

ثم اعتبر عددَ الشهود على أطوار، ووَزَّعَها على أنواعِ الحقوقِ:

فالزنا: لايثبت إلا بأربعة شهداء، والأصل فيه قوله تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ، ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ﴾ الآية، وقد ذُكر سببُ مشروعيةِ هذامن قبلُ.

ولا يُعتبر في القصاص والحدود إلا شهادةُ رجلين، والأصل فيه قولُ الزهري رحمه الله تعالى: "جرتِ السنةُ من عهدِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم أن لاتُقبل شهادةُ النساء في الحدود"

ويُعتبر في الحقوق المالية شهادةُ رجل وامرأتين، والأصلُ فيه قولُه تعالى: ﴿فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ﴾ وقد نبَّهَ الله تعالى على سبب مشروعية الكثرة في جانب النساء، فقال: ﴿أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى﴾ يعني هن ناقصات العقل، فلابد من جبر هذا النقصان بزيادة العدد.

ترجمہ: پھر لحاظ کیا گواہوں کی تعداد کا مختلف طریقوں سے، اوران طریقوں کو حقوق کی انواع پر تقسیم کیا..... یعنی

عورتیں ناقص العقل ہیں یعنی ان کی یادداشت کمزور ہے۔ پس ضروری ہے اس کی کی تلافی کرنا تعداد کی زیادتی کے ذریعہ۔

☆ ☆ ☆

ایک گواہ کے ساتھ مدعی کی قسم کے ذریعہ فیصلہ کرنے کی وجہ

حدیث ــــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قسم اور گواہ کے ذریعہ فیصلہ فرمایا (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۳۷۶۳)

تشریح: مدعی کے پاس ایک ہی گواہ ہو تو اموال میں فیصلہ کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دوسرے گواہ کی جگہ مدعی سے قسم لی جائے، اور اس کے حق میں فیصلہ کیا جائے۔ کیونکہ اس کے پاس ایک معتبر گواہ تو ہے، جس سے فی الجملہ دعوی ثابت ہوتا ہے۔ پس جب گواہ کے ساتھ اس کی قسم مل جائے گی تو دعوی مضبوط ہو جائے گا۔ اور مدعی کے حق میں فیصلہ کرنا درست ہو جائے گا ــــ رہا یہ سوال کہ قرآن کریم کی صراحت کے بموجب دو گواہ ضروری ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حدیث نے اس معاملہ میں توسع کیا ہے۔ یعنی قسم کے ساتھ ایک معتبر گواہ بھی کافی ہے۔

فائدہ: فیصلہ کا یہ طریقہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صرف حقوق واموال میں معتبر ہے۔ نکاح وطلاق اور حدود وقصاص میں معتبر نہیں۔ اور احناف کے نزدیک مطلقاً معتبر نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ پر اضافہ خبر مشہور ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ خبر واحد ہے۔ اور حدیث: البينة على المدعي، واليمين على من أنكر کے بھی خلاف ہے۔ اور اُس حکمت سے بھی ہم آہنگ نہیں جسے شاہ صاحب ابھی بیان کر چکے ہیں کہ قسم ظاہر واستصحاب ہی پر کھائی جاتی ہے۔ اور اس کا ایک مرتبہ مدعی علیہ کے حق میں اعتبار کیا جا چکا ہے، پس اس کا دوبارہ مدعی کے حق میں اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

گواہوں کا تزکیہ ضروری ہونے کی وجہ

تعامل یہ چلا آرہا ہے کہ جب کوئی شک کی بات ہو تو دونوں گواہوں کا تزکیہ کیا جائے۔ یعنی ان کا عادل (دیندار) اور صادق ہونا معلوم کیا جائے۔ کیونکہ گواہوں کی گواہی ان کی ان صفات کی وجہ ہی سے معتبر قرار دی گئی ہے جو صدق کو کذب پر ترجیح دینے والی ہیں۔ پس شک کی صورت میں ان کی تحقیق ضروری ہے۔

قسم کو بھاری کرنے کا طریقہ اور اس کی وجہ

اور یہ بھی تعامل چلا آرہا ہے کہ اگر کوئی شک کی بات ہو تو زمان ومکان اور الفاظ کے ذریعہ قسم کو بھاری کیا جائے۔ کیونکہ قسم کے ساتھ مدعی علیہ کی بات اسی لئے قبول کی جاتی ہے کہ وہ صدقِ خبر کا ایک قرینہ ہے۔ کیونکہ دیندار مسلمان جھوٹی قسم کھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ پس جب کوئی شک کی بات ہو تو اس قرینہ کو مزید مضبوط کر لینا مناسب ہے۔ اور اس کی

صورت یہی ہے کہ قسم کو بھاری کیا جائے۔ پس:

ا ـــ الفاظ کے ذریعہ قسم بھاری کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ قسم میں اسماء وصفات کا اضافہ کیا جائے۔ اور اس کی دلیل یہ حدیث شریف ہے:

حدیث ـــ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو قسم کھلائی۔ فرمایا: ''اس اللہ کی قسم کھاؤ جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ مدعی کے لئے تیرے پاس کوئی چیز نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۷۴) اور اس کے مانند دیگر صفات کا اضافہ کیا جائے۔

۲ ـــ اور وقت کے ذریعہ قسم بھاری کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ عصر کی نماز کے بعد قسم کھلائی جائے۔ اور اس کی دلیل سورۃ المائدہ آیت ۱۰۶ میں ارشاد پاک ہے: ''تم ان دونوں کو نماز کے بعد روکو'' اور نماز کی تفسیر عصر سے کی گئی ہے۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بھی ایک واقعہ میں عصر کے بعد قسم کھلائی ہے (درمنثور ۲:۳۴۳)

۳ ـــ اور جگہ کے ذریعہ قسم بھاری کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان قسم کھلائی جائے، مدینہ منورہ میں منبر نبوی کے پاس، اور دیگر شہروں میں جامع مسجد کے منبر کے پاس قسم کھلائی جائے۔ کیونکہ پہلی دو جگہوں کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ اور ان جگہوں میں جھوٹ بولنا بھاری گناہ ہے۔

وقضى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بشاهدويمين؛ وذلك: لأن الشاهدَ العدلَ، إذا لَحِقَ معه اليمينُ تأكَّدَ الأمرُ؛ وأمرُ الشهادات لابد فيه من توسِعَة.

وجرتِ السنةُ: أنه إذا كان رَيْبٌ زُكِّيَ الشاهدان؛ وذلك: لأن شهادتَهما إنما اعتُبرت من جهة صفاتهما المرجِّحَةِ للصدق على الكذب، فلا بد من تَبَيُّنِهَا.

وجرتِ السنة: أنه إذا كان رَيْبٌ غُلِّظَتِ الأيمانُ بالزمان، والمكان، واللفظ؛ وذلك: لأن الأيمان إنما صارت دليلاً على صدق الخبر من جهةِ اقترانِ قرينةٍ، تدل على أنه لايُقْدِمُ على الكذب معها؛ فكان حقُّها ـ إذا كانزيادةُ ريب ـ طلبَ قوةِ القرائن.

فاللفظ: زيادةُ الأسماء والصفات، والأصلُ فيه قولُه صلى الله عليه وسلم: "احْلِفْ بالله الذى لا إلٰه إلا هو، عالمُ الغيب والشهادة" ونحوُ ذلك.

والزمانُ: أن يحلَّف بعد العصر، لقوله تعالى: ﴿تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلاَةِ﴾

والمكانُ: أن يقام بين الركن والمقام، إن كان بمكة؛ وعند منبر رسول الله صلى الله عليه وسلم، إن كان بالمدينة؛ وعند المنبر فى سائر البلدان، لورود فضلِ هذه الأمكنة، وتغليظِ الكذب عندها.

ترجمہ: زیادہ تر واضح ہے۔ ایک جملہ کا ترجمہ یہ ہے: اور وہ بات یعنی قسم کو بھاری کرنا اس لئے ہے کہ قسمیں دلیل بنی ہیں خبر کے سچے ہونے کی: کسی ایسے قرینہ کے ملنے کی جہت ہی سے جو اس بات پر دلالت کرتا ہو کہ وہ (قسم کھانے والا) جھوٹ پر اقدام نہیں کرے گا اُن قسموں کے ساتھ۔ پس قسموں کا حق تھا — جب شک زیادہ ہو — قرائن کی قوت طلب کرنا یعنی اس قرینہ کو مزید مضبوط کر لینا۔

☆ ☆ ☆

احکام قضاء کی خلاف ورزی پر سخت وعیدیں اور اس کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے مقدمات فیصل کرنے کے لئے، اور واقعہ کی حقیقت جاننے کے لئے جو احکام مقرر کئے ہیں، ان کی خلاف ورزی پر سخت وعیدیں سنائی ہیں وہ خلاف ورزیاں اور ان پر وعیدیں درج ذیل ہیں:

① — گواہی چھپانا سخت گناہ ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۸۳ میں ارشاد پاک ہے: ''اور گواہی مت چھپاؤ، اور جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل مجرم ہوگا'' یعنی یہ کوئی سرسری گناہ نہیں، بلکہ دل کی حالت بگاڑ دینے والا کبیرہ گناہ ہے۔ جو شخص کسی معاملہ کی حقیقت سے واقف ہے، اور وہ معاملہ عدالت میں پہنچ گیا ہے، اور صاحبِ حق کا حق ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو اس پر گواہی دینا واجب ہے۔

② — جھوٹی گواہی دینا بہت بڑا گناہ ہے۔ نبی ﷺ نے اس کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ''کبیرہ گناہ: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی شخص کو قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا ہیں (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۰ و ۵۱ باب الکبائر) اور ابوداؤد کی ایک حدیث میں جھوٹی گواہی کو شرک کے برابر قرار دیا ہے (مشکوۃ حدیث ۳۷۷۹)

③ — مدعیٰ علیہ کا جھوٹی قسم کھانا بھی تباہ کر دینے والا گناہ ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس شخص نے روکی ہوئی قسم کھائی یعنی جب مقدمہ میں مدعیٰ علیہ کی طرف قسم متوجہ ہوئی تو اس نے قسم کھائی درانحالیکہ وہ اس میں بدکار (جھوٹا) ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعہ کسی مسلمان کا حق مار لے یعنی اپنے حق میں فیصلہ کرا لے، تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ اس پر غضبناک ہونگے'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۵۹)

④ — جھوٹا دعوی دائر کرنا حرام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے کسی ایسی چیز کا دعوی کیا جو اس کی نہیں ہے تو وہ ہم میں سے نہیں! اور چاہئے کہ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۶۵) رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا کہ وہ ہم میں سے نہیں یعنی ہماری جماعت سے خارج ہے، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے: بڑی سخت وعیدیں ہے۔ اللہ کی پناہ!

⑤ — قاضی کے فیصلہ کی وجہ سے کوئی چیز لینا، حالانکہ وہ اس کی نہیں، تو یہ بھی سنگین جرم اور حرام کھانا ہے۔ قاضی کے فیصلہ سے وہ چیز اس کے لئے جائز نہیں ہوگی۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''میں ایک انسان ہی ہوں یعنی مجھے پوشیدہ چیزوں

کا علم نہیں۔اور تم لوگ میرے پاس اپنے مقدمات لاتے ہو۔اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص چرب زبانی سے اپنی دلیل پیش کرے۔اور میں اس کے حق میں فیصلہ کردوں، تو جس کے لئے میں نے اس کے بھائی کی چیز کا فیصلہ کیا ہے: وہ اس کو ہرگز نہ لے۔میں نے اس کو جہنم کا ایک ٹکڑا ہی کاٹ کر دیا ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۶۱)

(۶) — جھگڑے کی عادت اور مقدمہ بازی کی خو سخت مبغوض خصلت ہے۔اس سے باہمی تعلقات خراب ہوتے ہیں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین شخص جھگڑالو لڑا کو ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۶۲) اور ایک حدیث میں حق و باطل دونوں ہی میں جھگڑا چھوڑنے والے کے لئے نبی ﷺ نے جنت کے اطراف میں ایک محل کی ضمانت لی ہے (ابوداؤد حدیث ۴۸۰۰) اور یہ فضیلت دو وجہ سے ہے: ایک: یہ عالی ظرفی کی بات ہے۔اور عالی ظرفی چار بنیادی کمالات میں سے ہے (رحمۃ اللہ ۱: ۵۳۶) دوم: بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز میں آدمی کا حق نہیں ہوتا۔اور وہ خیال کرتا ہے کہ اسکا حق ہے۔اور مقدمہ کر کے وہ چیز حاصل کر لیتا ہے، پس وہ حرام کھاتا ہے اور گنہ گار رہتا ہے۔ایسے گناہوں سے اجتناب کی بس ایک ہی صورت ہے کہ آدمی حق و باطل دونوں ہی میں جھگڑا نہ کرنے کی خو بنالے۔

احکام قضاء کی مذکورہ بالا خلاف ورزیوں پر تین وجوہ سے وعیدیں سنائی گئی ہیں:

پہلی وجہ: ایسے عمل پر اقدام کرنا جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، اور جس کی سخت ممانعت آئی ہے: پرہیزگاری کی کمی اور اللہ کے سامنے بے باکی اور جسارت کی دلیل ہے۔اور یہ ایک جذبۂ پنہانی ہے، جس کی ترجمانی یہ خلاف ورزیاں کرتی ہیں۔اس لئے مظِنہ کو اصل علت کی جگہ رکھ کر اس پر حکم دائر کیا گیا ہے۔اور بے باکی اور جسارت کی جو سزا ہے وہ ان خلاف ورزیوں کے لئے ثابت کی گئی ہے۔اور وہ سزا دخولِ نار کا وجوب اور جنت سے محرومی وغیرہ ہے۔

دوسری وجہ: یہ خلاف ورزیاں لوگوں پر ظلم کی کوشش ہیں۔اور چوری اور ڈاکہ زنی کے مترادف ہیں۔یا چور کو چوری کرنے کے لئے مال بتلانے جیسی ہیں، یا راہ زنوں کا تعاون کرنے کی طرح ہیں۔پس نظام عالَم خراب کرنے والوں پر جو اللہ تعالیٰ، ملائکہ اور نیک لوگوں کی لعنتیں برستی ہیں وہ ان کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، اور ان کو دوزخ کا مستحق بناتی ہیں۔

تیسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے جو احکام مشروع کئے ہیں: یہ خلاف ورزیاں ان کی مخالفت ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے جو شریعت نازل فرمائی ہے، اور ان کے ذریعہ جن احکام کو رواج دیا ہے: یہ اعمال ان میں روڑا اٹکاتے ہیں۔مثلاً مقدمات میں گواہیاں اور قسمیں اسی لئے مشروع کی گئی ہیں کہ حقیقتِ حال کا پتہ چلے اور صورتِ حال واضح ہو۔پس اگر جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم کا رواج چل پڑے گا تو شریعت نازل کرنے کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا، اس لئے ایسے لوگوں کو سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں۔

نوٹ: شرح میں متن کے مضامین میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔اس کا خیال رکھیں۔

ثم وقعت الحاجةُ أن يُرَهَّبَ الناسُ أشدَّ ترهيبٍ من أن يَجْتَرِءُ وا على خلاف ما شرع الله لهم لفصلِ القضايا ومعرفةِ جلية الحال؛ والأصلُ فى تلك الترهيبات ثلاثةُ أشياء:

أحدها: أن الإقدام على فعلٍ نَهى اللّهُ تعالى عنه، وغَلّظ في النهي: دليلُ قلةِ الورع، والاجتراءِ على الله، فأُدير حكمُ الاجتراء على هذه الأشياء، وأُثبت لها أثَرُه، مثلَ وجوبِ دخول النار، وتحريمِ الجنة، ونحوِ ذلك.

والثاني: أن ذلك سعْيٌ في الظلم، وبمنزلة السرِقة وقطعِ الطريق، أو بمنزلة دَلالةِ السارق على المال ليسرق، أو رِدْءِ القاطع، فتوجهت لعنةُ الله والملائكة والناس على السُّعاة في الأرض بالفساد: إلى هذا العاصي، فاستُحِقَّ النارَ.

والثالث: أنه مخالفةٌ لما شَرَعَ اللّه لعباده، وسعيٌ في سدِّ جَرَيَانِه على ما أراد الله في شرائعه، فإن اليمينَ إنما شُرعت مُعَرِّفَةً للحق، والبينةُ إنما شُرعت مُبَيِّنَةً لجلية الحال؛ فإن جرت السنةُ بزور الشهادة والأيمان انْسَدَّ بابُ المصلحةِ المرعية.

فمن ذلك: كتمان الشهادة، لقوله تعالى: ﴿وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ آثِمٌ قَلْبُهٗ﴾

ومنها: شهادة الزور، لِعَدِّهِ عليه السلام من الكبائر شهادةَ الزور.

ومنها: اليمينُ الكاذبةُ، لقوله صلى الله عليه وسلم: "من حلف على يمينِ صبرٍ، وهو فيها فاجر، ليقتطع بها حقَّ امرىءٍ مسلم: لقي الله تعالى يوم القيامة وهو عليه غضبان"

ومنها: الدعوى الكاذبة، لقوله صلى الله عليه وسلم: "من ادعى ماليس له فليس منا، وليتبوأ مقعده من النار"

ومنها: الأخذ لقضاء القاضي، وليس له الحقُّ، لقوله صلى الله عليه وسلم: "إنما أنا بشر مثلكم، وإنكم تختصِمون إليَّ "الحديث.

ومنها: الاعتياد بالمجادلة ورفعِ القضية، فإن ذلك لايخلو من إفساد ذات البين، لقوله صلى الله عليه وسلم: "إن أبغض الرجال إلى الله الألدُّ الخَصِمُ"، ورَغَّبَ لمن ترك المخاصمة في الحق والباطل جميعاً، فإن ذلك مُطَاوَعَةٌ لداعية السماحة؛ وأيضًا: كثيرًا مَّالايكون الحقُّ له، ويَظُنُّ أن الحقَّ له، فلايخرج عن العهدة باليقين، إلا إذا وَطَّنَ نفسَه على ترك الخصومة في الحق والباطل جميعًا.

ترجمہ: پھر ضرورت پیش آئی کہ لوگ خوف زدہ کئے جائیں بہت زیادہ خوف زدہ کرنا: اس بات سے کہ وہ جسارت کریں اس بات کے خلاف جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مشروع کی ہے قضیوں کے فیصلے اور حقیقت حال کو جاننے کے لئے یعنی جھوٹی گواہی اور جھوٹی قسم کھانے پر وعیدیں سنانا ضروری ہے۔ اور ان ڈراؤں میں بنیادی چیزیں تین ہیں یعنی وہ وعیدیں

تین وجوہ سے سنائی گئی ہیں۔اور یہ تین وجوہ اہم وجوہ ہیں۔اوران کے علاوہ بھی وجوہ ہیں ـــــ ان میں سے ایک: یہ ہے کہ ایسے کام پر اقدام کرنا جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، اور روکنے میں سختی کی ہے: پرہیزگاری کی کمی اور اللہ کے سامنے جسارت کی دلیل ہے۔پس ان چیزوں پر جسارت کرنے کا حکم دائر کیا گیا۔اوران چیزوں کے لئے جسارت کرنے کا اثر (نتیجہ) ثابت کیا گیا، جیسے دخولِ نار کا وجوب، اور جنت کو حرام کرنا، اوراس کے مانند ـــــ اور ثانی: یہ ہے کہ یہ کام ظلم کی کوشش ہیں۔اور چوری اور ڈاکہ زنی کے بمنزلہ ہیں، یا چوری مال پر راہ نمائی کرنے جیسا ہے تاکہ وہ چوری کرے، یا ڈاکو کا مددگار بننے جیسا ہے۔پس متوجہ ہوئی اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی لعنت زمین میں بگاڑ پھیلانے والوں پر: اس گنہ گار کی طرف، پس وہ دوزخ کا حقدار ٹھہرا ـــــ اور ثالث: یہ ہے کہ یہ کام اس بات کے برخلاف ہیں جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مشروع کئے ہے۔اوراس بات کے رواج کو روکنے کی کوشش ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعتوں میں چاہا ہے۔پس بیشک قسم: حق کی معرفت ہی کے لئے مشروع کی گئی ہے۔اور گواہ حقیقتِ حال کو واضح کرنے ہی کے لئے مشروع کئے گئے ہیں۔پس اگر طریقہ چل پڑے جھوٹی گواہی اور قسموں کا تو مصلحتِ مقصودہ کا دروازہ بند ہوجائے گا (اس کے بعد ترجمہ آسان ہے)

لغات: اَلرِّدْءُ: مددگار، معاون، پشت پناہ۔قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: ﴿أَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي﴾ ...... العِدَّةُ (مصدر) شمار کرنا ...... یمینِ صبرٍ (اضافت کے ساتھ ہے) ...... الأخذ لقضاء القاضی میں لام اجلیہ ہے ...... الألدّ اور الخَصِم: مترادف ہیں۔

☆ ☆ ☆

کبھی قبضہ وجہ ترجیح ہوتا ہے

حدیث ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دو شخصوں نے ایک جانور (اونٹنی) میں دعوی کیا۔اور ہر ایک نے گواہ قائم کئے کہ وہ اس کا ہے، اس نے اس کو جنوایا ہے۔یعنی اس کی ماں کو اس نے گابھن کرایا ہے اور وہ اس کے مملوکہ جانور سے پیدا ہوا ہے۔پس نبی ﷺ نے اس شخص کے لئے اس کا فیصلہ کیا جس کے قبضہ میں وہ جانور تھا (مشکوۃ حدیث ۳۷۷۱)

تشریح: اس فیصلہ کی دو بنیادیں ہوسکتی ہیں: ایک: یہ کہ جب دونوں دلیلیں (گواہیاں) ایک دوسرے کے معارض ہوئیں تو دونوں بیکار ہوگئیں۔پس جانور حسبِ سابق قابض کے پاس باقی رہا۔کیونکہ کوئی چیز اس کے قبضہ کی تردید کرنے والی نہیں۔دوم: دو دلیلوں میں سے ایک دلیل یعنی قابض کے گواہ دلیل ظاہر یعنی قبضہ سے مؤید (قوی) ہوگئے، پس اس کو ترجیح دی گئی۔

فائدہ: دعوئ نتاج کی صورت میں مسئلہ اجماعی ہے۔باقی صورتوں میں اختلاف ہے۔تفصیل کے لئے دیکھیں شامی (۴: ۴۹۰ کتاب الدعوی، باب دعوی الرجلین)

وفي الحديث:" أن رجلين تَدَاعَيَا دابةً، فأقام كلُّ واحد منهما البينةَ: أنها دابتُه، نَتَجهَا، فقضى بها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم للذي في يده"

أقول: والسر في ذلك: أن الحجتين لما تعارضَتا تساقطتا، فبقي المتاع في يد صاحب القبض، لعدم ما يقتضي ردَّه، أو نقول: اعتضدت إحدى البينتين بالدليل الظاهر، وهو القبض، فرُجِّحَتْ.

ترجمہ: اور راز اس فیصلہ میں یہ ہے کہ (۱) دونوں دلیلیں جب ایک دوسرے کے معارض ہوئیں تو دونوں ساقط ہوگئیں۔ پس سامان قابض کے ہاتھ میں باقی رہا، اس چیز کے نہ ہونے کی وجہ سے جو قبضہ کے ردکو چاہتی ہے (۲) یا ہم کہیں: دونوں گواہیوں میں سے ایک گواہی دلیل ظاہر (استصحاب) سے قوی ہوئی۔ اور دلیل ظاہر قبضہ ہے، پس وہ ترجیح دی گئی۔

☆ ☆ ☆

دوسرا مقام

منصفانہ فیصلوں کے لئے اصول

مباح الاصل چیزوں میں وجہ ترجیح تلاش کی جائے، اور معاملات میں عرف وعادت کا لحاظ کیا جائے

منصفانہ فیصلہ کرنے کے لئے بھی نبی ﷺ نے چند اصول مشروع فرمائے ہیں، جن کی طرف رجوع کیا جائے یعنی ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر مقدمات کے فیصلے کئے جائیں۔ اور ان اصولوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جب واقعہ کی حقیقت معلوم ہو جائے تو غور کیا جائے کہ معاملہ کی نوعیت کیا ہے؟ کیونکہ نزاعات دو طرح کی چیزوں میں پیش آتے ہیں: مباح الاصل چیزوں میں اور ایسی چیز میں جس میں کوئی عقد ہوا ہو۔ پس:

① — اگر نزاع کسی ایسے امر میں ہوا ہے جو دراصل مباح ہے تو وجہ ترجیح تلاش کی جائے۔ اور اس کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اور وجوہ ترجیح تین ہو سکتی ہیں:

(الف) کسی ایسے وصفِ زائد کو بنائے حکم بنایا جائے جس میں مسلمانوں کا اور اس چیز کا فائدہ ہو۔ جیسے حضرات علی وزید وجعفر رضی اللہ عنہم میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی کی پرورش میں نزاع ہوا آپؐ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر میں بچی کی ماسی (ماں جیسی) ہونے کی وجہ سے، پرورش کا حق ان کو دیا۔ یہ وصف بچی کے لئے مفید ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے بھی اس میں بہتری ہے۔

(ب) یا سبقت (پہلے قبضہ کرنے) کو بناءِ حکم بنایا جائے۔ حدیث میں ہے: مِنىٰ مُناخٌ من سَبَقَ: منیٰ میں جو پہلے پہنچ کر جگہ پکڑ لے وہ اس کی قیام گاہ ہے (ترمذی) اور حدیث میں ہے: مَن أذَّنَ فهو يقيم: جس نے اذان دی وہی تکبیر کہے (مشکوۃ حدیث ۶۴۸)

(ج) یا قرعہ اندازی کی جائے تاکہ کسی کا دل نہ دُکھے۔ حدیث میں ہے کہ اگر لوگ اس ثواب کو جان لیں جو اذان دینے میں اور پہلی صف میں نماز پڑھنے میں ہے، پھر قرعہ اندازی کے علاوہ کوئی ترجیح کی صورت نہ ہو تو وہ ضرور قرعہ اندازی کریں (مشکوۃ حدیث ۶۲۸) اور حدیث میں ہے کہ جب نبی ﷺ کسی سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج میں قرعہ ڈالتے، جس کا نام نکلتا اس کو ساتھ لے جاتے (مشکوۃ حدیث ۳۲۳۲ باب القسم کتاب النکاح)

② — اور اگر نزاع کسی ایسی چیز میں ہوا ہے جس میں پہلے کوئی معاملہ ہو چکا ہے، مثلاً بیع یا غصب ہوا ہے۔ اور ہر فریق دعویدار ہے کہ چیز اس کی ہے۔ اور ہر ایک کے پاس بوگس دلیل بھی ہے تو ایسی صورت میں عرف وعادت کو دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔ اور مقدمہ میں اقرار وعقود کے جو الفاظ ہیں ان کے معنی کی تعیین بھی عرف وعادت کے مطابق کی جائے۔ اور کون ضرر پہنچانا چاہتا ہے یا دوسرے سے کیا چاہتا ہے اس کا فیصلہ بھی عرف کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ مثلاً حضرت براء رضی اللہ عنہ کی اونٹنی ایک انصاری کے باغ میں گھس گئی، اور اس میں نقصان کر دیا ہر ایک اپنی صفائی پیش کرتا تھا، اور دوسرے کو الزام دیتا تھا، جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے عرف وعادت کا لحاظ کر کے فیصلہ کیا کہ باغ والے دن میں اپنے اموال کی حفاظت کریں۔ اور جانور والے رات میں اپنے مواشی کی حفاظت کریں (موطا ۲: ۷۴۷ اقضیہ حدیث ۳۷)

وأما المقام الثاني: فشرع النبيُّ صلى الله عليه وسلم فيه أصولاً يُرجع إليها. والجملة في ذلك: أن جلية الحال إذا كانت معلومةً، فالنزاع يكون:

[۱] إما في طلب كل واحد شيئًا هو مباح في الأصل، وحكمُه: إبْدَاءُ الترجيح:

[الف] إما بزيادة صفةٍ، يكون فيها نفعٌ للمسلمين ولذلك الشيئ.

[ب] أو سَبْقِ أحدهما إليه.

[ج] أو بالقرعة.

مثالُه: قضيةُ زيد وعلي وجعفرٍ رضي الله عنهم في حِضَانة بنتِ حمزة رضي الله عنه، فقضى بها لِجعفرٍ رضي الله عنه، وقال: "الخالة أم!". وقولُه صلى الله عليه وسلم في الأذان: "لاَسْتَهَمُوْا" وكان صلى الله عليه وسلم إذا أراد سفرًا أقرع بين نسائه.

[۲] وإما أن يكون هنالك سابقةٌ من عقد، أو غصب: يدَّعي كلُّ واحد أنه أحقُّ، ويكون لكل واحد شبهةٌ؛ وحكمُه: اتباع العرفِ والعادةِ المسلَّمة عند جمهور الناس، يُفَسَّرُ الأقاريرُ

وألفاظُ العقود بما عند جمهورهم من المعنى، ويُعَرِّف الإضرارَ وغيره بما عندهم.

مثالُه : قضية البراء بن عازب: دخلت ناقته حائطا، فأفسدت فيه، وادعى كل واحد أنه معذور، فقضى بما هو المعروف من عادتهم: من حفظ أهل الحوائط أموالَهم بالنهار، وحفظِ أهل المواشي مواشِيَهم بالليل.

ترجمہ: اور رہا دوسرا مقام: پس نبی ﷺ نے اس مقام میں چند ایسے اصول مشروع فرمائے جن کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اس سلسلہ میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب حقیقتِ حال معلوم ہو، پس نزاع ہوتا ہے: (۱) یا تو ہر ایک کے طلب کرنے میں کسی ایسی چیز کو جو کہ وہ درحقیقت مباح ہے (جیسے آنے والی مثال میں بچی کی تربیت کا دراصل ہر ایک کو حق ہے) اور اس کا حکم: ترجیح ظاہر کرنا ہے: (الف) یا تو کسی صفت کی زیادتی سے جس میں مسلمانوں کا اور اس چیز کا نفع ہو (ب) یا اُن دونوں میں سے چیز کی طرف ایک کے سبقت کرنے کی وجہ سے (ج) یا قرعہ کے ذریعہ (اس کے بعد مثالیں ہیں۔ مگر ان میں (ب) کی مثال نہیں وہ شارح نے بڑھائی ہے۔ ان میں ایک شیئ کی طرف سبقت کی مثال ہے، اور ایک شیئ کے مجاور کی طرف سبقت کی ہے) (۲) اور یا یہ کہ ہو وہاں (مقدمہ میں) پہلے سے کوئی معاملہ یعنی کوئی عقد یا غصب۔ ہر ایک دعوی کرتا ہو کہ وہ زیادہ حقدار ہے۔ اور ہر ایک کے پاس بوگس دلیل ہو۔ اور اس کا حکم: اُس عرف اور عام لوگوں کے نزدیک مسلّم عادت کی پیروی کرنا ہے جو اقرار اور الفاظِ عقود کی تفسیر کرے، اور اس کے ان معنی کے ذریعہ جو ان کے جمہور کے نزدیک ہیں، اور جو نقصان پہنچانے اور اس کے علاوہ کو پہچانوائیں اس بات کے ذریعہ جو جمہور کے پاس ہے (یہ بہت لمبا جملہ ہے۔ شرح میں اس کو کئی جملوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ بات واضح ہو)

☆ ☆ ☆

پانچ ہمہ گیر عدالتی ضابطے

چند ہمہ گیر عدالتی ضوابط ہیں جن پر بہت سے احکام کا مدار ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

پہلا ضابطہ — نفع بعوض تاوان ہے — اس کی اصل یہ حدیث ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نے غلام خریدا۔ وہ اس کے پاس عرصہ تک رہا۔ پھر اس میں کوئی عیب ظاہر ہوا۔ مشتری نے اس کو واپس کرنا چاہا۔ یہ مقدمہ دربارِ نبوی میں آیا۔ آپؐ نے واپسی کا فیصلہ فرمایا۔ بائع کہنے لگا: یا رسول اللہ! مشتری نے میرے غلام کے ذریعہ کمائی کی ہے پس وہ آمدنی بھی مجھے ملنی چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''آمدنی نقصان برداشت کرنے کے عوض میں ہے'' یعنی اگر عیب ظاہر ہونے اور واپس کرنے سے پہلے غلام مرجاتا تو مشتری کا نقصان ہوتا، پس اس زمانہ کی آمدنی بھی اسی کی ہے (ابوداؤد حدیث ۳۵۱۰ کتاب البیوع) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ منافع کی تعیین میں بڑی دشواری ہوگی۔ اور ایک نیا جھگڑا کھڑا

ہو جائے گا۔اس لئے منافع مشتری کا حق قرار دیئے گئے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۴: ۵۹۰)

دوسرا ضابطہ —— جو میراث وغیرہ زمانۂ جاہلیت میں تقسیم ہو چکی ہے اور زمانۂ جاہلیت میں جو خون ہوئے ہیں، اور زمانۂ جاہلیت کے ایسے ہی دیگر معاملات سے اسلام کے بعد تعرض نہیں کیا جائے گا۔ان کو اسی طرح برقرار رکھا جائے گا۔ اور اسلام کے بعد معاملات: از سر نو شروع ہوں گے۔اس کی اصل دو حدیثیں ہیں:

حدیث (۱) —رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كلُّ قَسْمٍ قُسِمَ في الجاهلية فهو على ما قُسِمَ، وكلُّ قَسْمٍ أدركه الإسلام فهو على قَسْمِ الإسلام: ہر وہ بٹوارہ جو زمانۂ جاہلیت میں ہو چکا، وہ اسی طرح باقی رکھا جائے گا۔اور ہر وہ قابل تقسیم چیز جس کو زمانۂ اسلام نے پایا وہ اسلامی اصول پر تقسیم کی جائے گی (ابوداؤد حدیث ۲۹۱۴ کتاب الفرائض)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كلُّ دَمٍ من دم الجاهلية موضوع: جو بھی خون زمانۂ جاہلیت میں ہوا ہے وہ کالعدم ہے (ابوداؤد حدیث ۳۳۳۴ کتاب البیوع) اور احناف کے نزدیک: لایُقتل مسلمٌ بكافرٍ بھی اسی باب سے ہے۔جیسا کہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے۔

تیسرا ضابطہ —— قبضہ بے دلیل نہ ہٹایا جائے۔اور دلیلیں تین ہیں: گواہ، اقرار اور قسم سے انکار —— اس ضابطہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابھی گذری کہ دو شخصوں نے ایک جانور کا دعوی کیا۔اور ہر ایک نے گواہ پیش کئے۔ نبی ﷺ نے تعارض کی بنا پر گواہیوں کو کالعدم کر کے قابض کے لئے جانور کا فیصلہ فرمایا (مشکوۃ حدیث ۳۷۷۱)

یہی ضابطہ استصحابِ حال کہلاتا ہے۔استصحاب کے معنی ہیں: بقاءُ ما كان على ما كان اور الحكمُ على أمرٍ ثابتٍ في وقتٍ: بثبوته في وقت آخر یعنی جو چیز پہلے سے ثابت ہو، اس کو اسی حال پر برقرار رکھا جائے (تفصیل کے لئے دیکھیں شیخ احمد زرقاء رحمہ اللہ کی کتاب شرح القواعد الفقهية قاعدہ نمبر ۴)

چوتھا ضابطہ — اگر کسی معاملہ میں تفتیش کی راہ مسدود ہو جائے یعنی گواہ نہ ہوں، اور حقیقتِ حال جاننے کی کوئی صورت نہ ہو، تو بات صاحبِ مال کی مانی جائے، ورنہ دونوں فریق اپنی چیزیں پھیر لیں۔اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: البيِّعَان إذا اختلفا، والمبيع قائم بعينه، وليس بينهما بينة: فالقولُ ماقال البائع، أو يَترَادَّان البيعَ یعنی بائع اور مشتری میں (مبیع یا ثمن کی مقدار میں) اختلاف ہو، اور مبیع بحالہ قائم ہو یعنی ختم ہو گئی ہو نہ اس میں تبدیلی واقع ہوئی ہو، اور کسی کے پاس بھی گواہ نہ ہوں، تو بائع کا قول قسم کے ساتھ معتبر ہوگا۔اور اگر مشتری اس کی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہو تو دونوں بیع ختم کر دیں (مشکوۃ حدیث ۲۸۸۰ کتاب البیوع) تفصیل پہلے رحمۃ اللہ ۴: ۵۹۰ میں گذر چکی ہے۔

پانچواں ضابطہ: عقد میں فریقین کو ان کا حق پورا پورا دیا جائے اور دونوں کو عقد کی ذمہ داریاں بھی پوری پوری اوڑھائی جائیں۔البتہ جو بات شریعت کے خلاف ہو وہ مستثنیٰ ہے۔اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: ''مسلمان اپنی طے کردہ دفعات پر ہیں، مگر وہ دفعہ جو کسی حلال کو حرام یا کسی حرام کو حلال کرے'' (تفصیل رحمۃ اللہ ۴: ۶۰۶ میں گذر چکی ہے)

یہ چند عدالتی ضابطے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے مقدمات کا منصفانہ فیصلہ کرنے کے لئے مشروع فرمائے ہیں۔

ومن القواعد المبنية عليها كثيرٌ من الأحكام:

[۱] أن الغُنْمَ بالغُرْمِ، وأصلُه ما قضى النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن الخَراج بالضَّمان، وذلك: لِعُسْرِ ضبطِ المنافع.

[۲] وأن قَسْمَ الجاهلية ودماءَ ها، وما كان فيها، لا يُتَعَرَّضُ بها، وأن الأمر مستأنَفٌ بعدَها.

[۳] وأن اليدَ لاتُنقض إلا بدليل آخر، وهو أصلُ الاستصحاب.

[٤] وأنه إن انسدَّ بابُ التفتيش، فالحكمُ أن يكون مايريده صاحبُ المال، أو يَتَرَادَّا، والأصلُ فيه قولُه صلى الله عليه وسلم:" البَيِّعَانِ إذا اختلفا بينهما، والسلعة قائمة" الحديث.

[٥] وأن الأصل في كل عقد: أن يُوَفَّى لكل أحد، وعلى كل أحد، ما التزمَه بعقده، إلا أن يكون عقدًا نهى الشرع عنه، وهو قولُه صلى الله عليه وسلم:" المسلمون على شروطهم، إلا شرطًا أحل حرامًا، أو حرم حلالاً"

فهذا نَبْذٌ مما شرع النبيُّ صلى الله عليه وسلم في المقام الثاني.

ترجمہ: اوران قواعد میں سے جن پر بہت سے احکام کا مدار ہے: (۱) یہ ہے کہ نفع بعوض تاوان ہے۔ اوراس کی دلیل وہ فیصلہ ہے جو نبی ﷺ نے فرمایا کہ:" آمدنی نقصان برداشت کرنے کے عوض میں ہے" اوروہ بات: منافع کے انضباط کی دشواری کی وجہ سے ہے —— (۲) اور یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی تقسیم، اوراس زمانہ کا خون، اور جو باتیں اس زمانہ کی ہیں: ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اور یہ کہ زمانۂ جاہلیت کے بعد معاملہ از سرِ نو ہے —— (۳) یہ ہے کہ قبضہ نہ توڑا جائے مگر دوسری دلیل کے ذریعہ، اوروہ استصحاب کی اصل ہے —— (۴) اور یہ ہے کہ اگر تفتیش کا دروازہ بند ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ اب وہ بات ہوگی جو صاحبِ مال (قابض) چاہتا ہے، یا دونوں اپنی چیزیں واپس پھیر لیں —— (۵) اور یہ ہے کہ ہر عقد میں اصل یہ ہے کہ ہر ایک کو پورا پورا دیا جائے، اور ہر ایک پر پورا پورا لازم کیا جائے گا: اس چیز کو جسے اس نے عقد کے ذریعہ سر لیا ہے۔ مگر یہ کہ کوئی عقد ایسا ہو جس سے شریعت نے روکا ہے۔

☆ ☆ ☆

پانچ نبوی فیصلے

احادیث میں چند واقعات اوران میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلے مروی ہیں، جو درج ذیل ہیں:



پہلا واقعہ: حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی عُمارہ کی پرورش کا معاملہ ہے: سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیوی اوران کی یہ بچی مکہ مکرمہ میں تھی۔ جب عمرۃ القضاء میں نبی ﷺ مکہ سے مراجعت فرما ہوئے تو یہ بچی آپ کو چچا! چچا! کہتی ہوئی پیچھے چلی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو لے لیا، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالے کیا۔ جب قافلہ مَرّ الظہران پہنچا تو اس بچی کی پرورش کا معاملہ خدمتِ نبوی میں پیش ہوا۔ حضرت علیؓ کا کہنا تھا: ''میری چچازاد بہن ہے، اور میں نے اس کو لیا ہے'' پس میرا حق ہے۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا: ''میری بھی چچازاد بہن ہے، اور اس کی خالہ (حضرت اسماء بنت عُمیسؓ) میرے نکاح میں ہے'' پس میرا حق ہے۔ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا: ''میری بھتیجی ہے!'' پس میں قریبی رشتہ دار ہوں، اس لئے میرا حق ہے (نبی ﷺ نے حضرت حمزہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہما میں بھائی چارہ کرایا تھا)

نبی ﷺ نے اس واقعہ میں بچی کی پرورش کا فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے لئے کیا۔ اور وجہ ترجیح یہ بیان کی کہ ''خالہ ماں سی ہے!'' اور حضرت جعفرؓ کے حق میں فرمایا: أشبهتَ خَلقي و خُلقي: آپ حلیہ اور اخلاق میں میرے مشابہ ہیں! اور حضرت علیؓ کے حق میں فرمایا: انت مني و أنا منك: تم میرے ہم مزاج ہو، اور میں تمہارے مزاج کا ہوں! اور حضرت زیدؓ کے حق میں فرمایا: انت اخونا و مولانا: آپ ہمارے دینی بھائی اور ہمارے آزاد کردہ ہیں! تینوں خوش ہوگئے، اور حبشہ والا ایک پیر کا ناچ ناچے! (بخاری حدیث ۴۲۵۱ مع الفتح)

دوسرا واقعہ: نسب کے دعوی کے سلسلہ میں زمعہ کی باندی کے لڑکے کا ہے: حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبد بن زمعہ اس لڑکے کا جھگڑا لیکر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ حضرت سعدؓ نے کہا: یارسول اللہ! یہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے بھائی عُتبہ کا لڑکا ہے۔ انھوں نے مجھے اِس کے لینے کی وصیت کی ہے اور عبدؓ نے کہا: یارسول اللہ! یہ میرا بھائی ہے۔ جب میرے اَبا اس کی ماں کو بیوی کے طور پر رکھتے تھے اس وقت پیدا ہوا ہے۔

اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا: ''اے عبد! وہ تیرے لئے ہے۔ نسب صاحبِ فراش سے ثابت ہوتا ہے۔ اور زنا کی بنا پر نسب کا دعوی کرنے والے کے لئے پتھر ہے!'' (بخاری حدیث ۲۲۱۸)

تیسرا واقعہ: حضرت زبیر اور ایک انصاری کے درمیان حرّہ کے نالے کے پانی کا ہے: آپؐ نے پہلے ایسا فیصلہ کیا جس میں دونوں کی رعایت تھی۔ فرمایا: ''زبیر! سینچائی کرو یعنی اپنے کھیت میں پانی پھرالو، پھر پڑوسی کی طرف پانی جانے دو'' انصاری کہنے لگا: یہ فیصلہ آپؐ نے اس لئے کیا کہ زبیرؓ آپ کے پھوپی زاد بھائی ہیں! ـــ یعنی آپؐ نے جانب داری سے کام لیا۔ اس پر آپؐ کو غصہ آیا۔ اور حضرت زبیرؓ کو ان کا پورا حق دیتے ہوئے فرمایا: ''زبیر! سینچائی کرو، پھر پانی روکو، یہاں تک کہ کھیت مَن تک بھر جائے، پھر پڑوسی کی طرف جانے دو'' (مشکوۃ حدیث ۲۹۹۳)

چوتھا واقعہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ کی اونٹنی کا ہے: وہ ایک انصاری کے باغ میں گھس گئی، اور اس نے نقصان کیا۔ نبی

ﷺ نے فیصلہ فرمایا: ''ارباب اموال (جائدادوالوں) پردن میں ان کی حفاظت ضروری ہے، اورارباب مواشی پررات میں اُن کی حفاظت ضروری ہے'' (موطا ۲: ۷۴۷)

پانچواں واقعہ: شفعہ میں نزاع کے سلسلہ میں نبی ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ شفعہ کا حق صرف اس جائداد میں ہے جس کا ابھی بٹوارہ نہ ہوا ہو۔ پس جب بٹوارہ ہوجائے: سرحدیں قائم ہوجائیں، اور راہیں جدا جدا کردی جائیں تو اب شفعہ کا حق نہیں (اس فیصلہ کی مراد سمجھنے میں اختلاف ہوا ہے۔ تفصیل رحمۃ اللہ ۴: ۵۹۳ میں گذرچکی ہے) شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں: ہم نے ان سب فیصلوں کی وجوہ پہلے بیان کردی ہیں۔

ومن القضايا التي قضى فيها رسولُ الله صلى الله عليه وسلم:

[۱] قضيةُ بنتِ حمزةَ رضي الله عنه في الحِضانة: حيث قال علي رضي الله عنه: بنتُ عمي، وأنا أخذتها؛ وقال جعفر رضي الله عنه: بنتُ عمي، وخالتُها تحتي؛ وقال زيد رضي الله عنه: بنتُ أخي، فقضى بها لجعفر رضي الله عنه، وقال:" الخالة بمنزلة الأم"

[۲] وقضيةُ ابنِ وليدةِ زمعةَ في الدِّعْوَة: حيث قال سعد! إن أخي قد عَهِدَ إليَّ فيه؛ وقال عبد بن زمعة: ابنُ وليدةِ أبي، وُلد على فراشه؛ فقال صلى الله عليه وسلم:" هو لك يا عبدَ بنَ زمعةَ، الولد للفراش، وللعاهر الحجر"

[۳] وقضيةُ الزبير رضي الله عنه والأنصاري في شِرَاجِ الحَرَّةِ: فأشار صلى الله عليه وسلم إلى أمر لهما فيه سَعَةٌ:" اسْقِ يا زبير، ثم أرسل إلى جارك" فغضب الأنصاري، فاستوعىٰ للزبير حقه، قال:" احْبِسِ الماء حتى يرجع إلى الجدر"

[۴] وقضيةُ ناقة براء بن عازب رضي الله عنه: دخلت حائطًا لرجل من الأنصار، فأفسدت فيه، فقضى صلى الله عليه وسلم:" أن على أهل الأموال حفظَها بالنهار، وعلى أهل المواشي حفظَها بالليل"

[۵] وقضى صلى الله عليه وسلم بالشفعة فيما لم يُقسم، فإذا وقعت الحدودُ، وصُرِفت الطرق، فلاشفعة، وقد ذكرنا فيما سبق وجوهَ هذه القضايا.

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: الدِّعوۃ (بکسر الدال) نسب کا دعوی کرنا ..... الشَّرْج: اوپر سے بہہ کر آنے والا نالہ۔ جمع شِرَاج ..... الحرۃ: جگہ کا نام ہے ..... الجَدْر: کھیت کی مینڈھ ..... اِستَوعیٰ: سب کا سب لے لینا۔

☆ ☆ ☆

راستہ سات ہاتھ چوڑا چھوڑنے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب راستہ کے بارے میں تم میں اختلاف ہو، تو اس کی چوڑائی سات ہاتھ رکھی جائے'' (مشکوۃ حدیث ۲۹۶۵ باب الشفعة)

تشریح: جب لوگ کسی مباح زمین کو آباد کریں، اور وہاں شہر بسائیں، اور ان میں راستہ کے بارے میں اختلاف ہو۔ بعض چاہیں کہ راستہ تنگ رکھا جائے، اور وہ اپنی تعمیر آگے بڑھانا چاہیں، اور دوسرے انکار کریں، اور کہیں کہ راستہ کشادہ رکھنا ضروری ہے، تو اس اختلاف کی صورت میں راستہ کم از کم سات ہاتھ چوڑا چھوڑا جائے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی دو سواریاں (ٹرک، بوگی اور باربردار اونٹ) آمنے سامنے آجاتی ہیں۔ پس اگر راستہ سات ہاتھ چوڑا ہوگا تو دونوں سواریاں بہ سہولت گذر جائیں گی، ورنہ تنگی ہوگی۔

غصب کی زمین میں کاشت کرنے کا حکم

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی قوم کی زمین میں، ان کی اجازت کے بغیر کاشت کی، تو اس کے لئے پیداوار میں سے کچھ نہیں، اور اس کے لئے اس کا خرچہ ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۹۷۹ باب المساقاۃ)

تشریح: چونکہ پیداوار زمین کا نماء ہے، اس لئے ساری پیداوار زمین کے مالک کو ملے گی۔ اور کاشتکار گویا زمین والے کا مزدور ہے۔ پس اس کو مزدوری اور دیگر مصارف (بیج کھاد وغیرہ) ملیں گے۔

فائدہ: یہ حضرت امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پیداوار کاشتکار کی ہے، اور زمین والے کو زمین کا کرایہ ملے گا۔ اور کاشتکار کے لئے زمین کے کرایے اور دیگر مصارف کے بقدر پیداوار حلال ہے۔ باقی پیداوار میں ملکِ خبیث ہے، اس لئے اس کا تصدق واجب ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل: حضرت مجاہد رحمہ اللہ کی ایک مرسل روایت ہے (اور حضرت مجاہد کی مرسل روایتیں بالاتفاق مقبول ہیں) فرماتے ہیں: نبی ﷺ کے زمانہ میں چار آدمیوں نے ساجھا کیا: ایک نے کہا: بیج میرے ذمہ، دوسرے نے کہا: محنت میرے ذمہ، تیسرے نے کہا: زمین میری، چوتھے نے کہا: ہل بیل میرے۔ اس طرح انھوں نے کھیتی کی۔ جب کھیتی تیار ہوئی (تو ان میں نزاع ہوا) اور وہ نبی ﷺ کے پاس آئے، آپؐ نے پیداوار کا بیج والے کے لئے فیصلہ کیا۔ اور محنت کرنے والے کو مقررہ مزدوری دلوائی۔ اور ہل بیل والے کو یومیہ ایک درہم دلوایا۔ اور زمین والے کو کچھ نہیں دلوایا (کیونکہ یہ غصب کا معاملہ نہیں تھا۔ اس کی اجازت سے کھیتی کی گئی تھی، اس لئے زمین کو عاریت قرار دیا)

(طحاوی ۲: ۲۶۴ باب الزراعة في أرض قوم إلخ)

اور مذکورہ حدیث اولاً متکلم فیہ ہے۔ ابن الترکمانی نے الجوہر النقی میں اس کے طرق پر مفصل بحث کی ہے (دیکھیں سنن بیہقی ۱۳۶:۶) ثانیاً: اس میں ملک طیّب سے تعرض ہے۔ ''اوراس کے لئے پیداوار میں سے کچھ نہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے لئے حلال وطیب نہیں۔ اور ''اس کے لئے اس کا خرچہ ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ زمین کے کرایہ اور دیگر مصارف کے بقدر پیداوار اس کے لئے حلال وطیب ہے، باقی اس کے لئے حلال نہیں، اس کو صدقہ کردے۔

اور اختلاف کی بناء اس پر ہے کہ پیداوار زمین کا نماء ہے یا بیج کا؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک زمین کا نماء ہے، اس لئے ان کے نزدیک ساری پیداوار زمین والے کی ہے، اور ان کے نزدیک مذکورہ حدیث کا مطلب وہ ہے جو شاہ صاحب قدس سرہٗ نے بیان کیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک پیداوار بیج کا نماء ہے۔ اور ان کے نزدیک مذکورہ حدیث کا مطلب وہ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم

وقال صلى الله عليه وسلم: " إذا اختلفتم في الطريق، جُعِلَ عرضُه سبعةَ أذرع"

أقول: وذلك: أن الناس إذا عَمَّرُوا أرضًا مباحةً، فتَمَصَّرُوْا بها، واختلفوا في الطريق، فأراد بعضُهم أن يُضَيِّقَ الطريقَ، ويَبْنِيَ فيها، وأبى الآخرون ذلك، وقالوا: لابد للناس من طريق واسعةٍ: قُضِي بأن يُجعل عرضُه سبعةَ أذرع.

وذلك: لأنه لابد من مرور قطارين من الإبل، يمشي أحدهما إلى جانب، وثانيهما إلى الآخر، وإذا جاءت زَامِلَةٌ من ههنا، وزاملةٌ من هنالك، فلابد من طريق تَسَعُهُما، وإلا كان الحرجُ، ومقدارُ ذلك سبعة أذرع.

وقال صلى الله عليه وسلم: " من زرع في أرض قوم بغير إذنهم، فليس له من الزرع شيئ، وله نفقتُه"

أقول: جعله بمنزلة أجير، عَمِلَ له عملاً نافعًا؛ والله أعلم.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اور وہ بات (سات ہاتھ چوڑا راستہ چھوڑنا) اس لئے ہے کہ جب لوگ کسی مباح زمین کو آباد کرتے ہیں، اور وہ وہاں بستے ہیں۔ اور ان میں راستہ کے متعلق اختلاف ہوجائے: پس ان کے بعض چاہیں کہ راستہ تنگ کیا جائے، اور وہ اس راستہ میں تعمیر کریں، اور دوسرے اس بات کا انکار کریں، اور کہیں: لوگوں کے لئے کشادہ راستہ ضروری ہے تو اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ راستہ کی چوڑائی سات ہاتھ رکھی جائے —— اور وہ بات اس لئے ہے کہ ضروری ہے اونٹوں کی دو قطاروں کا گذرنا، ایک: ایک جانب سے، اور دوسری: دوسری جانب سے۔ اور جب ایک جانب سے ایک باربردار اونٹ آئے، اور دوسرا باربردار اونٹ دوسری جانب سے آئے تو ضروری ہے کہ اتنا راستہ ہو جو دونوں کے لئے کافی

ہوجائے، ورنہ تنگی پیش آئے گی، اور اس کی مقدار سات ہاتھ ہے۔

میں کہتا ہوں: نبی ﷺ نے کاشتکار کو اس مزدور کے بمنزلہ گردانا جو زمین والے کے لئے مفید کام کرتا ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

باب ــــــ ۶

جہاد کا بیان

مشروعیتِ جہاد کی مصلحتیں

تمام سماوی شریعتوں میں جہاد کا حکم رہا ہے۔ کیونکہ اتم واکمل شریعت وہی ہے جس میں جہاد کا حکم ہو۔ اور اللہ کی تمام شریعتیں کامل ومکمل تھیں۔ اس لئے جہاد کا حکم تمام سماوی شریعتوں کا مشترک حکم ہے۔ اور جہاد کا حکم تین مصلحتوں سے ہے:

پہلی مصلحت ــــ جہاد ایمان کا ذریعہ ہے ــــ اللہ تعالیٰ بندوں کو جو احکامات دیتے ہیں۔ اور ان کی تعمیل کا مکلف بناتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی آقا کے غلام بیمار پڑیں، اور وہ اپنے کسی مخصوص آدمی کو حکم دے کہ ان کو دواء پلاؤ۔ پس اگر وہ ان کو دوا پینے پر مجبور کرے، اور زبردستی دواء ان کے منہ میں ڈالے تو وہ حق بجانب ہوگا۔ مگر رحمتِ خداوندی نے چاہا کہ دواء کے فوائد بیان کئے جائیں، تاکہ بیمار رغبت سے پئیں، اور دواء کے ساتھ شہد بھی ملایا جائے، تاکہ دواء کی عقلی محبت اور شہد کی فطری رغبت ایک دوسرے کے لئے بازو بن جائیں۔

اور لوگوں کی صورت حال یہ ہے کہ بہت سے لوگوں پر گھٹیا خواہشات، درندگی والی صفات اور حب ریاست کے شیطانی خیالات غالب آجاتے ہیں۔ اور ان کے دلوں کے ساتھ ان کے اسلاف کی ریت رواج چمٹ جاتے ہیں۔ اس لئے ایمان لانے کے فوائد ان کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور نبی ﷺ ان کو جو حکم دیتے ہیں: وہ اس کی تابعداری نہیں کرتے، نہ وہ اسلام کی خوبیوں میں غور کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ مہربانی یہ نہیں ہے کہ ان پر حجت قائم کرکے ان کو چھوڑ دیا جائے۔ ان کے ساتھ مہربانی یہ ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے۔ دواء کا کڑوا گھونٹ زبردستی ان کو پلایا جائے۔ یہی ان کے حق میں مفید ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو ان میں سخت گیر اور طاقتور ہیں ان کو تہِ تیغ کردیا جائے، یا ان کا شیرازہ منتشر کردیا جائے اور ان کے اموال چھین لئے جائیں، تاکہ ان کی طاقت ٹوٹ جائے اور وہ بے بس ہوجائیں۔ اور جب ان کی روک ہٹ جائے گی تو ان کے اتباع واذناب اور ان کی آل اولاد ایمان کی طرف مائل ہوگی، اور اطاعت قبول کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے قیصر روم کو جو والا نامہ تحریر فرمایا تھا اس میں یہ بات ہے کہ

''اگر تو نے ایمان قبول نہ کیا تو کاشتکاروں یعنی رعیت کا گناہ تیرے سر ہوگا!'' (بخاری حدیث ۷) کیونکہ وہی ان کے ایمان کی راہ میں روڑا ہوگا۔ اور ایک دوسری حدیث میں جہاد کی اس مصلحت کی طرف اشارہ آیا ہے۔ ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو زنجیروں میں جنت میں داخل کئے جائیں گے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۹۶۰) یعنی وہ لوگ جہاد میں گرفتار ہوکر اسلامی معاشرہ میں آتے ہیں، اور اسلام کی خوبیوں سے آشنا ہوکر دولتِ ایمان سے بہرور ہوتے ہیں، اور جنت سے ہم کنار ہوتے ہیں، معلوم ہوا کہ جہاد لوگوں کے لئے ایمان کا ذریعہ ہے۔

دوسری مصلحت —— جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ دنیا کو سنوارتے ہیں —— انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی مہربانی یہ ہے کہ ان کو نیکوکاری کی راہ دکھائیں۔ ظالموں کو ظلم سے روکیں۔ لوگوں کے دنیوی معاملات، ان کی گھریلو زندگی اور ملکی نظام کو سنواریں —— جن علاقوں پر خونخوار لوگ قابض ہوتے ہیں، اور وہ سخت جنگجو بھی ہوتے ہیں، وہ پورے علاقہ کا ناس مار دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس آفت رسیدہ عضو کی طرح ہیں جس کو کاٹے بغیر جسم درست نہیں ہوسکتا۔ جو شخص جسم کی صحت کا فکر مند ہے: اس پر لازم ہے کہ اس عضو کو کاٹ دے۔ کیونکہ بڑی منفعت کی خاطر چھوٹا ضرر برداشت کیا جاتا ہے۔

اور یہ بات سمجھنے کے لئے قریش کی اور ان کے ارد گرد کے عربوں کی مثال کافی ہے۔ طلوعِ اسلام کے وقت وہ ایمان واحسان سے کوسوں دور تھے۔ کمزوروں پر ستم ڈھاتے تھے۔ باہم برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو قید کرتے تھے۔ ان میں سے بیشتر اسلام کے دلائل میں غور کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ نہ معجزات سے متاثر ہوتے تھے۔ اس صورتِ حال میں اگر نبی ﷺ ان سے جہاد نہ کرتے، اور سخت گیر اور شریر لوگوں کو قتل نہ کرتے تو وہ دینِ اسلام سے بے بہرہ رہتے، عرب میں امن وامان قائم نہ ہوتا۔ اور ان کے گھریلو اور ملکی احوال نہ سنورتے۔ پس جہاد دنیا کے احوال کو سنوارنے کا ایک ذریعہ ہے۔

تیسری مصلحت —— جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انقلاب رونما کرتے ہیں —— بعثتِ نبوی کے وقت دنیا کی صورتِ حال وہ تھی جو مسلم شریف (۱۷:۱۹۷ مصری) کی ایک روایت میں آئی ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین کی طرف نظر کی تو عرب وعجم سبھی پر سخت ناراض ہوئے'' یعنی سارا جہاں گمراہی کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا۔ چنانچہ فیصلۂ خداوندی ہوا کہ عرب وعجم سبھی کی حکومت ختم کردی جائے۔ اور ان کی شہنشاہیت پر بریک لگادی جائے۔ اس لئے نبی ﷺ کے دل میں، اور آپ کے توسط سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ اٹھیں اور راہِ خدا میں لڑیں، تاکہ مرادِ خداوندی برآئے۔ چنانچہ یہ حضرات ان ملائکہ کی طرح ہوگئے جو احکامِ الٰہی کی تعمیل کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ فرق اتنا رہا کہ ملائکہ کسی نظامِ کلی کو لیکر نہیں چلتے، اور یہ حضرات ایک منظم پروگرام لے کر چلے، جو ان پر اللہ تعالیٰ نے نازل کیا تھا۔ اس لئے ان کا عمل اعظم اعمال سے ہوگیا۔ اور ان کا قتل کرنا ان کی طرف منسوب نہیں رہا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگیا۔ جیسے حاکم مجرم کو قتل کرواتا ہے تو وہ قتل جلاد کی طرف منسوب نہیں ہوتا۔ بلکہ آمر کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ اور وہی قاتل شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانفال آیت ۱۷ میں جنگِ بدر کے سلسلہ میں ارشاد پاک ہے: ''پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ

تعالیٰ نے ان کو قتل کیا'' اور اس عالمی انقلاب کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے کہ ''جب کسریٰ (شاہ ایران) ہلاک ہوگا تو اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہوگا۔ اور جب قیصر (شام روم) ہلاک ہوگا، تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہوگا'' (بخاری حدیث ۳۶۱۹) یعنی جاہلیت کے ادیان کے ماننے والے ختم ہوجائیں گے ان کا شہرہ اور دبدبہ ختم ہوجائے گا۔ لوگ دین رحمت کی طرف رجوع کریں گے، اور دنیا کا نقشہ بدل جائے گا۔

﴿ الجهاد ﴾

اعلم: أن أتمَّ الشرائع وأكملَ النواميسِ هو الشرعُ الذى يُؤمر فيه بالجهاد؛ وذلك: لأن تكليفَ اللّٰهِ عباده بما أمر ونهى: مَثَلُه كمثَلِ رجل مَرِضَ عبيدُه، فأمر رجلاً من خاصَّتِه: أن يَسقِيَهم دواءً، فلوأنه قَهَرهم على شرب الدواء، وأَوْجَرَهُ فى أفواههم لكان حقًا، لكنَّ الرحمةَ اقْتَضت أن يُبَيِّنَ لهم فوائدَ الدواء، ليشربوه على رغبةٍ فيه، وأن يُخلط معه العسلُ، ليتعاضدَ فيه الرغبةُ الطبيعيةُ والعقليةُ.

ثم إن كثيرًا من الناس يَغلب عليهم الشهواتُ الدَّنِيَّةُ والأخلاقُ السَّبُعية ووساوسُ الشيطان فى حب الرياسة، ويلصَقَ بقلوبهم رسومُ آبائهم فلايسمعون تلك الفوائدَ، ولا يُذْعنون لما يأمر به النبيُّ صلى الله عليه وسلم، ولا يتأملون فى حُسْنه، فليست الرحمة فى حق أولئك أن يُقتصر على إثبات الحجةِ عليهم، بل الرحمةُ فى حقهم أن يُقهروا، ليدخلَ الإيمانُ عليهم على رغم أنفهم، بمنزلةِ إيجار الدواء المُرِّ، ولا قهرَ إلا بقتل من له منهم نِكايةٌ شديدة وتَمنُّعٌ قويٌّ، أو تفريقِ مَنَعَتِهم وسلبِ أموالهم، حتى يصيروا لايقدرون على شيئ، فعند ذلك يدخُلُ أتباعُهم وذراريهم فى الإيمان برغبة وطوع، ولذلك كتب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى قيصر: "كان عليك إثمُ الأَرِيْسِيِّيْنَ!"

وربما كان أسرُهم وقهرُهم يؤدى إلى إيمانهم، وإلى هذا أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم حيث قال: " عَجِبَ اللّٰهُ من قوم يَدْخُلُوْن الجنةَ فى السلاسل!"

وأيضا: فالرحمة التامة الكاملة بالنسبة إلى البشر: أن يَهديهم اللّٰهُ إلى الإحسان، وأن يَكْبَحَ ظالمَهم عن الظلم، وأن يُصلح ارتفاقاتِهم وتدبيرَ منزلهم وسياسةَ مدينتهم؛ فالمُدُنُ الفاسدةُ التى يَغلب عليها نفوسٌ سبُعية، ويكون لهم تَمنُّعٌ شديد، إنما هو بمنزلة الآكِلَةِ فى بدن الإنسان، لايصح الإنسان إلا بقطعه، والذى يتوجه إلى إصلاح مزاجه وإقامة طبيعته لابد له من

القطع؛ والشرُّ القليلُ إذا كان مُفضيا إلى الخير الكثير: واجب فعلُه.

وللك عبرةٌ بقريش ومن حولهم من العرب: كانوا أبعدَ خلق الله عن الإحسان، وأظلمَهم على الضعفاء، وكانت بينهم مقاتلاتٌ شديدة، وكان بعضهم يَأْسِرُ بعضًا، وما كان أكثرهم متأملين في الحجة، ناظرين في الدليل، فجاهدهم النبيُّ صلى الله عليه وسلم، وقتل أشدَّهم بطشا، وأحدَّهم نفسًا، حتى ظهر أمر الله، وانقادوا له، فصاروا بعد ذلك من أهل الإحسان، واستقامت أمورهم، فلو لم يكن في الشريعة جهادُ أولئك لم يحصل اللطفُ في حقهم.

وأيضًا: فإن الله تعالى غَضِبَ على العرب والعجم، وقضى بزوال دولتهم، وكَبْتِ ملكهم، فنفث في رُوع رسول الله صلى الله عليه وسلم، وبواسطته في قلوب أصحابه رضي الله عنهم: أن يقاتلوا في سبيل الله، ليحصل الأمر المطلوب، فصاروا في ذلك بمنزلة الملائكة، تَسعى في إتمام ما أمر الله تعالى، غيرَ أن الملائكة تَسعى من غيرِ أن يَعْقِدَ فيهم قاعدةٌ كليةٌ، والمسلمون يقاتلون لأجل قاعدة كلية علَّمهم الله تعالى، وكان عملُهم ذلك أعظمَ الأعمال، وصار القتلُ لايُسْنَدُ إليهم، إنما يُسند إلى الآمر، كما يُسند قتلُ العاصي إلى الأمير، دون السيَّاف، وهو قوله تعالى: ﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ﴾ وإلى هذا السر أشار النبيُّ صلى الله عليه وسلم حيث قال: "مَقَتَ عربَهم وعجمَهم" الحديث، وقال عليه السلام: "لاكسرى ولاقيصر" يعني المتديِّنين بدين الجاهلية.

ترجمہ: جہاد کا بیان: جان لیں کہ شریعتوں میں تمام تر اورقوانین میں کامل تر وہی شریعت ہے جس میں جہاد کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور وہ بات یعنی شریعت میں جہاد کا حکم اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کو مکلّف بنانا اُن باتوں کا جن کا حکم دیا ہے یا روکا ہے یعنی اوامر ونواہی کا، اس مکلّف بنانے کا حال اس شخص کے حال جیسا ہے جس کے غلام بیمار پڑے ہوں۔ پس اس نے اپنے خواص میں سے ایک شخص کو حکم دیا کہ وہ ان کو دواء پلائے۔ پس اگر یہ بات ہو کہ وہ ان پر دواء پینے کے لئے زبردستی کرے۔ اور وہ دواء ان کے مونہوں میں ڈالے تو البتہ وہ برحق ہوگا۔ لیکن رحمتِ خداوندی نے چاہا کہ بیماروں کے لئے دواء کے فوائد بیان کئے جائیں، تاکہ وہ اس میں رغبت کرتے ہوئے پئیں۔ اور رحمت نے چاہا کہ دواء کے ساتھ شہد ملایا جائے، تاکہ دواء میں فطری اور عقلی رغبتیں ایک دوسرے کی مدد کریں —— پھر بیشک بہت سے لوگوں پر نگمی خواہشات، درندگی والے اخلاق، اور حکومت کی محبت میں شیطانی خیالات غالب آجاتے ہیں۔ اور ان کے دلوں کے ساتھ ان کے اسلاف کے طریقے چپکتے ہیں۔ پس وہ ان فوائد کو نہیں سنتے۔ اور اس بات کی تابعداری نہیں کرتے جس کا نبی ﷺ حکم دیتے ہیں۔ اور اس کی خوبی میں غور نہیں کرتے۔ پس ان لوگوں کے حق میں یہ بات مہربانی کی نہیں ہے کہ ان

پر حجت قائم کرنے پر اکتفا کی جائے۔ بلکہ ان کے حق میں رحمت یہ ہے کہ وہ مجبور کیے جائیں تا کہ ایمان ان میں داخل ہو ان کی ناک خاک آلود ہونے کے ساتھ، جیسے کڑوی دواء زبردستی منہ میں ڈالنا۔ اور مغلوب کرنا نہیں ہے مگر ان لوگوں کو قتل کرنے کے ذریعہ جن کے لئے ان میں سخت گزند اور مضبوط بچاؤ ہے یا ان کے طاقتوروں کو منتشر کرنے کے ذریعہ، اور ان کے اموال چھین لینے کے ذریعہ، یہاں تک کہ وہ اس حال میں ہوجائیں کہ وہ کسی چیز پر قدرت نہ رکھتے ہوں۔ پس اس وقت ان کے پیروکار اور ان کی اولاد ایمان میں داخل ہوگی رغبت اور تابعداری سے۔ اور اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے قیصر کو لکھا: ''تجھ پر کاشتکاروں کا گناہ ہوگا'' اور کبھی ان کو قید کرنا اور ان پر جبر کرنا پہنچا دیا کرتا ہے ان کے ایمان تک۔ اور اس کی طرف نبی ﷺ نے اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ تعجب کرتے ہیں ان لوگوں پر جو جنت میں زنجیروں میں داخل ہوتے ہیں''

اور نیز: پس رحمتِ تامہ کاملہ انسانوں کے تعلق سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو نیکوکاری کی راہ دکھائیں۔ اور ان کے ظالم کو ظلم سے روکیں۔ اور یہ کہ سنواریں ان کے معاشی امور کو، اور ان کی خانگی زندگی کو، اور ان کے ملکی انتظام کو۔ پس وہ بگڑے ہوئے ممالک جن پر درندہ صفت انسان غالب ہیں، اور ان کے لئے سخت گزند ہے۔ ایسا شخص بدن انسانی میں سڑا لگے ہوئے عضو کے بمنزلہ ہی ہے۔ انسان درست نہیں ہوتا مگر اس کو کاٹنے کے ذریعہ۔ اور وہ شخص جو اس کے مزاج کو سنوارنے کی طرف، اور اس کی طبیعت کو درست کرنے کی طرف متوجہ ہے: ضروری ہے اس کے لئے کاٹنا۔ اور تھوڑی برائی جب خیر کثیر کی طرف پہنچانے والی ہو تو اس کا کرنا ضروری ہے۔ اور آپ سبق لے سکتے ہیں قریش سے، اور ان عربوں سے جو ان کے ارد گرد تھے: وہ اللہ کی مخلوق میں نیکوکاری سے نہایت دور تھے، اور ان میں سب سے زیادہ ظلم کرنے والے تھے کمزوروں پر۔ اور ان میں باہم سخت لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اور ان کے بعض بعض کو گرفتار کرتے تھے۔ اور ان کے بیشتر حجت میں غور کرنے والے، دلیل میں دیکھنے والے نہیں تھے۔ پس ان کے ساتھ نبی ﷺ نے جہاد کیا۔ اور ان میں سے سخت گرفت والے کو اور ان میں سے سب سے تیز مزاج والے کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ اللہ کا معاملہ ظاہر ہوا۔ اور وہ اس کے تابعدار ہوگئے۔ پس ہوگئے وہ اس کے بعد احسان والوں میں سے، اور درست ہوگئے ان کے امور۔ پس اگر شریعت میں ان لوگوں سے جہاد نہ ہوتا تو ان کے حق میں مہربانی حاصل نہ ہوتی۔

اور نیز: پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت غضبناک ہوئے عرب وعجم پر، اور فیصلہ کیا ان کی حکومت کے خاتمہ کا، اور ان کے ملک پر بریک لگانے کا۔ پس ڈالا رسول اللہ ﷺ کے دل میں، اور آپؐ کے توسط سے آپؐ کے اصحاب کے دلوں میں کہ وہ راہِ خدا میں لڑیں، تا کہ امر مطلوب حاصل ہو۔ پس وہ اس معاملہ میں ان فرشتوں کے بمنزلہ ہوگئے جو اس چیز کی تکمیل کی سعی کرتے ہیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرشتے کوشش کرتے ہیں اس کے بغیر کہ ان میں کوئی قاعدہ کلیہ منعقد ہو۔ اور مسلمان ایسے قاعدہ کلیہ کی وجہ سے لڑتے ہیں جو ان کو اللہ نے سکھلایا ہے۔ اور ان کا یہ جہاد کرنا نہایت

مہتم بالشان اعمال میں سے ہے۔اور قتل ان کی طرف منسوب نہیں کیا جاتا، وہ حکم دینے والے ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مجرم کو قتل کرنا امیر کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، نہ کہ جلاد کی طرف۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا'' اور اس راز کی طرف نبی ﷺ نے اشارہ کیا ہے، چنانچہ فرمایا: ''سخت ناپسند کیا ان کے عرب وعجم کو'' اور آپؐ نے فرمایا: ''نہ کسریٰ اور نہ قیصر'' یعنی جاہلیت کے دین کو دین بنانے والے۔

☆ ☆ ☆

فضائل جہاد کی چھ بنیادیں

نصوص میں جہاد اور آلاتِ جہاد کے جو فضائل وارد ہوئے ہیں وہ چند اصول کی طرف راجع ہیں:

اصلِ اول: جہاد نظم خداوندی اور اس کے الہام کی موافقت ہے۔ نظم خداوندی سے مراد دین اسلام ہے، جو انسانوں کی بھلائی کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ اور موافقت کا مطلب وہ ہے جو ابھی مشروعیت جہاد کی دوسری مصلحت میں گذر چکا کہ جہاد نظام اسلامی کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ پس جو لوگ تکمیل جہاد کے لئے محنتیں کرتے ہیں: رحمتِ الٰہی ان کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے۔ اور جو اس کو رائگاں کرنے کے درپے ہوتے ہیں: اللہ کی لعنت ان پر برستی ہے۔ اور اس پُرآشوب دور میں جہاد کو نظر انداز کرنا خیر کثیر سے محرومی ہے۔

اصلِ دوم: جہاد پرمشقت کام ہے۔ اس کے لئے سخت محنت اور جان ومال کی قربانی درکار ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے وطن اور حاجتوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جہاد کے لئے وہی تیار ہوتا ہے جو دین میں مخلص ہوتا ہے۔ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے۔ اور اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ رکھتا ہے۔

اصلِ سوم: جہاد کا جذبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں جو فرشتوں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور فرشتوں سے مشابہت پیدا کرنے میں بڑا نصیبہ ور وہ شخص ہے جو بہیمیت کی برائیوں، اور دل میں زنگ جمنے سے کوسوں دور ہو۔ اس طرح جہاد سلامتیٔ صدر کی علامت بن جاتا ہے۔

مگر یہ تینوں باتیں جب ہیں: جب جہاد اس کی شرائط کے مطابق ہو، یعنی صرف اعلائے کلمۃ اللہ پیش نظر ہو، کوئی دوسری غرض نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص بہادری دکھانے کے لئے یا غیرتِ قومی سے یا نام ونمود کے لئے لڑتا ہے: ان میں سے راہِ خدا میں لڑنے والا کونسا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو: وہی راہِ خدا میں لڑنے والا ہے'' (ترمذی ۱:۱۹۸)

اصلِ چہارم: قیامت کے دن جزاء بصورتِ عمل ظاہر ہوگی۔ حدیث میں ہے: ''جو بھی شخص راہِ خدا میں زخمی کیا جاتا ہے، اور کون راہِ خدا میں زخمی کیا گیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں، وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ زخم

سے خون بہ رہا ہوگا: رنگ خون کا رنگ ہوگا، مگر اس میں مشک جیسی خوشبو ہوگی (مشکوۃ حدیث ۳۸۰۲)

اصلِ پنجم: جہاد کا عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور عادۃً اس کی تکمیل چند چیزوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مصارف درکار ہوتے ہیں۔ گھوڑے پالنے کی اور تیر اندازی سیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ قرار پائیں۔ کیونکہ وہ تحصیل مقصد کا ذریعہ ہیں۔

اصلِ ششم: جہاد سے ملت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور ملت کے کاموں کی شان بلند ہوتی ہے۔ اور امر دین امر لازم ہوتا ہے۔ پس جو مسلمان شعائر اللہ کا انکار کریں ان کے ساتھ بھی جہاد لازم ہے۔

اگر آپ یہ اصول محفوظ کر لیں تو فضائل جہاد کی روایات کی حقیقت جاننے میں کچھ دقت پیش نہیں آئے گی۔ سب فضائل بخوبی سمجھ میں آجائیں گے۔

وفضائل الجهاد راجعةٌ إلى أصول:

منها: أنه موافقةُ تدبيرِ الحق وإلهامِه، فكان السعي في إتمامه سببًا لشمول الرحمة، والسعيُ في إبطاله سببًا لشمول اللعنة، والتقاعدُ عنه في مثل هذا الزمان تفويتًا لخير كثير.

ومنها: أن الجهاد عمل شاق، يحتاج إلى تعب، وبذلِ مال ومُهْجَةٍ، وتركِ الأوطان والأوطار، فلايُقْدِم عليه إلا من أخلص دينَه لله، وآثر الآخرة على الدنيا، وصحَّ اعتمادُه على الله.

ومنها: أنَّ نفثَ مثلِ هذه الداعية في القلب لايكون إلا بتشبُّه الملائكة، وأحظاهم بهذا الكمال أبعدُهم عن شرور البهيمية، وأطرفُهم من رسوخ الرَّيْنِ في قلبه، فيكون معرَّفا لسلامة صدره.

هذا كلُّه: إن كان الجهاد على شرطه، وهو ماسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الرجل يقاتل شجاعة، ويقاتل حَمِيَّة، فأيُّ ذلك في سبيل الله؟ فقال: "من قاتل لتكون كلمةُ الله هي العليا فهو في سبيل الله"

ومنها: أن الجزاء يتحقق بصورة العمل يوم القيامة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "لايُكْلَمُ أحدٌ في سبيل الله — والله أعلم بمن يُكلم في سبيله — إلا جاء يوم القيامة وجُرْحُه يَثْعَبُ دمًا: اللونُ لونُ الدم، والريحُ ريحُ المِسْك"

ومنها: أن الجهاد لما كان أمرًا مرضيًا عند الله تعالى، وهو لايتم في العادة إلا بأشياءَ من النفقات ورباطِ الخيل والرمي ونحوها: وجب أن يتعدى الرِّضا إلى هذه الأشياء، من جهة إفضائها إلى المطلوب.

ومنها: أن الجهاد تكميلُ الملة، وتنويهُ أمرِها، وجعلُه في الناس كالأمر اللازم.
فإذا حفظتَ هذه الأصولَ انكشف لك حقيقةُ الأحاديث الواردة في فضائل الجهاد.

ترجمہ: اور جہاد کے فضائل چند اصول کی طرف راجع ہیں —— ازانجملہ: یہ ہے کہ جہاد انتظام الٰہی اور اس کے الہام کی موافقت ہے۔ پس اس کے اہتمام کی سعی شمولِ رحمت کا سبب ہے، اور اس کے ابطال کی سعی شمولِ لعنت کا سبب ہے۔ اور اس جیسے زمانہ میں جہاد کو چھوڑ بیٹھنا خیر کثیر کو فوت کرنا ہے —— اور ازانجملہ: یہ ہے کہ جہاد ایک دشوار کام ہے۔ وہ سخت محنت، اور جان و مال خرچ کرنے، اور اوطان و حاجات کو چھوڑنے کا محتاج ہے۔ پس اس کے لئے پیش قدمی وہی شخص کرتا ہے جس نے اپنا دین اللہ کے لئے خالص کیا ہو۔ اور وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے، اور اللہ پر اس کا اعتماد درست ہو —— اور ازانجملہ: یہ ہے کہ اس قسم کا جذبہ دل میں ڈالنا نہیں ہوتا مگر ملائکہ کی مشابہت پیدا کرنے کے ذریعہ۔ اور لوگوں میں بڑا نصیبہ ور یہ کمال (فرشتوں کی مشابہت) حاصل کرنے میں: ان میں کا بہیمیت کی برائیوں سے بہت دور، اور اس کے دل میں زنگ کے جمنے سے بہت برطرف شخص ہے۔ پس جہاد اس کے سینہ کی سلامتی کو پہچانوانے والا ہوتا ہے —— اور یہ سب باتیں جب ہیں کہ جہاد اس کی شرط کے مطابق ہو (اس کے بعد ترجمہ واضح ہے)

لغات: تقاعد عن الأمر: کسی کام کو نظر انداز کردینا، چھوڑ بیٹھنا، دلچسپی نہ لینا...... المُهْجَة: روح، جان...... الوطر: حاجت...... أحْظَى: اسم تفضیل حَظَّ (ف) حَظًّا: خوش نصیب ہونا...... أطْرَف: اسم تفضیل: بہت زیادہ دور۔ طَرَفَه عنه: باز رکھنا (رحمۃ اللہ ۲:۳۱۶)...... كَلَمَه: زخمی کرنا...... ثَعَبَ (ف) ثَعْبًا: بہانا۔

تصحیح: من رسوخ الرَّين في قلبه مطبوعہ میں من رسوخ الدين في قلبه تھا۔ یہ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

مجاہدین کے لئے جنت کے سو درجات

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو اللہ تعالیٰ پر اور ان کے رسول پر ایمان لایا، اور اس نے نماز کا اہتمام کیا، اور اس نے ماہِ رمضان کے روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ پر ثابت ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کریں۔ اس نے راہِ خدا میں جہاد کیا ہو یا اپنی اس زمین میں بیٹھا رہا ہو جہاں وہ جنا گیا ہے“ صحابہ نے عرض کیا: ہم یہ خوش خبری لوگوں کو نہ سنا دیں؟ آپؐ نے فرمایا: ”جنت میں سو درجات ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کئے ہیں۔ ہر دو درجوں میں آسمان و زمین کے بقدر تفاوت ہے۔ یعنی آسمان جتنا زمین سے بلند ہے: اوپر کا درجہ نیچے کے درجے سے اتنا ہی بلند ہے۔ پس جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس (بہشت بریں) مانگو یعنی اس کو حاصل کرنے کی محنت کرو۔ کیونکہ فردوس جنت کا عمدہ اور اعلیٰ درجہ ہے۔ اس سے اوپر عرشِ رحمٰن ہے، اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں“ (رواہ البخاری،

مشکوۃ حدیث ۳۷۸۷) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جنت اگر چہ ایمان وعمل پر ضرور ملے گی، مگر یہ بات عام طور پر لوگوں کو نہ بتائی جائے، ان کو جہاد میں مشغول رہنے دیا جائے، تا کہ وہ جنت کے بلند درجات حاصل کریں۔

تشریح: اس حدیث کے ذیل میں شاہ صاحب قدس سرہٗ نے تین باتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی بات ــــ درجات کا مطلب اور ان کو حاصل کرنے کا طریقہ ــــ آخرت میں جگہ کی بلندی: اللہ تعالیٰ کے نزدیک مرتبہ کی بلندی کا پیکر ہے۔ جیسے اللہ کی نزدیکی خوشنودی کا پیکر ہے۔ اس دنیا میں بھی اسٹیج پر وہی لوگ بٹھائے جاتے ہیں جو عالی رتبہ ہوتے ہیں۔

اور اللہ کے نزدیک بلند رتبہ حاصل کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں:

ایک: معرفتِ خداوندی۔ اور وہ اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ تام کرے، اور ذکر وفکر کے ذریعہ نزدیکی حاصل کرے۔ چنانچہ قرآن کی تلاوت کرنے والے کے حق میں آیا ہے کہ اس سے کہا جائے گا: ''پڑھتا جا اور چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا تو دنیا میں پڑھا کرتا تھا۔ تیرا مرتبہ اس آخری آیت کے پاس ہے جس کو تو پڑھے گا'' (مشکوۃ حدیث ۲۱۳۴ فضائل القرآن)

دوسری: جہاد کرنا۔ تا کہ اس کے ذریعہ دین کی، دین کی امتیازی باتوں کی، اور دیگر ان باتوں کی خوب شہرت ہو، جن کی شہرت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ مذکورہ حدیث میں یہی بات ہے کہ جہاد رفع درجات کا سبب اس لئے ہے کہ وہ دین کی سربلندی کا ذریعہ ہے۔ اور جزاء جنس عمل سے ہوتی ہے۔ پس جہاد کا بدلہ اس کے مانند ہے۔ اور جس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں وہ ان شاء اللہ ضرور جنت کے بلند درجات کا حقدار ہوگا۔

دوسری بات ــــ مجاہدین کے لئے سو درجات ہونے کی وجہ ــــ مجاہدین کو جنت میں جو درجات ملیں گے وہ مختلف وجوہ سے ہونگے۔ کیونکہ عملِ جہاد کی مختلف شکلیں ہیں: کوئی شہسوار ہوتا ہے کوئی پیدل۔ کوئی تیرانداز ہوتا ہے کوئی شمشیر زن۔ کوئی خشکی میں لڑتا ہے کوئی سمندر یا فضا میں۔ کوئی معمولی دشمن کو مارتا ہے کوئی خطرناک آدمی کو، اس لئے سب کے درجات مختلف ہوں گے۔ اور عمل کی ہر شکل الگ درجہ میں متمثل ہوگی۔

تیسری بات ــــ تفاوتِ درجات کو بیان کرنے کے لئے آسمان وزمین کے تذکرہ کی وجہ ــــ انسانوں کے علم وادراک میں زیادہ سے زیادہ بلندی آسمان کی ہے۔ اور تفہیم کے لئے وہ پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے جو قابل فہم ہو۔ اس لئے ایک درجہ سے دوسرے درجہ کی بلندی سمجھانے کے لئے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ورنہ اُس بلندی کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور اس کی نظیر ﴿مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ کا محاورہ ہے۔ کیونکہ انسان کے خیال میں جو بڑی سے بڑی مدت آسکتی ہے وہ یہی ہے۔ اور ﴿اِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ﴾ کا استثناء کم کرنے کے لئے نہیں ہے، بلکہ اضافہ کرنے کے لئے ہے۔ یعنی آسمان وزمین کی برقراریت سے زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں (تفصیل کے لئے میری تفسیر

ہدایت القرآن ۴:۱۰۴ ملاحظہ فرمائیں)

[۱] قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: "إن في الجنة مائةَ درجةٍ، أعدها الله للمجاهدين" الحديث.

أقول: سره: أن ارتفاع المكان في دار الجزاء تمثالٌ لارتفاع المكانة عند الله؛ وذلك بأن تَكْسِبَ النفسُ سعادتَها من التطلُّع للجبروت، وغير ذلك، وبأن يكون سببًا لاشتهار شعائر الله، ودينه، وسائرِ مايَرْضى اللهُ باشتهاره، ولذلك كانت الأعمالُ التي هي مظنةُ هاتين الخصلتين: جزاؤُها الدرجات في الجنة؛ فورد في تالي القرآن أنه يقال له: "اقرأ، وارْتَقِ، وَرَتِّلْ كما كنتَ تُرَتِّل في الدنيا" وورد في الجهاد: أنه سببُ رفع الدرجات، فإن عملَه يفيد ارتفاعَ الدين، فَيُجازى بمثل ما تضمَّنه عملُه.

ثم إن ارتفاع المكانة يتحقق بوجوه كثيرة، فكل وجهٍ يتمثل درجةً في الجنة؛ وإنما كان كلُّ درجةٍ كما بين السماء والأرض: لأنه غايةُ ما تمكّن في علوم البشر من البُعد الفوقانيّ، فيتمثل في دار الجزاء كما تمكن في علومهم.

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس کا راز یعنی مجاہدین کے لئے مخصوص درجات ہونے کی وجہ یہ ہے کہ دار جزاء میں جگہ کی بلندی: اللہ کے نزدیک مرتبہ کی بلندی کا پیکر ہے۔ اور وہ بلند رتبہ (۱) بایں طور حاصل ہوتا ہے کہ نفس اپنی نیک بختی کمائے یعنی آدمی سعادت حاصل کرے جبروت (اللہ تعالیٰ) کی طرف جھانکنے اور اس کے علاوہ کے ذریعہ۔ یعنی اللہ کی معرفت حاصل کرے، اور خوب عبادت کرے (۲) اور بایں طور کہ وہ سبب ہو، شعائر اللہ اور اللہ کے دین کو شہرت دینے کا۔ اور دیگر ان چیزوں کی تشہیر کا جن کی تشہیر اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اعمال جو ان دو باتوں کی احتمالی جگہ ہیں: ان کی جزاء جنت کے بلند درجات ہیں (جیسے تلاوتِ قرآن پہلی بات کا مظنہ ہے اور جہاد دوسری بات کا) پس وارد ہوا ہے قرآن کی تلاوت کرنے والے کے بارے میں کہ "پڑھ، اور چڑھ، اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا تو دنیا میں پڑھا کرتا تھا" اور جہاد کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ وہ رفع درجات کا سبب ہے۔ کیونکہ اس کا عمل جہاد دین کی بلندی کا فائدہ دیتا ہے۔ پس بدلہ دیا جائے گا اس عمل کے مانند کے ذریعہ جس کو اس کا عمل شامل ہے یعنی رفع درجات کے ذریعہ —— پھر بیشک مرتبہ کی بلندی پائی جاتی ہے بہت سی وجوہ سے۔ پس ہر وجہ جنت میں ایک درجہ متمثل ہوگی —— اور ہر درجہ میں آسمان وزمین کا تفاوت اسی وجہ سے ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ بلندی ہے جس نے انسان کے علوم میں جگہ بنائی ہے۔ پس وہ بلندی متمثل ہوگی دار جزاء میں جس طرح اس نے ان کے علوم میں جگہ بنائی ہے۔



مجاہد کو روزہ دار شب زندہ دار اطاعت شعار کے ساتھ تشبیہ دینے کی وجہ

حدیث ــ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ جہاد کے برابر کونسا عمل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ عمل تمہارے بس کا نہیں!'' یہی بات دو یا تین بار پوچھی گئی۔ آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ ''وہ عمل تمہارے بس کا نہیں!'' تیسری مرتبہ فرمایا: ''راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی حالت: اُس روزہ دار، نفل گذار، اطاعت شعار کی طرح ہے جو نہ نماز سے ست پڑے، نہ روزے سے، یہاں تک کہ مجاہد لوٹ آئے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۷۸۸ ترمذی ۱:۱۹۵) یعنی ایک آدمی جہاد کے لئے نکلا، دوسرا نماز روزے میں لگا۔ وہ دن میں روزہ رکھتا ہے، اور رات میں نوافل پڑھتا ہے، اور اللہ کا ہر حکم بجالاتا ہے، اور ایک لحہ کے لئے بھی عبادت موقوف نہیں کرتا، وہ عبادت گذار مجاہد کے برابر ہے۔ مگر یہ بہت دشوار عمل ہے کہ آدمی ذرا ست نہ پڑے، اس لئے آپؐ نے فرمایا کہ ''وہ عمل تمہارے بس کا نہیں!''

تشریح: یہاں ایک باریک سوال ہے کہ جب ایسا عمل دریافت کیا گیا ہے جو جہاد کے برابر ہے، تو جواب میں اس عمل کو مشبّہ اور جہاد کو مشبّہ بہ بنانا چاہئے۔ جبکہ حدیث میں مجاہد کو مشبّہ اور صائم وقائم کو مشبّہ بہ بنایا گیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: تشبیہ کے لئے مشبّہ بہ کا اَوضح ہونا ضروری ہے یعنی وہ مشبّہ سے زیادہ واضح ہونا چاہئے۔ اور مجاہد کا حال زیادہ واضح نہیں۔ گو اس کی برتری لوگ جانتے ہیں مگر اجمالاً جانتے ہیں، تفصیلاً نہیں جانتے۔ جیسے لوگ ''مزاج'' پوچھتے ہیں، مگر مزاج کی حقیقت سے بخوبی واقف نہیں ہوتے۔ مزاج کی ماہیت حکیم ہی جانتا ہے۔ اور صائم وقائم کی برتری لوگ خوب جانتے ہیں، ایسے شخص کو ''بزرگ'' تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کی برتری دو وجہ سے ہے: اول: اس طرح عبادت میں لگا رہنا سخت دشوار عمل ہے، جو عابد اللہ کو خوش کرنے کے لئے کرتا ہے۔ اس لئے وہ برتر مانا جاتا ہے۔ دوم: عابد اس عمل سے فرشتوں کے مشابہ ہوجاتا ہے۔ فرشتوں کا حال ہے: ﴿يُسَبِّحُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ وہ شب وروز اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں، ست نہیں پڑتے (الانبیاء، آیت ۲۰) اور مجاہد جب حکم شرع کے مطابق جہاد کرتا ہے تو وہ اس عبادت گذار کی طرح ہوجاتا ہے۔ یعنی اس کا ہر لحہ اور ہر سانس عبادت بن جاتا ہے۔ حدیث میں ہے: فإن نومَه ونُبْهه اجر كلُّه: اس کا سونا اور جاگنا سب باعث اجر ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۸۴۶) جیسے معتکف سویا بھی ہو تو بھی عبادت میں ہوتا ہے۔ مگر مجاہد کا یہ حال خواص ہی جانتے ہیں۔ اس لئے نبی ﷺ نے مجاہد کو صائم وقائم کے ساتھ تشبیہ دی تا کہ سوال کا جواب بھی معلوم ہوجائے۔ اور خود مجاہد کے حال کی بھی وضاحت ہوجائے۔

[۲] قال صلى الله عليه وسلم: "مَثَلُ المجاهدِ في سبيل الله كمثل القانت الصائمِ"

أقول: سره: أن الصائم القانت إنما فُضِّلَ على غيره بأنه عمل عملاً شاقًا لمرضاة الله، وأنه صار بمنزلة الملائكة، ومتشبِّهًا بهم؛ والمجاهدُ إذا كان جهادُه على ما أمر الشرعُ به يُشْبِهُهُ

فی کل ذلك — غیر أن الاجتهاد فی الطاعاتِ یُسَلِّمُ فضلَه الناسُ، وهذا لایفهمه إلا الخاصة — فَشَبَّهَهُ به لینکشف الحالُ.

ترجمہ: اس کا یعنی تشبیہ مقلوبی کا راز یہ ہے کہ روزہ دار فرمانبردار: اس کے علاوہ پر بایں طور ہی برتری دیا گیا ہے کہ (۱) اس نے اللہ کی خوشنودی کے لئے سخت دشوار عمل کیا ہے (۲) اور بایں وجہ کہ وہ بمنزلہ ملائکہ کے ہوگیا ہے، اور ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے والا ہوگیا ہے — اور مجاہد جب اس کا جہاد اس طور پر ہو جس کا شریعت نے حکم دیا ہے تو وہ عبادت گذار کے ساتھ ان سب باتوں میں یعنی دونوں باتوں میں مشابہ ہوجاتا ہے — البتہ یہ بات ہے کہ عبادات میں انتہائی درجہ محنت کی برتری لوگ مان لیتے ہیں، اور یہ عمل (جہاد) اس کو خواص ہی سمجھتے ہیں — پس مجاہد کو عبادت گذار کے ساتھ تشبیہ دی تا کہ (خود مجاہد کی) حالت واضح ہوجائے۔



جہاد کی تیاری کرنے کی ترغیب کی وجہ

پھر ضرورت پیش آئی کہ جہاد کی تیاری کرنے کی، اور اس کے لئے آلات واسباب جمع کرنے کی ترغیب دی جائے۔ کیونکہ سامانِ حرب کے بغیر عام طور پر جہاد ناممکن ہے۔ اس لئے گھوڑے پالنے اور تیراندازی وغیرہ کے فضائل بیان کئے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کا حکم دیتے ہیں، اور اس سے خوش ہوتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ ان مقدمات کے بغیر جہاد کی تکمیل نہیں ہوسکتی، تو اس بات کا تقاضا یہ ہے کہ جہاد کے لئے تیاری کرنے کا حکم دیا جائے۔ اور سامانِ حرب پر خوشی کا اظہار کیا جائے (چنانچہ سورۃ الانفال آیت ۶۰ میں حکم دیا کہ تم سے جس قدر ہوسکے کفار کے لئے سامانِ جنگ تیار کرلو، قوت جمع کرو اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو۔ اور نبی ﷺ نے قوت کی تفسیر تیراندازی سے فرمائی۔ پس ہر دور سے مار کرنے والا کارگر ہتھیار قوت کا مصداق ہے)

نوٹ: آگے دور تک مقدماتِ جہاد کی روایات اور ان کی حکمتیں بیان کی ہے۔

پہرہ دینے کے فضائل

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "راہِ خدا میں ایک دن پہرہ دینا دنیا ومافیہا سے بہتر ہے!" (مشکوۃ حدیث ۳۷۹۱)

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "راہِ خدا میں ایک رات دن کا پہرہ ماہِ رمضان کے روزوں اور اس کی راتوں کی نفلوں سے بہتر ہے۔ اور اگر پہرہ دینے والا (پہرہ دیتے ہوئے) مرگیا تو اس کے لئے اس کا وہ عمل جاری رہتا ہے جو وہ کیا کرتا تھا۔ اور اس پر اس کا رزق (ثواب) جاری رکھا جاتا ہے۔ اور وہ سخت آزمائش میں ڈالنے والے (فرشتہ)

سے محفوظ ہوجاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۹۳) اور ایک روایت میں ہے: ''ہر میت کے عمل پر مہر کردی جاتی ہے، مگر جو شخص راہِ خدا میں پہرہ دیتا ہوا مرجاتا ہے، اس کے لئے اس کا عمل قیامت تک بڑھایا جاتا ہے، اور وہ قبر کی آزمائش سے محفوظ ہوجاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۲۳)

تشریح: ان احادیث میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں جو درج ذیل ہیں:

پہلی بات — راہِ خدا میں پہرہ دینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے — راہ خدا میں چوکیداری کرنا ایک دینی عمل ہے۔ جو آخرت میں باقی رہنے والا ہے۔ اور دنیا کی ہر نعمت ختم ہونے والی ہے۔ اور باقی رہنے والی چیز اگرچہ تھوڑی ہو، فنا ہونے والی چیز سے بہتر ہوتی ہے۔ یہی مطلب ہے دنیا و مافیہا سے بہتر ہونے کا۔ فجر کی سنتوں کے تعلق سے بھی یہی بات وارد ہوئی ہے، اور اس کی بھی یہی وجہ ہے۔ دیکھیں رحمۃ اللہ (۴۷۶:۳) وہاں فائدہ میں ایک سوالِ مقدر کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ وجہ تو ہر دینی عمل اور اس کے ثواب میں متحقق ہے۔ پھر بعض مخصوص اعمال ہی کے سلسلہ میں یہ بات کیوں فرمائی گئی کہ وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں؟ جواب یہ دیا ہے کہ بعض لوگ دنیا کے تھوڑے نفع کی خاطر سنتیں چھوڑ کر، صرف فرض پڑھ کر کام میں لگ جاتے ہیں ان سے کہا گیا کہ دنیا کے چار پیسوں کے لئے ایسا نہ کرو، یہ سنتیں دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں۔ یہی بات یہاں بھی ہے۔ غزوہ میں مالِ غنیمت ملتا ہے، اور وہ چند دن کا کام ہے۔ اور سرحد کا پہرہ دینے میں کوئی مالی منفعت نہیں، اور وہ ایک طویل عمل ہے جس کے لئے دنیا کے کاروبار چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اس لئے یہ بات فرمائی گئی کہ ان باتوں کا کچھ غم نہ کرو۔ ایک دن سرحد کا پہرہ دینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

دوسری بات — چوکیداری کا ماہِ رمضان کے روزوں اور نفلوں سے بہتر ہونا — چوکیداری ایک دشوار عمل ہے۔ اور روزوں اور نفلوں جیسی ریاضت ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر۔ پس جس طرح اُن عبادات سے بہیمیت نابود ہوتی ہے، راہِ خدا میں پہرہ دینے سے بھی بہیمیت فنا ہوتی ہے۔ اور روزوں سے بہیمیت کا زور ٹوٹنے کی تفصیل رحمۃ اللہ (۱۰۴:۴) میں ہے۔

تیسری بات — پہرہ دینے والے کے عمل کو موت کے بعد جاری رکھنا — جہاد کا حال عمارت کے حال جیسا ہے۔ جیسے دیواریں بنیاد پر کھڑی ہوتی ہیں، اور چھت دیواروں پر ٹکتی ہے، اسی طرح جہاد کا بعض بعض پر مبنی ہوتا ہے — اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگلے مہاجرین و انصار: قریش اور ان کے حوالی موالی کے اسلام کا سبب تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قریش کے ذریعہ عراق و شام کو فتح کرایا۔ پھر ان مسلمانوں کے ذریعہ فارس و روم کو فتح کرایا۔ پھر ان کے ذریعہ ہندوستان، ترکستان اور سوڈان فتح کرایا۔ اس طرح جہاد کا فائدہ دن بدن بڑھتا گیا۔ پس جہاد: اوقاف، مسافرخانوں اور دیگر صدقات جاریہ جیسا ہوگیا، اس لئے موت کے بعد بھی اس کا ثواب جاری رہتا ہے۔

چوتھی بات — قبر کی آزمائش سے حفاظت — منکر و نکیر کی طرف سے آفت اس منافق پر آتی ہے جس کا دل اسلام پر مطمئن نہیں۔ اور وہ دینِ اسلام کی نصرت کے لئے آمادہ نہیں۔ اور پہرہ دینے والا، اگر مقررہ شرط کے مطابق پہرہ دے، تو

اس سے بڑا دین کی تصدیق کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ نہ اس سے کوئی بڑا دین کا ناصر ومددگار ہوسکتا ہے۔ پھر اسے منکر ونکیر سے کیا ڈر ہوسکتا ہے؟!

ثـم مسّت الـحاجةُ إلى الترغيب في مقدّمات الجهاد، التي لايتأتّى الجهادُ في العادة إلا بها، كـالـرِّبـاط والـرمـي وغيرهما: لأن الله تعالى إذا أمر بشيئ، ورَضِيَ به، وعَلِمَ أنه لايتم إلا بتلك المقدمات: كان من موجِبه الأمر بها، والرضا عنها.

[۱] ورد في الرِّباط أنه:" خير من الدنيا ومافيها" وأنه:" خير من صيام شهر وقيامه، وإن مات أُجْرِيَ عليه عملُه الذى كان عَمِلَه، وأُجرى عليه رزقُه، وأَمِنَ الفَتَّانَ"

أقول: أمـا سر كونه خيرًا من الدنيا ومافيها :فـلأن لـه ثمرةً باقيةً في المعاد، وكلُّ نعيم من نِعَمِ الدنيا لامحالةَ زائل.

وأمـا كونه خيرًا من صيام شهر وقيامه: فلأنه عملٌ شاقٌّ، يأتي على البهيمية لله وفي سبيل الله، كما يفعل ذلك الصيامُ والقيامُ، بل أكثر من ذلك.

وسِرُّ إجراء عمله: أن الـجهـادَ بـعـضُـه مبنى على بعض، بمنزلة البناء: يقوم الجدار على الأساس، ويقوم السقف على الجدار.

وذلك: لأن الأولين مـن الـمهـاجـريـن والأنصار كانوا سببَ دخول قريش ومَن حَولهم في الإسـلام، ثـم فتـح الله عـلـى أيـدى هؤلاء العراقَ والشامَ، ثم فتح الله على أيدى هؤلاء الفارس والـروم، ثم فتح الله على أيدى هؤلاء الهند والترك والسودان، فالنفعُ الذى يترتب على الجهاد يتزايد حينًا فحينًا، وصار بمنزلة الأوقاف والرباطات والصدقات الجارية.

وأمـا الأمن من الفَتَّانِ يعنى المنكرَ والنكيرَ: فإن المهلكةَ منهما على من لم يطمئن قلبُه بدين محمد صلى الله عليه وسلم، ولم يَنْهَضْ لنصرته، أما المرابطُ على شرطه فهو جامع الهمة على تصديقه، ناهضُ العزيمة على تمشية نور الله.

ترجمہ: واضح ہے۔ چند وضاحتیں یہ ہیں (۱) کالرباط میں رباط بمعنی رباط الخیل ہے۔ اور فی الرباط میں سرحد کی حفاظت کے معنی ہیں......أتى عليه : نابود کرنا......الفَتَّان (اسم مبالغہ) فتنه فتونًا : آزمائش میں ڈالنا۔ اور فتّانا القبر : منکر ونکیر......المهلكة: ہلاکت......الناهض: مستعد ناهض العزيمة: تیار، آمادہ۔

تصحيح: بل أكثر من ذلك: مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے۔

جہاد کے لئے دی ہوئی چیز کو صدقہ کہنے کی وجہ

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے سامانِ جہاد فراہم کیا اس نے جہاد کیا۔ اور جس نے مجاہد کے گھر کی خبر گیری کی اس نے جہاد کیا'' (مشکوۃ حدیث ۳۷۹۷)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین صدقات: راہِ خدا میں خیمہ کا سایہ، راہِ خدا میں خادم کا عطیہ، اور راہِ خدا میں جوان اونٹنی دینا: ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۲۷) یعنی جہاد کے چندہ میں یہ چیزیں دینا بہترین خیراتیں ہیں، کیونکہ یہ چیزیں مجاہدین کے لئے بہت کارآمد ہیں۔

تشریح: یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح مجاہد کے لئے سامانِ جہاد فراہم کرنا اور اس کے گھر کی خبر گیری کرنا جہاد ہے، اسی طرح راہِ خدا میں خیمہ، خادم اور سواری دینا بھی جہاد ہونا چاہئے، پھر دوسری حدیث میں ان کو خیراتیں کیوں کہا گیا ہے؟

جواب: پہلی حدیث میں مجاہد کے تعلق سے جو دو کام کئے گئے ہیں، وہ چونکہ مجاہد کا راست تعاون ہیں، اس لئے ان کو جہاد قرار دیا۔ اور جو چیزیں جہاد کے چندہ میں دی جاتی ہیں، ان پر پہلے حکومت قبضہ کرتی ہے، پھر وہ مجاہدین تک پہنچتی ہیں۔ اور ضروری نہیں کہ وہ ان تک پہنچیں، حکومت مسلمانوں کی دیگر ضروریات میں بھی ان کو خرچ کرسکتی ہے، اس لئے ان کو صدقہ کہا گیا۔ کیونکہ جہاد کے مقصد سے یا صدقہ میں دی ہوئی چیزوں سے اصل مقصود مجاہدین اور فقراء کی اعانت ہے۔ اس لئے نصرت واعانت کے اشتراک سے ان کو صدقہ کہا گیا ہے۔

مجاہد کا قیامت کے دن ہرے زخموں کے ساتھ آنا

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص راہِ خدا میں زخمی کیا جاتا ہے — اور اللہ تعالیٰ اس کو بخوبی جانتے ہیں جو راہِ خدا میں زخمی کیا جاتا ہے — وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، رنگ خون کا رنگ ہوگا، مگر خوشبو مشک جیسی ہوگی'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۰۲)

تشریح: قیامت کے دن شہید کے یہ ہرے زخم اس کی جزائے خیر ہوں گے۔ اور وہ ان سے لطف اندوز ہوگا۔ ''مشک جیسی خوشبو'' میں اس طرف اشارہ ہے۔ اور اس بات کو سمجھنے کے لئے تین باتیں جاننی ضروری ہیں:

۱ — اعمال اپنی ہیئت وصورت کے ساتھ یعنی کماھی نفس کے ساتھ چپک جاتے ہیں۔ لہٰذا شہید کی ''صورتِ شہادت'' بھی اس کے نفس کے ساتھ وابستہ ہوجاتی ہے۔ یہ مضمون تفصیل سے رحمۃ اللہ (۱: ۳۲۲) میں گذر چکا ہے۔

۲ — عمل اور اس کی جزاء میں تضایُف ہے۔ یعنی ایک کا سمجھنا دوسرے پر موقوف ہے، جیسے ابوّت وبنوّت (تفصیل معین الفلسفہ ص ۸۱ و ۸۴ میں ہے) اس لئے عمل میں جزاء کی شان پیدا ہوجاتی ہے، اور جزاء میں عمل کا اثر پہنچ جاتا ہے۔ اس کی حسّی مثال

یہ ہے: ملازم کومہینہ ختم ہونے پر جوتنخواہ ملتی ہے وہ اس کی مہینہ بھر کی محنت ہے۔ اور وہ مہینہ بھر جو کام پر حاضری دیتا ہے وہ بامید تنخواہ دیتا ہے۔ اسی طرح شہید کی صورتِ شہادت میں بھی جزاء کی شان جلوہ گر ہوجاتی ہے۔

۳ — مجازات کا مدار مماثلت پر ہے۔ آخرت میں نعمت وراحت عمل کی قریب ترین صورت میں متمثل ہونگی۔ حدیث میں ہے کہ جیسا جانور قربان کیا ہوگا ویسا ہی آخرت میں ملے گا (مشکوۃ حدیث ۱۴۷۰ بـــاب الأضـحية) البتہ مماثلت میں آخرت کے احوال کا لحاظ ہوگا۔

جب یہ باتیں جان لیں تو اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ جب قیامت کے دن میدانِ محشر میں شہید حاضر ہوگا تو اس پر اس کا عمل ظاہر ہوگا، یعنی وہ ہرے زخموں کے ساتھ آئے گا، اور وہ ان سے لطف اندوز ہوگا۔

[۲] قال صلى الله عليه وسلم: "من جَهَّز غازِيا في سبيل الله فقد غزا، ومن خَلَفَ غازيا في أهله فقد غزا" وقال صلى الله عليه وسلم: " أفضلُ الصدقة ظِلُّ فسطاطٍ في سبيل الله" ونحوُ ذلك.

أقول: السر في ذلك: أنه عملٌ نافع للمسلمين، يترتب عليه نصرتُهم، وهو المعنيُّ في الغزو والصدقة.

[۳] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لايُكْلَم أحد في سبيل الله — والله أعلم بمن يُكلم في سبيله — إلا جاء يوم القيامة وجُرحُه يَثْعَبُ دما: اللون لون الدم، والريح ريح المسك"

أقول: العمل يلتصق بالنفس بهيئته وصورته، ويَجُرُّ ما فيه معنى التضايف بالنسبة إلى العمل، والمجازاةُ مبناها على تمثل النعمة والراحة بصورةِ أقربِ ماهناك، فإذا جاء الشهيدُ يوم القيامة ظهر عليه عملُه، وتَنَعَّمَ به بصورة مافي العمل.

ترجمہ: (۲) راز اس میں یعنی جہاد کے چندہ میں دی ہوئی چیزوں کو صدقہ کہنے میں یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک مفید عمل ہے یعنی وہ چندہ مجاہدین کے ساتھ خاص نہیں۔ اس پر مسلمانوں کی نصرت (فتح) مرتب ہوتی ہے۔ یعنی اگر وہ سامان مجاہدین کو ملا، اور اس کے ذریعہ انھوں نے فتح پائی تو وہ بھی مسلمانوں کی فتح ہے۔ اور جہاد وصدقہ میں وہ (نصرت) توجہ دی ہوئی چیز ہے یعنی دونوں میں اعانت پیش نظر ہوتی ہے۔ اس لئے اشتراکِ علت کی وجہ سے ان چیزوں کو صدقہ کہا گیا ہے۔

(۳) میں کہتا ہوں: (۱) عمل اپنی ہیئت وصورت کے ساتھ یعنی بعینہ نفس کے ساتھ چپکتا ہے (۲) اور وہ اس نسبتی معنی کو کھینچتا ہے جو اس (جزاء) میں ہیں عمل کے تعلق سے یعنی عمل میں جزاء کی شان پیدا ہوتی ہے (۳) اور مجازات کا مدار: نعمت وراحت کے متمثل ہونے پر ہے اس قریب ترین صورت کے ساتھ جو وہاں (آخرت میں) ہے — پس جب قیامت کے دن شہید آئے گا تو اس پر اس کا عمل ظاہر ہوگا۔ اور وہ اس سے خوش حال ہوگا، اس جزاء کی صورت سے جو عمل میں ہے۔

لغت: مَعْنِيٌّ به (اسم مفعول) توجہ طلب بات۔ عُنِيَ بالأمر عناية: توجہ دینا، پیش نظر رکھنا۔

ترکیب: یَجُزُ کا فاعل ھو ضمیر: عمل کی طرف راجع ہے، اور مافیه معنی التضایف: مفعول بہ ہے۔ اور فیہ کی ضمیر جزاء کی طرف راجع ہے۔ اور صلہ کا مِن محذوف ہے أی مافی الجزاء من معنی التضایف إلخ.

تصحیح: معنی التضایف مطبوعہ صدیقی وغیرہ میں معنی التضاعف ہے، جس کے معنی ہیں: دوگنا ہونا۔ یہ تصحیف ہے۔ تصحیح تینوں مخطوطوں سے کی ہے۔

☆ ☆ ☆

شہداء کو روزی دینے کی وجہ

سورۃ آل عمران آیات ۱۶۹ و ۱۷۰ میں ارشاد پاک ہے: ''جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مرا ہوا خیال نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس روزی دیئے جارہے ہیں۔ وہ اُن نعمتوں پر خوشیاں منا رہے ہیں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں''

حدیث —— مذکورہ آیت کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں میں ہیں۔ ان کے لئے عرش کے ساتھ لٹکے ہوئے فانوس ہیں۔ وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں جاتی ہیں۔ پھر ان فانوسوں میں بسیرا کرتی ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۸۰۴)

تشریح: یہاں ایک سوال ہے کہ مرنے کے بعد تو کھانے پینے کی حاجت نہیں رہتی۔ پھر شہداء کو روزی کیوں دی جاتی ہے؟ اور اگر حاجت ہے تو کم از کم بھی صالحین کو روزی دی جانی چاہئے، شہداء کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

جو لوگ راہ خدا میں شہید کئے جاتے ہیں ان میں دو باتیں ایک ساتھ پائی جاتی ہیں:

پہلی بات: موت کے بعد بھی ان کا نسمہ (روح حیوانی جس کا کھانے پینے سے تعلق ہے) کامل و مکمل باقی رہتا ہے۔ دنیوی زندگی میں وہ جن (کھانے پینے کے) تصورات میں ڈوبے ہوئے تھے وہ پاش پاش نہیں ہوجاتے۔ ان کا حال ایسا ہے جیسے کوئی شخص کاروبار میں مشغول ہو، اور ذرا دیر کے لئے سو جائے —— اور دیگر اموات کی صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ وہ موت سے پہلے ایسے سخت امراض میں مبتلا کئے جاتے ہیں جو ان کے مزاج میں تبدیلی پیدا کردیتے ہیں۔ اور بہت سی دنیوی باتیں بھلا دیتے ہیں۔

دوسری بات: اللہ تعالیٰ کی وہ مہربانی جو انتظام عالم کی طرف متوجہ ہے، اور جس سے حظیرۃ القدس اور ملائکہ مقربین لبریز ہیں یعنی وہ رحمت ان کا خاص حصہ ہے: وہ مہربانی شہید کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ اس لئے جب شہید اقامتِ دین کی محنت میں ہمہ تن مشغول ہونے کی حالت میں دنیا سے گذر جاتا ہے تو بارگاہِ عالی اور شہید کے درمیان ایک کشادہ راہ

کھول دی جاتی ہے۔اور بارگاہِ مقدس سے اس پر نعمتیں اور راحتیں نازل ہوتی ہیں۔اور اس پر اللہ تعالیٰ کی مثالی رنگ میں خاص مہربانی ہوتی ہے۔اس لئے شہید کے تصورات کے لحاظ سے جزاء متمثل ہوتی ہے۔

اور ان دونوں باتوں کی ترکیب سے عجیب احوال رونما ہوتے ہیں۔مثلاً:

ا— شہید کی روح عرش الٰہی کے ساتھ ایک خاص نوعیت سے لٹکی ہوئی متمثل ہوتی ہے۔اور وہ نوعیت یہ ہے کہ وہ حاملین عرش فرشتوں میں شامل کرلی جاتی ہے۔اور بارگاہِ عالی کی طرف اس کی خاص توجہ ہوجاتی ہے۔

۲— ان کے لئے سبز رنگ کے پرندوں کے بدن متمثل ہوتے ہیں:

(الف) اور پرندوں کے بدن اس لئے متمثل ہوتے ہیں کہ فرشتوں سے ان کی نسبت ایسی ہے، جیسے زمینی جانوروں کی نسبت پرندوں سے: اجمالی طور پر جنس کے احکام ظہور پذیر ہونے میں۔حیوانیت کے احکام ہیں: موٹا ہونا، خوب کھانا، اور خوب کام کرنا وغیرہ۔جس طرح حیوانیت کے یہ احکام چوپایوں میں کامل ظاہر ہوتے ہیں، اور پرندوں میں ناقص، اسی طرح ملکیت کے احکام فرشتوں میں کامل، اور شہداء میں ناقص ظاہر ہوتے ہیں۔کیونکہ شہداء فرشتے نہیں ہیں، بلکہ ان کے مشابہ ہیں، اس لئے ان کو کم تر حیوانات (پرندے) سواری کے لئے ملتے ہیں۔

(ب) اور وہ پرندے سبز رنگ کے اس لئے ہوتے ہیں کہ یہ خوشنما رنگ ہے۔

۳— اور جس طرح دنیا کی راحتیں اور نعمتیں میووں اور بھونے ہوئے گوشت کی صورت میں پائی جاتی ہیں، شہداء کے لئے وہ نعمتیں جنت کی روزی کی صورت میں متمثل ہوتی ہیں۔

[٤] وقال عليه السلام في قوله تعالى: ﴿وَلَاتَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أَمْوَاتًا، بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ الآية:" أرواحُهم في جوف طير خُضْرٍ، لها قناديلُ معلّقة بالعرش، تَسرح في الجنة حيث شاء ت، ثم تأوى إلى تلك القناديل"

أقول: الذى يُقتل فى سبيل الله يجتمع فيه خصلتان:

إحداهما :أنه تَبقى نَسمتُه وافرةً كاملةً، لم تضمحلَّ علومُها التى كانت منغمسةً فيها فى حياتها الدنيا، وإنما هو بمنزلة رجل مشغولٍ بأمر معاشه، ينام نومةً، بخلاف الميت الذى ابتُلى بأمراض شديدة، تُغيِّرُ مزاجَه، وتُنسِيْه كثيرًا مما كان فيه.

والثانية : أنه شملتْه الرحمةُ الإلٰهية، المتوجهةُ إلى نظام العالَم، والممتلئُ منها حظيرة القدس والملائكةُ المقربون، فلما زهقتْ نفسُه، وهى ممتلئةٌ من السعى فى إقامة دين الله، فُتح بينه وبين حظيرة القدس فَجٌّ واسعٌ، ونزل من هناك الأنسُ والنعمةُ والراحةُ، وتَنَفَّسَتْ إليه حظيرةُ القدس نَفَسًا مثاليًا، فيتمثل الجزاءُ حسبما عنده.

فتركبت من اجتماع هاتين الخصلتين أمور عجيبةٌ:

منها: أنه تتمثل نفسُه معلقةً بالعرش بنحوٍ مَّا، وذلك: لدخوله في حملة العرش، وطموحِ همته إلى ماهنالك.

ومنها: أنه تـمثَّل له بدن طير أخضر: فكونُه طيرًا: لأنه من الملائكة بمنزلة الطير من دواب الأرض في ظهور أحكام الجنس إجمالاً؛ وكونُه أخضر: لحسن منظره.

ومنها: أنه تتمثل نعمتُه وراحتُه بصورة الرزق، كما كان يتمثل النعمةُ في الدنيا بالفواكه والشِّوَاءِ.

ترجمہ: واضح ہے۔ چندوضاحتیں یہ ہیں: خُضر: اَخضر کی جمع ہے، اور طیر: اسم جنس ہے..... سَرَحتِ الماشيةُ: نکلنا، جانا..... ينام نومةً: کاروبار کرتے کرتے تھوڑی دیر کے لئے اچانک آنکھ لگ گئی..... بخلاف الميت إلخ یہاں یہ خیال نہ کیا جائے کہ کچھ لوگ اچانک مرجاتے ہیں۔ وہ دنیوی معاملات بھولتے نہیں، پھران کو رزق کیوں نہیں دیا جاتا؟ جواب یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں صرف پہلی بات متحقق ہوتی ہے، دوسری بات متحقق نہیں ہوتی، اس لئے وہ روزی نہیں دیئے جاتے..... پہلی جگہ حظيرة القدس اور الملائكة المقربون ایک ہی چیز ہیں۔ عطف تفسیری ہے..... دوسری جگہ حظیرۃ القدس سے ذات بے چگوں مراد ہے..... فَجّ واسع: مطبوعہ میں فيح واسع ہے یہ تصحیح مخطوطہ کراچی اور مطبوعہ صدیقی سے کی ہے..... تَنَفُّس: سانس لینا: اور اللہ کا سانس لینا کنایہ ہے عنایات مبذول کرنے سے۔

☆ ☆ ☆

شرعی اور غیر شرعی جہادوں میں امتیاز

پھر یہ بات ضروری ہے کہ شرعی اور غیر شرعی جہادوں میں امتیاز کیا جائے۔ کیونکہ دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ شرعی جہاد سے نفس سنورتا ہے، اور غیر شرعی جہاد سے بگڑتا ہے۔

شرعی جہاد دو مقاصد کے لئے ہے: ایک: قبیلہ، شہر، مملکت اور ملّت کے نظم و انتظام کے لئے۔ دوم: مجاہدین کے نفوس کی تکمیل و تہذیب کے لئے۔ جس جنگ میں یہ مقاصد نہ ہوں وہ شرعی جہاد نہیں، جیسا کہ درج ذیل حدیث سے معلوم ہوتا ہے:

حدیث — ایک صاحب نے پوچھا: ایک شخص مالِ غنیمت کے لئے لڑتا ہے، دوسرا ناموری کے لئے، اور تیسرا بہادری کا جوہر دکھانے کے لئے: ان میں سے راہِ خدا میں لڑنے والا کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بول بالا ہو وہی راہِ خدا میں لڑتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۱۴)

تشریح: اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے جو جنگ کرتا ہے وہی شرعی جہاد اس لئے ہے کہ اعمال تو ڈھانچے ہیں۔ ان میں جان نیتوں سے پڑتی ہے۔ روح کے بغیر جسم لاش (لاشیء) ہے۔ پس جیسی نیت ہوگی ویسا عمل ہوگا۔ پہلے تین شخصوں کی نیت

صحیح نہیں، اس لئے وہ شرعی جہاد نہیں۔ اور جو اللہ کا بول بالا کرنے کیلئے لڑتا ہے، اس کی نیت صحیح ہے، اس لئے وہی شرعی جہاد ہے۔

محض نیت سے ثواب کب ملتا ہے؟

کبھی محض نیت پر ثواب ملتا ہے۔ کیونکہ روح جسم کے بغیر بھی پائی جاتی ہے۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کسی سماوی عذر کی وجہ سے عمل فوت ہوجائے۔ آدمی کی اپنی کوتاہی اس میں شامل نہ ہو، مثلاً آدمی نابینا، بوڑھا یا لولا ہونے کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہ کرسکے۔ یا کسی زمانہ میں جہاد جاری نہ ہو، تو ایسی صورت میں جہاد کی پکی نیت پر بھی ــــ اور اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ کس کی نیت پکی ہے ــ جہاد کا ثواب ملے گا۔ درج ذیل حدیث اس کی دلیل ہے:

حدیث ــــ نبی ﷺ غزوۂ تبوک سے مراجعت فرما ہوئے۔ جب مدینہ قریب آیا تو فرمایا: ''مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم جو بھی راستہ چلے ہو، یا جو بھی میدان طے کیا ہے وہ تمہارے ساتھ تھے'' اور ایک روایت میں ہے: ''وہ تمہارے ساتھ ثواب میں شریک تھے'' صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مدینہ میں رہتے ہوئے؟ آپؐ نے فرمایا: ''مدینہ میں رہتے ہوئے۔ کیونکہ ان کو عذر نے روک رکھا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۱۵)

اور اگر کوتاہی کی وجہ سے عمل فوت ہوا ہے تو اجر کا مستحق نہیں۔ کیونکہ اس کی نیت پکی نہیں۔ پکی نیت وہ ہے جس پر عمل مرتب ہو۔ ضعیف نیت پر اجر نہیں ملتا۔

ثم مست الحاجةُ إلى تمييز ما يُفيد تهذيبَ النفس ممالا يُفيدُه، وهو مشتبهٌ به، فإن الشرع أتى بأمرين: بانتظام الحي والمدينة والملّة، وبتكميل النفوس:

قيل: الرجلُ يقاتل للمغنم، والرجلُ يقاتل للذِّكر، والرجلُ يقاتل لِيُرى مكانُه، فمن يقاتل في سبيل الله؟ قال صلى الله عليه وسلم: " من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله"

أقول: وذلك لما ذكرنا من أن الأعمال أجساد، وأن النياتِ أرواح لها، وإنما الأعمال بالنيات، ولا عبرةَ بالجسد إلا بالروح.

وربما تفيد النيةُ فائدةَ العمل، وإن لم يقترن بها؛ إذا كان فوتُه لما نع سماوي، دون تفريطٍ منه، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: " إن بالمدينة أقوامًا، ماسِرْتم مسيرا، ولا قطعتم واديا، إلا كانوا معكم، حَبَسَهم العذرُ"

وإن كان من تفريطٍ: فإن النية لم تَتِمَّ حتى يترتب عليها العمل.

ترجمہ: واضح ہے۔ وھو مشتبہ بہ ترجمہ: اور تہذیب نفس کا فائدہ دینے والا جہاد ملتا جلتا ہے نہ فائدہ دینے والے جہاد سے۔ قولہ: وإن لم يقترن بها: اگرچہ عمل سے نہ ملا ہو یعنی عمل وجود میں نہ آیا ہو، صرف نیت کی ہو۔

جہاد چھوڑ دینا قوم کی ذلّت کا سبب ہے

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''برکت گھوڑوں کی پیشانیوں میں ہے!'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۳۸۶۶)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک خیر بندھی ہوئی ہے: ثواب یا غنیمت!'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۶۷)

حدیث (۳) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم بیع عِینہ کرنے لگو، بیلوں کی دُمیں پکڑلو، اور کھیتی باڑی پرخوش ہوجاؤ، اور جہاد تج دو، تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کردیں گے، جسے اس وقت تک نہیں ہٹائیں گے جب تک تم اپنے دین کی طرف نہ لوٹو!'' (ابوداؤد حدیث ۳۴۶۲)

تشریح: نبی ﷺ کی بعثت خلافتِ عامہ کے لئے ہوئی ہے۔ سورۃ الصف آیت ۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اللہ وہی ہیں جنھوں نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دیکر بھیجا، تا کہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردیں، گو مشرکین کیسے ہی ناخوش ہوں!'' اور آپ کے دین کا غلبہ دیگر ادیان پر جہاد ہی کے ذریعہ متحقق ہوسکتا ہے۔ اور جہاد اسباب کی فراہمی پر موقوف ہے۔ اور گھوڑے بہترین سامانِ جہاد ہیں، اس لئے ان کو تیار رکھنے کی ترغیب دی۔

اور جب مسلمان جہاد چھوڑ دیں گے، بیلوں کی دُمیں پکڑلیں گے، اور مکارم اخلاق سے رشتہ توڑ لیں گے، غریبوں کا تعاون کرنے کے بجائے ان کا خون چوسنے لگیں گے تو ان پر ذلت مسلط کردی جائے گی۔ اور دوسرے مذاہب والے ان پر غالب آجائیں گے۔ اور یہ صورتِ حال اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک وہ دین کی طرف نہیں لوٹیں گے، اور جہاد شروع نہیں کریں گے۔

گھوڑے کا چارہ پانی اور لید پیشاب تولا جائے گا

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوئے، اور اس کے وعدہ کی تصدیق کرتے ہوئے راہِ خدا میں کوئی گھوڑا پالا تو اس کی شکم سیری و سیرابی، اور اس کی لید پیشاب قیامت کے دن اس کی ترازو میں ہوگی'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۶۸)

تشریح: یہ چارہ پانی اور لید پیشاب دنیا والا نہیں، بلکہ اس کا اجر وثواب ہے۔ جب گھوڑا پالنے والے نے ان چیزوں میں مشقت برداشت کی تو اس کا یہ عمل اس کے نفس کے ساتھ چپک گیا۔ پھر عمل اور اس کی جزاء میں اضافی تعلق ہونے کی وجہ سے صورتِ عمل میں جزاء کی شان پیدا ہوگئی۔ چنانچہ قیامت کے دن اس کی جزاء بصورتِ عمل متمثل ہوگی (اس کی تفصیل ابھی شہید کے ہرے زخموں کے بیان میں گذر چکی ہے)

تیر سازی، تیراندازی اور مجاہد کو تیر دینے کی فضیلت

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین شخصوں کو جنت میں داخل کرتے ہیں: اس کے بنانے والے کو، جس نے بہ امید ثواب اس کو بنایا ہے، اور اس کے چلانے والے کو، اور چلانے کے لئے دینے والے کو (خواہ وہ اس کا مالک ہو، یا صرف میدان میں پہنچا رہا ہو) پس تیر اندازی کرو، اور شہ سواری سیکھو۔ اور تیر اندازی مجھے شہ سواری سے زیادہ پسند ہے۔ ہر وہ کام جس سے آدمی دل بہلاتا ہے بے کار ہے۔ مگر کمان سے تیر چلانا، گھوڑے کو سدھانا، اور بیوی سے دل لگی کرنا: پس بیشک یہ برحق کام ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۷۲)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے راہِ خدا میں تیر چلایا: وہ اس کے لئے غلام آزاد کرنے کے برابر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۷۳)

تشریح: اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہے کہ ان چیزوں کے بغیر کفار کو دبایا نہیں جاسکتا۔ اور کفار کو زیر کرنا اور ان کے کفر وظلم کا خاتمہ کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اس لئے اللہ کی وہ خوشنودی ان چیزوں کے ساتھ متعلق ہوگئی۔ اور یہ کام بھی باعث اجر قرار پائے۔

قال صلى الله عليه وسلم: " البركة في نواصي الخيل" وقال عليه السلام: " الخيلُ معقود في نواصيها الخير إلى يوم القيامة: الأجرُ والغنيمة"

اعلم: أن النبي صلى الله عليه وسلم بُعث بالخلافة العامة، وغلبةُ دينِه على سائر الأديان لايتحقق إلا بالجهاد، وإعدادِ آلاتِه، فإذا تركوا الجهادَ، واتبعوا أذنابَ البقر: أحاط بهم الذل، وغلب عليهم أهلُ سائر الأديان.

قال صلى الله عليه وسلم: " من احتبس فرسًا في سبيل الله، إيمانا بالله، وتصديقًا بوعده، فإن شِبَعَه، ورِيَّه، ورَوْثَه، وبولَه في ميزانه يوم القيامة"

أقول: ذلك: لأنه يتعانى في عَلَفه وشرابه، وفي رَوثه وبوله، فصار عملُه ذلك متصورًا بصورة ماتعانى فيه، فيظهر يوم القيامة كلُّ ذلك بصورته وهيئته.

قال صلى الله عليه وسلم: " إن الله يُدخل بالسهم الواحد ثلاثةَ نفرٍ الجنةَ: صانعَه، يحتسب في صَنعه، والراميَ به، ومُنَبِّلَه" وقال عليه السلام: " من رمى بسهم في سبيل الله، فهو عِدْلُ مُحَرَّرٍ"

أقول: لما عَلِمَ الله تعالى أن كَبْتَ الكفار لايتم إلا بهذه الأشياء: انتقل رِضا الحق بإزالة الكفر والظلم: إلى هذه.

ترجمہ: اور وہ بات یعنی مذکورہ چیزوں کا میزانِ عمل میں ہونا اس لئے ہے کہ اس نے مشقت برداشت کی ہے گھوڑے کے چارے اور اس کے پانی میں، اور اس کی لید اور پیشاب میں، پس اس کے یہ اعمال خیال کیے ہوئے ہوگئے اس چیز کی صورت کے ساتھ جس میں اس نے مشقت برداشت کی ہے۔ پس ظاہر ہونگی یہ سب چیزیں قیامت کے دن اپنی ہیئت وصورت کے ساتھ۔



اصحابِ اعذار کے لئے جہاد معاف ہونے کی وجہ

سورۃ الفتح آیت ۱۷ میں ارشاد پاک ہے: "نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے، اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے، اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے"
سورۃ التوبہ آیت ۹۱ میں ارشاد پاک ہے: "کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں، اور نہ بیماروں پر، اور نہ ان لوگوں پر جن کو خرچ کرنے کو میسر نہیں"

حدیث —— ایک صاحب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انھوں نے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے پوچھا: "کیا تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟" انھوں نے کہا: ہاں! آپؐ نے فرمایا: "تو ان دونوں میں جہاد کر" اور ایک روایت میں ہے: "پس آپ لوٹ جائیں اور ان دونوں کے ساتھ اچھی طرح رہیں" (مشکوۃ حدیث ۳۸۱۷) غالباً صورتِ واقعہ یہ ہوگی کہ جہاد کے لئے جتنی تعداد مطلوب ہوگی وہ حاصل ہو چکی ہوگی۔ اب یہ صاحب باہر سے آئے ہیں اور جہاد میں شرکت کے خواہاں ہیں۔ اس لئے ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے نبی ﷺ نے ان کو حسنِ تدبیر سے واپس کر دیا۔

تشریح: سبھی لوگوں کا جہاد کے لئے نکل جانا امورِ معاش کو فاسد کر دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ آیت ۱۲۲ میں ارشاد پاک ہے: "مسلمانوں کو یہ نہ چاہئے کہ سب کے سب جہاد کے لئے نکل کھڑے ہوں" حسبِ ضرورت ہی لوگوں کو نکلنا چاہئے۔ بے ضرورت بھیڑ بے فائدہ ہوتی ہے، اور ان کے مصارف کا بار بھی پڑتا ہے۔ پھر جہاد کے لئے ان لوگوں کو نکلنا چاہئے جو معذور نہیں۔ معذور اول تو مجبور ہیں، پھر ان سے کوئی معتد بہ فائدہ بھی نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ کبھی ان کو ساتھ لے جانا ضرر رساں ہو جاتا ہے۔

جنگ میں بھاگنا کیوں حرام ہے؟ اور دس گنا سے دوگنا تک تخفیف کی وجہ

سورۃ الانفال آیات ۱۵ و ۱۶ میں ارشاد پاک ہے: "اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرنا۔ اور جو شخص ان سے اس موقعہ پر پشت پھیرے گا — مگر جو لڑائی کے لئے پینترا بدلے یا اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آئے تو وہ مستثنیٰ ہے — وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا، اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے"

اورسورۃ الانفال آیت ۶۵ میں دس گنا سے مقابلہ ضروری قرار دیا گیا تھا، پھر آیت ۶۶ میں ارشاد فرمایا: ''اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کردی، اور جانا کہ تم میں کمزوری ہے''

تفسیر: جنگ میں بھاگنا دووجہ سے حرام ہے:

پہلی وجہ: اللہ کا دین اسی وقت سر بلند ہوسکتا ہے جب مسلمانوں میں ثبات قدمی اور بہادری کا جوہر موجود ہو۔ اور وہ صبر وہمت سے جنگ کی سختیاں جھیلیں۔ اگر یہ عادت چل پڑے کہ لوگ خطرہ کی بو محسوس کرتے ہی بھاگ کھڑے ہوں تو مقصود فوت جائے گا۔ بلکہ نوبت کبھی رسوائی تک پہنچ جائے گی۔ اس لئے جب کافروں سے دوبدو مقابلہ ہوتو بھاگنا حرام ہے۔

دوسری وجہ: مقابلہ سے بھاگنا نامردی اور کمزوری ہے، جو بدترین اخلاق ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بالکل پاک ہونا چاہئے۔

پھر ضروری ہے کہ وہ تعداد متعین کی جائے جس سے مقابلہ فرض ہے اور بھاگنا حرام ہے۔ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ بہادری اور جوانمردی یہ ہے کہ شکست کے اسباب: غلبہ کے اسباب سے زیادہ ہوں تب بھی ڈٹ کر مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اولاً (جنگ بدر کے موقعہ پر) دس گنا سے مقابلہ ضروری قرار دیا گیا۔ کیونکہ اس وقت کفر بہت طاقتور تھا۔ اور مسلمان آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ پس اگر اس وقت بھاگنے کی اجازت دی جاتی تو سرے سے جہاد متحقق ہی نہ ہوتا۔ اور اسلام کا نام ونشان مٹ جاتا۔ پھر جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تو حکم ہلکا کردیا، اور دوگنے سے مقابلہ ضروری قرار دیا۔ کیونکہ اس سے کم میں بہادری اور ثابت قدمی کا تحقق نہیں ہوتا۔

قال الله تعالى: ﴿لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ، وَلَاعَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ، وَلاَ عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ﴾ وقال الله تعالى: ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ، وَلاَ عَلَى الْمَرْضٰى، وَلَاعَلَى الَّذِيْنَ لَايَجِدُوْنَ مَايُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ﴾ وقال صلى الله عليه وسلم لرجل: "ألكَ والدان؟" قال: نعم، قال: "ففيهما فجاهدْ!"

أقول: لما كان إقبالُهم بأجمعهم على الجهاد يُفسد ارتفاقاتهم: وجب أن لايقوم به إلا البعضُ؛ وإنما تَعَيَّنَ غيرُ المعلولِ بهذه العلل: لأن على أصحابها حرجًا، وليس فيهم غُنية معتدٌّ بها للإسلام، بل ربما يُخاف الضررُ منهم.

قال الله تعالى: ﴿آلْآنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ، وَعَلِمَ أَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا﴾

أقول: إعلاءُ كلمة الله لايتحقق إلا بأن يوطنوا أنفسهم بالثبات والنجدة، والصبرِ على مشاقِّ القتال، ولو جرت العادةُ بأن يفروا إذا عثروا على مشقة: لم يتحقق المقصود، بل ربما أفضى إلى الخذلان.

وأيضًا: فالفرار جُبْنٌ وضعفٌ، وهو أسوأُ الأخلاق.

ثم لابد من بيانِ حدٍّ يتحقق به الفرقُ بين الواجب وغيره، ولاتتحقق النجدةُ والشجاعة إلا

إذا كان أسبابُ الهزيمة أكثرَ من أسباب الغلبة، فقُدِّرَ أولاً بعشرة أمثالٍ: لأن الكفر يومئذ كان أكثرَ، ولم يكن المسلمون إلا أقلَّ شيئ،فلم رُخص لهم الفرار لم يتحقق الجهاد أصلا؛ ثم خُفِّفَ إلى مثلَين: لأنه لايتحقق النجدة والثبات فيما دون ذلك.

ترجمہ: جب سارے ہی لوگوں کا جہاد کی طرف متوجہ ہونا ان کے امور معاش کو فاسد کرتا تھا، تو ضروری ہوا کہ نہ کھڑے ہوں جہاد کے لئے مگر بعض۔ اور متعین ہوئے وہ لوگ جو اعذار سے معذور نہیں، اس لئے کہ ان عذر والوں پر تنگی ہے۔ ان میں اسلام کا کوئی معتد بہ فائدہ نہیں۔ بلکہ کبھی ان کی شرکت سے نقصان کا اندیشہ ہے — میں کہتا ہوں: اعلائے کلمۃ اللہ متحقق نہیں ہوتا مگر بایں طور کہ لوگ خود کو خوگر بنائیں جمنے اور بہادری کا، اور جنگ کی مشقتوں پر صبر کا۔ اور اگر عادت چل پڑے کہ لوگ بھاگ کھڑے ہوں جب ان کو مشقت کا پتہ چل جائے تو مقصود متحقق نہیں ہوگا، بلکہ کبھی وہ رسوائی تک پہنچادے گا — اور نیز: پس بھاگنا نامردی اور کمزوری ہے۔ اور وہ بدترین اخلاق ہیں — پھر ضروری ہوا وہ حد بیان کرنا جس کے ذریعہ فرق متحقق ہو واجب اور غیر واجب کے درمیان۔ اور نہیں متحقق ہوتی بہادری اور جوانمردی مگر جب شکست کے اسباب زیادہ ہوں غلبہ (فتح) کے اسباب سے۔ پس اندازہ ٹھہرایا اولاً دس گنا سے، اس لئے کہ اس وقت کفر زیادہ تھا۔ اور مسلمان نہیں تھے مگر بہت ہی تھوڑے۔ پس اگر ان کو بھاگنے کی اجازت دی جاتی تو سرے سے جہاد پایا ہی نہ جاتا۔ پھر حکم ہلکا کیا دوگنا تک۔ اس لئے کہ بہادری اور ثابت قدمی اس سے کم میں متحقق نہیں ہوتی۔

☆ ☆ ☆

سرحدوں کی حفاظت، فوج کی پیشی اور امراء کی تنصیب ضروری ہونے کی وجہ

اور

غنیمت میں خیانت، عہد شکنی، مُثلہ اور بچوں کے قتل کی ممانعت کی وجہ

جب جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کی خاطر واجب ہوا ہے یعنی کوئی ذاتی یا مالی غرض پیش نظر نہیں ہے: تو ضروری ہوا کہ وہ کام واجب ہوں جو اعلاء کلمۃ اللہ کا ذریعہ ہیں، جن کے بغیر اسلام کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی۔ اور جن باتوں سے مقصد جہاد کو نقصان پہنچ سکتا ہے ان کو ممنوع قرار دیا جائے۔ چنانچہ درج ذیل کام ضروری ہوئے:

پہلا کام — سرحدوں کی حفاظت — سرحد پر فوج مقرر کی جائے تاکہ دشمن ملک میں گھس نہ آئے۔ سورہ آل عمران کی آخری آیت میں ہے: ﴿وَرَابِطُوْا﴾: مقابلہ کے لئے مستعد رہو یعنی سرحد کا پہرہ دو تاکہ کفار سے دارالاسلام کی حفاظت رہے۔ اور احادیث میں رباط کے جو فضائل آئے ہیں وہ اس باب کے شروع میں گذر چکے ہیں۔

دوسرا کام — فوج کا جائزہ لینا — جنگ سے پہلے فوج کا جائزہ لیا جائے۔ مجاہدین ایک ایک کر کے امیر کے سامنے پیش کئے جائیں، تا کہ وہ ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کرے۔ درج ذیل دو روایتیں اس کی دلیل ہیں:

پہلی روایت: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں جنگِ احد کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی۔ چنانچہ آپؐ نے مجھے فوج میں نہیں لیا۔ پھر ایک سال بعد غزوۂ خندق کے موقعہ پر میری پیشی ہوئی۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال ہو چکی تھی، چنانچہ آپؐ نے مجھے فوج میں لے لیا (ترمذی ۱:۲۰۴)

دوسری روایت: عُمیر مولی آبی اللحم رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں اپنے آقا کے ساتھ جنگِ خیبر میں گیا۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری بہادری کا تذکرہ کیا۔ چنانچہ آپؐ کے حکم سے مجھے ہتھیار پہنائے گئے، اور میں آپؐ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپؐ نے مجھے فوج میں لے لیا (ترمذی ۱:۱۸۸)

تیسرا کام — امراء کی تنصیب — امام پر واجب ہے، اور رائج طریقہ بھی یہی ہے کہ ہر علاقہ میں سرحد پر، اور فوج کا کوئی امیر مقرر کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے اس سلسلہ میں مختلف طریقے مروی ہیں۔ درج ذیل روایت اسی سلسلہ کی ہے:

حدیث — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بڑے لشکر یا چھوٹے لشکر پر امیر مقرر کرتے تو اس کو مخصوص طور پر اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تاکید کرتے، اور اس کے ماتحت جو مسلمان کرتے، ان کے ساتھ خیر خواہی کی ہدایت دیتے۔ پھر فرماتے: ''اللہ کے نام سے، اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ ان لوگوں سے لڑو جو اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں۔ جہاد کرو، اور مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرو، اور عہد شکنی نہ کرو، اور ناک کان نہ کاٹو، اور کسی بچہ کو قتل نہ کرو'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۲۹ باب الکتاب إلی الکفار إلخ کتاب الجهاد)

تشریح: اس حدیث میں چار باتوں کی ممانعت کی گئی ہے:

پہلی بات — مالِ غنیمت میں خیانت کی ممانعت — یہ ممانعت متعدد وجوہ سے ہے: (۱) اس سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوگی۔ کیونکہ غنیمت سب کا حق ہے۔ اگر بعض لوگ اس کو لے اڑیں گے تو دوسروں کی ہمت پست ہو جائے گی (۲) اور فوج میں اختلاف رونما ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ محروم رہنے والے خیانت کرنے والوں سے الجھیں گے (۳) اور فوج لڑنے کے بجائے غنیمت لوٹنے میں لگ جائے گی، جس کا نتیجہ بارہا شکست کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

دوسری بات — عہد شکنی کی ممانعت — دشمن سے کوئی معاہدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔ نہ کفار کو امن دینے کے بعد ان پر ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ اگر عہد شکنی کی جائے گی تو مسلمانوں کے عہد و پیمان اور ذمہ داری لینے پر لوگوں کا اطمینان باقی نہیں رہے گا۔ اور اگر یہ بات ختم ہوگئی تو عظیم ترین فتح اور قریب ترین نفع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور وہ یہ ہے کہ کفار عقدِ ذمہ کر کے اسلامی حکومت میں شامل ہوں، تا کہ ان کو دولتِ ایمان نصیب ہو، ورنہ کم از کم مسلمانوں کو مالی فائدہ پہنچے۔

تیسری بات — مُثلہ کی ممانعت — دشمن کو قتل کرنا ایک جنگی ضرورت ہے، مگر اس کی لاش بگاڑنا اور ناک کان کاٹنا محض دل کی بھڑاس نکالنا ہے جو جہاد کے مقاصد میں شامل نہیں، اس لئے مُثلہ ممنوع ہے۔ نیز یہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہے، جو شیطانی اغواء کا نتیجہ ہے۔ سورۃ النساء آیت ۱۱۹ میں شیطان کا یہ قول ہے کہ "میں ان کو تعلیم دونگا جس سے وہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑیں گے" پس اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ممنوع ہے اور مطلقاً ممنوع ہے۔

چوتھی بات — بچوں کے قتل کی ممانعت — یہ ممانعت دو وجہ سے ہے:

پہلی وجہ: بچوں کو قتل کرنا مسلمانوں پر تنگی کرنا، اور ان کو نقصان پہنچانا ہے۔ کیونکہ بچہ اگر زندہ رہے گا تو مسلمانوں کا غلام بنے گا۔ اور جس کے پاس رہے گا دین میں اس کی پیروی کرے گا۔ پس بڑا ہو کر وہ مسلمان ہوگا۔

دوسری وجہ: بچہ نہ تو کسی کو مارتا ہے، نہ کسی کی مدد کرتا ہے۔ پس اس کا قتل جنگی ضرورت نہیں۔

فائدہ: یہی حکم عورت کا ہے۔ بلا وجہ اس کو قتل کرنا جائز نہیں۔ ایک جنگ میں رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ لوگ کسی چیز پر جمع ہیں۔ آپؐ نے دریافت کیا: "یہ لوگ کس چیز پر جمع ہیں؟" بتایا گیا کہ ایک عورت کی لاش ہے! آپؐ نے فرمایا: "وہ لڑتی تو نہیں تھی!" پھر اسے کیوں قتل کیا گیا! پھر آپؐ نے مقدمۃ الجیش کے امیر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس حکم بھیجا کہ کسی عورت اور مزدور کو قتل نہ کیا جائے (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۵۵) اسی طرح آپؐ نے نہایت بوڑھے آدمی کو قتل کرنے سے بھی منع کیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۵۶)

ثم لـمـا وجـب الجهاد لإعلاء كلمة الله: وجب مالايكون الإعـلاء إلا به؛ ولذلك كان سَدُّ الثغور وعَرْضُ المقاتلة ونصبُ الأمراء على كل ناحية وثغر واجبًا على الإمام، وسنةً متوارثةً؛ وقد سَنَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وخُلَفاؤُه رضي الله عنهم في هذا الباب سننًا.

وكـان رسولُ الله صـلـى الله عليه وسلم إذا أمَّرَ أميرًا على جيشٍ أو سَرِيَّة: أوصاه في خاصَّته بتقوى الله، ومن معه من المسلمين خيرًا، ثم قال: " اغزوا باسم الله في سبيل الله، قاتلوا من كفر بالله، اغزوا، ولاتَغُلُّوْا" الحديث

[أقول] وإنما نهى:

[۱] عن الغلول: لـما فيه من كسر قلوب المسلمين، واختلافِ كلمتهم، واختيارِهم النُّهبى على القتال؛ وكثيرًا مَّا يفضي ذلك إلى الهزيمة.

[۲] وعن الغدر: لـئـلا يرتـفـع الأمـان من عهدهم وذمتهم، ولو ارتفع: ذهب أعظمُ الفتوح وأقربُها؛ وهي الذمةُ.

[۳] وعن المثلة: لأنه تغيير خلق الله.

[٤] وعن قتل الوليد: لأنه تضييق على المسلمين، وإضرارٌ بهم، فإنه لوبقي حيا لصار رقيقا لهم، واتَّبعَ السَّابِيَ: في الإسلام؛ وأيضًا: فإنه لايَنْكَأُ عدوًا، ولا ينصر فئةً.

ترجمہ: پھر جب جہاد واجب ہوا اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے تو وہ باتیں بھی واجب ہوئیں جن کے بغیر اسلام کی سربلندی نہیں ہوسکتی۔ اور اسی وجہ سے سرحدوں کی حفاظت، اور فوج کی پیشی اور امراء کی تنصیب ہر علاقہ میں اور سرحد میں امام پر واجب اور رائج طریقہ ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے نائبین نے اس سلسلہ میں مختلف طریقے رائج کئے ہیں...... میں کہتا ہوں: اور آپؐ نے ممانعت فرمائی: (۱) مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کی: اس لئے کہ اس میں مسلمانوں کے دلوں کو توڑنا ہے۔ اور ان کے کلمہ کا اختلاف ہے۔ اور ان کا لوٹ کو قتال پر ترجیح دینا ہے۔ اور بار ہا یہ چیز شکست تک پہنچاتی ہے — (۲) اور عہد شکنی سے: تاکہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی ذمہ داری سے اطمینان ختم نہ ہوجائے۔ اور اگر وہ ختم ہوگیا تو عظیم ترین اور قریب ترین فتح ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اور وہ عقد ذمہ ہے — (۳) اور مُثلہ سے: اس لئے کہ وہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہے — (۴) اور بچوں کے قتل سے: اس لئے کہ وہ مسلمانوں پر تنگی کرنا، اور ان کو نقصان پہنچانا ہے۔ پس بیشک وہ اگر زندہ رہے گا تو مسلمانوں کا غلام ہوگا، اور اسلام میں: قید کرنے والے کی پیروی کرے گا — اور نیز: پس وہ دشمن کو زخمی کر کے مارتا نہیں، اور نہ وہ کسی جماعت کی مدد کرتا ہے۔

☆ ☆ ☆

جنگ سے پہلے ترتیب وار تین باتوں کی دعوت دینے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہاری لشکرِ کفار سے مڈبھیڑ ہو، تو انہیں تین باتوں کی دعوت دو۔ ان میں سے جو بھی بات وہ مان لیں تم بھی مان لو، اور جنگ سے رُک جاؤ۔ انھیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ یہ دعوت قبول کرلیں تو تم بھی قبول کرلو، اور جنگ سے رک جاؤ۔ پھر انھیں ان کے وطن سے مہاجرین کے وطن (دارالاسلام) کی طرف منتقل ہونے کی دعوت دو۔ اور انہیں بتلاؤ کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو ان کے لئے وہ حقوق ہونگے جو مہاجرین کے لئے ہیں۔ اور ان پر وہ ذمہ داریاں ہونگی جو مہاجرین پر ہیں — پس اگر وہ اس بات سے انکار کریں کہ وہاں سے منتقل ہوں تو ان کو بتلاؤ کہ وہ صحرانشیں مسلمانوں کی طرح ہونگے۔ اور ان پر اللہ کا وہ حکم جاری ہوگا جو مؤمنین پر جاری ہوتا ہے۔ اور ان کو غنیمت وفئی میں سے کچھ نہیں ملے گا، مگر یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد کریں — پس اگر وہ انکار کریں تو ان سے جزیہ طلب کرو۔ اگر وہ جزیہ دینا منظور کرلیں تو تم بھی قبول کرلو، اور جنگ سے رک جاؤ — پس اگر وہ انکار کریں تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرو، اور جنگ شروع کرو'' (مشکوۃ حدیث ۳۹۲۹)

تشریح: جنگ شروع کرنے سے پہلے کفار کو ترتیب وار تین باتوں کی دعوت دی جائے:

اول — اسلام مع ہجرت وجہاد کی دعوت دی جائے یعنی وہ اسلام قبول کر کے، اور ہجرت کر کے دار الاسلام میں آجائیں۔ اور مجاہدین کے ساتھ ہو کر جہاد کریں۔ اس صورت میں ان کو مجاہدین کی طرح مالِ غنیمت اور مالِ فئی میں سے حصہ ملے گا۔

دوم — اسلام کی دعوت دی جائے، ہجرت وجہاد کے بغیر۔ اس صورت میں ان پر احکامِ اسلام: نماز روزہ وغیرہ لازم ہونگے۔ اور مالِ غنیمت وفئی میں سے کچھ نہیں ملے گا۔ ہاں نفیر عام کی صورت میں یعنی جب سب مسلمانوں پر جنگ میں شریک ہونا لازم قرار دیا جائے، اور وہ بھی شریک ہوں تو غنیمت وفئی میں سے حصہ ملے گا۔

اور اس دوسری صورت میں غنیمت وفئی میں سے نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ غنیمت مجاہدین کا مخصوص حق ہے۔ اور مالِ فئی پہلے اہم کاموں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ پھر دوسرے درجہ کے کاموں میں خرچ کیا جاتا ہے۔ اور عام طور پر بیت المال میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ مجاہدین کے علاوہ پر بھی خرچ کیا جائے۔

سوال: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مالِ فئی میں سب مسلمانوں کا حصہ ہے۔ آپؓ نے سورۃ الحشر کی آیت پاک: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْ مِنْ بَعْدِهِمْ﴾ کا مصداق تمام مسلمانوں کو قرار دیا ہے۔ اور فرمایا: ''اگر میں ایک سال زندہ رہا تو ایک چرواہے کو درانحالیکہ وہ قبیلۂ حِمیر کے ٹیلوں میں (یمن میں) بکریاں چرا رہا ہوگا: مالِ فئی میں سے اس کا حصہ پہنچے گا، اس کے بغیر کہ اس کی پیشانی اس کو حاصل کرنے کے لئے عرق آلود ہوئی ہو'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۶۱)

جواب: ہماری بات میں اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں۔ وہ بات جب ہے کہ بیت المال میں گنجائش نہ ہو۔ اور یہ بات اس وقت ہے جب شاہوں کے خزانے فتح ہو کر آجائیں۔ اور خراج بڑی مقدار میں وصول ہونے لگے تو مجاہدین وغیرہم کو دینے کے بعد بھی بچے گا، جو عام مسلمانوں کو دیا جائے گا۔

سوم — ان کو دعوت دی جائے کہ وہ اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کرلیں، اور جزیہ دینا منظور کرلیں۔ مگر ان کو بتایا جائے کہ یہ بات ان کے لئے ذلت کی ہے۔ ان کے حق میں بہتر پہلی دو باتیں ہیں۔

تینوں باتوں کے مصالح — پہلی بات میں دو مصلحتیں ہیں: ایک: نظام عالَم کی استواری، اور لوگوں کے درمیان سے ظلم وستم کا خاتمہ۔ دوسری: ان کو دولتِ ایمان نصیب ہوگی، اور ان کے نفوس کی اصلاح ہوگی۔ وہ اللہ کے دین کی اشاعت میں حصہ دار بنیں گے، اور جنت کے بلند درجات حاصل کریں گے۔

اور دوسری بات میں یہ مصلحت ہے کہ وہ ایمان لا کر دوزخ سے بچ جائیں گے۔ البتہ جنت کے بلند درجات ان کو حاصل نہیں ہونگے۔ اور تیسری بات میں یہ فائدہ ہے کہ کفار کا دبدبہ ختم ہوگا۔ اور مسلمانوں کی شوکت قائم ہوگی۔ اور ان تینوں ہی مصالح کے لئے نبی ﷺ کی بعثت ہوئی ہے، پس جو بھی مصلحت بدست آئے اس پر قناعت کرنی چاہئے۔

فائدہ: شارحین حدیث عام طور پر تیسری بات: جنگ کرنا قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری بات کو پہلی بات کا تتمہ بتاتے ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرہ نے انوکھی بات کہی ہے۔

والدعوةُ إلى ثلاث خصالٍ مترتبةٍ:

الأول: الإسلامُ مع الهجرة والجهاد؛ وحينئذ له ما للمجاهدين من الحق في الفيءِ والمغانم.

والثانية: الإسلامُ من غير هجرة ولاجهاد، إلا في النفير العام: وحينئذ له نصيبٌ في المغانم والفيءِ، وذلك: لأن الفيءَ إنما يُصرف إلى الأهم فالأهم؛ والعادةُ قاضيةٌ بأن لايَسَعَ بيتُ المال الصرفَ إلى المتوطنين في بلادهم غير المجاهدين، فلا اختلاف بين هذا وبين قول عمر رضي الله عنه:" فلئن عشتُ فليأتين الراعيَ، وهو بِسَرْوِ حِمْيَرَ، نصيبُه منها، لم يعرق فيها جبينُه" يعني إذا فُتح كنوزُ الملوك، وجُبِيَ من الخراج شيئٌ كثيرٌ، فيبقى بعد حظِّ المقاتِلة وغيرهم.

والثالثة: أن يكونوا من أهل الذمة، ويؤدوا الجزيةَ عن يدٍ وهم صاغرون.

فبالأول: تحصل المصلحتان: من نظام العالَم ورفع التظالم من بينهم، ومن تهذيب نفوسهم، بأن يحصل نجاتهم من النار، ويكونوا ساعين في تمشية أمر الله.

وبالثانية: النجاة من النار، من غير أن ينالوا درجاتِ المجاهدين.

وبالثالثة: زوالُ شوكة الكفار، وظهورُ شوكة المسلمين — وقد بُعث النبيُّ صلى الله عليه وسلم لهذه المصالح.

ترجمہ: اور دعوت تین باتوں کی طرف ترتیب وار ہے: پہلی بات: اسلام مع ہجرت وجہاد ہے، اور اس وقت اس کے لئے فئی اور غنیمت میں وہ حق ہے جو مجاہدین کے لئے ہے — اور دوسری بات: اسلام ہے بغیر ہجرت اور بغیر جہاد کے، مگر اعلانِ عام کی صورت میں۔ اور اس وقت اس کے لئے غنیمت اور فئی میں حصہ ہے۔ اور وہ بات: یعنی اس دوسری صورت میں غنیمت اور فئی میں حصہ نہ ہونا: اس لئے ہے کہ مالِ فئی خرچ کیا جاتا ہے الأهم فالأهم میں۔ اور عادت فیصلہ کرنے والی ہے اس بات کا کہ بیت المال میں گنجائش نہیں ہوتی مسلمانوں کے شہروں میں بسنے والوں پر خرچ کرنے کی سوائے مجاہدین کے یعنی عام طور پر ہر مسلمان کو بیت المال سے دینے کی گنجائش نہیں ہوتی (سوال کا جواب) پس کوئی اختلاف نہیں اس بات کے درمیان اور عمرؓ کے قول کے درمیان ''پس بخدا! الی آخرہ۔ یعنی جب شاہوں کے خزانے کھولے جائیں، اور مال گذاری میں بہت سارا مال وصول ہو تو مجاہدین وغیرہم کے حصہ کے بعد بھی باقی رہے گا — اور تیسری بات: یہ ہے کہ وہ اہلِ ذمہ میں سے ہوجائیں۔ اور بدستِ خود جزیہ دیں درانحالیکہ وہ بے عزت ہونے والے ہوں۔

پس اول سے دو مصلحتیں حاصل ہوتی ہیں: (۱) عالَم کا انتظام، اور لوگوں کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم کرنے کا خاتمہ (۲) اور

ان کے نفوس کی اصلاح بایں طور کہ ان کو دوزخ سے نجات ملے۔ اور وہ اللہ کے دین کے پھیلانے میں کوشش کرنے والے ہوجائیں — اور دوسری سے: دوزخ سے نجات: بدوں اس کے کہ وہ مجاہدین کے درجات حاصل کریں — اور تیسری سے: کفار کی شوکت کا خاتمہ، اور مسلمانوں کی شوکت کا ظہور — اور تحقیق نبی ﷺ ان مصلحتوں کے لئے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔

☆ ☆ ☆

خلیفہ کے لئے حربی ہدایات

امام المسلمین پر واجب ہے کہ وہ مسلمانوں کی شوکت ودبدبہ کے ظہور کے اسباب میں غور کرے۔ اور ان سے کفار کے ہاتھ کاٹ دینے کی تدبیریں سوچے۔ اس معاملہ میں انتہائی غور کرے اور خوب سوچے۔ پھر وہ کام کرے جو اس کی رائے میں درست ہو، اور وہ بعینہ یا اس کی نظیر نبی ﷺ اور خلفائے راشدین سے ثابت ہو۔ اور امام کے ذمہ یہ بات اس لئے واجب ہے کہ اس کا تقرر مصالح مسلمین کے لئے کیا گیا ہے۔ اور مصالح اس کے بغیر تکمیل پذیر نہیں ہوتے۔

اور اسلام کے حربی نظام کی بنیاد نبی ﷺ کے حربی معاملات ہیں۔ ہم یہاں اس سلسلہ کی احادیث کا ماحصل ذکر کرتے ہیں:

(۱) — امام المسلمین پر واجب ہے کہ اسلامی ملک کی سرحدیں ایسے لشکروں سے بھر دے جو ان دشمنوں کے لئے کافی ہوجائیں جو سرحد سے متصل ہیں۔ اور اس لشکر کا کسی بہادر، ذی رائے اور مسلمانوں کے لئے خیر خواہ آدمی کو امیر مقرر کرے۔ اور ملک کی حفاظت کے لئے خندق کھودنی ضروری ہو یا کوئی قلعہ تعمیر کرنا ضروری ہو تو وہ بھی کرے۔ نبی ﷺ نے غزوۂ احزاب میں مدینہ کی حفاظت کے لئے خندق کھودی ہے۔

(۲) — جب امام المسلمین کوئی سریہ (چھوٹا لشکر) روانہ کرے تو اس کا امیر افضل آدمی کو یا مسلمانوں کے حق میں انفع شخص کو مقرر کرے۔ اور اس کو ذاتی طور پر اللہ سے ڈرنے کی تاکید کرے، اور اس کے ماتحت جو فوجی کئے جارہے ہیں ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے کی وصیت کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔

(۳) — اور جب امام المسلمین کوئی بڑی مہم سر کرنے کے لئے خود نکلنے کا ارادہ کرے تو اپنے لشکر کا معائنہ کرے۔ اور سواروں اور پیادوں کو دیکھے بھالے۔ جو جانور یا انسان کمزور ہو اس کو لشکر میں نہ لے۔ اسی طرح درج ذیل لوگوں کو بھی ساتھ نہ لے۔

(الف) کم عمر کو یعنی جس کی عمر پندرہ سال سے کم ہو اس کو فوج میں شامل نہ کرے۔ نبی ﷺ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

(ب) بے ہمت کرنے والے کو یعنی جو فوج کی ہمت توڑے، اور ان کو جنگ سے بٹھائے اور حوصلہ پست کرے اس کو ساتھ نہ لے۔

(ج) بری خبریں پھیلانے والے کو یعنی جو کفار کی طاقت کی باتیں کرے، اور لوگوں کو خوفزدہ کرے اس کو بھی ساتھ نہ لے۔ اور اس کی دلیل سورۃ التوبہ کی آیات ۴۶ و ۴۷ ہیں۔ ارشاد پاک ہے: ''اور اللہ تعالیٰ نے اُن (منافقین) کے (غزوۂ تبوک میں) جانے کو پسند نہیں کیا، اس لئے ان کو توفیق ہی نہیں دی۔ اور (تکوینی طور پر) کہہ دیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو!۔ اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ شامل ہوجاتے تو سوائے اس کے کہ دُونا فساد کرتے کیا ہوتا!''

(د) اور مشرک (غیر مسلم) کو ساتھ نہ لے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہم کسی مشرک سے مدد نہیں لیں گے'' (اخرجہ مسلم واصحاب السنن، فتح ۴: ۴۴۲) البتہ ضرورت ہو، اور آدمی قابل اعتماد ہو تو ساتھ لے سکتے ہیں۔

(ھ) اور جوان عورت کو جس پر خطرہ ہو ساتھ نہ لے۔ البتہ عمر رسیدہ عورت کو اجازت دے۔ کیونکہ نبی ﷺ حضرت ام سُلیم وغیرہ انصار کی خواتین کو ساتھ لے جاتے تھے۔ وہ فوجیوں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں (مشکوۃ حدیث ۳۹۴۰)

④ —— اور لشکر کی تنظیم کرے۔ اس کا دایاں بایاں بازو بنائے۔ اور ہر گروہ کے لئے ایک جھنڈا تجویز کرے۔ اور ہر جماعت کا ایک امیر یا منتظم مقرر کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر کیا تھا۔ منظم لشکر کی دھاک زیادہ بیٹھتی ہے، اور اس کا انضباط بھی خوب ہوتا ہے۔

⑤ — اور فوج کے لئے کوئی شعار (مخصوص لفظ) مقرر کرے، جس کو وہ شب خون کے وقت استعمال کریں، تا کہ اپنے ہی آدمی کو قتل نہ کردیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔

⑥ —— اور سفر جمعرات یا پیر کے دن شروع کرے۔ ان دونوں میں بارگاہِ خداوندی میں اعمال کی پیشی ہوتی ہے۔ اور ہم یہ بات پہلے ذکر کر چکے ہیں (دیکھیں رحمۃ اللہ ۴: ۱۶۲)

⑦ —— اور لشکر کو ایسی رفتار سے چلنے کا حکم دے جس کا کمزور بھی تحمل کرسکیں۔ البتہ ضرورت کے وقت برق رفتاری کا حکم دیا جاسکتا ہے۔ اور راستے کی منزلیں ایسی منتخب کرے جو اچھی ہوں، اور جہاں پانی وافر مقدار میں ہو۔

⑧ — اگر دشمن کی طرف سے خطرہ ہو تو پہرہ دینے والے اور خبریں لانے والے مقرر کرے۔

⑨ — اور امام اپنا مقصد سفر حتی الامکان مخفی رکھے۔ اور توریہ کرے۔ البتہ عقلمندوں اور خیر خواہوں سے اپنا ارادہ نہ چھپائے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو کسی اور سفر سے توریہ کرتے۔ اور فرمایا کہ جنگ چال ہے! (ابوداؤد حدیث ۲۶۳۷)

⑩ —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنگ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۰۱) اور یہ ممانعت دو وجہ سے ہے: پہلی وجہ: وہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ کہیں شیطان اس کو ورغلائے، اور وہ کافروں میں جا ملے۔ اور دوسری وجہ: یہ ہے کہ اس قسم کے مواقع میں اکثر اختلاف ہوجاتا ہے۔ اور نزاع مسلمانوں کی مصلحت (جنگ)

میں خلل ڈالنے والا ہے۔

(۱۱) — جہاد: اہل کتاب اور مجوس: سبھی سے کیا جائے، تا آنکہ وہ اسلام قبول کریں، یا رسوائی کے ساتھ جزیہ دینا منظور کریں۔

(۱۲) — جنگ میں بچوں، عورتوں اور بہت بوڑھوں کو قتل نہ کرے۔ البتہ ضرورت کے وقت قتل جائز ہے۔ جیسے شب خون مارنے کی صورت میں قتل جائز ہے۔

(۱۳) — کوئی پھل دار درخت نہ کاٹے، اور نہ ان کو جلائے۔ اور نہ جانوروں کی کوچیں کاٹے۔ البتہ مصلحت کا تقاضا ہو تو جائز ہے۔ جیسے بنونضیر کے گاؤں بُوَیرہ کا معاملہ۔ جنگی ضرورت سے ان کے باغات کاٹے اور جلائے گئے تھے۔ سورۃ الحشر میں صحابہ کے اس عمل کو درست قرار دیا گیا ہے۔

(۱۴) — اور کفار کے ساتھ کیئے ہوئے عہد و پیمان کی خلاف ورزی نہ کرے۔

(۱۵) — اور دشمن کے قاصدوں اور سفیروں کو نہ روکے، تا کہ باہمی مراسلت کا دروازہ بند نہ ہو جائے۔

(۱۶) — اور جنگی چالیں چلے۔ نبی ﷺ اسی مقصد سے توریہ کرتے تھے، اور فرمایا: ''جنگ چال ہے!'' (متفق علیہ مشکوٰۃ حدیث ۳۹۳۹) جنگ میں جو شخص چال چلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے وہ ہی پالا مار لیتا ہے (مگر جھوٹ بولنا اور دھوکہ دینا جائز نہیں)

(۱۷) — اور دشمن پر بے خبری کی حالت میں پہنچ جائے۔ اور دشمن پر گوپھنیں (ٹینک) چلائے۔ اور ان کا گھیرا ڈالے، اور ان پر عرصۂ حیات تنگ کرے۔ یہ سب باتیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اور جنگی ضروریات ہیں۔ جن کی وضاحت کی حاجت نہیں۔

(۱۸) — اور جو شخص خود پر اعتماد رکھتا ہے، اس کے لئے امام کی اجازت سے مبارزت طلبی جائز ہے۔ جنگ بدر میں تین کافروں نے حریف طلب کئے تھے، تو نبی ﷺ نے حضرت حمزہ، حضرت علی، اور حضرت عبیدۃ بن الحارث رضی اللہ عنہم کو مقابلہ کے لئے نکلنے کا حکم دیا تھا (ابن ہشام)

(۱۹) — مجاہدین کے لئے جائز ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں اور گھاس چارہ میں خمس نکالے بغیر تصرف کریں، تا کہ فوجیوں کے لئے تنگی نہ ہو۔

(۲۰) — جنگ میں جو قیدی ہاتھ آئیں، ان کے بارے میں امام کو چار باتوں میں اختیار ہے: چاہے تو قتل کرے، یا فدیہ لے کر چھوڑ دے، یا مفت چھوڑ دے، یا غلام بنا لے۔ جو بات زیادہ مفید ہو وہ اختیار کرے۔

(۲۱) — امام کے لئے جائز ہے کہ وہ سب دشمنوں کو یا ان میں سے بعض کو امان دے۔ اور اس کی دلیل سورۃ التوبہ آیت ۶ میں یہ ارشاد پاک ہے: ''اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے آپ سے پناہ کا طالب ہو، تو آپ اس کو پناہ دیدیجئے تا کہ وہ کلام الٰہی سن لے، پھر اس کو اس کے امن کی جگہ میں پہنچا دیجئے۔ یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو جانتے نہیں'' یہ امن دینا دو مصلحتوں سے ہے: ایک: وہ جو آیت کریمہ میں بیان کی گئی کہ کفار پر قبول اسلام کی راہ اسی وقت کھل سکتی

ہے، جب وہ مسلمانوں سے ملیں جلیں، اوران کے دلائل سنیں اوران کی زندگیاں دیکھیں۔ دوسری مصلحت: یہ ہے کہ تجارتی ضرورتیں پیش آتی ہیں۔ جن کے لئے امان دینا ضروری ہے۔

(۲۲) —— اورامام کے لئے جائز ہے کہ دشمن سے مال کے بدل یا بغیر مال کے مصالحت کرے۔ اور یہ جواز تین وجوہ سے ہے: اول: کبھی مسلمان کفار کے مقابلہ میں کمزور پڑجاتے ہیں۔ اس وقت مصالحت ہی مصلحت ہوتی ہے۔ دوم: کبھی مسلمانوں کو مال کی حاجت ہوتی ہے، تاکہ وہ اس کے ذریعہ مضبوط ہوجائیں۔ سوم: کبھی یہ مصلحت ہوتی ہے کہ ایک قوم کے شر سے مطمئن ہوکر دوسری قوم سے نمٹا جائے۔ صلح حدیبیہ میں یہی بات پیش نظر تھی۔

ويجب على الإمام أن يَنظر في أسباب ظهورِ شوكةِ المسلمين، وقطعِ أيدى الكفار عنهم، ويجتهد ويتأمل في ذلك، فيفعل ما أدّى إليه اجتهادُه، مما عُرِفَ هو أو نظيرُه عن النبي صلى الله عليه وسلم وخلفائه رضى الله عنهم: لأن الإمام إنما جُعل لمصالح، ولاتتم إلا بذلك.

والأصل في هذا الباب سِيَرُ النبي صلى الله عليه وسلم، ونحن نذكر حاصلَ أحاديثِ الباب، فنقول:

[١] يجب أن يَشْحَنَ ثغورَ المسلمين بجيوش يَكْفُوْنَ من يليهم، ويُؤَمِّرُ عليهم رجلاً شجاعًا، ذارأيٍ، ناصحًا للمسلمين، وإن احتاج إلى حفرِ خندقٍ، أو بناءِ حصنٍ: فعله، كمافعله رسول الله صلى الله عليه وسلم يومَ الخندق.

[٢] وإذا بعث سريةً، أَمَّرَ عليهم أفضلَهم، أو أنفعَهم للمسلمين، وأوصاه في نفسه، وبجماعة المسلمين خيرًا، كما كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يفعل.

[٣] وإذا أراد الخروج للغزو: عَرَضَ جيشَه، ويتعاهد الخيلَ والرجالَ، فلا يقبل:

[الف] مَن دونَ خمس عشرة سنةً، كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعل ذلك.

[ب] ولامُخَذِّلاً: وهو الذى يُقْعِدُ الناس عن الغزو.

[ج] ولا مُرْجِفًا: وهو الذى يُحَدِّثُ بقوة الكفار، والأصل فيه قوله تعالى: ﴿كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقَاعِدِيْنَ، لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَازَادُوْكُمْ إِلَّا خَبَالاً﴾

[د] ولامشركا: لقوله صلى الله عليه وسلم: "إنا لانستعين بمشرك" إلا عند ضرورة، ووثوقٍ به.

[هـ] ولا امرأةً شابةً يُخاف عليها، ويأذنُ للطاعنة في السن، لأنه صلى الله عليه وسلم كان يغزو بأم سُليم ونسوةٍ من الأنصار، يسقين الماءَ، ويداوين الجرحى.

[٤] ويُعَبِّى الجيشَ ميمنةً وميسرة، ويجعل لكل قوم راية، ولكل طائفة أميرًا أو عريفًا، كما

فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم الفتح، لأنه أكثر إرهابًا، وأقربُ ضبطًا.

[٥] ويُعَيِّنُ لهم شعاراً، يتكلمونه في البَيَاتِ، لئلا يقتل بعضُهم بعضًا، كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يفعل.

[٦] ويَخرُجُ يومَ الخميس أو الاثنين، فإنهما يومانِ يُعرض فيهما الأعمال، وقد ذكرنا من قبل.

[٧] ويكلِّفهم من السير ما يطيقه الضعيف، إلا عند الضرورة، ويَتَخَيَّرُ لهم من المنازل أصلَحها وأوفرها ماءً.

[٨] وينصب الحُرَّسَ والطلائعَ إذا خاف العدوَّ.

[٩] ويُخفي من أمره ما استطاع ويُوَرِّي، إلا من ذوي الرأي والنصيحة.

[١٠] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لاتُقطع الأيدي في الغزوِ" وسِرُّه: مابينه عمر رضي الله عنه: أن لاتلحقه حميةُ الشيطان، فيلحق بالكفار؛ ولأنه كثيرًا مَّا يُفضي إلى اختلاف بين الناس، وذلك يُخِلُّ بمصلحتهم.

[١١] ويقاتل أهل الكتاب والمجوسَ حتى يُسلموا، أو يعطوا الجزيةَ عن يد وهم صاغرون.

[١٢] ولايقتل وليدًا، ولا امرأةً، ولا شيخًا فانيًا، إلا عند ضرورة، كالبَيَاتِ.

[١٣] ولايقطع الشجر ولا يُحرِقُ، ولا يَعْقِرُ الدواب، إلا إذا تعينت المصلحةُ في ذلك، كالبُوَيْرَةِ قريةِ بني النضير.

[١٤] ولايَخِيْسُ بالعهد.

[١٥] ولايَحْبِسُ البُرُدَ: لأنه سبب انقطاع المراسلة بينهم.

[١٦] ويخدع، فإن الحرب خُدعة.

[١٧] ويهجم عليهم غارِّين، ويرميهم بالمنجنيق، ويحاصرهم، ويضيِّق عليهم؛ ثبت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم كلُّ ذلك، ولأن القتال لا يتحقق إلا به، كما لاحاجة إلى شرحه.

[١٨] ويجوز المبارزة بإذن الإمام لمن وَثِقَ بنفسه، كما فعل علي وحمزة رضي الله عنهما.

[١٩] وللمسلمين أن يتصرفوا فيما يجدونه هنالك من العلف والطعام، من غير أن يُخَمَّسَ، لأنه لو لم يُرَخَّص فيه لضاق الحال.

[٢٠] فإذا أَسَرُوْا أسراءَ خُيِّرَ الإمامُ بين أربع خصال: القتلِ، والفداءِ، والمنِّ، والإرقاقِ؛ يفعلُ

من ذلك الأحظ.

[۲۱] وللإمام أن يعطيهم الأمان، ولآحادهم، والأصل فيه قوله تعالى: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ﴾

وذلك: لأن دخولهم في الإسلام لايتحقق إلا بمخالطة المسلمين، ومعرفة حجتهم وسيرتهم، وأيضًا: فكثيرًا مَّا تقع الحاجة إلى تردد التجار وأشباههم.

[۲۲] ويصالحهم بمال، وبغير مال: فإن المسلمين ربما يضعفون عن مقاتَلة الكفار، فيحتاجون إلى الصلح، وربما يحتاجون إلى المال يَتقوَّوْن به، أو إلى أن يأمنوا من شر قوم فيجاهدوا آخرين.

ضروری الفاظ کی تشریح: سِیَر: سِیْرۃ کی جمع ہے۔ پہلے اس کے معنی حربی نظام اور جنگی اصول کے تھے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی کتابیں: السِّیَر الصغیر اور السیر الکبیر اسی موضوع پر ہیں۔ اور جیسے سنن ترمذی کے ابواب السیر ان میں بھی یہی ابحاث ہیں...... مُخَذِّلاً (اسم فاعل) خَذَّلَه: پسپائی اور جنگ بندی پر آمادہ کرنا...... عَبَّی الجیش: تیار کرنا...... الطلیعة: دشمن کی سپاہ کا اندازہ لگانے اور معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجی جانے والی فوج کی ٹکڑی...... خَاسَ (ض) بالعهد: عہد وپیمان کی خلاف ورزی کرنا، عہد شکنی کرنا...... قوله: أن لا تلحقه إلخ ترجمہ: کہ نہ لاحق ہو اس کو شیطانی غیرت...... قوله: لآحادهم: کا عطف یُعْطِیَهم کی ضمیر منصوب پر ہے۔ فصل کی وجہ سے عطف درست ہوا ہے۔

☆ ☆ ☆

غنیمت میں چوری: اُخروی سزا

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر گز تم میں سے کسی شخص کو میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے کہ اس کی گردن پر اونٹ ہو، اور وہ بلبلا رہا ہو، اور وہ کہے: یارسول اللہ! میری مدد کیجئے! اور میں کہوں کہ میں تیرے لئے کچھ نہیں کرسکتا! میں نے تجھے خبر دیدی تھی!'' ایسا ہی آپ کا ارشاد ہے: ''اس کی گردن پر گھوڑا ہو، جو ہنہنا رہا ہو، اور بکری ہو، جو ممیا رہی ہو، اور غلام ہو جو چلا رہا ہو، اور کپڑے کے ٹکڑے ہوں، جو لہرا رہے ہوں!'' (مشکوۃ حدیث ۳۹۹۵) یہ طویل حدیث کا خلاصہ ہے۔

تشریح: اس حدیث میں مالِ غنیمت میں چوری کی تین سزائیں بیان کی گئی ہیں:

پہلی سزا: خائن چُرائی ہوئی چیز کے ساتھ میدانِ قیامت میں آئے گا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عمل نفس کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ پھر اس میں جزاء کی شان پیدا ہوتی ہے، اور مجازات کا مدار مماثلت پر ہے، اس لئے مالِ غنیمت میں چوری کی سزا

بصورت معصیت متمثل ہوگی۔ جیسے مال کی زکوۃ ادانہ کرنے کی سزابھی اسی طرح متحقق ہوتی ہے (رحمۃ اللہ ۴: ۳۸)

دوسری سزا: چوری کی ہوئی چیز گردن پر اٹھا کر آئے گا: جس کے بوجھ سے وہ تکلیف پائے گا۔

تیسری سزا: جانوروں کا چلانا: جس سے لوگوں کے سامنے اس کے گناہ کی تشہیر ہوگی، اور وہ برملا رسوا ہوگا۔

غنیمت میں چوری: دنیوی سزا

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم کسی آدمی کو پاؤ کہ اس نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہے تو اس کا سامان جلادو، اور اس کی پٹائی کرو" (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۳ باب التعزیر) اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے اس پر عمل کیا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۰۱۳) یعنی یہ محض دھمکی نہیں، نہ یہ حکم منسوخ ہے۔

تشریح: یہ سزا چوری کرنے والے کیلئے زجر وتوبیخ ہے، اور دوسروں کیلئے سامانِ عبرت۔ تاکہ وہ ایسی حرکت نہ کریں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لاأُلْفِيَنَّ أحدَكم يجيئُ يومَ القيامة: على رقبته بعيرٌ، لـهُ رُغاءٌ، يقول :يارسول الله! أَغِثْنِيْ، فأقول: لا أملك لك شيئًا، قد أبلغتُك!" ونحوُ ذلك قوله صلى الله عليه وسلم:" على رقبته فرسٌ، له حَمْحَمَة، وشاة: له يُعَارٌ، ونفس: لها صياحٌ، ورِقَاعٌ تَخْفِقُ"

أقول: الأصل في ذلك: أن المعصيةَ تُتصوَّر بصورةِ ماوقعتْ فيه. وأما حملُه: فثقلُه، والتأذِّى به؛ وأما صوتُه: فعقوبتُه بإشاعة فاحشتِه على رء وس الناس.

قال صلى الله عليه وسلم:" إذا وجدتم الرجلَ قد غَلَّ في سبيل الله، فأَحْرِقوا متاعَه، واضربوه" وعمل به أبوبكر وعمر رضى الله عنهما.

أقول: سره: الزجر، وكَبْحُ الناس أن يفعلوا مثلَ ذلك.

ترجمہ: اس میں اصل یہ ہے کہ معصیت تصور کی جاتی ہے اس چیز کی صورت میں جس میں وہ واقع ہوئی ہے۔ اور رہا اس کا اٹھانا: تو وہ اس کا بوجھ ہے: اور اس سے تکلیف اٹھانا ہے۔ اور رہی اس کی آواز: تو وہ اس کی سزا ہے اس کے گناہ کی تشہیر کے ذریعہ تمام لوگوں کے سامنے — اور اس کا راز: توبیخ ہے۔ اور لوگوں کو روکنا ہے اس بات سے کہ وہ اس کے مانند کریں۔

لغات: الرُّغاء: اونٹ کی بلبلاہٹ..... الحمحمة: گھوڑے کا متوسط آواز سے ہنہنا..... اليَعار: بھیڑ بکری کی آواز۔

☆ ☆ ☆

غنیمت کے احکام

خُمس کے مصارف

جواموال کفار سے حاصل ہوتے ہیں وہ دوقسم کے ہیں:

ایک: مالِ غنیمت: یہ وہ مال ہے جو غیر مسلموں سے جنگ وقتال اور قہر وغلبہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

دوسرا: مالِ فئی: یہ وہ مال ہے جو غیر مسلموں سے جنگ کے بغیر حاصل ہوتا ہے۔ جیسے جزیہ، خراج (مال گذاری) غیر مسلم تاجروں سے لی ہوئی چنگی (ٹیکس) وہ مال جو کفار سے مصالحت میں حاصل ہوا ہے، یا وہ جس مال کو گھبرا کر چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں۔

پس مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالا جائے۔ اور اس کو ان مصارف میں خرچ کیا جائے جس کا تذکرہ سورۃ الانفال کی آیت ۴۱ میں ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اور یہ بات جان لو کہ جو چیز کفار سے بطور غنیمت تم کو حاصل ہوئی ہو: اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کا پانچواں حصہ ہے اور اس کے رسول کے لئے، اور رسول کے رشتہ داروں، اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کے لئے''

تفسیر: مصارفِ خمس میں کائنات کے خالق ومالک کا تذکرہ بطور تو طئہ ہے۔ باقی مصارف کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) —— غنیمت میں جو حصہ رسول اللہ ﷺ کا تھا، آپؐ اپنی حیات میں اس میں سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا خرچ نکالتے تھے۔ آپؐ کی وفات کے بعد اب یہ حصہ مصالح مسلمین میں خرچ کیا جائے گا۔ اور جو کام زیادہ اہم ہوں ان میں پہلے خرچ کیا جائے گا۔ پھر دوسرے کاموں میں۔

(۲) —— اور آپؐ کے قرابت داروں کا حصہ بنی ہاشم اور بنی المطلب کو دیا جائے گا۔ خواہ وہ غریب ہوں یا مالدار، اور خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ اور ان میں جو مقروض ہے، یا شادی کرنا چاہتا ہے، یا حاجت مند ہے اس کی اعانت کی جائے گی۔

رہی یہ بات کہ رسول کے رشتہ داروں میں ان کا حصہ کس طرح تقسیم کیا جائے گا؟ تو شاہ صاحب قدس سرۂ کی رائے یہ ہے کہ یہ بات امام المسلمین کے حوالے ہے۔ کس کو کتنا دینا ہے؟ اس کی تعیین امام اپنی صوابدید سے کرے گا۔ البتہ امام کے علم میں یہ بات رہنی چاہئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے لئے بیت المال سے پانچ پانچ ہزار کا وظیفہ مقرر کیا تھا، جو ان کے ہم سروں سے بہت زیادہ تھا۔ اور یہ زیادتی نواسۂ رسول ہونے کی وجہ سے تھی۔ پس بنو ہاشم اور بنو المطلب میں سے آلِ رسول کو زیادہ دینا چاہئے۔

(۳) —— اور یتیموں کا حصہ: ایسے بچوں پر خرچ کیا جائے جو غریب ہوں، اور ان کا باپ وفات پا چکا ہو۔

(۴) —— اور غریبوں اور مسکینوں (اور مسافروں) کا حصہ: انہیں پر خرچ کیا جائے (اور مسافر سے مراد: وہ ہے جو وطن

سے دور ہو، اور اس کو مال کی شدید حاجت پیش آ گئی ہو)

رہی یہ بات کہ خمس کے مذکورہ مصارف میں سے کس مصرف میں کتنا خرچ کیا جائے؟ تو یہ بھی امام کی صوابدید پر موقوف ہے۔ وہ خوب غور کر کے طے کرے کہ زیادہ اہم کون ہے؟ اور کس مصرف میں کتنا خرچ کرنا ہے؟ اور کس شخص کو کتنا دینا ہے؟

فائدہ: حنفیہ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپؐ کی ذات کا خرچ نہیں رہا۔ اور آپؐ کے رشتہ داروں کا حصہ نصرتِ قدیم کی بناپر تھا، اس لئے وہ بھی نہیں رہا۔ البتہ مساکین اور حاجت مندوں کا جو حصہ ہے اس میں حضور ﷺ کے قرابت دار: مساکین واہل حاجت کو مقدم رکھا جائے گا (فوائد عثمانی)

واعلم: أن الأموال المأخوذة من الكفار على قسمين:

[۱] ما حصل منهم بإيجاف الخيل والركاب، واحتمالِ أَعْبَاءِ القتال؛ وهو الغنيمة.

[۲] وما حصل منهم بغير قتال، كالجزية، والخَراج، والعشورِ المأخوذةِ من تُجَّارهم، ومابذلوا صلحًا، أو هربوا عنه فزعًا.

فالغنيمة: تُخَمَّسُ، ويُصرف الخُمُسُ إلى ما ذكر الله تعالى في كتابه، حيث قال: ﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ، وَلِلرَّسُوْلِ، وَلِذِي الْقُرْبٰى، وَالْيَتَامٰى، وَالْمَسَاكِيْنِ، وابْنِ السَّبِيْلِ﴾

فيوضع سهمُ رسول الله صلى الله عليه وسلم بعدَه في مصالح المسلمين: الأهمّ فالأهمّ.

وسهمُ ذوي القربى: في بني هاشم وبني المطلب: الفقير منهم والغنيّ، والذكر والأنثى.

وعندي: أنه يُخَيَّرُ الإمام في تعيين المقادير، وكان عمر رضي الله عنه يزيدُ في فرض آل النبي صلى الله عليه وسلم من بيت المال، ويُعين المَدِيْنَ منهم، والناكحَ، وذا الحاجة.

وسهمُ اليتامى: لصغير فقير، لا أب له.

وسهمُ الفقراء والمساكين: لهم.

يُفَوَّضُ كلُّ ذلك إلى الإمام، يجتهد في الفرض، وتقديم الأهم فالأهم، ويفعل ما أدى إليه اجتهاده.

ترجمہ: (۱) جو حاصل ہوا کفار سے گھوڑے اور اونٹ دوڑانے کے ذریعہ۔ اور جنگ کا بوجھ ڈھونے کے ذریعہ

(أَوْجَفَ دابتَه: چوپائے کو تیز دوڑانا وَجَفَ (ض) وَجْفًا البعير: اونٹ کو دوڑانا...... العِبْءُ: بوجھ، جمع أعباء...... المَدِيْن: قرض دار، جس کے ذمہ قرض ہو)

غنیمت میں سے انعام یا بخشش دینا

غنیمت کے باقی چار اخماس غانمین کے لئے ہیں۔ اللہ پاک نے غانمین کو مخاطب کر کے خُمس کو مذکورہ مصارف کے لئے خاص کیا ہے۔ باقی چار اخماس کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ غانمین کا حق ہے۔ لہٰذا وہ غانمین میں تقسیم کئے جائیں گے۔ مگر تقسیم سے پہلے امام: لشکر کی حالت میں خوب غور کرے، اگر کسی کو انعام یا بخشش دینا مسلمانوں کی مصلحت سے ہم آہنگ ہو، تو باقی چار اخماس میں سے پہلے یہ کام کرے۔

اور انعام تین وجوہ سے دیا جاتا ہے:

پہلی وجہ: امام دارالحرب میں داخل ہوا، اور اس نے کوئی سریہ بطور مثال کسی گاؤں پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا، تو وہ جو غنیمت لائے گا: اس میں سے خمس نکالنے کے بعد: چوتھائی یا تہائی اس سریہ کو بطور انعام دیا جائے گا۔ باقی غنیمت میں شامل کرلیا جائے گا، جو پوری فوج پر تقسیم ہوگا، اور اس میں سے سریہ کو بھی حصہ ملے گا۔

فائدہ: اس سلسلہ میں نبی ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب لشکر آگے بڑھ رہا ہو، اور سریہ بھیجا جائے، تو اس کو چوتھائی انعام دیتے تھے۔ اور جب لشکر واپس لوٹ رہا ہو، تو تہائی دیتے تھے (مشکوٰۃ حدیث ۴۰۰۷ و ۴۰۰۸) اور پہلی صورت میں انعام کم اس لئے دیا جاتا تھا کہ اس وقت سریہ میں نکلنے میں طبیعت پر بوجھ کم پڑتا ہے، اور لشکر کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور جب لشکر واپس لوٹ رہا ہو، اس وقت سریہ میں نکلنے میں بوجھ زیادہ پڑتا ہے۔ طبیعت پر یہ بات شاق گذرتی ہے کہ سب تو گھر جارہے ہیں، اور ہم کام پر! اور لشکر کی پشت پناہی بھی کم ہوجاتی ہے۔ ضرورت پیش آنے پر لشکر جلدی سے مدد کو نہیں پہنچ سکتا، اس لئے انعام بڑھا دیا جاتا تھا (فائدہ تمام ہوا)

دوسری وجہ: امام اس شخص کے لئے جو کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جس میں مسلمانوں کا بڑا نفع ہو: مختنانہ مقرر کرے۔ مثلاً کہے کہ جو اس قلعہ پر چڑھ جائے اس کو یہ دیا جائے گا، یا جو کوئی قیدی پکڑ لائے اس کو یہ دیا جائے گا، یا جو کوئی کافر کو قتل کرے اس کا ساز و سامان اس کو دیا جائے گا۔ پس اگر بیت المال سے یہ اجرت دینا طے کیا ہے تو بیت المال سے دے، اور غنیمت میں سے دینا طے کیا ہے تو باقی چار اخماس میں سے دے۔

تیسری وجہ: کسی جنگ میں کوئی شخص بہادرانہ کارنامہ انجام دے، اور اس سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچے تو امام اس کو انعام دے۔ جیسا کہ غزوۂ ذی قرد میں نبی ﷺ نے حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کو پیدل ہونے کے باوجود سوار اور پیدل دونوں کا حصہ دیا تھا (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۸۹)

سلب (مقتول کا ساز و سامان) قاتل کا حق کب ہے؟ —— اس میں اختلاف ہے کہ مقتول کا ساز و سامان قاتل کا حق ہے یا انعام؟ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک انعام ہے، اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حق ہے۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میرے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مقتول کا سامان قاتل کا حق اس وقت ہے جب امام جنگ سے پہلے اس کا اعلان کرے یا جنگ کے بعد بطور انعام دے یعنی اعلان یا دیئے بغیر اس کا استحقاق نہیں۔

غنیمت میں سے بخشش دینا: جن کا غنیمت میں با قاعدہ حصہ نہیں، اور ان کو بخشش دینا مصلحت کے موافق ہے، اس کو بھی پہلے ہی اخماسِ اربعہ میں سے اٹھالے۔ یہ بخشش درج ذیل لوگوں کو دی جاتی ہے:

۱۔ عورتوں کو: جن کی جنگ میں خدمات ہوں۔ مثلاً بیماروں کا علاج یا تیمارداری کی ہو، فوجیوں کے لئے کھانا پکایا ہو، یا مجاہدین کے احوال کی خبر گیری کی ہو۔

۲۔ غلاموں، بچوں اور ان ذمیوں کو جن کو امام نے جنگ میں شرکت کی اجازت دی ہو، اور ان سے مجاہدین کو نفع حاصل ہوا ہو۔

مسئلہ: اگر غنیمت میں حاصل شدہ کسی چیز کے بارے میں پتہ چلے کہ وہ کسی مسلمان کا مال ہے، جس پر دشمن نے قبضہ کرلیا تھا، تو وہ چیز مالک کو ویسے ہی لوٹا دی جائے (مشکوۃ حدیث ۴۰۰۲ و ۴۰۰۳)

وَيُقَسَّمُ أربعةُ أخماسه في الغانمين: يجتهد الإمامُ أولاً في حال الجيش: فمن كان نفلُه أوفق بمصلحة المسلمين نَفَّلَ له؛ وذلك بإحدى ثلاث:

[إحداها] أن يكون الإمامُ دخل دار الحرب، فبعث سرية تُغِيْرُ على قرية مثلاً، فَيُجْعل لها الربعُ بعد الخُمس، أو الثلثُ بعد الخُمس؛ فما قَدِمَتْ به السريةُ: رفع خُمُسَه، ثم أعطى السريةَ ربعَ ما غبر، أوثلثه، وجعل الباقي في المغانم.

وثانيتها: أن يجعل الإمامُ جُعْلاً، لمن يعمل عملاً فيه غَناء عن المسلمين، مثلاً: أن يقول: من طلع هذا الحصن فله كذا، من جاء بأسير فله كذا، من قتل قتيلاً فله سلبُه؛ فإن شرط من مال المسلمين أعطى منه، وإن شرط من الغنيمة أعطى من أربعة أخماس.

وثالثتها: أن يخص الإمامُ بعضَ الغانمين بشيئ لغَنائه وبأسه، كما أعطى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم سلمةَ بن الأكوع في غزوة ذي قَرَدٍ سهمَ الفارس والراجل، حيث ظهر منه نفع عظيم للمسلمين.

والأصح عندي: أن السَّلَب إنما يستحقه القاتل بجعل الإمام قبلَ القتال، أو تنفيله بعدَه.

ويرفع ما ينبغي أن يُرْضَخَ دون السهم:

[۱] للنساء: يداوين المرضى، ويطبخن الطعام، ويُصلحن شأنَ الغزاة.

[۲] وللعبيد، والصبيان، وأهل الذمة: الذين أَذِنَ لهم الإمامُ، إن حصل منهم نفع للغزاة.



وإن عثر على أن شيئًا من الغنيمة: كان مالُ مسلمٍ، ظَفَرَ به العدوُّ: رَدَّ عليه بلا شيئ.

لغات: نَفَلَ (ن) نَفْلاً وَنَفَّلَ تنفيلاً: حصہ سے زائد عطیہ دینا...... غبر: بقی...... الجُعْل: محنتانہ، مزدوری...... غناء: بڑا نفع...... رَضَخَ له: مال کا کچھ حصہ دینا۔

☆ ☆ ☆

باقی غنیمت کی تقسیم

پھر باقی غنیمت ان لوگوں پر تقسیم کی جائے جو معرکہ میں شریک تھے۔ گھوڑ سوار کے لئے تین حصے ہیں، اور پیادہ کے لئے ایک حصہ (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۸۷)

ملحوظہ: یہ صاحبین اور جمہور کی رائے ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک: گھوڑ سوار کے لئے دو حصے ہیں۔ تیسرا حصہ اگر امام بطور انعام دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے۔

شتر سواروں اور تیر اندازوں کا حکم: شاہ صاحب قدس سرہٗ کی رائے یہ ہے کہ اگر امام مناسب سمجھے تو شتر سواروں اور تیر اندازوں کو پیدل لڑنے والوں سے کچھ زیادہ دے۔ اسی طرح عربی گھوڑوں کو عجمی گھوڑوں پر ترجیح بھی دے سکتا ہے۔ ان کو کچھ زیادہ دے، مگر چوہرا نہ دے۔ اور امام کو یہ کام ذی رائے لوگوں کے مشورہ سے کرنا چاہئے۔ اور اس وقت کرنا چاہئے کہ مخالفت کا اندیشہ نہ ہو۔ اور اس طرح نبی ﷺ اور آپؐ کے اصحاب کے حربی معاملات میں اختلاف ختم کیا جاسکتا ہے۔

وضاحت: رسول اللہ ﷺ سے مطلقاً گھوڑوں کو دو حصے اور سوار کو ایک حصہ دینا مروی ہے۔ آپؐ نے عربی اور غیر عربی گھوڑوں میں فرق نہیں کیا۔ اور مُنذر بن ابی حمیصہ وداعی ہمدانی رضی اللہ عنہ نے غیر عربی گھوڑوں کو حصہ کم دیا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو برقرار رکھا ہے (اصابہ ۳: ۵۰۳)

مسئلہ: اور جس کو امیر نے لشکر کی مصلحت کے لئے بھیجا ہو، اس کو بھی باقاعدہ غنیمت میں سے حصہ دیا جائے۔ اگرچہ وہ معرکہ میں شریک نہ ہوا ہو۔ جیسے پیام رساں، دشمن کی معلومات حاصل کرنے کے لئے فرستادہ اور جاسوس وغیرہ۔ جنگ بدر میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شریک نہیں ہوسکے تھے۔ نبی ﷺ کی صاحبزادی اور حضرت عثمانؓ کی بیوی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سخت علیل تھیں۔ ان کی تیمارداری کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مدینہ چھوڑا گیا تھا۔ چنانچہ بدر کی غنیمت میں سے ان کو بھی حصہ دیا گیا۔

ثم يُقسم الباقي على من حضر الوَقْعَة: للفارس ثلاثةُ أسهم، وللراجل سهم.
وعندي: أنه إن رأى الإمامُ أن يزيد لركبانِ الإبل أو للرُّماة شيئًا، أو يُفَضِّلَ العِرابَ على

البراذين بشيئ دون السهم: فله ذلك، بعدَ أن يشاور أهلَ الرأى، ويكون أمراً لا يُختلَفُ عليه لأجله، وبه يُجمع اختلافُ سِيَرِ النبى صلى الله عليه وسلم وأصحابِه رضى الله عنهم فى الباب.
ومن بعثه الأميرُ لمصلحةِ الجيش، كالبريد، والطليعة، والجاسوس: يُسْهَمُ له، وإن لم يحضر الوقعة كما كان لعثمان يومَ بدر.

ترجمہ: واضح ہے۔ البِرْذون: غیر عربی گھوڑا۔

☆ ☆ ☆

مالِ فئی کے مصارف

مالِ فئی (بلا جنگ حاصل ہونے والے مال) کے مصارف اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحشر آیات ۷-۱۰ میں بیان فرمائے ہیں۔ ارشاد پاک ہے: ''جو مال اللہ تعالیٰ نے فئی کے طور پر دیا اپنے رسول کو بستیوں کے لوگوں سے تو وہ اللہ کے لئے، اور رسول کے لئے، اور رسول کے رشتہ داروں، اور یتیموں اور مسکینوں، اور مسافر کے لئے ہے...... اور ان حاجت مند مہاجرین کے لئے ہے، جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکالے گئے...... اور اُن (انصار) کے لئے ہے جو مہاجرین کے آنے سے پہلے سے دارالاسلام (مدینہ) میں اور ایمان میں قرار پکڑے ہوئے ہیں...... اور ان لوگوں کے لئے ہے جو ان کے بعد آئے، جو دعا کرتے ہیں...... بیشک آپ بڑے شفیق ورحیم ہیں''۔ جب اِن آیات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھا تو فرمایا: ''اس (آخری) آیت نے تمام مسلمانوں کا استیعاب کیا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۶۱) یعنی مالِ فئی میں سبھی مسلمانوں کا حصہ ہے۔ پس امام مالِ فئی کو پہلے زیادہ اہم کاموں میں خرچ کرے، پھر اس سے کم اہم کاموں میں۔ اور وہ اس سلسلہ میں مسلمانوں کی مصلحت پیشِ نظر رکھے۔ اپنی کسی مخصوص مصلحت کو پیشِ نظر نہ رکھے۔

اور فئی کی تقسیم کے طریقے مختلف رہے ہیں:

۱— رسول اللہ ﷺ کے پاس جب مالِ فئی آتا تو آپؐ اسی دن اس کو تقسیم فرمادیتے: کنبہ دار کو دو حصے، اور مجرد کو ایک حصہ دیتے تھے (مشکوۃ حدیث ۴۰۵۷)

۲— حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول تھا۔ آپ آزاد اور غلام سب کو دیتے تھے (رواہ ابوداؤد، جامع الاصول حدیث ۱۲۳۷) اور حاجت مندوں کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔

۳— اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ اس کے لئے رجسٹر بنایا تھا۔ اور اسلام کی طرف پیش قدمی کرنے اور حاجت مندوں کے لحاظ سے درجہ بندی کی تھی۔ اور ہر ایک کے وظائف کی تحدید بھی کردی تھی۔ مثلاً: (۱) وہ لوگ جو قدیم الاسلام ہیں (۲) وہ لوگ جو سخت آزمائشوں سے گذرے ہیں (۳) وہ لوگ جو عیالدار ہیں (۴) اور وہ لوگ جو ضرورت مند ہیں (تفصیل

کے لئے دیکھیں ازالۃ الخفا ۲: ۶۸)

اور ضابطہ: اس قسم کے اختلاف میں یہ ہے کہ اس کو اختلافِ اجتہاد پر محمول کیا جائے۔ اور یہ کہا جائے کہ ہر ایک نے اس مصلحت کو پیش نظر رکھا ہے جو اس وقت اس کے سامنے آئی۔

وأما الفَيْءُ: فمصرفه ما بين الله تعالى، حيث قال: ﴿مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى: فَلِلّٰهِ، وَلِلرَّسُوْلِ، وَلِذِيْ الْقُرْبٰى، وَالْيَتَامٰى، وَالْمَسَاكِيْنِ، وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ إلى قوله: ﴿رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ ولما قرأها عمر رضى الله عنه قال: "هذه استوعبت المسلمين!" فيصرفه إلى الأهم، فالأهم وينظر في ذلك إلى مصالح المسلمين، لا مصلحته الخاصة به.

واختلفت السنن في كيفية قسمة الفيء: فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أتاه الفيءُ قَسَمَه في يومه: فأعطى الآهِلَ حَظَّيْنِ، وأعطى الأَعْزَبَ حظا؛ وكان أبوبكر رضى الله عنه يقسم للحر وللعبد، يتوخّى كفايةَ الحاجة؛ ووضع عمر رضى الله عنه الديوان: على السوابق والحاجات: فالرجل وقِدَمُه، والرجل وبلاؤه، والرجل وعيالُه، والرجل وحاجتُه؛ والأصلُ في كل ماكان مثلَ هذا من الاختلاف: أن يُحمل على أنه إنما فعل ذلك على الاجتهاد، فتوخّى كلٌّ المصلحةَ بحسب ما رأى في وقته.

ترجمہ: اور حضرت عمرؓ نے رجسٹر بنایا تھا: سبقت کرنے والوں اور حاجتوں کے اعتبار سے: پس آدمی اور اس کی قدامت، اور آدمی اور اس کی آزمائش، اور آدمی اور اس کے بال بچے، اور آدمی اور اس کی ضرورت —— اور ضابطہ: ہر اس اختلاف میں جو اس طرح کا ہو یہ ہے کہ اس پر محمول کیا جائے کہ وہ کام اجتہاد کے طور پر کیا ہے۔ پس ہر ایک نے مصلحت کا قصد کیا ہے اس طور پر جو اس نے اس وقت میں دیکھی۔

☆ ☆ ☆

مفتوحہ زمینوں کا حکم

جن زمینوں پر مسلمانوں نے غلبہ پالیا ہے یعنی جنگ کر کے ان کو فتح کیا ہے: ان کے بارے میں امام کو تین اختیار ہیں:

۱— اگر چاہے تو ان کو غانمین میں بانٹ دے کہ وہ بھی مالِ غنیمت ہیں۔

۲— اور اگر چاہے تو ان کو مجاہدین کے لئے یعنی جہاد کی ضروریات کے لئے روک لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر میں ایسا ہی کیا تھا۔ آدھی زمین غانمین میں بانٹ دی تھی۔ اور آدھی جہاد کی اور مسلمانوں کی

ضروریات کے لئے روک لی تھی۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی عراق کی زمین روک لی تھی۔غانمین کے اصرار کے باوجود ان پر تقسیم نہیں کی تھی۔

۳ــــ اور اگر چاہے تو ان میں ان کفار کو بسائے جو ذمی بن کر رہنا منظور کریں۔اور ان سے خراج (لگان) وصول کرے۔

جزیہ کی مقدار

جب یمن والوں کے ساتھ جزیہ پر مصالحت ہوئی تو نبی ﷺ نے حضرت مُعاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا، اور حکم دیا کہ ہر بالغ شخص سے سالانہ ایک دینار یا اتنی قیمت کا مُعافری کپڑا وصول کیا جائے۔(مشکوۃ حدیث ۴۰۳۶) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالدار پر سالانہ اڑتالیس درہم، اور متوسط حال پر چوبیس درہم، اور کامدار غریب پر بارہ درہم جزیہ مقرر کیا تھا (ازالۃ الخفاء ۲: ۶۹ بحوالہ امام ابو یوسفؒ)

یہاں سے یہ بات جانی گئی کہ جزیہ کی کوئی مقدار شرعاً متعین نہیں۔اس کی مقدار امام کی صوابدید پر موقوف ہے۔اسی طرح خراج (مالگذاری) کی بھی کوئی مقدار متعین نہیں۔حالات کا لحاظ کر کے لگان متعین کیا جائے۔اسی طرح ہر اس معاملہ میں جس میں نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے طریقوں میں اختلاف ہے: یہی بات کہی جائے کہ وہ اجتہادی امور ہیں۔اور ہر ایک نے اپنے زمانہ کی مصلحت پیش نظر رکھی ہے۔

والأراضي التي غلب عليها المسلمون: للإمام فيها الخيار: إن شاء قسمها في الغانمين، وإن شاء أوقفها على الغزاة، كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم بخيبر: قسم نصفَها، ووقف نصفها، ووقف عمر رضي الله عنه أرض السواد، وإن شاء أسكنها الكفار، ذمةً لنا.

وأمر النبي صلى الله عليه وسلم معاذًا رضي الله عنه: أن يأخذ من كل حالم دينارًا، أو عِدْلَه معافِرَ؛ وفرض عمر رضي الله عنه على الموسر ثمانية وأربعين درهما، وعلى المتوسط أربعة وعشرين، وعلى الفقير المعتمل اثني عشر.

ومن هنا يُعلم أن قدرَه مفوَّض إلى الإمام، يفعل ما يرى من المصلحة، ولذلك اختلفت سِيَرُهم، وكذلك الحكم عندي في مقادير الخراج، وجميع ما اختلفت فيه سِيَرُ النبي صلى الله عليه وسلم وخلفائِه رضي الله عنهم.

ترجمہ: واضح ہے۔وقف اور أوقف لغوی معنی میں ہیں۔اصطلاحی وقف مراد نہیں۔

☆ ☆ ☆

غنیمت اور فئی کی حلّت کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کی امت کے لئے مالِ غنیمت وفئی کو دو وجہ سے حلال کیا ہے:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی کمزوری دیکھی پس اس کے لئے ان اموال کو حلال کیا۔ یہ مضمون متفق علیہ روایت میں آیا ہے (مشکوۃ حدیث ۳۹۸۵)

دوسری وجہ: یہ ہے کہ غنیمت وفئی کی حلّت: ہمارے نبی ﷺ کی دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پر، اور آپؐ کی امت کی دیگر امتوں پر برتری کے لئے ہے۔ یہ مضمون مسلم شریف کی روایت میں آیا ہے (مشکوۃ حدیث ۵۷۴۸)

اور مذکورہ دونوں وجہوں کی دلیلیں کتاب کی قسم اول، مبحث ۶ باب ۲۰ رحمۃ اللہ ۲: ۴۰۵ تا ۴۱۰ میں بیان ہو چکی ہے۔

وإنما أباح اللّٰهُ لنا الغنيمةَ والفيءَ: لما بينه النبي صلى الله عليه وسلم، حيث قال: " لم تَحِلَّ الغنائمُ لأحدٍ من قبلنا، ذلك: بأن الله رأى ضَعْفنا وعجزنا، فأحلَّها لنا" وقال صلى الله عليه وسلم: " إن الله فَضَّلَ أمتي على الأمم، وأحل لنا الغنائم" وقد شرحنا هذا في القسم الأول، فلانعيده.

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے جائز کیا ہمارے لئے غنیمت وفئی کو اُس وجہ سے جو نبی ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: "نہیں حلال کی گئیں غنیمتیں ہم سے پہلے کسی کے لئے: وہ جواز بایں وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری کمزوری اور ہماری عاجزی دیکھی، پس اس کو ہمارے لئے حلال کیا" اور فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے میری امت کو تمام امتوں پر برتری بخشی ہے، اور ہمارے لئے غنیمتیں حلال کی ہیں" اور ہم قسم اول میں اس کی تشریح کر چکے ہیں۔ پس ہم اس کا اعادہ نہیں کرتے۔

☆ ☆ ☆

غنیمت وفئی کے مصارف کی حکمتیں

ابھی غنیمت وفئی کے جو مصارف بیان کئے گئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ غنیمت کا بڑا حصہ (چار اخماس) غانمین کے لئے ہے۔ اور فئی دیگر ملی اور ملکی کاموں کے لئے ہے۔ کیونکہ بیت المال میں تین قسم کے اموال جمع ہوتے ہیں: ایک: صدقات وعشر۔ دوم: مالِ غنیمت۔ سوم: مالِ فئی: جزیہ اور خراج وغیرہ۔ شریعت نے ان اموال کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ صدقات وعشر میں بنیادی اہمیت حاجت مندوں کو دی ہے، غنیمت میں مجاہدین کو، اور اموالِ فئی میں ملکی اور ملی ضروریات کو۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ پہلے دو باتیں بیان فرماتے ہیں: ۱- بیت المال کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟ ۲- ممالک کی کتنی قسمیں ہیں، اور ان کی ضروریات کیا ہیں؟ پھر غنیمت میں غانمین کی ترجیح کی تین حکمتیں بیان فرمائیں گے۔

بیت المال کے بنیادی مقاصد

بیت المال کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

پہلا مقصد: ایسے لوگوں کے بقاء کا سامان کرنا جن کے پاس کچھ نہیں۔ یا تو وہ لولے لنجے ہیں، یا کسی حادثہ کی بنا پر ان کے مال کا صفایا ہو گیا ہے، یا وہ اپنے مال سے دور ہیں اور ان کو حاجت درپیش ہے۔

دوسرا مقصد: کفار کی ریشہ دوانیوں سے مملکت کی حفاظت کرنا۔ سرحدوں کے سوراخ بند کرنا۔ مجاہدین کے مصارف کا انتظام کرنا۔ اور جہاد کے لئے ہتھیار اور گھوڑے تیار کرنا۔

تیسرا مقصد: مملکت کا داخلی نظم وضبط کرنا۔ پولس اور عدلیہ کے محکمے قائم کرنا۔ حدود جاری کرنا، اور محکمۂ احتساب قائم کرنا۔

چوتھا مقصد: دین وملت کی بقاء اور ترقی پر خرچ کرنا۔ جیسے خطباء، ائمہ، واعظین اور مدرسین کا تقرر کرنا۔

پانچواں مقصد: مفادِ عامہ کے کام انجام دینا۔ جیسے نہریں اگارنا، اور پل تعمیر کرنا۔

اسی طرح کے اور بھی کام ہیں جن پر خرچ کرنا ضروری ہے۔

ممالک کی قسمیں اور ان کی ضروریات

ممالک کی دو قسمیں ہیں: ایک: وہ ممالک جن میں صرف مسلمان رہتے ہیں، جیسے حجاز، یا ان میں مسلمانوں کی کثرت ہے۔ دوم: وہ ممالک جن میں بڑی تعداد غیر مسلموں کی ہے۔ مسلمان بہ زور اُن پر غالب آ گئے ہیں، یا مصالحت کے ذریعہ ان پر قبضہ کیا ہے۔

دوسری قسم کے ممالک کا مزانیہ (بجٹ) بھاری ہوتا ہے۔ ان ممالک کی بہت ضروریات ہوتی ہیں۔ مثلاً: فوج تیار کرنا۔ جنگی سامان مہیا کرنا۔ عدلیہ کا انتظام کرنا۔ پولس اور سرکاری عملہ کا تقرر کرنا۔ اور پہلی قسم کے ممالک میں یہ سب انتظامات بہت زیادہ ضروری نہیں۔ اس لئے ان کا مزانیہ ہلکا ہوتا ہے۔

غنیمت میں غانمین کی ترجیح کی وجوہ

پہلی وجہ: شریعت کا منشا یہ ہے کہ ہر شہر میں جو بیت المال اکٹھا ہوتا ہے، اس کو ضروریات کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ:

(الف) زکوۃ وعشر کے مصارف میں محتاجوں کا دوسروں سے زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

(ب) اور غنیمت وفئی میں فوج کی تیاری اور ملک وملت کی حفاظت کا غرباء کی حاجت روائی سے زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

چنانچہ زکوۃ میں یتامی، مساکین اور فقراء کا حصہ زیادہ رکھا گیا ہے، اور غنیمت وفئی میں کم۔ اور مجاہدین کا حصہ غنیمت وفئی میں زیادہ رکھا گیا ہے، اور زکوۃ میں کم (شاہ صاحب کے نزدیک مصارفِ زکوۃ آٹھ میں منحصر نہیں۔ دیکھیں رحمۃ اللہ ۴: ۷۴)

دوسری وجہ: غنیمت پاپڑ بیل کر اور گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ کارنامہ مجاہدین انجام دیتے ہیں۔ پس ان کے دل اسی وقت خوش ہو سکتے ہیں، جب اس کی تقسیم میں ان کے ساتھ ترجیحی معاملہ کیا جائے۔

تیسری وجہ: شریعت کے عمومی احکام میں عمومی احوال کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اور فطری اور عقلی رغبتوں کو ملایا جاتا ہے۔ اور لوگوں کی صورتِ حال یہ ہے کہ وہ جہاد میں اسی صورت میں رغبت کر سکتے ہیں جب کوئی مال بھی بدست آئے۔ اس لئے لوگوں کی خواہش کا لحاظ کر کے غنیمت کے چار اخماس مجاہدین کے لئے مختص کئے گئے ہیں۔

اور فئی کے لئے بالفعل جنگ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ محض دبدبہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے مصارف میں فوج کا حصہ نہیں رکھا گیا۔ وہ ملّی اور ملکی ضرورتوں کے لئے خاص کی گئی ہے۔ اور الأهم فالأهم کے اصول سے خرچ کی جاتی ہے۔

والأصل في المصارف:

[۱] أن أمهاتِ المقاصدِ أمور:

منها: إبقاءُ ناسٍ لايقدرون على شيئ: لزِمانةٍ، أو لاجْتِياح مالهم، أو بُعْدِه منهم.

ومنها: حفظ المدينة عن شر الكفار، بسدّ الثغور، ونفقاتِ المقاتِلة، والسلاح، والكُراع.

ومنها: تدبير المدينة وسياستُها: من الحِراسة، والقضاء، وإقامة الحدود، والحِسْبة.

ومنها: حفظ الملة بنصب الخطباء، والأئمة، والوُعّاظ، والمدرسين.

ومنها: منافع مشتركة، ككرى الأنهار، وبناء القناطر ونحوُ ذلك:

[۲] وأن البلاد على قسمين: قسم: تجرَّد لأهل الإسلام، كالحجاز، أو غلب عليه المسلمون؛ وقسمٌ: أكثرُ أهله الكفار، فغلب عليهم المسلمون بعَنْوة، أو صلح.

والقسم الثاني: يحتاج إلى شيئ كثير من جمع الرجال، وإعداد آلات القتال، ونصب القضاة والحرس والعمال؛ والأول: لايحتاج إلى هذه الأشياء كاملة وافرة.

وأراد الشرعُ أن يُوَزِّعَ بيتُ المال المجتمعُ في كل بلاد على ما يلائمُها، فجعل:

[الف] مصرفَ الزكاة والعشر: مايكون فيه كفايةُ المحتاجين أكثرَ من غيرها.

[ب] ومصرف الغنيمة والفيء: مايكون فيه إعدادُ المقاتِلة وحفظُ الملة وتدبير المدينة أكثر.

ولذلك جعل سهمَ اليتامى والمساكينِ والفقراءِ من الغنيمة والفيء أقلَّ من سهمهم من الصدقات؛ وسهمَ الغزاة منهما أكثرَ من سهمهم منها.

ثم الغنيمة: إنما تحصل بمعاناة وإيجاف خيل وركاب: فلا تطيب قلوبُهم إلا بأن يعطوا منها.

والنواميسُ الكلية المضروبةُ على كافَّة الناس: لابد فيها من النظر إلى حال عامة الناس، ومن ضَمِّ الرغبة الطبيعية إلى الرغبة العقلية، ولايرغبون إلا بأن يكون هناك مال يجدونه بالقتال، فلذلك كان أربعة أخماسها للغانمين.

والفيءُ: إنما يحصُل بالرُّعب، دون مباشرة القتال: فلا يجب أن يصرف على ناس مخصوصين، فكان حقُّه: أن يُقَدَّمَ فيه الأهم فالأهم.

ترجمہ: اور بنیادِ مصارف میں: (۱) یہ ہے کہ امہاتِ مقاصد چند امور ہیں: از انجملہ: ایسے لوگوں کو زندہ رکھنا ہے جو کسی چیز پر قادر نہیں: اپاہج ہونے کی وجہ سے، یا ان کے مال کا صفایا ہو جانے کی وجہ سے، یا مال کے ان سے دور ہونے کی وجہ سے — اور از انجملہ: کفار کے شر سے مملکت کی حفاظت ہے: سرحدوں کو بند کرنے کے ذریعہ، اور مجاہدین کے خرچوں کے ذریعہ، اور ہتھیار اور گھوڑوں کے ذریعہ — اور از انجملہ: مملکت کا نظم و انتظام کرنا ہے یعنی پاسبانی اور قضاء، اور حدود کا اجراء، اور محکمۂ احتساب کا قیام (الحِسْبة: احتسابی محکمہ جو اسلامی حکومتوں میں زندگی کے معاملات و آداب کی نگرانی کے لئے ہوتا ہے اس نظام کے تحت اشیاء کے نرخوں کی نگرانی، اور نماز وغیرہ عبادات کی پابندی کرانا اور فواحش و منکرات کی روک تھام کرنا آتا ہے) — اور از انجملہ: ملت کی حفاظت کرنا: خطباء (جمعہ پڑھانے والے) اور عام ائمہ مساجد، اور واعظین، اور مدرسین کے تقرر کے ذریعہ — اور از انجملہ: مفادِ عامہ کے کام کرنا: جیسے نہروں کی کھدائی، اور پُل تعمیر کرنا — اور اس قسم کے امور۔

(۲) اور (مصارف میں بنیاد) یہ ہے کہ ممالک کی دو قسمیں ہیں: ایک: وہ ممالک جو مسلمانوں کے لئے فارغ ہیں، جیسے حجاز، یا ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اور دوسری قسم: وہ ممالک جن کے بیشتر باشندے غیر مسلم ہیں۔ پس ان پر مسلمان بہ زور غالب آگئے، یا صلح کے ذریعہ — اور قسم ثانی: بہت چیزوں کی محتاج ہے یعنی فوج جمع کرنا، اور جنگ کے آلات تیار کرنا۔ اور قاضیوں اور چوکیداروں اور کارندوں کو مقرر کرنا۔ اور قسم اول: ان چیزوں کی کامل و مکمل طور پر محتاج نہیں۔

(غنیمت میں غانمین کی ترجیح کی پہلی وجہ) اور شریعت نے چاہا کہ وہ بیت المال جو تمام شہروں میں اکٹھا ہونے والا ہے: اُن کاموں پر تقسیم کیا جائے جو بلاد کے ملائم (مناسب و موافق) ہوں۔ پس مقرر کیا: (الف) زکوٰۃ و عشر کا مصرف: وہ جس میں محتاجوں کی کفایت زیادہ ہوتی ہے کفایت کے علاوہ سے یعنی بقدر کفاف ہی ان کے گذارے کا سامان کرنا مقصود ہوتا ہے (ب) اور غنیمت وفَیٔ کا مصرف: وہ جس میں فوجیوں کو تیار کرنا، اور ملت کی حفاظت اور مملکت کی صیانت زیادہ ہوتی ہے — اور اسی وجہ سے یتیموں، اور مسکینوں اور فقیروں کا حصہ غنیمت وفَیٔ میں کم رکھا، صدقات میں ان کے حصہ سے۔ اور مجاہدین کا حصہ غنیمت وفَیٔ میں زیادہ مقرر کیا، صدقات میں ان کے حصہ سے — (دوسری وجہ) پھر غنیمت: مشقت اور گھوڑے اور اونٹ دوڑانے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ پس مجاہدین کے دل خوش نہیں ہوں گے مگر بایں طور کہ وہ دیئے جائیں غنیمت میں سے — (تیسری وجہ) اور قوانین کلیہ جو تمام لوگوں پر مقرر کئے جاتے ہیں: ضروری ہے ان میں عام

لوگوں کی حالت کی طرف نظر کرنا، اور فطری رغبت کو عقلی رغبت کے ساتھ ملانا۔ اور عام لوگ رغبت نہیں کریں گے مگر بایں طور کہ وہاں (جہاد میں) کوئی مال ہو، جس کو وہ جنگ کے ذریعہ پائیں۔ پس اس وجہ سے غنیمت کے چار خمس غانمین کے لئے ہیں ــــ اور فئی: دبدبہ ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، نہ کہ بالفعل جنگ کرنے کے ذریعہ: پس ضروری ہے کہ وہ خرچ کی جائے مخصوص لوگوں پر۔ پس فئی کا حق تھا: کہ اس میں الأهم فالأهم کو مقدم کیا جائے۔

☆ ☆ ☆

خُمس اور اس کے مصارف کی حکمتیں

مشروعیتِ خُمس کی وجہ

خُمس کے سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ ''غنیمت کا چوتھائی'' لینے کا جاہلیت میں عام دستور تھا۔ قوم کا سردار اور اس کا خاندان یہ مال وصول کیا کرتا تھا۔ اور یہ بات ان کے اذہان میں مرتکز ہو چکی تھی۔ وہ اس لینے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کا ایک شاعر فخریہ کہتا ہے:

اور ہر غارت لوٹ میں ہمارا چوتھائی ہے — خواہ وہ نجد میں ہو، خواہ تہاموں میں

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ملک وملت کی ضروریات کے لئے مالِ غنیمت کا خمس مشروع کیا۔ اور یہ تشریع عربوں کے تصورات کے مطابق تھی۔ اور اس کی نظیر انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں ہیں۔ ان میں بھی لوگوں میں شائع ذائع باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں قسم اول، مبحث ۶ باب ۴ رحمۃ اللہ ۲: ۹۳)

خمس میں رسول اللہ ﷺ کا حصہ رکھنے کی وجہ

زمانۂ جاہلیت میں ''غنیمت کا چوتھائی'' قوم کا سردار اور اس کا خاندان دو وجہ سے وصول کیا کرتا تھا۔ ایک: رفعتِ شان کے لئے۔ دوسرے: اس لئے کہ سردار عام لوگوں کے کام میں مشغول ہوتا ہے، اور اپنی ضروریات کمانے کے لئے فارغ نہیں ہوتا۔ اور اس کے مصارف بھی زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے وہ یہ مال وصول کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی دو وجہ سے خمس میں رسول اللہ ﷺ کا حصہ مقرر کیا:

پہلی وجہ: آپ ﷺ بھی لوگوں کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اپنے گھر والوں کی ضروریات کمانے کے لئے فارغ نہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپؐ کے مصارف مسلمانوں کے مال میں ہوں۔

دوسری وجہ: مسلمانوں کو جو فتح نصیب ہوتی تھی وہ نبی ﷺ کی دعا اور آپؐ کے اُس رعب کی وجہ سے ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عنایت فرمایا تھا۔ آپؐ کا ارشاد ہے: نُصِرْتُ بالرعب: میں رعب سے مدد کیا گیا ہوں (نسائی ۶: ۳

کتاب الجہاد) پس گویا آپؐ ہر معرکہ میں موجود ہیں۔اس لئے ہر خمس میں آپؐ کا حصہ رکھا گیا ہے۔

خُمس میں ذوی القربیٰ کا حصہ رکھنے کی وجہ

جاہلیت میں مرباع (چوتھائی) میں سردارِ قوم کا خاندان بھی شریک وسہیم ہوتا تھا۔ چنانچہ خمس میں رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں کا حصہ بھی دو وجہ سے مقرر کیا گیا:

پہلی وجہ — نصرت وحمایت — آپؐ کے خاندان نے آپؐ کی حفاظت کی تھی۔ جب وہ مسلمان نہیں تھے اس وقت بھی نصرت میں کمربستہ تھے۔ اور یہ حمایت عبدِ مناف کے دولڑکوں کی اولاد نے کی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے بنو ہاشم اور بنو مطلب ہی کو ذوی القربیٰ کا حصہ دیا۔ پھر جب وہ مسلمان ہوگئے تو ان کی حمیت وحمایت اور نصرت واعانت میں اضافہ ہوگیا۔ نسبی غیرت کے ساتھ دینی غیرت بھی شامل ہوگئی۔ کیونکہ اب ان کے لئے حضرت محمد ﷺ کے دین کے علاوہ کوئی فخر باقی نہیں رہا تھا۔

دوسری وجہ — رفعتِ شان — زمانۂ جاہلیت میں جو چوتھائی غنیمت وصول کی جاتی تھی اس میں رفعتِ شان اور اپنا امتیاز قائم کرنا بھی مقصود ہوتا تھا۔ ذوی القربیٰ کا خمس میں حصہ رکھنے میں یہ پہلو بھی پیش نظر ہے۔ اور یہ کوئی شخصی مصلحت نہیں، بلکہ ملّی مصلحت ہے۔ جب علماء وقراء کی تعظیم وتوقیر سے ملت کی شان بلند ہوتی ہے تو صاحبِ ملت کے رشتہ داروں کی توقیر وتعظیم سے بدرجۂ اولیٰ ملت کی شان بلند ہوتی ہے۔

خمس میں مساکین، مسافر اور یتامیٰ کا حصہ رکھنے کی وجہ

خُمس میں مساکین، مسافر اور یتامیٰ کا حصہ ان کی حاجت مندی کی بنا پر رکھا گیا ہے۔ صدقات وعشر کے مصارف میں تو ان کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور غنیمت وفیٔ میں بھی ان کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اور سورۃ الحشر میں اس کی وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ ان محتاجوں کا فیٔ میں حصہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ اموالِ فیٔ مالداروں کے درمیان دست گرداں ہوکر نہ رہ جائیں، جن سے سرمایہ دار مزے لوٹیں اور غریب فاقوں مریں!

خمس: مصارف خمسہ کے ساتھ خاص نہیں

اور یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خُمس سے مؤلفۃ القلوب اور ان کے علاوہ کو بھی دیا ہے۔ پس خُمس مذکورہ مصارفِ خمسہ کے ساتھ خاص نہیں۔ اور ذکر میں ان کی تخصیص تین وجہ سے کی گئی ہے۔

پہلی وجہ: اہتمام شان کے لئے ان کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ مصارفِ خمس میں ان کو اولیں اہمیت دی جائے۔

دوسری وجہ: محتاجوں کا تذکرہ کرنے سے لوگوں کو یہ تاکید کرنا مقصود ہے کہ مالدار خمس وفیٔ کو دست گرد چیز نہ بنالیں۔

بلکہ حاجت مندوں کا بھی حق ادا کریں۔

تیسری وجہ: اگر مصارف میں صرف رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے رشتہ داروں کا ذکر کیا جاتا تو بدگمانی کرنے والوں کو بدگمانی کا موقع ملتا کہ یہ بھی جاہلیت کے مرباع والا چکر ہے۔ جب ان کے ساتھ محتاجوں کا بھی تذکرہ کیا تو یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ ملی مصالح کے لئے ہے۔

فائدہ: یہ جو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے خمس سے مؤلفۃ القلوب اور ان کے علاوہ کو بھی دیا ہے، یہ غزوۂ حنین کی غنیمت کی تقسیم کی طرف اشارہ ہے۔ مگر اس موقع پر آپؐ نے جو کچھ مؤلفۃ القلوب کو دیا تھا: وہ خمس سے دیا تھا: اس کی کوئی صراحت نہیں۔ بلکہ بظاہر وہ مجموعۂ غنیمت سے یا اخماس اربعہ سے دیا تھا۔ اور اسی وجہ سے انصار کو ناراضگی ہوئی تھی۔ اور آپؐ نے ان کی دلداری کی تھی۔ اگر خمس سے دیا ہوتا تو انصار کی ناراضگی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ خمس میں تو غانمین کا حق ہی نہیں۔ واللہ اعلم

والأصل في الخُمُس: أنه كان المِرْبَاعُ عادةً مستمرةً في الجاهلية، يأخذه رئيسُ القوم وعصبتُه، فتمكّن ذلك في علومهم، وماكادوا يجدون في أنفسهم حرجًا منه، وفيه قال القائل:

وإنّ لنا المِرْبَاعَ من كلّ غارةٍ تكون بنَجْدٍ، أو بأرض التهائمِ

فشرع الله تعالى الخمس لحوائج المدينة والملّة، نحوًا مماكان عندهم، كما أُنزل الآياتُ على الأنبياء عليهم السلام نحواً مما كان شائعًا ذائعًا فيهم.

وكان المِرْبَاعُ لرئيس القوم وعصبتِه، تنويها بشأنهم، ولأنهم مشغولون بأمر العامة، محتاجون إلى نفقاتٍ كثيرة، فجعل الله الخمسَ.

[۱] لرسول الله صلى الله عليه وسلم: لأنه عليه السلام مشغول بأمر الناس، لايتفرغ أن يكتسب لأهله، فوجب أن تكون نفقتُه في مال المسلمين؛ ولأن النصرة حصلت بدعوة النبي صلى الله عليه وسلم، والرعبِ الذي أعطاه الله إياه، فكان كحاضِر الوقعة.

[۲] ولذوي القربى: لأنهم أكثرُ الناس حميَّةً للإسلام، حيث اجتمع فيهم الحميةُ الدينية إلى الحمية النسبية، فإنه لافخرلهم إلا بعلو دين محمد صلى الله عليه وسلم؛ ولأن في ذلك تنويهَ أهلِ بيتِ النبي صلى الله عليه وسلم، وتلك مصلحة راجعةٌ إلى الملة؛ وإذا كان العلماءُ والقراءُ: يكون توقيرُهم تنويها بالملة: يجب أن يكون توقيرُ ذوي القربى كذلك بالأولى.

[۳] وللمحتاجين: وَضَبَطَهم بالمساكين، والفقراء، واليتامى.

وقد ثبت أن النبي صلى الله عليه وسلم أعطى المؤلفةَ قلوبُهم وغيرَهم من الخمس: وعلى هذا فتخصيصُ هذه الخمسة بالذكر: للاهتمام بشأنها، والتوكيدِ: أن لايتَّخِذَ الخمسَ والفيءَ

أغنياؤُهم دُولَةً، فَيُهمِلُوا جانبَ المحتاجين، ولسَدِّ بابِ الظن السَّيِّئ بالنسبة إلى النبي صلى الله عليه وسلم، وقرابته.

ترجمہ: اور خمس میں بنیادی بات: یہ ہے کہ مالِ غنیمت کا چوتھائی لینا جاہلیت میں عادتِ مستمرہ تھی۔ اس کو قوم کا سردار اور اس کا خاندان لیا کرتا تھا۔ پس اس بات نے ان کے علوم (تصورات) میں جگہ پکڑ لی تھی۔ اور وہ قریب نہیں تھے کہ اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی پائیں۔ اور اس کے بارے میں کہنے والے نے کہا ہے: (شعر) اور بیشک ہمارے لئے ہر لوٹ میں سے چوتھائی ہے، وہ نجد کے علاقہ میں ہو یا تہامہ میں۔ پس اللہ تعالیٰ نے خمس شروع کیا ملت و مملکت کی ضروریات کے لئے، مانند اس کے جو ان کے نزدیک تھا یعنی وہ چوتھائی لیتے تھے اللہ نے بھی ویسا ہی مقرر کیا۔ اور ان سے کم مقرر کیا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر احکام اتارے ہیں اسی قبیل سے جو ان میں شائع ذائع تھے۔

اور چوتھائی قوم کے سردار اور اس کے خاندان کے لئے تھا: ان کی شان بلند کرنے کے طور پر، اور اس لئے کہ وہ عام لوگوں کے کام میں مشغول ہیں۔ بہت سارے خرچوں کے محتاج ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے خمس مقرر کیا: (۱) رسول اللہ ﷺ کے لئے: (الف) اس لئے کہ آپ ﷺ لوگوں کے کام میں مشغول ہیں۔ نہیں فارغ ہیں کہ اپنے گھر والوں کے لئے کمائیں۔ پس ضروری ہے کہ آپ کا خرچ مسلمانوں کے مال میں ہو (ب) اور اس لئے کہ فتح حاصل ہوتی ہے نبی ﷺ کی دعا سے، اور اس رعب کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا۔ پس آپ معرکہ میں موجود کی طرح تھے —— (۲) اور آپ کے رشتہ داروں کے لئے: (الف) اس لئے کہ وہ لوگوں میں زیادہ تھے اسلام کے لئے غیرت کے اعتبار سے، بایں طور کہ اکٹھا ہوگئی تھی ان میں دینی غیرت نسبی غیرت کے ساتھ۔ پس بیشک کوئی فخر نہیں تھا ان کے لئے مگر محمد ﷺ کے دین کی سربلندی سے —— (ب) اور اس لئے کہ اس میں نبی کریم ﷺ کے گھر والوں کی شان بلند کرنا ہے۔ اور وہ ایک مصلحت ہے جو ملت کی طرف لوٹنے والی ہے۔ اور جبکہ علماء اور قراء: ان کی توقیر و تعظیم ملت کی شان بلند کرنا تھی تو ضروری ہے کہ ذوی القربیٰ کی توقیر بدرجۂ اَولیٰ ایسی ہو —— (۳) اور محتاجوں کے لئے: اور ان کی تعیین کی مساکین اور فقراء اور یتامیٰ کے ذریعہ (غنیمت اور فئی کی آیات میں فقراء کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ابن السبیل کا ذکر ہے) —— اور تحقیق ثابت ہوا ہے کہ نبی ﷺ نے مؤلفۃ القلوب اور ان کے علاوہ کو خمس میں سے دیا ہے۔ اور اس تقدیر پر پس ان پانچ کے ذکر کی تخصیص: (۱) ان کی شان کے اہتمام کی وجہ سے ہے (۲) اور اس بات کی تاکید کے طور پر ہے کہ ان کے مالدار خمس اور فئی کو دست گرداں چیز (جو چیز گردش کرتی رہے) نہ بنالیں، پس وہ محتاجوں کی جانب رائگاں کردیں (۳) اور بدگمانی کے دروازے کو بند کرنے کے لئے ہے نبی ﷺ اور آپ کے رشتہ داروں کے تعلق سے۔

غنیمت سے چھوٹے بڑے عطیات دینے کی وجہ

پہلے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ بڑے لشکر (جیش) میں سے جو چھوٹا لشکر (سریہ) بھیجا جاتا ہے، اور وہ جو غنیمت لاتا ہے، اس میں سے خُمس نکالنے کے بعد باقی کا چوتھائی یا تہائی سریہ کو بطور انعام دیا جاتا ہے۔ اور جنگ میں جو عورتیں اور غلام وغیرہ خدمات انجام دیتے ہیں ان کو بھی کچھ دیا جاتا ہے، یہ چھوٹے بڑے انعامات وعطیات اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ اکثر انسان خطرناک کام کسی امید پر ہی انجام دیتے ہیں۔ یہ لوگوں کی عادت اور فطرت ہے، جس کی رعایت ضروری ہے۔

گھوڑسوار کا تہرا حصہ ہونے کی وجہ

شریعت نے گھوڑسوار کے لئے تین حصے، اور پیادے کے لئے ایک حصہ اس لئے مقرر کیا ہے کہ جنگ میں گھوڑسوار سے مجاہدین کو بہت زیادہ نفع پہنچتا ہے۔ اور اس کا خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ اور گھوڑسوار کا جی بھی جبھی خوش ہوتا ہے جب اس کو پیادے سے تہرا دیا جائے۔ اس سے کم میں وہ راضی نہیں ہوتا۔ عرب وعجم کے تمام گروہ: ان کے احوال وعادت کے اختلاف کے باوجود اس پر متفق ہیں۔

فائدہ: پہلے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک گھوڑسوار کا تہرا حصہ ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک دُوہرا۔ اور یہ اختلاف روایات میں اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہے۔ جمہور کا مستدل: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی اور اس کے گھوڑے کے لئے تین حصے نکالے۔ ایک حصہ اس کے لئے، اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لئے (مشکوۃ حدیث ۳۹۸۷) اور امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل: حضرت مجمع بن جاریہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ خیبر کی غنیمت اصحاب حدیبیہ پر تقسیم کی گئی۔ آپؐ نے غنیمت کے اٹھارہ حصے کئے (پھر ہر حصہ کے سو حصے کئے، پس کل اٹھارہ سو حصے ہوئے) اور لشکر پندرہ سو تھا، جس میں تین سو گھوڑسوار تھے۔ پس گھوڑسوار کو دو حصے اور پیادے کو ایک حصہ دیا (مشکوۃ حدیث ۴۰۰۶) یہ روایت ابوداؤد کی ہے۔ اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس روایت پر جو تبصرہ کیا ہے کہ حدیث میں وہم ہے۔ گھوڑسواروں کی تعداد تین سو نہیں، بلکہ دو سو تھی۔ یہ بات خود محل نظر ہے۔ اول: اس وجہ سے کہ یہ ایک دعوی ہے کہ گھوڑسواروں کی تعداد دو سو تھی۔ یہ دعوی دلیل کا محتاج ہے۔ اور کوئی دلیل اس پر قائم نہیں کی گئی اور اصحاب حدیبیہ کی تعداد میں روایات میں بہت اختلاف ہے۔ ثانیاً: یہ بات تسلیم کر لی جائے تو بھی حساب نہیں بیٹھے گا۔ حصوں کی تعداد ۱۹۰۰ ہوجائے گی۔

اس سلسلہ میں روایتی اور اسنادی بحث بہت طویل ہے۔ اعلاء السنن (۱۲: ۱۵۶-۱۷۴) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس مسئلہ میں شارح کا رجحان اس طرف ہے کہ گھوڑسوار کا دُوہرا حصہ تو اس کا حق ہے۔ اور تیسرا حصہ نَفَل (انعام) ہے جو گھوڑوں کی

کارکردگی اور امیر کی صوابدید پر موقوف ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عامل حضرت منذر بن ابی حمیصہ رضی اللہ عنہ نے شام میں ایک غنیمت تقسیم کی تو گھوڑے کو ایک حصہ، اور سوار کو ایک (کل دو حصے) دیئے۔ یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس کو درست قرار دیا۔ یہ واقعہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ اس روایت سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں: اول: یہ کہ حضرت منذرؓ کی یہ تقسیم خلافِ معمول تھی۔ اسی وجہ سے یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش ہوا۔ دوسری: حضرت عمرؓ کا اس تقسیم کو نافذ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ گھوڑے کا حصہ درحقیقت ایک ہی ہے۔ دوسرا انعامی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

وإنما شُرعت الأنفالُ والأرْضاخُ: لأن الإنسان كثيرًا مَا لايُقْدِم على مهلكةٍ إلا لشيئٍ يطمع فيه؛ وذلك ديدنٌ وخُلُقٌ للناس، لابد من رعايته.

وإنما جُعل للفارس ثلاثةُ أسهم، وللراجل سهمٌ: لأن غناءَ الفارس عن المسلمين أعظمُ، ومؤنته أكثرُ؛ وإن رأيتَ حالَ الجيوش: لم تَشُكَّكْ أن الفارس لايطيب قلبه، ولا تكفي مؤنته إذا جُعلت جائزتُه دون ثلاثةِ أضعافِ سهمِ الراجل، لايختلف فيه طوائف العرب والعجم، على اختلاف أحوالهم وعاداتهم.

ترجمہ: اور بڑے عطیے اور چھوٹے عطیے اسی لئے مشروع کئے گئے ہیں کہ انسان بارہا ہلاکت پر پیش قدمی نہیں کرتا مگر کسی ایسی چیز کی وجہ سے جس کا وہ امیدوار ہو۔ اور یہ لوگوں کی عادت اور اخلاق ہیں، جس کی رعایت ضروری ہے — اور سوار کے لئے تین حصے اور پیادہ کے لئے ایک حصہ اسی لئے مقرر کیا ہے کہ سوار کا نفع مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ ہے۔ اور اس کا خرچ (بھی) زیادہ ہے۔ اور اگر آپ لشکروں کا حال دیکھیں تو آپ شک نہیں کریں گے کہ گھوڑ سوار کا دل خوش نہیں ہوتا، اور اس کا خرچہ پورا نہیں ہوتا جبکہ اس کا انعام پیادے کے حصے کے تین گناہ سے کم قرار دیا جائے۔ نہیں اختلاف کرتے اس میں عرب وعجم کے گروہ، ان کے احوال وعادات کے اختلاف کے باوجود (الــرَّضْــخ: تھوڑا عطیہ، تھوڑی چیز...... الدَّیْدَن: عادت)

غیر مسلموں سے جزیرۃ العرب خالی کرنے کی وجہ

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے اپنی آخری حیات میں فرمایا: ''اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر کرونگا'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۵۳)



حدیث (۲) — حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین وصیتیں فرمائی ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے: ''مشرکین کو جزیرۃ العرب سے باہر کردو'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۵۲)

تشریح: غیر مسلموں سے جزیرۃ العرب کا تخلیہ تین وجوہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: آنحضرت ﷺ یہ بات جانتے تھے کہ زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا۔کبھی اسلام کمزور بھی پڑ سکتا ہے۔اور اس کی جمعیت پراگندہ بھی ہوسکتی ہے۔ایسے وقت میں اگر اسلام کے مرکز اور جڑ میں غیر مسلم ہوں گے تو حرماتِ دین کی پردہ دری ہوگی، اور اس کی سخت بے حرمتی ہوگی۔اس لئے آپؐ نے دارالعلم (مدینہ شریف) کے اردگرد سے اور بیت اللہ کے مقام (مکہ مکرمہ) سے غیر مسلموں کو نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔

دوسری وجہ: غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط لوگوں کے دین کے فساد کا سبب ہے۔اور وہ لوگوں کے مزاجوں میں تبدیلی کردیتا ہے۔پس اگر مسلمانوں کے لئے دیگر ممالک میں اختلاط ناگزیر ہے تو کم از کم حرمین شریفین کو ان سے پاک رکھنا ضروری ہے۔

تیسری وجہ: نبی ﷺ پر وہ بات منکشف ہوئی جو آخر زمانہ میں پیش آنے والی ہے۔چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک ایمان مدینہ کی طرف سُکڑ جائے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سکڑ جاتا ہے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۶۰ باب الاعتصام) یعنی خالص دین مدینہ منورہ ہی میں باقی رہے گا۔اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب وہاں دیگر مذاہب کا کوئی شخص موجود نہ ہو۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم: "لئن عشتُ: إن شاء اللہ لأخرجن الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب" وأوصی بإخراج المشرکین منہا.

أقول: عرف النبی صلی اللہ علیہ وسلم أن الزمانَ دِوَلٌ وَسِجَالٌ، فربما ضَعُفَ الإسلامُ، وانتشر شملُہ، فإن کان العدو فی مثل ہذا الوقت فی بیضۃ الإسلام ومَحْتِدِہ: أفضی ذلک إلی ہتک حرمات اللہ وقطعِہا، فأمر بإخراجہم من حوالی دارالعلم، ومحلِّ بیت اللہ.

وأیضًا: المخالطۃُ مع الکفار تُفسد علی الناس دینہم، وتُغیِّرُ نفوسَہم؛ ولما لم یکن بُدٌّ من المخالطۃ فی الأقطار: أمر بتنقیۃ الحرمین منہم.

وأیضًا: انکشف علیہ صلی اللہ علیہ وسلم مایکون فی آخر الزمان، فقال." إن الدین لیأرز إلی المدینۃ" الحدیث، ولایتم ذلک إلا بأن لایکون ہناک من أہل سائر الأدیان، واللہ أعلم.

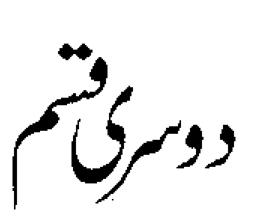
ترجمہ: نبی ﷺ نے جانا کہ زمانہ ادل بدل ہونے والی چیزیں اور کنویں کے ڈول ہیں، پس کبھی اسلام کمزور ہوجاتا ہے، اور اس کی اجتماعیت منتشر ہوجاتی ہے۔پس اگر اس جیسے وقت میں اسلام کے مرکز اور اس کی جڑ میں دشمن ہو تو یہ چیز

پہنچائے گی اللہ کی قابل احترام چیزوں کے پھاڑنے اوران کے کاٹنے تک۔ پس آپؐ نے حکم دیا غیر مسلموں کو نکالنے کا، دار العلوم کے اردگرد اور بیت اللہ کی جگہ سے — اور نیز: کفار کے ساتھ اختلاط لوگوں پر ان کے دین کو بگاڑ دیتا ہے۔ اوران کے نفوس کو بدل دیتا ہے۔ اور جب نہیں تھا کوئی چارہ اطراف میں اختلاط سے تو آپؐ نے حکم دیا: حرمین کو ان سے پاک صاف کرنے کا — اور نیز: کھلی نبی ﷺ پر وہ بات جو آخر زمانہ میں ہونی ہے۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''بیشک دین یقیناً سمٹے گا مدینہ کی طرف'' آخر حدیث تک (حدیث میں ایمان کا لفظ ہے۔ دین کا لفظ روایت بالمعنی ہے) اور نہیں تام ہوتی وہ بات یعنی دین کا سمٹنا مگر بایں طور کہ نہ ہو وہاں دیگر ادیان والوں میں سے کوئی۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

لغات: دِوَل اور دُوَل جمع ہیں الدَّولة اور الدُّولة کی: اَدلنے بدلنے والی چیز (لسان)...... سِجَال جمع ہے السَّجْل کی: بڑا ڈول جو کنویں پر رکھا رہتا ہے، جس سے لوگ باری باری پانی بھرتے ہیں...... البیضة: کسی بھی چیز کی اصل...... یہی معنی المَحْتِد کے ہیں۔ دیکھیں رحمۃ اللہ (۱:۴۷)...... أَرَزَ (ن،ض،ف) أَرْزًا: سمٹنا، سکڑنا۔

بفضلہ تعالیٰ آج بروز بدھ ۲۷؍رجب ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ''خلافت وامارت'' کی شرح مکمل ہوئی۔ فالحمد للہ!





تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حکم کا بیان

معیشت (زندگانی)

باب (۱) معیشت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

باب (۲) مطعومات ومشروبات

باب (۳) لباس، زینت، ظروف اوران کے مانند چیزں

باب (۴) آدابِ صحبت

باب (۵) أیمان ونذور کا بیان

باب ــــــ ۱

معیشت کے سلسلہ کی اصولی باتیں

آدابِ معیشت کی تنقیح ضروری ہے

ادب: کی تعریف رحمۃ اللہ (۱۶۹:۲) میں گذر چکی ہے۔ اور معیشت کے معنی ہیں: زیست، زندگانی۔ متمدن ممالک کے لوگ کھانے پینے، لباس پوشاک، نشست و برخاست اور دیگر احوال و کیفیات میں آدابِ زندگانی اور طریقۂ زیست کی ضرورت پر متفق ہیں۔ اگر انسان کا مزاج درست ہو، اور نوع کے تقاضوں کو نمود کا موقعہ ملے تو اجتماعات اور باہمی ملاقات میں آداب کی رعایت سب کو پسند ہے۔ اور گویا یہ ایک فطری بات ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں لوگوں کے طریقے مختلف ہیں۔ کوئی حفظانِ صحت کے اصول اور طب و تجربہ کی رو سے جو باتیں مفید ہوتی ہیں، اور ان میں کچھ ضرر نہیں ہوتا، ان کو اختیار کرتا ہے۔ اور کوئی اپنے مذہب کی رو سے آداب تجویز کرتا ہے۔ اور کوئی اپنے بادشاہوں، دانشمندوں اور بزرگوں کی پیروی کرتا ہے۔ اور کوئی ان کے علاوہ طریقے اختیار کرتا ہے۔

بہر حال لوگوں میں زیست کے جو طریقے رائج ہیں ان میں سے کچھ مفید اور کچھ غیر مفید ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ شریعتِ اسلامیہ ان سے بحث کرے۔ مفید باتوں سے لوگوں کو باخبر کرے، اور ان کا حکم دے۔ اور فاسد طریقوں سے آگاہ کرے۔ اور ان سے روک دے۔ اور جو طریقے نہ مفید ہیں نہ مضر ان کی اجازت دے۔ کیونکہ نبی ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد آدابِ زیست کی تنقیح و تفتیش بھی ہے۔

﴿ من أبواب المعيشة ﴾

اعلم: أن جميع سُكّانِ الأقاليم الصالحة اتفقوا على مراعاةِ آدابٍ في مطعَمِهم، ومشربهم، وملبسهم، وقيامهم، وقعودهم، وغير ذلك من الهيئات والأحوال؛ وكان ذلك كالأمر المفطور عليه الإنسانُ عند سلامة مزاجه، وظهورِ مقتضياتِ نوعِه، عند اجتماعِ أفرادٍ منه، وتَرائِيْ بعضِها لبعض؛ وكانت لهم مذاهبُ في ذلك، فكان منهم: من يُسَوِّيْها على قواعد الحكمة الطبيعية، فيختار في كل ذلك مايُرْجَى نفعُه، ولا يُخشَى ضررُه، بحكم الطب

والتجربة. ومنهم: من يسويها على قوانين الإحسان، حسبما تُعطيه ملتُه. ومنهم: من يريد محاكاةَ ملوكهم، وحكمائهم، ورهبانهم. ومنهم: من يسويها على غير ذلك.

وكان في بعض ذلك منافعُ يجب التنبيهُ عليها، والأمرُ به لأجلها؛ وفي البعض الآخر مفاسدُ يجب أن يُنهى عنه لأجلها، ويُنبه عليها؛ والبعضُ الآخَرُ غُفْلٌ من المعنيين، يجب أن يُبقَى على الإباحة، ويُرَخَّصَ فيه؛ فكان تنقيحُها والتفتيشُ عنها إحدى المصالح التي بُعث النبي صلى الله عليه وسلم لها.

ترجمہ: معیشت کے سلسلہ کی اصولی باتیں: جان لیں کہ قابلِ رہائش خطوں کے تمام باشندے اپنے کھانے، اپنے پینے، اپنے لباس، اپنے قیام، اپنے قعود، اوران کے علاوہ احوال وکیفیات میں آداب کی رعایت پر متفق ہیں۔ اور یہ بات اُس امر کی طرح ہے جس پر انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے مزاج کی درستگی کے وقت، اوراس کی نوع کے تقاضوں کے ظہور کے وقت: انسانوں میں سے چند افراد کے اکٹھا ہونے کے وقت یعنی اجتماعات میں، اوران کے بعض کے بعض کو دیکھنے کے وقت یعنی ملاقات کے وقت۔ اورلوگوں کے لئے اس سلسلہ میں طریقے تھے۔ بعضے ان طریقوں کو ٹھیک کرتے تھے حکمتِ طبیعیہ کے اصول پر، پس وہ ان سب میں یعنی کھانے پینے وغیرہ تمام حالات میں اختیار کرتا ہے اس چیز کو جس کے نفع کی امید کی جاتی ہے، اور جس کے نقصان کا اندیشہ نہیں، طب اور تجربہ کی رو سے۔ اور بعضے اپنے بادشاہوں اور اپنے دانشمندوں اور اپنے بزرگوں کی تقلید کا ارادہ کرتے تھے۔ اور بعضے اس کے علاوہ طریقوں سے ان آداب کو ٹھیک کرتے تھے — اوران میں سے بعض میں فوائد تھے، جن سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ اوراس بعض کا حکم دینا ضروری تھا اُن فوائد کی وجہ سے۔ اور دوسرے بعض میں مفاسد تھے۔ ضروری ہے کہ اُن بعض کی ممانعت کی جائے اُن مفاسد کی وجہ سے۔ اوراُن مفاسد سے آگاہ کیا جائے۔ اور دوسرے بعض دونوں باتوں سے خالی تھے۔ ضروری ہے کہ وہ باقی رکھے جائیں اباحت پر، اوران کی اجازت دی جائے۔ پس ان آداب کی تنقیح اوران کی تفتیش ان مصالح میں سے ایک تھی جس کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے ہیں۔

ملحوظہ: حکمتِ نظریہ کے اقسام میں علم طبیعی بھی ہے۔ اسی کو حکمتِ طبیعیہ کہتے ہیں (معین الفلسفہ ص ۳۴)

تصحیح: **يُنهى عنه**: مطبوعہ میں **يُنهى عنها**: ضمیر مؤنث کے ساتھ تھا۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔ اور ضمیر مذکر البعض الآخر کی طرف راجع ہے۔

☆ ☆ ☆

آدابِ معیشت کے اصول

آداب واحکامِ معیشت کے پانچ اصول ہیں:

اصلِ اول — اشغال کے ساتھ اذکار کی ملونی — دنیا کی مشغولیات اللہ کی یاد بھلا دیتی ہے۔ اور آئینۂ دل کو مکدر کردیتی ہیں۔ اس لئے کسی تریاق سے اس زہر کا علاج ضروری ہے۔ اور وہ تریاق یہ ہے کہ مشغولیات سے پہلے یا بعد میں یا ساتھ اذکار مسنون کئے جائیں۔ جو آدمی کو ان مشاغل پر مطمئن ہونے سے روکیں۔ اور وہ اذکار ایسے مضامین پر مشتمل ہوں جو منعم حقیقی کی یاد دلائیں۔ اور ذہن کو بارگاہِ بے چگوں کی طرف پھیریں۔ جیسے کھانے سے پہلے بسم اللہ، اور کھانے کے بعد دعا مشروع کی، تاکہ کھانا پینا غفلت کا باعث نہ بنے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ کرے۔

اصلِ دوم — شیطانی افعال وہیئات کی ممانعت اور ملکوتی افعال وہیئات کی ترغیب — بعض افعال شیاطین کے مزاجوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔ بایں اعتبار کہ شیاطین جب بھی خواب میں یا بیداری میں کسی کے سامنے متمثل ہوتے ہیں تو ضرور انہیں افعال وہیئات میں متمثل ہوتے ہیں۔ پس جو شخص ان افعال وہیئات کو اپنائے گا وہ شیاطین سے نزدیک ہوگا۔ اور ان کا بُرا رنگ اس پر چڑھے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان افعال وہیئات سے روکا جائے۔ خواہ کراہیت کے طور پر روکا جائے خواہ تحریم کے طور پر، جیسی مصلحت ہو ایسا کیا جائے۔ جیسے ایک چپل پہن کر چلنا، بائیں ہاتھ سے کھانا پینا، اور اوندھا سونا بری ہیئتیں ہیں، اس لئے ان سے روکا گیا — اس کے برخلاف بعض افعال وہیئات شیطان کو دھتکارتے ہیں، اور فرشتوں سے نزدیک کرتے ہیں۔ جیسے بسم اللہ پڑھ کر کھانا، اور گھر میں داخل ہوتے وقت اور نکلتے وقت اللہ کا ذکر کرنا۔ پس ضروری ہے کہ ایسے کاموں کا حکم دیا جائے۔ اور ان پر ابھارا جائے (یہ مضمون تفصیل سے رحمۃ اللہ ۲:۱۷۲ میں گذر چکا ہے)

اصلِ سوم — ضرر رساں ہیئتوں سے بچنے کی ہدایت — ایسی ہیئتوں سے بچنا ضروری ہے جن میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ جیسے بغیر منڈیر کی چھت پر سونا۔ مشکیزہ کے منہ سے پانی پینا، اور رات میں چراغ جلتا چھوڑ دینا۔ حدیث میں ہے: ''چھوٹا شرارتی (چوہا) کبھی بتّی کھینچتا ہے، اور گھر والوں کو جلا دیتا ہے'' لہٰذا چراغ گل کرکے سویا جائے (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۹۵)

اصلِ چہارم — عیش کوشی کے اسباب کی ممانعت، اور عجمیوں کی عادات سے بچنے کی ہدایت — ایران وروم کے لوگ عیش پرستی میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اور ٹھاٹھ سے زندگی گذارنے میں مبالغہ کی حد تک بڑھ گئے تھے۔ جبکہ عیش وعشرت کا سامان ڈھیروں مال خرچ کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور مال آسانی سے بدست نہیں آتا۔ اس کے لئے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اور شب وروز محنت درکار ہوتی ہے۔ اور ایسی صورت میں آخرت کی تیاری کرنے کے لئے وقت نہیں بچتا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اعاجم کی ان عادات واطوار کی مخالفت کی جائے۔ اور ان کی عیش کوشی کی بڑی چیزیں حرام ٹھہرائی جائیں۔ جیسے ریشمی، قَسّی اور اُرغوانی لباس اور تکیے، سونے چاندی کے برتن، سونے کا بڑا زیور، وہ کپڑے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں، اور عورتوں کی خوشبو خَلوق جس کا غالب حصہ زعفران ہوتا تھا۔ اور ایسی ہی اور چیزیں۔ اور جو چیزیں انتہائی مرفہ حالی کے قبیل کی نہیں ہیں، ان کے لئے عام ضابطہ بنادیا جائے کہ ان عادات کو اختیار کرنا مکروہ ہے۔ اور رفاہیت کی ان چیزوں کو چھوڑنا مستحب ہے (یہ مضمون تفصیل سے رحمۃ اللہ (۲۳۹:۲) میں گذر چکا ہے)

اصلِ پنجم ـــــ متانت ووقار کے منافی حالت کی ممانعت ـــــ شریعت کا جہاں یہ منشا ہے کہ ارتفاقات کو آسودگی میں مخمور لوگوں کی حالت تک نہ پہنچنے دیا جائے، وہاں یہ بھی ہے کہ ارتفاقات کو جنگلی اور پہاڑی لوگوں کی حالت تک گرنے بھی نہ دیا جائے۔ ورنہ انسانوں اور جانوروں کی معیشت میں کچھ فرق باقی نہیں رہے گا۔ شریعت کی نظر میں پسندیدہ میانہ روی ہے۔ ایک صاحب بوسیدہ کپڑوں میں آئے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سب کچھ دے رکھا تھا۔ آپؐ نے ان سے فرمایا: ''جب اللہ نے تجھ کو مال دیا ہے تو اللہ کی نعمت اور اعزاز کا اثر تجھ پر نظر آنا چاہئے'' یعنی اچھی حالت میں رہنا چاہئے (ابو داؤد حدیث ۴۰۶۳ یہ مضمون بھی تفصیل سے رحمۃ اللہ (۲۳۲:۲) میں گذر چکا ہے)

والعمدة في ذلك أمور:

فمنها: أن الاشتغال بهذه الأشغال يُنْسِي ذكرَ الله، ويُكَدِّرُ صفاءَ القلب، فيجب أن يُعالج هذا السمُّ بترياق: وهو أن يُسَنَّ قبلَها، وبعدَها، ومعها أذكارٌ، تَرْدَعُ النفسَ عن اطمئنانها بها، بأن يكون فيها ما يُذَكِّرُ المنعمَ الحقيقيَّ، ويُميل الفكر إلى جانب القدس.

ومنها: أن بعض الأفعال والهيئاتِ تُناسب أمزجةَ الشياطين، من حيث أنهم لو تمثَّلوا في منام أحدٍ، أو يقظته، لتَلَبَّسُوْا ببعضها لامحالة؛ فَتَلَبُّسُ الإنسان بها مُعِدٌّ للتقرب منهم، وانطباعِ ألوانها الخسيسة في نفوسهم، فيجب أن يُمْنَعَ عنها كراهةً أو تحريمًا، حسبما تحكم به المصلحةُ، كالمشي في نعل واحدة، والأكل باليد اليسرى؛ وبعضها مَطْرَدَةٌ للشياطين، مَقْرَبَةٌ من الملائكة، كالذكر عند ولوج البيت، والخروج منه؛ ويجب أن يُحَضَّ عليها.

ومنها: الاحتراز عن هيئاتٍ يتحقق فيها التأذى بحكم التجربة، كالنوم على سَطح غيرِ محجور، وتركِ المصابيح عند النوم، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "فإن الفُوَيْسِقَةَ تُضْرِمُ على أهلها"

ومنها: مخالفة الأعاجم فيما اعتادوه من الترفُّهِ البالغ، والتعمقِ في الاطمئنان بالحياة الدنيا، فأنساهم ذكرَ الله، وأوجب الإكثار من طلب الدنيا، وتَشَبُّحِ اللذاتِ في نفوسهم، فيجب:

[الف] أن يُخَصَّ رءوسُ تعمقاتهم بالتحريم، كالحرير، والقَسِّيِّ، والمياثر، والأُرْجُوَانِ، والثيابِ المصنوعة فيها الصورُ، وأواني الذهب، والفضة، والمعصفر، والخَلوق، ونحوِ ذلك.

[ب] وأن يُعَمَّ سائرُ عاداتهم بالكراهية، ويستحب تركُ كثيرٍ من الإرفاه.

ومنها : الاحتراز عن هيئات تنافي الوقار، وتُلحق الإنسانَ بأهل البادية، ممن لم يتفرغوا لأحكام النوع، ليحصل التوسط بين الإفراط والتفريط.

ترجمہ: اوراصلِ اصول اس معاملہ میں چندامور ہیں: — پس ازانجملہ: یہ ہے کہ ان مشاغل میں مشغولیت اللہ کی یاد بھلادیتی ہے۔ اوردل کی صفائی مکدر کردیتی ہے۔ پس ضروری ہے کہ اس زہر کا علاج کیا جائے کسی تریاق کے ذریعہ۔ اوروہ تریاق یہ ہے کہ ان اشغال سے پہلے، اوران کے بعد، اوران کے ساتھ، ایسے اذکار مسنون کئے جائیں جونفس کوان اشغال پر مطمئن ہونے سے روکیں، بایں طور کہ ان اذکار میں وہ بات ہو جومنعم حقیقی کو یاد لائے۔ اورسوچ وچار کواللہ تعالیٰ کی جانب مائل کرے — اورازانجملہ: یہ ہے کہ بعض افعال وہیئات شیاطین کے مزاجوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔ بایں طور کہ اگر شیاطین کسی کے خواب میں یا اس کی بیداری میں متمثل ہوں، تولامحالہ ان میں سے کسی نہ کسی ہیئت کے ساتھ ضرور متلبس ہوں گے۔ پس انسان کاان افعال وہیئات کے ساتھ متلبس ہونا تیار کرنے والا ہے ان سے قُرب کو، اوران کے نکمے رنگوں کے چھپنے کوان کے نفوس میں۔ پس ضروری ہے کہ ان افعال وہیئات سے روکا جائے کراہت یا تحریم کے طور پر، اس چیز کے موافق جس کا مصلحت فیصلہ کرے۔ جیسے ایک چپل میں چلنا، اور بائیں ہاتھ سے کھانا۔ اوربعض افعال وہیئات شیاطین کو دھتکارنے کا ذریعہ، اورفرشتوں سے نزدیکی کا ذریعہ ہیں۔ جیسے گھر میں داخل ہوتے وقت اورگھر سے نکلتے وقت ذکر کرنا۔ اور ضروری ہے کہ ان پر ابھارا جائے — اورازانجملہ: ایسی ہیئتوں سے احتراز کرنا ہے جن میں تجربہ کی روسے تکلیف سہنا پایا جاتا ہے۔ جیسے ایسی چھت پرسونا جوآڑ کی ہوئی نہیں ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۲۱) اور چراغ کوسوتے وقت جلتا چھوڑ دینا۔ اوروہ ضرر نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ”پس چھوٹا شریرگھر والوں پرآگ بھڑکا دیتا ہے“ — اورازانجملہ: عجمیوں کی مخالفت ہے، اس بات میں جس کی انھوں نے عادت بنالی ہے یعنی انتہائی درجہ کی فارغ بالی، اوردنیوی زندگی پر مطمئن ہونے میں گہرائی میں اترنا۔ پس بھلادی اس چیز نے ان کواللہ کی یاد۔ اورواجب کیا دنیا طلبی میں زیادتی کرنا یعنی رات دن دنیا کمانے کے لئے محنت کرنا۔ اوران کے نفوس میں لذات کا متمثل ہونا یعنی عیش کا دلدادہ ہونا۔ پس واجب ہے: (الف) کہ ان کے تعمقات کی بڑی چیزیں خاص کی جائیں حرام ٹھہرانے کے ساتھ، جیسے ریشم، اورقَسّی کپڑا (ریشم اورسوت سے بُنا ہوا کپڑا، جوقَس مقام میں تیار ہوتا تھا) اورریشمی تکیے گدّے (عرب میں تکیہ پر بیٹھنے کا بھی رواج تھا۔ اوراس مقصد کے لئے الگ تکیے ہوتے تھے) اوراُرغوانی رنگ کے کپڑے، اوروہ کپڑے جن میں تصویریں بُنی ہوئی ہوں، اورسونے چاندی کے برتن۔ اورکُسمی رنگ کے کپڑے، اورخَلوق اوراس کے مانند — (ب) اور یہ کہ عام کی جائیں ان کی دیگر عادتیں کراہیت کے ساتھ۔ اورمستحب ہے رفاہیت کی بہت سی باتوں کوچھوڑنا — اورازانجملہ: احتراز کرنا ہے ایسی ہیئات سے جووقار کے منافی ہیں۔ اورانسان کوبادیہ نشینوں کے ساتھ لاحق کرتی ہیں۔ ان لوگوں میں سے جونوع کے احکام کے لئے فارغ نہیں یعنی ان کوانسانیت کے تقاضے پورے کرنے کی فرصت نہیں۔ تاکہ افراط وتفریط کے درمیان میانہ روی حاصل ہو۔

باب ——— ۲

مطعومات ومشروبات

انسان کی خوش بختی اُن چار اخلاق میں ہے جن کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ اور اس کی بدبختی ان کی اضداد میں ہے[1] پس نفس کی صحت کی حفاظت کے لئے، اور اس کی بیماری کو دفع کرنے کے لئے اُن اسباب کی تفتیش ضروری ہے جو آدمی کے مزاج کو کسی ایک جانب پھیر دیتے ہیں۔

اور وہ اسباب عقائد واعمال بھی ہوتے ہیں جن کے ساتھ نفس متلبس ہوتا ہے، جو نفس کی جڑ میں داخل ہوتے ہیں، اور اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ جن کی کافی مقدار کا تذکرہ پہلے آچکا ہے[2]

اور وہ اسباب ایسی چیزیں بھی ہوتی ہیں جو نفس میں نکمّی کیفیات پیدا کرتی ہیں۔ جو انسان کو شیطان کے مشابہ بنادیتی ہیں۔ اور فرشتوں سے دور کردیتی ہیں۔ اور اچھے اخلاق کی جگہ بُرے اخلاق پیدا کرتی ہیں۔ اس طرح کہ انسان کو کبھی اس کا احساس ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔

پس حضرات انبیاء علیہم السلام نے ——— جو ملأ اعلیٰ کے ساتھ منسلک ہونے والے ہیں۔ اور جو ہر آلودگیوں سے کوسوں دور ہیں ——— ان چیزوں کی برائی بارگاہِ مقدس سے اس طرح حاصل کی، جس طرح طبیعت کڑوی اور بدمزہ چیز کی ناگواری محسوس کرتی ہے۔ یعنی انبیاء ذوق ووجدان سے ان چیزوں کی برائی جانتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی جو عنایت ومہربانی لوگوں کے حال پر ہے اس نے واجب کیا کہ اُن اہم اور بڑی حرام چیزوں سے جو منضبط ومتعین ہیں اور جن کا اثر واضح ہے، پوشیدہ نہیں، ان سے لوگوں کو واقف کردیا جائے۔

حرمتِ خنزیر کی وجہ

جب یہ امر مسلّم ہے کہ کھانے کی چیزیں ہی جسمانی اور اخلاقی بگاڑ کا قوی ترین سبب ہیں، تو ضروری ہے کہ بڑی حرام چیزیں غذا کے قبیل سے ہوں۔ چنانچہ انسان پر بہت زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز اس جانور (خنزیر) کا کھانا ہے جس کی صورت میں بعض اقوام کا مسخ واقع ہوا ہے۔ سورۃ المائدہ آیت ۶۰ میں ارشاد پاک ہے: ”جس پر اللہ نے لعنت کی، اور اس پر غضبناک ہوئے، اور ان میں سے بعض کو سؤر اور بندر بنادیا، اور اس نے شیطان کی پرستش کی، وہی لوگ مرتبہ کے اعتبار سے

[1] اخلاق اربعہ اور ان کی اضداد کے لئے دیکھیں: رحمۃ اللہ (۱:۵۳۹-۵۵۲ و۴:۲۷۵-۲۸۶ و۴:۳۱۷-۳۱۲)

[2] قسم اول، مبحث خامس میں عقائد حقہ وباطلہ اور اعمالِ برّ واثم پر سیر حاصل بحث ہے۔ دیکھیں رحمۃ اللہ (۱:۵۸۱-۸۱۸)

بہت بُرے، اور راہِ راست سے بہت دور ہیں" اور جس جانور کی صورت میں مسخ واقع ہوتا ہے، وہ خبیث ترین جانور ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان پر لعنت بھیجتے ہیں، اور اس پر غضبناک ہوتے ہیں، تو اللہ کی پھٹکار اور ناراضگی کی وجہ سے اس کا ایسا مزاج بن جاتا ہے، جو سلامتی سے برطرف اور نہایت دور ہوتا ہے۔ اور یہ تبدیلی اس حد تک ہوجاتی ہے کہ وہ انسان ہی باقی نہیں رہتا۔ اور یہ بھی جسمانی تعذیب کی ایک صورت ہے[1] اور جب ایسا موقع آتا ہے تو اس شخص کا مزاج ایسے خبیث جانور کے مزاج کی طرف منقلب ہوجاتا ہے جس سے سلیم طبیعتیں نفرت کرتی ہیں۔ اور اللہ کے علم ازلی میں اس خبیث جانور اور اس مبغوض اور رحمت سے دور کئے ہوئے انسان کے درمیان کوئی مخفی سبب ہوتا ہے۔ اور اس کے درمیان اور سلیم الفطرت لوگوں کے درمیان آسمان وزمین کا تفاوت ہوتا ہے۔ پس ایسے جانور کا کھانا، اور اس کو اپنے بدن کا جزء بنانا نجاستوں کے ساتھ اختلاط سے زیادہ سخت ہے یعنی گوکھانے سے زیادہ برا ہے۔ اور اللہ کے غضب کو بھڑکانے والے جو کام ہیں ان سے زیادہ برا کام ہے۔ چنانچہ اولین رسول حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر مابعد تک تمام انبیاء خنزیر کو برابر حرام ٹھہراتے رہے ہیں۔ اور اس سے کلی اجتناب کا حکم دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے: وہ بھی اس کو قتل کریں گے[2]۔

نظائر: اور اس کی دو نظیریں ہیں[3]:

پہلی نظیر: جہاں خسف یا عذاب واقع ہوا ہو وہاں ٹھہرنا مکروہ ہے۔ دیار ثمود سے گزرتے ہوئے نبی ﷺ نے سر پر کپڑا ڈال لیا تھا۔ اور سواری تیز کردی تھی، یہاں تک کہ آپؐ وہاں سے نکل گئے (بخاری حدیث ۴۴۱۹) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ارضِ بابل میں جہاں خسف واقع ہوا ہے نماز پڑھنا مکروہ ہے (بخاری کتاب الصلوٰۃ، باب ۵۳)

دوسری نظیر: مغضوب علیہم کی ہیئت اپنانا مکروہ ہے۔ ایک صحابی بایاں ہاتھ پیچھے کرکے ہتھیلی کی پچھلی پر ٹیک لگا کر بیٹھے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: "کیا تم مغضوب علیہم کی طرح بیٹھے ہو!" (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۳۰) اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پیٹ کے بل سو رہے تھے۔ آپؐ نے ان کو پیر سے اٹھایا۔ اور فرمایا: "جندب! یہ جہنمیوں کے لیٹنے کا انداز ہے!" (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۳۱)

پہلی بات اس طرح نظیر ہے کہ جس زمین میں خسف یا عذاب اترا ہے، وہاں ٹھہرنا گندگی میں ٹھہرنے سے کسی طرح

---

[1] قسم اول، مبحث دوم: مجازات کی بحث میں ہے کہ مجازات دنیا میں بھی ہوتی ہے، اور اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک انسان کے بدن میں مجازات ہے۔ صورت مسخ ہوجانا بدنی مجازات ہے۔ مجازات کی تفصیل کے لئے دیکھیں: رحمۃ اللہ (۱:۳۵۹)

[2] عیسیٰ علیہ السلام کی طرف قتل کی نسبت آمر ہونے کی وجہ سے ہے۔ آپ کے حکم سے نئے مسلمان جو پہلے خنزیر کھاتے تھے اس کو قتل کریں گے۔ تاکہ ان کے دل سے اس خبیث جانور کی محبت ورغبت نکل جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی مقصد سے کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا ۱۲

[3] نظیر مثل لہ کا فرد نہیں ہوتی۔ ایک لگتی چیز ہوتی ہے ۱۲

کم نہیں۔ گندگی میں دَم گھٹتا ہے، اور ویران جگہ میں دل گھبراتا ہے، اور دوسری بات نظیر اس طرح ہے کہ بری ہیئات کے ساتھ تلبس اُن ہیئات کے ساتھ تلبّس سے کم مؤثر نہیں جن کو شیاطین کا ذوق چاہتا ہے۔ شیاطین انسان کی تکلیف اور بے حیائی کے خوہاں ہیں، اور اوپر حدیثوں میں جن ہیئتوں کا ذکر ہے وہ بھی ایسی ہی ہیں۔

سوال — مسخ خنزیر کے علاوہ دیگر حیوانات کی صورتوں میں بھی ہوا ہے۔ آیتِ بالا میں بندر کا بھی ذکر ہے۔ پھر خنزیر ہی کے معاملہ میں ایسی سختی کیوں برتی گئی؟

جواب (۱) — ''اللہ نے اس کو سوّر اور بندر بنادیا'' ایک محاورہ ہے۔ مسخ خواہ کسی صورت میں ہوا ہو، یہ محاورہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے محاورہ میں کہتے ہیں کہ ''باڑ: بیل بکری سے حفاظت کے لئے ہے'' حالانکہ بیل بکری کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک خاندان زمین پر رینگنے والے جانوروں کی صورت میں مسخ کیا گیا تھا۔ گوہ کے بارے میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے: ''اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک خاندان پر لعنت کی — یا فرمایا: غضبناک ہوئے — پس ان کو زمین پر رینگنے والے جانوروں کی شکل میں مسخ کردیا۔ پس میں نہیں جانتا: شاید یہ (گوہ) ان میں سے ہو!'' (مسلم شریف ۱۳: ۱۰۳ کتاب الصید) ان لوگوں پر بھی مذکورہ ارشاد پاک صادق ہے کہ ''ان میں سے بعض کو بندر اور سوّر بنادیا'' خلاصۂ جواب یہ ہے کہ بندر کی صورت میں بھی مسخ واقع ہوا ہو، یہ بات ضروری نہیں۔

جواب (۲) — اور اگر بندر کی صورت میں بھی مسخ واقع ہوا ہے تو پھر خنزیر کے معاملہ میں سختی برتنے کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ خنزیر کو لوگ کھاتے تھے۔ اور بندر چوہے وغیرہ کو کوئی نہیں کھاتا۔ اس لئے خنزیر کی حرمت زیادہ سے زیادہ صراحت وتاکید کے ساتھ بیان کی، اور دوسرے جانوروں میں تاکید کی ضرورت نہیں سمجھی۔

فائدہ: پہلا جواب کمزور ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۶۵ میں ہے: ﴿كُونُوا قِرَدَةً خٰسِئِينَ﴾ تم ذلیل بندر بن جاؤ۔ اس کو محاورہ قرار دینا مشکل ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے دوسرا جواب دیا کہ خنزیر کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت لوگ اس کو کھاتے تھے۔ اس لئے ان کو بتایا کہ جن جانوروں کو تم کھاتے ہو، ان میں سے خنزیر سخت حرام ہے۔ وہ سراپا نجاست ہے۔ اس کی نجاست خوری بھی اس کی حرمت کی ایک وجہ ہے۔ کیونکہ نجاست مردار اور خون ہی کی طرح مضرت رساں ہے۔ واللہ اعلم

دیگر حیوانات کی حرمت کی وجہ

خنزیر کے بعد حرمت میں ان جانوروں کا نمبر آتا ہے جو بداخلاق ہیں۔ وہ ایسے اخلاق پر پیدا کئے گئے ہیں جو انسان سے مطلوب اخلاق کے برخلاف ہیں۔ اور وہ ان کی فطرت کا ایسا لازمہ بن گئے ہیں کہ وہ بداخلاقی کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ حیوانات اُن بُرے اخلاق میں ضرب المثل ہیں۔ اور سلیم الفطرت لوگ ان جانوروں کو برا سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے کھانے کے روادار نہیں۔ بجز چند لوگوں کے جو قابلِ اعتماد نہیں۔

اوروہ جانور جن میں یہ اخلاقی بگاڑ پوری طرح پایا جاتا ہے، اور خوب نمایاں ہے، اور عرب وعجم کے بھی لوگ اس کوتسلیم کرتے ہیں: وہ پانچ قسم کے جانور ہیں:

اول: درندے: جن کی فطرت میں پنجوں سے چھیلنا، زخمی کرنا اور حملہ کرنا ہے۔ اور جن میں سخت دلی پائی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے: ''ہر کچلی دار درندے کا کھانا حرام ہے (مشکوۃ حدیث ۴۱۰۴) اور رسول اللہ ﷺ سے بجّو کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو آپؐ نے فرمایا: ''کیا بجّو کو بھی کوئی کھاتا ہے!'' اور بھیڑیے کے بارے میں دریافت کیا گیا، تو فرمایا: ''کیا بھیڑیے کو بھی کوئی بھلا مانس کھاتا ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۲۷۰۵ کتاب المناسک، باب المحرم یجتنب الصید)

دوم: وہ حیوانات جن کی طبیعت میں لوگوں کو ستانا، تکلیف پہنچانا، ان سے جھپٹ کر کوئی چیز لے لینا، ان پر ٹوٹ پڑنے کے لئے موقعہ کا منتظر رہنا، اور اس معاملہ میں شیاطین کا الہام قبول کرنے کا مادّہ ہے۔ جیسے کوا، چیل، چھپکلی، مکھی، سانپ، بچھو وغیرہ۔

سوم: وہ حیوانات جن کی فطرت میں ذلت وحقارت اور گڑھوں میں چھپا رہنا ہے۔ جیسے چوہا، اور دیگر حشرات الارض (کیڑے مکوڑے)

چہارم: وہ حیوانات جو نجاستوں اور ناپاکیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ یا مردار کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔ اور وہی کھاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے جسم بدبو سے بھر گئے ہیں۔

پنجم: گدھا: یہ جانور حماقت وذلت میں ضرب المثل ہے۔ کوئی بے وقوفی کا کام کرتا ہے تو اس کو گدھے کا خطاب ملتا ہے۔ اور عرب کے سلیم الفطرت لوگ اسلام سے پہلے بھی اس کو حرام قرار دیتے تھے۔ اور گدھا شیطان کے مشابہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''جب تم گدھے کا رینکنا سنو، تو شیطان سے اللہ کی پناہ چاہو۔ کیونکہ اس نے یقیناً کسی شیطان کو دیکھا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۲۴۰۲)

اور سب حیوانات میں حرمت کی مشترک وجہ: وہ ہے جس پر اطباء کا اتفاق ہے کہ یہ سب حیوانات نوع انسانی کے مزاج کے برخلاف ہیں۔ اور ازروئے طب ان کا کھانا جائز نہیں۔

﴿ الأطعمة والأشرِبة ﴾

اعلم: أنه لما كانت سعادةُ الإنسان في الأخلاق الأربعة التي ذكرناها، وشقاوتُه في أضدادها: أوجب حفظُ الصحةِ النفسانيةِ، وطردُ المرضِ النفساني: أن يُفَحَصَ عن أسبابِ تغيُّرُ مزاجِه إلى إحدى الوجهتين:

فمنها: أفعالٌ تتلبس بها النفسُ، وتدخل في جذرِ جوهرِها؛ وقد بحثنا عن جملةٍ صالحةٍ من

هذا الباب.

ومنها: أمورٌ تُولِّدُ في النفس هيئاتٍ دَنِيَّةً توجب مشابهةَ الشياطين والتبعُّدَ من الملائكة، وتُحقِّقُ أضدادَ الأخلاقِ الصالحة، من حيث يشعرون ومن حيث لايشعرون.

فَتَلَقَّتِ النفوسُ اللاحقةُ بالملأ الأعلى، التاركةُ للألواثِ البهيمية: من حظيرة القدس بشاعةَ تلك الأمور، كما تَلَقَّى الطبيعةُ كراهيةَ المُرِّ والبَشِعِ؛ وأوجب لطفُ الله ورحمتُه بالناس: أن يكلِّفهم برء وس تلك الأمور، والذى هو منضبط منها، وأَثَرُها جليٌّ غير خافٍ فيهم.

ولما كان أقوى أسبابِ تغيُّرِ البدنِ والأخلاقِ المأكولُ: وجب أن يكون رء وسُها من هذا الباب: فمن أشد ذلك أثرًا: تناولُ الحيوانِ الذى مُسِخَ قومٌ بصورته:

وذلك: أن الله تعالى إذا لعن الإنسان، وغضب عليه: أورث غضبُه ولعنُه فيه وجودَ مزاجٍ هو من سلامة الإنسان على طرف شاسع وصَقْعٍ بعيد، حتى يخرج من الصورة النوعية بالكلية؛ فذلك أحدُ وجوه التعذيب في بدن الإنسان، ويكون خروج مزاجه عند ذلك إلى مشابهة حيوان خبيث، يتنفَّرُ منه الطبعُ السليم، فيقال في مثل ذلك:" مسخ الله قردةً وخنازير" فكان في حظيرة القدس علمٌ متمثِّلٌ: أن بين هذا النوع من الحيوان، وبين كون الإنسان مغضوبًا عليه، بعيدًا من الرحمة: مناسبةٌ خفيةٌ؛ وأن بينه وبين الطبع السليم، الباقى على فطرته: بونًا بائنًا؛ فلا جرم أن تناول هذا الحيوان، وجعلَه جزء بدنه: أشدُّ من مخامرة النجاسات، والأفعالِ المُهَيِّجة للغضب؛ ولذلك لم يزل تَرَاجِمَةُ حظيرة القدس: نوحٌ فمن بعده من الأنبياء عليهم الصلاة والسلام: يحرِّمون الخنزير، ويأمرون بالتبعُّد منه، إلى أن ينزل عيسى عليه السلام فيقتله.

ويُشْبِهُ أن الخنزير كان يأكلُه قومٌ، فنطقتِ الشرائع بالنهى عنه، وَهَجْرِ أمرِه أشدَّ مايكون؛ والقردةُ والفأرةُ لم تكن تؤكل قط، فكفى ذلك عن التأكيد الشديد؛ وهو قولُه صلى الله عليه وسلم في الضب:" إن الله غَضِبَ على سِبْطٍ من بنى إسرائيل، فمسخهم دوابَّ يدِبُّوْنَ في الأرض، فلا أدرى لعل هذا منها" وقال الله تعالى:﴿جعل مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ﴾

ونظيره: ماورد من كراهيةِ المكث بأرض وقع فيها الخسفُ أو العذابُ، وكراهيةُ هيئاتِ المغضوب عليهم: فإن مخامرة هذه الأشياء ليست أدنى من مخامرة النجاسات، والتلبسُ بها ليس أقل تأثيرًا من التلبس بالهيئات التى يقتضيها مزاج الشياطين.

ويتلوه: تناولُ حيوانٍ جُبل على الأخلاق المضادَّة للأخلاق المطلوبة من الإنسان، حتى

صار كالمندفع إليها بالضرورة، وصار يضرب به المثل، وصارت الطبائع السليمة تَستَخبِثُهُ، وتأبى تناوله، اللهم إلا قومًا لايُعْبَأ به.

والذى تكامل فيه هذا المعنى، وظهر ظهوراً بيناً، وانقاد له العربُ والعجم جميعًا: أشياء:

منها: السباع: المخلوقة على الخَدْش، والجَرْح، والصولة، وقسوةِ القلب، ولذلك قال عليه السلام فى الذئب:" أوَ يأكلُه أحد!"

ومنها: الحيوانات المجبولة على إيذاء الناس، والاختطافِ منهم، وانتهازِ الفُرَصِ للإغارة عليهم، وقبول إلهام الشياطين فى ذلك، كالغراب، والحُدَيَّاتِ، والوزغ، والذباب، والحية، والعقرب، ونحو ذلك.

ومنها: حيوانات جُبلت على الصَّغَارِ والهوان، والتسترِ فى الأُخدود، كالفأرة، وخَشَاشِ الأرض.

ومنها: حيوانات تتعيَّش بالنجاسات أو الجيفةِ، ومخامرتِها، وتناولِها، حتى امتلأت أبدانها بالنَّتْن.

ومنها: الحمار: فإنه يُضرب به المثلُ فى الحمق والهوان؛ وكان كثير من أهل الطبائع السليمة من العرب يحرمونه، ويُشْبِهُ الشياطنَ، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إذا سمعتم نهيقَ الحمار فَتَعَوَّذُوا بالله من الشيطان، فإنه رأى شيطانًا"

وأيضًا: قد اتفق الأطباء أن هذه الحيوانات كلُّها مخالفةٌ لمزاج نوع الإنسان، لايسوغ تناولها طِبًّا.

ترجمہ: اور جب ماکول (کھانے کی چیزیں) بدن اور اخلاق میں تبدیلی کا قوی ترین سبب تھا۔ تو ضروری ہوا کہ ان کے بڑے اسباب اس باب سے ہوں۔ یعنی زیادہ تر حرام چیزیں از قبیل ماکولات ہوں۔ پس تاثیر کے اعتبار سے شدید ترین: اس جانور کا کھانا ہے جس کی صورت میں کوئی قوم مسخ کی گئی ہے...... اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان پر لعنت بھیجتے ہیں، اور اس پر غضبناک ہوتے ہیں، تو اللہ کا غضب اور ان کی لعنت سبب بنتی ہے اس شخص میں ایسے مزاج کے پائے جانے کا جو انسان کی سلامتی سے دور کنارہ پر اور بعید جگہ میں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح صورتِ نوعیہ سے نکل جاتا ہے یعنی وہ انسان ہی باقی نہیں رہتا، جانور ہو جاتا ہے۔ پس یہ انسان کے بدن میں تعذیب کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے (یہ ایک ضمنی فائدہ ہے) اور اس وقت اس کے مزاج کا خروج ہوتا ہے ایسے خبیث حیوان کی مشابہت کی طرف جس سے سلیم طبیعت نفرت کرتی ہے۔ پس کہا جاتا ہے اس جیسی صورت میں: "اللہ نے مسخ کر کے بندر اور سور بنا دیا" (یہ سوال مقدر کا پہلا جواب ہے) پس حظیرۃ القدس میں ایک پایا جانے والا علم تھا کہ حیوان کی اس نوع کے

درمیان، اور انسان کے مغضوب علیہ اور رحمت سے دور ہونے کے درمیان کوئی پوشیدہ مناسبت ہے۔ اور یہ کہ اس انسان کے درمیان اور اس سلیم الفطرت کے درمیان جو اپنی حالت پر باقی ہے بونِ بعید ہے۔ پس لامحالہ یہ بات ہے کہ اس جانور کا کھانا، اور اس کو اپنے بدن کا جزء بنانا: نجاستوں کے اختلاط سے زیادہ سخت ہے۔ اور ان کاموں میں سے ہے جو غضب الٰہی کو بھڑکانے والے ہیں۔ اور اسی وجہ سے حظیرۃ القدس کے ترجمان: نوحؑ پس جوان کے بعد ہیں انبیاء علیہم السلام میں سے: برابر خنزیر کو حرام ٹھہراتے رہے ہیں، اور اس سے دور رہنے کا حکم دیتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے۔ پس اس کو قتل کریں گے۔

(دوسرا جواب) اور صحیح بات یہ ہے کہ خنزیر کو ایک قوم کھایا کرتی تھی۔ اس لئے شریعتوں نے اس کی ممانعت کی، اور اس کے معاملہ کو چھوڑنے کی صراحت کی، زیادہ سے زیادہ جو صراحت ہوسکتی تھی۔ اور بندر اور چوہا نہیں کھائے جاتے تھے کبھی بھی، پس کافی ہوگئی وہ بات تاکید شدید سے اور وہ نبی ﷺ کا گوہ کے بارے میں ارشاد ہے الی آخرہ (اس کا تعلق جواب اول سے ہے۔ اور آیتِ کریمہ سے نفس مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔ شرح میں یہ دونوں باتیں ان کی جگہ میں ذکر کی گئی ہیں)

اور اس کی یعنی رجس وخبث کی وجہ سے حرمتِ خنزیر کی نظیر: (۱) وہ ہے جو وارد ہوئی ہے ایسی سرزمین میں ٹھہرنے کی کراہیت سے جس میں خسف یا عذاب واقع ہوا ہے (۲) اور مغضوب علیہم کی ہیئتیں اختیار کرنے کی کراہیت ہے (پہلی نظیر کی وضاحت) پس بیشک ان چیزوں سے اختلاط یعنی ان مقامات میں ٹھہرنا کم نہیں نجاستوں کے ساتھ اختلاط سے (دوسری نظیر کی وضاحت) اور ان چیزوں کے ساتھ تلبس یعنی ان ہیئتوں کو اختیار کرنا، تاثیر کے اعتبار سے کم نہیں اُن ہیئتوں کے ساتھ تلبس سے جن کو شیاطین کے مزاج چاہتے ہیں۔

اور اس (خنزیر کی حرمت) کے پیچھے آتا ہے: اس جانور کا کھانا، جو ایسے اخلاق پر پیدا کیا گیا ہے: جو اُن اخلاق کے برخلاف ہیں جو انسان سے مطلوب ہیں۔ یہاں تک کہ وہ حیوان ہوگیا ہے مانند دھکا دیئے ہوئے کے ان اخلاق کی طرف ضرورت کی وجہ سے یعنی بداخلاقی سے پیش آنا اُن حیوانات کی حاجت بن گئی ہے۔ اور اس حیوان کے ذریعہ (بداخلاقی کی) مثال بیان کی جاتی ہے۔ یعنی وہ بداخلاقی میں ضرب المثل ہوگیا ہے۔ اور سلیم طبیعتیں اس کو برا سمجھتی ہیں۔ اور اس کے کھانے سے انکار کرتی ہیں۔ اے اللہ! مگر کچھ لوگ جو قابل لحاظ نہیں۔

اور وہ جانور جن میں یہ معنی (بداخلاقی) پوری طرح پائے جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہوئے ہیں واضح طور پر ظاہر ہونا۔ اور سبھی عرب وعجم اس معنی کی تابعداری کرتے ہیں۔ یعنی اس کی بداخلاقی کے قائل ہیں: وہ چند چیزیں ہیں (الی آخرہ)

لغات: البَشَاعة: بدمزگی بَشِعٌ: بدمزہ...... خَامَرَ الشیئَ: اختلاط رکھنا، ساتھ لگا رہنا...... تَرَاجِمَة: جمع تَرْجُمَان: تمام انبیاء علیہم السلام حظیرۃ القدس (بارگاہِ مقدس) کے ترجمان ہیں۔ وہاں کی باتیں لوگوں کو پہنچاتے ہیں...... أَشْبَهَ الشیئُ الشیئَ: مشابہ ہونا۔ یہاں صواب کے مشابہ ہونا مراد ہے۔ اور یہ اصول حدیث کی اصطلاح ہے هذا أَشْبَهُ

أي بالصواب یعنی دوسرے جواب میں صحت کا احتمال زیادہ ہے...... الأُخدود: لمبا گڑھا۔ جمع الأخادید، خَدُّ الأرض: زمین پھاڑنا، ہل جوتنا...... الخشاس (فاء کے فتحہ اور ضمہ کے ساتھ) کیڑے مکوڑے۔

ترکیب: کما تلقی میں ایک تاء محذوف ہے...... المأکول: کان کا اسم مؤخر ہے...... کراهیةً کا عطف ماورد پر ہے۔

☆ ☆ ☆

حیوانات کی حلّت وحرمت سے متعلق سات باتیں

حلال وحرام حیوانات کے سلسلہ میں تین باتوں کی تحدید وتعریف ضروری ہے۔ اور جن چیزوں سے وہ ملتی جلتی ہیں اُن سے تمیز ضروری ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں: ۱- بتوں کے لئے ذبح کیا ہوا جانور کونسا ہے؟ ۲- مردار کیا ہے؟ اور اس کے حکم میں کیا چیزیں شامل ہیں؟ ۳- ذبح کی تعریف اور اس کا محل —— پھر پہلی بات کی تمہید میں یہ بیان کیا ہے کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور کیوں حرام ہے؟ اور اس کے نتیجہ کے طور پر یہ بات بیان کی ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح کرنا کیوں ضروری ہے؟ اور دوسری بات کی تمہید میں یہ بات بیان کی ہے کہ مردار کیوں حرام ہے؟ اور تیسری بات کی تمہید میں یہ بات بیان کی ہے کہ ذبح کیوں ضروری ہے؟ پس کل سات باتیں ہوئیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلی بات —— غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور کیوں حرام ہے؟ —— غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور دو وجہ سے حرام ہے:

پہلی وجہ: شرک کی روک تھام مقصود ہے: مشرکین بتوں کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے۔ اور وہ اس کے ذریعہ بتوں کا تقرب حاصل کرتے تھے۔ جو شرک کی ایک نوع تھی۔ اس لئے حکمتِ الٰہی نے چاہا کہ لوگوں کو اس شرک سے روکا جائے۔ اور اس کی صورت یہی تھی کہ بتوں کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام قرار دیا جائے۔ تاکہ لوگ اس فعل سے باز آجائیں۔

دوسری وجہ: غیر اللہ کے لئے جانور ذبح کرنا شرک ہے۔ اور اُس شرک کی برائی ذبیحہ میں سرایت کرتی ہے۔ جیسے زکوٰۃ میں لوگوں کا میل اُتر آتا ہے (تفصیل کیلئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۴: ۷۷) پس یہ ذبیحہ بھی شرک کی حرمت کی وجہ سے حرام ہوتا ہے۔

دوسری بات —— بتوں کے لئے ذبح کیا ہوا جانور کونسا ہے؟ —— درحقیقت بتوں کے لئے ذبح کیا ہوا جانور وہ ہے جس کو ذبح کرتے وقت کسی دیوی دیوتا یا پیر بزرگ کا نام لیا گیا ہو۔ مگر شریعت نے تین اور جانوروں کو بھی بتوں کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کے حکم میں رکھا ہے:

اول: وہ جانور جو غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو۔ جیسے فلاں کا بکرا یا مرغا کر دیا گیا ہو۔ ایسا جانور اگر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے گا تو بھی حرام ہے۔ البتہ اگر نامزد کرنے والا اپنی منت سے سچی توبہ کرلے، پھر اللہ کے نام پر ذبح کرے، تو حلال ہے۔

دوم: وہ جانور جو مخصوص تھانوں یا آستانوں پر ذبح کیا جائے۔ وہ چاہے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے حرام ہے۔
سوم: مسلمان یا کتابی کے علاوہ کا ذبح کیا ہوا جانور، جیسے ہندو کا ذبح کیا ہوا۔ اگر وہ اللہ کا نام لیکر ذبح کرے تو بھی حرام ہے۔
کیونکہ وہ مذہب کی رُو سے یہ بات نہیں مانتا کہ اللہ کے نام پر ذبح کرنا ضروری ہے، اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا حرام ہے۔
تیسری بات — اللہ کے نام پر ذبح کرنا کیوں ضروری ہے؟ — حلّت حیوان کے لئے اللہ کے نام پر ذبح کرنا دو وجہ سے ضروری ہے:
پہلی وجہ: ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا اس لئے ضروری ہے کہ اول وہلہ ہی میں حلال وحرام کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ امتیاز کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔
دوسری وجہ: حیوانات بھی انسان کی طرح زندگی رکھتے ہیں۔ اور کسی کی زندگی میں دست درازی کا کسی کو حق نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے جانوروں کو انسان کی روزی بنایا ہے۔ سورۃ الحج آیت ۳۴ میں ارشاد پاک ہے: ''تاکہ وہ اللہ کا نام لیں ان پالتو چوپایوں پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو بطور روزی دیئے ہیں'' اسی لئے اللہ نے انسان کے لئے جانوروں کو مباح کیا ہے، اور ان پر مقدرت بخشی ہے۔ پس اللہ کی حکمت نے واجب کیا کہ جب بندے کھانے کے لئے جانور کی روح نکالیں تو اللہ کی اس نعمت سے غافل نہ رہیں۔ اور غافل نہ ہونے کی یہی صورت ہے کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔
چوتھی بات — مردار کیوں حرام ہے؟ — تمام مذاہب اور تمام دھرم مردار کی حرمت پر متفق ہیں۔ مذاہب تو اس لئے متفق ہیں کہ انبیائے کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی یہی بات بتلائی گئی ہے کہ مردار خبائث میں سے ہے۔ اور ہر خبیث چیز حرام ہے۔ اور دھرم والے اس لئے متفق ہیں کہ انھوں نے علم وتجربہ سے یہ بات جانی ہے کہ اکثر مردہ جانور زہریلے ہو جاتے ہیں۔ جب جانور اپنی موت مرتا ہے تو دم مسفوح — جس میں زہریلے جراثیم تحقیق سے ثابت ہو چکے ہیں — گوشت میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور وہ گوشت انسان کے مزاج کے موافق نہیں رہتا۔
پانچویں بات — مردار کیا ہے؟ اور کیا چیزیں اس کے حکم میں شامل ہیں؟ — مذبوحہ جانور: وہ ہے جس کی بالقصد شرعی طریقہ پر جان نکالی گئی ہو۔ پس مردار اس کی ضد ہے۔ اور گلا گھٹنے سے مرا ہوا، کسی ضرب سے مرا ہوا، اوپر سے گر کر مرا ہوا، کسی ٹکر سے مرا ہوا، اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے، اور وہ ذبح سے پہلے مر جائے: یہ سب جانور مردار کے حکم میں ہیں۔ کیونکہ یہ سب خبیث اور نقصان دہ ہیں۔
چھٹی بات — جانور کا ذبح کیوں ضروری ہے؟ — جانور کا ذبح چار وجہ سے ضروری ہے:
پہلی وجہ: عرب ویہود گائے بکری کو ذبح کرتے تھے، اور اونٹ کو نحر کرتے تھے۔ اور مجوس گلا گھونٹتے تھے، اور پیٹ پھاڑ کر آنتیں نکال دیتے تھے۔ اور ذبح ونحر انبیاء علیہم السلام کی سنت تھی، جو عرب ویہود میں متوارث چلی آرہی تھی۔ اور گلا دبانا اور پیٹ پھاڑنا لوگوں کا خود ساختہ طریقہ تھا۔ پس قابل تقلید پہلا طریقہ ہے۔

دوسری وجہ: ذبح کرنے سے جانور کو راحت پہنچتی ہے۔ کیونکہ ذبح روح نکالنے کا بہترین طریقہ ہے۔ حدیث میں ہے: ''جب تم ذبح کرو تو عمدہ طریقہ پر ذبح کرو: چھری تیز کرلو اور جانور کو آرام پہنچاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۳) جب چھری تیز ہوگی تو ہاتھ رکھتے ہی رگیں کٹ جائیں گی۔ اور جانور بے ہوش ہوجائے گا۔ اور اب جو تڑپے گا: اس کا اس کو احساس نہیں ہوگا — اور حدیث میں جو جانور کو نیم بسمل کرکے چھوڑ دینے کی ممانعت آئی ہے اس کی بھی یہی حکمت ہے (مشکوۃ حدیث ۴۰۹۰)

تیسری وجہ: خون نہایت گندی چیز ہے۔ لوگ اس سے بچتے ہیں۔ اور جسم یا کپڑوں پر لگ جائے تو دھوتے ہیں۔ اور ذبح ونحر سے پورا خون نکل جاتا ہے۔ اور گوشت پاک صاف ہوجاتا ہے۔ اور گلا گھونٹنے اور پیٹ چاک کرنے سے پورا خون نہیں نکلتا۔ وہ جذب ہوکر سارے گوشت کو ناپاک کردیتا ہے۔

چوتھی وجہ: ذبح کرنا ملتِ حنفی کا شعار ہے۔ اس کے ذریعہ حنفی اور غیر حنفی ملتوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ پس ذبح: ختنہ اور خصالِ فطرت کی طرح ہوگیا۔ پھر جب نبی ﷺ کی بعثت ملتِ حنفی کو رواج دینے کے لئے ہوئی تو ضروری ہوا کہ اس حنفی شعار کی حفاظت کی جائے۔

ساتویں بات — ذبح کی تعریف اور اس کا محل — ذبح کی دو قسمیں ہیں: ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری۔ جانور اگر قابو میں ہو تو ذبح اختیاری ضروری ہے۔ اور بے قابو ہو جیسے شکار تو ذبح اضطراری بھی کافی ہے۔ اور ذبح: کسی دھار دار آلہ سے گلا کاٹنے کا نام ہے۔ اور ذبح اختیاری کا محل: حلق اور لَبّہ ہے۔ ذبح گلے کے بالائی حصہ میں کیا جاتا ہے۔ اور نحر اس گھڑے میں کیا جاتا ہے جو سینہ سے متصل ہے۔ اور ذبح اضطراری کا محل: سارا جسم ہے۔ دھار دار آلہ سے کسی بھی جگہ جانور کو زخمی کرکے خون نکالا جائے تو ذبح ہوجائے گا۔

ملحوظہ: اب تک جن حرام چیزوں کا بیان ہوا ہے وہ روحانی تندرستی اور مصلحتِ ملّی کے پیشِ نظر ہے۔ رہی وہ چیزیں جو صحتِ جسمانی کے تعلق سے ممنوع ہیں۔ جیسے زہر اور چستی کے بعد سستی پیدا کرنے والی چیزیں (تمباکو وغیرہ) تو ان کا معاملہ واضح ہے۔ یعنی ضرر کی نوعیت اور مقدار کو پیشِ نظر رکھ کر حکم لگایا جائے گا۔

واعلم: أن ههنا أمورًا مبهمة تحتاج إلى ضبط الحدود، وتمييز المشكل:

منها: أن المشركين كانوا يذبحون لطواغيتهم، يتقربون به إليها، وهو نوع من الإشراك، فاقتضت الحكمة الإلٰهية: أن يُنهى عن هذا الإشراك، ثم يُؤكَّد التحريمُ بالنهي عن تناول ما ذُبح لها، ليكونَ كابِحًا عن ذلك الفعل.

وأيضًا: فإن قبح الذبح يَسْرِىْ في المذبوح، لما ذكرنا في الصدقة.

ثم المذبوح للطواغيت أمرٌ مبهم: ضُبِطَ: بما أهل لغير الله به وبما ذُبح على النصب وبما ذبحه غير المتديِّنِ بتحريمِ الذبحِ بغيرِ اسمِ الله، وهم المسلمون وأهل الكتاب.

وَجَرَّ ذلك: أن يُوجَبَ ذكرُ اسمِ الله عند الذبح: لأنه لايتحقق الفرقان بين الحلال والحرام بادى الرأى إلا عند ذلك.

وأيضًا :فإن الحكمة الإلْهية: لما أباحت لهم الحيواناتِ التى هى مثلُهم فى الحياة، وجعل لهم الطَّوْلَ عليها: أوجبت أن لايَغْفلُوْا عن هذه النعمة عند إزهاقِ أرواحها؛ وذلك: أن يذكروا اسمَ الله عليها، وهو قوله تعالى: ﴿لِيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَارَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْأَنْعَامِ﴾

ومنها :أن الميتة حرامٌ فى جميع المِلَل والنِّحَل: أما المللُ: فاتفقت عليها لما تُلُقِّى من حظيرة القدس أنها من الخبائث. وأما النِّحَل: فلِمَا أدركوا أن كثيرًا منها يكون بمنزلة السم، من أجل انتشارِ أخلاطٍ سِمِّيَّةٍ تُنافى المزاجَ الإنسانيَّ: عند النزع.

ثم لابد من تمييز الميتة من غيرها : فضبط بما قُصِدَ إزهاقُ روحِه للأكل، فَجَرَّ ذلك: إلى تحريم المتردِّيَةِ، والنطيحة، وما أكل السبع: فإنها كلها خبائثُ مؤذية.

ومنها : أن العرب واليهود كانوا يذبحون وينحرون، وكان المجوسُ يَخْنُقُوْنَ ويَبْعَجُوْنَ؛ والذبح والنحر سنةُ الأنبياء عليهم السلام، توارثوهما، وفيهما مصالح.

منها: إراحةُ الذبيحة، فإنه أقربُ طريقٍ لإزهاق الروح، وهوقولُه صلى الله عليه وسلم:"فَلْيُرِحْ ذبيحته" وهو سِرُّ النهى عن شَرِيْطَةِ الشيطان.

ومنها: أن الدم أحدُ النجاسات التى يغسلون الثياب إذا أصابها، ويتحفظون منها، والذبح تطهير للذبيحة منها، والخَنِقُ والبَعْجُ تنجيسٌ لها به.

ومنها: أنه صار ذلك أحد شعائر الملة الحنيفية، يُعرف به الحنيفى من غيره، فكان بمنزلة الختان، وخِصال الفطرة؛ فلما بُعث النبى صلى الله عليه وسلم مُقيمًا للملَّة الحنيفية: وجب الحفظ عليه.

ثم لابد من تمييز الخَنِقِ والبَعْجِ من غيرهما: ولايتحقق إلا بأن يُوْجَبَ المُحَدَّدُ، وأن يُوْجَبَ الحلقُ واللبةُ.

فهذا مانُهِى عنه لأجل حفظ الصحة النفسانية والمصلحة الملية؛ أما الذى يُنهى عنه لأجل الصحة البدنية، كالسموم والمفتِّرَاتِ فحالها ظاهر.

ترجمہ: اور جان لیں کہ (حیوانات کی حلت وحرمت کے باب میں) چند مبہم امور ہیں جو تعریفات کی تعیین اور مشتبہ کی تمیز کے محتاج ہیں (پہلی بات) ان میں سے: یہ ہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے لئے ذبح کیا کرتے تھے۔ اس ذبح کے

ذریعہ ان بتوں کی نزدیکی حاصل کرتے تھے۔ اور وہ ساجھی بنانے کی ایک صورت ہے۔ پس اللہ کی حکمت نے چاہا کہ اس شریک ٹھہرانے سے روک دیا جائے۔ پھر تحریم کو پختہ کیا جائے اس چیز کو کھانے کی ممانعت کرنے کے ذریعہ جو ان بتوں کے لئے ذبح کی گئی ہے۔ تاکہ وہ تحریم اس فعل سے روکنے والی ہو ــــ اور نیز: پس ذبح کی برائی مذبوح میں سرایت کرتی ہے، اس وجہ سے جو ہم نے زکوٰۃ میں ذکر کی ہے (دوسری بات) پھر "اصنام کے لئے ذبح کیا ہوا" ایک مبہم بات تھی: وہ منضبط کی گئی: (الف) اس جانور کے ساتھ جس کے ذریعہ غیر اللہ کا نام بلند کیا گیا ہو یعنی وہ جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو (ب) اور اس جانور کے ذریعہ جو تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو (ج) اور اس جانور کے ذریعہ جس کو ذبح کیا ہو دین نہ بنانے والے نے اللہ کے نام کے علاوہ کے ذریعہ ذبح کرنے کی تحریم کو۔ اور وہ (جو اس بات کو دین بنانے والے ہیں) مسلمان اور اہل کتاب ہیں۔

(تیسری بات) اور کھینچا اس نے اس بات کو کہ ضروری قرار دیا گیا ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا: اس لئے کہ اول وہلہ میں حلال وحرام کے درمیان جدائی متحقق نہیں ہوتی مگر اسی صورت میں ــــ اور نیز: پس بیشک حکمتِ الٰہیہ نے جب انسانوں کے لئے ان جانوروں کو مباح کیا جو زندگی میں ان کے مانند ہیں، اور ان پر انسانوں کو قدرت بخشی تو حکمت نے واجب کیا کہ وہ غافل نہ ہوں اس نعمت سے حیوانات کی روح نکالتے وقت۔ اور وہ (عدم غفلت) یہ ہے کہ جانوروں پر اللہ کا نام لیا جائے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ الی آخرہ۔

(چوتھی بات) اور ازانجملہ: یہ ہے کہ مردار تمام ملتوں اور دَھرموں میں حرام ہے۔ رہی ملتیں: تو وہ اس پر اس بات کی وجہ سے متفق ہیں جو حظیرۃ القدس سے حاصل کی گئی ہے کہ مردار خبائث میں سے ہے۔ اور رہے دَھرم: پس اس بات کی وجہ سے جس کا انھوں نے ادراک کیا ہے کہ بہت سے مردار بمنزلہ زہر کے ہوتے ہیں، ایسے زہریلے مواد کے پھیلنے کی وجہ سے جو مزاج انسانی کے منافی ہیں۔ روح نکلتے وقت (یہ انتشار کا ظرف ہے)

(پانچویں بات) پھر مردار کو اس کے علاوہ سے جدا کرنا ضروری ہوا۔ پس متعین کیا گیا (غیر میتہ) اس چیز کے ساتھ جس کو کھانے کے لئے اس کی روح نکالنے کا ارادہ کیا گیا ہو، پس کھینچا اس نے متردیہ اور نطیحہ اور ما اکل السبع کی حرمت کی طرف۔ پس بیشک وہ سب خبیث اور مضرت رساں ہیں۔

(چھٹی بات) اور ازانجملہ: (۱) یہ ہے کہ عرب ویہود ذبح کیا کرتے تھے، اور نحر کیا کرتے تھے۔ اور مجوس گلا گھونٹا کرتے تھے، اور پیٹ پھاڑ کر آنتیں نکال دیا کرتے تھے۔ اور ذبح اور نحر انبیاء علیہم السلام کی سنت ہیں۔ دونوں باتیں لوگوں میں بطور توارث چلی آرہی ہیں۔ اور ان دونوں میں مصالح ہیں ــــ (۲) ازانجملہ: ذبیحہ کو آرام پہنچانا ہے۔ پس بیشک ذبح روح نکالنے کا قریب ترین طریقہ ہے۔ اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: "پس چاہئے کہ وہ ذبیحہ کو آرام پہنچائے" اور وہ راز ہے شریطۃ الشیطان (جانور کو پورا ذبح نہ کرنا۔ ادھورا ذبح کر کے چھوڑ دینا) سے ممانعت کا ــــ (۳) اور ازانجملہ: یہ ہے کہ خون اُن ناپاکیوں میں سے ایک ہے کہ لوگ کپڑے دھوتے ہیں جب وہ نجاستیں لگ جاتی ہیں۔ اور وہ ان سے بچتے ہیں۔

اور ذبح: ذبیحہ کو اس نجاست سے پاک کرتا ہے۔ اور گلا گھونٹنا اور شکم چاک کرنا ذبیحہ کو خون سے ناپاک کرتا ہے —— (۴) اور ازانجملہ: یہ ہے کہ یہ چیز ملتِ حنفی کے شعاروں میں سے ایک شعار ہوگیا ہے۔ اس کے ذریعہ حنفی غیر حنفی سے پہچانا جاتا ہے۔ پس ذبح کرنا: ختنہ کرنے اور فطرت کی باتوں کی طرح ہوگیا (دیکھیں رحمۃ اللہ ۳: ۲۴۲) پس جب نبی ﷺ ملتِ حنفی کو برپا کرنے کے لئے مبعوث کئے گئے تو اس کی حفاظت ضروری ہوئی۔

(ساتویں بات) پھر ضروری ہے گلا گھونٹنے اور شکم چاک کرنے کو ان کے علاوہ سے جدا کرنا۔ اور نہیں متحقق ہوتی یہ بات مگر بایں طور کہ واجب کیا جائے دھاردار آلہ، اور یہ کہ واجب کیا جائے گلا اور سینہ کے بالائی حصہ کا گڑھا (ملحوظہ) پس یہ وہ باتیں ہیں جن سے روکا گیا ہے روحانی تندرستی اور ملی مصلحت کی حفاظت کے لئے۔ رہی وہ باتیں جن سے روکا گیا ہے جسمانی تندرستی کے لئے، جیسے زہر، اور بدن کو چست کرنے کے بعد سست کرنے والی چیزیں تو ان کا حال واضح ہے۔

☆ ☆ ☆

حیوانات کی حلت وحرمت کا تفصیلی بیان

جب حیوانات کی حلت وحرمت کے اصول ہموار ہوگئے تو اب تفصیل کا وقت آگیا۔ پس جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جن حیوانات کے کھانے کی ممانعت کی ہے: وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں جن میں کوئی خرابی (خبث، بدخلقی وغیرہ) پائی جاتی ہے۔ دوسرے: وہ ہیں جن میں ذبح کی کوئی شرط مفقود ہے۔ بالترتیب دونوں قسموں کو بیان کیا جاتا ہے:

پہلی قسم

وصف کی بنا پر حیوانات کی حلت وحرمت

حیوانات: چار قسم کے ہیں: اہلی، وحشی، طیور اور سمندری جانور۔ سب کے احکام درج ذیل ہیں:

① — اہلی: (گھریلو) — پالتو جانوروں میں سے اونٹ، گائے بھینس اور بھیڑ بکری حلال ہیں۔ سورۃ المائدہ کی پہلی آیت میں ارشاد پاک ہے: ''حلال کئے گئے تمہارے لئے پالتو چوپائے'' اور ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ یہ جانور ستھرے، معتدل مزاج کے اور انسانی مزاج کے موافق ہیں۔

اور جنگ خیبر کے موقع پر گھوڑوں کی اجازت دی گئی، اور گدھوں کی ممانعت کی گئی (مشکوۃ حدیث ۴۱۰۷) اور گھوڑوں کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ عرب وعجم اس کو ستھرا سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک بہترین جانور ہے۔ اور انسان کے مشابہ ہے۔

فائدہ: گھوڑے کے سلسلہ میں ممانعت کی بھی روایت ہے (مشکوۃ حدیث ۴۱۳۰) امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما

اللہ نے اس روایت کولیا ہے۔ اور گھوڑے کے گوشت کو مکروہ (تنزیہی) قرار دیا ہے (فائدہ تمام ہوا)

اور گدھا: حرام اس لئے ہے کہ وہ بے وقوف اور ذلیل جانور ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان باتوں میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔ اور اس کو شیطان سے مناسبت ہے۔ ابھی یہ حدیث گذری ہے کہ وہ شیطان کو دیکھتا ہے تو رینکتا ہے۔ اور سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اس کو نبی ﷺ نے حرام قرار دیا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۱۰۶) اور آپ عربوں میں سب سے ستھری فطرت اور لطیف مزاج کے مالک تھے۔

اور نبی ﷺ نے مرغی کا گوشت کھایا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۱۱۲) اور مرغی کے حکم میں مرغابی اور چھوٹی بڑی بطخیں ہیں۔ اور ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ یہ ستھرے جانور ہیں۔ اور مرغ کو فرشتوں سے مناسبت ہے۔ حدیث میں ہے کہ مرغ فرشتہ کو دیکھتا ہے تو بانگ دیتا ہے (بخاری شریف حدیث ۳۳۰۳)

اور کتا اور بلی حرام جانور ہیں۔ کیونکہ دونوں درندے ہیں۔ اور مردار کھاتے ہیں۔ اور کتے کو شیطان سے مناسبت ہے۔ حدیث میں ہے کہ کالا بھجنگا کتا شیطان ہے (مشکوۃ حدیث ۴۱۰۰)

(۲) — وحشی (جنگلی) جانور — خشکی کے نامانوس جانوروں میں سے جو پالتو چوپایوں کے ساتھ نام اور وصف (ستھرا ہونے) میں مشابہ ہیں وہ حلال ہیں۔ جیسے ہرن: بکری کی طرح ستھرا جانور ہے۔ اور نیل گائے: گائے، اور شتر مرغ: مرغ کے ہمنام ہیں، پس وہ حلال ہیں۔ اور نبی ﷺ کی خدمت میں گورخر کے گوشت کا ہدیہ پیش کیا گیا تو آپ نے اس کو نوش فرمایا (مشکوۃ حدیث ۴۱۰۸) اور خرگوش کا گوشت پیش کیا گیا تو قبول فرمایا (مشکوۃ حدیث ۴۱۰۹) اور آپ کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی (مشکوۃ حدیث ۴۱۱۱) کیونکہ عربوں کے نزدیک یہ سب جانور ستھرے سمجھے جاتے ہیں۔

سوال: گوہ کے بارے میں تین روایات ہیں۔ اور ان میں منافات ہے: ایک روایت: اس موقعہ کی ہے جب حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے آپ کے دسترخوان پر گوہ کھائی تھی۔ آپ کی ایک سالی نے جونجد کے علاقہ میں رہتی تھیں بھنی ہوئی گوہ بھیجی تھی۔ جب وہ آپ کے دسترخوان پر رکھی گئی اور آپ نے کھانے کا ارادہ کیا تو مستورات نے بتایا کہ گوہ ہے۔ آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ حضرت خالد نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا گوہ حرام ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، مگر چونکہ ہمارے علاقہ میں یہ نہیں ہوتی یعنی نہیں کھائی جاتی، اس لئے مجھے اس سے گھن آتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۱۱) دوسری حدیث وہ ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ ایک بدوی نے گوہ کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ایک خاندان پر لعنت فرمائی پس اُن کو زمین پر رینگنے والے جانوروں کی صورت میں مسخ کر دیا۔ پس میں نہیں جانتا: شاید یہ ان میں سے ہو، پس میں نہ تو اس کو کھاتا ہوں، نہ اس سے منع کرتا ہوں'' (مسلم شریف ۱۰۳:۱۳) اور تیسری حدیث وہ ہے جس کو امام ابو داؤد نے بہ سندِ حسن روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے گوہ کا گوشت کھانے سے منع فرمایا (مشکوۃ حدیث ۴۱۲۷) ان روایات میں دو طرح سے تعارض ہے: ایک: پہلی دو روایتوں میں وجہ معذرت مختلف ہے۔ دوم: پہلی دو روایتیں

اباحت پر اور تیسری ممانعت پر دلالت کرتی ہے۔

جواب: شاہ صاحب قدس سرہٗ کے نزدیک ان روایات میں کچھ منافات نہیں۔ کیونکہ گوہ میں دونوں ہی باتیں موجود ہیں۔ایک: گوہ سے آپؐ کا گھن کرنا دوسری: اس کی صورت میں مسخ کا احتمال ہونا۔اوران میں سے ہر بات آپؐ کے نہ کھانے کی وجہ بن سکتی ہے۔اور تیسری حدیث میں جو نہی ہے اس سے کراہتِ تنزیہی مراد ہے۔اور شاہ صاحب رحمہ اللہ کی رائے گوہ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ حرام تو نہیں، مگر پرہیزگاری کی بات یہ ہے کہ اس کو نہ کھایا جائے۔

فائدہ: گوہ میں اختلاف ہے۔ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بلا کراہیت جائز ہے۔اور احناف کے نزدیک حرام ہے۔کیونکہ روایات میں اختلاف ہے۔اور جب مُحرِم و مُبیح روایات میں تعارض ہو تو احناف محرم روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔کیونکہ اس میں احتیاط ہے۔شاہ صاحب رحمہ اللہ نے درمیانی راہ نکالی ہے (فائدہ تمام ہوا)

اور ہر کچلی دار درندے کو ممنوع قرار دیا: کیونکہ ان کی طبیعت میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کے اخلاق میں بدلحاظی ہوتی ہے، اوران کے دل سخت ہوتے ہیں۔پس ان کے کھانے سے ویسے ہی اخلاق پیدا ہوں گے، اس لئے ان کی ممانعت کی۔

(۳) —— پرندے —— پرندوں میں سے کبوتر اور تمام چھوٹے پرندے حلال ہیں۔کیونکہ وہ طیب (ستھرے) ہیں —— اور جو پرندے پنجوں سے شکار کرتے ہیں وہ ممنوع ہیں۔نبی ﷺ نے ان میں سے چیل کو فاسق جانوروں میں شمار کیا ہے (مشکوۃ حدیث ۲۶۹۹) پس ان کا کھانا جائز نہیں —— اسی طرح جو جانور مردار اور نجاست کھاتے ہیں وہ بھی ممنوع ہیں۔اسی طرح ہر وہ جانور ممنوع ہے جس کو عرب خبیث سمجھتے ہیں۔سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ میں نبی ﷺ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ آپؐ گندی چیزوں کو لوگوں پر حرام کرتے ہیں۔پس اس سلسلہ میں آپؐ کا اور آپؐ کی قوم کے مذاق کا اعتبار ہوگا —— اور نبی ﷺ کے زمانہ میں ٹڈی کھائی گئی (مشکوۃ حدیث ۴۱۱۳ و ۴۱۳۲) پس ٹڈی حلال ہے کیونکہ عرب اس کو طیب سمجھتے ہیں۔

(۴) —— سمندری جانور —— دریائی جانوروں میں سے عرب جن کو طیب سمجھتے ہیں وہ حلال ہیں۔جیسے مچھلی اور عنبر (یہ بھی ایک قسم کی مچھلی ہے۔متفق علیہ روایت میں ہے: فألقى البحر حوتا ميتا، لم نر مثلَه، يقال له: العنبر إلخ مشکوۃ حدیث ۴۱۱۳) اور وہ دریائی جانور جن کو عرب گندہ سمجھتے ہیں، اور اس کو خشکی کے حرام جانور کے نام سے موسوم کرتے ہیں، جیسے دریائی خنزیر، تو اس میں دلائل متعارض ہیں۔اور احتراز اولیٰ ہے۔

فائدہ: ''دلائل متعارض ہیں'' یہ دو حدیثوں کی طرف اشارہ ہے: ایک: وہ حدیث ہے جو آگے آرہی ہے کہ: ''ہمارے لئے دو مردار: مچھلی اور ٹڈی حلال کئے گئے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۳۲) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی حلال ہے۔اور یہی احناف کا مسلک ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ سے سمندر کے پانی سے وضو کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا: تو آپؐ نے فرمایا: هو الطَّهور ماؤُه الحِلُّ ميتتُه: سمندر کا پانی پاک کرنے والا ہے، اس کا مردار حلال ہے (مشکوۃ حدیث ۴۷۹ کتاب

الطهارة، باب المياه) اس حدیث کے دوسرے جزء سے معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کا ہر جانور حلال ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ چند چیزوں کا استثناء کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سمندر کا خنزیر، کتا اور انسان حرام ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ جملہ کہ ''خشکی کے حرام جانور کے نام سے موسوم کرتے ہیں'' شوافع کی ترجمانی ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ عربوں کے مذاق کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور وہ سمندری سانپ وغیرہ کا استثناء کرتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ کا یہ جملہ کہ ''جس دریائی جانور کو عرب گندہ سمجھتے ہیں'' حنابلہ کی ترجمانی ہے۔ اور شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اس سلسلہ میں سورۃ الاعراف کی آیت سے استدلال کیا ہے۔ مگر وہ استدلال تام نہیں ﴿يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ سے رسول اللہ ﷺ کے ذوق ووجدان کی اعتباریت تو مفہوم ہوتی ہے، مگر عربوں کی یا اہل حجاز کی اعتباریت مفہوم نہیں ہوتی، جیسا کہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

اور احناف کے نزدیک: اس حدیث میں بھی مردار سے مچھلی ہی مراد ہے۔ اور اس حدیث میں مسئلہ کا بیان نہیں، بلکہ ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سائل نے جو سمندر کے پانی کا حکم معلوم کیا ہے: تو درحقیقت اس کے ذہن میں خلجان یہ ہے کہ سمندر میں بے شمار جانور ہیں۔ جو سمندر ہی میں مرتے، گلتے اور سڑتے ہیں۔ پھر اس کا پانی پاک کیسے ہوسکتا ہے؟! رسول اللہ ﷺ نے اس کو یہ بات سمجھائی کہ سمندر کے جانوروں میں دم مسفوح نہیں ہوتا۔ پس سمندر کا مراہوا جانور مردار نہیں، جیسے کنویں اور تالاب میں پتے گرتے ہیں، اور گل سڑ جاتے ہیں، اس سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ پاک ہیں۔ اسی طرح سمندر کا مراہوا جانور پاک ہے۔ اس لئے سمندر میں اس کے گلنے سڑنے سے پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ اور اس بات کی دلیل کہ سمندر کے کسی جانور میں دم مسفوح نہیں ہوتا: یہ ہے کہ مردہ مچھلی حلال ہے۔ پس الحل ميتته میں بھی میتہ سے مچھلی ہی مراد ہے۔

اور اس مطلب کا قرینہ یہ ہے کہ دونوں جملوں کے درمیان واو عاطفہ نہیں لایا گیا۔ واو کے ذریعہ عطف کرنے ہی سے فی الجملہ مغائرت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اتحاد ہوتا ہے۔ اور عطفِ تفسیری قرار دیا جاتا ہے۔ پس الحل ميتته میں پہلے جملہ ہی سے متعلق بات بیان کی گئی ہے، کوئی نئی بات بیان نہیں کی۔ واللہ اعلم

وإذا تُمُهِّدَتْ هذه الأصول حَانَ أن نشتغل بالتفصيل، فنقول: ما نهى الله عنه من المأكول صنفان: صنفٌ نَهٰى عنه لمعنىً فى نوع الحيوان، وصنف نهى عنه لفقد شرط الذبح:

فالحيوان على أقسام:

[١] أهلي: يُباح منه الإبل والبقر والغنم، وهو قوله تعالى: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْأَنْعَامِ﴾ وذلك: لأنها طَيِّبَةٌ معتدلةُ المزاج، موافقةٌ لنوع الإنسان.

وأُذن يومَ خيبر فى الخيل، ونُهى عن الحمر: وذلك: لأن الخيل يستطيبه العربُ والعجم،

وهو أفضل الدواب عندهم، ويُشبهُ الإنسانَ.

والحمار: يُضرب به المثل في الحُمق والهوان، وهو يرى الشيطانَ فَيَنْهَقُ، وقد حرَّمه من العرب أذكاهم فطرةً، وأطيبهم نفسًا.

وأكل صلى الله عليه وسلم لحمَ الدجاج، وفي معناها الإوَزُّ والبطُّ، لأنها من الطيبات، والديك يرى الملَكَ فَيَصْقَعُ. ويُحَرَّمُ الكلبُ والسنور: لأنهما من السباع، ويأكلان الجيف، والكلب شيطان.

[۲] ووحشي: يَحِلُّ منه ما يُشبه بهيمةَ الأنعام في اسمها ووصفها، كالظباء، والبقر الوحشي، والنعامة؛ وأُهدى له صلى الله عليه وسلم لحمُ الحمار الوحشي فأكلَه، والأرنبِ فقبله؛ وأُكل الضبُّ على مائدته: لأن العرب يستطيبون هذه الأشياء.

واعتَذَرَ في الضب تارةً بأنه: "لم يكن بأرضِ قومي، فَأَجِدُني أَعَافُهُ" وتارةً باحتمال المسخ، ونهى عنه تارةً؛ وليس فيها عندي تناقض: لأنه كان فيه وجهان جميعًا، كلُّ واحد كافٍ في العذر؛ ولكن تركُ مافيه الاحتمالُ ورعٌ من غير تحريم. وأراد بالنهي: الكراهة التنزيهية.

ونَهى عن كل ذي ناب من السباع: لخروج طبيعتها من الاعتدال، ولِشَكاسَةِ أخلاقِها، وقسوةِ قلوبها.

[۳] وطير: يُباح منه الحَمام والعصفور: لأنهما من المستطاب؛ ونهى عن كل ذي مخلب، وسمى بعضَها فاسقًا، فلايجوز تناولُه؛ ويُكره ما يأكل الجيفَ والنجاسةَ، وكلُّ ما يستخبثه العرب، لقوله تعالى: ﴿يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ وأُكل الجرادُ في عهده صلى الله عليه وسلم: لأن العرب يستطيبونه.

[٤] وبحري: يُباح منه ما يستطيبه العرب، كالسمك والعنبر، وأما ما يستخبثه العرب، ويسميه باسم حيوان مُحَرَّمٍ، كالخنزير، ففيه تعارض الدلائل، والتعففُ أفضل.

ترجمہ: واضح ہے۔ چند وضاحتیں یہ ہیں۔ قوله: وقد حرَّمه من العرب أذكاهم إلخ *ترجمہ: اور گدھے کو حرام قرار دیا ہے عربوں میں سے سب سے زیادہ ستھری فطرت اور سب سے عمدہ نفس رکھنے والی ہستی نے یعنی نبی ﷺ نے* — قوله: واعتذر إلخ *ترجمہ: اور معذرت کی کبھی گوہ میں بایں طور کہ: ''میری قوم کی سرزمین میں یہ نہیں ہوتی، پس پاتا ہوں میں خود کو کہ گھن آتی ہے مجھے اس سے'' اور کبھی مسخ کے احتمال کے ذریعہ (معذرت کی) اور کبھی گوہ کھانے کی ممانعت کی۔ اور میرے نزدیک ان (تینوں روایتوں) میں کوئی منافات نہیں۔ اس لئے کہ گوہ میں دونوں ہی جہتیں ہیں۔ ہر ایک*

عذر کرنے کے لئے کافی ہے۔لیکن اس چیز کو چھوڑ دینا جس میں احتمال (شبہ) ہو پرہیزگاری ہے، حرام کئے بغیر۔اور آپؐ نے نہی سے کراہت تنزیہی مراد لی ہے — شَكِسَ (س) شَكَسًا وَشَكَاسَةً: بے مروت ہونا، سخت مزاج ہونا۔

مردار سے متاثر چیز کا حکم

حدیث — رسول اللہ ﷺ سے ایسے گھی کے بارے میں دریافت کیا گیا جس میں چوہا مر گیا ہو؟ آپؐ نے فرمایا: ''چوہے کو اور اس کے اردگرد کے گھی کو پھینک دو، اور (باقی) گھی کو کھاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۱۶) اور ایک روایت میں ہے: ''جب گھی میں چوہا گر جائے (اور مر جائے) تو اگر گھی جما ہوا ہو، تو چوہے کو اور اس کے اردگرد کے گھی کو پھینک دو۔ اور اگر گھی پگھلا ہوا ہو، تو اس کے نزدیک نہ جاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۲۳) یعنی اس کو مت کھاؤ۔

تشریح: مردار اور اس سے متاثر چیز تمام امتوں اور ملتوں میں خبیث ہے۔ پس اگر خبیث طیب سے جدا ہو تو خبیث کو پھینک دیا جائے۔اور طیب کو کھایا جائے۔اور اگر امتیاز نہ ہو تو سارا ہی حرام ہو جائے گا — اور حدیث سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ ہر (اصلی) ناپاک، اور (عارضی) ناپاک ہونے والی چیزیں حرام ہیں۔

فائدہ: نجس اور متنجس دونوں کا کھانا حرام ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ پھر متنجس (ناپاک ہونے والی چیز) کے سلسلہ میں تین باتیں مختلف فیہ ہیں: اول: اس کا خارجی استعمال مثلاً ناپاک گھی چراغ میں جلانا جائز ہے یا نہیں؟ احناف اور شوافع کے نزدیک جائز ہے۔ دوم: ناپاک گھی فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک جائز ہے۔اور دونوں مسئلوں کی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے إن كان السمن مائعا انتفعوا به، ولا تأكلوه: اگر گھی پگھلا ہوا ہو تو اس سے فائدہ اٹھاؤ، اور اس کو کھاؤ مت (فتح الباری ۹: ۶۷۰) سوم: ناپاک گھی پاک کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک جو چیز نچوڑی نہیں جا سکتی وہ پاک نہیں کی جا سکتی۔اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک پاک کی جا سکتی ہے۔ اور فتوی امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔اور پاک کرنے کا طریقہ کتب فقہ میں مذکور ہے۔

نجاست سے متاثر چیز کا حکم

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے نجاست خور جانور کے کھانے سے، اور اس کے دودھ سے منع کیا (مشکوۃ حدیث ۴۱۲۶)

تشریح: جو چوپایہ لید اور مینگنیاں کھاتا ہے۔اس کا گوشت اور دودھ اس وجہ سے ممنوع ہے کہ جب جانور کے اعضاء نے نجاست پی لی، اور نجاست اس کے اجزاء میں پھیل گئی تو اس جانور کا حکم نجاستوں کے حکم جیسا ہو گیا، یا اس جانور جیسا ہو گیا جو نجاست میں زندگی بسر کرتا ہے۔

فائدہ: جو جانور کبھی کبھی ناپاکی کھاتا ہے وہ نجاست خور نہیں۔ جیسے کھلی پھرنے والی مرغی۔اور اگر زیادہ تر ناپاکی کھاتا

ہے، اور گوشت، دودھ اور پسینہ بدبودار ہوگیا ہے تو وہ ناپاک ہے۔ مگر نجس العین نہیں۔ پس اس کو کم از کم دس دن باندھ دیا جائے، اور دوسرا چارہ دیا جائے۔ جب اس کے پسینہ میں سے بدبو ختم ہوجائے تو اب اس کا گوشت اور دودھ حلال ہے۔

لغات: الجِلَّة: مینگنیاں، لید الجَلّالة: وہ چوپایہ جو لید اور مینگنیاں کھاتا ہے۔

دو مردار اور دو خون حلال ہیں

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے لئے دو مردار اور دو خون حلال کئے گئے ہیں۔ دو مردار: مچھلی اور ٹڈی ہیں۔ اور دو خون: جگر اور تلی ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۳۲)

تشریح: یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ جب مردار اور خون حرام ہیں تو مری ہوئی مچھلی اور ٹڈی، اور جگر اور تلی جو درحقیقت خون ہیں، کیوں حلال ہیں؟ نبی ﷺ نے اس شبہ کا ازالہ کیا ہے کہ جگر اور تلی چوپایے کے بدن کے دو عضو ہیں، جو خون کے مشابہ ہیں، مگر خون نہیں ہیں، اس لئے حلال ہیں۔ اسی طرح مری ہوئی مچھلی اور ٹڈی بھی اگرچہ بظاہر مردار ہیں، مگر حقیقت میں مردار نہیں۔ کیونکہ ان میں دم مسفوح نہیں۔ اسی لئے ان کا ذبح مشروع نہیں۔

[۱] وسُئل صلى الله عليه وسلم عن السَّمْنِ ماتت فيه الفارة؟ فقال: " أَلْقُوْها وماحولها، وكلوه" وفي رواية: " إذا وقعت الفأرة في السمن: فإن كان جامدًا فألقوها وما حولها، وإن كان مائعا فلا تقربوه"

أقول: الجيفة وما تأثَّر منها خبيث في جميع الأمم والملل، فإذا تميز الخبيث من غيره أُلقي الخبيثُ، وأُكل الطيب؛ وإن لم يمكن التمييز حَرُمَ كلُّه؛ ودلَّ الحديثُ على حرمة كل نجس ومُتَنَجِّسٍ.

[۲] ونَهٰى عليه السلام عن أكل الجلَّالة، وألبانها:

أقول: ذلك: لأنها لما شَرِبَتْ أعضاؤُها النجاسةَ، وانتشرت في أجزائها: كان حكمُها حكمَ النجاسات أو حكمَ من يتعيَّش بالنجاسة.

[۳] قال صلى الله عليه وسلم: " أُحِلَّتْ لنا ميتتان ودمان: أما الميتتان: الحوت والجراد؛ والدمان: الكَبِدُ والطحال"

أقول: الكبد والطحال عضوان من بدن البهيمة، لكنهما يُشبهان الدمَ، فأزَاحَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم الشبهة فيهما؛ وليس في الحوت والجراد دمٌ مسفوحٌ، فلذلك لم يُشرع فيهما الذبحُ.

چھپکلی مارنے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے چھپکلی کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ اور اس کا فاسق (شرارتی) نام رکھا، اور فرمایا: ''وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ میں پھونک مارتی تھی!'' اور فرمایا: ''جس نے پہلے وار میں چھپکلی کو مار ڈالا اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی۔ اور دوسرے وار میں اس سے کم، اور تیسرے وار میں اس سے بھی کم'' (مشکوۃ احادیث ۴۱۱۹-۴۱۲۱)

تشریح: اس حدیث کے ذیل میں شاہ صاحب قدس سرہٗ نے تین باتیں بیان کی ہیں: پہلے ایک شبہ کا جواب دیا ہے کہ جس چھپکلی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ میں پھونک ماری تھی، اس کا چاہے کچومر نکال دیا جائے مگر پوری نوع کو اس کی سزا دینا خلاف اصول ہے۔ جواب یہ دیا ہے کہ چھپکلی کو مارنے کا حکم اس جرم کی سزا میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکم اس جانور کی ایذارسانی کی بنیاد پر ہے۔ اور پھونک مارنے کو ایذارسانی کی علامت کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی جہاں اس کا کچھ نہیں اٹھتا، وہاں بھی وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آتی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب نمرود نے بیت المقدس میں آگ لگائی تو وہاں بھی یہ جانور پھونک مار رہا تھا (لغات الحدیث لفظ وَزَغ) پھر چھپکلی کو مار ڈالنے کی وجہ بیان کی ہے۔ اور آخر میں پہلے وار میں مار ڈالنے کی ترغیب کی وجہ بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

بعض حیوان فطری طور پر ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے شیطانی حرکتیں اور بُری ہیئتیں صادر ہوتی ہیں۔ اور وہ حیوان شیطان سے قریب ترین مشابہت رکھتے ہیں۔ اور شیطانی خیالات کی بہت زیادہ پیروی کرتے ہیں۔ چھپکلی بھی ایسا ہی ایک جانور ہے۔ اور اس کی خباثت کی علامت یہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آگ میں پھونک مارتی تھی۔ یہ فطری طور پر شیطان کے وسوسہ کی تابعداری تھی۔ حالانکہ اس کی پھونک سے کچھ فائدہ نہیں تھا۔ اور اس کو مار ڈالنے کا حکم دو وجہ سے دیا ہے:

پہلی وجہ: چھپکلی انسان کو ہر ممکن ضرر پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ برتن میں تھوکتی ہے، نمک میں رال ٹپکاتی ہے، جس کے نتیجہ میں برص کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ اور کچھ بس نہیں چلتا تو چھت میں چڑھ کر کھانے وغیرہ پر بیٹ کرتی ہے (حاشیہ الکوکب الدری ۲: ۳۹۱ مصری) پس جس طرح سانپ بچھو کو مار ڈالنے کا حکم ہے، اور جیسے آبادیوں سے جھاڑ جھنکاڑ اکھاڑ دیئے جاتے ہیں، تاکہ لوگ ایذاء سے محفوظ رہیں، اسی طرح چھپکلی کو مار ڈالنے کا حکم ہے، تاکہ لوگ اس کے ضرر سے محفوظ رہیں۔

دوسری وجہ: چھپکلی کو مار ڈالنا شیطان کے لشکر کی شکست، اور اس کے وسوسوں کے گھونسلہ کو اکھاڑ پھینکنا ہے۔ اور یہ کام اللہ تعالیٰ کو، اور ان کے مقرب فرشتوں کو پسند ہے۔

اور پہلے وار میں مار ڈالنے کی ترغیب دو وجہ سے دی ہے:

پہلی وجہ: یہ چاند ماری میں مہارت کی علامت ہے۔ اور نشانہ بازی ایک جہادی عمل ہے، جو مرغوب فیہ ہے۔
دوسری وجہ: یہ خیر کے کام کی طرف سبقت ہے۔ اور نیکی کے کاموں میں سبقت مامور بہ ہے۔
فائدہ: چھپکلی نہایت بھولی اور بڑی چالاک ہوتی ہے۔ اگر پہلا وار چل گیا تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر ہاتھ آنا مشکل ہے۔ اس لئے پہلے ہی وار میں اس کا کام تمام کردینا چاہئے۔

[٤] وأمر صلى الله عليه وسلم بقتل الوَزَغ، وسماه فاسقًا، وقال: "كان يَنْفُخُ على إبراهيم!" وقال: "من قتل وزغا في أول ضربةٍ كُتب له كذا وكذا، وفي الثانية دون ذلك، وفي الثالثة دون ذلك"

أقول: بعضُ الحيوان جُبل بحيث يصدر منه أفعال وهيئاتٌ شيطانيةٌ، وهو أقربُ الحيوان شِبْهًا بالشيطان، وأطوعُه لوسوسته، وقد عَلِمَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن منه الوزغ، ونبه على ذلك بأنه كان ينفخ على إبراهيم، لانقياده بحسب الطبيعة لوسوسة الشيطان، وإن لم يَنْفَعْ نفخُه في النار شيئًا.

وإنما رَغَّبَ في قتله لمعنيين:

أحدهما: أن فيه دفعَ ما يؤذى نوعَ الإنسان، فمثله كمثل قطع أشجار السموم من البلدان، ونحو ذلك مما فيه جمعُ شَمْلِهم.

والثاني: أن فيه كَسْرَ جندِ الشيطان، ونَقْضَ وَكْرِ وسوستِه، وذلك محبوبٌ عند الله وملائكته المقرَّبين.

وإنما كان القتلُ في أول ضربة أفضلَ من قتله في الثانية: لما فيه من الحَذاقةِ والسُّرْعَةِ إلى الخير، والله أعلم.

ترجمہ: واضح ہے۔ چند وضاحتیں یہ ہیں: الوزغ اور الوزغة کا ترجمہ تمام لغات میں چھپکلی کیا گیا ہے۔ اردو کتابوں میں گرگٹ کا ترجمہ معلوم نہیں کہاں سے چل پڑا ہے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک نیزہ رکھا ہوا تھا۔ ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی (کیونکہ نیزہ فوجی رکھتا ہے) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ ہم اس سے چھپکلی کو مارتے ہیں (الکوکب ۲: ۳۹۰ حاشیہ) اور ظاہر ہے کہ گھر میں چھپکلیاں ہوتی ہیں، گرگٹ نہیں ہوتا —— اور عبارت کے آخر میں والله أعلم اس لئے لکھا ہے کہ یہاں قسم اول کا بیان پورا ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

قسم دوم

وہ حیوانات جو ذبح کی شرط فوت ہونے کی وجہ سے حرام ہیں

سورۃ المائدۃ آیت تین میں ارشاد پاک ہے: ''تم پر حرام کیا گیا مردار، اور خون، اور خنزیر کا گوشت، اور وہ جانور جو غیر اللہ کے نام زد کردیا گیا ہو، اور گلا گھٹنے سے مرا ہوا، اور مار سے مرا ہوا، اور اوپر سے گر کر مرا ہوا، اور ٹکّر سے مرا ہوا، اور جس کو کسی درندہ نے کھایا، مگر جس کو تم ذبح کرلو، اور جو پرستش گاہوں (بتوں) پر ذبح کیا گیا ہو، اور یہ بات کہ تم حصہ طلب کرو قرعہ کے تیروں کے ذریعہ: یہ سب کام گناہ ہیں''

تفسیر: اس آیت کے ذیل میں شاہ صاحب قدس سرہ نے چھ باتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی بات: مردار اور خون اس لئے حرام ہیں کہ دونوں ناپاک ہیں۔ تفصیل گذر چکی۔

دوسری بات: خنزیر اور اس کے تمام اجزاء اس لئے حرام ہیں کہ اس کی صورت میں ایک قوم مسخ کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل بھی گذر چکی۔

تیسری بات: وہ جانور جو غیر اللہ کے نام زد کردیا گیا ہو، اور جو پرستش گاہوں یعنی مورتیوں پر ذبح کیا گیا ہو: دو وجہ سے حرام ہے: ایک: اس سے شرک کی جڑ کاٹنا مقصود ہے۔ دوم: فعل یعنی شرک کی برائی مفعول بہ یعنی ذبیحہ میں سرایت کرتی ہے۔ اس لئے جس طرح شرک حرام ہے یہ ذبیحہ بھی حرام ہے۔ اس کی تفصیل بھی گذر چکی۔

چوتھی بات: پانچ جانور: (۱) جو گلا گھونٹنے سے مرگیا ہو (۲) جو لاٹھی سے ماردیا گیا ہو (۳) جو اوپر سے گر کر مرگیا ہو (۴) جو دوسرے جانور کے سینگ کی ٹکر سے مرگیا ہو (۵) وہ جانور جس کو درندہ نے کھایا ہو، اور اس میں سے کچھ بچ گیا ہو: یہ پانچوں جانور دو وجہ سے حرام ہیں:

پہلی وجہ: شریعت میں حلال ذبیحہ وہ ہے جس کے گلے کو دھاردار آلہ کے ذریعہ کاٹ کر جان نکالنے کا ارادہ کیا گیا ہو۔ یہ تعریف ان پانچوں جانوروں میں نہیں پائی جاتی، اس لئے وہ حرام ہیں۔

دوسری وجہ: ان جانوروں کے جسم سے دم مسفوح خارج نہیں ہوتا۔ بلکہ گوشت میں جذب ہوکر سارے بدن کو ناپاک کردیتا ہے، اس لئے یہ حرام ہیں۔

پانچویں بات: ﴿إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ﴾ کا تعلق مخنقہ سے آخر تک سب جانوروں کے ساتھ ہے۔ پس جس جانور کو ان میں سے جو بھی آفت پہنچے، اور اس کو ذبح کرلیا جائے، درانحالیکہ اس میں حیاتِ مستقرہ ہو تو وہ حلال ہے۔ کیونکہ اس پر شرعی ذبح کی تعریف صادق آتی ہے۔

فائدہ: حیاتِ مستقرہ یہ ہے کہ وہ جانور زندہ رہ سکتا ہو۔ ظاہر روایت میں یہی بات امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے: وذکر (یعنی صاحب البدائع) أن ظاهر الرواية عن أبي يوسف: أنه يُعتبر من الحياة ما يُعلم أنها تعيش به، فإن عُلم أنها لاتعيش فذبحها لاتؤكل (شامی ۵: ۳۳۴ کتاب الصید) لیکن مفتی بہ قول مطلق حیات کا ہے: والمعتبر في المتردية وأخواتها مطلق الحياة، وإن قلّت، وعليه الفتوى (درمختار ۵: ۳۳۴)

چھٹی بات: ازلام: زَلَم کی جمع ہے۔ زَلم: فال کے تیر کو کہتے ہیں۔ یہ تین تیر تھے جو کعبہ کے مجاور کے پاس رہتے تھے۔ ان میں سے ایک پر: ''کر'' اور دوسرے پر: ''مت کر'' لکھا ہوا تھا۔ اور تیسرے پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ جب کوئی شخص کسی کام کا مفید یا مضر ہونا معلوم کرنا چاہتا تو مجاور ان تیروں کو گھما کر ان میں سے ایک تیر نکالتا۔ اگر ''کر'' والا تیر نکلتا تو اس کو خدا کا حکم سمجھ کر کرتا۔ اور ''مت کر'' والا تیر نکلتا تو اسے بھی خدا کی طرف سے ممانعت تصور کرتا۔ اور خالی تیر نکلتا تو فال دوبارہ نکالتا۔ تیروں سے اس طرح فال نکالنا دو وجہ سے حرام ہے:

پہلی وجہ: یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے۔ افعل یا لاتفعل والا تیر نکلنا محض اتفاق ہے۔ پس اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا غلط انتساب ہے۔

دوسری وجہ: اس طرح فال نکال کر کام کرنا یا نہ کرنا نادانی اور جہالت پر تکیہ ہے۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی تیر تو بہر حال نکلے گا (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۳: ۵۱۴)

قال الله تعالى: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ، وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ، وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ، وَالْمُنْخَنِقَةُ، وَالْمَوْقُوْذَةُ، وَالْمُتَرَدِّيَةُ، وَالنَّطِيْحَةُ، وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ، إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ، وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْأَزْلَامِ: ذٰلِكُمْ فِسْقٌ﴾

أقول:

[الف] فالميتة والدم: لأنهما نجسان.

[ب] والخنزير: لأنه حيوان مُسِخَ بصورته قوم.

[ج] وما أهل لغير الله به، وما ذبح على النصب: يعني الأصنامَ: قطعًا لدابر الشرك؛ ولأن قبح الفعل يسري في المفعول به.

[د] والمنخنقة: وهي التي تخنق فتموت [والموقوذة: وهي التي وُقِذَتْ بالعصا حتى ماتت] والمتردية: وهي التي تقع من الأعلى إلى الأسفل؛ والنطيحة: وهي التي قُتلت نَطْحًا بالقرون؛ وما أكل السبع، فبقي منه: لأنه ضُبط المذبوحُ الطيبُ بما قُصد إزهاقُ روحه باستعمال المحدَّدِ في حلقه، أو لَبَّتِه، فَجَرَّ ذلك إلى تحريم هذه الأشياء.

وأيضًا: فإن الدم المسفوح ينتشر فيه، ويتنجس جميعُ البدن.

[ھ] إلا ما ذكيتم: أي وجد تموه قد أُصيب ببعض هذه الأشياء، وفيه حياة مستقرة فذبحتموه: فكان إزهاقُ روحه بالذبح.

[د] وأن تستقسموا بالأزلام: أي تطلبوا علمَ ما قُسِمَ لكم من الخير والشر بالقِداح، التي كان أهل الجاهلية يجيلونها: في أحدها: افعل، والثاني: لا تفعل، والثالث: غُفلٌ: فإن ذلك افتراءٌ على الله، واعتمادٌ على الجهل.

ترجمہ: واضح ہے۔ ایک وضاحت: یہ ہے کہ والموقوذة إلخ بین المربعین اضافہ ہے۔ یہ عبارت کسی مخطوطہ میں نہیں ہے، مگر اس کو ہونا چاہئے۔ حضرت مولانا محمد احسن صاحب نانوتوی رحمہ اللہ نے مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ میں بڑھائی ہے۔ شارح نے اس کو کتاب میں لے لیا ہے۔

☆ ☆ ☆

نشانہ سے مرے ہوئے جانور کو کھانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی ممانعت فرمائی کہ کوئی جانور روکا جائے (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۴) اور ایک روایت میں ہے: لاتتخذوا شيئًا فيه الروح غَرَضًا: کسی ذی روح کو نشانہ مت بناؤ (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۶)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے تیروں کے ذریعہ روکے ہوئے جانور کو کھانے کی ممانعت فرمائی (مشکوۃ حدیث ۴۰۸۸)

تشریح: زمانۂ جاہلیت کے لوگ جانور کو باندھ کر چاند ماری کیا کرتے تھے۔ پھر جب وہ تیر کھا کھا کر مر جاتا تو اس کو کھاتے تھے۔ پہلی حدیث میں جانور کو نشانہ بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ بے ضرورت جانور کو تکلیف پہنچانا ہے۔ نشانہ بازی کی مشق کے لئے اور بہت سے طریقے ہیں، ان کو اختیار کیا جائے — اور دوسری حدیث میں اس جانور کو کھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ جانور نہ تو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ذبح کیا گیا ہے، اور نہ اس کے ذریعہ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کیا گیا ہے یعنی وہ شرعی طریقہ پر ذبح کیا ہوا جانور نہیں۔ اس لئے حرام ہے۔

تیز چھری سے ذبح کرنے کی حکمت

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں نکوکردن فرض کیا ہے۔ پس جب تم (جہاد میں) دشمن کو قتل کرو تو عمدہ طریقہ پر قتل کرو یعنی اس کی لاش نہ بگاڑو، آگ میں نہ جلاؤ، اور جب تم جانور ذبح کرو تو بہترین طریقہ پر ذبح کرو، اور چاہئے کہ تم میں سے ہر ایک اپنی چھری تیز کرلے، اور چاہئے کہ وہ اپنے ذبیحہ کو راحت پہنچائے" (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۳)

تشریح: جانور کی روح نکالنے کے لئے بہترین طریقہ اپنانا یعنی تیز چھری سے ذبح کرنا: جانور پر مہربانی ہے۔ اور مہربانی کرنے والوں سے پروردگار عالم خوش ہوتے ہیں۔ حدیث میں ہے: الراحمون یرحمهم الرحمن: مہربانی کرنے والوں پر مہربان ذات مہربانی کرتی ہے (مشکوۃ حدیث ۴۹۶۹) اور بہت سی خانگی اور شہری مصلحتیں بھی جذبۂ ترحم پر موقوف ہیں۔ پس ہر معاملہ میں اس کا لحاظ کرنا چاہئے۔

زندہ جانور سے کاٹا ہوا عضو حرام ہے

حدیث —— نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو عضو چوپایے میں سے کاٹا گیا، درانحالیکہ وہ زندہ ہے، تو وہ عضو مردار ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۹۵)

تشریح: جب نبی ﷺ مدینہ میں فروکش ہوئے: لوگ اونٹوں کی کوہانیں اور دنبوں کی چکتیاں کاٹا کرتے تھے، آپؐ نے اس کی ممانعت کی اور اس علحدہ کئے ہوئے حصہ کو مردار قرار دیا۔ کیونکہ اس میں جانور کو ستانا ہے۔ اور یہ شرعی طور پر ذبح کرنا بھی نہیں، اس لئے اس کی ممانعت کردی۔

ناحق جانور کو مارنا ممنوع ہے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کوئی چڑیا ماری، یا اس سے کوئی بڑا جانور، اس کے حق کے بغیر، تو اللہ تعالیٰ اس سے اس قتل کی باز پرس کریں گے'' کسی نے پوچھا: اس کا حق کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس کو کھانے کے لئے ذبح کرے، اور اس کے سر کو کاٹ کر پھینک نہ دے'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۹۴)

تشریح: یہاں دو چیزیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں: ایک جائز ہے، دوسری ناجائز۔ پس دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ کھانے کے لئے اور انسانی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جانور کو مارنا جائز ہے۔ اور خواہ مخواہ حیوانات کو برباد کرنا، اور قساوتِ قلبی کی پیروی کرنا ممنوع ہے۔ حدیث میں یہی فرق واضح کیا گیا ہے۔

[۱] ونَهٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان تُصْبَرَ بهيمةٌ، وعن أكل المصبورة.

أقول: كان أهل الجاهلية يَصبرون البهائمَ، يرمونها بالنبل: وفي ذلك إيلامٌ غيرُ محتاج إليه؛ ولأنه لم يَصِرْ قرباناً إلى الله، ولا شُكْرَ به نِعَمُ اللهِ.

[۲] قال صلى الله عليه وسلم: "إن الله كتب الإحسان على كل شيئ: فإذا قتلتم فأحسنوا القِتْلَةَ، وإذا ذبحتم فأحسنوا الذِّبْحَة: وَلْيُحِدَّ أحدُكم شفرته، ولْيُرِحْ ذبيحته"

أقول: في اختيارِ أقربِ طريقٍ لإزهاقِ الروح: اتباعُ داعيةِ الرحمة، وهي خُلَّةٌ يَرْضَى بها

ربُّ العالمين، ويتوقف عليها أكثرُ المصالحِ المنزلية والمدنية.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: "ما يُقْطَعُ من البهيمة، وهي حية، فهي ميتة"

أقول: كانوا يَجُبُّوْنَ أَسْنِمَةِ الإبل، ويقطعون أَلْيَاتِ الغنم: وفي ذلك تعذيب، ومناقضةٌ لما شرع الله من الذبح، فَنُهي عنه.

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: "من قتل عُصفورًا فما فوقها بغير حقها: سأله الله عن قتله!" قيل: يارسولَ الله! وما حقُّها؟ قال: "أن يذبحها فيأكلها، ولا يقطع رأسها فيرمىَ بها"

أقول: ههنا شيئان مشتبهان، لابد من التمييز بينهما:

أحدهما: الذبحُ للحاجة، واتباعُ داعيةِ إقامةِ مصلحةِ نوعِ الإنسان.

والثاني: السعي في الأرض بإفساد نوع الحيوان، واتباعُ داعيةِ قسوةِ القلب.

☆ ☆ ☆

شکار کے احکام

شکار کرنا عربوں کی خُو تھی۔ اوران میں ایک رائج طریقہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ ان کا ایک ایسا پیشہ بن گیا تھا جس پر ان کی معاش کا مدار تھا۔ اس لئے شریعت نے شکار کرنا جائز رکھا۔ مگر شکار کا دُھنی بن جانا برا ہے۔ نبی ﷺ نے اس کی مضرت بیان فرمائی۔ ارشاد فرمایا: ''جو شکار کے پیچھے پڑا وہ غافل ہوا'' (ابوداؤد حدیث ۲۸۵۹) یعنی کرنے کا رہا نہ دَھرنے کا!

اور شکار کے احکام دو بنیادوں پر مبنی ہیں:

پہلی بنیاد: شکار میں ذبح اس کی تمام شرائط کے ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔ مگر دو باتوں میں تخفیف کی گئی ہے: ایک: تسمیہ جانور کے بجائے آلہ پر مقرر کیا گیا ہے۔ کیونکہ شکار میں جانور قابو میں نہیں ہوتا، آلہ ہی اختیار میں ہوتا ہے۔ دوم: ذبح کے لئے گلا اور لَبّہ شرط نہیں۔ شکار کا سارا ہی جسم محلِ ذبح ہے۔ اوران دو شرطوں میں تخفیف اس لئے کی گئی ہے کہ شکار کا کچھ حاصل نکلے۔ ورنہ شکار کا عمل لا حاصل ہو جائے گا۔ جانور قابو میں نہ ہونے کی وجہ سے ذبح سے پہلے ہی مر جائے گا۔

دوسری بنیاد: شکار کی حلت کے لئے دو شرطیں بڑھائی گئی ہیں: ایک: شکاری جانور کو بالقصد شکار پر چھوڑنا، تاکہ اصطیاد (مشکل سے شکار کرنا) متحقق ہو، ورنہ وہ ظَفَر (فتح یاب ہونا) ہوگا۔ دوم: شکاری جانور شکار کو روکے رکھے، خود نہ کھائے، تاکہ اس کا معلَّم (سکھلایا ہوا) ہونا متحقق ہو۔

پہلی بنیاد کی وضاحت: پہلے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ ذبح کی دو قسمیں ہیں: ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری۔ اگر جانور قابو میں ہو تو ذبح اختیاری ضروری ہے۔ اور ذبح اختیاری کا محل حلق اور لَبّہ ہے۔ اوراس میں ذبیحہ پر تسمیہ ضروری

ہے۔ پس اگر ذبح کرنے کے لئے ایک بکری لٹائی، اور اس پر بسم اللہ پڑھی۔ پھر وہ بکری چھوڑ کر دوسری بکری ذبح کی۔ اور ازسرِنو بسم اللہ نہ پڑھی تو یہ دوسری بکری حرام ہے۔ اور اگر بکری تو وہی رہی، لیکن چھری بدل دی، دوسری چھری سے ذبح کیا تو وہ حلال ہے ——— اور اگر جانور بے قابو ہو جیسے شکار تو ذبح اضطراری کافی ہے۔ اور اس کا محل جانور کا سارا جسم ہے۔

حدیث میں ہے: ایک صحابی نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! کیا ذبح حلق اور لَبّہ ہی میں ضروری ہے؟ آپؐ نے فرمایا: **لو طعنتَ في فخذها لأجزأ عنك**: اگر تم جانور کی ران میں نیزہ مارو تو بھی تمہارے لئے کافی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۰۸۲)

اور شکار میں چونکہ جانور اختیار میں نہیں ہوتا اس لئے تسمیہ ذبیحہ پر ضروری نہیں، بلکہ آلہ پر ضروری ہے۔ پس اگر بسم اللہ پڑھ کر کسی شکار پر تیر چلایا، اور وہ تیر دوسرے شکار کو لگ گیا تو وہ شکار حلال ہے۔ اور اگر شکار پر چلانے کے لئے ایک تیر نکالا، اور اس پر بسم اللہ پڑھی، پھر وہ تیر چھوڑ کر دوسرا تیر چلایا۔ اور ازسرِنو بسم اللہ نہ پڑھی تو شکار حلال نہیں ——— ان دو شرطوں کے علاوہ ذبح کی باقی شرطیں بحالہ ہیں۔ مثلاً ذابح کا صاحبِ ملت (مسلمان یا کتابی) ہونا ضروری ہے۔ یہ بات جانور وغیرہ سے شکار کرنے میں بھی ضروری ہے ——— اور مذکورہ دو شرطوں میں تخفیف کی وجہ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے یہ بیان کی ہے کہ شکار میں بھی حلق اور لَبّہ کی شرط لگانا اور جانور پر بسم اللہ پڑھنا: ایسی باتیں ہیں جن کی پابندی دشوار ہے۔ اگر یہ باتیں شرط کی جائیں گی تو شکاریوں کی محنت اکثر رائگاں جائے گی۔

دوسری بنیاد کی وضاحت: اصطیاد کے معنی ہیں کوشش کرکے شکار کرنا۔ پس اس کی ذاتیات کیا ہیں؟ یعنی اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کی تعیین ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ﴿مُكَلِّبِيْنَ﴾ کے لفظ سے تعیین کی ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ (اولین اردو مترجم قرآن) نے "شکار پر دوڑانا" کیا ہے۔ اور حدیث میں أرسلتَ آیا ہے۔ پس اصطیاد کا تحقق اس وقت ہوگا جب ارسال پایا جائے یعنی شکاری جانور کو بالقصد شکار پر چھوڑا جائے: کتے کو دوڑایا جائے، باز کو اڑایا جائے، اور تیر کو چلایا جائے۔ اگر اتفاقاً کتے وغیرہ کو شکار مل گیا تو وہ اصطیاد نہیں، بلکہ ظفر مندی ہے ——— اور دوسری شرط قرآن کریم نے ﴿أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ﴾ لگائی ہے۔ یعنی شکاری جانور کو یہ سکھایا گیا ہو کہ وہ شکار میں سے کھائے نہیں (اور باز کو یہ تعلیم دی گئی ہو کہ جب اس کو بلایا جائے: واپس آجائے، گو وہ شکار کے پیچھے جارہا ہو) ایسا ہی جانور اصطلاح میں "معلَّم" کہلاتا ہے۔ پس یہ شرط اس لئے لگائی ہے کہ کتے کا معلَّم ہونا متحقق ہو یعنی یہ واضح ہوجائے کہ کتے نے شکار مالک کے لئے کیا ہے، اپنے لئے نہیں کیا۔

واعلم: أنه كان الاصطياد دَيْدَنًا للعرب، وسيرةً فاشيةً فيهم، حتى كان ذلك أحد المكاسب التي عليها معاشُهم، فأباحه النبيُّ صلى الله عليه وسلم، وبَيَّنَ مافي إكثاره بقوله: "من اتَّبَعَ الصيدَ لَهَا!"

وأحكام الصيد تُبنى على:

[۱] أنه محمولٌ على الذبح في جميع الشروط، إلا فيما يَعْسَر الحفظُ عليه، ويكونُ أكثرُ سَعْيِهم — إن اشتُرِطَ — باطلاً: فَيُشترط التسميةُ على إرسال الجارح، أو الرمي، أو نحوِها؛ ويُشترطُ أهليةُ الصائد؛ ولا يُشترط الذبح، ولا الحلق واللَّبةُ.

[۲] وعلى تحقيق ذاتياتِ الاصطياد، كإرسال الجارح المعلَّم قصدًا، وإلا كان ظَفَرًا بالصيد اتفاقًا، لا اصطيادًا؛ وكونِ الجارح لم يأكل منه، فإن أكلَ، فأُدرك حيًا، وذُكِّيَ حلَّ، وإلالا؛ وذلك: تحقيقًا لمعنى المعلَّم، وتمييزًا له مما أكل السبع.

ترجمہ: اور جان لیں کہ شکار کرنا عربوں کی عادت تھی۔ اور ان میں ایک رائج طریقہ تھا۔ یہاں تک کہ یہ چیز ایک پیشہ بن گئی تھی، جس پر ان کی معاش کا مدار تھا۔ پس نبی ﷺ نے اس کو جائز قرار دیا۔ اور وہ خرابی بیان کی جو بکثرت شکار کرنے میں ہے (لَهَا وَلَهِيَ عن الشيئ: غافل ہونا)

اور شکار کے احکام کی بنیاد رکھی گئی ہے: (۱) اس بات پر کہ وہ محمول ہے ذبح پر تمام شرائط میں یعنی ذبح اختیاری کی تمام شرائط شکار میں بھی ضروری ہیں مگر اس شرط میں جس کی نگہداشت دشوار ہے۔ اور اگر وہ بات (شکار میں بھی) شرط کی گئی تو شکاریوں کی اکثر محنت رائگاں جائے گی۔ پس بسم اللہ پڑھنا شرط کیا گیا شکاری جانور کو چھوڑنے پر یا تیر اور اس کے مانند کو چلانے پر۔ اور شرط کی گئی شکاری کی اہلیت، اور نہیں شرط کیا گیا ذبح کرنا اور نہ گلا اور لَبّہ (عطف تفسیری ہے یعنی ذبح اختیاری جو گلے اور لَبّہ میں کیا جاتا ہے شرط نہیں کیا گیا)

(۲) اور (بنیاد رکھی گئی ہے) شکار کرنے کی ذاتیات کی تحقیق پر۔ جیسے شکار پر سکھلائے ہوئے شکاری جانور کو بالقصد چھوڑنا، ورنہ وہ اتفاقاً شکار پانا ہوگا، نہ شکار کرنا۔ اور شکاری جانور کا ہونا کہ اس نے شکار میں سے نہ کھایا ہو۔ پس اگر اس نے کھایا، پس وہ زندہ ہاتھ آ گیا، اور ذبح کیا گیا تو وہ حلال ہے، ورنہ نہیں۔ اور وہ بات: معلَّم کی حقیقت کو واقعہ بنانے کے لئے ہے۔ اور شکار کو جدا کرنے کے لئے ہے اس سے جس کو درندے نے کھایا ہے۔

☆ ☆ ☆

شکار کرنے کی روایات

رسول اللہ ﷺ سے شکار کرنے اور ذبح کرنے کے احکام دریافت کئے گئے تو آپؐ نے مذکورہ اصول پیش نظر رکھ کر جوابات دیئے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اس سلسلہ کی دس روایات ذکر کی ہیں۔ جن میں سے پہلی چار شکار کرنے سے متعلق ہیں، باقی ذبح سے متعلق ہیں۔ ان روایات پر قسم ثانی کا بیان مکمل ہو جائے گا۔

پہلی روایت: حضرت ابو ثعلبہ خُشَنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں

اہل کتاب ہیں، تو کیا ہم ان کے (لکڑی اور مٹی کے) برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟ اور ہم شکار کے علاقہ میں رہتے ہیں: میں اپنی کمان سے شکار کرتا ہوں۔ اور اپنے اس کتے کے ذریعہ شکار کرتا ہوں، جس کو شکار کرنے کا طریقہ سکھلایا نہیں گیا۔ اور میں اپنے سکھلائے ہوئے کتے سے بھی شکار کرتا ہوں، پس ان میں سے کونسا شکار جائز ہے؟

نبی ﷺ نے فرمایا: ''تم نے جو اہل کتاب کے برتنوں کے بارے میں سوال کیا ہے: تو اگر ان کے علاوہ برتن تمہیں دستیاب ہوں تو ان کے برتنوں میں مت کھاؤ۔ اور اگر نہ ملیں تو ان کو دھولو، اور ان میں کھاؤ ــــ اور جو شکار تم نے اپنی کمان سے کیا ہے، پس تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ــــ اور جو تم نے اپنے سکھلائے ہوئے کتے سے کیا ہے، پس تم نے اللہ کا نام لیا ہے تو کھاؤ ــــ اور جو تم نے اپنے غیر معلَّم کتے کے ذریعہ کیا ہے، پس تم نے اس کے ذبح کو پایا یعنی اس کے ذبح کا موقعہ مل گیا اور ذبح کر لیا تو کھاؤ'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۰۶۶)

تشریح: اگر دوسرے برتن میسر ہوں تو اہل کتاب کے برتن استعمال نہ کئے جائیں: یہ حکم بطور استحباب اور قطع وساوس کے لئے ہے۔ عبارت کا ترجمہ: یہ حکم پسندیدہ بات کو سوچنے کے طور پر، اور دل کو وساوس سے راحت پہنچانے کے طور پر ہے۔

دوسری روایت: حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! ہم شکار کا طریقہ سکھلائے ہوئے کتے شکار کے پیچھے چھوڑتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''جب تم نے اپنے کتے کو شکار پر چھوڑا، پس تم نے اللہ کا نام لیا، تو اگر اس نے شکار کو تمہارے لئے روک رکھا ہے، اور تم نے اسے زندہ پالیا تو اسے ذبح کرو، اور اگر تم نے اس کو پایا کہ وہ مار ڈالا گیا ہے، اور کتے نے اس میں سے نہیں کھایا، تو اس کو کھاؤ۔ اور اگر اس نے کھایا ہے تو نہ کھاؤ، کیونکہ وہ اس نے اپنے لئے پکڑا ہے ــــ اور اگر تم اپنے کتے کے ساتھ دوسرے کتے کو پاؤ، اور شکار مار ڈالا گیا ہے تو نہ کھاؤ۔ کیونکہ تمہیں معلوم نہیں کہ ان دو کتوں میں سے کس نے مارا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۶۴)

تیسری روایت: حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! میں شکار کو تیر مارتا ہوں۔ دوسرے دن وہ شکار مجھے اس حال میں ملتا ہے کہ میرا تیر اس کے اندر پیوست ہے؟ آپ نے فرمایا: ''جب تم یقین سے جان لو کہ تمہارے تیر ہی سے وہ مرا ہے، اور کسی درندہ کا کوئی اثر نہ دیکھو تو کھاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۸۴) اور ایک روایت میں ہے: ''جب تم اپنا تیر پھینکو تو اللہ کا نام لو۔ پھر اگر وہ شکار ایک دن تم سے غائب ہو گیا (اور دوسرے دن ملا) پس تم نے اس میں اپنے تیر کے علاوہ کوئی نشان نہ پایا تو اگر چاہو تو کھاؤ۔ اور اگر وہ تمہیں پانی میں ڈوبا ہوا ملے تو مت کھاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۶۴)

چوتھی روایت: حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: یا رسول اللہ! ہم شکار پر مِعراض (بے لکڑی کا تیر) پھینکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: جو معراض شکار کے جسم میں گھس جائے اس کو کھاؤ۔ اور جو اپنی چوڑائی سے لگے، پس مار ڈالے تو وہ چوٹ سے مارا ہوا ہے، پس مت کھاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۶۵)

فائدہ: بندوق کے شکار کا بھی یہی حکم ہے۔ گولی کی چوٹ چھوٹا شکار مثلاً کبوتر برداشت نہیں کر سکتا۔ پس اگر چھَرّا بدن

میں گھس بھی گیا ہو، اور شکار ذبح سے پہلے مرگیا ہو تو حرام ہے۔ کیونکہ معلوم نہیں وہ چوٹ سے مرا ہے یا خون نکل جانے کی وجہ سے مرا ہے۔ اور جب موت کے دو سبب جمع ہوتے ہیں تو شکار حرام ہوتا ہے۔ جیسا کہ تیسری روایت میں آیا ہے کہ اگر شکار پانی میں ڈوبا ہوا ملے تو حلال نہیں ـــــ رہا بڑا شکار جیسے ہرن نیل گائے وغیرہ تو اس میں ذبح کرنے کا موقع باقی رہتا ہے،

وسُئل رسولُ الله صلى الله عليه وسلم عن أحكام الصيد والذبائح، فأجاب بالتخريج على هذه الأصول:

[۱] قيل: إنا بأرض قومٍ أهلِ الكتاب، أفنأ كل في آنيتهم؟ وبأرضِ صيدٍ: أَصِيْدُ بقوسي وبكلبي الذي ليس بمعلَّم، وبكلبي المعلَّم، فما يصلح؟ قال صلى الله عليه وسلم:" أما ماذكرتَ من آنية أهل الكتاب: فإن وجدتم غيرها فلاتأكلوا فيها، وإن لم تجدوا فاغسِلوها، وكلوا فيها . وما صِدْتَ بقوسك، فذكرتَ اسمَ الله فكل، وماصِدْتَ بكلبك المعلَّم فذكرتَ اسم الله فكل، وماصدت بكلبك غيرِ معلَّم، فأدركتَ ذكاته، فكل"

قوله صلى الله عليه وسلم:" فإن وجدتم غيرها فلا تأكلوا فيها" أقول: ذلك تحَرِّيًا للمختار، وإراحةً للقلب من الوساوس.

[۲] وقيل: يارسولَ الله! إنا نرسل الكلاب المعلَّمة؟ قال صلى الله عليه وسلم:" إذا أرسلتَ كلبك فاذكر اسمَ الله، فإن أمسكَ عليكَ فأدركتَه حيًا فاذْبَحْه، وإن ادركتَه قد قُتل، ولم ياكل منه، فَكُلْه، فإن أكل فلا تأكل، فإنما أمسك على نفسه، وإن وجدت مع كلبك كلبا غيره، وقد قُتل، فلا تأكُلْ، فإنك لا تدرى أيُّهما قتله"

[۳] وقيل: يارسولَ الله! أَرمِي الصيدَ، فأجد فيه من الغد سهمي؟ قال:" إذا علمتَ أن سهمك قتله، ولم ترَ فيه أَثَرَ سَبُع، فكُلْ" وفي رواية:" وإذا رميتَ بسهمك فاذكر اسمَ الله؛ فإن غاب عنك يومًا، فلم تجد فيه إلا أثر سهمك، فكل إن شئتَ، وإن وجدتَه غريقًا في الماء فلا تأكل"

[۴] قيل: إنا نرمي بالمعراض؟ قال صلى الله عليه وسلم:" كُلْ ما خَزَق، وما أصاب بعرضه فقتل فإنه وَقِيْذ فلا تأكل"

ترجمہ: واضح ہے۔ لغات: تخریج: کے معنی ہیں: کسی بنیاد سے مسئلہ نکالنا۔ تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۶۵۲:۲)...... المِعْراض: تیر کا درمیانی موٹا حصہ۔ یہ ایک ہتھیار تھا جو ہاتھ سے پھینکا جاتا تھا...... خَزَق السهم: تیر کا شکار کے جسم میں گھس جانا۔

ذبح کی روایات

بلا وجہ شبہ نہ کرنا چاہئے!

حدیث —— حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ کچھ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہاں کچھ لوگ ہیں، جن کا شرک کے ساتھ زمانہ نیا ہے یعنی وہ پہلے مشرک تھے، اب نئے مسلمان ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے یہاں (مدینہ میں) گوشت لے کر (بیچنے) آتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ انھوں نے اللہ کا نام لیکر ذبح کیا ہے، یا یونہی ذبح کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم اللہ کا نام لو، اور کھاؤ!'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۶۹)

تشریح: جوابِ نبوی کی بنیاد یہ ہے کہ حکم ظاہر حال پر لگتا ہے۔ جب وہ لوگ سچے دل سے ایمان لے آئے ہیں تو ظاہر یہی ہے کہ انھوں نے اللہ کا نام لیکر ذبح کیا ہوگا، پھر خواہ مخواہ شبہ میں کیوں پڑا جائے۔

ذبح ہر دھار دار آلہ سے ہوسکتا ہے

حدیث —— حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کل ہم دشمن کے مقابلہ میں ہوں گے (پس تلواروں پر سان چڑھانی ضروری ہے) اور ہمارے ساتھ چھریاں نہیں، تو کیا ہم بانس (کی کھپچی) سے ذبح کر سکتے ہیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ''جو بھی چیز خون بہادے اور اللہ کا نام لے کر ذبح کیا جائے، تو کھاؤ۔ البتہ وہ دانت اور ناخن نہ ہو۔ اور اس کی وجہ میں ابھی بتلاتا ہوں: دانت تو ہڈی ہے! اور ناخن اہل حبشہ کی چھری ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۱)

تشریح: جسم میں لگے ہوئے دانتوں اور ناخنوں سے ذبح کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ ان میں دھار نہیں۔ اور ناخن میں ایک دوسری وجہ ممانعت کفار کے ساتھ مشابہت بھی ہے۔

پالتو جانوروں میں ذبح اضطراری کی ایک صورت

حدیث —— حضرت رافع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں غنیمت میں اونٹ اور بکریاں ملیں۔ ان میں سے ایک اونٹ بدک گیا۔ پس اس کو ایک آدمی نے تیر مارا۔ پس اس کو روک لیا۔ پس نبی ﷺ نے فرمایا: ''یہ اونٹ بھی کبھی جنگلی جانوروں کی طرح وحشی ہوجاتے ہیں۔ پس جب ان میں سے کوئی تم پر غالب آجائے تو تم اس کے ساتھ ایسا ہی کرو'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۱)

تشریح: اگر پالتو جانور بدک جائے، اور اس کو پکڑنے کی اور ذبح کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ وحشی جانور کے حکم میں ہوجاتا ہے۔ پس ذبح اضطراری درست ہوگا۔ جیسے کوئی بڑا جانور کنویں میں یا کھائی میں گر جائے، اور اتر کر ذبح کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو کوئی دھار دار چیز بسم اللہ پڑھ کر اس پر ڈالی جائے اور اس کو زخمی کیا جائے، جب وہ مر جائے تو اتر

کرکاٹ کرنکال لیا جائے۔ وہ حلال ہے۔

دھاردار پتھر سے ذبح کرنا جائز ہے

حدیث — حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی بکریاں سَلْع نامی پہاڑی پر چررہی تھیں۔ ان کی ایک باندی نے ایک بکری کو مرتا دیکھا۔ اس نے ایک پتھر توڑا اور اس سے ذبح کردیا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا: آپؐ نے اس کے کھانے کا حکم دیا (مشکوۃ حدیث ۴۰۷۲)

حکم شرعی میں شک کرنا مؤمن کی شان نہیں

حدیث — حضرت قَبِیصہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عیسائیوں کے ذبیحہ کے بارے میں دریافت کیا۔ عرض کیا: گوشتوں میں سے کچھ گوشت ایسے ہیں جن کے کھانے میں ہمیں تنگی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی عیسائیوں کا ذبیحہ کھانے میں شرح صدر نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''ہرگز کوئی چیز تمہارے دل میں اضطراب پیدا نہ کرے۔ تم اس معاملہ میں عیسائیت کے مشابہ ہوگئے ہو!'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۸۷)

تشریح: سورۃ المائدۃ آیت پانچ میں صراحت ہے کہ ''اہل کتاب کا کھانا (ذبیحہ) تمہارے لئے حلال ہے'' پس اہل کتاب خواہ یہودی ہو یا عیسائی، اگر وہ واقعی اپنے مذہب پر قائم ہے تو اس کا ذبیحہ حلال ہے۔ اس میں شرح صدر نہ ہونے کی کوئی بات نہیں کسی منصوص حکم پر عمل کرنے میں تنگی محسوس کرنا یا اس کو خلافِ تقوی تصور کرنا مسلمان کی شان نہیں۔ یہ مزاج عیسائیوں کا ہے۔ اس کی نظیر: مسح علی الخفین ہے۔ یہ ایک ثابت حکم ہے۔ پس اس پر عمل کرنے میں کوئی تنگی محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ کوئی نام کا یہودی یا عیسائی ہو۔ اور وہ کسی مذہب کا قائل نہ ہو، جیسا کہ آج کل ان لوگوں کا حال ہے، یا وہ بسم اللہ کے بغیر ذبح کرتے ہوں تو ان کا ذبیحہ حلال نہیں۔ اس معاملہ میں عرب سخت مغالطے میں ہیں۔ پس احتیاط ضروری ہے۔

مذبوحہ کے پیٹ سے نکلے ہوئے بچے کے ذبح کا حکم

حدیث — حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم اونٹنی ذبح کرتے ہیں۔ اور گائے اور بکری ذبح کرتے ہیں۔ پس ہم اس کے پیٹ میں بچہ پاتے ہیں تو کیا ہم اس کو پھینک دیں، یا اس کو کھائیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو اس کو کھاؤ۔ پس بیشک اس کا ذبح اس کی ماں کا ذبح ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۰۹۴)

تشریح: مذبوحہ جانور کے پیٹ میں سے اگر بچہ زندہ نکلے تو اس کا ذبح ضروری ہے۔ ذبح کئے بغیر مرجائے تو وہ بالاجماع حلال نہیں۔ اور اگر اس حال میں نکلے کہ ابھی اس کی بناوٹ ہی مکمل نہیں ہوئی تو بھی بالاجماع حلال نہیں۔ کیونکہ ابھی وہ مُضغہ ہے۔ اور اگر بناوٹ مکمل ہوچکی ہے اور سب بال نکل آئے ہیں، اور مرا ہوا نکلا تو صاحبین وغیرہ کے نزدیک

حلال ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک حلال نہیں۔

[۵] قيل: يارسولَ الله! إن هنا أقوامًا حديثٌ عهدُهم بشركٍ، يأتوننا بلُحمان، لاندری يذكرون اسم الله عليها أم لا؟ قال صلی الله عليه وسلم:" اذكروا أنتم اسمَ الله وكلوا"

أقول: أصله: أن الحكم على الظاهر.

[٦] قيل: إنا لاَقُوا العدوِّ غدًا، وليست معنا مدًى، أفنذبح بالقَصَب؟ قال صلی الله عليه وسلم:" ما أنْهَرَ الدمَ، وذُكر اسمُ الله، فكُلْ، ليس السنَّ والظُفُر، وسأحدثك عنه: أما السن فعظمٌ، أما الظفر فمُدَى الحَبَشِ"

[٧] ونَدَّ بعيرٌ، فرماه رجل بسهم، فحبسه، فقال صلی الله عليه وسلم:" إن لهذه الإبل أوابدَ كأوابد الوحش، فإذا غلبكم منها شيئ فافعلوا به هكذا"

أقول: لأنه صار وحشيا، فكان حكمُه حكمَ الصيد.

[٨] وسئل صلی الله عليه وسلم عن شاة: أبصرتْ جاريةٌ بها موتًا، فكسرتْ حجرًا، فذبحتها، فأمر بأكلها.

[٩] قيل: إن من الطعام طعامًا أتَحَرَّجُ منه قال:" لايتخلَّجَنْ في صدرك شيئٌ، ضارعتَ فيه النصرانيةَ!"

[١٠] قيل: يارسولَ الله! نَنْحَرُ الناقة، ونذبح البقرةَ والشاةَ، فنجد في بطنها الجنينَ، أنُلقيه أم نأكله؟ قال صلی الله عليه وسلم:" كلوه إن شئتم، فإن ذكاتَه ذكاةُ أمه"

ترجمہ: اوپر آگیا۔ یہاں حلال وحرام جانوروں کی قسم دوم کا بیان مکمل ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

آدابِ طعام

آداب کی رعایت برکت کا باعث ہے اور برکت کی صورت اور سبب

حدیث(۱) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۰۸)

حدیث(۲) ــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنا کھانا ناپو تمہارے لئے اس میں برکت کی جائے گی!'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۹۸)

حدیث(۳) ــ ثرید کا ایک بڑا پیالہ نبی ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس کے کناروں سے کھاؤ۔ اور

اس کے بیچ میں سے مت کھاؤ۔ کیونکہ برکت پیالہ کے بیچ میں نازل ہوتی ہے'' (رواہ الترمذی وغیرہ) اور ابوداؤد کی روایت میں ہے: ''جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو وہ پلیٹ کے بالائی (درمیانی) حصہ سے نہ کھائے، بلکہ زیریں حصہ سے یعنی کناروں سے کھائے۔ کیونکہ برکت اس کے بالائی حصہ میں نازل ہوتی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۱۱)

تشریح: کھانے وغیرہ میں برکت کی دوصورتیں ہوتی ہیں:

پہلی صورت: کھانے میں برکت یہ ہے کہ نفس سیر ہوجائے۔ آنکھ ٹھنڈی ہو۔ دل کو چین آئے۔ اور ہائے ہائے! لائے لائے! کرنے والا نہ ہو، جیسے وہ شخص جو کھاتا ہے اور شکم سیر نہیں ہوتا۔ یہ بے برکتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دوشخصوں کے پاس مثال کے طور پر سوسو درہم ہیں: ان میں سے ایک محتاجگی سے ڈرتا ہے۔ اور لوگوں کے مالوں پر رال ٹپکاتا ہے۔ اور وہ اس طرح اپنے مال کو خرچ کرنے کی راہ نہیں پاتا کہ وہ اس کے لئے دین ودنیا میں سودمند ہو۔ اور دوسرے کا حال یہ ہے کہ بے خبر اس کو مالدار گمان کرتا ہے۔ وہ اسبابِ زندگی میں میانہ روی اختیار کرتا ہے۔ اور اپنی ذات میں پرسکون ہوتا ہے۔ پس اس دوسرے کے لئے اس کے مال میں برکت ہوئی۔ اور اُس پہلے کے لئے کوئی برکت نہیں ہوئی۔

دوسری صورت: آدمی مال اپنی ضروریات ہی میں خرچ کرے۔ اور وہ مال کئی گنا زائد کا کام کرے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی دوشخص ایک ایک رطل کھاتے ہیں: ایک کی طبیعت اس غذا سے بدن کی نشوونما کرتی ہے۔ اور دوسرے کے پیٹ میں کوئی آفت پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کا کھایا ہوا اس کے لئے سودمند نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی ضرررساں ہوجاتا ہے — اور کبھی دوشخصوں کے پاس مال کی یکساں مقدار ہوتی ہے: ایک اس سے زرخیز زمین خریدتا ہے۔ اور اس کی آمدنی میانہ روی سے خرچ کرتا ہے۔ اور دوسرا اپنے مال کو دونوں ہاتھوں سے اڑاتا ہے۔ پس اس کی کوئی ضرورت پوری نہیں ہوتی، اور مال نمٹ جاتا ہے۔

برکت کا سبب: اور برکت کا سبب آدمی کا عقیدہ اور دل کی کیفیت ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے: حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے نبی صَلَّاللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ سے مال کا سوال کیا۔ آپؐ نے عنایت فرمایا۔ انھوں نے پھر مانگا۔ آپؐ نے پھر عنایت فرمایا۔ اور ارشاد فرمایا: ''حکیم! یہ مال سرسبز وشیریں ہے۔ جو اس کو نفس کی فیاضی سے لیتا ہے اس کے لئے اس میں برکت کی جاتی ہے۔ اور جو اس کو اِشرافِ نفس (رال ٹپکا کر) لیتا ہے، اس کے لئے اس میں برکت نہیں کی جاتی'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۴۲ کتاب الزکوۃ، باب من تحل له المسألة إلخ) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نفس کی حالت مال میں برکت اور بے برکتی کا سبب ہوتی ہے۔

اور نفس کی حالت کی اثراندازی کی مثال یہ ہے کہ ایک لکڑی فضا میں رکھی ہوئی ہو اور اس پر کوئی چلے تو پیر پھسل جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا دل دھڑکتا ہے۔ اور وہی لکڑی زمین پر رکھی ہو، اور کوئی اس پر چلے تو پیر نہیں پھسلتا۔ کیونکہ دل مطمئن ہوتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی مال کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے۔ اور مال سے حاجت روائی چاہتا ہے، اور یہ بات دل میں ٹھا

لیتا ہے تو اس کا مال اس کی آنکھ کی ٹھنڈک، دل کے سکون اور نفس کی عفت کا سبب ہوتا ہے۔ اور کبھی اس کے دل کی یہ کیفیت اس کی طبیعت کی طرف سرایت کرتی ہے، پس وہ غذا کو ایسی خِلط صالح کی طرف پھیرتی ہے کہ وہ اس کے لئے سود مند ہوتی ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲: ۶۵)

مذکورہ آداب کی حکمتیں: مذکورہ حدیثوں میں کھانے کے چار آداب بیان کئے گئے ہیں: ۱- کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا ۲- کھانے کے بعد ہاتھ دھونا ۳- ناپ تول کر کھانا پکانا ۴- لوگ بڑے برتن میں ایک ساتھ کھا رہے ہوں تو کناروں سے کھانا، برتن کے بیچ میں سے نہ کھانا — یہ آداب کس طرح سببِ برکت بنتے ہیں اور ان میں کیا حکمتیں ہیں، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

① — کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا دو طرح سے سببِ برکت بنتا ہے:

ایک: جب کوئی شخص کھانے سے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھو لیتا ہے (اور منہ گندہ ہو تو اسے بھی صاف کر لیتا ہے) اور جوتے نکال کر اطمینان سے کھانے کے لئے بیٹھتا ہے۔ اور اللہ کے نام سے کھانا شروع کرتا ہے۔ اور کھانے کی طرف متوجہ ہو کر کھاتا ہے تو اس کی یہ حالت سبب بنتی ہے، اور اس کے کھانے میں برکت کا فیضان کیا جاتا ہے۔

دوم: کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے سے میل کچیل دور ہو جاتا ہے۔ ورنہ وہ کھانے کے ساتھ پیٹ میں جاتا ہے۔ اور بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ بیماریوں سے بچا رہنا بھی ایک طرح کی برکت ہے۔

② — اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینے سے برکت اس طرح ہوتی ہے کہ ہاتھوں کی چکنائی دور ہو جاتی ہے۔ اور اس بات کا اندیشہ نہیں رہتا کہ اس کے کپڑے آلودہ ہوں، یا کوئی درندہ (بلی چوہا وغیرہ) اس کو نوچے۔ یا کوئی زہریلا کیڑا اس کو ڈسے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے اس حال میں رات گذاری کہ اس کے ہاتھ میں چکنائی ہے، جس کو اس نے نہیں دھویا، پس اگر اس کو کوئی ضرر پہنچے تو وہ ہرگز ملامت نہ کرے مگر اپنے آپ کو'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۱۹)

③ — اور ناپ تول کر پکانے میں برکت اس طرح ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص ناپ کر رسد لیتا ہے، اور اس کی مقدار جانتا ہے۔ پھر کھانا تیار ہونے کے بعد میانہ روی سے اپنی نگرانی میں خرچ کرتا ہے، تو وہ کھانا اگرچہ دوسروں کے لئے ناکافی سے بھی کم ہوتا ہے، مگر وہ کافی ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ اٹکل سے رطل بھر لیا جاتا ہے، جو اس کی ضرورت سے زائد ہوتا ہے، مگر کھانا تیار ہونے کے بعد وہ زائد کھانا کہاں چلا جاتا ہے: اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، اور رسد کم ہو جاتی ہے یعنی مہینہ میں ایک دن کی رسد کا ٹوٹا پڑ جاتا ہے۔

④ — اور جب کسی بڑے برتن میں لوگ ایک ساتھ کھا رہے ہوں تو ادب یہ ہے کہ لوگ برتن کے کنارے سے کھائیں۔ درمیان سے نہ کھائیں۔ اناپ شناپ ہاتھ مارنے سے مکروہ ہیئت پیدا ہوتی ہے۔ اور کھانا سارا بکھر جاتا ہے۔ پس اگرچہ وہ کھانا دوسروں کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہوتا ہے، مگر وہ بھوکے رہ جاتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ انسان پوری

خوراک تفکہ کے طور پر کھا جاتا ہے۔ یا چلتے ہوئے یا باتیں کرتے ہوئے کھالیتا ہے۔ اور اس کھانے کی اس کے نزدیک کچھ اہمیت نہیں ہوتی۔ پس وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس نے کھایا ہی نہیں۔ اور اس کا جی نہیں بھرتا، اگرچہ پیٹ بھر جاتا ہے۔

حاصل کلام: یہ ہے کہ برکت اور عدم برکت کے لئے بھی طبعی اسباب ہیں۔ انہی کے ضمن میں ملائکہ اور شیاطین اپنے اثرات دکھاتے ہیں۔ اور ان اسباب کے ڈھانچوں میں ملکوتی برکات اور شیطانی حرکات نمودار ہوتی ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

نوٹ: آخری دو باتیں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ اور پہلی بات کی دونوں حکمتیں جدا جدا ہوگئی ہیں۔ اس کا خیال رکھ کر تقریر کو عبارت سے ملائیں۔

واعلم: أن النبي صلى الله عليه وسلم علَّم آدابًا يتأدَّبون بها في الطعام: قال صلى الله عليه وسلم:" بَرَكة الطعام الوضوءُ قبلَه، والوضوءُ بعدَه" وقال صلى الله عليه وسلم:" كِيْلوا طعامَكم يُبَارَكْ لكم فيه" وقال عليه السلام:" إذا أكل أحدُكم طعامًا فلا يأكلْ من أعلى الصَّحْفَة، ولكن ليأكل من أسفلها، فإن البَرَكَةَ تنزل من أعلاها"

أقول: من البركة: أن تَشْبَعَ النفسُ، وتَقَرَّ العينُ، ويَنْجَمِعَ الخاطر، ولايكون هاعاً لاعًا، كالذي يأكل ولايشبع.

وتفصيل ذلك: أنه ربما يكون رجلان: عند كل منهما مائةُ درهم، أحدهما: يخشى العَيْلَةَ، ويطمع في أموال الناس، ولايهتدي لصرف مالِه فيما ينفعه في دينه ودنياه؛ والآخَرُ: يحسبه الجاهل غنيًا، مقتصدٌ في معيشته، مُنْجَمِعٌ في نفسه: فالثاني بورك له في ماله، والأولُ لم يُبَارَكْ له.

ومن البركة: أن يَصْرِفَ الشيئَ في الحاجة، ويكفي عن أمثاله.

تفصيله: أنه ربما يكون رجلان: يأكل كل واحد رطلا، يصرف طبيعةُ أحدهما إلى تغذية البدن؛ ويَحْدِثُ في معدة الآخر آفةٌ، فلا ينفعه ما أكل، بل ربما صار ضارًّا؛ وربما يكون لكل منهما مال: فيصرف أحدهما في مثل ضَيْعَةٍ كثيرةِ الرِّيْفِ، ويهتدي لتدبير المعاش؛ والثاني يُبَذِّرُ تبذيرًا، فلا يقع من حاجته في شيئ.

وإن لهيئات النفس وعقائدها مدخلاً في ظهور البركة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:"فمن أخذه بإشرافِ نفسٍ لم يُبَارَكْ له فيه، وكان كالذي يأكل ولايشبع" ولذلك تَزْلَقُ رِجْلُ الماشي على الجذع في الجوِّ دون الأرض، فإذا أقبل على شيئ بالهمة، وأراد به أن يقع كفايةً عن

حـاجتـه، وجـمـع نفسه في ذلك، كان سببَ قرةِ عينه، وانجماع خاطره، وتعفُّفِ نفسِه، وربما يسري ذلك إلى الطبيعية، فصرفتْ فيما لابد منه:

فإذا غسـل يـديـه قبل الطعام، ونزع النعلين، واطمأن في مجلسـه، وأخذه اعتدادًا به، وذكر اسم الله عليه؛ أُفيضت عليه البركةُ.

وإذا كال الطعام، وعرف مقدارَه، واقتصد في صرفه، وصَرَفه على عينه: كان أدنى أن يكفيه أقلَّ مـمـالايـكفي الآخرين؛ وإذا جعل الطعام بهيئة منكرة تَعَافُهَا الأنفسُ، ولا تعتد به لأجلها: كان أدنى أن لايكفي أكثرَ مما يكفي الآخرين.

كيف؟ ولا أظن أن أحـدًا يـخـفـى عـليه: أن الإنسان ربما يأكل الرغيف كهيئة المتفكِّه، أو يـأكله وهو يمشي ويحدِّث، فلا يجد له بالاً، ولايرى نفسه قد اغتذتْ، ولا تشبع به نفسُه، وإن امتـلأتِ الـمـعـدةُ؛ وربما يأخذ مقدارَ الرطل جُزَافًا، فيكون الزائد يستوي وجودُه وعدمُه، ولا يقع من الحاجة في شيئ، ويجدُ الطعامَ بعد حين وقد ظهر فيه النقصان.

وبالجملة: لـوجـود البركة وعدمها أسباب طبيعية، يُمِدُّ في ضمنها مَلَكٌ كريم، أو شيطان رجيم، ويُنفخ في هيكلها روحٌ ملكي أو شيطاني، والله أعلم.

أما غسل اليد قبل الطعام: ففيه إزالة الوسخ. وأما غسلها بعده: ففيه إزالة الغَمْرِ، وكراهية ان يـفسُد عليه ثيابُه، أو يَخدِشَه سَبُعٌ، أو تَلْدَغَه هامَّة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "من بات وفي يده غَمَرٌ لم يغسله، فأصابه شيئ: فلا يلومنَّ إلا نفسَه"

ترجمہ: میں کہتا ہوں: برکت میں سے ہے کہ نفس سیر ہوجائے، اور آنکھ ٹھنڈی ہو، اور دل جمعی میسر آئے۔ اور بے صبر بےقرار نہ ہو، جیسے وہ شخص جو کھاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا ـــــ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی دو آدمی: ان میں سے ہر ایک کے پاس سو درہم ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک: محتاجگی سے ڈرتا ہے۔ اور لوگوں کے اموال پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتا ہے۔ اور وہ اپنے مال کو اس کام میں خرچ کرنے کی راہ نہیں پاتا جو اس کے لئے اس کے دین اور اس کی دنیا میں سودمند ہو۔ اور دوسرا: اس کو اس کے حال سے بےخبر مالدار خیال کرتا ہے۔ وہ اپنی معیشت میں میانہ روی اپنانے والا، اور اپنی ذات میں مطمئن ہوتا ہے۔ پس دوسرا: اس کے لئے برکت کی گئی اس کے مال میں، اور پہلے کے لئے برکت نہیں کی گئی ـــــ اور برکت میں سے یہ ہے کہ خرچ کرے وہ اپنی ضروریات میں۔ اور کافی ہوجائے وہ چیز اپنے کئی گنا سے ـــ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کبھی دو شخص: ہر ایک: ایک رطل کھاتا ہے۔ ان میں سے ایک کی طبیعت اس کو خرچ کرتی ہے بدن کی پرورش میں۔ اور دوسرے کے پیٹ میں کوئی آفت پیدا ہوتی ہے۔ پس سودمند نہیں ہوتا اس کے لئے جو اس نے کھایا۔ بلکہ کبھی نقصان رساں

ہوتا ہے — اور کبھی ہر ایک کے لئے ایک مال ہوتا ہے۔ پس ان میں سے ایک خرچ کرتا ہے کثیر آمدنی والی کسی جائداد میں (لفظ مثل زائد ہے) اور وہ معاش کی تدبیر کی راہ پالیتا ہے۔ اور دوسرا دونوں ہاتھوں سے اس کو اڑاتا ہے۔ پس نہیں واقع ہوتا خرچ کرنا اس کی حاجت سے کسی چیز میں — (برکت کا سبب) اور بیشک نفس کی ہیئتوں اور اس کے عقیدوں کے لئے برکت کے ظاہر ہونے میں دخل ہوتا ہے (حدیث شریف) اور اسی وجہ سے فضا میں رکھی ہوئی لکڑی پر چلنے والے کا پیر پھسلتا ہے، نہ کہ زمین پر۔ پس جب وہ پوری توجہ سے متوجہ ہوتا ہے، اور چاہتا ہے وہ مال سے کہ واقع ہو وہ اس کی حاجت روائی میں۔ اور وہ اس میں اپنا دل اکٹھا کرتا ہے تو ہوتا ہے وہ اس کی آنکھ کی ٹھنڈک کا سبب، اور اس کی دل جمعی کا باعث، اور اس کے نفس کی پاکدامنی کا ذریعہ۔ اور کبھی یہ چیز طبیعت کی طرف سرایت کرتی ہے۔ پس وہ اس کام میں خرچ کرتی ہے جو اس کے لئے سودمند ہوتا ہے (سبب کا بیان تمام ہوا)

(پہلے ادب کی پہلی حکمت:) پس جب اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھانے سے پہلے دھوئے، اور چپل نکالے، اور اطمینان کے ساتھ بیٹھا۔ اور اس نے لیا کھانا اس کا لحاظ کرتے ہوئے یعنی توجہ کے ساتھ کھایا۔ اور اس نے اس پر اللہ کا نام لیا تو اس پر برکت کا فیضان کیا جاتا ہے — (تیسری بات کا بیان:) اور جب اس نے کھانا ناپا، اور اس کی مقدار جانی، اور میانہ روی سے اس کو خرچ کیا۔ اور اس کو اپنی نگرانی میں خرچ کیا تو ہوتا ہے کھانا قریب تر اس سے کہ کافی ہوجائے وہ اس کے لئے درانحالیکہ وہ کم ہوتا ہے اس کھانے سے جو دوسروں کے لئے ناکافی ہوتا ہے (چوتھی بات کا بیان:) اور جب کھانے کو ایسی مکروہ ہیئت پر بناتا ہے جس کو نفوس ناپسند کرتے ہیں یعنی لوگ اناپ شناپ ہاتھ مارتے ہیں۔ اور لوگ اس کو شمار میں نہیں لاتے اس منکر ہیئت کی وجہ سے تو ہوتا ہے وہ کھانا قریب تر اس بات سے کہ نہ کافی ہو اس سے زیادہ بھی جو دوسروں کے لئے کافی ہوجاتا ہے۔

اور کیسے؟ اور نہیں گمان کرتا میں کہ کسی پر یہ بات مخفی ہو کہ انسان کبھی کھاتا ہے روٹی (خوراک) میوہ کھانے کے طور پر یا وہ کھاتا ہے درانحالیکہ وہ چل رہا ہے اور باتیں کررہا ہے (یہ مکروہ ہیئت ہے) پس نہیں پاتا وہ کھانے کے لئے کچھ اہمیت۔ اور نہیں دیکھتا وہ اپنے نفس کو کہ اس نے کھانا کھایا، پس اس کی وجہ سے اس کا نفس سیر نہیں ہوتا، اگرچہ پیٹ بھر جاتا ہے (اس کا تعلق چوتھی بات سے ہے) — اور کبھی رطل بھر انکل سے لیتا ہے۔ پس ہوتا ہے زائد: اس کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہوتا ہے۔ اور نہیں واقع ہوتا وہ زائد ضرورت سے کسی چیز میں۔ اور پاتا ہے وہ کھانے کو یعنی رسد کو ایک وقت کے بعد یعنی مہینہ بھر کے بعد درانحالیکہ اس میں نقصان ظاہر ہوچکا ہے یعنی ایک دن کی رسد گھٹ گئی ہے (اس کا تعلق تیسری بات سے ہے)

— اور حاصل کلام: برکت کے پائے جانے اور نہ پائے جانے کے لئے اسباب ہیں۔ ان اسباب کے ضمن میں معزز فرشتہ یا مردود شیطان کمک پہنچاتا ہے۔ اور ان اسباب کے ڈھانچوں میں ملکی یا شیطانی روح پھونکی جاتی ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں (اس پر بحث تمام ہوتی ہے، اس لئے واللہ اعلم لکھا ہے) — رہا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا: پس اس میں میل دور کرنا ہے (یہ پہلی بات کی دوسری حکمت ہے) — اور رہا کھانے کے بعد ہاتھ دھونا: تو اس میں چکنائی دور کرنا

ہے۔ اور اس بات کی ناگواری دور کرنا ہے کہ اس کے کپڑے بگڑ جائیں۔ یا اس کو کوئی درندہ نوچے، یا اس کو کوئی زہریلا کیڑا ڈسے۔ الی آخرہ (یہ دوسری بات کی حکمت ہے)

لغات: تَأَدَّبَ: تہذیب سیکھنا ..... اِنْجَمَعَ: اکٹھا ہونا ..... الهاع: جلدی گھبرا جانے والا اللاّع: تنگ دل ہونے والا، گھبرانے والا، رَجلٌ هَاعٌ وَلَاعٌ: تنگ دل، پریشان ..... العَيْلة: محتاجگی، غربت ..... الرِّيْف: کھیتی۔

تصحیح: مقتصدٌ اور مُنْجَمِع مطبوعہ میں حالت نصبی میں تھے۔ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے۔ اور یہ مبتدا محذوف هو کی خبریں ہیں۔

ترکیب: أدنى أن میں دونوں جگہ مِن محذوف ہے۔

☆ ☆ ☆

ہر حال میں انسان کے ساتھ شیطان کی موجودگی کی صورت

حدیث (۱) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کھائے تو دائیں ہاتھ سے کھائے۔ اور جب پیئے تو دائیں ہاتھ سے پیئے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۶۲)

حدیث (۲) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی بائیں ہاتھ سے ہرگز نہ کھائے۔ اور بائیں ہاتھ سے ہرگز نہ پیئے۔ پس بیشک شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا ہے، اور بائیں ہاتھ سے پیتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۶۳)

حدیث (۳) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان کھانے کو جائز سمجھتا ہے جب اس پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۶۰)

حدیث (۴) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کھائے، اور اللہ کا نام لینا بھول جائے، تو چاہئے کہ کہے بسم الله أوله و آخره: اللہ کے نام سے کھاتا ہوں شروع سے آخر تک (مشکوۃ حدیث ۴۲۰۲)

حدیث (۵) — ایک صاحب بسم اللہ پڑھے بغیر کھا رہے تھے۔ جب ایک لقمہ رہ گیا تو انھوں نے کہا: بسم الله أوله و آخره تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے، اور فرمایا: ''شیطان برابر اس کے ساتھ کھا رہا تھا۔ پس جب اس نے اللہ کا نام لیا تو اس نے سارا کھایا ہوا قئے کر دیا'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۰۳)

حدیث (۶) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''شیطان ہر ایک کے پاس اس کے ہر حال میں موجود ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ پس اگر تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اس کی خرابی دور کر دے، پھر اس کو کھالے، اور اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۶۷)

تشریح: مذکورہ چھ روایات میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ دائیں ہاتھ سے کھانا پینا چاہئے۔ بائیں ہاتھ سے شیطان کھاتا پیتا ہے۔ پس اس کی مشابہت سے بچنا چاہئے۔

۲۔ اللہ کا نام لیکر کھانا چاہئے۔ بسم اللہ پڑھے بغیر کھانے پینے کی صورت میں شیطان حصہ دار ہوتا ہے۔ پس اس دشمن کو شریک نہیں کرنا چاہئے۔

۳۔ اگر اللہ کا نام لینا بھول جائے تو جب یاد آئے بسم الله أوله و آخره کہہ لے۔ ایسا کہنے سے شیطان سارا کھایا ہوا قئے کر دیتا ہے۔

۴۔ شیطان انسان کے ساتھ ہر حال میں حاضر رہتا ہے۔ پس اگر لقمہ گر جائے تو اسے صاف کر کے کھالینا چاہئے۔ شیطان کے لئے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

یہ سب باتیں حقیقت ہیں۔ مجازی معنی مراد نہیں۔ اور شیطان کی شرکت اور موجودگی کی کیا صورت ہوتی ہے، اس کو شاہ صاحب قدس سرہٗ بیان کرتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جو علوم عطا فرمائے ہیں: ان میں فرشتوں اور شیاطین کا اور ان کے زمین میں پھیلنے کا علم بھی عطا فرمایا ہے۔ فرشتے ملأ اعلیٰ سے اچھے الہامات حاصل کرتے ہیں، اور ان کو انسانوں تک پہنچاتے ہیں۔ اور شیاطین کے مزاج سے ایسی خراب باتیں پھوٹتی ہیں جو نظام خیر کو بگاڑنے کی طرف مائل ہوتی ہیں۔ وہ وقار و متانت کے حکم کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اور فطرت سلیمہ کے تقاضے کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ کام بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ اور انسانوں کو وحی بھی اسی کی کرتے ہیں۔

اور شیاطین کے احوال میں دو باتیں ہیں:

ایک: جب وہ خواب میں یا بیداری میں کسی کے سامنے متمثل ہوتے ہیں تو ایسی بھونڈی شکلوں میں متمثل ہوتے ہیں جن سے طبائع سلیمہ نفرت کرتی ہیں۔ جیسے بائیں ہاتھ سے کھانا اور ننگا بن کر نمودار ہونا۔ اور ایسی ہی مکروہ ہیئتیں!

دوم: ان کے نفوس میں بھی نُکمّی ہیئتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جس طرح انسانوں کے نفوس میں بہیمیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے بھوک کے وقت کھانے کی خواہش ہوتی ہے، اور شدتِ شہوت کے وقت عورتوں سے جماع کی۔ اس قسم کے تقاضے شیاطین میں بھی ابھرتے ہیں۔ اور وہ ان خواہشات کی تکمیل کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ انسانوں کے شریک حال ہو کر ان کے فعل کی نقل کرتے ہیں۔ اور خیالی طور پر اپنی خواہش پوری کرتے ہیں۔

پس جو بچہ ایسی ہم بستری سے پیدا ہوتا ہے جس میں شیاطین نے شرکت کی ہے، اور شوہر کے جماع کے ساتھ انھوں نے بھی اپنی حاجت پوری کی ہے، تو وہ بچہ بے برکت اور شیطنت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور جو کھانا انسان کے ساتھ شیاطین نے بھی کھایا ہے، اور انھوں نے بھی اس کھانے سے اپنی حاجت روائی کی ہے، وہ کھانا بے برکت ہوتا ہے، اور انسان کے لئے سودمند نہیں ہوتا، بلکہ کبھی نقصان رساں ہوتا ہے —— اور اللہ کا نام لینا، اور شیاطین سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنا فطری طور پر شیاطین کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لئے جب کھانے پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے، اور ان کی پناہ

طلب کی جاتی ہے تو وہ مردود پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

اور ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ہمارے یہاں ایک دن ہمارا ایک شاگرد مہمان آیا۔ ہم نے اس کے سامنے ماحضر پیش کیا۔ وہ کھا رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے روٹی کا ایک ٹکڑا گر گیا۔ اور زمین میں لڑھکنے لگا۔ اس شخص نے اس کا پیچھا کیا اور وہ دور ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اس پر ذرا تعجب بھی ہوا۔ اور اس نے اس لقمہ کا پیچھا کرنے میں کچھ تعب بھی اٹھایا، اور اس کو لے لیا اور کھا لیا۔ چند روز کے بعد ایک شخص پر آسیب چڑھا۔ اور وہ جو باتیں بولا اس میں یہ بات بھی تھی کہ میں فلاں آدمی کے پاس سے گذرا، وہ کھانا کھا رہا تھا۔ مجھے وہ کھانا بہت پسند آیا۔ مگر اس نے مجھے اس میں سے کچھ نہ دیا تو میں نے اس کے ہاتھ سے اس کو جھپٹ لیا مگر اس نے مجھ سے جھگڑا کر کے اس کو لے لیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ یہ ہے کہ ہمارے گھر والے گاجریں کھا رہے تھے۔ اچانک گاجر لڑھکنے لگی۔ ایک شخص اس کی طرف کودا، اور اس کو لیکر کھا لیا۔ اسی وقت اس کے سینہ اور معدہ میں درد شروع ہو گیا۔ پھر اسی پر آسیب چڑھا۔ اور اس کی زبان سے بولا کہ یہ شخص وہ لڑھکتی ہوئی گاجر کھا گیا ہے۔

اور اس قسم کے بہت سے واقعات سے ہمارے کان آشنا ہیں۔ ان واقعات سے ہم نے یہ بات جانی ہے کہ ان احادیث میں مجازی معنی مراد نہیں۔ بلکہ وہ حقیقت ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

قال صلى الله عليه وسلم: "إذا أكل أحدكم فليأكل بيمينه، وإذا شرب فليشرب بيمينه" وقال صلى الله عليه وسلم: "لايأكل أحدكم بشماله، ولايشرب بشماله، فإن الشيطان يأكل بشماله، ويشرب بشماله" وقال صلى الله عليه وسلم: "إن الشيطان يَسْتَحِلُّ الطعام أن لايُذكر اسمُ الله عليه" وقال صلى الله عليه وسلم: "إذا أكل أحدكم، فنسي أن يذكر اسم الله على طعامه، فليقل: بسم الله أولَه وآخِرَه" وقال فيمن فعل ذلك: "مازال الشيطان يأكل معه، فلما ذَكراسمَ الله اسْتَقَاءَ مافي بطنه" وقال عليه السلام: "إن الشيطان يَحضر أحدَكم عند كل شيئ من شأنه، حتى يحضُرَه عند طعامه، فإذا سقطت من أحدكم اللقمةُ، فَلْيُمِطْ ماكان بها من أذى، ثم ليأكلْها، ولايدعْها للشيطان"

أقول: من العلم الذى أعطاه الله نبيّه: حالُ الملائكة والشياطين، وانتشارِهم فى الأرض: يتلقّى هؤلاء من الملأ الأعلى إلهاماتِ خيرٍ، فيُوْحونه إلى بني آدم؛ وينبجس من مزاج الشياطين آراءٌ فاسدة، تميل إلى إفساد النظامات الفاضلة، ومعصيةِ حكمِ الوقار، وما تقتضيه الطبيعة السليمة، فيفعلون ذلك، ويوحونه إلى أوليائهم من الإنس.

فمن حال الشياطين: أنهم إذا تمثلوا فى المنام أو اليقظة، تمثلوا بهيئات منكرة، تتنفر منها

الطبائع السلمية، كالأكل بالشمال، وكصورة الأجدع، ونحو ذلك.

ومنها: أنه قد تنطبع في نفوسهم هيئاتٌ دنية تنبجس في بني آدم من البهيمية، كالجوع والشبق، فإذا حدثت فيهم اندفعوا إلى اختلاطٍ بتلك الحاجات، وتَلَفُّعٍ بها، ومحاكاة ما يفعله الإنس عندها، ويتخيلون في ذلك قضاء تلك الشهوة، يقضون بذلك أوطارهم:

فيصير الولد الذي حصل من جماع اشترك فيه الشياطين، وقضوا عنده وطرهم: قليلَ البركة، مائلاً إلى الشيطنة، والطعام الذي باشروه، وقضوا به وطرهم: قليلَ البركة، لاينفع الناس بل ربما يضرهم؛ وذِكْرُ اسمِ الله والتعوذُ بالله مضادٌّ بالطبع لهم، ولذلك يَنْخَنِسُوْنَ عمن ذكر الله، وتعوَّذ به.

وقد اتفق لنا: أنه زارنا ذات يوم رجل من أصحابنا، فقربنا إليه شيئًا، فبينا يأكل إذ سقطت كِسرة من يده، وتَدَهْدَهَتْ في الأرض، فجعل يَتْبَعُها، وجعلت تَتَبَاعد عنه، حتى تعجَّب الحاضرون بعضَ العجب، وكَابَدَ هو في تتبعها بعضَ الجهد، ثم إنه أخذها فأكلها، فلما كان بعد أيام تَخَبَّطَ الشيطانُ إنساناً، وتكلم عن لسانه، فكان فيما تكلم: أني مررتُ بفلان وهو يأكل، فأعجبني ذلك الطعام، فلم يُطعمني منه شيئًا، فخطفتُه من يده، فنازعني حتى أخذه مني.

وبينا يأكل أهلُ بيتنا أصولَ الجَزَرِ، إذ تَدَهْدَهَ بعضُها، فوثب إليه إنسان، فأخذه وأكله، فأصابه وجع في صدره ومعدته، ثم تخبطه الشيطان، فأخبر على لسانه: أنه كان أخذ ذلك المُتَدَهْدَهَ.

وقد قرع أسماعَنا شيئ كثير من هذا النوع، حتى علمنا أن هذه الأحاديث ليست من باب إرادة المجاز، وإنما أُريد بها حقيقتُها، والله أعلم.

ضروری ترجمہ: اور از انجملہ: یہ ہے کہ ان کے نفوس میں چھپتی ہیں ایسی نکمی ہیئتیں جو انسانوں میں پھوٹتی ہیں بہیمیت سے، جیسے بھوک اور شدتِ شہوت۔ پس جب ان میں یہ ہیئتیں پیدا ہوتی ہیں، تو وہ دھکا دیئے جاتے ہیں ان حاجتوں کے ساتھ اختلاط کی طرف یعنی وہ اپنی حاجتیں پوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور ان حاجتوں کے ساتھ لپٹنے کی طرف (یہ پہلے جملہ کا مترادف ہے) اور اس چیز کی نقل اتارنے کی طرف جس کو انسان کرتے ہیں ان حاجات کے وقت۔ اور خیال کرتے ہیں وہ اس نقل اتارنے میں اس شہوت کو پورا کرنے کا۔ پورا کرتے ہیں وہ اس خیال کے ذریعہ اپنی حاجتوں کو۔

مکھی ڈُبانے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کے برتن میں مکھی گر جائے تو وہ پوری کو ڈبا دے، پھر اس کو پھینک دے۔ پس بیشک اس کے ایک پَر میں شفا، اور دوسرے میں بیماری ہے!'' (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۴۱۱۵) اور ابوداؤد کی روایت میں یہ اضافہ ہے: ''اور بیشک وہ بچاؤ کرتی ہے اپنے اس پَر سے جس میں بیماری ہے، پس ساری ہی ڈبو دو!'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۴۳)

تشریح: یہ حدیث کچھ لوگوں کو مستبعد معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ ایک غلط فہمی ہے۔ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ جس مشروب میں مکھی گر جائے اس کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ حالانکہ حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر کسی کا جی نہ چاہے تو نہ پیئے۔ البتہ پینا چاہے تو یہ عمل کرے، ورنہ ضرر کا اندیشہ ہے۔ اور ضرر یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے حیوانات میں بھی طبیعتِ مدبّرہ پیدا کی ہے۔ جو جسم کا نظام درست رکھتی ہے۔ چنانچہ حیوانات کی طبیعت بھی اس موذی مواد کو جو بدن کا جزء بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، بدن کے اندر سے اطراف کی طرف پھینکتی ہے۔ اسی وجہ سے اطباء حیوان کی دُم کھانے سے منع کرتے ہیں کہ اس میں فاسد مادّہ ہوتا ہے۔ اور مکھی بارہا خراب غذا کھاتی ہے، جو بدن کا جزء بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ پس اس کی طبیعت اس غذا کو اس کے خسیس ترین عضو جیسے پَر کی طرف پھینکتی ہے۔ پھر جب کوئی خطرہ کی بات پیش آتی ہے تو مکھی اپنے اس عضو کو دو وجہ سے پہلے جھونکتی ہے: ایک: اس وجہ سے کہ جس عضو میں زہریلا مادّہ ہوتا ہے اس میں کھجلی اٹھتی ہے، اور وہ خود بخود حرکت کرتا ہے۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ حکمتِ خداوندی نے زہر کے ساتھ تریاق بھی پیدا کیا ہے۔ سانپ کا مُہرہ اس کے سر میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تریاق کے ذریعہ حیوان کے جسم کی حفاظت کرتے ہیں، ورنہ سانپ اپنے زہر سے خود ہی مر جائے گا۔ اور یہ بحث اگر ہم طب کی رو سے لکھیں تو بات دور جا پڑے گی۔ بہر حال ہر حیوان اپنی قیمتی چیز کی حفاظت کرتا ہے۔ اور خطرہ کے وقت نکمّی چیز فدیہ میں پیش کرتا ہے۔

حاصلِ کلام: یہ ہے کہ تین باتیں معلوم و محسوس ہیں: اول: بعض موسموں میں اور بعض غذاؤں کے کھانے کے وقت مکھی کے کاٹنے کا زہر محسوس معلوم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مکھی میں زہر ہے۔ دوم: جس عضو میں تکلیف دہ مادہ اکٹھا ہوتا ہے اس میں تحریک پیدا ہوتی ہے۔ پھنسی بھرتی ہے تو کھجلی آتی ہے۔ سوم: طبیعت میں وہ چیز مخفی ہے جو موذی مادّہ کی مقاومت کرتی ہے یعنی زہر کے ساتھ تریاق بھی ہوتا ہے۔ جب یہ تینوں باتیں مسلّم ہیں تو پھر حدیث میں بیان شدہ حقیقت میں کیا استبعاد رہ جاتا ہے؟!

قال صلى الله عليه وسلم: " إذا وقع الذبابُ في إناء أحدكم فَلْيَغْمِسْه كلَّه، ثم لْيَطْرَحْه، فإن في أحد جناحيه شفاءً، وفي الآخر داء" وفي رواية:" فإنه يَتَّقِي بجناحه الذي فيه الداء"



اعلم: أن الله تعالى خلق الطبيعةَ في الحيوان مُدَبِّرةً لبدنه، فربما دفعتِ الموادُّ المؤذيةَ التي لاتصلح أن تصير جزءَ البدن، من أعماق البدن إلى أطرافه؛ ولذلك نهى الأطباءُ عن أكل أذناب الدواب؛ فالذباب كثيرًا ما يتناول أغذيةً فاسدة، لاتصلح جزءً للبدن، فتدفعها الطبيعةُ إلى أخس عضوٍ منه، كالجناح؛ ثم إن ذلك العضو لما فيه من المادة السُّمِّيَّة يندفع إلى الحَكِّ، ويكون أقدمَ أعضائه عند الهجوم في المضايق؛ ومن حكمة الله تعالى: أنه لم يجعل في شيئ سَمًّا إلا جعل فيه مادةً ترياقيةً، ليَحْفِظَ بها بِنْيةَ الحيوانِ، ولو ذكرنا هذا المبحث من الطب لطال الكلام.

وبالجملة: فَسَمُّ لَسْعِ الذباب في بعض الأزمنة، وعند تناول بعض الأغذية محسوسٌ معلومٌ؛ وتحرُّكُ العضو الذي تندفع إليه المادة اللذَّاعةُ معلوم؛ وأن الطبيعةَ تَخْتَبِئُ فيها ما يُقاوِم مثلَ هذه الموادِّ المؤذيةِ معلومٌ، فما الذي يُستبعد من هذا المبحث؟

ترجمہ: جان لیں کہ اللہ تعالیٰ نے حیوان میں طبیعت پیدا کی ہے جو اس کے بدن کی تدبیر کرنے والی ہے۔ پس کبھی طبیعت پھینکتی ہے اس موذی مواد کو جو جزِ بدن بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا: بدن کی گہرائیوں سے اس کے اطراف کی طرف۔ اور اسی وجہ سے اطباء نے چوپایوں کی دُمیں کھانے کی ممانعت کی ہے۔ پس مکھی بار ہا ایسی خراب غذائیں کھاتی ہے جو جزِ بدن بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ پس پھینکتی ہے ان غذاؤں کو طبیعت اس کے ذلیل ترین عضو کی طرف، جیسے پَر۔ پھر بیشک یہ عضو: (۱) بایں وجہ کہ اس میں زہریلا مادّہ ہے دھکا کھاتا ہے یعنی مجبور ہوتا ہے رگڑ کی طرف یعنی اس میں کھجلی اٹھتی ہے۔ اور ہوتا ہے وہ عضو اس کے اعضاء میں سے سب سے آگے تنگیوں میں اچانک پہنچنے کے وقت (اس عبارت میں دلیل مقدم اور دعوی مؤخر ہے) (۲) اور اللہ کی حکمت میں سے یہ بات ہے کہ نہیں بنایا انھوں نے کسی چیز میں زہر مگر اس میں مادّہ تریاقی بھی بنایا ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس مادّہ تریاقی کے ذریعہ حیوان کی باڈی کی حفاظت کریں۔ اور اگر ہم یہ بحث طب سے ذکر کریں تو کلام دراز ہوجائے گا۔

اور حاصل کلام: پس (۱) مکھی کے کاٹنے کا زہر بعض اوقات میں، اور بعض غذاؤں کے کھانے کے وقت: محسوس ومعلوم ہے (۲) اور اس عضو کا حرکت کرنا جس کی طرف دھکا کھاتا ہے بہت تکلیف دہ مادّہ: معلوم ہے (۳) اور یہ کہ طبیعت میں چھپی ہوئی ہوتی ہے وہ چیز جو اس موذی مادّہ کی مقاومت کرتی ہے: (یہ بات بھی) معلوم ہے۔ پس کیا چیز ہے جو اس بحث میں مستبعد سمجھی جائے؟!

تصحیح: لیحفظ: مطبوعہ میں لتحفظ تھا۔ اور تختبی مطبوعہ میں یختفی تھا۔ دونوں تصحیحات مخطوطہ کراچی سے کی ہیں۔

سادہ زندگی بہتر ہونے کی وجہ

حدیث ــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے نہ تو ٹیبل پر کھایا، نہ چھوٹی تشتری میں اور نہ آپؐ کے لئے چپاتی پکائی گئی (مشکوۃ حدیث ۴۱۶۹) اور حضرت انسؓ ہی کا بیان ہے کہ آپؐ نے سالم پکائی ہوئی بکری اپنی آنکھ سے نہیں دیکھی (مشکوۃ حدیث ۴۱۷۰) اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا (مشکوۃ حدیث ۴۱۶۸) اور حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے از بعثت تا وفات چھلنی نہیں دیکھی۔ اس زمانہ میں لوگ جَو کا آٹا بھی چھانے بغیر کھاتے تھے (مشکوۃ حدیث ۴۱۷۱)

تشریح: سادہ زندگی تین وجہ سے بہتر ہے:

پہلی وجہ: نبی ﷺ کی بعثت عرب میں ہوئی ہے۔ اور ان کی عادتیں اور طریقے معتدل تھے۔ وہ عجمیوں کا سا تکلف نہیں کرتے تھے۔ اس لئے وہی طریقہ اپنانا بہتر ہے۔

دوسری وجہ: معیشت (اسبابِ زندگی) میں تکلف دنیا میں انہماک اور اللہ کی یاد سے غافل کرتا ہے۔ اور اسبابِ غفلت سے احتراز ضروری ہے۔

تیسری وجہ: معمولی باتوں میں بھی ملت کے پیشوا کی پیروی ضروری ہے۔ اس سے بہتر کوئی بات نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو امت کے لئے عمدہ نمونہ بنایا ہے (سورۃ الاحزاب آیت ۲۱) اور خود آپؐ کا ارشاد ہے: خیر الهدٰی هدٰی محمد (ﷺ) بہترین سیرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت ہے۔ اور آپؐ سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پس ہر امتی کو بھی سادہ زندگی بسر کرنی چاہئے۔

مؤمن کے کم کھانے کی وجہ

حدیث ــــ ایک غیر مسلم رسول اللہ ﷺ کا مہمان ہوا۔ شام کو اس نے سات بکریوں کا دودھ پیا، تب اس کا پیٹ بھرا۔ صبح میں وہ مسلمان ہوگیا اور ایک بکری کا دودھ اس کے لئے کافی ہوگیا۔ دوسری بکری کا دودھ لایا گیا تو وہ اس کو پورا نہ پی سکا۔ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا: ''مؤمن ایک آنت کھاتا ہے۔ اور کافر سات آنتیں کھاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۷۳-۴۱۷۶-۴۱۷۶) یعنی مؤمن کم کھاتا ہے، اور کافر زیادہ!

تشریح: کافر پر پیٹ کی فکر سوار رہتی ہے، اور مؤمن پر آخرت کی۔ یعنی مؤمن کی پیٹ کی طرف سے بے توجہی قلتِ طعام کا سبب ہوتی ہے۔ اور مؤمن کے شایانِ شان بھی کم کھانا ہے۔ کیونکہ یہ ایمانی خصلت ہے۔ کھانے کی حرص کفر کی عادت ہے۔

دو کھجوریں ایک ساتھ کھانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے کہ آدمی دو کھجوریں ایک ساتھ کھائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے

ساتھیوں سے اجازت لیلے" (مشکوۃ حدیث ۴۱۸۸)

تشریح: دو کھجوریں ایک ساتھ کھانا چند وجوہ ممنوع ہے:

اول: دو کھجوریں ایک ساتھ اچھی طرح چبائی نہیں جاسکتیں۔ اور جب منہ میں دو گٹھلیاں جمع ہونگی تو ممکن ہے کوئی ایک تکلیف پہنچائے۔ کیونکہ منہ کے لئے دونوں پر کنٹرول کرنا دشوار ہوگا۔ اور ایک میں کوئی دشواری نہیں۔ منہ اس پر کنٹرول کرسکتا ہے۔

دوم: دو کھجوریں ایک ساتھ کھانا حرص وآز کی علامت ہے۔ جو مؤمن کی شان کے خلاف ہے۔

سوم: ساتھیوں کے ساتھ کھانے کی صورت میں جو دو کھجوریں ایک ساتھ کھاتا ہے وہ خود کو ساتھیوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار سمجھتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ ساتھیوں کو یہ بات ناگوار ہو۔ ممانعت کی یہ وجہ ساتھیوں سے اجازت لینے پر ختم ہوجاتی ہے۔

[۱] وما أكل رسول الله صلى الله عليه وسلم على خِوَانٍ، ولا في سُكُرُّجة، ولا خُبِزَ له مُرَقَّقٌ، ولا رأى شاةً سَمِيْطًا بعينه قط، ولا أكل متكئا، وما رأى مُنْخُلاً، كانوا يأكلون الشعيرَ غيرَ منخول.

اعلم: أن النبي صلى الله عليه وسلم بُعث في العرب، وعادتُهم أوسط العادات، ولم يكونوا يتكلّفون تكلفَ العجم، والأخذُ بها أحسن وأدنى أن لا يتعمقوا في الدنيا، ولا يُعرضوا عن ذكر الله.

وأيضًا: فلا أحسنَ لأصحاب الملة من أن يتبعوا سيرةَ إمامِها في كل نقير وقطمير.

[۲] قال صلى الله عليه وسلم: " إن المؤمن يأكل في معًى واحد، والكافر يأكل في سبعة أَمْعَاءَ"

أقول: معناه: أن الكافر همُّه بطنُه، والمؤمنَ همُّه آخرتُه؛ وأن الحَرِيَّ بالمؤمن أن يقلِّلَ الطعامَ؛ وأن تقليلَه خصلةٌ من خصال الإيمان، وأن شِرَّةَ الأكل خصلةٌ من خصال الكفر.

[۳] ونهى صلى الله عليه وسلم أن يَقْرِنَ الرجل بين تمرتَين.

أقول: النهي عن القِرَانِ يحتمل وجوها:

منها: أنه لايُحْسِنُ المضغَ عند جمع تمرتين، وأنه أدنى أن تُؤْذِيَه إحدى النواتين، لنقصان ضبطهما، بخلاف النواة الواحدة.

ومنها: أن ذلك هيئةٌ من هيئاتِ الشَّرَّةِ والحرص.

ترجمہ: واضح ہے۔ خِــوَان کے معنی ہیں چوکی، میز۔ دورِ اول میں خوش عیش لوگ زمین پر بیٹھ کر، کھانا چوکی پر اونچا رکھ کر کھاتے تھے تاکہ جھکنا نہ پڑے۔ میز کرسی پر کھانا بھی اسی حکم میں ہے۔ نبی ﷺ کی یہ سیرت نہیں۔ پس اس سے بچنا چاہئے۔

☆ ☆ ☆

گھر میں کھانے کی کوئی چیز رکھنے کی وجہ

حدیث(۱) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ گھر والے بھوکے نہیں جن کے پاس کھجوریں ہیں'' اور ایک روایت میں ہے: ''وہ گھر جس میں کھجوریں نہیں، وہ گھر والے بھوکے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۸۹)

حدیث(۲) —— رسول اللہ ﷺ نے گھر والوں سے سالن مانگا۔ انھوں نے جواب دیا: ہمارے پاس صرف سرکہ ہے۔ آپؐ نے وہ طلب فرمایا، اور اس سے کھانا شروع کیا، اور فرمایا: ''سرکہ بہترین سالن ہے! سرکہ بہترین سالن ہے!!'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۸۳)

تشریح: نظام خانہ داری میں یہ بات شامل ہے کہ گھر میں کوئی معمولی چیز جو بازار میں سستی ملتی ہو: ذخیرہ رکھنی چاہئے۔ جیسے مدینہ شریف میں کھجوریں اور ہمارے علاقہ میں گاجریں وغیرہ، تاکہ اگر بے وقت بھوک لگے اور گھر میں مطلوبہ کھانا ہو تو سبحان اللہ! ورنہ گھر میں اس موجود چیز سے ضرورت پوری کر لی جائے گی، اور گھر کی عزت رہ جائے گی۔ اگر لوگ اس بات کا اہتمام نہیں کریں گے تو وہ بھوک کے کنارے پر ہوں گے یعنی کسی بھی وقت ان کو بھوک ستائے گی ہے۔ اور یہی حال سالن کا ہے یعنی گھر میں کوئی لاون جیسے اچار وغیرہ رکھنا چاہئے، تاکہ بوقتِ ضرورت اس سے کام چلایا جا سکے۔

پیاز لہسن کھانے والوں کو دور کرنے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے لہسن یا پیاز کھائی ہے وہ ہم سے دور رہے'' یا فرمایا: ''ہماری مسجد سے دور رہے'' —— اور نبی ﷺ کی خدمت میں ایک ہانڈی لائی گئی، جس میں سبزی ترکاری تھی۔ آپؐ نے اس میں بو محسوس کی، تو خود نوش نہیں فرمائی، اور بعض صحابہ سے فرمایا: ''تم کھاؤ، میں اُس سے سرگوشی کرتا ہوں جس سے تم سرگوشی نہیں کرتے'' (مشکوۃ حدیث ۴۱۹۷)

تشریح: فرشتوں کو نظافت، خوشبو اور ہر وہ چیز پسند ہے جو پاکیزگی کا باعث ہے۔ اور ان کی اضداد سے نفرت ہے۔ اور مسجد میں اور نبی ﷺ کے پاس ملائکہ کا ہجوم رہتا ہے، اس لئے آپ نے پیاز لہسن کھانے والوں کو دور رہنے کا حکم دیا۔ البتہ کھانے کے معاملہ میں فرق کیا: اُن نیکوکاروں کے درمیان جن میں ملکیت کے انوار چمکتے ہیں، اور ان کے علاوہ کے درمیان۔ اول کو بدبودار چیزیں نہیں کھانی چاہئیں۔ عام لوگ کھا سکتے ہیں۔

کھانے کے بعد حمد پسند ہونے کی وجہ اور کھانے کے بعد کی دعائیں

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو بندے کی یہ بات پسند ہے کہ وہ ایک لقمہ بھی کھائے تو اللہ کی حمد کرے، اور ایک گھونٹ بھی پیئے تو اللہ کی حمد کرے'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۰۰)

تشریح: کھانے پینے کے بعد اللہ تعالیٰ کو حمد اس لئے پسند ہے کہ اس سے منعم حقیقی کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ اور ذہن

بارگاہِ عالی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تفصیل اس مبحث کے پہلے باب میں گذر چکی ہے —— اورروایات میں متعدد دعائیں وارد ہوئی ہیں۔ان میں سے جوبھی دعا پڑھے،سنت ادا ہوجائے گی۔

پہلی دعا: جب دسترخوان اٹھتا تھا تو نبی ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے: الحمد لله حمدًا كثيرًا طيّبًا مُبار كًا فيه، غيرَ مَكْفِيٍّ، ولا مُوَدَّعٍ، ولا مُستَغْنًى عنه، ربَّنا! سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ بہت زیادہ، پاکیزہ جس میں برکت کی گئی، نہ واپس کیا ہوا، اور نہ رخصت کیا ہوا، اور نہ اس سے بے نیاز ہوا ہوا، اے ہمارے پروردگار! (مشکوۃ حدیث ۴۱۹۹)

آخری تینوں جملوں کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس نعمت کے محتاج ہیں۔

دوسری دعا: جب نبی ﷺ کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے: الحمدلله الذى أطْعَمَنا وسَقَانا وجَعَلَنا مُسْلِمِيْنَ: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں کھلایا، اور ہمیں پلایا، اور ہمیں مسلمان بنایا (مشکوۃ حدیث ۴۲۰۴)

تیسری دعا: جب نبی ﷺ کھاتے یا پیتے تو کہتے: الحمدلله الذى أطْعَمَ، وسَقى، وَسَوَّغَهُ، وجعل له مخرجا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے کھلایا، اور پلایا۔ اور اس کو خوشگوار بنایا، اور اس کے نکلنے کے لئے راہ بنائی (مشکوۃ حدیث ۴۲۰۷)

مہمانی کی اہمیت اور اس کے درجات قائم کرنے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے: چاہئے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ مہمان کا انعام یک شبانہ روز ہے۔ اور مہمان تین دن ہے۔ اور اس کے بعد جو ہے وہ خیرات ہے۔ اور مہمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ میزبان کے پاس یہاں تک ٹھہرے کہ اس کو تنگی میں ڈالدے“ (مشکوۃ حدیث ۴۲۴۴)

تشریح: مہمان نوازی فیاضی کے قبیل سے ہے۔ جو چار اہم صفات میں سے ایک ہے۔ اس سے ملک وملت کی شیرازہ بندی ہوتی ہے یعنی لوگ ایک دوسرے سے جڑتے ہیں، اور ان میں باہم محبت ومودت پیدا ہوتی ہے۔ اور مسافروں کو پریشانی سے نجات ملتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مہمان نوازی کو زکوۃ کی طرح لازمی حکم قرار دیا جائے، اس کی ترغیب دی جائے، اور اس پر ابھارا جائے۔ چنانچہ فرمایا: مؤمن پر مہمان کا اکرام لازم ہے۔

پھر ضیافت کا اندازہ ٹھہرانا ضروری ہے۔ تاکہ مہمان: میزبان کو تنگی میں نہ ڈالے۔ اور میزبان ناکافی مہمانی کو کافی نہ سمجھ لے۔ چنانچہ ضیافت کا اندازہ یک شبانہ روز ٹھہرایا۔ اور اسی کو مہمان کا اکرام وانعام قرار دیا۔ اور ضیافت کی آخری مدت تین دن مقرر کی۔ اور اس کے بعد کو خیرات قرار دیا۔

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: "لا يَجُوْعُ أهلُ بيتٍ عندهم التمر" وقال صلى الله عليه وسلم: "بيتٌ لا تمر فيه: جِيَاعٌ أهلُه" وقال عليه السلام: " نِعم الإدام الخَلُّ!"

أقول: من تدبير المنزل: أن يَدَّخِرَ في بيته شيئًا تافهًا، يجده رخيصًا في السوق، كالتمر في المدينة، وأصول الجَزَر ونحوها في سواد بلادنا؛ فإن وجد طعامًا يشتهيه فبها، وإلا كان الذي عنده كفافًا لهم وسترًا، فإن لم يفعلوا ذلك كانوا على شَرَفِ الجوع؛ وكذلك حالُ الإدام.

[٥] قال صلى الله عليه وسلم: "من أكل ثوما أو بصلاً فَلْيَعْتَزِلْنَا" وأُتي بِقدر فيه خَضِرَاتٌ لها رائحة، فقال لبعض أصحابه: "كل فإني أُناجي من لاتناجي"

أقول: الملائكة تحب من الناس النظافةَ والطيبَ، وكلَّ شيئ يُهَيِّجُ خُلُقَ التنظيف، وتتنفَّرُ من أضداد ذلك؛ وفَرَّقَ النبي صلى الله عليه وسلم بين ماكان هو شريعةُ المحسنين، المُتَلَعْلَعُ فيهم أنوارُ الملكية، وبين غيرهم.

[٦] قال صلى الله عليه وسلم: "إن الله يرضى من العبد: أن يأكل الأُكلة، فيحمده عليها؛ ويشرب الشربة فيحمده عليها" وقد مر سره. وقد رُوي من الحمد صِيَغٌ أيَّها فعل فقد أدى السنة:

منها: الحمدلله حمدًا كثيرًا طيبا مباركًا فيه، غير مَكْفِيٍّ، ولا مُوَدَّعٍ، ولا مُسْتَغْنًى عنه رَبَّنَا.

ومنها: الحمدلله الذي أطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمين.

ومنها: الحمدلله الذي أطعم وسقى، وَسَوَّغَه، وجعل له مخرجًا.

[٧] ولما كانت الضيافة بابًا من أبواب السماحة، وسببًا لجمع شمل المدينة والملة، مؤديًا إلى تودُّد الناس، وأن لايتضرَّرَ أبناءُ السبيل: وجب أن تُعَدَّ من الزكاة، ويرغَّب فيها، ويُحَثَّ عليها: قال صلى الله عليه وسلم: "من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلْيُكرم ضيفَه"

ثم مست الحاجة إلى تقدير مدة الضيافة، لئلا يُحَرِّجَ الضيفُ، أو يَعُدَّ القليلَ منها كثيرًا؛ فقدَّر الإكرامَ بيوم وليلة، وهو الجائزة؛ وجعل آخِرَ الضيافة ثلاثةَ أيام، ثم بعد ذلك صدقة.

ترجمہ: (۴) نظام خانہ داری سے ہے کہ آدمی ذخیرہ رکھے اپنے گھر میں کسی معمولی چیز کا، جس کو وہ بازار میں سستا پاتا ہے۔ جیسے مدینہ میں کھجور اور ہمارے دیار میں گاجر وغیرہ۔ پس اگر آدمی نے پایا کسی ایسے کھانے کو جس کو اس کا دل چاہتا ہے تو کیا کہنے! ورنہ ہوگی وہ چیز جو اس کے پاس ہے بقدر ضرورت روزی گھر والوں کے لئے، اور ان کے لئے پردہ! پس اگر وہ یہ کام نہیں کریں گے تو وہ بھوک کے کنارے پر ہوں گے۔ اور یہی معاملہ لاون کا ہے —— (۵) فرشتے لوگوں سے پسند کرتے ہیں نظافت اور خوشبو، اور ہر وہ چیز جو صفتِ طہارت کو ابھارتی ہے۔ اور ان کی اضداد سے نفرت کرتے ہیں۔ اور آپؐ نے جدائی کی اس چیز کے درمیان جو کہ وہ اُن نیکوکاروں کا طریقہ ہے، جن میں ملکیت کے انوار چمک گئے ہیں اور ان کے علاوہ

کے درمیان ـــــ (۷) اور جب ضیافت سماحت کے ابواب میں سے ایک باب تھی، اور ملک وملت کے متفرق کو اکٹھا کرنے کا سبب تھی، پہنچانے والی تھی لوگوں کے باہم محبت کرنے کی طرف، اور اس بات کی طرف کہ مسافر ضرر نہ اٹھائیں تو ضروری ہوا کہ مہمانی کو زکوٰۃ میں شمار کیا جائے۔ اور اس کی ترغیب دی جائے۔ اور اس پر ابھارا جائے...... پھر ضرورت پیش آئی مدتِ ضیافت کی تقدیر کی، تاکہ مہمان تنگ نہ کرے، یا میزبان تھوڑی مہمانی کو زیادہ شمار نہ کرے۔ پس یک شبانہ روز سے اکرام کا اندازہ مقرر کیا۔ اور وہی انعام ہے۔ اور ضیافت کی انتہائی مدت تین دن مقرر کی۔ پھر اس کے بعد خیرات ہے۔

☆ ☆ ☆

مطلقاً حرمتِ خمر کی وجہ

نشہ آور چیز کھا کر یا پی کر عقل کا ناس کرنا: عقل کے نزدیک قطعی بُرا کام ہے۔ کیونکہ اس میں بڑے بڑے مفاسد ہیں۔ مثلاً: ۱- نشہ کرنے سے نفس بہیمیت کے گہرے کھڈ میں گر جاتا ہے۔ ۲- ملکیت سے انتہائی دوری ہو جاتی ہے۔ ۳- اس میں اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عقل کا جوہر دیا ہے، اور اس کے ذریعہ ان پر احسان کیا ہے۔ اور نشہ کرنے سے عقل خراب ہوتی ہے۔ ۴- نشہ کرنے سے گھریلو اور ملکی جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں۔ ۵- شراب نوشی میں مال کا ضیاع ہے۔ ۶- شراب پی کر ایسی بُری حالت ہو جاتی ہے کہ بچے بھی شرابی پر ہنستے ہیں۔ اور یہ سب مفاسد صراحۃً یا اشارۃً اس ارشاد پاک میں جمع ہیں: ''شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی اور عداوت پیدا کرے'' (سورۃ المائدۃ آیت ۹۱)

مذکورہ مفاسد کی وجہ سے تمام ملتیں اور دَھرم نشہ کرنے کی برائی پر بیک زبان متفق ہیں۔ البتہ کچھ بے بصیرت لوگ خیال کرتے ہیں کہ شراب اچھی چیز ہے، اس سے بدن کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ خیال طبّی اور عملی احکام میں اشتباہ واقع ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور برحق بات یہ ہے کہ یہ دونوں احکام مختلف ہیں۔ مگر بارہا ان میں کھینچا تانی اور نزاع پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً:

۱ــــ قتال: طب کی رو سے حرام ہے۔ کیونکہ اس میں جسم کی ہلاکت ہے۔ اور طب کی رُو سے جسم کی حفاظت ضروری ہے۔ اور عملی طور پر قتال اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جب اس میں ملک کا مفاد یا کوئی ذاتی مصلحت ہو، جیسے سخت عار کو ہٹانا۔

۲ــــ اور جماع: طبی نقطۂ نظر سے اس وقت ضروری ہو جاتا ہے جب ہیجانی کیفیت پیدا ہو، اور جماع نہ کرنے سے ضرر کا اندیشہ ہو۔ اور عملی طور پر اگر جماع کرنا عار کی بات ہو، جیسے بیوی سے لوگوں کے روبرو ہم بستر ہونا، یا اس میں راہِ ہدایت کی خلاف ورزی ہو تو حرام ہے۔

نوٹ: پہلی مثال میں طب کا حکم منفی اور عمل کا مثبت ہے۔ اور دوسری مثال میں اس کے برعکس ہے۔

اور ہر ملت اور ہر زمانہ کے لوگ مصلحتِ عملی کو طبی احکام پر مقدم رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو مصلحت کا خیال نہیں کرتا،

اوراس کی پابندی نہیں کرتا، اورطب کی طرف دیکھتا ہے: وہ شخص بدکار، بے باک، برااور قبیح ہے۔ اوراس معاملہ میں لوگوں میں کچھ اختلاف نہیں۔ اور مصلحت عملی کو ترجیح دینے کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد پاک سے دی ہے: ''لوگ آپ سے شراب اور قمار کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ بتلادیں کہ دونوں میں بھاری گناہ ہے، اورلوگوں کے لئے کچھ منافع ہیں۔ اوران کا گناہ ان کے نفع سے بھاری ہے'' (سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۹) چنانچہ اسی بھاری گناہ کی وجہ سے بعد میں یہ دونوں چیزیں حرام کی گئیں۔ اوران کے فوائد کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔

البتہ اس میں اہل الرائے مختلف ہیں کہ نشہ آور چیز کی اتنی مقدار کھانا پینا کہ نشہ نہ چڑھے، اور خرابیاں نہ پیدا ہوں، اور جسم کو توانائی مل جائے: جائز ہے یا نہیں؟ کچھ لوگ اس کے جواز کے قائل ہیں۔ مگر شریعتِ اسلامیہ نے ـــــ جو ملت کے انتظام، فساد کے سدّباب اور تحریف کے احتمال کو ختم کرنے میں آخری درجہ کی چیز ہے ـــــ تین باتیں ملحوظ رکھی ہیں۔

۱۔ شراب کی تھوڑی مقدار زیادہ کی دعوت دیتی ہے یعنی آدمی تھوڑے پر صبر نہیں کرتا، پیتا ہی چلا جاتا ہے۔

۲ ـــــ شراب کو مطلقاً حرام کئے بغیر مفاسد کا سدّباب ممکن نہیں ـــــ اور اہل یورپ کے احوال ان دونوں باتوں کی شہادت کے لئے کافی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو فرزانہ خیال کرتے ہیں۔ اور شراب کی تھوڑی مقدار کو جائز کہتے ہیں۔ مگر جب وہ شراب خانہ میں جاتے ہیں تو دُھت ہو کر نکلتے ہیں۔ اور ہرنا کردنی کرتے ہیں۔

۳ ـــــ شراب نوشی کا دروازہ اگر ذرا بھی کھلا رکھا جائے گا تو ملت کی تنظیم قطعاً ناممکن ہو جائے گی۔ کسی کی بھی اس جرم کی وجہ سے گرفت نہیں کی جاسکے گی۔ اس لئے شریعتِ مطہرہ نے خمر کی نوع ہی کو ـــــ خواہ قلیل مقدار ہو یا کثیر ـــــ حرام قرار دیا۔ اور مطلقاً خمر کی حرمت نازل فرمائی۔

واعلم: أن إزالة العقل بتناول المسكر: يَحْكُمُ العقلُ بقبحه لامحالةَ، إذ فيه تَرَدِّى النفسِ في ورطة البهيمية، والتبعُّدُ من الملكية في الغاية، وتغييرُ خلق الله: حيث أفسد عقلَه الذى خص الله به نوعَ الإنسان، ومنَّ به عليهم، وإفسادُ المصلحة المنزلية والمدنية، وإضاعة المال، والتعرضُ لهيئات منكرة يَضْحَكُ منها الصبيان، وقد جمع الله تعالى كلَّ هذه المعانى ـــ تصريحًا أو تلويحًا ـــ في هذه الآية: ﴿إِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ﴾ الآية.

ولذلك اتفق جميعُ الملل والنِّحل على قبحه بالمَرَّة، وليس الأمر كما يظُنُّه من لابصيرةَ له: من أنه حَسَنٌ بالنظر إلى الحكمة العملية، لِمَا فيه من تقوية الطبيعة، فإن هذا الظن من باب اشتباه الحكمة الطبية بالحكمة العملية. والحق: أنهما متغايرتان، وكثيرًا مَا يقع بينهما تجاذب وتنازع: كالقتال: يحرِّمه الطبُّ، لما فيه من التعرُّض لفكِّ البنية الإنسانية، الواجب حفظُها في الطب، وربما أوجبته الحكمة العملية إذا كان فيه صلاحُ المدينة، أو دفعُ عارٍ

شديد؛ وكالجماع: يوجبه الطب عند التوقان، وخوفِ التأذى من تركه، وربما حَرَّمته الحكمة العملية إذا كان فيه عارٌ، أو منا بذةُ سنةٍ راشدة.

وأهل الرأى من كل ملة وكل قرن يذهبون إلى ترجيح المصلحة على الطب، ويرون من لايتحراها ولا يتقيد بها — ميلاً إلى صحة الجسم — فاسقا ماجنا مذموما مقبوحًا، لااختلاف لهم فى ذلك، وقد علّمنا الله تعالى ذلك حيث قال: ﴿فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا﴾

نعم تناولُ المسكر إذا لم يبلغ حدَّ الإسكار، ولم تترتب عليه المفاسد: يختلف فيه أهل الرأى؛ والشريعةُ القويمة المحمديةُ — التى هى الغاية فى سياسة الأمة، وسد الذرائع، وقطع احتمال التحريف — نظرتْ إلى أن قليل الخمر يدعو إلى كثيرها، وأن النهى عن المفاسد من غير أن يُنهى عن ذات الخمر لا يَنْجَعُ فيهم، وكفى شاهدًا على ذلك ماكان فى المجوس وغيرهم، وأنه إن فُتح بابُ الرخصة فى بعضها، لم تنتظم السياسة الملية أصلاً، فنزل التحريم إلى نوع الخمر قليلها وكثيرها.

ترجمہ: اور جان لیں کہ نشہ آور چیز کھانے کے ذریعہ عقل کو زائل کرنا: عقل اس کی قطعی برائی کا فیصلہ کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں نفس کا بہیمیت کے گہرے گھڑے میں گرنا ہے۔ اور اس میں ملکیت سے انتہائی درجہ دوری ہے۔ اور اس میں اللہ کی بناوٹ کو بدلنا ہے، بایں طور کہ اس نے خراب کرلی وہ عقل جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو خاص کیا ہے۔ اور جس کے ذریعہ انسانوں پر احسان کیا ہے۔ اور اس میں گھریلو اور ملکی مصلحت کو بگاڑنا ہے۔ اور مال ضائع کرنا ہے۔ اور ایسی مکروہ ہیئتوں کے درپے ہونا ہے جس سے بچے بھی ہنستے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام باتوں کو — صراحۃً یا اشارۃً — اس آیت میں جمع کیا ہے۔

اور اسی وجہ سے تمام ملتوں اور دھرموں نے اُس کی برائی پر بیک زبان اتفاق کیا ہے۔ اور نہیں ہے معاملہ جیسا گمان کرتا ہے وہ شخص جس میں بصیرت کا فقدان ہے یعنی یہ بات کہ شراب اچھی چیز ہے حکمتِ عملیہ کی طرف نظر کرتے ہوئے: اس لئے کہ اس سے طبیعت کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ پس بیشک یہ خیال حکمتِ طبیہ اور حکمتِ عملیہ میں اشتباہ واقع ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے — اور برحق بات یہ ہے کہ وہ دونوں جداگانہ ہیں۔ اور بارہا دونوں کے درمیان کھینچا تانی اور جھگڑا واقع ہوتا ہے — جیسے قتال: طب اس کو حرام قرار دیتی ہے: بایں وجہ کہ اس میں انسانی ڈھانچہ کو کھولنے کے درپے ہونا ہے، جس کی حفاظت طب میں ضروری ہے۔ اور کبھی قتال کو حکمتِ عملیہ ضروری قرار دیتی ہے۔ جب قتال میں ملک کی مصلحت ہو یا کسی سخت عار کو ہٹانا ہو — اور جیسے جماع: طب اس کو واجب کرتی ہے شہوت میں ہیجان کے وقت، اور جماع نہ کرنے سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہونے کی صورت میں۔ اور کبھی حکمتِ عملیہ اس کو حرام قرار دیتی ہے جب اس میں عار ہو، یا راہِ ہدایت کو پس پشت ڈالنا ہو — اور ہر ملت اور ہر قرن کے اہل الرائے جاتے ہیں مصلحت کو طب پر ترجیح دینے کی طرف۔ اور دیکھتے ہیں وہ

اس شخص کو جو مصلحت کو نہیں سوچتا، اور اس کی پابندی نہیں کرتا ــــ جسم کی صحت کی طرف مائل ہونے کے طور پر ــــ بدکار، بے باک، بُرا اور قبیح۔ ان میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور ہمیں یہ باتیں اللہ تعالیٰ نے سکھلائی ہیں بایں طور کہ فرمایا ــــ ہاں نشہ آور کو کھانا جبکہ وہ نشہ کرنے کی حد تک نہ پہنچے، اور اس پر خرابیاں مرتب نہ ہوں: اس میں اہل الرائے مختلف ہیں۔ اور شریعتِ مستقیمہ محمدیہ نے ــ جوامت کے انتظام اور سدِّ ذرائع اور تحریف کے احتمال کو ختم کرنے میں آخری درجہ کی چیز ہے ــــ اس طرف دیکھا کہ (۱) شراب کی تھوڑی مقدار زیادہ کی دعوت دیتی ہے (۲) اور یہ کہ مفاسد سے روکنا اس کے بغیر کہ شراب کی ذات سے روکا جائے لوگوں کے لئے سودمند نہیں (دونوں باتوں کی دلیل:) اور اس سلسلہ میں شہادت کے لئے کافی ہے وہ بات جو مجوس وغیرہ میں تھی (۳) اور یہ بات کہ اگر کچھ شراب کی اجازت کا دروازہ کھول دیا جائے گا تو قطعاً ملّی سیاست منظم نہیں ہوگی۔ پس اتری تحریم: خمر کی نوع کی طرف اس کے قلیل اور اس کے کثیر کی طرف۔

حکمتِ عملیہ: جن موجودات کو وجود پذیر کرنا ہماری قدرت اور اختیار میں ہے، ان کے واقعی احوال کو اس حیثیت سے جاننا کہ ان پر عمل کرنے سے ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے: حکمتِ عملیہ ہے۔ جیسے اعمالِ شرعیہ نماز، روزہ وغیرہ بجالانا اور اعمالِ حسنہ وسیئہ کو پہچاننا اور ان پر عمل پیرا ہونا (معین الفلسفہ ص ۳۱) اور حکمتِ طبّیہ سے مراد علم طب ہے۔

☆ ☆ ☆

شراب میں مدد کرنا باعثِ لعنت ہے

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی شراب پر، شراب پینے والے پر، شراب پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدار پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے نچڑوانے والے پر، اس کے اٹھانے والے پر، اور جس کے لئے وہ اٹھائی گئی'' (مشکوٰۃ حدیث ۲۷۷۷ کتاب البیوع، باب الکسب)

تشریح: جب شریعت کی مصلحت شراب کو حرام کرنے اور اس کو گمنام کرنے میں ہے، اور اس بارے میں فیصلہ نازل ہوگیا تو اب ضروری ہے کہ ہر اس چیز سے روکا جائے جو اس کے معاملہ کو بڑھائے، لوگوں میں اس کو رواج دے، اور لوگوں کو اس پر ابھارے۔ کیونکہ اس سلسلہ میں ذراسی بھی حصہ داری مصلحتِ شرعی کے مناقض اور حکم شرعی کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ چنانچہ مذکورہ حدیث میں ایسے تمام حصہ داروں پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار بھیجی گئی ہے۔

انگوری شراب ہی نہیں، ہر شراب حرام ہے

نبی ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بہت سی حدیثیں، اتنی سندوں سے جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا، مختلف الفاظ سے مروی ہیں۔ اور یہ احادیث درجۂ شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ان میں سے چند روایات یہ ہیں:

(الف) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''خمر ان دودرختوں سے ہے یعنی کھجور اور انگور'' (مشکوۃ ۳۶۳۴ کتاب الحدود، باب بیان الخمر)

(ب) اور شہد، مکئی وغیرہ کی شرابوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''ہر وہ شراب جو نشہ کرے حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۷)

(ج) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر نشہ آور خمر ہے، اور ہر نشہ آور حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۸)

(د) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شراب کی زیادہ مقدار نشہ کرے، اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۵)

(ھ) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شراب کا ایک فَرَق (دس لیٹر) نشہ کرے، اس کا ایک چلّو بھی حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۶)

(و) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطابِ عام میں فرمایا: جب خمر کی حرمت نازل ہوئی تو پانچ چیزوں کی شرابیں رائج تھیں: انگور، کھجور، گیہوں، جَو اور شہد کی (اور ان میں انحصار نہیں) خمر: ہر وہ شراب ہے جو عقل کو مختل کردے (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۵)

(ز) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب خمر حرام کی گئی تو انگوری شراب کا وجود بہت کم تھا۔ اکثر شرابیں کھجور اور چھوہاروں کی تھیں (مشکوۃ حدیث ۳۶۳۶)

(ح) جب خمر کی حرمت نازل ہوئی تو گدرّ (کچی) کھجور کی شراب کے مٹکے توڑ دیئے گئے (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۹)

تشریح: جب گذشتہ بحث سے یہ بات متعین ہوگئی کہ قانون سازی کے قواعد کا مقتضی یہ ہے کہ ہر شراب کو حرام قرار دیا جائے۔ پس انگوری شراب کی تخصیص کے کوئی معنی نہیں۔ حرمت کی علت: شراب کا عقل کو مختل کرنا ہے۔ اور یہ بات ہر شراب میں پائی جاتی ہے۔ اور ہر شراب کا تھوڑا زیادہ کی دعوت دیتا ہے۔ پس اس کا قائل ہونا واجب ہے۔ اور آج کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ غیر انگوری شراب کو حلال قرار دے، یا نشہ سے کم مقدار استعمال کرے۔

اور بعض صحابہ وتابعین سے جو غیر انگوری شراب کی تھوڑی مقدار پینا مروی ہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو روایات نہیں پہنچی تھیں، پس وہ معذور تھے۔ مگر اب جبکہ احادیث عام ہوگئیں، اور معاملہ روز روشن کی طرح واضح ہوگیا۔ اور یہ حدیث بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ'' کچھ لوگ میری امت میں سے شراب پئیں گے: وہ اس کا نام کچھ اور رکھ لیں گے'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۹۲) تو اب کوئی عذر باقی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اور سب مسلمانوں کی ہر شراب سے حفاظت فرمائیں (آمین)

فائدہ: حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی یہ شرح احناف کے بعض اقوال کی طرف مشیر ہے۔ مگر احناف کے یہاں فتوی امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر ہے کہ ہر شراب اور اس کی ہر مقدار حرام ہے۔ درمختار (۵: ۳۲۳) میں ہے (وحَرَّمها محمد) أی الأشربة المتخذة من العسل والتین ونحوهما (مطلقًا) قلیلها وکثیرها (وبه یفتی) ذکر الزیلعی وغیره،

واختاره شارح الوهبانيةاور شامی میں دیگر بہت سے فقہاء کی تائیدات مذکور ہیں۔

البتہ احناف نے حد وغیرہ احکام میں انگوری اور دوسری شرابوں میں فرق کیا ہے۔اس کی تفصیل گذشتہ مبحث میں ''حدود'' کے بیان میں گذر چکی ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" لعن الله الخَمْرَ، وشاربَها، وساقيها، وبائعها، ومبتاعها، وعاصرها، ومُعتصرها، وحاملَها، والمحمولةَ إليه"

أقول: لـمـا تـعينت المصلحة في تحريم شيئ وإخماله، ونزل القضاءُ بذلك: وجب أن يُنهى عن كل ما يُنَوِّهُ أمرَه، ويروِّجه في الناس، ويحمِلُهم عليه، فإن ذلك مناقضةٌ للمصلحة، ومناوَأةٌ بالشرع.

وقـد استفـاض عن النبي صلى الله عليه وسلم وأصحابه رضي الله عنهم أحاديثُ كثيرة، من طرق لاتحصى وعباراتٍ مختلفة، فقال:

[الف] الخمر من هاتين الشجرتين: النخلةِ والعنبةِ.

[ب] وأجـاب صـلـى الله عـلـيـه وسـلـم مَن سأل عن البِتْع والمِزْر وغيرِهما، فقال:" كل شرابٍ أسكر فهو حرام"

[ج] وقال عليه السلام:" كل مسكر خمر، وكل مسكر حرام"

[د] و"ما أسكر كثيره فقليله حرام"

[هـ] و" ما أسكر منه الفَرَقُ فملءُ الكف منه حرام"

[ر] وقـال مَـن شـاهـد نـزولَ الآية: إنـه قـد نزل تحريم الخمر، وهي من خمسة أشياء: العنب، والتمر، والحنطة، والشعير، والعسل: والخمر ماخامر العقل.

[ز] وقال: لقد حرمت الخمر حين حرمت، وما نجد خَمْرَ الأعنابِ إلا قليلا، وعامةُ خَمْرِنا البُسر والتمر.

[ح] وكَسَرُوا دِنَانَ الفضيخ حين نزلت.

وهـو الـذي يقتضيه قوانين التشريع، فإنه لامعنى لخصوصية العنب، وإنما المؤثر في التحريم: كـونـهُ مُـزيـلا للعقل، يدعو قليله إلى كثيره، فيجب به القول، ولا يجوز لأحد اليومَ أن يذهب إلى تحليل ما اتُّخِذَ من غير العنب، واستعملَ أقلَّ من حد الإسكار.

نـعـم كان ناس من الصحابة والتابعين لم يبلغهم الحديث في أول الأمر فكانوا معذورين، ولما استفـاض الـحـديـثُ، وظهـر الأمـر، ولاكـرابـعة النهار، وصَحَّ حديثُ:" ليشر بنَّ ناسٌ من أمتي الخمر، يسمونها بغير اسمها" لم يبق عذر! أعاذنا الله تعالى والمسلمين من ذلك.

لغات: نَاوَاہ: دشمنی کرنا......**قولہ: وقال من شاھد إلخ** اوراس نے کہا جس نے آیت کا نزول دیکھا ہے یعنی (د) اور (ز) صحابہ کے اقوال ہیں......**قولہ: وھو الذی إلخ** ترجمہ: اور یہی وہ بات ہے جس کو قانون سازی کے قواعد چاہتے ہیں۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ کوئی وجہ نہیں انگور کی تخصیص کی۔ اور تحریم میں مؤثر یعنی علت اس کا ایسا عقل کو زائل کرنے والا ہونا ہے جس کا تھوڑا اس کے زیادہ کی دعوت دیتا ہے۔ پس واجب ہے اس کا قائل ہونا۔ اور آج کسی کے لئے بھی جائز نہیں کہ وہ اس شراب کی تحلیل کی طرف جائے جو انگور کے علاوہ سے بنائی گئی ہے۔ اور استعمال کرے وہ نشہ کرنے کی حد سے کم تر ......**قولہ: ولا کرابعة النھار**: اس کا ظہور چوتھائی دن کے ظہور کی طرح نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ چوتھائی دن چاشت کا وقت ہے، اس وقت دن جتنا روشن ہوتا ہے، اس سے بھی زیادہ واضح۔

☆ ☆ ☆

شراب کو سرکہ بنانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث (۱) ـــــ رسول اللہ ﷺ سے شراب کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اس کا سرکہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۱)

حدیث (۲) ـــــ حضرت طارق بن سُوید رضی اللہ عنہ نے شراب کے بارے میں دریافت کیا؟ آپؐ نے ان کو منع کیا۔ انھوں نے عرض کیا: میں اس کو دواء کے لئے بناتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ دوا نہیں، بیماری ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۲) یہ حدیث اس موقع کی نہیں ہے۔ مسئلہ شراب کو سرکہ بنانے کا ہے۔ اور یہ حدیث شراب بنانے کے بارے میں ہے۔ جس کی بالاتفاق اجازت نہیں۔

تشریح: لوگ شراب کے دلدادہ تھے۔ شراب پینے کے لئے طرح طرح کے حیلے تلاش کرتے تھے۔ پس تحریم خمر کی مصلحت اسی وقت تکمیل پذیر ہوسکتی ہے جب ہر حال میں شراب کی ممانعت کردی جائے۔ کسی جائز مقصد سے بھی گھر میں شراب رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تا کہ کسی کے لئے عذر باقی رہے نہ بہانہ! یعنی سرکہ بنانے کی ممانعت سدّ ذرائع کے طور پر ہے۔

فائدہ: یہ مسئلہ ائمہ میں مختلف فیہ ہے: امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک شراب کو سرکہ بنانا جائز نہیں۔ اگر بنائے گا تو سرکہ حرام ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک سرکہ بنانا تو جائز نہیں۔ لیکن اگر بنائے گا تو اس کا استعمال درست ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک شراب میں نمک وغیرہ ڈال کر سرکہ بنانا جائز نہیں، البتہ جگہ بدل دے، مثلاً دھوپ میں رکھ دے اور سرکہ بن جائے تو اس کا استعمال درست ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقاً سرکہ بنانا جائز ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممانعت ایک وقتی مصلحت تھی۔ جس وقت شراب حرام کی گئی تھی اس وقت کسی بھی مصلحت سے شراب رکھنے کی اجازت دی جاتی تو شراب زندگیوں سے دور نہ ہوتی۔ اور اس کی نظیر: شراب کے برتنوں کی ممانعت ہے جو بعد میں اٹھادی گئی تھی (مشکوۃ

حدیث ۴۲۹۱) اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی دلیل حدیث خیرُ خلّکم خلُّ خمرِکم، اور حضرت علی، حضرت ابوالدرداء، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حضرت عطاء بن ابی رباح وغیرہم کے فتاوی ہیں۔ تفصیل اعلاء السنن (۱۸: ۴۱) میں ہے۔

مختلف میوے ملا کر نبیذ بنانے کی ممانعت کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے چھوہارے اور گدر (نیم پختہ) کھجوریں ملا کر، اور کشمش اور چھوہارے ملا کر، اور رنگ دار کھجور (جو پکنے کے قریب ہوتی ہے) اور تازہ پکی ہوئی کھجوریں ملا کر نبیذ بنانے کی ممانعت فرمائی۔ اور ارشاد فرمایا: اِنتَبِذُوا کلَّ واحدٍ علی حِدَةٍ: ہر ایک کی الگ الگ نبیذ بناؤ (مشکوۃ حدیث ۳۶۴۰)

تشریح: نبیذ کے معنی ہیں: پانی میں کوئی میوہ وغیرہ ڈال کر چھوڑ دینا، یہاں تک کہ پانی میں مٹھاس پیدا ہوجائے۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں میوے پانی میں بھگوئے جاتے تھے۔ جب وہ گل جاتے اور پانی شیریں ہوجاتا تو استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یہ بالاتفاق جائز ہے۔ مگر اس میں احتیاط ضروری ہے۔ کیونکہ نبیذ میں جب جوش آئے گا شراب بن جائے گی۔ اسی لئے بند مسامات والے برتنوں میں نبیذ بنانے کی ممانعت کی، اور چمڑے کے مشکیزوں میں بنانے کی ہدایت فرمائی (مشکوۃ حدیث ۴۲۹۰) کیونکہ چمڑے میں مسامات ہوتے ہیں، اس لئے جلدی جوش پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر پیدا ہو تو مشکیزہ پھولے گا، اور پتہ چل جائے گا۔ اسی طرح مختلف میوں کو ملا کر نبیذ بنانے کی ممانعت بھی احتیاطاً ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

جب نبیذ شراب کے مرحلہ میں داخل ہوتی ہے تو اس میں جوش آتا ہے، اور اس کا مزہ بدل جاتا ہے یعنی نبیذ کھٹی ہوجاتی ہے۔ اور جب دو مختلف میوے ملائے جائیں گے تو ایک جلدی گل جائے گا، دوسرا دیر میں۔ اور جلدی گلنے والا میوہ جب نبیذ کو شراب کے مرحلہ میں پہنچا دے گا تو اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ کیونکہ جوش آئے گا نہ مزہ بدلے گا۔ پس پینے والا گمان کرے گا کہ ابھی نشہ نہیں آیا، حالانکہ وہ نشہ آور ہوچکی ہے۔ اس لئے ہر ایک کی نبیذ علحدہ علحدہ بنانے کی ہدایت فرمائی۔ اور اس کی نظیر: عقیقہ کی دو بکریاں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ وہ مکافئتان ہونی چاہئیں۔ یعنی دونوں کی عمریں یکساں ہوں۔ ورنہ ایک کی بوٹیاں پک جائیں گی اور دوسرے کی سخت رہ جائیں گی۔

[۱] وسئل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الخمر يُتَّخَذُ خَلًّا؟ قال: "لا!" وقيل: إنما أصنعها للدواء، فقال: "إنه ليس بدواء، ولكنه داءٌ!"

أقول: لما كان الناس مولعين، وكانوا يتحيَّلون لها حِيَلاً: لم تتم المصلحةُ إلا بالنهي عنها على كل حالٍ، لئلا يبقى عذر لأحد ولا حيلةٌ.

[۲] ونهى صلى الله عليه وسلم عن خليط التمر والبُسْر، وعن خليط الزبيب والتمر، وعن

خليط الزهو والرطب.

أقول: السر في ذلك: أن الإسكار يسرع إليه بسبب الخلط قبل أن يتغير طَعمُه، فيظن الشارب أنه ليس بمسكر، ويكون مسكرًا.

ترجمہ: (۱) جب لوگ دلدادہ تھے اور وہ شراب کے لئے مختلف حیلے کیا کرتے تھے تو مصلحت تام نہیں ہوتی مگر ہر حال میں شراب سے روکنے کے ذریعہ۔ تاکہ کسی کے لئے نہ کوئی عذر باقی رہے نہ حیلہ ـــــ (۲) اس میں یعنی مختلف میوے ملا کر نبیذ بنانے کی ممانعت میں راز یہ ہے کہ نشہ پیدا کرنا تیزی سے جاتا ہے اس کی طرف ملانے کی وجہ سے، اس سے پہلے کہ اس کا مزہ بدل جائے۔ پس پینے والا گمان کرتا ہے کہ وہ نشہ آور نہیں، اور ہوتی ہے وہ نشہ آور۔

☆ ☆ ☆

تین سانس میں پینے کی حکمت

حدیث ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ پانی پیتے ہوئے تین مرتبہ سانس لیا کرتے تھے اور فرماتے کہ ”اس سے سیرابی خوب حاصل ہوتی ہے، یہ صحت کے لئے زیادہ مفید ہے، اور یہ زیادہ خوشگوار ہے“ (مشکوۃ حدیث ۴۲۶۳)

تشریح: تین سانس میں پینے سے سیرابی زیادہ اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ جب پانی معدہ میں تھوڑا تھوڑا پہنچتا ہے تو طبیعت اس کو ان اعضاء کی طرف سپلائی کرتی ہے جن کو تری کی حاجت ہوتی ہے۔ اور رواں رواں سیراب ہوجاتا ہے۔ اور جب بہت سارا پانی اچانک معدہ میں پہنچتا ہے تو طبیعت حیران ہوجاتی ہے کہ اس کو کہاں سپلائی کرے۔ چنانچہ پیٹ بوجھل ہوجاتا ہے اور سیرابی حاصل نہیں ہوتی۔

اور تین سانس میں پینا صحت کے لئے زیادہ مفید اس طرح ہے کہ:

۱۔ باردمزاج آدمی: جب ایک دم اس کے معدہ پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اس کو ”سردی“ ہوجاتی ہے۔ کیونکہ اس میں قوتِ مدافعت کمزور ہوتی ہے۔ وہ پانی کی بہت ساری مقدار کا مقابلہ نہیں کرسکتی، اور اس کو ”ٹھنڈ“ لگ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر پانی بتدریج پہنچے تو قوتِ مدافعت کام کرتی ہے اور سردی نہیں ہوتی۔

۲۔ اور گرم مزاج آدمی: جب پیٹ میں یکبارگی پانی ڈالا جاتا ہے تو مزاج اور پانی میں مزاحمت ہوتی ہے۔ اور ٹھنڈک حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب معدہ میں تھوڑا تھوڑا پانی ڈالا جاتا ہے تو اول اول مزاحمت ہوتی ہے، پھر برودت غالب آجاتی ہے۔ جیسے آگ پر پانی ڈالا جاتا ہے تو شروع میں آگ اور پانی میں کشمکش ہوتی ہے۔ پھر آگ ہار مان لیتی ہے۔

رہی خوشگواری کی بات تو وہ ظاہر ہے۔ اور تجربہ سے تعلق رکھتی ہے۔ سخت پیاس کی حالت میں تین سانس میں پانی پی

کر دیکھیں۔ اور ایسی ہی حالت میں یکبارگی پی کر بھی دیکھیں: فرق واضح ہوجائے گا۔

مشکیزہ سے پینے کی ممانعت کی وجہ

حدیث(۱) —— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مشکیزہ کے منہ سے پانی پینے سے منع کیا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۲۶۴)

حدیث(۲) —— حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مشکیزوں کے منہ موڑنے سے منع کیا ہے۔ اور ان کا موڑنا یہ ہے کہ ان کا سر پلٹا جائے، پھر ان سے پیا جائے (مشکوۃ حدیث ۴۲۶۵)

تشریح: مشکیزہ کا منہ موڑ کر اور اس سے منہ لگا کر پانی پینے میں چند نقصانات ہیں: ایک: پانی جوش سے نکلے گا اور اس کے حلق میں یکبارگی گرے گا۔ اس سے درد جگر پیدا ہوتا ہے۔ دوم: اس سے معدہ کو بھی ضرر پہنچتا ہے۔ سوم: پانی کے بہاؤ میں تنکے وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا۔ اور منقول ہے کہ ایک شخص نے مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پیا تو سانپ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ چہارم: اس میں کپڑے بھیگنے کا اندیشہ ہے۔ پنجم: جب سب لوگ اس طرح منہ لگا کر پئیں گے تو مشکیزہ کا منہ بدبودار ہوجائے گا۔

[۳] وكان صلى الله عليه وسلم يتنفَّس في الشراب ثلاثاً، ويقول: إنه أَرْوىٰ، وأَبْرَأُ، وَأَمْرَأُ"

أقول: ذلك: لأن المعدةَ إذا وصل إليها الماءُ قليلاً قليلاً صرفَتْه الطبيعة إلى ما يَهُمُّهَا، وإذا هجم عليها الماءُ الكثير تحيَّرَتْ في تصريفه؛ والمبرودُ: إذا أُلقى على معدته الماءُ أصابته البرودة، لضعف قوته من مزاحمة القدر الكثير، بخلاف ما إذا تَدَرَّج، والمحرور: إذا أُلقى على معدته الماءُ دفعةً حصلت بينهما المدافعة، ولم تتم البرودةُ؛ وإذا أُلقى شيئًا فشيئًا وقعت المزاحمة أولاً، ثم ترجحت البرودةُ.

[٤] ونهى صلى الله عليه وسلم عن الشرب من فِي السِّقَاءِ، وعن اخْتِنَاثِ الأسقية.

أقول: وذلك: لأنه إذا ثَنَى فَمَ القِربة، فشرب منه: فإن الماء يتدفق، ويَنْصَبُّ في حلقه دفعةً، وهو يورث الكُبَادَ، ويضرُّ بالمعدة، ولا يتميز عنده في دفق الماء وانصبابه القَذَاةُ ونحوُها؛ ويُحكى أن إنسانا شرب من فِي السِّقاء فدخلت حية في جوفه.

ترجمہ: (۳) میں کہتا ہوں: وہ بات یعنی زیادہ سیرابی اس لئے حاصل ہوتی ہے کہ جب معدہ میں پانی تھوڑا تھوڑا پہنچتا ہے تو طبیعت اس کو خرچ کرتی ہے اس چیز کی طرف جو اس کو فکر مند بنائے ہوئے ہے۔ اور جب معدہ میں بہت

سارا پانی اچانک پہنچتا ہے تو طبیعت حیران رہ جاتی ہے اس کی تدبیر کرنے میں ـــــ اور (صحت کے لئے زیادہ مفید اس لئے ہے کہ) بارد مزاج: جب اس کے معدہ پر پانی ڈالا جاتا ہے تو اس کو برودت پہنچتی ہے، اس کی قوت کے کمزور ہونے کی وجہ سے، بہت ساری مقدار کا مقابلہ کرنے سے، برخلاف اس صورت کے جب وہ بتدریج پہنچے ـــــ اور حار مزاج آدمی: جب اس کے معدہ پر پانی یکبارگی ڈالا جاتا ہے تو دونوں (معدہ اور پانی) کے درمیان مزاحمت پیدا ہوتی ہے اور ٹھنڈک حاصل نہیں ہوتی۔ اور جب تھوڑا تھوڑا ڈالا جاتا ہے تو اولاً مزاحمت ہوتی ہے۔ پھر برودت غالب آجاتی ہے (اور مقصد حاصل ہوجاتا ہے)

(۴) اور وہ بات یعنی ممانعت اس لئے ہے کہ جب اس نے مشکیزہ کا منہ موڑا، پس اس سے پیا تو بیشک پانی جوش سے نکلے گا۔ اور اس کے حلق میں یکبارگی اوپر سے گرے گا۔ اور وہ درد جگر پیدا کرتا ہے۔ اور معدہ کو ضرر پہنچاتا ہے۔ اور نہیں جدا ہوگا اس کے نزدیک پانی کے جوش مارنے اور اس کے اوپر سے گرنے میں تنکا اور اس کا مانند۔ اور نقل کیا گیا کہ ایک شخص نے مشکیزہ کے منہ سے پیا تو سانپ (کا بچہ) اس کے پیٹ میں چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

کھڑے کھڑے پینا شائستگی کے خلاف ہے

حدیث (۱) ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس بات کی ممانعت کی کہ آدمی کھڑے کھڑے پیئے (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۶۶)

حدیث (۲) ـــــ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے اور بیٹھے پیتے ہوئے دیکھا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۷۶)

تشریح: کھڑے کھڑے پینے کی ممانعت ارشادی (بھلائی کی راہ نمائی) اور شائستہ بنانے کے لئے ہے۔ کیونکہ بیٹھ کر پینا عمدہ ہیئت ہے۔ اس میں دلجمعی اور سیرابی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور طبیعت کو پانی اس کے محل میں خرچ کرنے کا بھی موقع خوب ملتا ہے۔ اور آپ کا کبھی کھڑے ہوکر پینا بیانِ جواز کے لئے تھا۔

دایاں پھر دایاں: جھگڑا نمٹانے کے لئے ہے

حدیث ـــــ ایک بار نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دودھ پیش کیا گیا۔ آپؐ نے نوش فرمایا۔ اس وقت آپؐ کی دائیں جانب ایک بدوی اور بائیں جانب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: باقی ابوبکر کو دیں۔ آپؐ نے بدوی کو دیا اور فرمایا: ''دایاں پھر دایاں!'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۷۳)

تشریح: یہ ضابطہ منازعت ختم کرنے کے لئے ہے۔ کیونکہ اگر افضل کی تقدیم کا ضابطہ بنایا جائے گا تو کبھی لوگوں کے درمیان کسی کی فضیلت مسلّم نہیں ہوگی۔ اور کبھی فضیلت مسلّم ہونے کے باوجود دوسرے کی تقدیم سے دل تنگی پیدا ہوگی۔

برتن میں سانس لینے کی ممانعت کی وجہ

حدیث — حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس بات سے منع کیا کہ (پانی وغیرہ پیتے ہوئے) برتن میں سانس لیا جائے۔ یا برتن میں پھونکا جائے (مشکوۃ حدیث ۴۲۷۷)

تشریح: دونوں باتوں کی ممانعت اس اندیشہ سے ہے کہ منہ یا ناک سے پانی وغیرہ میں کوئی ایسی چیز گر جائے جو خود اس کو ناگوار ہو، اور بدنما شکل پیدا ہو۔

پینے سے پہلے تسمیہ اور بعد میں حمد کی وجہ

حدیث — نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب تم پیو تو اللہ کا نام لو، اور جب پی چکو تو اللہ کی تعریف کرو'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۷۸)

تشریح: اس کی وجہ وہی ہے جو کھانے سے پہلے تسمیہ اور کھانے کے بعد حمد کی ہے، جو پہلے بیان ہو چکی ہے۔

[۵] ونهى صلى الله عليه وسلم أن يشرب الرجل قائما؛ ورُوى أنه عليه السلام شرب قائما.

أقول: هذا النهى نهىُ إرشاد وتأديب، فإن الشرب قاعدًا من الهيئات الفاضلة، وأقربُ لِجُمُوْمِ النَّفَسِ والرِّيِّ، وأن تَصْرِفَ الطبيعةُ الماءَ فى محله؛ أما الفعل فلبيان الجواز.

[۶] وقال عليه السلام: "الأيمنُ فالأيمنُ"

أقول: أراد بذلك قطع المنازعة، فإنه لو كانت السنةُ تقديمَ الأفضل، ربما لم يكن الفضلُ مسلَّما بينهم، وربما يجدون فى أنفسهم من تقديم غيرهم حاجةً.

[۷] ونهى صلى الله عليه وسلم أن يُتَنَفَّسَ فى الإناء، أو يُنفخَ فيه.

أقول: ذلك: لئلا يقع فى الماء من فمه أو أنفه ما يكرهه، فيحدث هيئة منكرة.

[۸] قال صلى الله عليه وسلم: "سَمُّوا إذا أنتم شربتم، واحْمَدُوْا إذا رفعتم" قد مر سره.

لغات: جَمَّ (ن) جُمُوْمًا: اکٹھا ہونا۔ اور نَفَس (فاء کے زبر کے ساتھ) سانس۔ جموم النفس: سانس کا اکٹھا ہونا یعنی سکون واطمینان اور دل جمعی حاصل ہونا...... قوله: وربما يجدون إلخ کے آخر میں حاجة ہے۔ غالب یہ ہے کہ یہ سبقت قلم ہے۔ زیادہ بہتر حَرَجًا ہے اسی کو پیش نظر رکھ کر شرح کی گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

باب ــــ ۳

لباس، زینت، ظروف اوران کے مانند چیزیں

اس مبحث کے شروع میں یہ عبارت آئی ہے: اتفقوا علی مراعاة آدابٍ فی مطعمهم ومشربهم، وملبسهم، وقیامهم وقعودهم، وغیر ذلك من الهیئات والأحوال اس عبارت میں اشارہ ہے کہ اس مبحث کے بنیادی ابواب چار ہیں۔ پہلا باب الأطعمة والأشربة تھا، جوتمام ہوا۔ درمیان میں آداب الطعام اور المسکرات کے عناوین ناشر نے بڑھائے تھے، جو مناسب نہیں تھے۔ اس لئے مخطوطات کی مطابقت میں ان کو حذف کردیا ہے۔ دوسرا باب لباس سے متعلق ہے۔ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے لباس کے ساتھ زینت، ظروف، سواری، مکان، معالجہ، منتر، اور ذرائع پیش بینی: شگون اور خواب وغیرہ کو بھی ملایا ہے۔ سب کا بیان اسی باب میں ہے۔ پھر قیام وقعود یعنی صحبت ورفاقت کے آداب کا بیان ہے۔ اور آخر میں ''ایمان ونذور'' کو مبحث کے ساتھ لاحق کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

نبی کریم ﷺ نے عجمیوں کی عادات واطوار پر نظر ڈالی، اور ان کی عیش کوشی اور لذاتِ دنیا میں سرشاری دیکھی، تو جو باتیں خرابیوں کی جڑ بنیاد نظر آئیں ان کو قطعی حرام کردیا۔ اور جو چیزیں ان سے کم درجہ کی تھیں ان کو مکروہ قرار دیا۔ کیونکہ نبی ﷺ نے یہ بات جانی کہ یہی چیزیں آخرت فراموشی اور دنیا طلبی میں انہماک کا ذریعہ ہیں، اس لئے ان کا قلع قمع کردیا۔

خرابی پیدا کرنے والی بڑی چیزیں آٹھ ہیں: ۱- متکبرانہ لباس ۲- خوش حالی والے یعنی بڑے بڑے زیورات ۳- بالوں کے ذریعہ آرائش ۴- کپڑوں وغیرہ میں تصویریں ۵- دل بہلانے والی چیزیں ۶- سواریوں کا ٹھاٹھ ۷- سونے چاندی کے برتن ۸- عالی شان مکانات اور ان کی آرائش۔ باب کے شروع میں انہی امور ثمانیہ سے بحث ہے۔ پھر معالجہ، منتر اور پیش بینی کے ذرائع کی بحث ہے۔

خرابی پیدا کرنے والی بڑی چیزیں

۱ــــ متکبرانہ لباس

عجمیوں کی توجہ زیادہ تر لباس پر مرکوز رہتی تھی۔ وہ ان کے فخر وغرور کا بڑا ذریعہ تھا۔ اس لئے اس پر تین جہتوں سے کلام کیا جاتا ہے:

پہلی جہت: کرتوں اور پاجاموں کو لٹکانے کی ممانعت: لباس کے دو مقصد ہیں: پردہ پوشی اور زینت۔ سورۃ الاعراف آیت ۲۶ میں ارشاد پاک ہے: ''اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے، اور

موجب زینت بھی ہے'' اور کپڑا لٹکانے میں یہ دونوں مقصد نہیں پائے جاتے۔ زینت بس اتنی مقدار میں ہے جو بدن کے برابر ہو۔ زیادہ سے اظہار دولتمندی اور فخر وغرور مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی ممانعت کی۔ درج ذیل روایات اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے جو اپنی لنگی متکبرانہ گھسیٹتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۳۱۱)

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن کی لنگی اس کی آدھی پنڈلی تک رہنی چاہئے۔ اور اس لنگی میں بھی کچھ گناہ نہیں جو نصف ساق اور ٹخنوں کے درمیان ہو، اور جو اس سے نیچے ہو وہ دوزخ میں ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۳۳۱)

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسبال لنگی کرتے اور پگڑی میں ہے۔ ان میں سے جسے بھی متکبرانہ گھسیٹے گا، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی طرف نظر نہیں فرمائیں گے (مشکوۃ حدیث ۴۳۳۲) (یہ حدیث شارح نے بڑھائی ہے)

دوسری جہت: نرم وگداز اور عجیب وغریب لباس کو ممنوع قرار دیا۔ البتہ ضرورت کے وقت اور اتنی مقدار جو پہناوا نہ کہلاتا ہو جائز ہے۔ درج ذیل روایات اسی سلسلہ کی ہیں:

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں اس کو نہیں پہنے گا'' (مشکوۃ حدیث ۴۳۱۶) اور اس کی وجہ حدود کے باب میں شراب کے بیان میں گذر چکی ہے۔ وہاں یہ حدیث آئی ہے کہ جو دنیا میں شراب پیتا ہے وہ آخرت میں اس کو نہیں پیئے گا۔ اُس کی اور اس کی وجہ ایک ہے۔ اور مختلف روایات میں قَسِّی پڑے، سرخ تکیے اور اُرغوانی لباس کی ممانعت آئی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۲: ۲۴۱)

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ریشم پہننے کی ممانعت کی، مگر دو، تین یا چار انگشت کا استثنا فرمایا (مشکوۃ حدیث ۴۳۲۴) اور اتنی مقدار دو وجہ سے جائز ہے: ایک: اس وجہ سے کہ اتنی مقدار لباس کے دائرہ میں نہیں آتی۔ اس کو پہناوا نہیں کہتے۔ دوم: اتنی مقدار کی کبھی ضرورت پیش آتی ہے یعنی کرتے وغیرہ میں گوٹ لگانے کے لئے حاجت ہوتی ہے (اور ایک تیسری وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اتنی مقدار جنت کے ریشم کے نمونہ اور یادگار کے طور پر جائز رکھی گئی ہے۔ اور سونے چاندی میں چاندی کی تھوڑی مقدار اسی مقصد سے جائز ہے)

۳۔ حضرت زبیر بن العوام اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو خارش ہوگئی تھی، چنانچہ ان کو نبی ﷺ نے ریشم پہننے کی اجازت دی (مشکوۃ حدیث ۴۳۲۶) کیونکہ اس صورت میں عیش کوشی مقصود نہیں تھی۔ بلکہ شفا طلبی پیش نظر تھی۔

تیسری جہت: مست کرنے والا رنگین کپڑا جس سے تکبر اور نمائش حاصل ہو ممنوع ہے۔ نبی ﷺ نے زعفرانی کپڑے کی ممانعت فرمائی، اور زرد کپڑوں کے بارے میں فرمایا: ''یہ کفار کے کپڑے ہیں پس ان کو نہ پہنو'' (مشکوۃ حدیث ۴۳۲۷) اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سنو! مردوں کی خوشبو: ایسی خوشبو ہے جس میں رنگ نہ ہو، اور عورتوں کی خوشبو:

ایسا رنگ ہے جس میں (پھیلنے والی) خوشبو نہ ہو" (مشکوۃ حدیث ۴۳۵۴) جب مردوں کی خوشبو میں رنگ ممنوع ہے تو کپڑوں میں اس کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟!

سوال: تین حدیثوں سے سادگی اور خستہ حالی کی محبوبیت معلوم ہوتی ہے۔ اور دوسری تین حدیثوں سے تجمل اور زیبائش کی پسندیدگی مترشح ہوتی ہے، پس اس تعارض کا حل کیا ہے؟

پہلی تین حدیثیں: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا سنتے نہیں ہو؟ کیا سنتے نہیں ہو؟ خستہ حالی ایمان سے ہے! خستہ حالی ایمان سے ہے!" (مشکوۃ حدیث ۴۳۴۵) (۲) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے دنیا میں شہرت کا لباس پہنا ،اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن رسوائی کا لباس پہنائیں گے" (مشکوۃ حدیث ۴۳۴۶) (۳) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس نے انکساری کے طور پر زینت کا لباس ترک کیا درانحالیکہ وہ اس پر قادر ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ عزت کا جوڑا پہنائیں گے" (مشکوۃ حدیث ۴۳۴۸) ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سادگی، انکساری، خستہ حالی اور ترکِ تجمل پسندیدہ ہے۔

دوسری تین حدیثیں: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھیں" (مشکوۃ حدیث ۴۳۵۰) (۲) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو پراگندہ بال دیکھا تو فرمایا: "کیا اس آدمی کے پاس کنگھی نہیں جس سے وہ اپنے بال ٹھیک کرے؟!" اور ایک اور شخص کو دیکھا جس کے کپڑے چرکیں تھے تو فرمایا: "کیا اس شخص کو پانی نہیں ملتا جس سے وہ اپنے کپڑے دھوئے؟!" (مشکوۃ حدیث ۴۳۵۱) (۳) اور ایک صحابی آپ کی خدمت میں بہت معمولی کپڑے پہن کر آئے۔ آپ نے دریافت کیا: کیا تمہارے پاس مال ہے؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے دریافت کیا: تمہارے پاس کونسا مال ہے؟ انھوں نے کہا: مجھے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کا مال دیا ہے: اونٹ بھی، بکریاں بھی، گھوڑے اور غلام بھی! آپ نے فرمایا: "جب اللہ نے تم کو مال دیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اعزاز کا اثر تم پر نظر آنا چاہئے!" (مشکوۃ حدیث ۴۳۵۲) ان حدیثوں سے تجمل و زینت کی پسندیدگی معلوم ہوتی ہے۔

جواب[1]: یہاں دو چیزیں ہیں۔ جو حقیقت میں مختلف ہیں۔ اور وہ مذکورہ دونوں قسم کی حدیثوں کا مصداق ہیں۔ اس لئے ان میں کچھ اختلاف نہیں۔ مگر وہ دونوں چیزیں کبھی سرسری نظر میں مشتبہ ہوجاتی ہیں۔ یعنی دونوں یکساں نظر آتی ہیں۔ اس لئے اشکال ہوتا ہے۔ ان دونوں چیزوں میں سے ایک مطلوب ہے اور دوسری مذموم۔ پہلی قسم کی حدیثوں کا مصداق مذموم چیزیں ہیں۔ اور دوسری قسم کی حدیثوں کا مصداق مطلوب چیزیں ہیں۔

مطلوب: چار باتیں ہیں: (۱) بخیلی سے بچا جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے گنجائش دی ہو تو کنجوسی نہ کی جائے۔ البتہ لوگوں کے طبقات کے اعتبار سے بخیلی میں اختلاف ہوتا ہے۔ ایک چیز جو بادشاہوں کے حق میں بخیلی تصور کی جاتی ہے، کبھی وہ چیز فقیر کے حق میں فضول خرچی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے بخیلی کی تعیین کرتے وقت لوگوں کے طبقات کا خیال رکھا جائے (۲)

[1] اس سوال کا جواب رحمۃ اللہ (۲: ۲۳۳) میں بھی ہے اس کو بھی دیکھ لیا جائے ۱۲

بادیہ نشینوں اور جانوروں جیسی زندگی گذارنے والوں کی عادتیں اختیار نہ کی جائیں (۳) نظافت و پاکیزگی کا خیال رکھا جائے (۴) اور بہترین عادتیں اختیار کی جائیں۔

اور مذموم باتیں بھی چار ہیں: (۱) تکلفات اور نمائش میں دور تک جانا (۲) لباس کے ذریعہ ایک دوسرے پر بڑائی جتانا (۳) غریبوں کی دل شکنی کرنا (۴) تکبر کا دل میں پنہاں ہونا اور لوگوں کو حقیر و کم تر سمجھنا۔

اور مذکورہ احادیث کے الفاظ میں ان مطلوب و مذموم باتوں کی طرف اشارہ ہے، جو غور کرنے والے پر پوشیدہ نہیں۔ مثلاً ثوب شهرة میں جذبۂ نمائش کی طرف، اور وَسِخة اور شَعِثٌ میں ترکِ نظافت کی طرف، اور إذا آتاك الله مالاً میں بخیلی نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

اور ثواب کی علت: دو باتیں ہیں: ایک: لوگوں کو حقیر نہ سمجھنا۔ دوم: فخر و غرور سے بچنا۔ اگر یہ دو باتیں حاصل ہوں تو ہر جائز لباس باعث اجر ہے، اگر اس پر اللہ کی حمد کی جائے اور شکر بجالایا جائے۔ جیسا کہ نبی ﷺ کی سنت ہے:

حدیث —— نبی ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کا نام لیتے۔ مثلاً: یہ پگڑی، یہ کرتا، یہ چادر، پھر فرماتے: ”اے اللہ! آپ کے لئے حمد ہے جیسا کہ آپؐ نے مجھے یہ کپڑا پہنایا۔ میں آپ سے اس کی بھلائی مانگتا ہوں، اور جس کام کے لئے وہ بنایا گیا ہے اس کی بھلائی مانگتا ہوں۔ اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں اس کی برائی سے، اور جس کام کے لئے وہ بنایا گیا ہے اس کی برائی سے“ (مشکوۃ حدیث ۴۳۴۲) اور اس کا راز قبل ازیں اسی مبحث کے باب اول میں گذر چکا ہے۔ یعنی شریعت نے مشاغل دنیا کے ساتھ ایسے اذکار متعین کئے ہیں جو منعم حقیقی کی یاد تازہ کریں اور ذہن کو بارگاہ عالی کی طرف پھیریں۔

﴿اللباس، والزينة، والأواني ونحوُها﴾

اعلم: أن النبيَّ صلى الله عليه وسلم نظر إلى عادات العجم، وتعمقاتهم في الاطمئنان بلذّات الدنيا، فحرَّم رء وسها وأصولها، وكرَّه مادون ذلك، لأنه عَلِمَ أن ذلك مُفْضٍ إلى نسيان الدار الآخرة، مستلزمٌ للإكثار من طلب الدنيا.

فمن تلك الرء وس: اللباس الفاخر: فإن ذلك أكبرُ همهم، وأعظم فخرهم، والبحثُ عنه من وجوه:

منها: الإسبال في القُمُص والسراويلات: فإنه لايُقصد بذلك السترُ والتجمُّلُ اللذين هما المقصودانِ في اللباس، وإنما يُقصد به الفخرُ، وإراءةُ الغِنى، ونحوُ ذلك؛ والتجمُّلُ ليس إلا في القدر الذي يُساوي البدنَ.

قال صلى الله عليه وسلم: ”لاينظر الله يوم القيامة إلى من جَرَّ إزارَه بَطَرًا“ وقال صلى الله



عليه وسلم:" إِزْرَةُ المؤمنِ إلى أنصاف ساقَيه؛ لاجُناح عليه فيما بينه وبين الكعبين؛ وما أسفل من ذلك ففي النار"

ومنها: الجنس المستغربُ الناعم من الثياب: قال صلى الله عليه وسلم:" من لبس الحرير في الدنيا لم يَلْبَسه يوم القيامة" وسِرُّه مثلُ ما ذكرنا في الخمر. ونهى صلى الله عليه وسلم عن لُبس الحرير والديباج، وعن لبس القَسِّيِّ، والْمَيَاثِرِ، والْأُرْجُوَان. ورخَّص في موضع إصبعين أوثلاث: لأنه ليس من باب اللباس، وربما تقع الحاجة إلى ذلك. ورخَّص للزبير وعبد الرحمن بن عوف في لبس الحرير لحِكّة بهما: لأنه لم يُقصد حينئذ به الإرفاهُ، وإنما قُصد الاستشفاءُ.

ومنها: الثوب المصبوغ بلون مطرب: يحصل به الفخر والمُرَاءَ اةُ؛ فنهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المعصفر والمُزَعْفر، قال:" إن هذه من ثياب أهل النار" وقال صلى الله عليه وسلم:" ألا طِيْبُ الرجال: ريح لالون له، وطيب النساء: لون لاريح له"

ولا اختلاف بين قوله صلى الله عليه وسلم:" إن البَذَاذَةَ من الإيمان" وقال عليه السلام:"من لبس ثوبَ شُهرة في الدنيا ألبسه الله ثوبَ مَذَلَّةٍ يوم القيامة" وقال صلى الله عليه وسلم:" من ترك لُبس ثوبِ جمالٍ تواضعًا كساه الله حُلَّةَ الكرامة" وبين قوله صلى الله عليه وسلم:" إن الله يحب أن يَرى أثرَ نعمته على عبده" ورأى رجلًا شَعِثًا، فقال:" ماكان يجد هذا ما يُسكِّنُ به رأسَه" ورأى رجلًا عليه ثياب وَسِخَةٌ، فقال:" ماكان يجد هذا ما يغسل به ثوبه" وقال صلى الله عليه وسلم:" إذا آتاك الله مالاً فَلْتُرَ نعمةُ الله وكرامتُه عليك":

لأن هنالك شيئين مختلفين في الحقيقة، قد يشتبهان بادى الرأى: أحدهما مطلوب، والآخر مذموم:

فالمطلوب: تركُ الشح: ويختلف باختلافِ طبقاتِ الناس، فالذى هو في الملوك شُحٌّ ربما يكون إسرافًا في حق الفقير؛ وتركُ عاداتِ البدو، واللاحقين بالبهائم؛ واختيارُ النظافة، ومحاسنِ العادات.

والمذموم: الإمعان في التكلف والمُرَاءَ اةِ، والتفاخرُ بالثياب، وكسرُ قلوبِ الفقراء، ونحوُ ذلك.

وفي ألفاظ الحديث إشارات إلى هذه المعاني، كمالا يخفى على المتأمل؛ ومناط الأجر: ردع النفس عن اتباع داعية الغَمْطِ والفخر.

وكان صلى الله عليه وسلم إذا استجدَّ ثوبًا سماه باسمه: عمامة أو قميصًا أو رداءً، ثم

يقول:" اللهم لك الحمد كما كسوتنيه، أسألك خيره وخيرَ ما صنع له، وأعوذ بك من شره وشر ما صنع له" وقد مر سره من قبل.

ترجمہ: جان لیں کہ نبی ﷺ نے دیکھا عجم کی عادتوں کی طرف، اور ان کے گہرائی میں جانے کی طرف دنیا کی لذتوں پر مطمئن ہونے میں۔ پس حرام کیا ان عادات ولذات کے رؤس اور ان کے اصول کو، اور ناپسندیدہ بنایا ان کو جو ان سے کم تر ہیں۔ اس لئے کہ آپؐ نے جانا کہ یہ چیزیں پہنچانے والی ہیں دار آخرت کو فراموش کرنے کی طرف، مقتضی ہیں دنیا طلبی کی افراط کی ـــــ پس ان رؤس میں متکبرانہ لباس ہے۔ پس بیشک یہ چیز ان کی بڑی فکر اور ان کا بڑا فخر تھا۔ اور اس سے بحث چند طور پر ہے ـــــ از انجملہ: کرتوں اور پاجاموں کا لٹکانا ہے۔ پس بیشک شان یہ ہے کہ اس سے قصد نہیں کیا جاتا پردہ پوشی اور زینت کا، جو کہ وہ دونوں لباس میں مقصود ہیں۔ اور اس کے ذریعہ قصد کیا جاتا ہے تکبر اور اظہار دولت مندی اور اس کے مانند کا۔ اور زیبائش نہیں ہے مگر اس مقدار میں جو بدن کے برابر ہو...... اور از انجملہ: کپڑوں میں نرم عجیب قسم ہے...... اس لئے کہ وہ لباس کے قبیل سے نہیں۔ اور کبھی اتنی مقدار کی حاجت پیش آتی ہے...... اس لئے کہ نہیں قصد کیا گیا اس وقت اس سے خوش عیشی کا، اور ارادہ کیا گیا شفا طلبی ہی کا ـــــ اور از انجملہ: مست کرنے والے رنگ سے رنگا ہوا کپڑا ہے، جس سے تکبر اور نمائش حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے روکا کسمی اور زعفرانی کپڑے سے۔ فرمایا:" بیشک یہ دوزخیوں کے کپڑوں میں سے ہے" (یہ حدیث سرسری تلاش میں نہیں ملی) ۔ اور کچھ اختلاف نہیں نبی ﷺ کے ارشاد کے درمیان...... اور آپؐ کے ارشاد کے درمیان اس لئے کہ یہاں دو چیزیں ہیں۔ جو در حقیقت مختلف ہیں۔ کبھی سرسری نظر میں دونوں مشتبہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک مطلوب ہے۔ اور دوسری مذموم۔

پس مطلوب: (۱) بخیلی چھوڑنا ہے۔ اور بخیلی مختلف ہوتی ہے لوگوں کے طبقات کے اختلاف سے۔ پس وہ چیز جو کہ وہ بادشاہوں میں بخیلی ہے کبھی فقیر کے حق میں فضول خرچی ہوتی ہے (۲) اور بادیہ نشینوں اور چوپایوں کے ساتھ ملنے والوں کی عادتیں چھوڑنا ہے (۳و۴) اور نظافت اور بہترین عادتیں اختیار کرنا ہے ـــــ اور مذموم: (۱) تکلف اور نمائش میں گہرائی میں اترنا ہے (۲) اور کپڑوں کے ذریعہ ایک دوسرے پر بڑائی جتانا ہے (۳) اور غریبوں کی دل شکنی ہے (۴) اور اس کے مانند ـــــ اور حدیث کے الفاظ میں ان باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ غور کرنے والے پر پوشیدہ نہیں۔ اور ثواب کی علت: حقیر سمجھنے اور فخر کے جذبہ کی پیروی کرنے سے نفس کو روکنا ہے۔

لغات: مُستلزم: اسْتَلْزَمَ الشيئَ: مقتضی ہونا، لازم اور ضروری سمجھنا...... الفاخر: فخر الرجلُ: ناز کرنا، تکبر کرنا...... المستغرب: استغربَ الشيئَ: تعجب کی نگاہ سے دیکھنا...... القَسِّي: مصر یا شام کا بنا ہوا پھولدار کپڑا جس میں ریشم ہوتا تھا۔ الميثرة: ریشم کا گدا یا تکیہ جس پر بیٹھا جاتا تھا (بخاری کتاب اللباس، باب ۲۸)

☆ ☆ ☆



۲— سونے کا بڑا زیور

خرابی پیدا کرنے والی ایک بڑی چیز: عورتوں کا سونے کا بڑا زیور ہے۔ اور اس سلسلہ میں بنیادی باتیں دو ہیں:

پہلی بات: سونا ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ عجمی مقابلہ میں اپنی برتری ثابت کیا کرتے تھے (لوگ فخر سے کہا کرتے تھے: میری بیوی کے پاس اتنا سونا ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کو جہیز میں اتنا سونا دیا۔ میں نے بہو پر اتنا سونا چڑھایا) اور سونے کے ذریعہ آرائش کا رواج دنیا طلبی میں انہماک تک پہنچانے والا ہے (کیونکہ آسودہ حال ہی سونے سے کھیلتے ہیں۔ اور مالداری کے لئے رات دن محنت کرنی پڑتی ہے۔ آدمی کاموں میں تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ رہتی ہے نہ آخرت کی تیاری کر سکتا ہے۔ بلکہ کبھی کردنی ناکردنی بھی کرنی پڑتی ہے) اور چاندی کا یہ حال نہیں۔ اس لئے نبی ﷺ نے سونے کے سلسلہ میں سختی برتی (مردوں کو تو اس کی مطلق اجازت نہیں دی۔ اور عورتوں کے لئے بھی مرفہ حالی اور آسودگی والا بڑا زیور ممنوع قرار دیا) البتہ عورتوں کو چاندی کی مطلقاً اجازت دی، اور فرمایا: ''بلکہ تم چاندی کو لازم پکڑو، پس اس سے کھیلو!'' یعنی وہ بیویوں کو پہناؤ (یہ حدیث تفصیل سے آگے آرہی ہے۔ اور مردوں کو چاندی کی ساڑھے چار گرام تک انگوٹھی بنانے کی اجازت دی)

دوسری بات: عورتیں آرائش کی زیادہ محتاج ہیں، تاکہ ان کے شوہران میں رغبت کریں۔ چنانچہ عرب وعجم سبھی کا طریقہ ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ آرائش کرتی ہیں۔ پس ضروری ہے کہ عورتوں کو مردوں سے زیادہ زیبائش کی اجازت دی جائے (اس لئے چاندی ان کے لئے مطلقاً جائز رکھی، اور سونے کا بھی چھوٹا زیور جائز قرار دیا)

دلائل: حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونا اور ریشم میری امت کی عورتوں کے لئے جائز کئے گئے ہیں۔ اور میری امت کے مردوں پر حرام کئے گئے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۳۴۱) سونا تو مردوں کے لئے مطلقاً حرام ہے اس کے عوض چاندی کی تھوڑی سی مقدار جائز رکھی گئی ہے۔ اور ریشم مقطع (ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا) جائز ہے۔ ایک، دو، تین اور چار انگشت چوڑی پٹی جائز رکھی گئی ہے۔ اور عورتوں کے لئے ریشم مطلقاً جائز ہے۔ البتہ سونا فی الجملہ جائز ہے۔ یعنی مقطع (چھوٹا زیور) جائز ہے۔ اور غیر مقطع (بڑا زیور) جائز نہیں (اس حدیث میں آگے شاہ صاحب رحمہ اللہ نے یہ قید لگائی ہے)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی، تو آپؐ نے اس کو نکال کر پھینک دیا۔ اور فرمایا: ''تم میں سے ایک شخص آگ کی چنگاری کا قصد کرتا ہے. پس اس کو اپنے ہاتھ میں گردانتا ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۳۸۵) معلوم ہوا کہ مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی بھی جائز نہیں۔

حدیث (۳) — ایک شخص نے پیتل کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا بات ہے: تیرے اندر سے مورتیوں کی بو آرہی ہے؟!'' اس نے وہ انگوٹھی پھینک دی، اور لوہے کی انگوٹھی پہن کر آیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا بات

ہے: تونے جہنمیوں کا زیور پہن رکھا ہے؟!'' اس نے پوچھا: یارسول اللہ! میں کس چیز کی انگوٹھی بناؤں؟ آپؐ نے فرمایا: ''چاندی کی، اور اس کو ایک مثقال پورا نہ کر'' (مشکوۃ حدیث ۴۳۹۶) یعنی انگوٹھی میں چاندی ساڑھے چار گرام سے کم ہو۔

حدیث (۴) ــــــ حضرت معاویہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (عورتوں کو) سونا پہننے سے منع کیا، مگر مقطع (ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا) مستثنیٰ کیا (مشکوۃ حدیث ۴۳۹۵) غیر مقطع زیور: وہ ہے جو بڑا ایک ٹکڑا (One Piece) ہو، جیسے ہنسلی، چوڑی وغیرہ۔ اسی کو محلّق بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ زیور جو کسی عضو کا ہالہ بنا ہوا ہو ممنوع ہے۔ اور مقطع: جیسے انگوٹھی اور جو دھاگے میں پرویا ہوا ہو (مسوّی شرح موطا) (یہ حدیث صحیح نہیں۔ اس کی سند اور متن میں اضطراب ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں نسائی شریف کتاب الزینۃ، باب تحریم الذهب على الرجال ۸: ۱۶۱-۱۶۳)

حدیث (۵) ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص پسند کرتا ہے کہ اپنے پیارے کو (یعنی اپنے بچے کو، اور مسند احمد ۲: ۳۳۴ میں حبیبتہ ہے: اپنی پیاری کو یعنی اپنی بیوی کو) آگ کا کڑا پہنائے تو وہ اس کو سونے کا کڑا پہنائے۔ اور جو پسند کرتا ہے کہ اپنے پیارے کو (یا اپنی پیاری کو) آگ کا ہار پہنائے تو وہ اس کو سونے کا ہار پہنائے۔ اور جو پسند کرتا ہے کہ اپنے پیارے کو (یا اپنی پیاری کو) آگ کی چوڑی پہنائے تو وہ اس کو سونے کی چوڑی پہنائے۔ بلکہ تم چاندی کو لازم پکڑو، پس اس سے کھیلو!'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۰۱)

حدیث (۶) ــــــ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس عورت نے سونے کا ہار پہنا: قیامت کے دن اس کے مانند آگ کا ہار اس کی گردن میں پہنایا جائے گا۔ اور جس عورت نے اپنے کان میں سونے کی بالی پہنی: قیامت کے دن اس کے مانند آگ کی بالی اس کے کان میں پہنائی جائے گی'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۰۲)

حدیث (۷) ــــــ بنت ہُبیرہ کے واقعہ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: پھر نبی ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ تھا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے سونے کی زنجیر اپنی گردن سے نکال کر ہاتھ میں لے رکھی تھی۔ انھوں نے کہا: یہ حسنؓ کے ابا (حضرت علیؓ) نے ہدیہ دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''کیا تمہیں خوشی ہے کہ لوگ کہیں: فاطمہ بنت محمد کے ہاتھ میں آگ کی زنجیر ہے؟'' اور آپؐ لوٹ گئے۔ بیٹھے نہیں۔ حضرت فاطمہؓ نے وہ زنجیر فروخت کردی۔ اور اس کا ایک بردہ خریدا، اور اس کو آزاد کردیا۔ جب آپؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے اس نے فاطمہ کو آگ سے نجات بخشی'' (نسائی ۸: ۱۵۸)

اور اس حکم کی وجہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی بہن کی روایت میں آئی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عورتو! کیا تمہارے لئے چاندی میں وہ چیز نہیں، جس کے ذریعہ تم بناؤ سنگھار کرو؟ سنو! تم میں سے جو بھی عورت سونا پہنے گی، جس کو وہ ظاہر کرے گی، وہ اس کے ذریعہ سزا دی جائے گی'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۰۳) یعنی عورتیں سونے کے بڑے زیور کی نمائش کرتی ہیں۔ اس لئے وہ ممنوع ہے۔ تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری!

سوال: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سونے کا پازیب پہنا کرتی تھیں۔ انھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا وہ کنز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جو سونا بقدر نصاب ہو، اور اس کی زکوۃ ادا کردی جائے تو وہ کنز نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۱۰ کتاب الزکوۃ، باب مایجب فیه الزکوۃ) اور پازیب سونے کا بڑا زیور ہے۔ پس اس حدیث سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے؟

جواب: بظاہر وہ مقطّع (ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا) تھا۔ یعنی وہ پازیب: سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اور ان کو جوڑ کرکے بنایا گیا تھا۔

سوال: اوپر حدیث (۱) میں آیا ہے کہ ''سونا عورتوں کے لئے جائز ہے'' یہ حدیث مطلق ہے۔ پس ہر زیور جائز ہوگا؟

جواب: اس حدیث میں جواز فی الجملہ مراد ہے۔ جیسے ریشم مردوں پر فی الجملہ حرام ہے۔ کیونکہ جب غیر مقطّع زیور کی ممانعت صراحۃً مروی ہے تو اس مطلق کو اس قید کے ساتھ مقید کرنا ضروری ہے۔ کہا جائے گا کہ عورتوں کے لئے مقطّع زیور ہی جائز ہے۔ نیز عورتوں کے لئے بھی سونے کے برتن حرام ہیں، اس لئے بھی فی الجملہ جواز مراد لینا ضروری ہے۔

یہ وہ بات ہے جو ان احادیث کے مفہوم سے ثابت ہوتی ہے۔ اور میرے نزدیک ان کے معارض کوئی دلیل نہیں۔ اور فقہاء کا مذہب اس سلسلہ میں معلوم ومشہور ہے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

فائدہ: یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ عورتوں کے لئے سونے کا زیور مطلقاً جائز ہے۔ سورۃ الزخرف آیت ۱۸ میں ارشاد پاک ہے: ﴿أَوَ مَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ ترجمہ: کیا اور جو زیور میں نشو ونما پائے، اور وہ مباحثہ میں واضح بات نہ کر سکے: ایسی صنف کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہو؟ گہنوں میں پلنا یہ عورت کی خصوصیت ہے۔ اس آیت سے اکابر تابعین حضرت مجاہد اور حضرت ابو العالیہ رحمہما اللہ نے عورتوں کے لئے مطلقاً زیور کا جواز مستنبط کیا ہے۔

اور یہ حدیث کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت کی عورتوں کے لئے سونا اور ریشم حلال کیا ہے: عام ہے۔ اس کی فی الجملہ کے ساتھ تخصیص تاویل بعید ہے۔ اور شاہ صاحب قدس سرہٗ نے جو روایات پیش کی ہیں ان میں سے صرف حدیث (۴) صریح ہے، مگر وہ صحیح نہیں۔ باقی وعید کی روایات ہیں، جن سے حکم شرعی ثابت نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وعید کی مختلف وجوہ ہوسکتی ہیں۔ مثلاً: زکوۃ ادا نہ کرنا، زیور کی نمائش کرنا۔ حضرت حذیفہؓ کی بہن کی روایت میں وعید کی یہی بنیاد ہے۔

پس صحیح بات: یہ ہے کہ ریشم اور سونا عورتوں کے لئے مطلقاً جائز ہیں۔ مگر نبی ﷺ اپنے گھر والوں کو زیور اور ریشم سے منع کیا کرتے تھے۔ نسائی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يمنع أهلَه الحليةَ والحرير، ويقول: إن كنتم تحبون حليةَ الجنة والحريرَ فلا تلبسوها في الدنيا (۱۵۶:۸) اور نبی ﷺ عورتوں کو ترغیب دیا کرتے تھے کہ وہ چاندی کا زیور سنہرا بنا کر استعمال کریں (نسائی ۱۵۹:۸) اور اس کی وجہ وہ ہے جو شاہ صاحب نے مبحث کے شروع میں بیان کی ہے کہ رفاہیتِ بالغہ دنیا طلبی میں منہمک کرتی ہے۔ اور سادہ معیشت اپنے جلو میں راحتیں لاتی ہے۔ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مقطّع سے تھوڑی چیز مراد ہے۔ جیسے بالی اور انگوٹھی۔ اور سونے کی زیادہ مقدار

جو مسرفین کی عادت اور متکبرین کی زینت ہے: مکروہ ہے۔ اور تھوڑی مقدار وہ ہے جس میں زکوۃ واجب نہ ہو (مسوّی ۲:۳۰۴)

ومن تلك الرء وس: الحُلِيُّ المترفّه: وههنا أصلان:

أحدهما : أن الذهب هو الذى يُفاخِر به العجمُ، ويُفضى جَرَيَانُ الرسم بالتحلّى به إلى الإكثار من طلب الدنيا، دون الفضةِ، ولذلك شدد النبى صلى الله عليه وسلم فى الذهب، وقال:" ولكن عليكم بالفضة، فَالْعَبُوا بها"

والثانى : أن النساء أحْوَجُ إلى التزين، ليرغب فيهن أزواجهن، ولذلك جرت عادة العرب والعجم جميعًا بأن يكون تزينهن أكثرَ من تزينهم، فوجب أن يُرخص لهن أكثرُ مما يُرخص لهم.

ولذلك قال صلى الله عليه وسلم:" أُحِلَّ الذهبُ والحريرُ للإناث من أمتى، وحُرِّم على ذكورها" وقال صلى الله عليه وسلم فى خاتم ذهب فى يد رجل:" يعمِد أحدُكم إلى جمرة من نار فيجعلها فى يده" ورخّص عليه السلام فى خاتم الفضة، لاسيما لذى سلطان، قال: "ولا تُتِمَّهُ مثقالاً"

ونهى صلى الله عليه وسلم النساءَ عن غير المقَطَّع من الذهب، وهو ما كان قطعة واحدة كبيرة، قال صلى الله عليه وسلم:" من أحب أن يُحَلِّقَ حبيبَه حلقة من النار فليُحلِّقْه حلقة من ذهب" وذكر على هذا الأسلوب الطوق، والسِّوَارَ؛ وكذا جاء التصريح بقلادة من ذهب، وخُرص من ذهب، وسلسلةٍ من ذهب؛ وبيَّن المعنى فى هذا الحكم، حيث قال:" أما إنه ليس منكن امرأة تُحَلِّى ذهبا تُظهره إلا عُذبت به" وكان لأم سلمة رضى الله عنها أَوْضَاحٌ من ذهب؛ والظاهرُ أنها كانت مُقَطَّعَةً؛ وقال صلى الله عليه وسلم:" حَلَّ الذهب للإنَاثِ" معناه: الحل فى الجملة.

هذا ما يوجبه مفهومُ هذه الأحاديث، ولم أجد لها معارضًا؛ ومذهب الفقهاء فى ذلك معلوم مشهور، والله أعلم بحقيقة الحال.

ترجمہ: اور اُن رؤس میں سے آسودگی والا زیور ہے۔ اور یہاں دو اصول ہیں: ان میں سے ایک: یہ ہے کہ سونا ہی وہ چیز ہے الی آخرہ...... اور نبی ﷺ نے عورتوں کو منع کیا سونے کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کئے ہوئے زیور سے (یہ حدیث ۴ ہے) اور وہ ممنوع وہ زیور ہے جو ایک بڑا ٹکڑا ہو۔ اور فرمایا نبی ﷺ نے: ''جو شخص پسند کرتا ہے...... اور آپؐ نے اسی انداز پر ہنسلی اور کنگن کا تذکرہ کیا (یہ حدیث ۵ ہے) اور اسی طرح صراحت آئی ہے سونے کے ہار کی اور سونے کی بالیوں کی (یہ حدیث ۶ ہے) اور سونے کی زنجیر کی (یہ حدیث ۷ ہے)

☆ ☆ ☆

۳— بالوں کے ذریعہ آرائش

بالوں کے ذریعہ ملّی امتیاز

لوگ بالوں کے ذریعہ آرائش کے معاملہ میں مختلف تھے۔ مجوس ڈاڑھیاں کٹواتے تھے، اور مونچھیں بڑھاتے تھے۔ اور انبیاءعلیہم السلام کا طریقہ اس کے برعکس تھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کی مخالفت کرو: ڈاڑھیاں بڑھاؤ، اور مونچھیں خوب پست کرو'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۲۱ اور مسلم شریف (۳: ۱۴۷) کی روایت میں ہے: ''مونچھیں کاٹو، اور ڈاڑھی لٹکاؤ، اور مجوس کی مخالفت کرو'')

وضاحت: ان احادیث میں ڈاڑھی مونچھ کے ذریعہ ملّی امتیار قائم کیا گیا ہے۔ ڈاڑھی بڑھانا اور مونچھ کٹانا مسلمان کا شعار اور یونیفارم ہے۔ اور اس حکم میں اور بھی مصلحتیں ہیں: مثلاً ڈاڑھی سے عورتوں سے تشبہ منقطع ہوتا ہے، اس میں تجمل وزینت ہے، مگر اس کا ادراک سلیم الفطرت لوگ ہی کرسکتے ہیں، مونچھیں پست کرنے میں نظافت ہے۔ کھانا پانی ان سے آلودہ نہیں ہوتا۔ اور ڈاڑھی: گرم وسرد ہوا کے جھونکوں سے گلے اور سینے کی حفاظت کرتی ہے۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ امور فطرت میں سے ہے یعنی تمام انبیاء کا یہی طریقہ رہا ہے۔

اسلام نے پراگندگی اور انتہائی تجمل میں اعتدال قائم کیا ہے

کچھ لوگ پراگندگی، خستگی اور بدحالی کو پسند کرتے ہیں، اور زیب وزینت کو ناپسند کرتے ہیں۔ جیسے ہِپّی قسم کے لوگ۔ اور کچھ لوگ آرائش وزیبائش میں حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ اور اس کو فخر وغرور اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کا ذریعہ بناتے ہیں، جیسے خوش عیش لوگ۔ یہ دونوں ہی نظریے باطل ہیں۔ ان کا نام ونشان مٹانا اور ان کی تردید کرنا مقاصدِ شریعت میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ کیونکہ شریعت کا مدار دونوں مرتبوں میں اعتدال اور دونوں مصلحتوں کو جمع کرنے پر ہے۔ چنانچہ اسلام نے بالوں کے سلسلہ میں مثبت ومنفی پانچ احکام دیئے: ۱- بالوں کے معاملہ کو امورِ فطرت میں شامل کیا، اور ان کی صفائی کے لئے وقت متعین کیا ۲- خضاب کرنے کا حکم دیا ۳- سر میں مانگ نکالنے کا طریقہ رائج کیا ۴- قزع یعنی کچھ سر منڈانے اور کچھ باقی رکھنے کی ممانعت کی ۵- اور بالوں کے اکرام کا حکم دیا۔ تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا، زیرناف لینا، مونچھ تراشنا، ناخن کاٹنا، اور بغل کے بال اکھاڑنا'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۲۰) پھر ختنہ کے علاوہ باقی چار چیزوں کے لئے وقت کی تحدید کی، تاکہ جو اس طریقہ کی خلاف ورزی کرے اس پر نکیر کی جاسکے۔ اور تاکہ محتاط آدمی روزانہ یہ کام نہ کرنے لگے۔ اور لاپرواہ سال بھر تک یہ کام چھوڑے نہ

رہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لئے موچھیں تراشنے، ناخن کاٹنے، بغل صاف کرنے، اور زیر ناف لینے کے لئے وقت متعین کیا کہ ہم چالیس دن سے زیادہ ان کو نہ چھوڑیں (مشکوۃ حدیث ۴۴۲۲)

(۲) — جب سر یا ڈاڑھی سفید ہو جائیں تو خضاب کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہود و نصاریٰ خضاب نہیں کرتے: تم ان کی مخالفت کرو'' یعنی خضاب کرو (مشکوۃ حدیث ۴۴۲۳)

(۳) — حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جن امور میں حکم شرعی نازل نہیں ہوا ہوتا تھا نبی ﷺ اہل کتاب کی موافقت پسند کرتے تھے۔ اور اہلِ کتاب بالوں کو سیدھا پیچھے کھینچ لیا کرتے تھے۔ اور مشرکین بالوں میں مانگ نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ نبی ﷺ بھی شروع میں بالوں کو سیدھا پیچھے کھینچ لیا کرتے تھے۔ پھر بعد میں آپؐ مانگ نکالنے لگے (مشکوۃ حدیث ۴۴۲۵)

تشریح: سَدل کے لغوی معنی ہیں: لٹکانا۔ اور سدل ہر چیز میں مختلف ہوتا ہے۔ نماز میں سدل یہ ہے کہ کپڑا اس طرح پہنایا اوڑھا جائے کہ گرنے کا خطرہ رہے۔ اور بالوں میں سدل یہ ہے کہ سر دھونے کے بعد جب کنگھا کرے تو پیشانی کے بال منہ پر لٹکائے یعنی سر کے درمیان سے آگے کی طرف کنگھا کرے۔ جب بال درست ہو جائیں تو ان کو پیچھے کی طرف کھینچ لے — اور فرق (مانگ نکالنا) یہ ہے کہ سر کے بال دو حصے کر کے کنپٹیوں پر ڈال لے۔ پھر کنگھا کر کے درست کرے، پھر دونوں لٹوں کو کانوں کے اوپر سے پیچھے کی طرف موڑے — اور یہ دونوں ہی اچھی ہیئتیں ہیں۔ اور دونوں جائز ہیں۔ مگر انبیاء کا طریقہ مانگ نکالنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کو امور فطرت میں شمار کیا ہے (بذل ۱:۳۴) اس لئے مانگ نکالنا مستحب ہے (فتح الباری ۱۰:۳۰۵) اور نبی ﷺ ناک کے مقابل مانگ نکالتے تھے۔ پس عورتوں کو بھی اسی طرح مانگ نکالنی چاہئے۔ آج کل جو دائیں بائیں مانگ نکالنے کا طریقہ رائج ہے وہ خلافِ سنت ہے۔

(۴) — حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے قَزَع سے منع کیا۔ لوگوں نے نافع رحمہ اللہ سے دریافت کیا کہ قزع کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا: بچہ کا سر کہیں سے مونڈنا، اور کہیں سے چھوڑ دینا (مشکوۃ حدیث ۴۴۲۶)

تشریح: قَزَع کے لغوی معنی ہیں: بادل کا پھٹ جانا اور آسمان میں بکھر جانا۔ اور حدیث میں وہ معنی مراد ہیں جو نافع رحمہ اللہ نے بیان کئے ہیں۔ اور قزع دو وجہ سے ممنوع ہے: اول: یہ شیاطین کی ہیئتوں میں سے ہے دوم: یہ مُثلہ یعنی شکل بگاڑنا ہے۔ اس کو لوگ ناپسند کرتے ہیں۔ صرف وہی لوگ اس کو پسند کرتے ہیں جو قزع کی عادت سے آفت رسیدہ ہیں۔

(۵) — سر اور ڈاڑھی کے بالوں کا اکرام کرنا چاہئے۔ یعنی دھونا، تیل لگانا اور کنگھا کرنا چاہئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جس کے بال ہوں اس کو چاہئے کہ ان کا اکرام کرے'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۵۰) مگر ہر وقت بناؤ سنگھار میں مشغول نہیں رہنا چاہئے۔ نبی ﷺ نے ہر روز تیل کنگھا کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک روز چھوڑ کر کرے (مشکوۃ حدیث ۴۴۴۸) حدیث کا منشا افراط و تفریط کے درمیان اعتدال قائم کرنا ہے۔

خودساختہ زینت اور فطرت بدلنے کی ممانعت

حدیث (۱) — حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدن گودنے والی، بدن گدوانے والی، بال نُچوانے والی، اور خوبصورت بننے کے لئے دانتوں میں فاصلہ کرانے والی عورتوں پر لعنت کی ہے، جو تخلیق الٰہی میں تبدیلی کرنے والی ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۴۴۳۱)

حدیث (۲) — نبی ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرنے والے ہیں۔ اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۴۲۹)

تشریح: دوسری حدیث میں لعنت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع اور ہر صنف کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ بدن میں نوعی اور صنفی احکام کے ظہور کو چاہتا ہے۔ مثلاً: جو مرد ہوگا اس کی ڈاڑھی نکلے گی، اور جو عورت ہوگی وہ طرب وخوشی اور نازک انداز کی طرف مائل ہوگی۔ اور ان نوعی اور صنفی احکام کا اقتضاء ہی بعینہ ان کی اضداد کی ناپسندیدگی ہے۔ پس ہر نوع اور ہر صنف کو اس کے فطری اقتضاء پر باقی رکھنا ضروری ہے۔ اور اس میں تبدیلی موجب لعنت ہے۔ چنانچہ جو مرد عورت بنتا ہے یا جو عورت مرد بنتی ہے: ان پر لعنت ہے۔

اور پہلی حدیث میں لعنت کی وجہ یہ ہے کہ زیب وزینت: بعض پسندیدہ ہے، بعض ناپسندیدہ۔ پسندیدہ آرائش وہ ہے جو فطری عمل کو تقویت پہنچائے، اور اس کیلئے ممد ومعاون بنے۔ جیسے سرمہ لگانا نگاہ کو قوت بخشتا ہے، اور سر میں تیل کنگھا کرنا بالوں کو غذا پہنچاتا ہے۔ پس یہ پسندیدہ آرائش ہے۔ اور اگر زیبائش فطرت کے خلاف ہو، جیسے انسان کا چوپایوں کی ہیئت اختیار کرنا یا کہیں سے سر منڈانا، کہیں سے چھوڑنا یا زبردستی کوئی ایسی چیز ایجاد کی گئی ہو جو فطرت کا تقاضا نہ ہو۔ جیسے بدن گودنا، اور وہ ایسی چیز ہو کہ اگر فطرت کو فیصلہ کرنے کا موقعہ دیا جائے تو وہ اس کو مثلہ قرار دے تو ایسی زیبائش ناپسندیدہ اور موجب لعنت ہے۔ پہلی حدیث میں سب باتیں مصنوعی حسن پیدا کرنے کی سعی یا فطرت میں تبدیلی ہیں، اس لئے ان عورتوں پر لعنت بھیجی گئی ہے۔

ومنها: التزيُّن بالشعور:

[۱] فإن الناس كانوا مختلفين في أمرها: فالمجوس: كانوا يقصُّون اللُّحى ويُوَفِّرُوْنَ الشوارب، وكانت سنةُ الأنبياء عليهم السلام خلافَ ذلك، فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ''خالفوا المشركين: أوفروا اللُّحى، وأَحْفُوْا الشوارب''

[۲] وكان ناس يحبون التشعُّث والتَّمَهُّنَ والهيئةَ البذَّة، ويكرهون التجمُّلَ والتزيُّن؛ وناسٌ يتعمقون في التجمل، ويجعلون ذلك أحدَ وجوه الفخر وغَمْطِ الناس؛ فكان إخمالُ مذهبهم جميعًا، ورَدُّ طريقهم أحدَ المقاصد الشرعية، فإن مبنى الشرائع على التوسط بين المنزلتين،

والجمع بين المصلحتين:

[الف] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " الفِطرةُ خمسٌ: الخِتانُ، والاستحداد، وقَصُّ الشارب، وتقليم الأظفار، ونتف الإبط"

ثم مسَّت الحاجة إلى توقيت ذلك: ليمكن الإنكارُ على من خالف السنة، ولئلا يصل المتورِّع إلى الحلق والنتف كلَّ يوم، والمتهاون إلى تركها سنةً، فوُقِّتَ في قص الشارب، وتقليم الأظفار، ونتف الإبط، وحلق العانة: أن لايُترك أكثر من أربعين ليلة.

[ب] وقال صلى الله عليه وسلم: " إن اليهود والنصارى لايَصْبِغُوْنَ فخالفوهم"

[ج] وكان أهل الكتاب يَسْدُلون، والمشركون يَفْرُقُوْنَ، فَسَدَلَ النبي صلى الله عليه وسلم ناصيتَه، ثم فَرَقَ بعدُ؛ فالسدلُ: أن يُرْخِيَ ناصيته على وجهه، وهي هيئة بَذَّة، والفرق: أن يجعله ضفيرتين، ويرسل كلَّ ضفيرة إلى صُدْغ.

[د] ونهى صلى الله عليه وسلم عن القَزَع.

أقول: السر فيه: أنه من هيئات الشياطين، وهو نوع من المثلة، تعافُها الأنفس إلا القلوبُ المأوفة باعتيادها.

[ه] وقال صلى الله عليه وسلم: " من كان له شعر فليكرمه" ونهى عن الترجل إلا غبا: يريد التوسط بين الإفراط والتفريط.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " لعن الله الواشمات والمستوشمات، والمُتَنَمِّصَاتِ، والمُتَفَلِّجَاتِ للحسن، المغيِّرَاتِ خلقَ الله" ولعن صلى الله عليه وسلم المتشبهين من الرجال بالنساء، والمتشبهات من النساء بالرجال.

أقول: الأصل في ذلك: أن الله تعالى خلق كلَّ نوع وصنف مقتضيا لظهور أحكامٍ في البدن، كالرجل يَلْتَحِي، وكالنساء يَصْغِيْنَ إلى نوع من الطَّرَبِ والخِفَّة، فاقتضاؤُها للأحكام لمعنىً في المبدأ هو بعينه كراهية أضدادها، ولذلك كان المرضِيُّ بقاءَ كل نوع وصنف على ما تَقتضيه فطرتُه، وكان تغيير الخلق سببا لِلَّعن، ولذلك كَرِه النبيُّ صلى الله عليه وسلم إنزاءَ الحمير لتحصيل البغال.

فمن الزينة: مايكون كالتقوية لفعل الطبيعة، والتوطئة له، والتمشية إياه، كالكحل والترجُّل، وهو محبوب.

ومنها: مايكون كالمباين لفعلها، كاختيار الإنسان هيئة الدواب؛ ومايكون تعمقا في إبداع مالا تقتضيه الطبيعة، وهو غير محبوب، إذا خُلي الإنسان وفطرتَه عدَّه مثلةً.

ترجمہ: اور عجم کی عادات وتعمقات میں سے: بالوں کے ذریعہ آراستہ ہونا ہے: (۱) پس لوگ بالوں کے معاملہ میں مختلف تھے: پس مجوسی ڈاڑھیاں کٹوایا کرتے تھے۔ اور مونچھیں بڑھایا کرتے تھے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی سنت اس کے برعکس تھی...... (۲) اور کچھ لوگ پراگندگی اور خستہ حالی اور بدحالی کو پسند کیا کرتے تھے۔ اور زیبائش وآرائش کو ناپسند کیا کرتے تھے۔ اور کچھ لوگ زیبائش میں غلو کیا کرتے تھے۔ اور وہ اس کو فخر اور حقیر سمجھنے کی صورتوں میں سے ایک صورت بنایا کرتے تھے۔ پس ان سبھی کے مذاہب کو گمنام کرنا اور ان کے طریقہ کو رد کرنا مقاصد شرعیہ میں سے ایک مقصد تھا۔ کیونکہ شریعت کا مدار دونوں مرتبوں کے درمیان اعتدال پر، اور دونوں مصلحتوں کے درمیان جمع کرنے پر ہے...... پس سدل: یہ ہے کہ اپنی پیشانی کے بال اپنے چہرے پر لٹکا دیئے جائیں۔ اور وہ بدنما حالت ہے (یہ سدل کی ناتمام تعریف ہے۔ اور عام طور پر یہی ناتمام تعریف کی جاتی ہے، اس لئے وہ بدنما ہیئت معلوم ہوتی ہے۔ لسان العرب میں پوری تعریف یہ ہے: السدل: الإرسال لیس بمَعْقُوْف و لا معقد یعنی بال اس طرح (پیچھے) چھوڑنا کہ وہ نہ پیچیدہ ہوں نہ الجھے ہوئے) اور فرق: یہ ہے کہ وہ بالوں کی دو لٹیں بنائے، اور ہر لٹ کو کنپٹی کی طرف چھوڑ دے (یہ بھی ناتمام تعریف ہے)

(۳) میں کہتا ہوں: اصل اس میں یعنی دوسری حدیث میں لعنت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع اور ہر صنف کو اس حال میں پیدا کیا ہے کہ وہ بدن میں احکام کے ظہور کو چاہنے والی ہے۔ جیسے مرد ڈاڑھی چھوڑتے ہیں۔ اور جیسے عورتیں مائل ہوتی ہیں ایک قسم کی خوشی اور ہلکے پن کی طرف، پس ان انواع واصناف کا احکام کو چاہنا مبادیٔ میں کسی معنی کی وجہ سے (یعنی مرد میں کوئی بات ہے اسی طرح عورت میں بھی کوئی بات ہے جو مذکورہ احکام کو چاہتی ہے) وہ بعینہ ان کی اضداد کی ناپسندیدگی ہے یعنی مرد کا مردانا پن خود چاہتا ہے کہ اس میں زنانہ پن بری چیز ہے اور اسی وجہ سے پسندیدہ ہے ہر نوع اور صنف کا باقی رکھنا اس پر جو اس کی فطرت چاہتی ہے۔ اور تخلیق کا تبدیل کرنا لعنت کے لئے سبب تھا۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے ناپسند کیا گدھوں کا چڑھانا خچروں کو حاصل کرنے کے لئے (یہ وجہ معقول نہیں، اس لئے اس کو شرح میں نہیں لیا[۱])

(پہلی حدیث میں لعنت کی وجہ:) پس زینت میں سے بعض وہ ہیں جو ہوتی ہیں طبیعت کے فعل کو تقویت پہنچانے کی طرح، اور اس کے لئے راہ ہموار کرنے کے طور پر، اور اس کو چلانے کے لئے (سب جملے مترادف ہیں) جیسے سرمہ اور تیل کنگھی کرنا۔ اور وہ پسندیدہ ہے ـــــ اور ان میں سے بعض: وہ ہیں جو ہوتی ہیں طبیعت کے عمل کے متضاد کی طرح، جیسے انسان کا چوپایوں کی ہیئت اختیار کرنا، اور بعض وہ ہیں جو گہرائی میں اترنا ہے اس چیز کی ایجاد میں جس کو فطرت نہیں چاہتی

[۱] گھوڑی سے گدھے کو ملا کر خچر حاصل کرنا: اس وجہ سے ممنوع ہے کہ اچھی مشین (گھوڑی) کے لئے گھٹیا مادّہ (MATERIAL) حاصل کرکے معمولی چیز (خچر) تیار کرنا ہے۔ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں: جو نفع ونقصان نہیں سمجھتے۔ یہ وجہ حدیث میں مصرح ہے۔ فرمایا: إنما یفعل ذلك الذین لایعلمون (ابوداؤد حدیث ۲۵۶۵) جب گھوڑی اعلیٰ درجہ کی مشین موجود ہے، تو اس کے لئے عمدہ مادّہ (گھوڑے کا نطفہ) مہیا کرکے اعلیٰ چیز (گھوڑا) حاصل کرنا ہی عقلمندی کی بات ہے۔ ہاں اگر گدھی اور گھوڑا ملانے سے خچر حاصل ہوتا تو ٹھیک تھا مگر ایسا نہیں ہوتا ۱۲

اور وہ پسندیدہ نہیں۔ جب چھوڑ دیا جائے انسان اس کی فطرت کے ساتھ تو وہ اس کو مثلہ شمار کرے گا۔

☆ ☆ ☆

۴— تصویر سازی

عجمیوں کی عادات وتعمقات میں سے کپڑوں، دیواروں اور غالیچوں میں تصویریں بنانا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اس سے روکا۔ اور ممانعت کی بنیاد دو چیزیں ہیں:

پہلی چیز: تصاویر خوش حالی اور آرائش وزیبائش کی شکلوں میں سے ایک شکل ہیں۔ کیونکہ عجمی لوگ ان کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے تھے۔ اور ان میں بے تحاشا دولت خرچ کیا کرتے تھے۔ پس تصاویر ریشم کے حکم میں ہوگئیں۔ اور ان کی ممانعت کی گئی۔ اور حرمت کی یہ وجہ درختوں وغیرہ کی تصاویر کو بھی عام ہے۔ یعنی ان کا رکھنا بھی جائز نہیں۔

دوسری وجہ: تصاویر کے ساتھ اختلاط رکھنا، اور ان کو بنانا اور ان میں دلچسپی لینا مورتیوں کی عبادت کا دروازہ کھولتا ہے۔ ان کی شان بڑھاتا ہے۔ اور مورتی بچاریوں کے لئے مورتیوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ اور اکثر لوگوں میں مورتیوں کی پوجا انہی تصاویر سے پیدا ہوئی ہے۔ اس لئے اسلام نے ان کو حرام قرار دیا ہے۔ اور حرمت کی یہ وجہ حیوانات کی تصاویر کے ساتھ خاص ہے پس غیر ذی روح کی تصویر بنانا اور اس کا رکھنا جائز ہے۔ چنانچہ ایک واقعہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: ''آپ حکم دیں کہ جو تصویر دروازے پر لٹکی ہوئی ہے اس کا سر کاٹ دیا جائے، تاکہ وہ درخت کی شکل کی بن جائے (مشکوۃ حدیث ۴۵۰۱) یعنی درختوں کی تصویر کی طرح اس کا فساد ہلکا پڑ جائے۔

فرشتے تصویر کی جگہ نہیں آتے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک وہ گھر جس میں (جاندار) کی تصویر ہوتی ہے: اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۹۲)

تشریح: چونکہ جاندار کی تصویروں میں مورتیوں کے معنی ہیں یعنی وہ پرستش کی ایک چیز ہیں، اور ملأ اعلی میں مورتیوں اور ان کے بچاریوں پر غضب ولعن کا داعیہ متحقق ہو چکا ہے یعنی ان کو شرک اور مشرکین سے شدید نفرت ہے، اس لئے ضروری ہے کہ تصویروں سے فرشتے نفرت کریں۔ چنانچہ وہ کسی ایسی جگہ میں داخل نہیں ہوتے جہاں کسی جاندار کی تصویر ہوتی ہے۔

ہر تصویر سے جان پیدا ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہر تصویر ساز جہنم میں جائے گا۔ وہاں اس کے لئے ہر اس تصویر کے بدل جو اس نے بنائی ہے: ایک جان بنائی جائے گی، جو اس کو جہنم میں سزا دے گی!'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۹۸)

تشریح: جب قیامت کے دن لوگ اپنے اعمال کے ساتھ میدانِ محشر میں جمع کئے جائیں گے تو مصور کا عمل (تصویر سازی) ایسے نفوس کی صورت میں جلوہ گر ہوگا جن کا مصور نے تصویر بناتے وقت اپنے دل میں خیال جما رکھا تھا۔ اور جن کی نقل کرنے کا مصور نے اپنے عمل میں ارادہ کیا تھا۔ اس لئے کہ وہی نفوس تصویر بناتے وقت اس کے دل ودماغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مثلاً: مصور زید کی تصویر بناتا ہے تو پورے عمل کے دوران وہی اس کے حواس پر چھایا رہتا ہے۔ پس وہ قیامت میں متشکل ہوکر جہنم میں اس کو سزا دے گا۔

مصوّر کو تصویر میں جان ڈالنے کا حکم دیا جائے گا

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کوئی تصویر بنائی وہ سزا دیا جائے گا، اور حکم دیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے۔ اور وہ روح پھونک نہیں سکے گا!'' اور عذاب جاری رہے گا (مشکوۃ حدیث ۴۴۹۹)

تشریح: مصور کا نقل کرنے پر اقدام یعنی کسی نے مصور کو اپنی یا کسی کی تصویر بنانے کا آڈر دیا، اور وہ تعمیل کے لئے تیار ہوگیا، اور اس کی یہ کوشش کہ وہ صورت گری میں آخری درجہ کو پہنچے یعنی ہو بہو تصویر بنائے: یہ دونوں عمل قیامت کے دن اس طرح ظاہر ہوں گے کہ اس سے کہا جارہا ہوگا کہ وہ اس میں روح پھونکے یعنی جب تو نے سارے جتن کرلئے، اور ایسی صورت بنائی جس پر حقیقت کا دھوکہ ہوتا ہے تو اب باقی کیا رہ گیا؟ بس جان ڈالنے کی کمی ہے، پس یہ کمی بھی پوری کردے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے بس کی نہیں، پس عذاب برابر جاری رہے گا۔

ومنها: صناعة التصاوير في الثياب والجُدران والأنماط: فنهى عنها النبي صلى الله عليه وسلم، ومدار النهي شيئان:

أحدهما: أنها أحدُ وجوهِ الإرفاهِ والزينةِ، فإنهم كانوا يتفاخرون بها، ويبذلون أموالاً خطيرة فيها، فكانت كالحرير، وهذا المعنى موجود في صورة الشجر وغيرها.

وثانيهما: أن المخامرة بالصور، واتخاذَها، وجَرَيَانَ الرسمِ بالرغبة فيها: يفتح بابَ عبادةِ الأصنام، ويُنَوِّهُ أمرها، ويذكِّرها لأهلها؛ وما نشأتْ عبادةُ الأصنام في أكثر الطوائفِ إلا من هذه؛ وهذا المعنى يختص بصورة الحيوان، ولذلك أمر بقطع رأس التماثيل، لتصير كهيئة الشجر، وخف فساد صناعةِ صورة الأشجار.

قال صلى الله عليه وسلم: " إن البيت الذي فيه الصورةُ لا تدخله الملائكة" وقال صلى الله عليه وسلم: " كل مصور في النار، يَجْعَلُ له بكل صورة صوَّرها نفسًا، فيعذب به في جهنم" وقال صلى الله عليه وسلم: " من صور صورة عُذب، وكُلِّفَ أن ينفخ فيها، وليس بنافخ.

أقول:

[۱] لما كانت التصاوير فيها معنى الأصنام، وقد تحقق في الملأ الأعلى داعيةُ غضبٍ ولعنٍ على الأصنام وعَبَدَتِها: وجب أن يتنفَّر منها الملائكة.

[۲] وإذا حُشر الناس يوم القيامة بأعمالهم: تمثل عملُ المصور بالنفوس التي تصوَّرها في نفسه، وأراد محاكاتِها في عمله: لأنها أقرب ماهنالك.

[۳] وظهر إقدامُه على المحاكاة، وسعيُه أن يبلغ فيها غايةَ المدى: في صورة التكليف بأن ينفخ فيها الروحَ، وليس بنافخ.

ترجمہ: واضح ہے۔ قوله: يذكرها لأهلها: یعنی اختلاط، اتخاذ اور ریت میں سے ہر ایک مورتیوں کو یاد دلائیگا مورتیوں والوں کو یعنی ان کے پجاریوں کو..... قوله: خف فسادَ إلخ معاملہ ہلکا پڑ جائے گا درختوں کی صورت بنانے کی خرابی کی طرح۔ فساد منصوب بنزع خافض ہے..... تمثل بالنفوس: جانوں کی صورت میں متشکل ہوگا..... قوله: لأنها أقربُ ما هنالك: اس لئے کہ وہ نفوس اس چیز سے زیادہ قریب ہیں جو وہاں ہے۔ یعنی محاکات (تصویر سازی) کے وقت زیادہ تر انہیں نفوس کا تصور رہا تھا۔

۵— ساز وسرود اور بہلاوے کی باتیں

عجمیوں کی عادات وتعمقات میں رنگ ورباب، ساز وسرود اور دل خوش کرنے والے مشاغل ہیں۔ یعنی وہ سامانِ تفریح جو آدمی کا غم غلط کرے، دنیاو آخرت کی فکر بھلادے، اور اوقات کو ضائع کرے۔ جیسے آلاتِ موسیقی، شطرنج، کبوتر بازی اور جانوروں کو لڑانا وغیرہ۔ ان تمام تفریحی مشاغل کو شریعت نے حرام کیا۔ جس پر احادیث ذیل دلالت کرتی ہیں:

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نَردشیر کھیلا، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی!'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۰۵)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نَردشیر کھیلا، اس نے گویا اپنے ہاتھ خنزیر کے خون اور گوشت میں رنگ لئے!'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۰۰)

حدیث (۳) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت میں ایسے لوگ ضرور ہونگے جو شرمگاہ، ریشم، شراب اور آلاتِ موسیقی کو حلال کرلیں گے'' (بخاری حدیث ۵۵۹۰ مشکوۃ حدیث ۵۳۴۳)

حدیث (۴) — رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا جو کبوتر کا پیچھا کررہا تھا، پس فرمایا: ''شیطان شیطانی کے



پیچھے جارہا ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۰۶)

حدیث (۵) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو لڑانے سے منع فرمایا (ابوداؤد حدیث ۲۵۶۲)

کھیل تفریح والے مشاغل کی ممانعت: تین وجوہ سے ہے: اول: جب انسان ان چیزوں میں مشغول ہوتا ہے تو وہ کھانے پینے اور ضروریات تک سے غافل ہوجاتا ہے۔ استنجے کا تقاضا ہوتا ہے تو بھی نہیں اٹھتا۔ دوم: اگر ان چیزوں میں مشغولیت کا رواج چل پڑے گا تو لوگ مملکت پر بوجھ بن جائیں گے۔ حکومت کو ان کی کفالت کرنی پڑے گی۔ سوم: لوگ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہونگے، اور وہ آخرت کی تیاری نہیں کریں گے۔

شادی میں نغمہ دھپڑا جائز ہے

اور جان لیں کہ شادی ولیمہ جیسی تقریبات میں نغمہ طبلہ بجانا عرب وعجم کی عادت اور ان کا طریقہ ہے۔ کیونکہ فرحت وسرور کی حالت چاہتی ہے کہ کچھ خوش کن بات ہو۔ پس یہ چیزیں سامانِ تفریح میں شامل نہیں۔ سامانِ تفریح: مطلوبہ فرحت وسرور سے زائد چیزوں میں مشغولیت ہے، مثلاً بانسری بجانا: جس کا نبی ﷺ کے زمانہ میں حجاز اور دیگر آباد بستیوں میں رواج تھا۔

حدیث ـــــ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس نکاح کی تشہیر کرو، اور اس پر دھپڑا بجاؤ'' (مشکوۃ حدیث ۳۱۵۲ کتاب النکاح)

تشریح: کھیل کی دو قسمیں ہیں: حرام اور حلال۔ حرام: مست کن آلات ہیں، جیسے بانسریاں۔ اور حلال: ولیمہ وغیرہ خوشی کے مواقع میں نغمہ اور دھپڑا بجانا ہے۔

شعر خوانی جائز ہے

اسی طرح حُدی خوانی جائز ہے۔ حُدی: درحقیقت وہ گانا ہے جو اونٹوں کو وجد میں لانے کے لئے گایا جاتا ہے۔ مگر یہاں مراد مطلق شعر خوانی ہے جس میں لہجہ کا اتار چڑھاؤ ہو۔ اور یہ جائز اس لئے ہے کہ یہ شگفتگی اور شادمانی کے قبیل سے ہے۔ تفریحی مشاغل میں شامل نہیں۔

جنگی مشقیں جائز ہیں

اسی طرح جنگی آلات سے کھیلنا، جیسے تیراندازی کا مقابلہ، گھوڑوں کو سدھانا، اور نیزہ بازی وغیرہ جائز ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں حقیقت میں کھیل نہیں۔ ان میں شرعی مصلحت ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ: ''ہر وہ چیز جس سے مسلمان آدمی دل بہلائے: بیکار ہے۔ مگر چاند ماری کرنا، گھوڑے کو سدھانا، اور بیوی سے ہنسی مذاق کرنا'' (رواہ الاربعہ، فتح الباری ۹۱:۱۱) اور حدیث میں ہے کہ حبشیوں نے عید کے دن مسجد نبوی (کے احاطہ) میں نیزوں اور ڈھال کا کرتب دکھایا ہے (بخاری حدیث ۴۵۴)

> ومنها: الاشتغال بالمُسَلِّيَاتِ: وهي ما يُسَلِّي النفسَ عن هَمِّ آخرته ودنياه، ويُضيع الأوقاتِ،

كـالـمـعازِف، والشطرنج، واللعبِ بالحَمَام، واللعِب بتحريش البهائم، ونحوِها: فإن الإنسان إذا اشتغل بهذه الأشياء لَهِيَ عن طعامه وشرابه وحاجته، وربما كان حاقنا، ولايقوم للبول: فإن جرى الرسمُ بالاشتغال بها صار الناس كَلًّا على المدينة، ولم يتوجَّهوا إلى إصلاح نفوسهم.

واعلم: أن الغناء والدف في الوليمة ونحوِها عادةُ العرب والعجم ودَيدنُهم، وذلك: لما يقتضيه الحال من الفرح والسرور، فليس ذلك من المسلِّيات، إنما ميزانُ المسليات: ماكان في زمنه صلى الله عليه وسلم في الحجاز وفي القرى العامرة: الاشتغالُ به زائدًا على الفرح والسرورِ المطلوبَين، كالمزامير.

قال صلى الله عليه وسلم: "من لعب بالنرد فقد عصى الله ورسولَه" وقال صلى الله عليه وسلم: "من لعب بالنردشير فكأنما صَبَغَ يدَه في لحم خنزير ودمِه" وقال صلى الله عليه وسلم: "ليكونَنَّ من أمتي أقوام يستحلُّون الحِرَ والحرير، والخمر، والمعازف" وقال صلى الله عليه وسلم: "أَعْلِنوا هذا النِكاحَ، واضربوا عليه بالدفوف"

[أقول:] فالملاهي نوعان: محرَّم: وهي الآلات المطربة، كالمزامير؛ ومباح: وهو الدفُّ والغناء في الوليمة ونحوِها من حادثِ سرور.

وأما الحُدَاء: وهو في الأصل: ما يُقصد به تَهَيُّجُ الإبل؛ ولكن المراد هنا مطلق النشيد، مع تاليف الألحان والإيقاع، فهو مباح، فإنه من المباسَطات، دون المسليات.

وأما اللعب بآلات الحرب: كالمناضلة، وتأديبِ الفرس، واللعِبِ بالرماح: فليس من اللعبِ في الحقيقة، لِمَا فيه من مقصود شرعي؛ وقد لعبت الحبشة بالحِراب والدَّرَقِ بين يدى رسولِ الله صلى الله عليه وسلم في مسجده.

وقال صلى الله عليه وسلم لرجل يَتْبَعُ حمامةً: "شيطان يَتْبَعُ شيطانة!" ونهى عليه السلام عن التحريش بين البهائم.

لغات اور وضاحتیں: سَلَّاه عنه ومنه: غم غلط کرنا۔ یہی معنی أَسْلٰی فلانا عن هَمِّه کے ہیں..... المِعْزَف: باجہ، ساز، آلۂ موسیقی، سارنگی وغیرہ..... شطرنج: ایک کھیل جو ۳۲ مہروں اور ۶۴ خانوں سے کھیلا جاتا ہے۔ یہ اصلاً ایک ہندوستانی کھیل ہے جو دو شخص کھیلتے ہیں۔ ہر کھلاڑی کے پاس سولہ مہرے ہوتے ہیں جن کو وہ جارحانہ اور مدافعانہ انداز میں چونسٹھ مربع خانوں کی بساط پر اس مقصد سے چلاتا ہے کہ مخالف کا سب سے اہم مہرہ یعنی بادشاہ ہر طرف سے اس طرح گھر جائے کہ کسی بھی خانے میں جانے کی گنجائش نہ ہو، اس طرح اس کو شہ مات دی جاتی ہے..... من الفرح والسرور: ما كا

بیان ہے......قولہ: ماکان فی زمنہ إلخ کان: فعل ناقص، الاشتغال بہ: اس کا اسم، زائدًا إلخ اس کی خبر، فی زمنہ إلخ ظرف ہے الاشتغال کا، کان کی خبر مقدم نہیں ہے۔اور فی الحجاز: کائنًا سے متعلق ہوکر زمنہ کی ضمیر مجرور کا حال ہے۔
ترجمہ: سامان تفریح کا معیار وہی ہے جس میں مشغول ہونا نبی ﷺ کے زمانہ میں حجاز اور آباد بستیوں میں اس فرحت وسرور سے زیادہ تھا جو دونوں مطلوب ہیں، جیسے بانسریاں اس دور میں بھی فضول کھیل میں شمار ہوتی تھیں......نَرْد: چوسر کی طرح کا ایک کھیل: جو دُہری بساط پر کھیلا جاتا ہے۔ایک ڈبیا میں کنکریاں یا پلاسٹک کی گوٹیں ہوتی ہیں۔اور دو نگ ہوتے ہیں، جن کو ہلا کر نکالا جاتا ہے۔جیسا نگ نکل آتا ہے اس کے مطابق کنکریاں یا گوٹیں آگے بڑھائی جاتی ہیں......نرد اور نردشیر ایک ہیں......اور نرد ہی کو چوسر کہتے ہیں......حِرٌ: چوت، عورت کی شرمگاہ، اس کی اصل حِرْحٌ ہے...... قولہ: مع تالیف الألحان: راگوں کو جوڑنے اور واقع کرنے کے ساتھ یعنی آواز میں زیر وبم اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ......الحِرَاب: نیزہ...... الدَّرَق: ڈھال۔

☆　☆　☆

۶ — فضول سواریاں

عجمیوں کی عادات میں سواریوں کی بڑی تعداد پالنا تھا۔وہ سواریاں ضرورت کے لئے نہیں پالتے تھے، بلکہ نمائش اور بڑائی جتانے کے لئے پالتے تھے۔چنانچہ نبی ﷺ نے ذیل کی روایت میں اس پر نکیر فرمائی:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کچھ اونٹ شیاطین کے لئے ہوں گے، اور کچھ گھر شیاطین کے لئے ہوں گے!'' حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: شیاطین کے اونٹ تو میں نے دیکھے ہیں: ایک شخص اپنے ساتھ عمدہ قسم کی اونٹنیاں لیکر (سفر میں) نکلتا ہے، جن کو اس نے فربہ کیا ہے۔ان میں سے کسی پر سواری نہیں کرتا (کیونکہ وہ ضرورت سے زائد ہیں) اور وہ اپنے ایسے بھائی کے پاس سے گزرتا ہے جو بے سواری رہ گیا ہے (اس کی سواری راستہ میں مرگئی ہے، لاغر ہوگئی ہے یا کھوگئی ہے) پس وہ اس کو سوار نہیں کرتا یعنی وہ سواریاں دوسروں کے کام بھی نہیں آتیں، اس لئے وہ شیاطین کے لئے ہیں (مشکوۃ حدیث ۳۹۱۹ باب آداب السفر)

کتا پالنے کی ممانعت کی وجہ

جاہلیت کے لوگ کتا پالنے کے شوقین تھے، جبکہ کتا ایک ملعون جانور ہے۔فرشتوں کو اس سے اذیت پہنچتی ہے۔کیونکہ کتے کو شیاطین سے مناسبت ہے جیسا کہ چھپکلی کے بیان میں گذرا۔چنانچہ درج ذیل حدیث میں نبی ﷺ نے اس کے پالنے کو حرام قرار دیا ہے:

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے کوئی کتا پالا — چوپانی، شکار یا کھیتی کا کتا چھوڑ کر — تو روزانہ

ایک قیراط اس کے ثواب سے کم ہوجائے گا'' (متفق علیہ مشکوۃ حدیث ۴۰۹۹) اور دوسری متفق علیہ روایت میں ''دو قیراط'' ہے (مشکوۃ حدیث ۴۰۹۸) اور جو کتوں کا حکم ہے وہی بندر اور خنزیر کا بھی ہے۔ ان کا پالنا بھی حرام ہے۔ کیونکہ یہ بھی ملعون جانور ہیں۔

تشریح: ثواب کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کتا بہیمیت کو تقویت پہنچاتا ہے، اور ملکیت کو مغلوب کرتا ہے۔ چنانچہ کتے کے شوقین نیکوکاری سے دور ہوتے ہیں ——— اور قیراط: جزءِ قلیل کی تمثیل ہے۔ پس دو قیراط اور ایک قیراط میں کچھ منافات نہیں۔ ایک قلیل ہے دوسرا اقل!

ومنها: اقْتِنَاءُ عددٍ كثير من الدواب: لايَقْصُدُ بذلك كفايةَ الحاجة، بل مراءاةَ الناس، والفخر عليهم:

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "فِراشٌ للرجل، وفراش لامرأته، والثالث للضيف، والرابع للشيطان!" وقال صلى الله عليه وسلم: "تكون إبل للشياطين، وبيوتٌ للشياطين" قال أبو هريرة رضى الله عنه: أما إبل الشياطين فقد رأيتُها. يخرج أحدكم بنَجيبات معه، قد أَسْمَنَها، ولا يعلو بعيرًا منها، ويمر بأخيه قد انقطع به، فلا يَحْمله"

وكان أهل الجاهلية مولعين باقتناء الكلاب: وهو حيوان ملعون تتأذى منه الملائكة، فإن له مناسبةً بالشياطين، كما قلنا في الوزغ، فحرَّم النبى صلى الله عليه وسلم اقتناءَ ها، وقال: "من اتخذ كلبا ——— إلا كلبَ ماشية، أو صيد، أو زرع ——— انتقص من أجره كلَّ يوم قيراط" وفي رواية: "قيراطان" وفي حكم الكلاب القردة والخنازير.

أقول: السر في انتقاص أجره: أنه يُمِدُّ البهيمية، ويَقْهَرُ الملكية؛ والقيراط: خرج مخرج المثل، يريد به الجزء القليلَ؛ ولذلك لم يكن بين قوله صلى الله عليه وسلم: قيراطان، وقوله: قيراط: مناقضة.

وضاحت: ایک حدیث شرح میں نہیں لی۔ کیونکہ اس کا زیر بحث مسئلہ سے تعلق نہیں۔ الا بتکلف۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ''ایک بستر مرد کے لئے اور ایک بستر اس کی بیوی کے لئے، اور تیسرا مہمان کے لئے، اور چوتھا شیطان کے لئے ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۳۱۰ کتاب اللباس) ...... اور زمانۂ نبوی میں ایک قیراط: درہم کا چھٹا حصہ ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

۷ ——— سونے چاندی کے برتن

عجمیوں کی عادات وتعمقات میں سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال بھی تھا۔ چنانچہ درج ذیل روایات میں ان کی ممانعت کی گئی:



حدیث(۱) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو چاندی کے برتن میں پیتا ہے وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ہی غَرغَراتا ہے'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۲۷۱) اور مسلم کی ایک روایت میں سونے کے برتن کا بھی ذکر ہے۔

حدیث(۲) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سونے اور چاندی کے برتن میں مت پیو، اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھاؤ۔ یہ چیزیں کفار کے لئے دنیا میں اور تمہارے لئے آخرت میں ہیں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۲۷۲)

تشریح: سونے چاندی کے برتنوں کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ سونا ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعہ عجمی لوگ ایک دوسرے پر فخر کیا کرتے ہیں۔ پس اگر ان کے استعمال کا رواج چل پڑے گا تو دنیا طلبی میں انہماک کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ شریعت نے اس فساد کا سدّباب کر دیا۔ پہلے زیورات کے بیان میں جو دو اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے پہلی بات یہی ہے۔

تین باتیں

حدیث(۱) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''برتنوں کو ڈھانک دو، مشکیزوں کا منہ باندھ دو، دروازے بند کرو، اور شام کے وقت بچوں کو روک لو، کیونکہ جنات پھیلتے اور اچک لیتے ہیں۔ اور سوتے وقت چراغوں کو بجھادو، کیونکہ چھوٹا شرارتی کبھی چراغ کی بتی کھینچتا ہے، پس گھر والوں کو جلا دیتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۹۵)

حدیث(۲) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''برتنوں کو ڈھانک دو، مشکیزوں کا منہ باندھ دو، دروازوں کو بھیڑ دو اور چراغوں کو بجھادو، پس بیشک شیطان کسی (بند) مشکیزہ میں نہیں گھستا۔ اور کوئی (بند) دروازہ اور کوئی (بند) برتن نہیں کھولتا'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۹۶)

حدیث(۳) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''برتنوں کو ڈھانک دو، اور مشکیزوں کو باندھ دو، پس بیشک سال میں ایک رات ایسی ہے جس میں وباء اترتی ہے۔ نہیں گزرتی وہ کسی ایسے برتن پر جس پر ڈھکنا نہ ہو، اور نہ کسی ایسے مشکیزہ پر جس پر بندھن نہ ہو، مگر اس وباء میں سے کچھ حصہ اس میں اتر تا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۲۹۸)

تشریح: ان روایتوں میں تین باتیں ہیں:

پہلی بات ــــ شام کے وقت جنات پھیلتے ہیں ــــ کیونکہ شیاطین اپنی اصل فطرت میں ظلمانی (تاریک مخلوق) ہیں اس لئے جب شام کی تاریکی پھیلتی ہے تو ان کو بہجت وسرور حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ خوشی سے اچھلتے ہیں۔ اور زمین میں پھیل جاتے ہیں اور بچوں کو اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں۔

دوسری بات ــــ شیاطین بند چیزوں میں نہیں گھستے ــــ ہم نے جو بات محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ شیاطین کے اثرات زیادہ تر فطری افعال کے ضمن میں پائے جاتے ہیں مثلاً جب ہوا گھر میں داخل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ جن داخل

ہوتا ہے۔ اور جب کوئی پتھر لڑھکتا ہے، تو اس کے لڑھکنے میں شیطان مدد کرتا ہے، پس وہ عادت سے زیادہ لڑھکتا ہے۔ اور ایسی اور صورتیں۔ اس لئے جو برتن، مشکیزہ اور دروازہ بند ہوتا ہے اس میں جن نہیں گھستا۔

تیسری بات ــــ سال کی کسی رات میں وباء کا اترنا ــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ لمبا وقت گزرنے کے بعد ایک ایسا وقت آتا ہے جس میں ہوا خراب ہوجاتی ہے۔ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ ایک مرتبہ مجھے خبیث ہوا کا احساس ہوا۔ اور وہ ہوا لگتے ہی میرے سر میں درد ہوگیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ بیمار پڑ گئے۔ اور اس رات میں ان لوگوں میں بیمار پڑنے کی استعداد پیدا ہوگئی۔

۸ ـــ مکانات میں فخر ومباہات

عجمیوں کی عادات وتعمقات میں مکانات بنانے اور ان کو آراستہ پیراستہ کرنے میں مقابلہ بازی تھی۔ عجمی اس میں حد درجہ تکلف کیا کرتے تھے۔ اور اس میں ڈھیروں دولت خرچ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے نہایت سختی کرکے اس کا مداوا کیا۔ درج ذیل چار روایات اسی سلسلہ کی ہیں:

حدیث (۱) ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کو اس کا اجر ملتا ہے، مگر اس مٹی میں یعنی تعمیر میں جو خرچ کرتا ہے (اس کا کچھ اجر نہیں ملتا) (مشکوۃ حدیث ۵۱۸۲ کتاب الرقاق)

ث (۲) ــــ ایک انصاری صحابی نے ایک قبہ بنایا۔ نبی ﷺ نے اس پر ناراضگی ظاہر کی۔ انھوں نے اس کو ڈھادیا۔ دوسرے وقت جب آپؐ وہاں سے گزرے تو قبہ نہیں تھا۔ آپؐ نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپؐ کو صورتِ حال بتائی گئی۔ اس موقعہ پر آپؐ نے فرمایا: ''ہر تعمیر اس کے مالک پر وبال ہے، مگر وہ جس کے بغیر چارہ نہیں! مگر وہ جس کے بغیرہ چارہ نہیں!!(مشکوۃ حدیث ۵۱۸۴)

حدیث (۳) ــــ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے یہاں کوئی مہمان آیا۔ اس کے لئے کھانا تیار کیا گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی دعوت دیدی جائے۔ چنانچہ آپؐ تشریف لائے، اور دروازہ پر رک گئے۔ گھر کے ایک کونہ میں ایک منقش پردہ پڑا ہوا تھا۔ آپؐ اس کو دیکھتے ہی واپس لوٹ گئے۔ حضرت فاطمہؓ نے حضرت علیؓ کو بھیجا کہ دیکھیں آپؐ کیوں لوٹ گئے؟ حضرت علیؓ نے جاکر وجہ دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا: ''میرے لئے ــــ یا فرمایا کسی بھی نبی کے لئے ــــ مناسب نہیں کہ وہ کسی آراستہ کئے ہوئے گھر میں داخل ہو'' (ابوداؤد حدیث ۳۷۵۵ کتاب الأطعمة)

حدیث (۴) ــــ نبی ﷺ ایک غزوہ میں تشریف لے گئے۔ پیچھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دروازے پر ایک رنگین جھالردار اونی پردہ لٹکایا۔ جب آپؐ سفر سے لوٹے تو اس کو پھاڑ دیا، اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم نہیں دیا کہ ہم پتھروں اور مٹی کو کپڑے پہنائیں!'' (مشکوۃ حدیث ۴۴۹۴ باب التصاویر)

ومنها: استعمالُ أواني الذهب والفضة: قال صلى الله عليه وسلم:" الذى يشرب فى آنية الفضة إنما يُجَرْجِرُ فى بطنه نار جهنم" وقال صلى الله عليه وسلم:" لا تشربوا فى آنية الذهب والفضة، ولا تأكلوا فى صِحافها، فإنهالهم فى الدنيا، ولكم فى الآخرة" وقد ذكرنا من قبلُ ما ينكشف به سره.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" خَمِّرُوا الآنية، وأَوْكُوا الأسقيةَ، وأَجِيْفُوا الأبوابَ، وأكْفِتُوا صبيانكم عند المساء، فإن للجن انتشارًا وخَطْفَةً، وأَطْفِئُوا المصابيح عند الرُّقاد، فإن الفويسقة ربما اجْتَرَّت الفتيلة، فأحرقتْ أهلَ البيت" وفى رواية:" فإن الشيطان لايَحُلُّ سقاءً، ولا يفتح بابا، ولاينكشف إناء" وفى رواية:" فإن فى السنة ليلةً، ينزل فيها وباءٌ، لايمر بإناءٍ ليس عليه غطاءٌ، أو سقاءٍ ليس عليه وِكاءٌ، إلا نزل فيه من ذلك الوباء"

أقول:

[۱] أما انتشار الجن عند المساء: فلكونهم ظُلما نيين فى أصل الفطرة، فيحصل لهم عن انتشار الظلمة ابتهاجٌ وسرور، فينتشرون.

[۲] وأمَّا إن الشيطان لايَحُلُّ سِقاءً: فلأن أكثر تأثيراتها ــ على ما أدركنا ــ فى ضمن الأفعال الطبيعية، كما أن الهواء إذا دخل فى البيت دخل الجنى معه، وإذا تدهدهَ الحجرُ أَمَدَّ فى تدهدهه، فتدهدَهَ أكثرَ مما تقتضيه العادة، ونحو ذلك.

[۳] وأما إن فى السنة ليلةً ينزل فيها الوباء: فمعناه: أنه يجيئ بعد زمان طويل وقت يفسد فيه الهواءُ؛ وقد شاهدتُ ذلك مرة: أحسستُ بهواء خبيث، أصابنى صداع فى ساعةٍ مَاوصلَ إلىَّ، ثم رأيتُ كثيرًا من الناس قد مَرِضوا، واسْتَعَدُّوا لحدوثِ مرضٍ فى تلك الليلة.

ومنها: التطاول فى البنيان، وَتَزْوِيْقِ البيوت، وزخرفَتُها: فكانوا يتكلفون فى ذلك غاية التكلف، ويبذلون أموالاً خطيرة، فعالجه النبى صلى الله عليه وسلم بالتغليظ الشديد، فقال:"ما أنفق المؤمن من نفقة إلا أُجِرَ فيها، إلا نفقتَه فى هذا التراب" وقال صلى الله عليه وسلم:" إن كل بناء وبالٌ على صاحبه، إلا مَالَا! وإلا مَالَا!!" يعنى إلا مالابد منه، وقال صلى الله عليه وسلم:" ليس لى ــ أوليس لنبى ــ أن يدخل بيتا مزوَّقا" وقال عليه السلام:" إن الله لم يأمرنا أن نَكْسُوَ الحجارةَ والطين"

لغات: جَرْجَرَ الشرابُ فى الحَلَق: حلق میں پینے کی چیز کا غرغر کرنا......حَلَّ (ن،ض) المكانَ: اترنا، قیام

کرنا، مقیم ہونا......اسْتَعَدَّ له: تیار ہونا، آمادہ ہونا۔

تصحیح : قوله: أما إن الشیطان لایحل سقاءً مطبوعہ میں و کاءً تھا۔ یہ میں نے حدیث کے مطابق کرنے کے لئے بدلا ہے۔

☆ ☆ ☆

معالجہ اور منتروں کا بیان

نبی ﷺ سے پہلے لوگ امراض وآفات میں معالجات اور منتروں سے تمسک کیا کرتے تھے۔اور آئندہ کے احوال جاننے کے لئے فال، بدشگونی، خط یعنی رمل، کہانت، نجوم اور خوابوں کی تعبیر کو مضبوط پکڑے ہوئے تھے۔ان میں کچھ نامناسب باتیں تھیں۔جن سے نبی ﷺ نے روکا،اور باقی باتوں کی اجازت دی، مثلاً: داغنے کی ممانعت کی، اور جن منتروں میں شرکیہ کلمات تھے ان کو ساقط کیا۔ وقس علی ہذا۔

علاج کی حقیقت: علاج کی ماہیت: حیوانات، نباتات اور معدنیات کی خاصیات سے فائدہ اٹھانا ہے، اور اخلاط یعنی سوداء، صفرا، خون اور بلغم کا توازن قائم کرنا ہے۔ملّی قواعد کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے۔کیونکہ اس میں نہ شرک کا کوئی شائبہ ہے، نہ دین ودنیا کا کوئی مفسدہ۔بلکہ اس میں بہت فوائد اور لوگوں کے پراگندہ احوال کی درستگی ہے۔البتہ تین علاج درست نہیں:

۱۔ شراب سے علاج کرنا: کیونکہ شراب کا چسکہ لگ جاتا ہے تو چھٹتا نہیں۔یعنی منشیات کے ذریعہ علاج کرنے سے انسان ان کا عادی ہوجاتا ہے۔جیسے بعض لوگ دانتوں کی کمزوری کا علاج تمباکو سے کرتے ہیں۔پھر وہ اس کے عادی ہوجاتے ہیں۔اور شراب کے حکم میں ہر حرام چیز ہے۔حدیث میں ہے: لاتداووا بحرام: کسی بھی حرام چیز سے علاج مت کرو (مشکوۃ حدیث ۴۵۳۸)

۲۔ خبیث یعنی اذیت رساں چیز سے علاج کرنا: جیسے زہر سنکھیا وغیرہ سے علاج کرنا (مشکوۃ حدیث ۴۵۳۹) پس اگر کوئی دوسرا علاج ممکن ہو تو زہر سے علاج نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے کبھی آدمی مر بھی جاتا ہے۔

۳۔ داغ دینے کا علاج کرنا: اگر کوئی دوسرا علاج ممکن ہو تو یہ علاج بھی نہیں کرنا چاہئے۔کیونکہ آگ سے جلانا ان باتوں میں سے ہے جن سے فرشتے نفرت کرتے ہیں۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ فرشتے مجھے سلام کیا کرتے تھے۔جب میں نے ابن زیاد کے کہنے سے داغ لگوایا تو جب تک داغ کا نشان باقی رہا فرشتے میرے پاس نہیں آئے (سنن دارمی ۲: ۳۵ کتاب المناسک، باب فی القران)

فائدہ: احادیث میں نبی ﷺ سے جو علاج مروی ہیں ان کی بنیاد: عربوں کے تجربات ہیں یعنی وحی کے ذریعہ وہ علاج نہیں بتلائے گئے (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

منتر کی حقیقت: منتروں کی ماہیت یہ ہے کہ عالَم مثال میں کلمات کے لئے تحقق (پایا جانا) اور اثر ہے۔ جیسے تعریفی کلمہ خوش کرتا ہے، اور گالی ناراض کرتی ہے، یہ تحقق واثر ہے۔ منتروں کے کلمات کے بھی اثرات اثر انداز ہوتے ہیں۔ پس اگر منتر کے کلمات شرکیہ نہ ہوں تو قواعد ملیہ اُس کی اجازت دیتے ہیں۔ خصوصاً قرآن وحدیث کی دعائیں، اور ان کے مشابہ دیگر تضرعات: نہ صرف جائز ہیں۔ بلکہ مسنون ہیں۔

نظر برحق ہے: نظر کی تاثیر ثابت ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نظر لگانے والے کے دل میں کوئی چیز کُھب جاتی ہے، تو اس کی آنکھ سے ایک زہریلی بھاپ نکلتی ہے، جو نظر زدہ سے ٹکراتی ہے، پس وہ بیمار پڑ جاتا ہے یا ہلاک ہو جاتا ہے۔ جیسے بعض سانپ جب انسان کی نظر سے نظر ملاتے ہیں، تو ان کی آنکھوں سے زہر نکلتا ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی طرح اگر مانع نہ ہو تو نظر لگانے والے کی نظر بھی متاثر کرتی ہے۔ اور مانع یہ ہے کہ جب کوئی چیز دل میں کُھب جائے تو فوراً کہے: ماشاء الله، لاقوة إلا بالله نظر کا اثر رک جائے گا۔ اور اگر نظر لگ ہی جائے تو جسمانی علاج کی طرح اس کا علاج بھی مسنون ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں ایک لڑکی تھی۔ جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "اسے جھڑواؤ، اسے نظر لگی ہے" (مشکوۃ حدیث ۴۵۲۸)

فائدہ (۱) نظر جنات کی بھی لگتی ہے (بلکہ سحر ونظر کے واقعات میں زیادہ تر جنات ہی کی نظر ہوتی ہے، اور وہی سحر کرتے ہیں)

فائدہ: (۲) حدیث میں جو منتر، تعویذ اور ٹوٹکے کی ممانعت آئی ہے (مشکوۃ حدیث ۴۵۵۲) اس کا مصداق وہ چیزیں ہیں جن میں شرک ہو، یا اسباب میں غلو ہو کہ اللہ کو بھول جائے، اور اسباب پر تکیہ کر بیٹھے (یہ دونوں فائدے کتاب میں ہیں)

وكان الناس قبلَ النبي صلى الله عليه وسلم يتمسكون في أمراضهم وعاهاتهم بالطب والرُّقى، وفي تقدِمة المعرفة بالفأل، والطِّيَرة، والخَطّ — وهو الرمل — والكهانةِ، والنجوم، وتعبير الرؤيا؛ وكان في بعض ذلك مالاينبغي، فنهى عنه النبي صلى الله عليه وسلم، وأباح الباقي:

فالطبُّ: حقيقته: التمسك بطبائع الأدوية الحيوانيةِ، أو النباتيةِ، أو المعدِنيةِ، والتصرفُ في الأخلاط نقصا وزيادة؛ والقواعد الملية تُصَحِّحُه، إذ ليس فيه شائبةُ شركٍ، ولافسادٌ في الدين والدنيا، بل فيه نفع كثير، وجمعٌ لشمل الناس، إلا:

[الف] المداواة بالخمر: إذ للخمر ضَرَاوةٌ لا تنقطع.

[ب] والمداواة بالخبيث: أي السم، ما أمكن العلاج بغيره، فإنه ربما أفضى إلى القتل.

[ج] والمداواة بالكَيِّ: ما أمكن بغيره: لأن الحرق بالنار أحد الأسباب التي تتنفَّر منها الملائكة.

والأصل فيما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم من المعالجات: التجربةُ التي كانت عند العرب.

وأما الرُّقى: فحقيقتها: التمسكُ بكلماتٍ لها تحقُّقٌ في المثال وأثرٌ؛ والقواعدُ الملية

لاتدفعها مالم يكن فيها شرك، لاسيما إذا كان من القرآن والسنة، أو ما يشبههما من التضرعات إلى الله.

والعين حق: وحقيقتها: تأثيرُ إلمام نفسِ العائن، وصدمةٌ تحصل من إلمامها بالمَعِيْن؛ وكذا نظــرة الجن؛ وكلُّ حديث فيه نهي عن الرقي، والتمائم، والتِّوَلَةِ: فمحمولٌ على ما فيه شرك، أو انهماك في التسبب، بحيث يغفل عن الباري جلَّ شأنُه.

لغات: خط اور رمل: ایک پیغمبر ریت میں کچھ لکیریں کھینچ کر آئندہ کے احوال معلوم کیا کرتے تھے۔ اب یہ علم دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ وہ پیغمبر کس طرح لکیریں کھینچتے تھے وہ کسی کو معلوم نہیں، پس اب ایسا کرنا جائز نہیں ...... الضَراوۃ: چسکا لگ جانا۔ لت پڑ جانا: اچھی یا بری۔ حدیث میں ہے: إن للإسلام ضراوة ، اسلام کا چسکہ پڑ جاتا ہے۔ إن للحم ضراوة كضراوة الخمر: گوشت کا چسکہ بھی شراب کے چسکے کی طرح ہے ...... قوله: والعين حق: اور نظر لگنا برحق ہے۔ اور اس کی حقیقت: نظر لگانے والے کے نفس کے نزدیک ہونے کی تاثیر ہے، اور ایسی ٹکر ہے جو نظر لگانے والے کے نفس کے نزدیک ہونے سے نظر زدہ کو حاصل ہوتی ہے (دونوں کا ایک ہی مطلب ہے یعنی نظر لگانے والے کی نظر کا اثر نظر زدہ کو پہنچتا ہے)

☆ ☆ ☆

نیک و بدفالی، چھوت کی بیماری، کھوپڑی کا پرندہ اور چھلاوہ

شریعت نے چند باتوں کی ممانعت کی ہے۔ جیسے بدشگونی، چھوت کی بیماری، کھوپڑی کا پرندہ اور چھلاوہ وغیرہ۔ ان میں سے بعض تو بالکل بے اصل ہیں، خارج میں ان کا کوئی وجود نہیں، اس لئے ان کی نفی کی ہے جیسے کھوپڑی کا پرندہ اور ماہِ صفر کی نحوست۔ اور اکثر چیزوں کی اگرچہ حقیقت ہے، مگر شریعت نے بربنائے مصالح ان کی ممانعت کی ہے۔ شاہ صاحب قدس سرہٗ سب سے پہلے شگونِ نیک و بد کی حقیقت بیان کرتے ہیں:

نیک فالی اور بدفالی کی حقیقت

جب ملأ اعلیٰ میں کسی امر کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ چیزیں جن میں سرعت سے اثر پذیری کی صلاحیت ہوتی ہے، اس فیصلہ سے رنگین ہوتی ہیں۔ ملأ اعلیٰ کے فیصلوں کا ان پر سایہ پڑتا ہے، اور وہ بہت جلد ان کا اثر قبول کر لیتی ہیں۔ ایسی چیزیں درج ذیل ہیں:

① ــــ خیالات ــــ لوگوں کے تصورات عالم بالا کے فیصلوں سے جلد متاثر ہوتے ہیں۔ جنگ بدر شروع ہونے سے پہلے کفار لڑنے کے لئے بے تاب تھے، مگر جونہی جنگ شروع ہوئی وہ بھاگنے کی راہیں ڈھونڈ ھنے لگے۔ کیونکہ اللہ پاک نے ان

کے دلوں میں رعب ڈالدیا (سورۃ الانفال آیت ۱۲) اور استخارہ میں جو کسی طرف دل مائل ہوتا ہے وہ بھی عالم بالا کے فیصلہ کا اثر ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کا پختہ ارادہ ہوتا ہے، اور ایک دم رائے بدل جاتی ہے یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

(۲) ـــــ کبھی کسی بزرگ آدمی کے منہ سے ایسے ارادہ کے بغیر جو قابل لحاظ ہو یعنی بے ساختہ کوئی بات نکلتی ہے، جو درحقیقت مخفی خیال کا پیکر محسوس ہوتی ہے یعنی دل میں جو بات وارد ہوتی ہے: منہ سے نکلی ہوئی بات اس وارد قلبی کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ان کے منہ سے نکلا ہے۔ حدیث میں ہے کہ تبوک میں نبی ﷺ ایک کھجور کا سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب گدھے پر بیٹھ کر سامنے سے گذرے۔ آپؐ کی زبان مبارک سے بے ساختہ نکلا: قَطَعَ صلاتَنا قطع الله أثره۔ وہ صاحب فوراً اپاہج ہوگئے۔ ظاہر ہے آپؐ رحمتِ عالَم تھے۔ بددعا دینا آپؐ کی شان نہیں تھی۔ مگر نماز خراب ہونے سے جو تکلیف پہنچی اس پر یہ بات زبان مبارک سے نکل گئی، اور ویسا ہی ہو کر رہا (ابوداؤد حدیث ۷۰۵-۷۰۷)

(۳) ـــــ فضائی واقعات ـــــ جیسے کسی علاقہ میں بارش کا برسنا، ہوا آندھی کا چلنا وغیرہ۔ ان واقعات کے اسباب بھی فطری طور پر اکثر ضعیف ہوتے ہیں۔ کسی خاص صورت کے ساتھ ان کی تخصیص دو وجہ سے ہوتی ہے: ایک: فلکی اسباب کی وجہ سے۔ دوم: ملأ اعلیٰ کے فیصلہ کی وجہ سے۔ یعنی بادل کا کسی جگہ پر برسنا علوی اسباب کی بنا پر ہوتا ہے، یا نماز استسقاء کے نتیجہ میں ملأ اعلیٰ کا بارش برسنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو بادل اس کا اثر قبول کرتے ہیں، اور برس پڑتے ہیں۔

نیک فالی اور بدفالی کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ صلح حدیبیہ کی حدیث میں ہے کہ جب مکہ والوں کی کئی سفارتیں واپس گئیں، تو آخر میں سُہیل بن عَمرو آیا۔ نبی ﷺ نے اس کو آتا دیکھ کر صحابہ سے فرمایا: "یہ سہیل ہے، تمہارا کام تمہارے لئے آسان کردیا گیا!" یعنی اب صلح ہوجائے گی۔ سہیل کا آخر میں آنا محض اتفاق نہیں تھا۔ ملأ اعلیٰ کے فیصلہ کا مقتضی تھا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے آنے سے نیک فال لیا۔ اور بدفالی: نیک فالی کی ضد ہے۔ اور ضدین کا معاملہ یکساں ہوتا ہے۔ پس بدفالی کی بھی یہی حقیقت ہے۔

چنانچہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ بھی فضائی واقعات، بولی ہوئی باتوں، پرندوں کی آوازوں اور ان کی پرواز کے رخ وغیرہ سے اچھا برا شگون لیتے تھے۔ اور ان سے آئندہ کے واقعات پر استدلال کرتے تھے مثلاً: کام ہوگا یا نہیں؟ فتح ملے گی یا نہیں؟ مگر شریعت نے چار وجوہ سے بُرا فال لینے کی ممانعت کی، اور نیک فال لینے کی اجازت دی: ایک: اس وجہ سے کہ وہ واقعات، کلمات اور اصوات محض اتفاق اور اندازہ بھی ہوسکتے تھے۔ ضروری نہیں کہ وہ عالَم بالا کی اثر پذیری ہی کا نتیجہ ہوں۔ دوم: اس وجہ سے کہ بدشگونی سے دل میں طرح طرح کے وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ آدمی اس ادھیڑ بُن میں لگ جاتا ہے کہ میرا کام کیوں نہیں ہوگا؟ سوم: اس وجہ سے کہ بدشگونی سے کبھی اللہ کے انکار کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ جب بار بار برا فال نکلتا ہے تو آدمی اللہ تعالیٰ سے بدظن ہوجاتا ہے۔ چہارم: اس وجہ سے کہ بدفالی کی صورت میں توجہ اللہ تعالیٰ سے بالکل ہی ہٹ جاتی ہے۔ اور نیک فال میں یہ سب خرابیاں نہیں ہیں۔ بلکہ آدمی پُر امید ہوجاتا ہے، اور اللہ سے لَو لگا لیتا ہے۔ پھر اگر امید پوری نہ بھی ہو تو کچھ نقصان نہیں۔

چھوت کی بیماری: اسی طرح چھوت کی بیماری کی نفی کی، مگر اس نفی کے یہ معنی نہیں کہ اس کی کچھ حقیقت نہیں۔ عدوی کی نفی والی روایت میں یہ بھی ہے: فِرَّ من المجذوم کما تفِرُّ من الأسد یعنی کوڑھی سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو۔ معلوم ہوا کہ بعض امراض ایسے ہیں: جن میں مریض کے ساتھ اختلاط مرض کا سبب ہے۔ بلکہ نفی کی وجہ یہ ہے کہ عرب بعض امراض میں ذاتی تاثیر مانتے تھے، اور اللہ پر بھروسہ کرنا بالکل ہی بھول جاتے تھے۔ پس صحیح بات: یہ ہے کہ بعض بیماریاں مِنجملۂ اسباب مرض ہیں۔ مگر ان کی سببیت اس وقت تام ہوتی ہے جب ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نہ ہو۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوجاتا ہے کہ فلاں کو یہ بیماری نہیں لگے گی، تو اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ نظام عالم میں رخنہ پڑے بغیر پورا ہوتا ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قوتِ مدافعت قوی ہوجاتی ہے۔ اور وہ اس سبب کی تاثیر کو روک دیتی ہے۔ علم کلام کی اصطلاح میں یہ بات اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ ''یہ اسباب عادی ہیں، عقلی نہیں'' یعنی سنتِ الٰہی یہی جاری ہے کہ مریض کے ساتھ اختلاط سبب مرض ہوتا ہے۔ مگر عقلاً ایسا ہونا ضروری نہیں۔

کھوپڑی کا پرندہ: اور ہامہ یعنی کھوپڑی کا پرندہ محض بے اصل بات ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا خیال تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی کھوپڑی سے ایک پرندہ نکلتا ہے، جو مجھے سیراب کرو! مجھے سیراب کرو! چلاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بدلہ لیا جائے، ورنہ وہ پرندہ نقصان پہنچاتا ہے۔ شریعت نے اس کی ممانعت کی، کیونکہ اس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے۔ نافع وضار صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔

غُولِ بیابانی: چھلاوہ یعنی بھوت پریت بھی کوئی چیز نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بیابان میں بھوت بھوتنیاں اور چڑیلیں ہوتی ہیں، جو مسافروں کو ڈراتی اور راہ سے بھٹکا دیتی ہیں، اور چھپت ہوجاتی ہیں۔ یہ سب بے اصل باتیں ہیں۔

کیا یہ سب بے اصل باتیں ہیں؟

ایسا نہیں ہے کہ ان چیزوں کی قطعاً کچھ حقیقت نہ ہو، بلکہ ان کی اصلیت ہے۔ اور اس کی دو دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل: بہت سی روایات ہیں، جو ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں، جو جنات کے ثبوت اور ان کے دنیا میں گھومنے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور عدوی کی اصل کوڑھی سے دور رہنے کی روایت، اور عورت، گھوڑے اور گھر میں نحوست کی روایت ہے۔ پس یہ چیزیں بے اصل کیسے ہوسکتی ہیں؟ رہی ان چیزوں کی نفی تو وہ دو اعتباروں سے کی گئی ہے: ایک: اس اعتبار سے کہ ان چیزوں میں مشغول ہونا جائز نہیں یعنی شرعاً یہ ناپسندیدہ امور ہیں۔ دوم: اس اعتبار سے کہ ان چیزوں کی بنیاد پر کوئی دعوی درست نہیں۔ مثلاً کوئی شخص دعوی کرے کہ میرے چنگے اونٹوں کو فلاں کے بیمار اونٹوں نے مار دیا یا بیمار کردیا تو یہ دعوی مسموع نہیں ہوگا۔

دوسری دلیل: شریعت نے کہانت سے سختی سے روکا ہے۔ کہانت: جنات سے باتیں لیکر بیان کرنے کا نام ہے۔ اور

آپؐ نے اس شخص سے بے تعلقی ظاہر کی ہے جو کاہنوں کے پاس جاتا ہے۔ مگر جب آپؐ سے کاہنوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں۔ اور آسمانوں میں جو امر طے پایا ہے اس کا چرچا کرتے ہیں۔ شیاطین وہاں سے کوئی بات چرالاتے ہیں۔ اور جس کاہن کے وہ تابع ہوتے ہیں اس کو وہ ادھوری بات پہنچادیتے ہیں۔ کاہن اس میں سوجھوٹ ملا کر بات پوری کرتا ہے، پھر اس کی پیشین گوئی کرتا ہے'' یعنی جب کوئی معاملہ ملأ اعلی میں قرار پاتا ہے تو وہاں سے ملأ سافل پر، جن میں الہام قبول کرنے کی استعداد ہوتی ہے، چند قطرات مترشح ہوتے ہیں۔ اور ان کو اس امر مقدر کا علم ہوجاتا ہے۔ پھر کبھی ملأ سافل سے بعض ہوشیار جن کچھ باتیں لے لیتے ہیں۔ پھر کاہن ان سے اپنی فطری یا اکتسابی مناسبت کی وجہ سے لیتا ہے۔ اور اس میں جھوٹ ملا کر بات مکمل کر کے چلتی کر دیتا ہے۔ اس روایت سے کہانت کی نفی کے باوجود اس کی حقیقت —— جنات سے باتیں لینا —— ثابت ہوئی۔ پس آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ مذکورہ چیزوں کی ممانعت کی وجہ ان کا بے اصل ہونا اور خارج میں ان کا وجود نہ ہونا ہے۔ بلکہ ممانعت کی تین وجوہ ہیں: ایک: ان میں غلطی کا احتمال ہے۔ دوم: وہ شرک کا مظنہ ہیں۔ سوم: وہ فساد کی جڑ ہیں۔ اور اللہ پاک نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ جس چیز میں خرابیاں زیادہ ہوں اس کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''آپؐ بتادیں کہ شراب اور جوے میں بڑی خرابی اور لوگوں کے لئے کچھ فوائد ہیں، اور ان کی خرابی ان کے نفع سے بڑھی ہوئی ہے'' چنانچہ ان کو آخر میں حرام کردیا۔

أما الفأل والطيرة: فحقيقتهما: أن الأمر إذا قُضي به في الملأ الأعلى: ربما تَلَوَّنَتْ بلونه وقائعُ جُبلت على سرعة الانعكاس.

فمنها: الخواطر.

ومنها: الألفاظ التي يُتفوَّه بها من غير قصد معتد به، وهي أشباح الخواطر الخفية التي لايُقصد إليها بالذات،

ومنها: الوقائع الجوّية: فإن أسبابها في الأكثر من الطبيعة: ضعيفة، وإنما تختص بصورة دون صورة بأسباب فلكية، أو انعقادِ أمر في الملأ الأعلى.

وكان العربُ يستدلون بها على ما يأتي، وكان فيه تخمينٌ، وإثارة وسواسٍ، بل ربما كانت مظنةً للكفر بالله، وأن لاتطمح الهمةُ إلى الحق، فنهى النبي صلى الله عليه وسلم عن الطيرة، وقال: "خيرُها الفأل" يعني كلمةً صالحة يتكلم بها إنسانٌ صالح، فإنها أبعدُ من تلك القبائح.

ونَفَى العَدْوَىٰ: لابمعنى نفي أصلها، لكن العربَ يظنونها سببا مستقلا، ويَنْسَوْنَ التوكلَ رأسًا.

والحقُّ: أن سببية هذه الأسباب إنما تتم إذا لم ينعقد قضاءُ الله على خلافه: لأنه إذا انعقد أَتَمَّه الله من غير أن يَنْخَرِمَ النظام؛ والتعبير عن هذه النكتة بلسان الشرع: أنها أسباب عادية، لاعقلية.

والهامَّة: تفتح باب الشرك غالبًا، وكذلك الغُوْلُ، فنُهوا عن الاشتغال بهذه الأمور: لا لأن هذه ليست لها حقيقةٌ البتة، كيف؟ والأحاديثُ متظاهرةٌ على ثبوت الجن، وتردُّده في العالم، وعلى ثبوتِ أصلِ العدوى، وعلى ثبوتِ أصلِ الشؤم في المرأة والفرس والدار، فلاجرم أن المراد نفيُها من حيثُ جوازِ الاشتغال بها، ومن حيث أنه لايجوز المخاصمة في ذلك، فلايُسمع خصومةُ من ادّعى على أحد: أنه قتل إبلَه، أو أمرضها، بإدخال الإبل المريضة عليها، ونحوِ ذلك.

كيف؟ وأنت خبير بأن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن الكهانة — وهي: الإخبار عن الجن — أشدَّ نهيٍ، وبرئ ممن أتى كاهنا؛ ثم لما سئل عن حال الكهان أخبر أن الملائكة تنزل في العنان، فتذكر الأمرَ الذى قد قُضى في السماء، فتسترق الشياطين السمعَ، فتوحيه إلى الكهان، فيكذبون معها مائة كَذْبَة، يعني أن الأمر إذا تقرر في الملأ الأعلى ترشح منه رشحاتٌ على الملائكة السافلة التي استعدت للإلهام، فربما أخذ منهم بعض أذكياء الجن، ثم يتلقى الكهان منهم بحسب مناسبات جبلية وكسبية، فلا تشكَّنّ أن النهي ليس معتمدا على عدمها في الخارج، بل على كونها مظنةً للخطأ والشرك والفساد، كما قال عزَّ مِنْ قائل: ﴿قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ، وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾

ترجمہ: رہا فال اور بدشگونی: پس دونوں کی حقیقت: یہ ہے کہ جب کسی امر کا ملأ اعلی میں فیصلہ کیا جاتا ہے، تو کبھی اس امر کے رنگ سے وہ واقعات رنگین ہوجاتے ہیں جو تیزی سے سایہ پڑنے پر پیدا کئے گئے ہیں — پس ازانجملہ: خیالات ہیں — اور ازانجملہ: وہ الفاظ ہیں جن کو آدمی بولدیتا ہے ایسے ارادہ کے بغیر جو قابل لحاظ ہو۔ اور وہ الفاظ ان مخفی خیالات کے پیکر ہائے محسوس ہیں جن کا بالذات ارادہ نہیں کیا جاتا، یعنی اس مخفی خیال سے وہ الفاظ نہیں بولے جاتے، بلکہ بے ساختہ زبان پر جاری ہوجاتے ہیں — اور ازانجملہ: فضائی واقعات ہیں۔ پس بیشک ان کے اسباب عام طور پر فطرت سے کمزور ہوتے ہیں یعنی بادل کی فطرت میں کسی خاص جگہ برسنے کا تقاضا نہیں ہوتا۔ اور وہ فضائی واقعات ایک صورت کے ساتھ نہ کہ دوسری صورت کے ساتھ خاص ہوتے ہیں فلکی اسباب کی وجہ سے یا ملأ اعلی میں کسی امر کے انعقاد کی وجہ سے یعنی بادل کو دیوبند میں برسنا چاہئے، مظفرنگر میں نہیں، یہ تخصیص ان دو سببوں کی وجہ سے ہوتی ہے — اور عرب ان کے ذریعہ آئندہ کے واقعات پر استدلال کیا کرتے تھے۔ اور اس میں اندازہ اور وسوسوں کو ابھارنا تھا، بلکہ کبھی وہ اللہ کے انکار کی احتمالی جگہ ہوتے تھے، اور اس بات کی احتمالی جگہ ہوتے تھے کہ اللہ تعالی کی طرف توجہ بلند نہ ہو۔ پس نبی ﷺ نے بدشگونی سے منع فرمایا، اور فرمایا: ''ان میں اچھا فال ہے'' یعنی اچھا کلمہ جس کو کوئی بزرگ آدمی بولے (یہ بطور مثال ہے، ورنہ نیک فال کی بہت سی صورتیں ہیں) پس بیشک وہ کلمہ (جس سے نیک فال لیا گیا ہے) ان برائیوں سے بہت دور ہے۔

اور چھوت کی بیماری کی نفی کی۔ نہیں نفی کی اس کی اصل کی نفی کے معنی کے لحاظ سے۔ بلکہ عرب اس کو مستقل سبب خیال کرتے تھے، اور اللہ پر اعتماد کرنا سرے سے بھول جاتے تھے۔ اور برحق بات: یہ ہے کہ ان اسباب کی سببیت اس صورت میں تام ہوتی ہے جب اس کے خلاف اللہ کا فیصلہ منعقد نہ ہو۔ اس لئے کہ جب اللہ کا فیصلہ منعقد ہوجاتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ پورا کرتے ہیں اس کے بغیر کہ نظام میں رخنہ پڑے۔ اور شریعت کی زبان میں اس نکتہ کی تعبیر یہ ہے کہ ''یہ اسباب عادی ہیں، عقلی نہیں'' —— اور ہامہ عام طور پر شرک کا دروازہ کھولتا ہے، اور اسی طرح غُول بیابانی، پس لوگ روکے گئے ان چیزوں میں مشغولیت سے، نہ اس وجہ سے کہ ان چیزوں کی قطعاً کوئی حقیقت نہیں۔ کیسے؟ اور احادیث باہم تعاون کرنے والی ہیں جنات کے ثبوت پر، اور دنیا میں ان کے گھومنے پر، اور عدوی کی اصل کے ثبوت پر، اور عورت، گھوڑے اور گھر میں نحوست کی اصل کے ثبوت پر۔ پس یقینی بات ہے کہ مراد اس کی نفی ہے: (۱) اس میں مشغولیت کے جواز کے اعتبار سے (۲) اور بایں اعتبار کہ اس سے دعوی کرنا جائز نہیں۔ پس نہیں سنا جائے گا اس شخص کا دعوی جو کسی پر کرتا ہے کہ اس نے اس کے اونٹوں کو مار دیا یا ان کو بیمار کر دیا، ان پر بیمار اونٹ داخل کر کے، اور اس کے مانند دعوے —— کیسے؟ اور آپ خوب جانتے ہیں کہ نبی ﷺ نے کہانت کی نہایت سخت ممانعت کی ہے۔ اور کہانت: جنات کی باتیں بیان کرنا ہے۔ اور براءت ظاہر کی اس سے جو کاہن کے پاس جاتا ہے۔ پھر جب آپؐ سے دریافت کیا گیا کاہنوں کے احوال کے بارے میں تو آپؐ نے بتلایا کہ فرشتے بادلوں میں اترتے ہیں۔ پس اس امر کا تذکرہ کرتے ہیں جس کا آسمان میں فیصلہ کیا گیا ہے۔ پس شیاطین بات چراتے ہیں، پس اس کو کاہنوں تک پہنچاتے ہیں، پس وہ اس کے ساتھ سو جھوٹ ملاتے ہیں یعنی یہ بات ہے کہ معاملہ جب ملأ اعلیٰ میں قرار پاتا ہے، تو وہاں سے چند قطرات ٹپکتے ہیں اُن ملأ سافل پر جن میں الہام کی استعداد ہوتی ہے۔ پس کبھی ان سے بعض ہوشیار جن لیتے ہیں، پھر کاہن ان سے لیتے ہیں فطری اور اکتسابی مناسبتوں کی وجہ سے۔ پس آپ ہرگز شک نہ کریں کہ ممانعت ٹیک لگانے والی نہیں ہے خارج میں ان کے نہ ہونے پر، بلکہ ٹیک لگانے والی ہے ان کے احتمالی جگہ ہونے پر غلطی، شرک اور فساد کے لئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:......

تصحیح: **التی لایُقصد إلیها بالذات** میں **لا** مخطوطہ کراچی سے بڑھایا ہے...... **لالأن هذه لیست لها حقیقة** میں **لا** اور **لها** مخطوطہ کراچی سے بڑھائے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نچھتّر اور نجوم

چاند اور ستاروں کی منازل کو ''انوا'' کہا جاتا ہے۔ عربوں نے ان کو جو، ریاح اور امطار کے احوال کے ساتھ جوڑ دیا تھا۔ علم نجوم والے ستاروں اور ان کی شکلوں (جدی، عقرب، دلو، حوت وغیرہ) میں تاثیرات کے قائل ہیں۔ ان کے

نزدیک علویات: سفلیات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کی یہ بات مبنی بر حقیقت ہے یا تاریکی کا تیر ہے؟ اگر اس کی کچھ حقیقت ہے تو دو سوال پیدا ہوتے ہیں: ایک: یہ کہ وہ کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟ دوم: یہ کہ شریعت نے علم نجوم سیکھنے سے کیوں روکا ہے؟ شاہ صاحب قدس سرہٗ دونوں باتوں سے بحث کرتے ہیں:

اس میں کچھ بھی استبعاد نہیں کہ نچھتروں اور نجوم کے لئے کچھ حقیقت ہو۔ شریعت نے علم نجوم میں مشغولیت ہی کی ممانعت کی ہے۔ اس کی حقیقت کی بالکل نفی نہیں کی۔ اور اسلاف سے بطور توارث جو بات منقول ہے: وہ یہ ہے کہ علم نجوم کو استعمال نہ کیا جائے، اس میں مشغولیت بری بات ہے، اور ان کی تاثیر کا عقیدہ رکھنا درست نہیں۔ اسلاف سرے سے اس کے عدم کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ثریا کی اب کتنی منزلیں باقی رہ گئی ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ سات دن باقی ہیں (لغات الحدیث)

اور کواکب کی بعض تاثیرات تو بدیہی ہیں۔ جیسے سورج کے احوال کے اختلاف سے سردی گرمی کے موسموں کا بدلنا، اور رات دن کا چھوٹا بڑا ہونا۔ اور چاند کی کشش کی وجہ سے سمندر میں جُوار بھاٹا اٹھنا وغیرہ۔ اور بعض تاثیرات حدس (زیرکی) تجربہ اور رَصَد (ستاروں کی گردش دیکھنے کی جگہ) سے معلوم ہوتی ہیں، جیسے سونٹھ کی حرارت اور کافور کی برودت انہی ذرائع سے جانی جاتی ہے۔ پس جب یہ مسلّم ہیں تو وہ بھی ثابت ہیں۔

کواکب کی تاثیر کی دو صورتیں

اور اس میں کچھ استبعاد نہیں کہ کواکب کی تاثیر دو طریقوں سے ہو:

پہلا طریقہ ــــ کواکب کی تاثیر طبائع (ماہیات) کی تاثیر کی طرح ہوتی ہے ــــ اللہ تعالیٰ نے ہر نوع کے لئے ایسی طبائع بنائی ہیں جو اس کے ساتھ مختص ہیں۔ مثلاً کوئی چیز حار ہے تو کوئی بارد۔ کسی چیز میں یبوست ہے تو کسی میں رطوبت۔ اور انہی طبائع سے اطباء کام لیتے ہیں، اور علاج تجویز کرتے ہیں۔ پس افلاک وکواکب کے لئے بھی طبیعتیں اور خاصیتیں ہیں۔ جیسے سورج گرم ہے اور چاند مرطوب۔ اس لئے جب کوئی ستارہ اس کی معین جگہ میں آتا ہے تو اس کی قوت وصلاحیت زمین میں ظاہر ہوتی ہے۔

مثال: عورتوں میں نسوانی عادتیں اور زنانے خصائل ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ زنانی فطرت ہے، جس کا ادراک دشوار ہے۔ اسی طرح مردوں میں بہادری اور بلند آہنگی ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ بھی مردانہ مزاج ہے۔ لہٰذا اس بات کا انکار نہیں کرنا چاہئے کہ زہرہ اور مریخ وغیرہ ستاروں کی صلاحیتیں جب زمین تک پہنچیں تو ان کے مخفی طبائع کے آثار ظاہر ہوں۔

دوسرا طریقہ ــــ کواکب کی تاثیر روحانی اور طبعی صلاحیتوں کا آمیزہ ہوتی ہے ــــ جنیں (پیٹ کے بچہ) پر ماں اور باپ دونوں کے اثرات پڑتے ہیں۔ مثلاً: مرد کا مادہ قوی ہوتا ہے تو بچہ ددھیال کے مشابہ، اور ماں کا مادہ قوی ہوتا ہے تو

ننھیال کے مشابہ ہوتا ہے (بخاری حدیث ۳۹۳۸) اور موالید ثلاثہ اور آسمانوں اور زمینوں میں ایسا ہی تعلق ہے جیسا جنین اور اس کے ماں باپ کے درمیان ہوتا ہے۔ پس آسمان وزمین کی صلاحیتیں ہی حیوانات اور انسانوں کے وجود کا سبب ہیں۔

اور موالید میں ان قُوی کے حلول کے لئے اتصالاتِ فلکیہ کے اعتبار سے انواع ہیں، اور ہر نوع کے لئے خواص ہیں یعنی وہ قُوی ایک مادہ میں حلول کرتے ہیں تو چاندی، اور دوسرے مادہ میں حلول کرتے ہیں تو سونا وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح اتصالات کے اختلاف سے مختلف حیوانات اور انسان وجود میں آتے ہیں۔ یہی اتصال روحانی صلاحیت ہے۔ پس کچھ لوگوں نے اس علم میں غور کیا تو علم نجوم وجود میں آیا۔ نجومی اس علم کے ذریعہ آئندہ پیش آنے والے واقعات جان لیتے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جب فیصلۂ خداوندی اس کے خلاف منعقد ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ستاروں کی صلاحیتوں میں تبدیلی کردیتے ہیں۔ اور ان کی تاثیرات کسی ایسی صورت میں منقلب ہوجاتی ہے جو پہلی صورت سے قریب ہی ہوتی ہے۔ اس طرح اللہ کا فیصلہ پورا ہوکر رہتا ہے، اور ستاروں کے خواص کے نظام میں کوئی خلل بھی واقع نہیں ہوتا۔ یہ اللہ کی صفت تدبیر کی کارفرمائی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۱:۱۷۹) اور علم کلام میں یہ مضمون اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ''ستاروں کے خواص بطریقِ جری عادت ہیں، لزومِ عقلی نہیں''

اور ستاروں کے یہ خواص محض علامات و امارات کے درجہ کی چیز ہیں، اس سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں۔ مگر لوگ اس علم میں بہت زیادہ گھستے چلے گئے۔ یہاں تک کہ یہ علم اللہ کے انکار اور بے ایمانی کی احتمالی جگہ بن گیا۔ چنانچہ بارش ہونے پر کوئی نجومی صمیم قلب سے نہیں کہتا کہ اللہ کے فضل اور ان کی مہربانی سے بارش ہوئی، بلکہ یہ کہتا ہے کہ فلاں نچھتر کی وجہ سے بارش ہوئی۔ پس اس میں وہ پختہ ایمان کہاں رہا جس پر نجات کا مدار ہے؟!

اور علم نجوم کا نہ جاننا کچھ مضر نہیں: کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے موافق عالم کا نظم کررہے ہیں، خواہ کوئی جانے یا نہ جانے! اس لئے شریعت نے اس علم کو بے نام ونشان کردیا، اور اس کے سیکھنے کی ممانعت کی، اور ببانگ دُہُل اعلان کردیا کہ ''جس نے نجوم کا کچھ علم سیکھا اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا، زیادہ حاصل کیا اس نے جادو، جتنا زیادہ حاصل کیا اس نے علم نجوم!'' (مشکوۃ حدیث ۴۵۹۸)

مثال: علم نجوم کا حال تورات وانجیل کے علم کی طرح ہے۔ جس نے ان کتابوں کو دیکھنا چاہا تھا اس پر نبی ﷺ نے نہایت سختی کی تھی (مسند احمد ۳:۳۸۷) کیونکہ وہ دونوں محرف کتابیں ہیں۔ معلوم نہیں ان میں کونسی بات صحیح ہے، اور کونسی تحریف شدہ۔ پس تصدیق بھی مشکل ہے، اور تکذیب بھی۔ دوسری وجہ: سختی کرنے کی یہ ہے کہ ان کتابوں میں لگنے والا ممکن ہے قرآن کریم کی تابعداری نہ کرے۔ اور ان کتابوں کی باتوں کو زیادہ اہمیت دینے لگے۔

نچھتر اور نجوم کے سلسلہ میں یہ وہ باتیں ہیں جن تک ہماری رائے اور ہماری تحقیق پہنچی ہے۔ پس اگر قرآن وحدیث سے اس کے خلاف ثابت ہو تو وہی برحق ہے۔

نوٹ: یہ بحث رحمۃ اللہ (۱:۲۲۹) میں بھی تفصیل سے ہے۔ اس کی بھی مراجعت کرلی جائے۔

وأما الأنواء والنجوم : فلايبعد أن يكون لهما حقيقةٌ مّا: فإن الشرع إنما أتى بالنهى عن الاشتغال به، لانفي الحقيقةِ البتة؛ وإنما توارث السلفُ الصالح: تركَ الاشتغال به، وذَمَّ المشتغلين، وعدمَ القولِ بتلك التأثيرات، لاالقولَ بالعدم أصلاً.

وإن منها ما يُلحق بالبديهيات الأولية، كاختلاف الفصول باختلاف أحوال الشمس والقمر، ونحو ذلك؛ ومنها مايدل عليه الحدسُ والتجربة والرصدُ، كمثل ماتدل هذه على حرارة الزنجبيل، وبرودة الكافور.

ولايبعد أن يكون تأثيرها على وجهين:

[أحدهما] وجهٌ يُشبه الطبائعَ: فكما أن لكل نوع طبائعُ مختصةٌ به من الحر والبرد، واليبوسة والرطوبة، بها يُتمسك في دفع الأمراض، فكذلك للأفلاك والكواكب طبائعُ وخواصٌّ، كحر الشمس ورطوبة القمر، فإذا جاء ذلك الكوكب في محله، ظهرت قوتُه في الأرض:

ألا تعلم أن المرأةَ إنما اختُصت بعادات النساء وأخلاقهن: لشيئ يرجع إلى طبيعتها، وإن خفى إدراكُها، والرجلَ إنما اختص بالجراءة والجَهْوَرِيَّة ونحوهما: لمعنى في مزاجه، فلا تُنكِرْ أن يكون لحلول قوى الزهرة والمريخ بالأرض: أثرٌ كأثرِ هذه الطبائع الخفية.

وثانيهما :وجهٌ يُشبه قوةً روحانيةً، متركبةً مع الطبيعة، وذلك مثل قوة نفسانية في الجنين من قِبَلِ أمه وأبيه؛ والمواليدُ بالنسبة إلى السماوات والأرضين كالجنين بالنسبة إلى أبيه وأمه؛ فتلك القوة تهيئُ العالَم لفيضان صورة حيوانية، ثم إنسانية.

ولحلول تلك القوى بحسب الاتصالات الفلكية أنواعٌ، ولكل نوع خواصٌ، فأمعن قومٌ في هذا العلم، فحصل لهم علمُ النجوم، يتعرَّفون به الوقائع الآتية؛ غيرَ أن القضاء إذا انعقد على خلافه: جعل قوةَ الكواكب متصورةً بصورة أخرى، قريبةٍ من تلك الصورة، وأتَمَّ اللّٰهُ قضاءه، من غير أن يَنْخرِم نظامُ الكواكب في خواصها؛ ويُعَبَّرُ عن هذه النكتة بأن الكواكب خواصُّها بجرْيِ عادةِ الله، لاباللزوم العقلي.

ويُشبه بالأمارات والعلامات، ولكن الناس جميعًا توغَّلوا في هذا العلم توغلا شديدًا، حتى صار مظنةً لكفر الله، وعدمِ الإيمان، فعسى أن لايقول صاحبُ توغلِ هذا العلم: مُطرنا بفضل الله ورحمته! من صميم قلبه، بل يقول: مُطرنا بنوء كذا وكذا، فيكون ذلك صادًّا عن تحققه

بالإيمان الذى هو الأصل فى النجاة.

وأما علم النجوم: فإنه لايَضُرُّ جهلُه، إذ اللهُ مدبرٌ للعالم على حسب حكمته، عَلِمَ أحد أولم يعلم، فلذلك وجب فى الملة أن يُخْمَلَ ذكرُه، ويُنهى عن تعلمه، ويُجْهَرَ بأن: "من اقتبس علما من النجوم: اقتبس شعبة من السحر، زاد مازاد"

ومَثَلُ ذلك مَثَلُ التوراة والإنجيل: شدَّد النبى صلى الله عليه وسلم من أراد أن ينظر فيهما: لكونهما محرَّفين، ومظنةً لعدم الانقياد للقرآن العظيم؛ ولذلك نُهُوْا عنه.

وهذا ما أدّى إليه رأيُنا وتفحُّصُنا، فإن ثبت من السنة مايدل على خلاف ذلك، فالأمر على ما فى السنة.

ترکیب: قولہ: ذَمَّ المشتغلين میں ذمٌّ مصدر ہے..... يشبہ بالأمارات: ضمیر فاعل علم نجوم کی طرف عائد ہے..... تَوَغَّلَ فيه اندر گھستے چلے جانا..... من صميم قلبه: لايقول سے متعلق ہے..... عن تحققه بالإيمان: اس کے ایمان کے بارے میں سچا (کھرا) ہونے سے۔

☆ ☆ ☆

خواب اور تعبیر

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "الرؤيا ثلاث: فالرؤيا الصالحة بشرى من الله، والرؤيا من تحزين الشيطان، والرؤيا مما يحدّث بها الرجلُ نفسَه: خواب کی تین قسمیں ہیں: (۱) نیک خواب: جواللہ کی طرف سے خوش خبری ہوتا ہے (۲) وہ خواب جو شیطان کا پریشان کرنا ہے (۳) وہ خواب جس میں آدمی اپنے دل سے باتیں کرتا ہے یعنی خیالات (ترمذی ۲:۵۱ ابواب الرؤیا)

شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ان تین قسموں کی پانچ قسمیں بنائی ہیں۔ رؤیا صالحہ کی دوقسمیں کی ہیں: بُشری من اللہ اور رؤیا ملکی یعنی نیک آدمی کا خواب۔ اسی طرح خیالات کی بھی دوقسمیں کی ہیں: ایک: وہ خیالات جو عادت کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری: وہ خیالات جو کسی خِلط کی زیادتی اور جسمانی تکلیف کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ غرض اصل اقسام تین ہیں۔ ان کو پھیلا کر پانچ قسمیں کی ہیں۔

پھر تین خوابوں کی تفصیل کی ہے: بشارتی خواب، ملکوتی خواب اور شیطانی خواب کی حقیقت بیان کی ہے۔ اور شیطانی خواب کا اثر زائل کرنے کی تدبیر بتلائی ہے۔ اور آخر میں یہ بیان کیا ہے کہ تعبیر صرف بشارتی اور ملکوتی خوابوں کی ہوتی ہے۔ خیالات والے خوابوں کی کچھ تعبیر نہیں ہوتی۔ یہ بحث کا خلاصہ ہے۔ اب تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

خواب کی پانچ قسمیں ہیں:

اول: وہ خواب ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش خبری ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''نبوت میں سے صرف خوش کن باتیں باقی رہی ہیں'' صحابہ نے دریافت کیا: خوش کن باتیں کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''نیک خواب'' اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے: ''جس کو کوئی مسلمان دیکھے، یا اس کے لئے دیکھا جائے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۰۶) جیسے حضرت ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے لئے ایک چشمہ جاری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ چشمہ ان کا عمل ہے، جو ان کے لئے بہ رہا ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۲۰) یہ حضرت عثمانؓ کے لئے بعد از وفات بشارت ہے۔ اور جیسے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ورقہ بن نوفل کا حال دریافت کیا، تو آپؐ نے فرمایا: ''میں نے ان کو خواب میں سفید کپڑوں میں دیکھا ہے۔ اگر وہ دوزخی ہوتے تو ان پر کوئی اور لباس ہوتا'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۲۳) یہ ورقہ کے لئے بشارت ہے۔ اس قسم کے خوابوں کی بس اتنی ہی تعبیر ہوتی ہے۔ اور اس قسم کے خوابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں پر حقائق و معارف بھی واشگاف کرتے ہیں، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

دوم: ملکوتی خواب یعنی نیک آدمی کا خواب: یہ خواب آدمی کی خوبیوں اور خرابیوں کا نورانی تمثّل (تصویر سامنے آنا) ہوتا ہے (اگر خوبی متمثّل ہوتی ہے تو وہ محض بشارت ہوتی ہے، اور خرابی متمثّل ہوتی ہے تو وہ تنبیہ ہوتی ہے، جو نتیجہ کے اعتبار سے بشارت ہے) اور وہ خوبیاں اور خرابیاں ملکی طریقہ پر نفس میں شامل ہونے والی ہوتی ہیں (ملائکہ طاعات بجالاتے ہیں، اور برائیوں سے ان کو مس نہیں۔ پس جو شخص طاعات کا اہتمام کرتا ہے، اور برائیوں سے دور رہتا ہے، اس کی خوبیاں اور خرابیاں نفس میں ملکی طریقہ پر شامل ہوتی ہیں۔ طاعات مثبت پہلو سے، اور سیئات منفی پہلو سے۔ اور ایسا ہی شخص نیک آدمی ہوتا ہے)

سوم: شیطان کا ڈراوا، اور اس کا پریشان کرنا۔ اس خواب کی تفصیل اور اس کا علاج آگے آرہا ہے۔

چہارم: وہ خواب جو خیالات ہوتے ہیں۔ جو ایسی عادت کی بناپر پیدا ہوتے ہیں جس کا نفس بیداری میں خوگر ہو چکا ہوتا ہے۔ اور وہ عادت قوتِ خیالیہ میں محفوظ ہوتی ہے، اور جو چیز خیال میں ہوتی ہے وہ حس مشترک میں ظاہر ہوتی ہے یعنی اسکے تصورات آتے ہیں۔ جیسے شراب کا چسکہ: خواب میں بھی اس کے خیالات آتے ہیں۔ اسی کو ''بلی کے خواب میں چھیچھڑے'' کہتے ہیں۔

پنجم: وہ خواب جو خیالات ہوتے ہیں۔ اور وہ خیالات فطری طور پر کسی خِلط کے غلبہ اور بدن میں اس کی تکلیف کے احساس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے بیمار آدمی خواب دیکھتا ہے کہ اس کے آپریشن کی تیاری ہورہی ہے ——— ان آخری دو خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

بشارتی خواب کی حقیقت

بشارتی خواب کی حقیقت یہ ہے کہ کبھی نفس ناطقہ کو بدن کے حجابات سے فرصت مل جاتی ہے یعنی اضطراری موت سے

پہلے ہی وہ اختیاری موت مرجاتا ہے۔اور یہ بات ایسے دقیق اسباب کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کافی غور وخوض کے بعد سمجھے جاسکتے ہیں۔ پس نفس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے علمی کمال کے فیضان کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے۔ چنانچہ نفس کی استعداد کے مطابق اس پر فیضان کیا جاتا ہے۔جس کا مادّہ اس کے پاس مجتمع علوم ہوتے ہیں۔مثلاً: اسرار دین کا کافی علم ہوتا ہے تو اس سلسلہ کا کوئی نکتہ بیداری یا خواب میں کھولا جاتا ہے۔اور وہ اس کے لئے عظیم بشارت ہوتا ہے۔منقول ہے کہ رات میں جب کوئی اہم مسئلہ حل ہوتا تھا تو امام محمد رحمہ اللہ فرماتے: شاہ زادوں کو: امین اور ماموں کو یہ دولت کہاں نصیب!

اور اس قسم کے خوابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تعلیم دیتے ہیں۔مثلاً:

ا — نبی ﷺ نے خواب میں اللہ پاک کو بہترین صورت میں دیکھا۔اللہ تعالیٰ نے پوچھا: فرشتے کس امر میں بحث کررہے ہیں الی آخرہ۔اس حدیث میں درجات اور کفارات کا بیان ہے یعنی کن اعمال سے مرتبے بلند ہوتے ہیں۔اور کن اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔یہ حدیث تفصیل سے ترمذی (۱۵۵:۲) میں سورۃ ص کی تفسیر میں ہے۔

۲ — حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے نبی ﷺ کا ایک طویل خواب مروی ہے کہ آپ کو دو شخص لے چلے،اور مختلف مناظر دکھائے،مثلاً: آپ ایک ایسے شخص کے پاس سے گزرے جو بیٹھا ہوا تھا،اور دوسرا کھڑا ہوا تھا،جس کے ہاتھ میں آنکڑا تھا،جس کو وہ بیٹھے ہوئے کی باچھ میں داخل کرتا تھا،اور اس کو گدی تک چیر دیتا تھا الی آخرہ۔اس منامی معراج میں نبی ﷺ کو مُردوں کے احوال سے واقف کیا گیا ہے۔یہ حدیث تفصیل سے مشکوۃ حدیث (۴۶۲۱ و ۴۶۲۵) میں ہے۔

۳ — متعدد خوابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو آئندہ پیش آنے والے واقعات سے واقف کیا ہے۔مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے شادی کا معاملہ آپ کو خواب میں دکھلایا گیا تھا (بخاری حدیث ۷۰۱۲) جنگ احد میں پہلے شکست پھر کامیابی خواب میں دکھائی گئی تھی۔اسی طرح آپ کو ہجرت کا مقام خواب میں دکھلایا گیا تھا۔

ملکوتی خواب کی حقیقت

ملکی خواب کی حقیقت یہ ہے کہ انسان میں اچھے برے: دونوں طرح کے ملکات (صلاحیتیں) ہوتے ہیں۔مگر ملکات کی خوبی خرابی آدمی اسی وقت جان سکتا ہے جب وہ ملکی صورت کے لئے فارغ ہوجائے: یعنی بہیمیت کی میّا مرجائے،اور ملکیت کا راج قائم ہوجائے۔پس جب آدمی ملکیت کے لئے فارغ ہوجاتا ہے تو اس کی نیکیاں اور برائیاں مثالی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔جیسے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا کہ دو فرشتے ان کو پکڑ کر آگ پر لے گئے۔انھوں نے کہا: پناہ بخدا! پھر ایک اور فرشتہ آیا۔اس نے کہا: گھبراؤ نہیں! ابن عمرؓ نے یہ خواب اپنی بہن ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا۔انھوں نے آنحضرت ﷺ سے بیان کیا،تو آپؐ نے فرمایا: نِعْمَ الرجلُ عبدُ الله! لو كان يصلي من الليل! عبداللہ بہت اچھا آدمی ہے! کاش وہ تہجد پڑھتا! (بخاری حدیث ۱۱۲۱ و ۱۱۲۲) اس خواب میں حضرت ابن عمرؓ کی خوبی

اور کمی: دونوں مثالی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ پس اس شان کا آدمی:

(الف) خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کرتا ہے۔ اور اس کی بنیاد: اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہوتی ہے۔ یعنی جو شخص کامل فرمانبردار ہوتا ہے اس کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔

(ب) اور نبی ﷺ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اور اس کی بنیاد: نبی ﷺ کی فرمانبرداری یعنی محبت ہوتی ہے جو اس کے سینہ میں مرکوز ہوتی ہے۔

(ج) اور انوار وتجلیات کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اور اس کی بنیاد: وہ طاعتیں ہوتی ہیں جو دل اور اعضاء سے کی جاتی ہیں۔ وہ طاعتیں انوار وطیبات کی صورت میں جیسے شہد، گھی اور دودھ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

پس جس نے اللہ تعالیٰ کو یا نبی ﷺ کو یا فرشتوں کو بری صورت میں یا غصہ کی حالت میں خواب میں دیکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے عقیدہ میں خلل یا کمزوری ہے۔ اور اس طرف اشارہ ہے کہ اس کا نفس کامل نہیں ہوا۔ اسی طرح جو انوار طہارت کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ سورج اور چاند کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

شیطان کا ڈراوا اور اس کا علاج

خواب میں شیطان کے پریشان کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ملعون جانور جیسے بندر، ہاتھی، کتے اور سیاہ فام انسان نظر آتے ہیں۔ جن سے آدمی ڈر جاتا ہے۔ اور دل میں وحشت اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ اگر ایسی صورت پیش آئے تو اللہ کی پناہ طلب کرے۔ أعوذ باللہ کہہ لے۔ اور اپنی بائیں جانب تین بار تھتکار دے۔ اور کروٹ بدل کر سوجائے (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۱۳)

مبشرات کی تعبیر

پہلی اور دوسری قسم کے خوابوں کی — جو مبشرات ہیں — تعبیر ہوتی ہے۔ اور تعبیر جاننے کا عمدہ طریقہ خواب میں آنے والے خیال کی معرفت ہے یعنی یہ جاننا کہ کس خیال کا کیا مطلب ہے؟ کیونکہ:

۱ — کبھی مسمّی سے اسم مراد ہوتا ہے۔ جیسے نبی ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ آپ حضرت عقبہ بن رافع انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں جلوہ افروز ہیں۔ آپؐ کی خدمت میں ابن طاب نامی تازہ کھجوریں پیش کی گئیں۔ آپؐ نے اس کی یہ تعبیر بیان فرمائی کہ رافع سے رفعت مراد ہے یعنی ہمارے لئے دنیا میں رفعت وبلندی ہے۔ اور عقبہ (اچھا انجام) سے مراد آخرت کا اچھا انجام ہے۔ اور طاب سے مراد دین کی عمدگی ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۱۷)

۲ — اور کبھی لازم سے ملزوم مراد ہوتا ہے۔ جیسے تلوار سے جنگ مراد ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ کے دستِ مبارک میں ذوالفقار نامی تلوار ہے۔ آپؐ نے اس کو ہلایا تو اس کا بالائی حصہ ٹوٹ گیا۔ پھر ہلایا تو پہلے سے

شاندار ہوگئی۔ اس کی تعبیر یہ تھی کہ جنگ احد میں پہلے ہزیمت ہوگی، پھر اللہ فتح نصیب فرمائیں گے (مشکوۃ حدیث ۴۶۱۸)

۳ــــ اور کبھی صفت سے موصوف مراد ہوتا ہے۔ جیسے آپؐ نے خواب دیکھا کہ سونے کی دو چوڑیاں آپؐ کے ہاتھ میں رکھی گئیں۔ آپؐ کو یہ بات ناگوار ہوئی تو وحی آئی کہ ان کو پھونک دیجئے۔ چنانچہ آپؐ نے پھونک ماری تو دونوں غائب! اس کی تعبیر دو جھوٹے نبوت کے دعویدار اسود عنسی اور مسیلمہ کذاب تھے۔ چونکہ دونوں پر مال کی محبت غالب تھی اس لئے وہ سونے کی شکل میں دکھائے گئے (مشکوۃ حدیث ۴۶۱۹)

حاصل کلام: یہ ہے کہ خواب میں نظر آنے والی چیز سے کیا مراد ہے؟ اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اور اس کے لئے کوئی قاعدہ کلیہ نہیں۔ یہ بات تعبیر دینے والے کی ذہانت پر موقوف ہے۔ اور مبشرات نبوت کا ایک حصہ ہیں یعنی کمالاتِ نبوت میں شامل ہیں۔ کیونکہ وہ بھی غیبی فیضان اور اللہ کی طرف سے مخلوق کی طرف تجلی کی ایک صورت ہیں۔ اور یہی مبشرات نبوت کی بنیاد ہیں۔ چنانچہ نبی ﷺ کو نبوت سے چھ ماہ قبل ہی سے سچے خواب آنے شروع ہوگئے تھے ــــ رہی خواب کی دیگر انواع تو ان کے لئے کوئی تعبیر نہیں۔

وأما الرؤيا: فهي على خمسة أقسام:

[۱] بُشرى من الله.

[۲] وتمثلٌ نورا ني للحمائد والرذائل، المندرجةِ في النفس على وجهٍ ملكي.

[۳] وتخويف من الشيطان.

[٤] وحديثُ نفس: من قِبَلِ العادة التي اعتادها النفس في اليقظة، تحفظها المتخيلة ويظهر في الحس المشترك ما اخْتُزِنَ فيها.

[٥] وخيالاتٌ طبيعيةٌ: لغلبة الأخلاط، وتنبُّه النفسِ بأذاها في البدن.

أما البشرى من الله: فحقيقتُها: أن النفس الناطقة إذا انتهزت فرصةً عن غواشي البدن، بأسباب خفية لايكاد يتفطن بها إلا بعد تأمل وافٍ: استعدّت لأن يفيض عليها من منبع الخير والجود كمالٌ علمي، فأُفيض عليه شيئ على حسب استعدادها: مادتُه العلومُ المخزونةُ عنده.

وهذه الرؤيا تعليم إلٰهي كالمعراج المنامي الذي رأى النبي صلى الله عليه وسلم فيه ربه في أحسنِ صورة، فعلّمه الكفارات والدرجاتِ، وكالمعراج المنامي الذي انكشفت فيه عليه صلى الله عليه وسلم أحوالُ الموتى بعد انفكاكهم عن الحياة الدنيا، كما رواه جابر بن سمرة رضي الله عنه، وكعلم ما سيكون من الوقائع الآتية في الدنيا.

وأما الرؤيا الملكية: فحقيقتُها: أن في الإنسان ملكاتٍ حسنةً، وملكاتٍ قبيحةً، ولكن

لايَعرف حُسنَها وقُبحها إلا المتجرد إلى الصورة الملكية، فمن تجرَّد إليها: تظهر له حسناته وسيئاتُه في صورة مثالية، فصاحبُ هذا:

[الف] يرى الله تعالى؛ وأصله: الانقيادُ للبارى.

[ب] ويرى الرسولَ صلى الله عليه وسلم؛ وأصله: الانقياد للرسول المركوزُ في صدره.

[ج] ويرى الأنوارَ؛ وأصلها: الطاعات المكتسبة في صدره وجوارحه، تظهر في صورة الأنوار والطيبات، كالعسل، والسمن، واللبن.

فمن رأى الله، أو الرسول، أو الملائكة في صورة قبيحة، أو في صورة الغضب: فليعرفْ أن في اعتقاده خللاً وضعفا، وأن نفسه لم تتكمَّل.

وكذلك الأنوار التي حصلت بسبب الطهارة: تظهر في صورة الشمس والقمر.

وأما التخويف من الشيطان: فوحشةٌ وخوفٌ من الحيوانات الملعونة، كالقرد، والفيل، والكلاب، والسودان من الناس؛ فإذا رأى ذلك فليتعوذ بالله، ولْيَتْفُلْ ثَلاثًا عن يساره، وليتحوَّل عن جنبه الذي كان عليه.

أما البشرى: فلها تعبيرٌ؛ والعمدة فيه: معرفةُ الخيال: أيُّ شيئ مظنةٌ لأيِّ شيئ؟ فقد ينتقلُ الذهن من المسمى إلى الاسم، كرؤية النبي صلى الله عليه وسلم أنه كان في دار عقبةَ بن رافع، فأُتي برطب ابن طاب، قال عليه السلام: "فأَوَّلْتُ أن الرفعةَ لنا في الدنيا، والعافيةَ في الآخرة، وأن ديننا قد طاب" وقد ينتقل الذهن من المُلابس إلى ما يُلابسه، كالسيف للقتال، وقد ينتقلُ الذهن من الوصف إلى جوهر مناسب له، كمن غلب عليه حبُّ المال، رآه النبي صلى الله عليه وسلم في صورةِ سِوَارٍ من ذهب.

وبالجملة: فللانتقال من شيئ إلى شيئ صور شتّٰى؛ وهذه الرؤيا شعبة من النبوة، لأنها ضربٌ من إفاضة غيبية، وتَدَلٍّ من الحق إلى الخلق، وهو أصل النبوة؛ وأما سائر أنواع الرؤيا فلاتعبير لها.

ترجمہ: اور رہا خواب: تو وہ پانچ قسموں پر ہے: (۱) اللہ کی طرف سے خوش خبری (۲) خوبیوں اور خرابیوں کا نورانی تمثل، جونفس میں مندرج (داخل) ہونے والی ہیں ملکی طریقہ پر (۳) اور شیطان کی طرف سے ڈرانا (۴) اور خیال: اس عادت کی جانب سے جس کا نفس بیداری میں عادی ہو چکا ہے، اس عادت کو قوت متخیلہ محفوظ کئے ہوئے ہے۔ اور وہ چیز جو متخیلہ میں جمع کی گئی ہے حس مشترک میں ظاہر ہوتی ہے (۵) اور فطری خیالات: اخلاط کے غلبہ کی وجہ سے، اور نفس کے آگاہ ہونے کی وجہ

سے بدن میں اختلاط کی ایذا دہی سے ــــ رہی اللہ کی طرف سے خوش خبری: پس اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نفس ناطقہ فرصت پاتا ہے بدن کے پردوں سے، ایسے پوشیدہ اسباب کی وجہ سے کہ نہیں قریب ہے آدمی کہ ان اسباب کو سمجھ سکے مگر کافی غور کے بعد تو نفس اس بات کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ اس پر کوئی علمی کمال بھلائی اور سخاوت کے سرچشمہ سے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہے۔ پس اس پر بہائی جاتی ہے کوئی ایسی چیز نفس کی استعداد کے موافق جس کا مادّہ اس کے پاس مجتمع علوم ہوتے ہیں ــــ اور یہ خواب تعلیم الٰہی ہے: (۱) جیسے وہ معراج منامی یعنی خواب جس میں نبی ﷺ نے اپنے رب کو بہترین شکل میں دیکھا۔ پس اللہ نے آپ کو سکھلائے کفارات و درجات (۲) اور جیسے وہ معراج منامی جس میں آپ ﷺ پر کھلے مُردوں کے احوال ان کے دنیوی زندگی سے جدا ہونے کے بعد، جیسا کہ روایت کیا ہے اس کو جابر بن سمرۃؓ نے (یہ تسامح ہے۔ یہ روایت سمرۃ بن جندبؓ کی ہے) (۳) اور جیسے اس چیز کا علم جو عنقریب ہونگی یعنی مستقبل قریب میں جو واقعات دنیا میں پیش آنے والے ہیں ــــ اور رہا ملکی خواب: تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان میں اچھے ملکات اور برے ملکات ہیں۔ مگر ان کی خوبی اور خرابی کو نہیں جانتا مگر فارغ ہونے والا ملکی صورت کے لئے۔ پس جو شخص فارغ ہو گیا ملکی صورت کے لئے: ظاہر ہوتی ہیں اس کی حسنات اور سیئات مثالی صورت میں۔ پس اس شان کا آدمی: (الف) اللہ کو دیکھتا ہے۔ اور اس کی اصل: اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے (ب) اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھتا ہے۔ اور اس کی اصل: آپؐ کی فرمانبرداری ہے جو اس کے سینہ میں مرکوز ہے (ج) اور انوار کو دیکھتا ہے۔ اور انوار کی اصل: وہ طاعتیں ہیں جو کمائی ہوئی ہیں اس کے سینہ اور اس کے اعضاء میں۔ ظاہر ہوتی ہیں وہ طاعات: انوار اور ستھری چیزوں کی صورت میں، جیسے شہد اور گھی اور دودھ ــــ پس جس نے دیکھا اللہ کو یا رسول کو یا فرشتوں کو بری صورت میں یا غصہ کی حالت میں تو چاہئے کہ وہ جان لے کہ اس کے اعتقاد میں خلل اور کمزوری ہے، اور یہ کہ اس کا نفس کامل نہیں ہوا ــــ اور اسی طرح وہ انوار جو طہارت کی وجہ سے حاصل ہوئے ہیں: سورج اور چاند کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں ــــ اور رہا شیطان کا ڈراوا: تو وہ وحشت اور خوف ہے ملعون جانوروں سے، جیسے بندر، اور ہاتھی، اور کتے، اور سیاہ فام انسان۔ پس جب اس چیز کو دیکھے تو اللہ کی پناہ طلب کرے، اور چاہئے کہ تھتکار دے تین بار اپنی بائیں جانب، اور چاہئے کہ بدل لے اپنا وہ پہلو جس پر وہ تھا ــــ رہی خوش خبری: تو اس کے لئے تعبیر ہے۔ اور عمدہ طریقہ تعبیر میں خیال کی معرفت ہے: کونسی چیز کس چیز کے لئے احتمالی جگہ ہے؟ (۱) پس کبھی ذہن منتقل ہوتا ہے مسمّی سے اسم کی طرف۔ جیسے نبی ﷺ کا دیکھنا کہ آپؐ عقبۃ بن رافع کے گھر میں ہیں۔ پس آپؐ کے پاس تازہ ابن طاب کھجوریں لائی گئیں۔ فرمایا نبی ﷺ نے: ''پس تعبیر لی میں نے کہ ہمارے لئے دنیا میں رفعت اور آخرت میں عافیت ہے، اور یہ کہ ہمارا دین یقیناً عمدہ ہوا'' (۲) اور کبھی ذہن ملابس (لازم) سے اس چیز کی طرف منتقل ہوتا ہے جس سے وہ چیز تعلق رکھتی ہے یعنی ملزوم کی طرف جیسے تلوار جنگ کے لئے (۳) اور کبھی ذہن منتقل ہوتا ہے وصف سے ایسے جوہر کی طرف جو اس وصف کے مناسب ہے۔ جیسے وہ شخص جس پر مال کی محبت غالب آگئی ہے اس کو نبی ﷺ نے سونے کے کنگن کی صورت میں دیکھا

—— اور حاصل کلام: پس ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف انتقال کے لئے مختلف صورتیں ہیں۔ اور یہ خواب نبوت کی ایک شاخ ہے، اس لئے کہ وہ غیبی فیضان، اور اللہ کی طرف سے مخلوق کی طرف تجلی کی ایک قسم ہے۔ اور وہ نبوت کی اصل ہے۔ اور رہی خواب کی دیگر انواع تو ان کے لئے کوئی تعبیر نہیں۔

باب —— ۴

آدابِ صحبت

صحبت کے معنی ہیں: ساتھ، تعلق۔ اور ادب: کے معنی ہیں: تہذیب وشائستگی —— افرادِ انسانی میں حاجتوں کا پیش آنا، اور ان حاجتوں میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا: ایسے چند آداب کا متقاضی ہے، جن کو لوگ باہم برتیں اور زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ ان آداب میں سے بیشتر ایسے امور ہیں جن کے اصول پر عرب وعجم کا اتفاق ہے۔ اگرچہ صورتوں اور شکلوں میں اختلاف ہے۔ ان آداب سے بحث کرنا اور صالح وفاسد کے درمیان امتیاز کرنا نبی ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

۱ —— دعا وسلام

لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ آپس میں خوشی کا اظہار کریں۔ ایک دوسرے پر لطف ومہربانی کریں۔ چھوٹا بڑے کی برتری پہچانے۔ بڑا چھوٹے پر مہربانی کرے۔ اور ہم زمانہ لوگوں میں بھائی چارہ قائم ہو۔ اگر یہ باتیں نہیں ہونگی تو رفاقت کچھ سودمند نہیں ہوگی۔ اور اس کا خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

پھر ضروری ہے کہ جذبۂ خیر سگالی وخیر اندیشی کے اظہار کے لئے اور مخاطب کو مانوس ومسرور کرنے کے لئے کوئی خاص لفظ متعین کیا جائے، ورنہ وہ جذبہ ایک مخفی چیز ہوگا، جس کو قرائن ہی سے پہچانا جاسکے گا۔ اول وہلہ میں اس کا پتہ نہیں چلے گا۔ چنانچہ دنیا کی تمام متمدن اقوام نے اپنی صوابدید کے مطابق تحیہ کا طریقہ متعین کیا ہے، جو بعد میں ان کی ملت کا شعار بن گیا۔ اور اہلِ ملت کی اس سے پہچان ہونے لگی۔ مثلاً: زمانۂ جاہلیت میں عرب بوقتِ ملاقات کہتے تھے: أَنْعَمَ اللهُ بِكَ عَيْنًا: اللہ آپ کی آنکھیں ٹھنڈی کرے۔ اور أَنْعِمْ صَبَاحًا: صبح بخیر! (ابوداؤد حدیث ۵۲۲۷) اور مجوسی کہا کرتے تھے: ہزار سال بزی: ہزار سال جیو!

اور قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ اس سلسلہ میں انبیاء اور فرشتوں کی سنت اپنائی جائے۔ اور کوئی ایسا کلمہ متعین کیا جائے جو ذکر اور دعا ہو، اور وہ دنیوی زندگی پر مطمئن کرنے والا نہ ہو یعنی اس میں درازیٔ عمر اور دولت کی فراوانی کی دعا نہ ہو۔ نہ کوئی ایسا طریقہ ہو جس میں تعظیم میں اتنا مبالغہ ہو کہ اس کی حدود شرک سے مل جائیں۔ مثلاً سجدہ کرنا یا زمین چومنا۔

ایسا تحیہ سلام ہی ہے۔ درج ذیل حدیث میں اس کا بیان ہے:

حدیث ــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کو حکم دیا: جاؤ اُس جماعت کو سلام کرو ــــ وہ فرشتوں کی جماعت تھی جو بیٹھی ہوئی تھی ــــ پس غور سے سنو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ وہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا دعاؤ سلام کا طریقہ ہوگا۔ چنانچہ آپؑ گئے اور ان سے کہا: السلام علیکم انھوں نے جواب دیا: **السلام علیك ورحمة الله** نبی ﷺ نے فرمایا: ”فرشتوں نے جواب میں ورحمة الله کا اضافہ کیا (مشکوۃ حدیث ۴۶۲۸)

تشریح: اس حدیث میں دو باتیں حل طلب ہیں:

پہلی بات: اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ ”ان کو سلام کرو“ تو کیا آدم علیہ السلام کو سلام کا طریقہ بتایا گیا تھا؟ جواب: یہ ہے کہ ان کو سلام کے الفاظ نہیں بتائے گئے تھے۔ بلکہ یہ امر ان کی رائے اور اجتہاد پر چھوڑا گیا تھا۔ پس آدم علیہ السلام نے حق کو پالیا یعنی اللہ تعالیٰ کو جو الفاظ پسند تھے انہی لفظوں سے آدم علیہ السلام نے سلام کیا۔

دوسری بات: اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے کہ ”وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا دعاء سلام کا طریقہ ہوگا“ اس کا کیا مطلب ہے؟ جواب: یہ ارشاد تشریعی ہے یعنی یہی وجوبی طور پر حکم خداوندی ہے۔ رہا یہ سوال کہ حضرت آدم اور ملائکہ جس طرح دعاؤ سلام کریں گے وہ حکم خداوندی کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ طریقہ اللہ تعالیٰ ہی الہام فرمائیں گے۔ جیسے اذان کی مشروعیت اور اس کے الفاظ حظیرۃ القدس ہی سے فرشتہ پر مترشح ہوئے تھے۔

﴿ آداب الصحبة ﴾

اعلم: أنه مما أوجبتْ سلامةُ الفطرة، ووقوعُ الحاجات في أشخاص الإنسان، والارتفاقُ منها: آدابٌ يتأدَّبون بها فيما بينهم، وأكثرُها أمورٌ اجتمعت طوائف العرب والعجم على أصولها، وإن اختلفوا في الصور والأشباح، فكان البحث عنها، وتمييزُ الصالح من الفاسد منها: إحدى المصالح التي بُعث النبي صلى الله عليه وسلم لها.

فمنها: التحية: التي يُحَيِّيْ بها بعضُهم بعضًا، فإن الناس يحتاجون إلى إظهار التَّبَشْبُش فيما بينهم، وأن يُلاطف بعضهم بعضا، ويرى الصغير فضلَ الكبير، ويرحم الكبيرُ الصغيرَ، ويُوَاخِي الأقران بعضُهم بعضًا، فإنه لولا هذه لم تُثْمِرِ الصحبةُ فائدتها، ولاأنْتَجتْ جدْوَاها.

ولو لم تُضْبَطْ بلفظ لكانت من الأمور الباطنة، لايُعلَم إلا استنباطا من القرائن؛ ولذلك جرت سنة السلف في كل طائفة بتحية حسبما أدى إليه رأيهم، ثم صارت شعارًا لملتهم، وأمارةً لكون الرجل منهم، فكان المشركون يقولون: أنعم الله بك عينا! وأنعم الله بك صباحًا! وكان المجوس يقولون: ہزار سال بزی!

وكان قانون الشرع يقتضي أن يُذهب في ذلك إلى ماجرت به سنةُ الأنبياء عليهم السلام، وتلقوها عن الملائكة، وكان من قبيل الدعاء والذكر، دون الاطمئنان بالحياة الدنيا، كتمنّي طول الحياة، وزيادةِ الثروة، ودونَ الإفراط في التعظيم، حتى يُتاخِمَ الشركَ، كالسجدة، ولَثْمِ الأرض.

وذلك هو السلام: فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: " لما خلق الله آدم، قال: اذْهب، فسلِّم على أولئك النفرِ، وهم نفرٌ من الملائكة جُلوسٌ، فاستمع ما يُحَيُّوْنك به، فإنها تحيتك وتحيةُ ذريتك، فذهب، فقال: السلام عليكم، فقالوا: السلام عليك ورحمة الله، قال: فزادوه: ورحمة الله.

قوله: " فسلِّم على أولئك": معناه — والله أعلم — حَيِّهم حسبما يؤدي إليه اجتهادُك، فأصاب الحقَّ، فقال: السلام عليكم.

وقوله: " فإنها تحيتك" يعني حتمًا، من حيث أنه عَرَفَ أن ذلك مترشح من حظيرة القدس.

ترجمہ: آدابِ رفاقت: جان لیں کہ ان چیزوں میں سے جن کو سلامتی فطرت اور افرادِ انسانی میں حاجتوں کے پیش آنے نے واجب کیا: چند آداب ہیں، جن کے ذریعہ لوگ باہم شائستگی پیدا کرتے ہیں۔ اور ان کے بیشتر ایسے امور ہیں جن کی بنیادی باتوں پر عرب وعجم کے گروہ اتفاق رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ صورتوں اور شکلوں میں مختلف ہیں۔ پس ان سے بحث کرنا، اور ان میں سے مفید کو غیر مفید سے جدا کرنا: ان مصالح میں سے ایک ہے جن کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے ہیں۔

پس از انجملہ: وہ تحیہ ہے جس کے ذریعہ بعض بعض کو دعا دیتے ہیں۔ پس لوگ محتاج ہیں آپس میں خوشی کے اظہار کی طرف، اور اس کی طرف کہ ان کے بعض بعض کے ساتھ مہربانی کریں، اور چھوٹا بڑے کی برتری دیکھے، اور بڑا چھوٹے پر مہربانی کرے۔ اور ہم زمانہ ایک دوسرے سے بھائی چارہ قائم کریں۔ پس اگر یہ چیز نہیں ہوگی تو رفاقت مثمر فوائد نہیں ہوگی، اور نہ صحبت اس کے فوائد کا نتیجہ دے گی —— اور اگر تحیہ کو کسی لفظ کے ساتھ متعین نہیں کیا جائے گا تو وہ امور باطنہ میں سے ہوگا نہیں جانا جائے گا وہ مگر قرائن سے مستنبط کر کے۔ اور اسی وجہ سے ہر گروہ میں گذشتہ لوگوں کا تحیہ کا طریقہ جاری رہا ہے، اس کے موافق جس تک ان کی رائے پہنچی ہے۔ پھر ہوگیا وہ تحیہ ان کی ملت کا شعار، اور نشان آدمی کے ان میں سے ہونے کا۔ پس مشرکین کہا کرتے تھے: ''اللہ تعالیٰ آپ کی آنکھ ٹھنڈی کرے'' اور '' آپ کی صبح خوشگوار ہو'' اور مجوس کہا کرتے تھے: ''تم جیو ہزار برس!'' —— اور شریعت کا قانون چاہتا تھا کہ جایا جائے اس سلسلہ میں اس چیز کی طرف جس کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی سنت جاری ہوئی ہے۔ اور حاصل کیا ہے انبیاء نے اس تحیہ کو فرشتوں سے، اور ہو وہ دعا اور ذکر کے قبیل سے، نہ کہ دنیوی زندگی پر مطمئن ہونے کے قبیل سے، جیسے درازیٔ عمر کی اور دولت کی زیادتی کی آرزو۔ اور نہ ہو وہ

تعظیم میں اتنا بڑھنا کہ وہ شرک سے مل جائے۔ جیسے سجدہ کرنا اور زمین چومنا —— اور وہ سلام ہی ہے (اس کے بعد حدیث ہے جس کو شاہ صاحب نے مختصر کیا ہے اور شرح میں بھی مختصر ہی لکھی گئی ہے) اللہ پاک کا ارشاد: ''پس ان لوگوں کو سلام کرو'' اس کے معنی —— اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں —— ان کو سلام کرو اس کے موافق جس تک تمہارا اجتہاد پہنچے۔ پس آدمؑ نے حق کو پالیا، پس کہا: السلام علیکم —— اور اللہ پاک کا ارشاد: ''پس وہ تمہارا تحیہ ہے'' یعنی وجوبی طور پر، بایں اعتبار کہ اللہ تعالیٰ نے جانا کہ وہ تحیہ مترشح ہونے والا ہے حظیرۃ القدس سے۔

لغات تَبَشْبَشَ: يقال: لقيتُه فتَبَشْبَشَ بي، وأصله: تَبَشَّشَ، فابدلوا من الشين الوسطى باء، كما قالوا تجفف (لسان)...... وَاخَاہ: آخاہ کے ہم معنی ہے: دوستی اور بھائی چارہ قائم کرنا (قلیل الاستعمال)...... أَنْتَجَتِ الناقةُ: بچہ جننا۔ أَنْتَجَ الفقرَ: غربت کو جنم دیا۔ الجَدْوی: فائدہ، بخشش۔ ترجمہ: اور نہیں جنم دیگا وہ تحیہ اپنے فائدہ کو...... تَاخَمَ الموضعُ الموضعَ: ایک جگہ کا دوسری جگہ سے ملا ہوا ہونا۔ ملک کی سرحد کا ملنا...... لَثَمَ (ض) لَثْمًا: بوسہ دینا، چومنا۔

☆ ☆ ☆

احکامِ سلام اور ان کی حکمتیں

سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کی وجہ

سورۃ الزمر آیت ۷۳ میں ارشاد پاک ہے کہ جب متقی لوگ جنت پر پہنچیں گے تو محافظ فرشتے ان سے کہیں گے: السلام علیکم: تم پر سلامتی ہو، تم مزے میں رہو، پس جنت میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ!

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم جنت میں نہیں جاسکتے جب تک ایمان نہ لاؤ، اور تم (کامل) مؤمن نہیں ہوسکتے جب تک باہم محبت نہ کرو، اور کیا میں تم کو وہ چیز نہ بتاؤں جس کے کرنے سے تم میں باہم محبت پیدا ہو؟ آپس میں سلام کو خوب پھیلاؤ!'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۳۱)

تشریح: نبی ﷺ نے سلام کا فائدہ اور اس کی مشروعیت کی وجہ بیان کی ہے کہ سلام محبت پیدا کرتا ہے، اور محبت دخولِ جنت کا سبب ہے، اس لئے سلام مشروع کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ دخولِ جنت کے لئے لازمی شرط ایمان ہے۔ اور کمالِ ایمان کے لئے مسلمانوں کے درمیان رشتۂ الفت ومحبت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ وصف اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور اس کو حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سلام کو پھیلانا ہے یعنی اس کو رواج دینا ہے۔ جب لوگ خلوص سے ایک دوسرے کو سلام کریں گے، اور ان کو خوش آمدید کہیں گے، جس طرح فرشتے جنتیوں کو خوش آمدید کہیں گے تو باہم الفت ومحبت پیدا ہوگی، اور وہ جنت میں لے جائے گی۔ یہی کام مصافحہ اور دست بوسی وغیرہ بھی کرتے ہیں۔

سلام کرنے میں پہل کون کرے؟

حدیث(۱) ـــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چھوٹی عمر والا بڑی عمر والے کو، گذرنے والا بیٹھنے والے کو، اور تھوڑے زیادہ کو سلام کریں'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۳۳) اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ''سوار پیادہ کو سلام کرے'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۳۲)

حدیث(۲) ـــــ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بچوں کے پاس سے گذرے تو آپؐ نے ان کو سلام کیا (مشکوۃ حدیث ۴۶۳۴)

حدیث(۳) ـــــ حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں کے پاس سے گذرے تو آپؐ نے ان کو سلام کیا (مشکوۃ حدیث ۴۶۴۷)

تشریح: ان احادیث میں گونہ تعارض ہے۔ مثلاً فرمایا کہ چھوٹی عمر والا بڑی عمر والے کو سلام کرے، اور آپؐ نے خود بچوں کو سلام کیا۔ شاہ صاحب اس کا جواب دیتے ہیں:

دنیا کا عام دستور یہ ہے کہ گھر میں آنے والا گھر والوں کو سلام کرتا ہے، اور ادنی آدمی بڑے کو سلام کرتا ہے۔ نبی ﷺ نے اس رواج کو بحالہ باقی رکھا۔ چنانچہ چھوٹوں کو حکم دیا کہ بڑوں کو سلام کریں۔ اور گذرنے والے کو ـــــ جو گھر میں آنے والے کے مشابہ ہے ـــــ حکم دیا کہ وہ بیٹھے ہوؤں کو سلام کرے۔ اور تھوڑوں کو ـــــ جو تھوڑے ہونے کی وجہ سے ادنی ہیں ـــــ حکم دیا کہ وہ زیادہ کو سلام کریں۔

دوسری حکمت: اس حکم میں یہ ہے کہ اگر آدمی اپنے بڑے اور اشرف کی قدر پہچانے، اس کی توقیر کرے، اور بڑھ کر اس کو سلام کرے تو اس سے سوسائٹی کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ لوگ باہم مربوط ہوتے ہیں، ورنہ بڑوں چھوٹوں میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں فرمایا کہ جو ہمارے چھوٹوں پر مہربانی نہ کرے، اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانے، وہ ہم میں سے نہیں! (ابوداؤد حدیث ۴۹۴۳)

البتہ نبی ﷺ یہ بات بھی جانتے تھے کہ سلام لینے میں ایک طرح کی خود پسندی ہے۔ چھوٹا جب بڑے کو سلام کرتا ہے تو اس کو فخر محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اپنے فعل سے بڑوں کو تواضع اور خاکساری کی تلقین کی کہ ان کو سلام کرنے میں پیش قدمی کرنی چاہئے۔ کیونکہ بڑھ کر سلام کرنے والا تکبر سے پاک ہوتا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۶۶۶) اور سوار کو جو حکم دیا کہ پیادہ کو سلام کرے: اس میں خصوصیت سے یہ بات ملحوظ ہے۔ کیونکہ سوار لوگوں کے نزدیک بڑی ہیبت والا ہوتا ہے، اور وہ بھی خود کو بڑا تصور کرتا ہے، اس لئے اس کو تاکید کی کہ وہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے، اور پیادے کو سلام کرے۔

خلاصۂ جواب: یہ ہے کہ اصل حکم تو یہی ہے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کریں۔ مگر ایک دوسری مصلحت سے بڑوں کو تلقین کی گئی کہ وہ بھی چھوٹوں کو سلام کریں، تاکہ ان میں تواضع اور خاکساری پیدا ہو۔

[۱] وقال الله تعالى في قصة الجنة: ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خَالِدِيْنَ﴾ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لاتدخلون الجنة حتى تؤمنوا، ولا تؤمنوا حتى تَحَابُّوا، أوَلا أدلكم على شيئ إذا فعلتموه تحاببتم؟ أفشوا السلام بينكم"

أقول: بين النبيُّ صلى الله عليه وسلم فائدةَ السلام، وسببَ مشروعيته، فإن التحابب في الناس خصلةٌ يرضاها الله تعالى، وإفشاءُ السلام آلةٌ صالحة لإنشاءِ المحبة؛ وكذلك المصافحة، وتقبيل اليد، ونحوُ ذلك.

[۲] قال صلى الله عليه وسلم:" يسلِّم الصغيرُ على الكبير، والمارُّ على القاعد، والقليلُ على الكثير" وقال صلى الله عليه وسلم:" يسلِّم الراكب على الماشي"

أقول: الفاشي في طوائف الناس: أن يُحَيِّيَ الداخلُ صاحبَ البيتِ،والحقيرُ على العظيم، فأبقاه النبي صلى الله عليه وسلم على ذلك؛ غير أنه مَرَّ عليه السلام على غلمان فسلَّم عليهم، ومَرَّ على نسوة فسلَّم عليهن، علمًا منه:

[الف] أن في رؤية الإنسان فضلَ من هو أعظمُ منه وأشرف: جمعًا لشمل المدينة.

[ب] وأن في ذلك نوعًا من الإعجاب بنفسه، فجعل وظيفةَ الكبار التواضعَ، ووظيفةَ الصغار توقيرَ الكبار، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" من لم يرحم صغيرنا، ولم يوقِّر كبيرنا: فليس منا"

وإنما جعل وظيفةَ الراكب السلامَ على الماشي: لأنه أهيبُ عند الناس، وأعظمُ في نفسه، فتأكد له التواضع.

ترجمہ:(۲) لوگوں کے گروہوں میں پھیلنے والی بات یعنی رواج عام یہ ہے کہ گھر میں آنے والا گھر والوں کو سلام کرے۔اور ادنی آدمی بڑے آدمی کو سلام کرے۔پس اس کو نبی ﷺ نے اسی طرح باقی رکھا۔البتہ یہ بات ہے کہ نبی ﷺ بچوں پر گذرے تو آپؐ نے ان کو سلام کیا، اور آپ عورتوں پر گذرے تو آپؐ نے ان کو سلام کیا۔آپؐ کے جاننے کی وجہ سے:(الف) کہ انسان کے دیکھنے میں اس شخص کی برتری کو جو کہ وہ اس سے بڑا، اور اس سے اشرف ہے: مملکت کی پراگندگی کو جمع کرنا ہے(جمعًا:أن کا تم مؤخر ہے اور یہ اصل حکم کی حکمت ہے)(ب) اور یہ کہ اس میں یعنی سلام لینے میں خود پسندی کی ایک نوع ہے۔پس بنایا بڑوں کا خاص حصہ خاکساری، اور چھوٹوں کا خاص حصہ بڑوں کی توقیر، اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے(یہ حدیث ان لفظوں سے معروف ہے، مگر ابوداؤد میں وہ الفاظ ہیں جن کا شرح میں ترجمہ کیا گیا ہے) اور بنایا سوار کا خاص حکم پیدل کو سلام کرنا۔کیونکہ سوار لوگوں کے نزدیک بڑی ہیبت والا ہوتا ہے، اور اپنے دل میں بڑا ہوتا ہے، پس پختہ ہوئی اس کے لئے تواضع۔

یہود ونصاریٰ کو ابتداءً سلام نہ کرنے کی وجہ

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہود ونصاریٰ کو سلام کرنے میں ابتدا نہ کرو۔ اور جب ان میں سے کسی سے راستہ میں تمہاری ملاقات ہو، تو اس کو تنگ راستہ چلنے پر مجبور کرو'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۳۵)

تشریح: نبی ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ملتِ اسلامیہ کی شان بلند کرنا، اور اس کو سب ملتوں سے اعلیٰ واعظم بنانا ہے۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب مسلمانوں کے لئے غیر مسلموں پر مقدرت وغلبہ ہو۔ مذکورہ حکم اسی نقطۂ نظر سے دیا گیا ہے۔

کلماتِ سلام میں اضافے سے ثواب بڑھنے کی وجہ

حدیث — ایک شخص خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، اور اس نے کہا: السلام علیکم۔ نبی ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور فرمایا: ''دس'' یعنی اس بندے کے لئے دس نیکیاں لکھی گئیں۔ پھر دوسرا شخص آیا۔ اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ''بیس'' پھر تیسرا آدمی آیا۔ اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور فرمایا: ''تیس'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۴۴) اور ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے: پھر چوتھا شخص آیا۔ اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ومغفرتہ۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''چالیس'' اور فرمایا: ''یوں ثواب بڑھتا رہتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۴۵)

تشریح: کلماتِ سلام میں اضافہ سے ثواب میں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ سلام کی مشروعیت کی غرض بشاشت ومسرت، اتحاد ویگانگت، مودت ومحبت، ذکر ودعا، اور معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ہے کہ وہی سلامتی کے ضامن ہیں۔ پس کلماتِ سلام میں اضافہ مقصدِ سلام کی تکمیل کرتا ہے، اس لئے ثواب بڑھتا رہتا ہے۔

جماعت کی طرف سے ایک کا سلام کرنا اور ایک کا جواب دینا کافی ہے

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (گزرنے والی) جماعت میں سے اگر کوئی ایک سلام کرلے تو پوری جماعت کی طرف سے کافی ہے۔ اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی ایک جواب دیدے تو سب کی طرف سے کافی ہے''
(مشکوۃ حدیث ۴۶۴۸)

تشریح: جماعت معنی کے لحاظ سے ایک فرد ہے یعنی وہ فرد حکمی ہے، جیسے تین طلاقیں: طلاق کا فرد حکمی ہیں۔ اور سلام وجواب کا مقصد: وحشت دور کرنا، اور باہم الفت پیدا کرنا ہے۔ اور یہ مقصد ایک کے سلام کرنے اور ایک کے جواب دینے سے حاصل ہوجاتا ہے، اس لئے اس کو کافی قرار دیا گیا۔

سلامِ رخصت کی حکمت

حدیث ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں پہنچے تو چاہئے کہ سلام کرے، پھر بیٹھنا چاہے تو بیٹھے، پھر جب جانے لگے تو پھر سلام کرے، پس پہلا سلام پچھلے سلام سے زیادہ حقدار نہیں'' یعنی جتنی اہمیت پہلے سلام کی ہے اتنی ہی سلام رخصت کی ہے (مشکوۃ حدیث ۴۶۶۰)

تشریح: سلامِ رخصت میں تین مصلحتیں ہیں:

پہلی مصلحت: سلام کرکے جانے سے: ناراض ہوکر ناگواری سے چل دینے، اور کسی ضرورت کے لئے جانے اور پھر ایسی ہی صحبت کے لئے لوٹنے کے درمیان امتیاز ہوتا ہے۔ اگر سلام کرکے گیا ہے تو خوش گیا ہے، ورنہ دوسری بات کا اندیشہ ہے۔

دوسری مصلحت: سلام کرکے رخصت ہوگا تو صاحبِ مجلس کو اس سے کوئی بات کہنی ہوگی تو کہہ سکے گا۔ اور چپکے سے چلا گیا تو بات رہ جائے گی۔

تیسری مصلحت: ایک جانا کھسک جانا ہے۔ جس کی سورۃ النور آیت ۶۳ میں برائی آئی ہے۔ پس جو سلام کرکے جائے گا وہ اس عیب سے محفوظ رہے گا۔

[۳] قال صلى الله عليه وسلم: " لاتَبدؤوا اليهودَ والنصارى بالسلام، وإذا لقيتم أحدَهم في طريق فاضْطَرُّوه إلى أضيَقِه"

أقول: سره: أن إحدى المصالح التي بُعث النبي صلى الله عليه وسلم لها: التنويهُ بالملة الإسلامية، وجعلُها أعلى الملل وأعظمُها، ولايتحقق إلا بأن يكونَ لهم طَوْلٌ على من سواهم.

[٤] وقال صلى الله عليه وسلم فيمن قال: السلام عليكم: " عشر"، وفيمن زاد: ورحمة الله: "عشرون" وفيمن زاد أيضا: وبركاته: " ثلاثون" وأيضًا: ومغفرته: " أربعون" وقال: " هكذا تكون الفضائل"

أقول: سر الفضل ومناطه: أنه تتميم لما شرع الله له السلامَ: من التبشش، والتألُّف، والمُوادَّة، والدعاء، والذكر، وإحالة الأمر على الله.

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم: يجزئ عن الجماعة إذا مَرُّوا أن يسلِّم أحدُهم، ويجزئ عن الجلوس أن يردَّ أحدهم"

أقول: وذلك: لأن الجماعة واحدةٌ في المعنى، وتسليم واحد منهم يدفع الوحشة، ويُوَدِّدُ بعضهم بعضًا.

[٦] قال صلى الله عليه وسلم: " إذا انتهى أحدكم إلى مجلس فليسلِّم، فإن بداله أن يجلس فليجلس، ثم إذا قام فليسلِّم، فليست الأولى بأحقَّ من الآخرة"

أقول: سلام الوَداع فيه فوائد:

منها: التمييز بين قيام المتارَكةِ والكراهيةِ، وقيامِ الحاجة على نية العود لمثل تلك الصحبة.

ومنها: أن يتدارك المتدارِكُ بعضَ ما كان يقصُده ويُهِمُّه، ونحو ذلك.

ومنها: أن لايكون ذهابُه من التسلُّل.

وضاحت: ولايتحقق کی ضمیر فاعل التنويه کی طرف لوٹتی ہے.....ترجمہ: اوراز انجملہ: یہ ہے کہ تلافی کرنے والا تلافی کرے بعض اس کام کی جس کا وہ ارادہ کرتا ہے، اور جو اس کو فکر مند بنائے ہوئے ہے، یا اس کے مانند کوئی اور بات۔

☆ ☆ ☆

مصافحہ، معانقہ اور خوش آمدید کہنے کی حکمت

ملاقات کے وقت سلام کے بعد اگر مصافحہ اور معانقہ بھی کیا جائے، اور آنے والے کو خوش آمدید کہا جائے تو اس سے مودّت ومحبت اور فرحت وسرور میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور وحشت ونفرت اور قطع تعلق کا اندیشہ دور ہوتا ہے یعنی یہ باتیں سلام کے مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں۔ حدیث میں ہے کہ "سلام کا تکملہ مصافحہ ہے" (مشکوۃ حدیث ۴۶۸۱) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے معانقہ فرمایا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۶۸۶) اور وفد عبد القیس اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کو خوش آمدید کہا ہے (مشکوۃ حدیث ۴۶۸۴) پس یہ باتیں بھی مسنون ہیں۔

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب دو مسلمان آپس میں ملیں، اور مصافحہ کریں، اور دونوں اللہ کی حمد کریں، اور دونوں اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کریں، تو دونوں کی مغفرت کردی جاتی ہے" (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۹)

تشریح: مغفرت کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان بشاشت، باہمی محبت وملاطفت اور ذکر الٰہی کی اشاعت رب العالمین کو پسند ہے، اس لئے مصافحہ کرنے والے مغفرت کے حقدار ہوتے ہیں۔

فائدہ (۱): اس حدیث سے اور اس کی حکمت سے یہ بات واضح ہوئی کہ مغفرت کا استحقاق جب ہے کہ بوقت ملاقات پہلے سلام کیا جائے۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ سے ملتے تھے تو جب تک سلام نہیں کر لیتے تھے مصافحہ نہیں کرتے تھے (مجمع الزوائد ۸: ۳۶) پھر مصافحہ کے ساتھ ہر ایک سلام کی طرح جہراً کہے: يغفر الله لنا ولكم: اللہ میری اور آپ کی مغفرت فرمائیں! پھر مزاج پرسی کے وقت دونوں اللہ کی حمد کریں، اور ہر حال پر اللہ کا شکر بجالائیں تو دونوں کی مغفرت کردی جاتی ہے۔ مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو

بھی دو مسلمان آپس میں ملیں، ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں یعنی مصافحہ کریں تو اللہ پر حق ہے کہ وہ دونوں کی دعا میں حاضر ہوں، اور دونوں کو جدا نہ کریں یہاں تک کہ دونوں کو بخش دیں'' (مجمع الزوائد ۸: ۳۶) اس حدیث میں بھی دعا کی صراحت ہے۔ مگر چونکہ ایک مختصر حدیث آئی ہے: مامن مسلمَیْنِ یلتقیان فیتصافحان إلا غفر لهما قبل أن یتفرقا (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۹) یہ حدیث اتنی مشہور ہوگئی کہ مصافحہ سے دعا غائب ہوگئی۔ حالانکہ حادثہ واحدۃ میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ اور حدیث میں واو عاطفہ مطلق جمع کے لئے ہے۔ پس حمد کا محل مزاج پرسی کا وقت ہے (رحمۃ اللہ ۴: ۳۶۶)

فائدہ (۲): ایک حدیث میں معانقہ کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: جب اپنے بھائی یا عزیز دوست سے ملاقات ہو تو کیا اس کی اجازت ہے کہ اس سے لپٹ جائے، اسے گلے لگائے، اور اس کو چومے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس کی اجازت نہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۸۰) اس حدیث میں جو معانقہ اور تقبیل کی ممانعت ہے، اس کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ سینہ سے لگانے اور چومنے میں کسی برائی کا یا اس کا شبہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، ورنہ خود رسول اللہ ﷺ سے معانقہ اور تقبیل ثابت ہے۔

والسر في المصافحة، وقوله: مرحبًا بفلان، ومعانقةِ القادم، ونحوِها: أنها زيادةٌ في المودَّة، والتبشبشِ، ورفعُ الوحشة والتدابر.

قال صلى الله عليه وسلم: "إذا التقى المسلمان، فتصافحا، وحَمِدَا اللّٰهَ، واستغفَراه، غُفر لهما"

أقول: وذلك: لأن التبشبش فيما بين المسلمين، وتوادَّهم، وتلاطفَهم، وإشاعةَ ذكر الله فيما بينهم: يَرْضَى بها ربُّ العالمين.

ترجمہ: اور راز مصافحہ میں اور اس کے کسی کو خوش آمدید کہنے میں اور آنے والے سے معانقہ کرنے میں اور اس کے مانند میں: یہ ہے کہ یہ چیزیں مودّت، بشاشت، رفع وحشت و دفع قطع تعلق میں اضافہ ہیں۔ الی آخرہ۔

☆ ☆ ☆

کسی کے لئے کھڑے ہونے کا حکم

حدیث (۱) —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے لئے لوگ کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۹۹)

حدیث (۲) —— حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لاٹھی ٹیکتے ہوئے باہر تشریف لائے، ہم آپؐ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے، تو آپؐ نے فرمایا: ''کھڑے نہ ہو، جس طرح عجمی لوگ کھڑے ہوتے

ہیں: ان کے بعض بعض کی تعظیم کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۰۰)

حدیث (۳) —— جنگ بنوقریظہ کے موقعہ پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بیمار تھے۔ اور مدینہ میں قیام تھا فوج کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ جب بنوقریظہ ان کے فیصلہ پر اتر آئے تو نبی ﷺ نے ان کو بلاوا بھیجا۔ وہ گدھے پر سوار ہوکر آئے۔ جب حضور کی قیام گاہ کے قریب پہنچے تو آپؐ نے ان کے قبیلہ کے لوگوں سے فرمایا: ''اپنے سردار کی طرف کھڑے ہوؤ!'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۹۵) اور مسند احمد (۱۴۲:۶) میں ہے: ''اپنے سردار کی طرف کھڑے ہوؤ، پس ان کو اُتارو، چنانچہ انھوں نے ان کو اتارا''

حدیث (۴) —— جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کے پاس آتیں، تو آپ کھڑے ہوکر ان کی طرف بڑھتے، ان کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لیتے، اور اس کو چومتے، اور اپنی جگہ پر ان کو بٹھاتے۔ اور جب آنحضرت ﷺ ان کے یہاں تشریف لے جاتے، تو وہ کھڑی ہوکر آپؐ کی طرف بڑھتیں، آپؐ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لیتیں، اس کو چومتیں، اور آپؐ کو اپنی جگہ پر بٹھاتیں (مشکوۃ حدیث ۴۶۸۹)

تشریح: ان روایات میں بظاہر تعارض ہے۔ پہلی دو روایتیں قیام کے عدم جواز پر دلالت کرتی ہیں۔ اور دوسری دو روایتیں جواز پر، بلکہ استحسان پر۔ مگر حقیقت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ جواز و عدم جواز کی علتیں مختلف ہیں:

۱ —— عجمیوں کی طرح کھڑا ہونا جائز نہیں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ نوکر آقا کی خدمت میں، اور رعایا بادشاہ کی خدمت میں کھڑی رہتی تھی۔ ان کو بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور یہ انتہائی درجہ کی تعظیم تھی۔ جس کی سرحدیں شرک سے ملی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس کی ممانعت کی گئی۔ حدیثوں کے یہ الفاظ: ''جس طرح عجمی کھڑے ہوتے ہیں'' اور ''جس کو یہ پسند ہو کہ لوگ اس کے لئے کھڑے رہیں'' اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اور ''کھڑے رہنے'' اور ''کھڑے ہونے'' میں فرق ہے۔ **مَثَلَ بین یدیه مُثُولاً** کے معنی: خدمت میں دست بستہ کھڑے رہنے کے ہیں۔ اور یہی ممنوع ہے۔ پہلی دونوں حدیثوں میں اسی کا بیان ہے۔

۲ —— اور کسی کے آنے پر فرحت و سرور سے کھڑا ہونا، اس کے لئے جھوم جانا، اور اس کے اکرام اور اس کی خوش دلی کے لئے اٹھنا، پھر بیٹھ جانا، مسلسل کھڑا نہ رہنا: اس کی گنجائش ہے۔ اور آخری دونوں حدیثوں میں اسی کا بیان ہے۔

فائدہ: قیام تعظیمی کے جواز، بلکہ استحسان پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، مگر یہ استدلال درست نہیں۔ کیونکہ حدیث میں **قوموا لسید** کم نہیں ہے بلکہ **إلی سید** کم ہے یعنی ان کے تعاون کے لئے اٹھو۔ وہ بیمار تھے، ان کو سواری سے اترنے کے لئے مدد کی ضرورت تھی۔ لفظ سید سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آپؐ نے لوگوں کو قیام تعظیمی کا حکم دیا تھا۔ اور یہ شبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی پیدا ہوا تھا۔ مسند احمد کی محوّلہ بالا روایت میں ہے: **فقال عمر، سیدُنا اللّٰہُ عزوجل! قال: أنزلوہ، فأنزلوہ**: حضرت عمرؓ نے کہا: ہمارے آقا تو اللہ عزوجل ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''ان کو اتارو'' چنانچہ لوگوں نے ان کو اتارا۔ اس میں اشارہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے لفظ سید سے قیام تعظیمی سمجھا تھا۔ نبی ﷺ نے اس کی وضاحت کی کہ تعظیم کے لئے نہیں، بلکہ تعاون کے لئے اٹھنا ہے۔ اور اوپر جو

دوسری حدیث آئی ہے اس میں صراحت ہے کہ جب نبی ﷺ مکان سے باہر تشریف لائے، اور صحابہ کھڑے ہوئے تو وہ تعظیم ہی کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ مُثُول یعنی خدمت میں کھڑا رہنا مقصود نہیں تھا، پھر بھی آپؐ نے ممانعت فرمائی۔ کیونکہ یہی قیام تعظیمی مُثُول تک مُفضی ہوتا ہے، اور اس سے مقتدیٰ کا نفس بھی خراب ہوتا ہے، اور تعظیم میں افراط شروع ہوگئی تو مقتدی کا حال بھی برا ہوجاتا ہے، جیسا کہ لوگوں کے احوال سے یہ بات واضح ہے۔

پس جسے اپنی تعظیم کے لئے دوسروں کا کھڑا ہونا اچھا لگے: اس کے لئے جہنم کی وعید ہے۔ کیونکہ یہ تکبر کی نشانی ہے۔ اور متکبرین کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خود بالکل نہ چاہے، مگر دوسرے اکرام اور عقیدت ومحبت میں کھڑے ہوجائیں تو یہ دوسری بات ہے۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بھی پسند نہیں تھی۔ اور ہمارے اکابر بھی اس پر سخت ناگواری ظاہر کرتے تھے۔ البتہ کسی مہمان وغیرہ کے آنے پر فرحت وسرور اور اعزاز واکرام کے طور پر کھڑا ہونا جائز ہے۔

ملاقات پر سلام کی جگہ جھکنا ممنوع ہونے کی وجہ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص دوست برادر سے ملتا ہے، تو کیا وہ اس کے لئے جھک سکتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۸۰)

تشریح: جھکنا اس لئے ممنوع ہے کہ وہ نماز کے رکوع کے مشابہ ہے، پس وہ سلامی کے سجدہ کی طرح ہوگیا۔ نیز سلام کی جگہ جھکنا: اسلامی طریقہ کا اپنی طرف سے بدل تجویز کرنا ہے، جو جائز نہیں۔

وأما القيام : فاختلفت فيه الأحاديث: فقال صلى الله عليه وسلم:" من سَرَّه أن يتمثل له الرجالُ قيامًا، فليتبوأ مقعده من النار" وقال صلى الله عليه وسلم:" لاتقوموا كما يقوم الأعاجم: يُعَظِّمُ بعضُهم بعضًا" وقال صلى الله عليه وسلم في قصة سعد:" قوموا إلى سيدكم" وكانت فاطمةُ رضي الله عنها إذا دخلت على النبي صلى الله عليه وسلم قام إليها، فأخذ بيدها، فَقَبَّلَها وأجلسها في مجلسه؛ وإذا دخل صلى الله عليه وسلم عليها، قامت إليه وأخذت بيده، فقبَّلَته، وأجلسته في مجلسها.

أقول: وعندي: أنه لا اختلاف فيها في الحقيقة، فإن المعاني التي يدور عليها الأمر والنهي: مختلفةٌ، فإن العجم كان من أمرهم أن تقومَ الخَدَمُ بين أيدي سادتهم، والرعيةُ بين أيدي ملوكهم، وهو من إفراطهم في التعظيم، حتى كاد يُتاخِمُ الشركَ، فنهوا عنه، وإلى هذا وقعت الإشارةُ في قوله عليه السلام:" كما يقومُ الأعاجم" وقوله عليه السلام:" من سَرَّه أن يتمثّل"

يقال: مَثُلَ بين يديه مُثُولًا: إذا انتصب قائما للخدمة؛ أما إذا كان تبشبشاله، واهتزازًا إليه، وإكرامًا وتطييبا لقلبه، من غير أن يتمثَّل بين يديه، فلا بأس، فإنه ليس يُتَاخِمُ الشركَ.

وقيل: يارسول الله! الرجل منا يلقى أخاه، أَيَنْحَنِي له؟ قال: "لا" وسببه: أنه يشبه الركوعَ في الصلاة، فكان بمنزلة سجدة التحية.

ترجمہ: اور رہا قیام: پس اس میں حدیثیں مختلف ہیں (اس کے بعد چار حدیثیں ہیں) میں کہتا ہوں: اور میرے نزدیک: یہ ہے کہ حقیقت میں ان روایات میں کچھ اختلاف نہیں۔ پس بیشک وہ معانی (وجوہ) جن پر امر ونہی (جواز وعدم جواز) کا مدار ہے مختلف ہیں: (۱) پس بیشک عجم کا معاملہ یہ تھا کہ نوکر اپنے آقا کے سامنے اور رعایا اپنے بادشاہوں کے سامنے کھڑی ہوتی تھی۔ اور وہ ان کے تعظیم میں مبالغہ سے تھا، یہاں تک کہ قریب تھا وہ کہ شرک سے مل جائے، پس لوگ اس سے روکے گئے...... رہا جب کھڑا ہونا آنے والے کے لئے بشاشت کے طور پر، اور اس کے لئے جھومنے کے طور پر، اور اکرام اور اس کے دل کو خوش کرنے کے طور پر ہو اس کے بغیر کہ وہ اس کے لئے کھڑا رہے تو گنجائش ہے۔ پس بیشک وہ شرک سے ملنے والا نہیں۔

☆ ☆ ☆

استیذان کی حکمت اور اس کے مختلف درجات

سورۃ النور آیت ۲۷ میں ارشاد پاک ہے: "اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوؤ، یہاں تک کہ تم اجازت حاصل کرو، اور ان کے رہنے والوں کو سلام کرو"

اور سورۃ النور ہی کی آیات ۵۸و۵۹ میں ارشاد پاک ہے: "اے ایمان والو! چاہئے کہ تم سے اجازت لیں وہ لوگ جن کے تم مالک ہو یعنی غلام باندی، اور وہ لوگ جو تم میں سے حد بلوغ کو نہیں پہنچے، تین اوقات میں: صبح کی نماز سے پہلے، اور دوپہر میں جب تم کپڑے اتار دیتے ہو، اور عشا کی نماز کے بعد۔ یہ تین اوقات تمہارے پردے کے اوقات ہیں۔ اور ان اوقات کے علاوہ تم پر کچھ الزام نہیں، اور نہ اُن پر کچھ الزام ہے۔ وہ بکثرت تمہارے پاس آنے جانے والے ہیں: ایک دوسرے کے پاس۔ اس طرح اللہ تعالیٰ صاف صاف احکام بیان فرماتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جاننے والے حکمت والے ہیں۔ اور جب تمہارے بچے حد بلوغ کو پہنچیں تو ان کو بھی اُسی طرح اجازت لینی چاہئے جس طرح ان سے اگلے لوگ لیتے ہیں"

تفسیر: استیناس کے لغوی معنی ہیں: اُنسیت حاصل کرنا، مانوس کرنا۔ اور مراد استیذان یعنی اجازت طلب کرنا ہے۔ اور استیذان کو استیناس کے لفظ سے ذکر کرنے میں اجازت طلبی کی ایک مصلحت کی طرف اشارہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص باقاعدہ اجازت لے کر اندر آتا ہے تو اس سے اُنسیت ہوتی ہے، وحشت نہیں ہوتی۔ اور اگر اذن واطلاع کے بغیر آجاتا ہے تو موڈ خراب ہوجاتا ہے۔

فائدہ: اور دو فعلوں کے درمیان واو عاطفہ مطلق جمع کے لئے ہے۔ ترتیب ملحوظ نہیں۔ کیونکہ استیذان کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آنے والا پہلے سلام کرے، پھر نام بتلا کر اجازت طلب کرے۔ حدیث میں ہے کہ بنو عامر کے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے اس طرح اجازت طلب کی: أَلِجُ؟ میں اندر گھس آؤں؟ آپؐ نے خادم سے فرمایا: "یہ شخص استیذان کا طریقہ نہیں جانتا، تم باہر جا کر اس کو طریقہ سکھلاؤ کہ کہے: السلامُ علیکم، أأدخل؟ تم سلامت رہو! کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ اُن صاحب نے آپؐ کی یہ بات سن لی، چنانچہ انھوں نے اسی طرح اجازت طلب کی، آپؐ نے اجازت دیدی (ابوداؤد حدیث ۵۱۷۷)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص پہلے سلام نہ کرے، اس کو اندر آنے کی اجازت مت دو" (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۶) اور یہ سلام: سلامِ استیذان ہے، پس جب اجازت کے بعد گھر میں داخل ہوتو دوبارہ سلام کرے (معارف القرآن)

اور آیت میں سلام پر استیذان کی تقدیم کی وجہ یہ ہے کہ آنے والا سلام تو کیا ہی کرتا ہے، لوگ استیذان میں غفلت برتتے ہیں، اس لئے اہمیت ظاہر کرنے کے لئے استیذان کا حکم مقدم کیا گیا ہے (فائدہ تمام ہوا)

اور استیذان کا حکم دو وجہ سے دیا گیا ہے:

پہلی وجہ: آدمی کبھی تنہائی میں بے تکلف حالت میں ہوتا ہے، اور کبھی کسی ضرورت سے برہنہ ہوتا ہے، پس اگر کوئی اچانک گھر میں گھس آئے گا تو اس کی اس کے ستر پر نظر پڑے گی، اور یہ بات اس کو سخت ناگوار ہوگی۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: کیا میں اپنی والدہ کے پاس جانے کے لئے اجازت لوں؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں! اجازت لو" انھوں نے عرض کیا: میں والدہ کے ساتھ رہتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: "پھر بھی اجازت لو" انھوں نے عرض کیا: میں اس کا خادم ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: "تاہم اجازت لو، کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ اپنی والدہ کو ننگا دیکھو؟" انھوں نے جواب دیا: نہیں! آپؐ نے فرمایا: "پس اجازت لو" کیونکہ ہوسکتا ہے وہ کسی ضرورت سے ستر کھولے ہوئے ہو، اور اس پر تمہاری نظر پڑ جائے (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۴)

فائدہ: گھر میں صرف اپنی بیوی ہو تو استیذان واجب نہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ بدوں اطلاع داخل نہ ہو، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں کھنکار کر داخل ہوتے تھے۔ ان کی اہلیہ بیان کرتی ہیں کہ آپؓ کا یہ معمول اس لئے تھا کہ وہ ہمیں ایسی حالت میں نہ دیکھیں جو ان کو پسند نہ ہو (ابن کثیر) اور یہ بھی ممکن ہے کہ پاس پڑوس کی کوئی عورت گھر میں آئی ہوئی ہو، اس لئے اجازت لے کر داخل ہونا ہی مناسب ہے (فائدہ تمام ہوا)

دوسری وجہ: کبھی انسان اپنے گھر میں تنہائی میں کوئی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے کہ نہیں چاہتا کہ دوسرا اس سے واقف ہو، پس اگر کوئی شخص بے اجازت اندر گھس آئے گا تو اس کو سخت اذیت پہنچے گی۔ اور حکم استیذان کی علت ایذاء رسانی سے بچنا، اور حسن معاشرت کے آداب سکھانا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے گھر میں جھانکا، آپؐ باریک سینگی

سے سر مبارک کھجلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر میں جانتا کہ تو گھر میں دیکھ رہا ہے تو میں تیری آنکھ میں سینگی مارتا۔ اجازت حاصل کرنے کا حکم آنکھ ہی کی وجہ سے تو ہے!'' (بخاری حدیث ۶۲۴۱)

اور استیذان کے تعلق سے لوگ تین طرح کے ہیں:

اول: اجنبی شخص جس سے ملنا جلنا نہیں ہوتا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ وہ صراحۃً اجازت لئے بغیر گھر میں داخل نہ ہو۔

حضرت کلدہ بن حنبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ (ان کے اخیافی بھائی) صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ نے ان کو دودھ، ہرنی کا بچہ اور چھوٹی ککڑیاں دے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ وادی مکہ کے بالائی حصہ میں قیام فرما تھے۔ کلدہ کہتے ہیں: میں یہ چیزیں لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا، اور میں نے پہلے سلام کیا نہ حاضری کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا: ''واپس جاؤ، اور کہو: السلام علیکم! أ أدخل ؟ تم پر سلامتی ہو، کیا میں اندر آسکتا ہوں؟ (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۱) رسول اللہ ﷺ نے حضرت کلدہؓ کو عملی طور پر استیذان کا طریقہ سکھلایا تاکہ یہ سبق ہمیشہ یاد رہے۔

مسئلہ: اگر کسی کے دروازے پر جاکر اجازت طلب کی: سلام کیا، دروازہ کھٹکھٹایا، یا گھنٹی بجائی، مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا، تو دوبارہ اجازت طلب کرے، پھر جواب نہ آئے تو تیسری مرتبہ اجازت طلب کرے، اگر تیسری مرتبہ بھی جواب نہ آئے، تو لوٹ جائے مسلم شریف (۱۴: ۱۳۲) میں روایت ہے کہ ''اجازت تین مرتبہ طلب کی جائے، پس اگر تمہیں اجازت دی جائے تو فبہا، ورنہ واپس لوٹ جائے'' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تین مرتبہ استیذان سے تقریباً یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ آواز سن لی گئی ہے، مگر صاحبِ خانہ یا تو ایسی حالت میں ہے کہ جواب نہیں دے سکتا۔ مثلاً: نماز پڑھ رہا ہے، یا بیت الخلاء میں ہے، یا غسل کر رہا ہے، یا پھر اس کو اس وقت ملنا منظور نہیں۔ پس ایسی حالت میں جمے رہنا، اور مسلسل دستک دیتے رہنا مصلحت کے خلاف بلکہ باعثِ ایذاء ہے، جس سے بچنا واجب ہے (ماخوذ از معارف القرآن ۶: ۳۹۲)

دوم: ایسا غیر محرم جس کے ساتھ ملنا جلنا اور معاشرتی تعلقات ہوں۔ ایسے شخص کی اجازت طلبی پہلے شخص کی اجازت طلبی سے کم درجہ کی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جو نبی ﷺ کے خادم خاص تھے، آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

إِذْنُكَ عَلَيَّ: أن يُرْفَعَ الحجابُ، وأن تَسْتَمِعَ سِوَادِي، حتى أنهاك (مسلم ۱۴: ۱۵۰ مصری) ترجمہ: میرے پاس آنے کے لئے تمہاری اجازت یہ ہے کہ پردہ اٹھا دیا گیا ہو، یعنی دروازہ کھلا ہوا ہو، اور یہ بات ہے کہ تم (مجھے بات کرتا ہوا) سنو (اور) میری ذات کو (دیکھو) یہاں تک کہ میں تم کو روک دوں۔ یعنی بیٹھک میں کوئی آیا ہوا ہو، اور دروازہ کھلا ہو، اور اس آنے والے سے رسول اللہ ﷺ گفتگو فرما رہے ہوں، تو خادم خاص حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کے لئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، البتہ ان کو روک دیا جائے تو رک جانا ضروری ہے۔

سوم: بچے اور غلام ہیں، جن سے پردہ واجب نہیں، اس لئے ان کے لئے استیذان کا حکم بھی نہیں۔ البتہ وہ اوقات جن میں عام طور پر کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں: ان کو بھی اجازت لے کر آنا چاہئے۔ اور یہ اوقات ملکوں اور قوموں کے

اعتبار سے مختلف ہوسکتے ہیں۔ اور آیت کریمہ میں جن اوقات کا ذکر ہے، ان کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان اوقات میں بچے اور غلام گھر میں آیا کرتے ہیں۔ ان اوقات میں حصر نہیں۔ مثلاً آدھی رات میں آنا چاہیں تو بھی اجازت ضروری ہے، مگر اس وقت کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اس وقت بچے اور غلام گھر میں نہیں آیا کرتے۔

مسئلہ: جس شخص کو کسی کے ذریعہ بلایا گیا ہو، اگر وہ قاصد کے ساتھ ہی آجائے، تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں، اس کی طرف قاصد بھیجنا ہی اجازت ہے۔ حدیث میں ہے کہ "آدمی کا آدمی کی طرف قاصد بھیجنا اجازت ہے" (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۲) اور ایک روایت میں ہے: "جو آدمی بلایا جائے، اور وہ قاصد کے ساتھ ہی آجائے، تو یہی اس کے لئے اندر آنے کی اجازت ہے (حوالہ بالا)

حدیث —— نبی ﷺ جب کسی کے دروازے پر پہنچتے، تو دروازے کے سامنے کھڑے نہیں ہوتے تھے، بلکہ دائیں بائیں کھڑے ہوتے تھے، اور فرماتے: السلام علیکم، السلام علیکم (مشکوۃ حدیث ۴۶۷۳) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں دروازوں پر پردے نہیں ہوتے تھے۔ پس اگر پردہ پڑا ہوا ہو یا کواڑ بند ہوں تو سامنے کھڑا ہونا جائز ہے۔

قال الله تعالى: ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَاتَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوْا، وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى أَهْلِهَا﴾ وقال الله تعالىٰ: ﴿يَـــآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِيَسْتَأْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ، وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ﴾ إلى قوله: ﴿ كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ فقوله: ﴿تَسْتَأْنِسُوْا﴾ أى تستأذنوا.

أقول: إنـمـا شُـرِع الاستئذان لكراهيةِ أن يهجم الإنسانُ على عورات الناس، وأن ينظر منهم مايكرهونه، وقال النبى صلى الله عليه وسلم فى بعض حديثه: "إنما جُعل الاستئذانُ لأجل البصر"

فكان من حقه أن يختلف باختلاف الناس:

فـمنهم: الأجـنبـى الـذى لامـخـالـطةَ بيـنهـم وبيـنــه، ومن حقـه: أن لايدخل حتى يُصَرِّح بـالاستئذان، ويُصَرَّح له بالإذن، ولذلك علَّم النبى صلى الله عليه وسلم كَلْدَةَ بنَ حَنْبل — رجلاً من بنى عامر —— أن يـقـول: "السلام عليكم أ أدخل؟" قال صلى الله عليه وسلم: "الاستئذان ثلاثٌ، فإن أُذِن لك، وإلا فارجع"

ومنهم: نـاس أحرار ليسوا بالمحارم، لكن بينهم خَلْطَةٌ وصحبةٌ، فاستئذانهم دون استئذان الأولين، ولذلك قال صلى الله عليه وسلم لعبد الله بن مسعود: "إذنُك عليَّ أن يُرفعَ الحجابُ، وأن تستمع سِوَادى، حتى أنهاك"

ومنهم: صبيـانٌ ومـماليكُ: لايجب الستر منهم، فلا استئذان لهم، إلا فى أوقات جرت العادة فيهـا بـوضـع الثيـاب؛ وإنـمـا خـصَّ الله تـعـالى هذه الأوقاتَ الثلاثَ: لأنها وقتُ وُلوج الصبيان

والمماليك، بخلاف نصف الليل مثلاً.
وقال صلى الله عليه وسلم: " رسولُ الرجل إلى الرجل إذنُه" وذلك: لأنه عَرَفَ بدخوله لَمَّا أرسل إليه.
وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا أتى بابَ قوم لم يستقبل الباب من تلقاء وجهه، ولكن من ركنه الأيمن أو الأيسر، فيقول: السلام عليكم، السلام عليكم، وذلك: لأن الدُّوْرَ لم يكن يومئذ عليها ستور.

ترجمہ: استیذان مشروع کیا گیا ہے: (۱) اس بات کو ناپسند کرنے ہی کی وجہ سے کہ کوئی شخص اچانک پہنچ جائے لوگوں کے ستروں پر (۲) اور اس وجہ سے کہ وہ دیکھے ان سے اس چیز کو جس کو وہ ناپسند کرتے ہیں۔ اور نبی ﷺ نے اپنی ایک بات کے ضمن میں فرمایا ہے کہ استیذان کا حکم آنکھ ہی کی وجہ سے مقرر کیا گیا ہے —— پس استیذان کے حق سے یہ بات ہے کہ وہ لوگوں کے اختلاف سے مختلف ہو: پس از انجملہ: وہ اجنبی شخص ہے کہ گھر والوں اور اس کے درمیان ملنا جلنا نہیں، اور اس اجنبی کے حق سے یہ ہے کہ نہ داخل ہو وہ یہاں تک کہ صراحۃً اجازت لے، اور اس کو صراحۃً اجازت دی جائے۔ اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے کلدۃ بن حنبل کو جو بنی عامر کے ایک آدمی ہیں سکھلایا کہ وہ کہیں: السلام علیکم، کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ (یہ تسامح ہے۔ کلدۃ بنو عامر کے آدمی نہیں ہیں۔ ابوداؤد میں دو روایتیں یکے بعد دیگرے آئی ہیں۔ ایک کلدۃ کی ہے دوسری بنو عامر کے آدمی کی ہے۔ شاہ صاحب کی نظر چوک گئی ہے۔ شرح میں دونوں روایتیں مذکور ہیں) —— اور از انجملہ: ایسے آزاد لوگ ہیں جو محارم نہیں ہیں، مگر ان کے درمیان معاشرت (میل جول) اور رفاقت ہے پس ان کی اجازت طلبی پہلوں کی اجازت طلبی سے کم ہے —— اور از انجملہ: بچے اور غلام ہیں، ان سے پردہ واجب نہیں، پس ان کے لئے اجازت طلبی بھی نہیں، مگر ایسے اوقات میں کہ ان میں عادت جاری ہے کپڑے اتار دینے کی —— اور اللہ تعالیٰ نے ان تین اوقات کو اسی لئے خاص کیا ہے کہ بچوں اور غلاموں کے داخل ہونے کے اوقات ہیں، برخلاف آدھی رات کے مثال کے طور پر۔

☆ ☆ ☆

۲ — بیٹھنے، سونے، سفر کرنے، چلنے، چھینک اور جمائی لینے کے آداب

(۱) —— کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھنے کی وجہ —— حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کوئی آدمی دوسرے آدمی کو اس کی جگہ سے نہ اٹھائے، پھر وہ خود اس جگہ بیٹھ جائے یعنی مجلس سے کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہئے، بلکہ کہے: کھل جاؤ اور گنجائش پیدا کرو" (مشکوٰۃ حدیث ۴۶۹۶)

تشریح: یہ ممانعت اس وجہ سے ہے کہ یہ حرکت تکبر اور خود پسندی کی وجہ سے صادر ہوتی ہے، جو بُری عادت ہے۔ اور

اس سے دوسرے کے دل میں میل آتا ہے اور کینہ کپٹ پیدا ہوتا ہے، اور یہ بھی بُری بات ہے، پس اس سے بچنا چاہئے۔

فائدہ: البتہ اگر بیٹھا ہوا شخص خود کسی کے لئے ایثار کرے، اور اپنی جگہ خالی کردے، تو وہ اجر کا مستحق ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک مسلمان کا اکرام ہے جو پسندیدہ امر ہے۔

(۲) — **پہلے سے بیٹھا ہوا آدمی اپنی جگہ کا زیادہ حقدار ہے** — **حدیث** — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنی جگہ سے (کسی ضرورت سے) اٹھا، پھر وہ وہاں واپس آگیا، تو وہ اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۶۹۷)

تشریح: جو شخص کسی مباح جگہ میں: جیسے مسجد، سرائے یا کسی گھر میں آکر بیٹھ جاتا ہے: اس جگہ کے ساتھ اس کا حق متعلق ہوجاتا ہے۔ پس جب تک وہ اس جگہ سے بے نیاز نہ ہوجائے: اس کو اس جگہ سے بے دخل کرنا جائز نہیں۔ یہ اس کی حق تلفی ہے۔ اور اس کا حال بنجر زمین کی آبادکاری کی طرح ہے، جس کی وجہ رحمۃ اللہ (۲۵۱:۴) میں گذر چکی ہے۔

(۳) — **دو آدمیوں کے درمیان بغیر اجازت نہ بیٹھے** — **حدیث** — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ دو شخصوں کے درمیان جدائی کرے، مگر ان کی اجازت سے'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۰۳)

تشریح: دو شخصوں کے درمیان ان کی اجازت کے بغیر بیٹھ کر ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دو وجہ سے **ممنوع** ہے: اول: کبھی دو شخص کوئی پوشیدہ بات کرنے کے لئے اور سرگوشی کے لئے اکٹھا بیٹھتے ہیں۔ پس ان دونوں کے درمیان گھسنا دونوں کو مکدر کردے گا۔ دوم: اور کبھی دونوں میں انسیت و محبت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ساتھ بیٹھنا چاہتے ہیں، پس ان دونوں کے درمیان بیٹھنا ان کو وحشت میں ڈالنا ہے۔

(۴) — **ٹانگ کھڑی کرکے اس پر ٹانگ رکھ کر لیٹنے کی ممانعت** — **حدیث (۱)** — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص ہرگز چت نہ لیٹے، پھر اپنا ایک پیر دوسرے پیر پر رکھے'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۱۰)

حدیث (۲) — حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم مازنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں اس طرح چت لیٹے ہوئے دیکھا ہے کہ آپ اپنا ایک پیر دوسرے پیر پر رکھے ہوئے تھے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۷۰۸)

تشریح: زمانۂ نبوت میں عربوں میں عموماً تہبند باندھنے کا رواج تھا۔ اور تہ بند باندھ کر اگر اس طرح چت لیٹا جائے کہ ایک زانو کھڑا کرکے دوسرا اس پر رکھا جائے تو بسا اوقات ستر کھلنے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ پہلی حدیث میں اس طرح لیٹنے کی ممانعت کی۔ البتہ اگر لباس ایسا ہو کہ اس بات کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً شلوار پہن رکھی ہو، تو اس طرح لیٹنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسری حدیث میں فعل نبوی سے جواز ثابت ہوتا ہے۔

(۵) — **پیٹ کے بل اوندھا لیٹنے کی ممانعت** — **حدیث** — طِخفہ بن قیس غفاری رضی اللہ عنہ جو اصحاب صفہ میں سے تھے: بیان کرتے ہیں کہ میں رات کے پچھلے حصہ میں پیٹ کے بل اوندھا لیٹا ہوا تھا کسی شخص نے اپنے پیر سے مجھے ہلایا، پس کہا: ''لیٹنے کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے!'' پس اچانک وہ رسول اللہ ﷺ تھے (مشکوۃ حدیث ۴۷۱۹)

اور ایک روایت میں ہے کہ ''یہ دوزخیوں کے لیٹنے کا طریقہ ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۳۱)

تشریح: لیٹنے کا یہ طریقہ اس لئے ممنوع ہے کہ یہ نہایت مکروہ ومنکر ہیئت ہے، دوزخیوں کے ساتھ تشبیہ بھی اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

(۶) — **سپاٹ چھت پر سونے کی ممانعت — حدیث** — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص کسی گھر کی ایسی چھت پر رات میں سوئے جس پر رکاوٹ نہ ہو تو اس کی ذمہ داری ختم ہوگئی'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۲۰)

تشریح: منڈیر بغیر کی چھت پر رات میں سونے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اندیشہ ہے کہ آدمی کی آنکھ کھلے، اور رات کی تاریکی اور نیند کی غفلت میں وہ چھت سے نیچے گر جائے، پس اس نے خود کو ہلاکت کے درپے کیا، حالانکہ اللہ پاک کا حکم ہے: ''اپنے ہاتھوں یعنی باختیار خود ہلاکت میں نہ پڑو'' (سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۵) اور اس شخص نے اللہ کے اس حکم پر عمل نہیں کیا، پس اگر وہ گر کر ہلاک ہوجائے یا چوٹ کھائے تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔

ومنها: آداب الجلوس، والنوم، والسفر، ونحوها

[۱] قال صلى الله عليه وسلم: " لايُقيم الرجلُ الرجلَ من مجلسه، ثم يجلس فيه، ولكن يقول: تفسَّحوا وتوسَّعوا"

أقول: وذلك: لأنه يصدُر من كِبْر وإعجابٍ بنفسه، ويَجِدُ به الآخَرُ وَحَرًا وضغينةً.

[۲] وقال صلى الله عليه وسلم: " من قام من مجلسه، ثم رجع إليه، فهو أحق به"

أقول: من سبق إلى مجلس أُبيح له: من مسجد أورِباط أو بيت، فقد تعلق حقه به، فلا يُهَيَّجُ حتى يَستغني عنه، كالموات ومَقدمِ هنالك.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: لايحل للرجل أن يفرِّق بين اثنين إلا بإذنهما"

أقول: وذلك: لأنهما ربما يجتمعان لِمُسَارَّةٍ ومناجاة، فيكون الدخول بينهما تنغيصًا عليهما؛ وربما يتأنَّسان فيكون الجلوس بينهما إيحاشًا لهما.

[٤] قال صلى الله عليه وسلم: " لايستَلْقِيَنَّ أحدكم، ثم يضع إحدى رجليه على الأخرى" ورُؤِيَ صلى الله عليه وسلم في المسجد مستلقيا، واضعا إحدى قدميه على الأخرى.

أقول: كان القوم يأتزرون، والمؤتَزِرُ إذا رفع إحدى رجليه على الأخرى: لايأمن أن تنكشف عورتُه؛ فإن كان لابسَ سراويلَ، أو يَأْمَنُ انكشافَ عورتِه، فلا بأس بذلك.

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم لمضطجع على بطنه: " إن هذه ضِجْعَةٌ يُبغِضُها الله"

أقول: وذلك: لأنها من الهيئات المنكرة القبيحة.

[۶] وقال صلى الله عليه وسلم:" من بات على ظهر بيت، ليس عليه حجاب، فقد برئت منه الذمة"
أقول: وذلك: لأنه تعرَّض لإهلاك نفسه، وألقى نفسه إلى التهلكة، وقد قال الله تعالىٰ: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾

ترجمہ:(۱)اور وہ بات یعنی ممانعت اس لئے ہے کہ وہ بات یعنی کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا تکبر اور خود پسندی کی وجہ سے صادر ہوتا ہے، اور دوسرا اس کی وجہ سے دل میں کینہ کپٹ پاتا ہے —— (۲)جو شخص کسی ایسی جگہ کی طرف جو اس کے لئے مباح کی گئی ہے پہلے پہنچا جیسے مسجد یا سرائے یا کوئی گھر تو یقیناً اس کے ساتھ اس کا حق وابستہ ہوگیا، پس وہ برانگیختہ نہ کیا جائے یہاں تک کہ وہ اس سے بے نیاز ہوجائے، جیسے بنجر زمین، اور اس کی وجہ وہاں یعنی مَوات کے بیان میں گذر چکی —— (۳)اور وہ ممانعت اس لئے ہے کہ کبھی دو شخص کوئی پوشیدہ بات کرنے کے لئے اور سرگوشی کیلئے اکٹھا بیٹھتے ہیں، پس ان دونوں کے درمیان گھسنا دونوں کو مکدر کرنا ہے۔ اور کبھی دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہوتے ہیں، پس ان دونوں کے درمیان بیٹھنا ان کو وحشت میں ڈالنا ہے —— (۴)لوگ لنگی پہنا کرتے تھے، اور لنگی پہننے والا جب اپنا ایک پیر دوسرے پر اٹھا کر رکھے گا تو وہ مطمئن نہیں ہوگا اس سے کہ اس کا ستر کھل جائے۔ پس اگر وہ شلوار پہنے ہوئے ہو یا اپنے ستر کے کھلنے سے مطمئن ہو تو کوئی مضائقہ نہیں —— (۵)اور وہ ناپسندیدگی اس لئے ہے کہ وہ ہیئت مکروہ و منکر ہیئتوں میں سے ہے —— (۶)اور وہ ممانعت اس لئے ہے کہ وہ خود درپے ہوا ہلاکت کے، اور اس نے خود کو ہلاکت میں ڈالا، درانحالیکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اپنے تئیں ہلاکت میں نہ پڑو''

لغات: الوَحر: کینہ...... المُسارَّة: سرگوشی۔ سارَّہ فی أُذُنه مُسارَّةً أی تناجوا (لسان)

☆ ☆ ☆

⑦ — حلقہ کے بیچ میں بیٹھنے کی ممانعت کی وجہ —— حدیث —— حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے وہ شخص ملعون ہے جو حلقہ کے بیچ میں بیٹھتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۲۲)

تشریح: اس حدیث کی چند توجیہات ہیں:

پہلی توجیہ: حلقہ کے بیچ میں بیٹھنے والے سے مراد: وہ مسخرہ ہے جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے ان کے بیچ میں بیٹھتا ہے۔ لوگ اس کو چھیڑتے ہیں، اس پر فقرے کستے ہیں، اور وہ الٹا سیدھا جواب دیتا ہے، جس پر لوگ قہقہہ لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شیطانی عمل ہے، اس لئے اس پر لعنت کی گئی ہے۔

دوسری توجیہ: کچھ لوگ حلقہ بنائے بیٹھے ہوں، اور ہر ایک کا دوسرے سے مواجہہ یعنی آمنا سامنا ہو، ایک شخص آکر اس حلقہ کے بیچ میں اس طرح بیٹھ جائے کہ بعض کی طرف اس کی پیٹھ ہو، اور ایک جانب اس کا منہ ہو، تو جن لوگوں کی طرف اس کی پیٹھ ہوگی، اور جن کا مواجہہ باقی نہیں رہے گا، ان کو یہ بات سخت ناگوار ہوگی، اس لئے وہ شخص ملعون ہے۔

تیسری توجیہ: کچھ اللہ کے بندے حلقہ بنائے بیٹھے ہوں، اور ایک بے تمیز، اجڈ، ادب ناآشنا آکر حلقہ کے بیچ میں

بیٹھ جائے، تو سب کو یہ بات ناگوار ہوتی ہے، اس لئے اس پر پھٹکار بھیجی گئی ہے (یہ توجیہ شارح نے بڑھائی ہے)

⑧ — عورتوں کے چلنے کا ادب، اور عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت — حدیث (۱) — حضرت ابو اُسید انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد سے باہر نکلے، پس (دیکھا کہ مسجد سے لوٹنے والے) مرد: عورتوں سے راستہ میں مل گئے ہیں یعنی سب ملے جلے چل رہے ہیں، آپؐ نے (عورتوں سے) فرمایا: ''تم پیچھے ہو جاؤ، یعنی ایک طرف ہو جاؤ، پس تمہارے لئے نہیں ہے کہ تم راستہ کے بیچ میں چلو، تم راستے کے کنارے لازم پکڑو'' چنانچہ عورت دیوار کے ساتھ لگ کر چلتی تھی، یہاں تک کہ اس کا کپڑا دیوار سے لگ جاتا تھا (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۲۷) اس حدیث میں راستہ میں عورتوں کے چلنے کا ادب بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ آگے آرہی ہے۔

حدیث (۲) — حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے منع کیا کہ آدمی دو عورتوں کے درمیان چلے (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۲۸) یہ ممانعت اس لئے ہے کہ مرد غیر محرم عورت کو مس کرے نہ اس کو دیکھے۔

⑨ — چھینکنے پر حمد کرنے کی، حمد کرنے والے کو دعا دینے کی، اور دعا کا جواب دینے کی حکمت —

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے تو اسے چاہئے کہ الحمد للہ کہے، اور چاہئے کہ اس کا بھائی — یا فرمایا اس کا ساتھی — یَرْحَمُكَ الله کہے۔ اور چاہئے کہ چھینکنے والا یھدیکم الله ، ویُصلح بالکم (اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت سے نوازیں، اور تمہارے حالات درست فرمائیں) کہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۳۳)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص چھینکے اور اللہ کی تعریف کرے، تو اسے یرحمك الله کہہ کر دعا دو، اور اگر وہ اللہ کی تعریف نہ کرے تو تم اس کو دعا مت دو'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۳۵)

حدیث (۳) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کی چھینک کا تین مرتبہ جواب دو، پس اگر وہ اس سے زیادہ چھینکے تو وہ زکام ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۴۳) یعنی نزلہ زکام کی وجہ سے کسی کو بار بار چھینک آئے تو ہر بار یرحمك الله کہنا ضروری نہیں۔

تشریح: چھینک آنے پر حمد کرنا دو وجہ سے مشروع کیا گیا ہے:

پہلی وجہ: چھینک آنا ایک قسم کی شفا ہے۔ اس کے ذریعہ ایسی رطوبت اور ایسے اَبخرے دماغ سے نکل جاتے ہیں کہ اگر وہ نہ نکلیں تو کسی تکلیف یا بیماری کا اندیشہ ہے۔ پس صحت کی حالت میں چھینک آنا اللہ کا فضل ہے، جس پر حمد ضروری ہے۔

دوسری وجہ: چھینک آنے پر حمد کرنا آدم علیہ السلام کی سنت ہے۔ صحیح ابن حبان میں مرفوع روایت ہے کہ جب آدم علیہ السلام میں روح پھونکی گئی، اور وہ روح ان کے سر میں پہنچی تو آپؑ کو چھینک آئی، پس آپؑ نے الحمد للہ رب العالمین کہا، جس کے جواب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یرحمك الله فرمایا (البدایہ والنہایہ ۱: ۸۶) اور چھینکنے پر حمد کرنا اسلامی شعار بھی ہے۔ حمد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چھینکنے والا ملت انبیاء کا تابعدار، اور ان کی سنتوں پر عمل کرنے کا پختہ عزم رکھتا ہے۔

اور تحمید کا جواب یرحمك الله (یعنی چھینک تمہارے لئے خیر وبرکت کا ذریعہ بنے) سے دینا بھی دو وجہ سے شروع کیا گیا ہے:
پہلی وجہ: یہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تحمید کے جواب میں یرحمك الله فرمایا ہے۔
دوسری وجہ: تحمید کرنے والے کی دین پر اور سنن انبیاء پر استقامت کا یہ حق ہے کہ اس کو یہ دعا دی جائے۔ چنانچہ اس کو حقوق اسلام میں شمار کیا گیا ہے (بخاری حدیث ۱۲۴۰، مشکوۃ حدیث ۴۷۳۲)

اور یرحمك الله کا جواب يهديكم الله، ويُصلح بالكم اس لئے مسنون ہے کہ وہ ''نیکی کا بدلہ نیکی'' کے باب سے ہے۔
فائدہ: نبی ﷺ کو جب چھینک آتی تو آپ اپنے ہاتھ یا کپڑے سے چہرۂ مبارک کو ڈھک لیتے تھے، اور پست آواز سے چھینکتے تھے (مشکوۃ حدیث ۴۷۳۸) اور اس کی وجہ وہ ہے جو جماہی کے وقت منہ بند کرنے کی ہے کہ اس وقت بھی کبھی پٹھے سکڑ جاتے ہیں، اور شکل بدنما ہو جاتی ہے۔

(۱۰) — جماہی ناپسند ہونے کی وجہ — حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ چھینک کو پسند فرماتے ہیں، اور جماہی کو ناپسند کرتے ہیں۔ پس جب تم میں سے کسی کو چھینک آئے، اور وہ اللہ کی حمد کرے، تو ہر اُس مسلمان پر جو اس تحمید کو سنے: لازم ہے کہ وہ اس کو یرحمك الله کہہ کر دعا دے۔ اور رہی جماہی تو وہ شیطان ہی کی طرف سے ہے۔ پس جب تم میں سے کسی کو جماہی آئے تو وہ اس کو حتی الامکان دفع کرے۔ کیونکہ جب تم میں سے کوئی جماہی لیتا ہے، تو شیطان اس سے ہنستا ہے'' اور ایک روایت میں ہے: ''جب جماہی لینے والا ہا کہتا ہے تو شیطان اس سے ہنستا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۳۲)
تشریح: جماہی اللہ تعالیٰ کو ناپسند اس لئے ہے کہ وہ طبیعت کے کسل اور غلبۂ مَلال سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ بری صفات ہیں۔ اور جب آدمی جماہی کے لئے منہ کھولتا ہے تو شیطان کو اپنی کارستانی کا موقع ملتا ہے، جیسا کہ آئندہ روایت میں آرہا ہے۔ اور منہ کھولنا اور ہاہا کرنا شیطان کو پسند ہے، کیونکہ یہ مکروہ ہیئت ہے، اس لئے وہ ہنستا ہے۔

(۱۱) — جماہی لیتے وقت منہ بند کر لینے کی حکمت — حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کو جماہی آئے تو چاہئے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لے، کیونکہ شیطان منہ میں داخل ہوتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۳۷)
تشریح: جماہی لیتے وقت منہ بند کر لینے کا حکم دو وجہ سے ہے: اول: مکھی مچھر منہ میں نہ چلا جائے۔ کیونکہ کبھی شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر جماہی لینے والے کے منہ میں داخل کر دیتا ہے۔ یہی شیطان کا منہ میں داخل ہونا ہے۔ دوم: کبھی جماہی لیتے وقت منہ کے پٹھے کھچ جاتے ہیں، رگیں سکڑ جاتی ہیں، اور نیچے والا جبڑا اتر جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ شارح نے بھی اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ میرا ایک طالب علم تھا۔ ایک دن جماہی لینے سے اس کی نیچے کی جباڑی اتر گئی، اور ڈاکٹر کے پاس لے جانا پڑا، اس لئے جماہی لیتے وقت ہاتھ سے منہ دبا لینا چاہئے تاکہ زیادہ نہ کھلے۔

[۷] عن حذيفة، قال: " ملعونٌ على لسان محمدٍ صلى الله عليه وسلم من قعد وَسْطَ الحَلْقة"
قيل: المراد منه الماجنُ الذى يُقيم نفسَه مقام السُّخرية، ليكون ضُحْكَةً، وهو عملٌ من

أعمال الشيطان؛ ويحتمل: أن يكون المعنى: أن يُدْبِرَ على طائفة، ويُقبل على ناحية، فيجد بعضُهم في نفسه من ذلك كراهيةً.

[۸] واختلط الرجالُ مع النساء في الطريق، فقال صلى الله عليه وسلم للنساء: " استأخِرْنَ، فإنه ليس لكنَّ أن تَحْقُقْنَ الطريق، عليكنَّ بحافات الطريق" فكانت المرأة تَلْصَقُ بالجدار؛ ونهى صلى الله عليه وسلم أن يمشي الرجل بين المرأتين.

أقول: وذلك: خوفًا من أن يمس الرجل امرأة ليست بمحرم، أو ينظر إليها.

[۹] قال صلى الله عليه وسلم: " إذا عَطَسَ أحدكم فليقل: الحمدلله! وليقل أخوه — أو صاحبه —: يرحمكَ الله! فليقل: يهديكم الله ويُصلح بالَكم" وفي رواية: " وإن لم يحمَدِ اللّهَ فلا تشمِّتوه" وقال صلى الله عليه وسلم: " شَمِّتْ أخاك ثلاثا، فما زاد فهو زكام"

أقول: إنما شُرِع الحمد عند العطسة لمعنيين: أحدهما: أنه من الشفاء، وخروج الأبخرة الغليظة من الدماغ، وثانيهما: أنه سنة آدم عليه السلام، وهو معرِّف لكونه تابعًا لسنن الأنبياء عليهم السلام، جامعَ العزيمة على ملتهم، ولذلك وجب التشميت، وكان من حقوق الإسلام؛ وإنما سُنَّ جوابُ التشميت: لأنه من مقابلة الإحسان بالإحسان.

[۱۰] وقال صلى الله عليه وسلم: " إنما التثاؤب من الشيطان، فإذا تثاءب أحدكم فليَرُدَّه ما استطاع، فإن أحدكم إذا تثاءبَ ضحك منه الشيطان"

أقول: وذلك: لأن التثاؤب ناشيء من كسل الطبيعة وغلبةِ الملال، والشيطانُ يجد في ضمن ذلك فرصةً، وفتحُ الفم وصوتُ هَاهْ يضحك منه الشيطانُ، لأنه من الهيئات المنكرة.

[۱۱] قال صلى الله عليه وسلم: " إذا تثاءب أحدكم، فليمسك بيده على فمه، فإن الشيطان يدخل"

أقول: الشيطان يُهَيِّجُ ذُبابا أو بَقَّةً، فَيُدخله في فمه؛ وربما تَشَنَّجَ أعصابُ وجهه، وقد رأينا ذلك.

ترجمہ: (۷) کہا گیا: اس سے مراد وہ ٹھٹھا مخول کرنے والا ہے جو اپنی ذات کو تمسخر کی جگہ میں کھڑا کرتا ہے، تاکہ وہ ہوے وہ شخص جس پر لوگ ہنسیں۔ اور وہ اعمالِ شیطانی میں سے ایک عمل ہے —— اور احتمال رکھتا ہے کہ ہوں معنی: وہ پیٹھ کرے کچھ آدمیوں کی طرف، اور منہ کرے کسی ایک جانب، پس ان کے بعض اپنے دل میں ناگواری پائیں —— (۸) اور وہ ممانعت اس اندیشہ سے ہے کہ آدمی ایسی عورت کو چھوئے جو محرم نہیں ہے، یا اس کی طرف دیکھے — (۹) چھینک کے وقت الحمدللہ کہنا دو معنی ہی کی وجہ سے مشروع کیا گیا ہے: ایک: یہ کہ چھینک کا آنا ایک قسم کی شفاء ہے، اور دماغ سے غلیظ ابخرے نکلتے ہیں۔ دوسری وجہ: یہ ہے کہ وہ آدم علیہ السلام کی سنت ہے، اور وہ پہچانوانے والا ہے اس کے ہونے کو انبیاء

علیہم السلام کی سنت کا تابعدار، اوران کی ملت پر پختہ ارادہ جمع کرنے والا — اوراسی وجہ سے اس کو یرحمك اللّٰہ کہہ کر دعا دینا ضروری ہے، اوروہ دعا حقوق اسلام میں سے ہے — اوریرحمك اللّٰہ کا جواب مسنون ہے اس وجہ سے کہ وہ ''نیکی کا بدلہ نیکی'' کے قبیل سے ہے — (۱۰) اوروہ ناپسندیدگی اس وجہ سے ہے کہ جمائی طبیعت کی سستی اورکلفت کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے، اورشیطان اس ضمن میں (اپنی کارستانی کے لئے) موقعہ پاتا ہے۔ اورمنہ کا کھولنا اور ''ہا'' کی آواز سے شیطان ہنستا ہے، اس لئے کہ وہ مکروہ ہیئتوں میں سے ہے — (۱۱) شیطان مکھی یا پسّو کو برانگیختہ کرتا ہے، پس وہ اس کو اس کے منہ میں داخل کرتا ہے۔ اورکبھی اس کے منہ کے پٹھے سکڑ جاتے ہیں۔ اورہم نے اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

لغات: الماجِن (صفت) جمع مُجّان: مخول کرنے والا، بےحیا ہونے والا...... السُخرِیَّة: ٹھٹھا...... الضُحْکَة: جس آدمی پر لوگ ہنسیں...... البق: کھٹل، پسّو۔

☆ ☆ ☆

(۱۲) — **رات میں تنِ تنہا سفر ممنوع ہونے کی وجہ — حدیث** — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر لوگ اس مضرت کو جان لیں جو تنہائی میں ہے، جیسا کہ میں جانتا ہوں، تو کوئی مسافر رات میں تنہا سفر نہ کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۹۳ کتاب الجہاد، باب آداب السفر)

تشریح: اس حدیث میں اس اصول کی طرف اشارہ ہے کہ تہوّر یعنی لاپروائی سے کسی کام میں گھسنا، اور بےضرورت خطرات میں کودنا شرعاً پسندیدہ نہیں۔ یعنی کچھ لوگ بہادر بنتے ہیں، وہ خواہ مخواہ ہلاکتوں میں گھستے ہیں: نبی ﷺ نے اس مزاج کو ناپسند کیا ہے۔ البتہ ضرورت کے وقت رات میں تنہا سفر کرنا جائز ہے۔ نبی ﷺ نے غزوۂ احزاب میں جس رات سخت سرد ہوا چلی تھی، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو دشمن کی نقل وحرکت کی خبر لانے کیلئے تنہا بھیجا تھا (مشکوۃ حدیث ۶۱۰۱)

فائدہ: یہ حکمت جب ہے کہ حکم عام ہو۔ اوراگر ممانعت زمانۂ جنگ یا زمانۂ فساد کے ساتھ خاص ہو تو پھر حکمت ظاہر ہے۔

(۱۳) — **سفر میں کتا اور گھنٹی ساتھ رکھنے کی ممانعت کی وجہ — حدیث** (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرشتے ایسے قافلہ کے ساتھ نہیں چلتے جس میں کتا یا گھنٹی ہو'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۹۴)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گھنٹی شیطان کی بانسری ہے!'' (مشکوۃ حدیث ۳۸۹۵)

تشریح: سخت کراری آواز شیطان اوراس کی جماعت کے مزاج کے موافق ہے، ملائکہ اس کو ناپسند کرتے ہیں، اوریہ بات ان کے مزاج کی دَین ہے یعنی شیاطین کا مزاج ہی ایسا واقع ہوا ہے کہ ان کو ایسی آواز پسند ہے، اورملائکہ کا مزاج اس کے برخلاف ہے (اوریہی حال کتے وغیرہ ملعون جانوروں کے تعلق سے ہے۔ شیاطین کو وہ جانور پیارے ہیں، اورملائکہ کو ان سے نفرت ہے) چنانچہ جس قافلہ میں کتا یا جانور کے گلوں میں گھنٹی ہوتی ہے: فرشتے اس قافلہ کے ساتھ نہیں چلتے۔

فائدہ: یہ حکمت بھی اس وقت ہے جب حکم عام ہو، اوراگر مجاہدین کے قافلہ کے ساتھ خاص ہو، تو پھر حکمت یہ ہے کہ

کتے اور گھنٹی کی وجہ سے دشمن کو فوج کی نقل وحرکت کا پتہ چل جاتا ہے۔ کتا کبھی بے وقت بھونکتا ہے، اور جب قافلہ چلتا ہے تو جانوروں کے گلوں کی گھنٹیاں بجتی ہیں، اور یہ بات فوجی مصلحت کے خلاف ہے، اس لئے اس کی ممانعت کی۔

⑭— سفر کے دو حکم جن کی حکمتیں واضح ہیں — حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم خوش حالی (سبز گھاس پتوں کی کثرت) کے زمانہ میں سفر کرو، تو اونٹوں کو زمین سے ان کا حق دو یعنی ان کو چرنے چگنے کا موقعہ دو، تیز تیز سفر نہ کرو۔ اور جب تم خشک سالی کے زمانہ میں سفر کرو، تو اونٹوں پر جلدی سفر طے کرو (تاکہ منزل پر پہنچ کر ان کو چارہ ملے) اور جب تم رات کے آخر میں آرام کیلئے اترو تو راستہ سے بچو یعنی اس سے ہٹ کر قیام کرو، کیونکہ راستے رات میں چوپایوں کی گذرگاہیں اور حشرات کا ٹھکانہ ہیں یعنی جنگلی جانوران راہوں پر گذرتے ہیں، اور سانپ وغیرہ ان پر آپڑتے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۸۹۷)

⑮— سفر کو بے ضرورت طول نہیں دینا چاہئے — حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے یعنی تکلیف دہ ہے، وہ تم کو سونے، کھانے اور پینے سے محروم کر دیتا ہے۔ پس جب آدمی سفر سے اپنی ضرورت پوری کر لے تو جلد اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۸۹۹)

تشریح: اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ غیر اہم کاموں کی وجہ سے سفر کو طول نہیں دینا چاہئے، جب سفر کی اہم ضرورت پوری ہو جائے تو وطن لوٹ آنا چاہئے۔

⑯— لمبے سفر سے رات میں بے اطلاع گھر پہنچنے کی ممانعت کی وجہ — حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص لمبے عرصہ تک گھر سے غائب رہے، تو وہ رات کے وقت اپنے گھر والوں کے پاس نہ پہنچے'' (مشکوٰۃ حدیث ۳۹۰۳)

تشریح: جب شوہر سفر میں ہوتا ہے تو عورت جسم کی صفائی اور زینت کا اہتمام نہیں کرتی، پس اگر عرصۂ دراز کے بعد شوہر بے اطلاع رات میں گھر پہنچے گا اور بیوی کو میلا کچیلا دیکھے گا، اور دیکھے گا کہ اس نے اپنا جسم بھی بالوں سے صاف نہیں کیا، تو ممکن ہے اس کے دل میں نفرت بیٹھ جائے، اور بیوی کی طرف سے دل میں تکدر پیدا ہو جائے، اس لئے شوہر کو چاہئے کہ اطلاع کر کے یا ایسے وقت گھر پہنچے کہ عورت کے لئے خود کو سنوارنے کا موقع رہے۔

[۱۲] قال صلى الله عليه وسلم: " لو يعلم الناس مافي الوَحْدَة ما أعلم، ما سار راكبٌ بليل وحدَه"
أقول: أراد عليه السلام كراهيةَ التهوُّر، والاقتحام في المهالك من غير ضرورة؛ أما بعثُ الزبير رضي الله عنه وحده طليعةً فلمكان الضرورة.

[۱۳] قال صلى الله عليه وسلم: " لاتَصْحَبُ الملائكةُ رُفقةً فيها كلبٌ ولا جَرَس" وقال صلى الله عليه وسلم: " الجَرَس مزاميرُ الشيطان"
أقول: الصوتُ الحديدُ الشديدُ يوافقُ الشيطانَ وحزبَه، ويكرهه الملائكة، لمعنى يُعطيه مزاجُهم.

[۱۴] وقال صلى الله عليه وسلم: " إذا سافرتم في الخِصْب فأعطوا الإبل حَقَّها من الأرض، وإذا سافرتم في السَّنَةِ فأَسْرِعوا عليها السيرَ، وإذا عَرَّستم بالليل فاجتنبوا الطريق، فإنها طرق الدواب ومَأْوَى الهوام بالليل"

أقول: هذا كلُّه ظاهر.

[۱۵] قال صلى الله عليه وسلم: " السفر قطعة من العذاب، يمنع أحدكم نومه وطعامه وشرابه، فإذا قضى نُهْمَتَه من وجهه فَلْيَعْجَلْ إلى أهله"

أقول: يريد عليه السلام كراهيةَ أن يتبع محقَّرات الأمور، فيطيل مكثَه لأجلها.

[۱۶] وقال صلى الله عليه وسلم: " إذا أطال أحدكم الغَيْبة فلا يَطْرِقْ أهله ليلاً"

أقول: كثيرًا مَّا يتنفَّر الإنسان نفرةً طبيعيةً من أجل التشعث ونحوه، فيكون سببا لتنغيص حالهم.

ترجمہ: (۱۲) نبی ﷺ نے (اس ارشاد سے) ارادہ فرمایا ہے لاپروائی سے کسی کام میں گھسنے کی ناپسندیدگی کا، اور بے ضرورت خطرات میں زبردستی گھسنے کی کراہیت کا۔ رہا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو تنہا طلیعہ کے طور پر بھیجنا تو وہ ضرورت کی وجہ سے تھا — (۱۳) سخت کراری آواز شیطان اور اس کی پارٹی کے مزاج کے موافق ہے، اور فرشتے اس کو ناپسند کرتے ہیں، ایک ایسی بات کی وجہ سے جوان کے مزاج کی دَین ہوتی ہے — (۱۵) نبی ﷺ ارادہ کررہے ہیں اس بات کی ناپسندیدگی کا کہ آدمی پیروی کرے معمولی باتوں کی، پس ان کی وجہ سے اپنا ٹھہرنا لمبا کرے — (۱۶) بارہا انسان فطری طور پر نفرت کرتا ہے پراگندگی اور اس کے مانند کی وجہ سے، پس وہ نفرت ان کے احوال کے تکدر کا باعث ہوجاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

۳- آدابِ کلام

① — شہنشاہ لقب اور ابوالحکم کنیت کی ممانعت — حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے برا نام: وہ شخص ہے جو مَـلِكُ الأمـلاك (شہنشاہ) کہلاتا ہے" (رواہ البخاری) اور مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں!" (مشکوۃ حدیث ۴۷۵۵)

حدیث (۲) — ہانی بن یزید مَذْحِجی رضی اللہ عنہ اپنی قوم کے وفد میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے دیکھا کہ وفد کے لوگ ان کو أبـو الـحَكَم سے پکارتے ہیں۔ آپؐ نے ان کو بلایا، اور فرمایا: "حَکَم (حکم جاری کرنے والے) اللہ تعالیٰ ہی ہیں اور حکم انہی کی طرف لوٹتا ہے یعنی حکم دینے کا حق اللہ ہی کا ہے، پھر تمہاری کنیت ابوالحکم کیوں ہے؟" انھوں نے کہا: میری قوم میں جب کوئی اختلاف ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں، اور میں ان کے درمیان فیصلہ

کرتا ہوں، جس پر دونوں فریق راضی ہوجاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، بتاؤ تمہاری اولاد کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: شُریح، مُسلم اور عبداللہ۔ آپؐ نے پوچھا: ''ان میں بڑا کون ہے؟'' انھوں نے کہا: شُریح۔ آپؐ نے فرمایا: ''پھر تمہاری کنیت ابوشریح ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۶۶)

تشریح: شہنشاہ لقب اور ابوالحکم کنیت سے اس لئے روکا ہے کہ یہ تعظیم میں بے حد مبالغہ ہے، جس کے ڈانڈے شرک سے ملے ہوئے ہیں۔

(۴) — ناموں کی دوروایتوں میں رفع تعارض — پہلی روایت: حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو ہرگز اپنے غلام کا نام یَسَار (آسانی، مالداری) رَبَاح (نفع، فائدہ) نَجِیح (فتح مندی) اور أَفْلَح (کامیابی) مت رکھ، کیونکہ اگر تم پوچھو گے کہ کیا وہ وہاں ہے؟ پس وہ نہیں ہوگا تو جواب دینے والا کہے گا: نہیں ہے'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۴۷۵۳)

دوسری روایت: حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارادہ فرمایا تھا کہ یَعْلٰی (بلند ہوا) بَرَکَة (نیک بختی، نمو، برکت) أفلح، یَسَار، نافع (نفع بخش) اور اس جیسے ناموں سے منع کریں، پھر میں نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ نے خاموشی اختیار کی، پھر آپؐ کی وفات ہوئی، اور آپؐ نے ان سے نہیں روکا'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۴۷۵۴)

تشریح: پہلی حدیث میں جن ناموں کی ممانعت ہے اس کی وجہ خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی ہے کہ ان ناموں میں بدفالی کا پہلو ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اگر ان کے مسمّی کو پکارا جائے گا، اور وہ موجود نہیں ہوگا تو جواب دیا جائے گا کہ نہیں ہے۔ مثلاً: کسی کا نام أفلح (کامیابی) ہے، اور کسی نے آواز دی کہ گھر میں کامیابی ہے، اور وہ نہیں تھا تو جواب دیا جائے گا کہ نہیں ہے۔ یعنی گھر میں کامیابی نہیں۔ توبہ! — پس یہ اقوال میں اوپری ہیئت ہے۔ اور جس طرح افعال میں اوپری ہیئت ناپسندیدہ ہے، مثلاً أجدَع (ناک کان کٹا) برا ہے، حدیث میں اس کو شیطان کہا گیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۶۷) اسی طرح اقوال میں بھی بری ہیئت — گو وہ مآلاً ہو — ناپسندیدہ ہے۔

رفع تعارض: اور ان حدیثوں میں جو تعارض ہے وہ دو طرح سے رفع کیا جاسکتا ہے:

ایک: اس طرح کہ پہلی حدیث میں نہی شرعی نہیں، بلکہ ارشادی ہے۔ یعنی شرعاً یہ نام ناجائز نہیں، البتہ بہتر یہ ہے کہ یہ نام نہ رکھے جائیں یہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ایک مشورہ دیا ہے، اور ان کو بھلائی کی بات بتائی ہے۔

دوم: اس طرح کہ پہلی روایت میں جو ممانعت ہے وہ اجتہادی ہے یعنی راوی نے ممانعت کی علامات دیکھیں، اور نہی کہہ دیا۔ اور دوسری روایت میں راوی نے پورے تیقظ سے بیان ہے کہ آپؐ نے منع کرنے کا ارادہ کیا تھا، پھر خاموشی اختیار فرمالی، اور تاحیات منع نہیں کیا۔ اور اصولِ حدیث کا قاعدہ ہے کہ جس راوی نے یاد رکھا ہو، اس کی بات قبول کی جائے گی، اور جس راوی نے بات پوری طرح ضبط نہ کی ہو، اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی۔

فائدہ: شاہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بہتر یہ ہے کہ ان دو توجیہات میں سے کوئی ایک توجیہ کی جائے، اور ان ناموں کو ناجائز نہ قرار دیا جائے، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کثرت سے یہ نام رکھتے تھے، اگر ناجائز ہوتے تو کیسے رکھتے؟!

ومنها: آدابُ الكلام

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "أَخْنَى الأسماء يومَ القيامة عند الله: رجلٌ يسمى مَلِكَ الأملاك" وقال: "لامَلِكَ إلا الله" وقال صلى الله عليه وسلم في التَّكْنِيَةِ بأبي الحكم: "إن الله هو الحَكَم، وإليه الحُكْم"

أقول: إنما نهى عن ذلك: لأنه إفراط في التعظيم، يُتَاخِمُ الشركَ.

[۲] قال صلى الله عليه وسلم: "لاتُسَمِّيَنَّ غلامَك: يسارًا، ولارَباحا، ولانجيحًا، ولا أفلحَ؛ فإنك تقول: أَثَمَّ هو؟ فلايكون، فيقول: لا" وقال جابر رضي الله عنه: أراد النبي صلى الله عليه وسلم أن يَنهى أن يسمى بيعلى، وببركة، وبأفلح، وبيسار، وبنافع، وبنحو ذلك، ثم رأيته سكت بعدُ عنها، ثم قُبض ولم ينه عن ذلك.

أقول: سبب كراهية التسمية بهذه الأسماء: أنها تُفضي إلى هيئة منكرة، هي في الأقوال بمنزلة الأجدع ونحوِه في الأفعال، وهو قوله عليه السلام: "الأجدع شيطان!"

ووجهُ الجمع بين الحديثين: أنه لم يَعْزِم في النهي ولم يؤكِّد، ولكنه نهى نَهْيَ إرشادٍ، بمنزلة المَشُوْرَةِ؛ أو ظهرت مخايلُ النهي، فقال الراوي: نهى، اجتهادًا منه؛ ومن حَفِظ حجةٌ على من لم يحفظ؛ وأرى أن هذا الوجه أوفق لفعل الصحابة رضي الله عنهم، فإنهم لم يزالوا يُسَمُّوْنَ بهذه الأسماء.

ترجمہ: (۱) اس سے اسی لئے روکا ہے کہ وہ تعظیم میں ایسا حد سے بڑھنا ہے جو شرک سے مل رہا ہے (تاخَمَ مُلْكِي مُلْكَك: سرحدیں متصل ہونا) —— (۲) ان ناموں سے نام رکھنے کی کراہیت کا سبب: یہ ہے کہ وہ نام پہنچاتے ہیں ایسی اوپری ہیئت تک جو اقوال میں بمنزلہ اَجدع اور اس کے مانند کے ہیں افعال میں، اور وہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ "اجدع شیطان ہے" — اور ان دو حدیثوں کے درمیان جمع کی صورت یہ ہے کہ آپؐ نے ممانعت میں پختہ ارادہ نہیں کیا، اور نہ مؤکد ممانعت فرمائی، بلکہ آپؐ نے منع کیا ارشاد (بھلائی کی راہ دکھانے) کے طور پر منع کرنا، بمنزلہ مشورہ کے —— یا ممانعت کی علامات ظاہر ہوئیں تو راوی نے کہہ دیا: "منع کیا" اپنے اجتہاد کے طور پر —— اور جس نے یاد رکھا وہ حجت ہے اس پر جس نے یاد نہیں رکھا —— اور میں دیکھتا ہوں کہ یہ صورت زیادہ موافق ہے صحابہ رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے، کیونکہ وہ برابر نام رکھتے رہے ہیں ان ناموں سے۔

☆ ☆ ☆

(۳)۔۔۔ ابوالقاسم کنیت کی ممانعت ۔۔۔ حدیث(۱)۔۔۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ بازار میں تھے۔ کسی نے پکارا: یا اباالقاسم۔ نبی ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے، اس نے (ایک آدمی کی طرف اشارہ کرکے) کہا: میں اس کو پکار رہا ہوں۔ اس وقت آپؐ نے فرمایا: ''میرے نام سے نام رکھو، اور میری کنیت سے کنیت مت رکھو'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۷۵۰)

حدیث (۲)۔۔۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار میں ایک شخص کے یہاں لڑکا پیدا ہوا، اس نے اس کا نام محمد رکھا۔ اس کی قوم نے کہا: ہم تجھے رسول اللہ ﷺ کا نام نہیں رکھنے دیں گے۔ وہ بچہ اٹھا کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا، اور ماجرا عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''میرا نام رکھو، اور میری کنیت مت رکھو، اس لئے کہ میں قاسم (تقسیم کرنے والا) ہوں، تمہارے درمیان (علوم ومعارف اور مال ومنال) تقسیم کرتا ہوں'' (مسلم شریف ۱۴: ۱۱۴ مصری)

تشریح: ابوالقاسم کنیت رکھنے کی ممانعت چار وجہ سے تھی:

پہلی وجہ: اگر کوئی شخص نبی ﷺ کے نام سے نام رکھے گا تو احکام میں اشتباہ پیدا ہوگا۔ لوگ احکام کی نسبت میں دھوکہ دہی سے کام لیں گے۔ کہیں گے: ''ابوالقاسم نے کہا'' مخاطبین سمجھیں گے کہ نبی ﷺ کا حکم ہے، جبکہ مراد کوئی اور شخص ہوگا۔

دوسری وجہ: جھگڑے میں کبھی نام لے کر گالی دی جاتی ہے، اور کبھی لقب کے ذریعہ برائی کی جاتی ہے۔ پس اگر کسی نے نبی ﷺ کا نام رکھا ہے، اور وہ اس نام سے برا کہا جائے گا، تو بھونڈی صورت پیدا ہوگی (مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بھتیجے محمد بن زید بن خطاب کو کسی نے نام لے کر گالی دی۔ آپؓ نے اس کو بلایا، اور کہا: ''میرا خیال ہے کہ تیرے نام کی آڑ میں رسول اللہ ﷺ کو برا کہا جا رہا ہے، پس جب تک میں زندہ ہوں تجھے محمد کے نام سے نہیں پکارا جائے گا'' پھر آپؓ نے اس کا نام بدل کر عبدالرحمٰن کر دیا۔ نووی شرح مسلم ۱۴: ۱۱۳ مصری)

تیسری وجہ: پہلی روایت کے شانِ ورود میں آئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ کنیت رکھنا نبی ﷺ کے لئے الجھن کا باعث ہوسکتا تھا۔ کوئی کسی کو پکارے گا، اور آپؐ یہ سمجھ کر متوجہ ہوں گے کہ مجھے پکار رہا ہے۔ پھر وہ معذرت کرے گا۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ لوگ یہ کنیت نہ رکھیں (یہ اضافہ ہے)

چوتھی وجہ: دوسری روایت میں آئی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی کنیت ابوالقاسم دو وجہ سے تھی: ایک: اس وجہ سے کہ آپؐ کے بڑے صاحبزادے قاسم تھے، اس صورت میں ابو کے معنی باپ کے ہوں گے۔ اس حیثیت سے کوئی اپنی کنیت ابوالقاسم رکھتا ہے تو کچھ قباحت نہیں۔ دوم: قاسم کے معنی تقسیم کرنے والا ہیں۔ چونکہ آپؐ علوم ومعارف اور مال ومنال لوگوں میں تقسیم فرماتے تھے اس لئے آپؐ ابوالقاسم تھے۔ اس صورت میں ابو کے معنی صاحب (والا) ہونگے، جیسے ابوالحکم (حکم جاری کرنے والا) پس اگر کوئی دوسرا شخص اپنی کنیت ابوالقاسم رکھے گا، تو علوم ومعارف اور مال ومنال تقسیم نہ کرنے کے باوجود وہ آپؐ کا ہمسر ہو جائے گا، اس لئے یہ کنیت رکھنے کی ممانعت کی۔

سوال: ممانعت کی مذکورہ بالا تین وجوہ عام ہیں۔ نام نامی محمد میں بھی پائی جاتی ہیں، کنیت کے ساتھ خاص نہیں، پھر صرف کنیت کی ممانعت کیوں کی، محمد نام رکھنے کی ممانعت کیوں نہیں کی؟

جواب: کنیت میں مذکورہ خرابیاں نام میں خرابیوں سے دو وجہ سے زیادہ پائی جاتی ہیں:

پہلی وجہ: قرآن کریم میں نبی ﷺ کو نام سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿لَاتَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ ترجمہ: تم لوگ رسول کے بلانے کو ایسا مت گردانو، جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو (النور ۶۳) اس آیت کی تفسیر میں فوائد عثمانی میں ہے: ''مخاطبات میں حضور کے ادب و عظمت کا پورا خیال رکھنا چاہئے۔ عام لوگوں کی طرح ''یا محمد'' وغیرہ کہہ کر خطاب نہ کیا جائے، بلکہ ''یا نبی اللہ'' اور ''یا رسول اللہ'' جیسے تعظیمی القاب سے پکارنا چاہئے'' اور عربوں کی عادت بھی نام سے پکارنے کی نہیں تھی۔ چنانچہ صحابہ ''یا رسول اللہ'' کہہ کر خطاب کرتے تھے، اور غیر مسلم رعایا ''یا ابا القاسم'' کہہ کر خطاب کرتی تھی۔ اس لئے نام میں مذکورہ قباحتیں برائے نام ہیں، اور کنیت میں زیادہ ہیں، اس لئے اسکی ممانعت کی۔

دوسری وجہ: عربوں کے نزدیک نام میں تعظیم کا پہلو تھا نہ تحقیر کا۔ اور کنیت میں یہ دونوں باتیں تھیں۔ جیسے ابوالحکم (حکم جاری کرنے والا) بطور تعظیم کہا کرتے تھے۔ اور ابوجہل (براناداں) بطور تحقیر کہا کرتے تھے۔ پس چونکہ محمد نام رکھنے میں، اور اس سے پکارنے میں تحقیر کا پہلو نہیں تھا، اس لئے اس کی اجازت دی۔ اور ابوالقاسم کنیت رکھ کر بطور تحقیر پکارنے میں خرابی تھی اس لئے اس کی ممانعت کی۔

فائدہ: ابوالقاسم کنیت رکھنے کی ممانعت آپؐ کے زمانہ کے ساتھ خاص تھی۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اجازت دی کہ وہ آپؐ کے بعد اپنے لڑکے کا نام محمد اور کنیت ابوالقاسم رکھیں (مشکوۃ حدیث ۴۷۷۲) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ التباس اور تدلیس آپؐ کے زمانہ ہی میں ہوسکتی تھی، آپؐ کے بعد اس کا احتمال نہیں ہے، اس لئے اجازت دی۔

[۳] قال صلى الله عليه وسلم: " سَمُّوا باسمي، ولاتَكْتَنُوْا بِكُنْيَتي، فإني إنما جُعلتُ قاسما أقسم بينكم"

أقول: لو كان أحدٌ يُسمَّى باسم النبي صلى الله عليه وسلم لكان مظنةً أن تشتبه الأحكامُ، ويُدَلَّسَ في نسبتها ورفعها، فإذا قيل: قال أبو القاسم، ظُنَّ أن الآمر هو النبي صلى الله عليه وسلم، وربما كان المراد غيرَه.

وأيضًا: ربما يُسَبُّ الرجلُ باسمه، ويُذَمُّ بلقبه في المُلاَحَاةِ، فإن كان مسمىً باسم النبي، كان في ذلك هيئة منكرة.

ثم هذا المعنى أكثر تحققا في الكنية منه في العَلَم لوجهين:

أحدهما: أن الناس كانوا ممنوعين شرعًا، وممتنعين دَيْدنًا: من أن يُنادوا النبيَّ صلى الله

علیه وسلم باسمه، وكان المسلمون ينادون: يارسولَ الله! وأهلُ الذمة يقولون: يا أبا القاسم!
وثانيهما: أن العرب كانوا لايقصدون بالاسم التشريفَ ولاالتحقير، وأما الكُنى: فكانوا يقصدون بها أحد الأمرين، كأبي الحكم، وأبي الجهل، ونحو ذلك.
وإنما كُنِّيَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم بأبي القاسم: لأنه قاسمٌ، فكان تكنية غيرِه بها كالتسوية معه، وإنما رخص النبيُّ صلى الله عليه وسلم لعليّ: أن يُسَمِّيَ ولَده باسمه بعدَه، ويُكَنِّيه بكُنيته: لارتفاع الالتباس والتدليس بانقراض القرن.

ترجمہ: (۳) اگر کوئی شخص نبی ﷺ کے نام سے نام رکھے گا تو وہ اس بات کی احتمالی جگہ ہوگی کہ احکام مشتبہ ہوں، اور احکام کی نسبت اور ان کے رفع (آپ کی طرف اٹھانے یعنی منسوب کرنے) میں تدلیس (دھوکہ دہی) کی جائے۔ پس جب کہا جائے: ''ابوالقاسم نے کہا'' تو گمان کیا جائے گا کہ حکم دینے والے نبی ﷺ ہیں، درانحالیکہ کبھی مراد آپؐ کے علاوہ ہوتا ہے ——— اور نیز: کبھی آدمی کو اس کا نام لے کر گالی دی جاتی ہے، اور اس کے لقب کے ذریعہ برائی کی جاتی ہے، باہمی جھگڑے میں، پس اگر وہ نبی ﷺ کے نام کے ساتھ نام رکھا ہوا ہوگا تو اس میں بھونڈی صورت ہوگی ——— پھر یہ معنی پائے جانے کے اعتبار سے زیادہ ہیں کنیت میں اس سے نام میں: دو وجہ سے: ایک: یہ ہے کہ لوگ روکے ہوئے تھے شرعاً، اور رکے ہوئے تھے عادت کے طور پر: اس سے کہ وہ نبی ﷺ کو آپؐ کے نام سے پکاریں، اور مسلمان پکارا کرتے تھے: ''یارسول اللہ'' اور اہلِ ذمہ کہا کرتے تھے: ''یا ابا القاسم'' ——— دوسری وجہ: یہ ہے کہ عرب ارادہ نہیں کیا کرتے تھے نام سے تعظیم کا، اور نہ تحقیر کا۔ اور رہی کنیتیں: تو وہ ان کے ذریعہ دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا ارادہ کیا کرتے تھے، جیسے ابوالحکم اور ابوجہل اور ان کے مانند ——— اور نبی ﷺ ابوالقاسم کنیت رکھے گئے ہیں اس لئے کہ آپؐ بانٹنے والے تھے، پس آپ کے علاوہ کی یہ کنیت رکھنا آپؐ کے ساتھ برابری کرنے کے مانند تھا (یہ ممانعت کی چوتھی وجہ ہے) ———
(فائدہ) اور نبی ﷺ نے علیؓ کو اجازت دی کہ وہ اپنے لڑکے کا نام رکھیں آپؐ کے نام سے، اور اس کو آپؐ کی کنیت سے موسوم کریں، التباس اور تدلیس ختم ہوجانے کی وجہ سے، زمانہ ختم ہوجانے کی وجہ سے۔

☆ ☆ ☆

(۴) ——— غلام کو بندہ اور آقا کو ربّ کہنے کی ممانعت ——— حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی ہرگز نہ کہے: میرا بندہ اور میری بندی، تم سب اللہ کے بندے ہو، اور تمہاری سب عورتیں (خواہ آزاد ہوں یا باندی) اللہ کی بندیاں ہیں۔ بلکہ چاہئے کہ کہے: میرا غلام اور میری باندی، اور میرا خادم اور میری خادمہ۔ اور غلام بھی نہ کہے: میرا ربّ (پروردگار) بلکہ چاہئے کہ کہے: میرا آقا'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۶۰)

تشریح: آقا اور غلام باندیوں کے درمیان کے تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے مذکورہ الفاظ کی ممانعت، اور دوسرے

مناسب الفاظ کا انتخاب دووجہ سے کیا ہے:

پہلی وجہ: گفتگو میں بڑائی جتانا اور دوسروں کو حقیر جاننا اپنے جلو میں دوخرابیاں رکھتا ہے۔ ایک: خود پسندی وغرور، دوسری: غیر کی دل شکنی۔ جیسے نوکر کو خوشامدی یا چپڑ قناتی کہنا خودستائی کی بات ہے، اور اس سے نوکر کی دل شکنی بھی ہوتی ہے اسی طرح آقا کا غلام باندی کو بندہ بندی کہنا، اور غلام سے خود کو رب (پروردگار) کہلوانا: بڑائی جتانا اور ماتحت کو حقیر جاننا ہے، جو بری صفات ہیں، نیز ان میں ان کی دل شکنی بھی ہے اس لئے اس کی ممانعت کی، اور دوسرے مناسب الفاظ استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی۔

دوسری وجہ: خالق ومخلوق کے درمیان جو نسبت وتعلق ہے: اس کو آسمانی کتابوں میں عبد (بندہ) اور رب (پروردگار) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے، پس آقا اور غلام کے درمیان کے تعلق کے لئے بھی یہی الفاظ استعمال کرنا بے ادبی اور بے تمیزی ہے، چنانچہ ان کی ممانعت کی، اور شائستہ الفاظ تلقین کئے۔

(۵)۔ انگور کو کرم اور زمانہ کو برا کہنے کی ممانعت۔ حدیث (۱)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم (انگور کو) کرم مت کہو، بلکہ عنب اور حَبَلہ کہو۔ اور تم ''ہائے برا زمانہ'' مت کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۶۳)

حدیث (۲)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آدم زاد مجھے ستاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، جبکہ میں ہی زمانہ ہوں، میرے ہاتھ میں معاملہ ہے، میں شب وروز کو پلٹتا ہوں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۲ کتاب الایمان)

تشریح: (۱) انگور کو کرم (طیّب وعمدہ) کہنے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جب قرآن کریم نے خمر کو حرام قرار دیا، اور رجس (گندگی) کہہ کر اس کی شان گھٹائی، تو ضروری ہے کہ ہر اس بات کی جو اس کی شان بڑھائے، اور اس کی خوبی کا ذہن بنائے: ممانعت کردی جائے۔ اور انگور چونکہ خمر کا مادہ اور اس کی اصل ہے، خمر کے حقیقی معنی ''انگوری شراب'' ہی کے ہیں، اور عرب اس کو رواج عام دینے کے لئے ''کرم کی بیٹی'' اور انگور کو ''کرم'' کہا کرتے تھے، اس لئے اس لفظ کے استعمال کی ممانعت کی، تاکہ اس سے ذہن متاثر نہ ہوں، اور اس کا رواج نہ پھیلے۔

(۲) اور زمانہ کی برائی کرنے کی ممانعت دووجہ سے کی ہے:

پہلی وجہ: زمانۂ جاہلیت کے لوگ اچھے برے واقعات کو زمانہ کی طرف منسوب کرتے تھے، جس سے زمانہ کی تاثیر کا خیال پیدا ہوتا تھا، اور شرک کا دروازہ کھلتا تھا۔ اس لئے شرک کے سد باب کے لئے زمانہ کی طرف اچھے برے واقعات کی نسبت کی ممانعت کی۔ اور ہدایت دی: ﴿مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ، وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ﴾ ترجمہ: اے انسان! تجھ کو جو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ کی جانب سے ہے، اور جو کوئی بدحالی پیش آتی ہے، وہ تیرے ہی سبب سے ہے (النساء آیت ۷۹)

دوسری وجہ: عرب کبھی زمانہ بول کر مقلّب زمانہ مراد لیتے تھے، جبکہ زمانہ کو پلٹنے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔ پس برے واقعات کو

زمانہ کی طرف منسوب کرنا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہے۔ اس طرح لوگ زمانہ کے پردے میں اللہ تعالیٰ سے خفگی کا اظہار کرتے تھے، گوعنوان دوسرا ہوتا تھا۔ اس لئے زمانہ کو برا کہنے کی ممانعت کی تاکہ لوگ بالواسطہ اللہ تعالیٰ کو برا نہ کہیں۔

[٤] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "لايقولنّ أحدكم: عبدى وأمتى، كلكم عبيدُ الله، وكل نسائكم إماءُ الله، ولكن لِيَقل: غلامى وجاريتى، وفتاىَ وفتاتى؛ ولايقل العبد: ربى، ولكن ليقل: سيدى"

أقول: التطاول فى الكلام والازدراء: منشؤُه الإعجاب والكبر، وفيه كسر قلوب الناس؛ وأيضًا: فلما عُبِّرَ فى الكتب الإلٰهية عن النسبة التى هى للخلق إلى الخالق: بالعبديَّة والرَّبيَّة: كان إطلاقُها فيما بينهم سوءَ أدب.

[٥] قال صلى الله عليه وسلم: "لاتقولوا الكَرْمَ ولكن قولوا العِنَبَ والحَبَلَة، ولاتقولوا: ياخَيْبَةَ الدهر! فإن الله هو الدهر" وقال الله تعالىٰ: "يؤذينى ابنُ آدم، يَسُبُّ الدهْرَ، وأنا الدهر، بيدى الأمر، أقلِّب الليلَ والنهار"

أقول: لما نهى الله تعالىٰ عن الخمر، ووضع أمْرَها، اقتضى ذلك: أن يُمنع عن كل مايُنَوِّهُ أمرَها، ويُخَيِّلُ حسنَها إليهم، والعنبُ مادَّة الخمر وأصلها، وكان العرب كثيرًا مَّا يسمونها: بنتَ كَرْمٍ، ويُرَوِّجونها بذلك.

وكان أهل الجاهلية ينسبون الوقائع إلى الدهر، وهذا نوع من الشرك، وأيضًا: ربما يريدون بالدهر مقلِّبَه، فالسُّخطُ راجعٌ إلى الله، وإن أخطأوا فى العنوان.

ترجمہ: (۴) گفتگو میں فخر کرنا، اور حقیر سمجھنا: اس کے پیدا ہونے کی جگہ خود پسندی اور گھمنڈ ہے، اور اس میں لوگوں کی دل شکنی ہے۔ اور نیز: پس جب آسمانی کتابوں میں تعبیر کیا گیا اس تعلّق کو جو مخلوق کا خالق کے ساتھ ہے: بندہ ہونے اور رب ہونے کے ساتھ، تو اس کا اطلاق لوگوں کے درمیان بے ادبی ہوا —— (۵) جب اللہ تعالیٰ نے خمر کی ممانعت فرمائی، اور اس کا معاملہ گھٹایا: تو اس نے چاہا کہ ہر اس چیز سے روکا جائے جو اس کے معاملہ کی شان بڑھاتی ہے، اور اس کی خوبی لوگوں کے ذہنوں میں بٹھاتی ہے۔ اور انگور خمر کا مادّہ اور اس کی بنیاد ہے، اور عرب بارہا اس کا نام: ''بنتِ کرم'' رکھتے تھے، اور خمر کو اس طرح رائج کرتے تھے —— اور جاہلیت کے لوگ واقعات کو زمانہ کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، اور یہ شرک کی ایک نوعیت ہے۔ اور نیز: عرب کبھی زمانہ سے زمانہ کا لوٹ پھیر کرنے والا مراد لیتے تھے۔ پس ناراضگی اللہ کی طرف لوٹنے والی ہے۔ اگرچہ وہ عنوان میں چوک گئے یعنی ان نالائقوں نے اللہ کی طرف راست نسبت کرنے کے بجائے، زمانہ کی طرف خفگی کی نسبت کی۔

☆ ☆ ☆

(۶) —— جی خبیث ہو رہا ہے: کہنے کی ممانعت —— حدیث —— رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''ہرگز کوئی نہ کہے:

میرا جی خبیث ہو رہا ہے، بلکہ چاہئے کہ کہے: میرا جی متلا رہا ہے" (مشکوۃ حدیث ۴۷۶۵)

تشریح: اس حدیث میں یہ اصول پیشِ نظر ہے کہ گفتگو میں مہذب اور شائستہ الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ جو الفاظ شرعاً یا عرفاً ناپسندیدہ ہیں: ان سے احتراز کرنا چاہئے۔ مثلاً جی متلا رہا ہو تو کہنا چاہئے: میری طبیعت مالش کرتی ہے۔ میرا جی گندہ ہو رہا ہے: نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ خبث کا لفظ کتب سماویہ میں اکثر خبثِ باطن اور سوئے ضمیر کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ پس یہ کلمہ اقوال میں ایسا ہی برا ہے جیسا اَجدع (ناک کان کٹا) افعال میں بھونڈا ہے۔

⑦ — **لوگوں کا ایسا خیال ہے: کہہ کر بات کہنے کی ممانعت — حدیث** — رسول اللہ ﷺ نے زَعَموا (لوگوں کا ایسا خیال ہے) کے بارے میں فرمایا: "آدمی کی بری سواری ہے!" (مشکوۃ حدیث ۴۷۷۷)

تشریح: اس حدیث میں یہ تعلیم ہے کہ بے تحقیق بات نہیں کہنی چاہئے۔ لوگ عام طور پر: لوگوں کا ایسا خیال ہے: کہہ کر باتیں بیان کرتے ہیں یہ شرعاً پسندیدہ نہیں۔

⑧ — **اللہ چاہیں اور فلاں چاہے: کہنے کی ممانعت — حدیث** — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ چاہیں اور فلاں چاہے: مت کہو، بلکہ کہو: جو اللہ چاہیں پھر فلاں چاہے" (مشکوۃ حدیث ۴۷۷۸)

تشریح: ذکر میں اللہ کے ساتھ کسی کو برابر کرنا، مرتبہ میں برابری کا خیال پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اندازِ کلام اللہ کی شان میں بے ادبی ہے، اس لئے ممنوع ہے۔

[٦] قال صلى الله عليه وسلم: " لايقولنّ أحدكم: خَبُثَتْ نفسي، ولكن ليقل: لَقِسَتْ نفسي"

أقول: الخُبْثُ كثيرًا مّا يستعمل في الكتب الإلٰهية بمعنى خُبث الباطن وسوء السَّريرة، فهذه الكلمة بمنزلة الهيئات الشيطانية.

[٧] وقال صلى الله عليه وسلم: في زعموا: " بئس مَطِيَّةُ الرجل!"

أقول: يريد كراهيةَ أن يُذكر الأقاويلُ من غير تثبُّت.

[٨] وقال صلى الله عليه وسلم: "لاتقولوا: ماشاء الله، وشاء فلان، ولكن قولوا: ماشاء الله، ثم شاء فلان"

أقول: التسوية في الذكر يوهم التسويةَ في المنزلة، فكان إطلاقُ مثلِ هذه اللفظة سوءَ أدب.

ترجمہ: (٦) خبث کا لفظ بارہا کتب سماویہ میں خبثِ باطن اور سوئے ضمیر کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، پس یہ کلمہ شیطانی (بری) ہیئتوں کے بمنزلہ ہے — (٧) آپؐ مراد لے رہے ہیں اس بات کی ناپسندیدگی کو کہ بات پکّی کئے بغیر اقوال ذکر کئے جائیں — (٨) ذکر میں برابری مرتبہ میں برابری کا خیال پیدا کرتی ہے، پس اس قسم کے الفاظ بولنا بے ادبی (گستاخی) ہے۔

جائز وناجائز کلام: تقریر واشعار

یہ بات بھی جان لیں کہ کلام میں بناوٹ کرنا، بتکلف فصاحت کا مظاہرہ کرنا، گلا پھاڑ پھاڑ کر بولنا، اشعار کی بہتات کرنا، مذاق بہت کرنا، قصہ کہانیوں میں اور اس قسم کی دوسری باتوں میں وقت برباد کرنا: ایک طرح کا سامانِ تفریح ہے، جو دین ودنیا سے فاغل کرتا ہے، اور تفاخر اور نام ونمود کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کا حال عجم کی عادتوں جیسا ہے۔ چنانچہ نبی صَلَّاللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کو ناپسند کیا، اور اس کی خرابیوں کو کھول کر بیان کیا۔ اور جس کلام میں یہ خرابیاں نہیں تھیں، اس کی اجازت دی، اگرچہ معاملہ بظاہر یکساں نظر آتا ہو۔

وضاحت: مثلاً: بیان کے بارے میں ایک حدیث میں فرمایا کہ بعض بیان جادو اثر ہوتے ہیں، اور دوسری حدیث میں بیان کو نفاق کی ایک شاخ قرار دیا۔ ان دونوں حدیثوں کے مصداق الگ الگ ہیں۔ یا جیسے اشعار کے بارے میں جہاں یہ فرمایا کہ آدمی کا پیٹ ایسی پیپ سے بھر جائے جو اس کے پیٹ کو خراب کردے: بہتر ہے اس سے کہ اس کا پیٹ اشعار سے بھر جائے، وہیں حضرت لبید رضی اللہ عنہ کے ایک مصرعہ کی ''نہایت سچی بات'' کہہ کر تحسین فرمائی، اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو ان کے کلام پر دعائیں دیں۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار کی نوعیت مختلف تھی، گو بظاہر معاملہ یکساں نظر آئے۔

جائز وناجائز کلام کے سلسلہ کی روایات:

پہلی حدیث: رسول اللہ صَلَّاللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''متنطِّعین ہلاک ہوں!'' آپؐ نے یہ بددعا تین بار فرمائی! (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۸۵)

تشریح: متنطعین کے دو معنی ہیں: ایک: کلام میں مبالغہ کرنے والے یعنی ڈینگیں مارنے والے۔ دوم: بتکلف کلام کرنے والے یعنی بہ تصنّع عبارت آرائی کرنیوالے، تاکہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں، اور واہ واہ کریں۔

دوسری حدیث: رسول اللہ صَلَّاللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''حیا اور زبان بستگی ایمان کی دو شاخیں ہیں۔ اور فحش گوئی اور زور بیان نفاق کی دو شاخیں ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۹۶)

تشریح: مقصدِ حدیث یہ ہے کہ فحش گوئی، کلام میں تصنّع اور تفاخر نہ کرے۔

تیسری حدیث: رسول اللہ صَلَّاللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''تم میں سے میرے نزدیک محبوب تر، اور قیامت کے دن مجھ سے قریب تر: وہ لوگ ہوں گے جو تم میں سب سے زیادہ خوش اخلاق ہیں۔ اور تم میں سے میرے نزدیک مبغوض تر، اور (قیامت کے دن) مجھ سے بعید تر: وہ لوگ ہوں گے جو تم میں سب سے زیادہ بد اخلاق ہیں: بہت زیادہ بولنے والے، گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے والے (یا باتوں میں غیر محتاط) تکبر سے بَغْبغانے والے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۷۹۷)

چوتھی حدیث: رسول اللہ صَلَّاللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''میں نے جانا ـــــ یا فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ـــــ کہ میں بات میں اختصار کروں، کیونکہ کلام میں اختصار بہتر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۰۳)

پانچویں حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''البتہ یہ بات کہ آدمی کا پیٹ ایسی پیپ سے بھر جائے جو اس کے پیٹ کو خراب کردے: اس سے بہتر ہے کہ وہ (گندے) اشعار سے بھر جائے'' (مشکوۃ حدیث ۴۸۰۹)

چھٹی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''بیشک جبرئیل ہمیشہ آپ کی تائید کرتے ہیں، جب تک آپ اللہ ورسول کی طرف سے مقابلہ کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۹۱)

ساتویں حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک مؤمن اپنی تلوار اور اپنی زبان (اشعار) سے جہاد کرتا ہے۔ اور قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے! گویا تم کفار کو اشعار سے مارتے ہو تیر سے مارنے کی طرح!'' (مشکوۃ حدیث ۴۷۹۵)

واعلم: أن التَنَطُّعَ والتَّشَدُّق والتَّقَعُّرَ في الكلام، والإكثارَ من الشعر والمزاح، وتَزْجِيَةِ الوقتِ بأسمارٍ ونحوِها: إحدى المُسْلِيَاتِ التي تُشغِل عن الدين والدنيا، وما يقع به التفاخر والمراءاةُ، فكان حالُها كحال عادات العجم، فكرهها النبيُّ صلى الله عليه وسلم، وبين ما في ذلك من الآفات، ورخص فيما لا يتحقق فيه معنى الكراهية، وإن اشتبه بادى الرأى.

قال صلى الله عليه وسلم: "هلك المُتَنَطِّعون!" قالها ثلاثا. وقال صلى الله عليه وسلم: "الحياء والعِيُّ شعبتان من الإيمان، والبَذَاءُ والبيانُ شعبتان من النفاق"

أقول: يريد ترك البَذاء والتقعر، والتطاول في الكلام.

وقال صلى الله عليه وسلم: " إن أحبَّكم إليَّ، وأقربَكم مني يوم القيامة: أحاسنُكم أخلاقاً؛ وإن أبغضكم إليَّ، وأبعدَكم مني: مَسَاوِيْكم أخلاقاً: الثرْثارون، المتشدِّقون، المتفيهقون" وقال صلى الله عليه وسلم: " لقد رأيتُ ـــ أو أمرتُ ـــ أن أَتَجَوَّزَ في القول، فإن الجَوَازَ هو خير" وقال صلى الله عليه وسلم: " لأن يمتلئَ جوفُ أحدكم قَيْحًا يَرِيْه، خير من أن يمتلى شعرًا" وقال صلى الله عليه وسلم لحسَّان: " إن روح القُدُس لايزال يؤيِّدكَ مانافَحْتَ عن الله ورسوله" وقال عليه السلام" إن المؤمن يجاهد بسيفه ولسانه، والذى نفسى بيده! لكأنما ترمونهم به نَضْحَ النبل"

لغات: تنطّع في الشيئ: غلو اور تکلف کرنا۔ تَنطَّعَ فى كلامه: گہرائی اور فصاحت سے بولنا...... تَشَدَّق: عمدہ گفتگو کرنے کے لئے باچھوں (گوشہائے لب) کو موڑنا...... تَقَعَّر فى كلامه: کلام کی گہرائی میں جانا۔ حلق پھاڑ کر بولنا...... تَزْجِيَة بمعنی إِزْجَاء استعمال کیا ہے، جس کے معنی ہیں: مؤخر کرنا...... المَسْلاة بمعنی السَّلْوى ہے: غم غلط کرنے کا ذریعہ، سامانِ تفریح...... العِيّ: کلام یا افہام مقصود پر عدم قدرت...... البَذَاء: بدزبانی، بدکلامی...... ثَرْثَرَ في الكلام: فضول بولنا، بکواس کرنا...... تَفَهَّقَ في الكلام: مزین اور پرتکلف کلام کرنا...... الجَواز: الاقتصار على قدر الكفاية (مرقات)...... يَرِيْه: صفة قيح، أى يُفسده، من الورى، وهو داء يفسد الجوف (مرقات)...... نافح عنه: دفاع

کرنا، کسی کی حمایت وطرف داری کرنا...... نَضَحَ القومَ بالنبل: قوم پر تیر برسائے۔

☆ ☆ ☆

جائز وناجائز کلام: غیبت وکذب

جس طرح بیان واشعار: بعض جائز ہیں بعض ناجائز۔ جو کلام خرابیوں پر مشتمل ہے اس کو ناجائز قرار دیا ہے، اور جو خرابیوں سے پاک ہے اس کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح غیبت وکذب بھی ناجائز ہیں۔ کیونکہ ان میں بے شمار مفاسد ہیں۔ البتہ روایات ہی سے کچھ غیبت وکذب جائز بھی ہیں، وہ خرابیوں سے پاک ہیں، یا ضرورت کی بنا پر ان کی اجازت دی ہے۔
حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

پہلے سلوک واحسان کے مبحث (رحمۃ اللہ ۴: ۳۹۲) میں ''زبان کی آفات'' کے بیان میں وہ اصول ذکر کئے جا چکے ہیں، جن سے غیبت وکذب کی ممانعت اور محافظت زبان کی روایات کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ روایات درج ذیل ہیں:

پہلی روایت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے: اس کو چاہئے کہ اچھی بات بولے، یا چاہئے کہ خاموش رہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۲۴۳ باب الضيافة، كتاب الأطعمة)

دوسری روایت: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا فسق (بدکاری) ہے، اور اسے قتل کرنا کفر ہے'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۱۴)

تیسری روایت: رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''جانتے ہو غیبت کیا ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''تمہارا اپنے بھائی کا تذکرہ کرنا ایسی بات کے ساتھ جو اس کو بری لگے'' کسی نے عرض کیا: اگر میرے بھائی میں وہ بات ہو جو میں کہتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگر وہ بات اس میں ہو تو غیبت ہے، اور اگر وہ بات اس میں نہ ہو تو بہتان ہے!'' (مشکوٰۃ حدیث ۴۸۲۸)

غیبت کا جواز: علماء نے بیان کیا ہے کہ چھ صورتوں میں غیبت جائز ہے:

پہلی صورت: مظلوم کے لئے جائز ہے کہ بادشاہ، قاضی یا ایسے شخص سے ظلم کا شکوہ کرے جس سے فریادرسی کی امید ہو۔ اللہ پاک جل شانہ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو پسند نہیں کرتے، مگر مظلوم مستثنیٰ ہے'' (النساء آیت ۱۴۸) یعنی مظلوم اگر ظالم کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر لائے تو جائز ہے۔

دوسری صورت: کسی امرِ منکر میں تبدیلی اور نافرمان کو راہِ راست پر لانے کے لئے کسی سے مدد طلب کرنے کے لئے برائی کرے تو جائز ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو عبداللہ بن اُبَی منافق کی وہ دو باتیں پہنچائی تھیں جو سورۃ المنافقین آیات ۷و۸ میں مذکور ہیں (متفق علیہ، ریاض الصالحین حدیث ۱۵۳۲) اور حضرت ابن مسعود رضی

اللہ عنہ نے حنین کی غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں انصار کی بات رسول اللہ ﷺ کو پہنچائی تھی (بخاری حدیث ۳۱۵۰)

تیسری صورت: فتوی حاصل کرنے کے لئے کسی کی غیبت کرنی پڑے تو جائز ہے۔ حضرت معاویہ کی والدہ حضرت ہند رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ سے عرض کیا: ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے جو میرے اور میری اولاد کے لئے کافی ہو۔ الی آخرہ (متفق علیہ، ریاض الصالحین حدیث ۱۵۳۳)

چوتھی صورت: مسلمانوں کو شر سے بچانے کے لئے کسی کی برائی کرنی پڑے تو جائز ہے۔ جیسے ایک شخص نے نبی ﷺ کے پاس حاضری کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے فرمایا" آنے دو، قبیلہ کا برا آدمی ہے!" (متفق علیہ، ریاض الصالحین حدیث ۱۵۲۹) اور جیسے ضعیف راویوں پر جرح کرنا۔ اور جیسے نبی ﷺ کا یہ ارشاد: "معاویہ تو کنگال ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں، اور ابوالجہم کندھے سے لاٹھی نہیں اتارتے!" (متفق علیہ، ریاض الصالحین حدیث ۱۵۳۱)

پانچویں صورت: جو شخص کھلے عام فسق وفجور میں مبتلا ہو، لوگوں کو اس سے متنفر کرنے کے لئے اس کی برائی کرنا جائز ہے۔ جیسے نبی ﷺ نے دو منافقوں کے بارے میں فرمایا" میں نہیں خیال کرتا کہ فلاں اور فلاں ہمارا دین کچھ بھی جانتے ہوں!" (رواہ البخاری، ریاض الصالحین حدیث ۱۵۳۰)

چھٹی صورت: کسی کا کوئی ایسا لقب ہو جس میں برائی ہو تو پہچان کے لئے اس کا تذکرہ جائز ہے۔ جیسے اعمش (چندھیا) اور اعرج (لنگڑا)

کذب کا جواز: اور علماء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر مقصود کا حصول جھوٹ بولے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اور دلیل یہ حدیث ہے کہ" وہ انسان جھوٹا نہیں جو لوگوں کے درمیان مصالحت کراتا ہے، پس وہ کوئی اچھی بات منسوب کرتا ہے، یا کوئی اچھی بات کہتا ہے" (متفق علیہ، ریاض الصالحین ص ۵۹۳)

وقد ذكرنا في الإحسان من أصول آفات اللسان: ما يَتَّضح به أحاديثُ حفظ اللسان، كقوله صلى الله عليه وسلم: " من كان يؤمن بالله واليوم الآخرِ فليقل خيرًا، أو ليَسْكُت" وقوله عليه الصلاة والسلام: " سِبَاب المسلم فسوق وقتاله كفر" وقوله صلى الله عليه وسلم: " أتدرون ما الغيبة؟" قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: " ذكرُك أخاك بما يكره" قيل: أفرأيتَ إن كان في أخي ماأقول؟ قال: " إن كان فيه ماتقول فقد اغْتَبْتَه، وإن لم يكن فيه ماتقول فقد بَهَتَّهُ"

قال العلماء: يُستثنى من تحريم الغيبة أمور ستة:

[الف] التظلُّم: لقوله تعالىٰ: ﴿لاَيُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلاَّ مَنْ ظُلِمَ﴾

[ب] والاستعانة على تغيير المنكر، وردِّ العاصي إلى الصواب، كإخبار زيد بن أرقم بقول عبد الله بن أبي، وإخبارِ ابن مسعود بقول الأنصار في مغانم حنين.

[ج] والاستفتاء: كقول هند: إن أبا سفيان رجلٌ شحيحٌ.
[د] وتحذير المسلمين من الشر: كقوله صلى الله عليه وسلم:" بئس أخو العشيرة!" وكجرح المجروحين، وكقوله صلى الله عليه وسلم:" أمّا معاويةُ فَصُعلوك، وأما أبو الجهم فلايضع العصا عن عاتقه"
[هـ] والتنفير من مجاهرٍ بالفسق، كقوله صلى الله عليه وسلم:" لاأظن فلانا وفلانا يعرفان من أمرنا شيئًا"
[و] والتعريف: كالأعمش، والأعرج.
وقالوا: الكذب يجوز إذا كان تحصيلُ المقصود لايمكن إلا به، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" ليس الكذّاب الذى يُصلح بين الناس: فَيَنْمِىْ خيرًا، أو يقولِ خيرًا"

ملحوظہ: غیبت وکذب کے جواز کا یہ مضمون شاہ صاحب قدس سرہٗ نے غالباً ریاض الصالحین سے حذف واضافہ کے ساتھ لیا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے یہ دونوں مضمون تفصیل سے لکھے ہیں۔

باب ــــــ ۵

اَیمان ونذور کا بیان

منت پوری کرنا کیوں ضروری ہے؟

اَیمان: یمین کی جمع ہے۔ یمین کے لغوی معنی قوت کے ہیں، اور اصطلاحی معنی قسم کے ہیں۔ یعنی کوئی ایسا عہد کرنا جس کی وجہ سے قسم کھانے والے کا کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا ارادہ پختہ ہوجائے: عقدٌ قَوِيَ به عزمُ الحالف على الفعل أو الترك (درمختار) اور نذر: کے معنی مَنّت، ماننا، بھینٹ اور غیر واجب کو اپنے اوپر واجب کرنے کے ہیں۔ اور شرعاً جس منت کا وفا واجب ہے: وہ ایسی عبادتِ مقصودہ ہے جس کے قبیل کی کوئی واجب عبادت ہو، جیسے روزے نماز وغیرہ کی منت مانی، اور شرط پائی گئی، تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

ایمان ونذور کے تذکرہ کا محل کیا ہے؟ صاحبِ مشکوٰۃ اور صاحبِ ہدایہ نے ان کو طلاق وعتاق کے بعد ذکر کیا ہے۔ کیونکہ تینوں میں ہزل (مذاق) اثر انداز نہیں ہوتا۔ اگر مذاق میں قسم کھائے یا منت مانے تو بھی درست ہوجاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ان کو مبحثِ معیشت کا تتمہ بنایا ہے۔ دونوں کا تعلق معیشت (زندگانی) سے بایں جہت ہے کہ دنیا جہاں کے لوگ، خواہ عرب ہوں یا عجم، اپنے موقع محل میں قسمیں کھاتے ہیں، اور منتیں بھی مانتے ہیں۔ اس طرح دونوں کا تعلق طریقہ

زندگانی اور آدابِ زیست سے ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے احکام سے بحث بھی ضروری ہے یعنی چونکہ یہ انسانی زندگی کا لازمہ ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ شریعت ان کے احکام سے بحث کرے، ورنہ بات ادھوری رہ جائے گی۔

ایمان ونذور کے سلسلہ میں مختصر بات: یہ ہے کہ دونوں درحقیقت نیکی کے کام نہیں۔ چنانچہ بکثرت قسم کھانا ممنوع ہے۔ اگر قسم کھانا دراصل نیکی کا کام ہوتا تو اس کی کثرت مطلوب ہوتی۔ اسی طرح نذر معلق بھی ناپسندیدہ ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ بلکہ یہ دونوں التزاماتِ عہد کے قبیل کی نیکیاں ہیں۔ تفصیل رحمۃ اللہ (۱:۷۸۸) میں گذر چکی ہے۔ پس جب انسان نے ایک چیز اپنی ذات پر واجب کرلی، اور اللہ کا نام لے کر اس کا پختہ ارادہ کرلیا، تو ضروری ہے کہ وہ اللہ کے پہلو میں، اور اس معاملہ میں جس پر اللہ کا نام لیا ہے: کوتاہی نہ کرے، بلکہ جو عہد کیا ہے اس کو پورا کرے۔ اور اس کی دلیل درج ذیل حدیث ہے:

حدیث ـــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''منت نہ مانا کرو، کیونکہ منت تقدیر کے سامنے کچھ کام نہیں آتی۔ اس کے ذریعہ بس بخیل سے مال نکال لیا جاتا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۲۶ کتاب الأیمان والنذور)

تشریح: انسان عام حالات میں راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ کسی مصیبت میں پھنستا ہے تو خرچ کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتا ہے۔ علاج معالجہ میں لاکھوں اڑا دیتا ہے۔ اور جب اس سے مایوس ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور آخری علاج کے طور پر راہِ خدا میں خرچ کرنے کا عہد کرتا ہے۔ یہی منت ہے۔ پھر جب اس کو اللہ تعالیٰ اس ہلاکت سے نجات دیدیتے ہیں تو اس کی ایسی حالت ہوجاتی ہے: گویا اسے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں۔ اور وہ اپنا عہد بھول جاتا ہے، یا اس کو نظر انداز کردیتا ہے۔ اس لئے کوئی ایسی چیز ضروری ہے جس کے ذریعہ اس کو مال خرچ کرنے پر مجبور کیا جائے، اور وہ نذر کا وجوب ہے۔ چنانچہ شریعت نے نذر کا وفا ضروری قرار دیا، تاکہ مصیبت کی گھڑی میں جس چیز کو اس نے سر لیا ہے، جس کا التزام کیا ہے، جس کا پختہ ارادہ کیا ہے، اور جس کی نیت کی ہے، اس کو پورا کرنے سے اس کے عزم وارادہ کی اہمیت ظاہر ہو۔

﴿الأیمان والنذور﴾

ومما یتعلق بهذا المبحث: أحكام النذور والأيمان، والجملة في ذلك: أنها من دَيْدَنِ الناس وعاداتهم: عربِهم وعجمهم، لا تجد واحدةً من الأمم إلا تستعمِلُها في مظانّها، فوجب البحث عنها.

وليس النذر من أصول البر، ولا الأيمانُ، ولكن إذا أوجب الإنسان على نفسه، وذَكَرَ اسمَ الله عليه: وجب أن لايفرِّطَ في جنب الله، وفيما ذُكِرَ عليه اسمُ الله، ولذلك قال صلى الله عليه وسلم: " لاتنذُروا، فإن النذر لايُغني من القدر شيئًا، وإنما يُستخرَج به من البخيل"

يعنى أن الإنسان إذا أحيط به: ربما يسهل عليه إنفاق شيئ، فإذا أنقذه الله من تلك المهلكة، كان كأن لم يمسَّه ضُرٌّ قط، فلابد من شيئ يُستخرج به ما التزمه على نفسه، مما يؤكد عزيمتَه، ويُنَوِّهُ نيَّتَه.

ترجمہ: قسموں اور منتوں کا بیان: (یہ عنوان شارح نے بڑھایا ہے) اوران باتوں میں سے جواس مبحث سے تعلق رکھتی ہیں: منتوں اور قسموں کے احکام ہیں۔ اور مختصر بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ لوگوں کی، عرب وعجم کی، خصلتوں اور عادتوں میں سے ہے: آپ کسی امت کو نہیں پائیں گے، مگر وہ ایمان ونذور کو ان کی احتمالی جگہوں میں استعمال کرتی ہوگی، پس ضروری ہے ان سے بحث کرنا ـــــ اور منت نیکی کے بنیادی کاموں میں سے نہیں، اور نہ قسمیں۔ لیکن جب انسان نے اپنی ذات پر واجب کیا، اور اس پر اللہ کا نام لیا، تو ضروری ہے کہ وہ کوتاہی نہ کرے اللہ کے پہلو میں، اور اس معاملہ میں جس پر اللہ کا نام لیا ہے، اور اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا ہے:...... یعنی جب انسان کو مصائب گھیر لیتے ہیں، تو کبھی اس کے لئے کسی چیز کا خرچ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ پس جب اس کو اللہ تعالیٰ اس ہلاکت سے نجات دیتے ہیں، تو اس کی ایسی حالت ہوجاتی ہے، گویا اسے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہی نہیں، پس ضروری ہے کوئی چیز جس کے ذریعہ نکالا جائے اس چیز کو جس کو اس نے اپنے سر لیا ہے ان چیزوں میں سے جس کا ارادہ پختہ کیا ہے، اور اپنی نیت کی شان دوبالا کی ہے۔

☆ ☆ ☆

قسم کی چار قسمیں

قسم کی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم ـــــ یمینِ منعقدہ ـــــ آئندہ کی کسی ممکن بات پر پختہ ارادہ سے قسم کھانا، جیسے میں آئندہ کل آؤنگا، یا نہیں آؤنگا۔ اس قسم کے بارے میں ارشاد پاک ہے: ''لیکن اللہ تعالیٰ اس قسم پر پکڑتے ہیں جس کو تم نے مضبوط باندھا ہے'' (المائدہ آیت ۸۹) یعنی اس کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہے۔

دوسری قسم ـــــ یمینِ لغو (بیہودہ قسم) ـــــ اس کی دوصورتیں ہیں: ایک: لوگ جو بول چال میں قسم کے ارادہ کے بغیر: ہاں بخدا اور نہیں بخدا کہتے ہیں: یمین لغو ہے۔ دوسری: کسی گذشتہ واقعہ پر اپنی دانست کے مطابق قسم کھانا، جبکہ واقعہ میں ایسا نہ ہو، جیسے کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ زید آگیا ہے، اس پر اعتماد کرکے قسم کھالی کہ وہ آگیا ہے، پھر ظاہر ہوا کہ نہیں آیا، تو یہ یمین لغو ہے، اس میں کفارہ ہے نہ گناہ۔ اس قسم کے بارے میں ارشاد پاک ہے: ''اللہ تم کو تمہاری بیہودہ قسموں پر نہیں پکڑتا'' (حوالہ بالا) یعنی اس میں کفارہ واجب نہیں۔

تیسری قسم ـــــ یمینِ غموس ـــــ قاضی کے سامنے جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا، تاکہ اپنے حق میں فیصلہ کرا کے کسی

مسلمان کا مال ہتھیا لے۔ یہ سخت کبیرہ گناہ ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۰ باب الکبائر) اسی طرح اگر کسی گذشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی تو وہ بھی یمینِ غموس ہے، اور گناہ کبیرہ ہے۔

چوتھی قسم — کسی محالِ عقلی یا عادی کی قسم کھانا — محالِ عقلی: جیسے گذشتہ کل کا روزہ رکھنا، اور ضدین کو جمع کرنا۔ اور محالِ عادی: جیسے مردوں کو زندہ کرنا اور قلبِ ماہیت جیسے مٹی کو سونا بنانا۔

فائدہ: آخری دو قسموں میں کوئی نص نہیں، اس لئے ان میں اختلاف ہوا ہے کہ کفارہ واجب ہے یا نہیں؟ یمینِ غموس میں صرف امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کفارہ واجب ہے۔ دیگر ائمہ کے نزدیک واجب نہیں۔ وہ اتنا بھاری گناہ ہے کہ کفارہ سے نہیں دُھل سکتا۔ توبہ ہی سے معاف ہوسکتا ہے۔ سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۵ ہے: ﴿لَايُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ، وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ ترجمہ: اللہ تعالیٰ (آخرت میں) تمہاری داروگیر نہ فرمائیں گے تمہاری بیہودہ قسموں پر، البتہ اس پر داروگیر فرمائیں گے جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے (مراد یمین غموس ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے، بڑے بردبار ہیں — اور محال امر کی قسم میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک کفارہ واجب ہے۔ امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک چونکہ انعقادِ یمین کے لئے امکانِ برّ شرط ہے: اس لئے ان کے نزدیک ایسی قسم منعقد نہیں ہوتی، پس کفارہ واجب نہیں۔

والحلف على أربعة أضرب:

[١] يمين منعقدة: وهي اليمين على مستقبَلٍ متصوَّرٍ، عاقدًا عليه قلبَه، وفيها قوله تعالىٰ: ﴿وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ﴾

[٢] ولغو اليمين: قول الرجل: لاوالله، وبلى والله، من غير قصد؛ وأن يحلِفَ على شيئ يظنه كما حلف، فتبين بخلافه، وفيها قوله تعالىٰ: ﴿لَايُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ﴾

[٣] واليمين الغموس: وهي التي يحلفها كاذبًا عامدًا، ليقتطع بها مالَ امرئ مسلم، وهي من الكبائر.

[٤] واليمين على مستحيل: عقلاً: كصوم أمسِ، والجمع بين الضدين؛ أو عادةً: كإحياء الميت، وقلب الأعيان.

واختُلف في الضربين اللذين ليس فيهما نص: هل فيهما كفارة؟

ترجمہ واضح ہے۔ متصوَّر: منطق کی اصطلاح ہے۔ جس کے معنی ہیں: ممکن بات: جو ہوسکتی ہو۔

☆ ☆ ☆

۱- غیر اللہ کی قسم کھانا شرک کیوں ہے؟

حدیث (۱) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے آباء کی قسمیں نہ کھایا کرو۔ جسے قسم کھانی ہو اللہ کی قسم کھائے یا چپ رہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۰۷)

حدیث (۲) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے علاوہ کی قسم کھائی، اس نے یقیناً شریک ٹھہرایا!'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۱۹)

تشریح: آدمی قسم اس کی کھاتا ہے جس کے بارے میں دو اعتقاد رکھتا ہے: ایک: اس کی ذات میں اللہ جیسی عظمت، اور اس کے نام میں اللہ کے نام جیسی برکت کا اعتقاد ہو۔ دوم: اس ذات کے معاملہ میں جس کی قسم کھائی ہے کوتاہی کو گناہ تصور کرتا ہو اور اس امر کی خلاف ورزی کو بھی گناہ سمجھتا ہو، جس پر اس کے نام کی قسم کھائی ہے۔ ظاہر ہے ایسے اعتقاد سے غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۱: ۶۲۸)

۲- غیر اللہ کی قسم منہ سے نکل جائے تو اس کا علاج

حدیث —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے قسم کھائی، پس اس نے اپنی قسم میں کہا: 'لات وعزی کی قسم!' تو چاہئے کہ کہے: 'اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں!' —— اور جس نے اپنے ساتھی سے کہا: 'آؤ کھیلیں' تو چاہئے کہ وہ خیرات کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۰۹)

تشریح: دل کی حفاظت کے لئے زبان کی حفاظت ضروری ہے۔ کیونکہ زبان دل کی ترجمان اور اس کا پیش خیمہ ہے۔ پس دل اسی وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب آدمی زبان کی حفاظت کا اہتمام کرے۔ لہٰذا اگر بے ساختہ زبان پر غیر اللہ کی قسم آجائے تو لا إلٰـــہ إلا اللہ کہہ لے، اور دل جُوے کا ہُوکا (شدید خواہش) کرے اور زبان پر یہ بات آجائے تو کچھ صدقہ کرے، تاکہ آئندہ زبان پر یہ بات نہ آئے۔

۳- قسم مصلحت کے خلاف ہو تو توڑ دینے کی اور کفارہ دینے کی وجہ

حدیث (۱) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جب آپ نے کسی بات کی قسم کھائی، پھر آپ نے اس کے علاوہ کو اس سے بہتر سمجھا، تو آپ اپنی قسم کا کفارہ دیدیں، اور وہ کام کریں جو بہتر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۱۲)

حدیث (۲) —— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''البتہ یہ بات کہ تم میں سے ایک شخص اپنے گھر والوں میں اپنی قسم پر اصرار کرے: اس کو زیادہ گنہگار بنانے والا ہے اللہ کے نزدیک: اس سے کہ وہ قسم کا وہ کفارہ دیدے جو اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض کیا ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۱۴)

تشریح: بارہا انسان اپنے گھر والوں کے بارے میں: بیوی، اولاد یا ماں باپ کے بارے میں کوئی ایسی قسم کھالیتا ہے جس سے خود بھی پریشان ہوجاتا ہے، اور دوسروں کے لئے بھی پریشانی کھڑی کردیتا ہے۔ ایسی قسم مصلحتِ شرعی سے ہم آہنگ نہیں، پس اس قسم کو توڑ دینا چاہئے، اس پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ اور کفارہ دیدے۔ کفارہ اس دغدغہ کو ختم کرنے ہی کے لئے مشروع کیا گیا ہے، جس کو مکلف اپنے دل میں پاتا ہے۔

۴۔ قسم: قسم کھلانے والے کی نیت پر محمول ہوتی ہے

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تیری قسم اُس پر محمول ہے جس پر تیرا ساتھی تیری تصدیق کرتا ہے''
(مشکوۃ حدیث ۳۴۱۵)

تشریح: جب مقدمہ میں مدعی کے پاس گواہ نہیں ہوتے، تو مدعی علیہ کی طرف قسم متوجہ ہوتی ہے، اور اسی پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ پس اگر مدعی علیہ صراحۃً جھوٹی قسم کھا کر اپنے حق میں فیصلہ کرالے تو وہ سخت کبیرہ گناہ ہے، جیسا کہ ابھی گذرا۔ اور اگر مدعی علیہ قسم میں توریہ کرے تو وہ بھی معتبر نہیں، قسم اس بات پر محمول ہوگی جس پر مدعی کھلا رہا ہے۔ مثلاً: مال کا دعوی ہے۔ مدعی علیہ قسم کھاتا ہے کہ میرے پاس مدعی کے مال میں سے کچھ بھی نہیں۔ اور جیب میں یا پاس میں ہونے کی نیت کرتا ہے، تو یہ نیت معتبر نہیں۔ یہ جھوٹی قسم شمار ہوگی۔ کیونکہ مدعی اس پر قسم کھلا رہا ہے کہ مدعی علیہ کے قبضہ وتصرف میں مال نہیں۔

غرض لوگ کبھی ایسا حیلہ کرتے ہیں، اور اس طرح وہ مسلمان کا مال ہتھیا لیتے ہیں۔ اس لئے شریعت نے یہ دروازہ بند کردیا۔ اور توریہ کو غیر معتبر قرار دیا۔ البتہ یہ حدیث اس صورت میں ہے کہ قسم کھانے والا ظالم ہو۔ اور اگر وہ مظلوم ہو تو توریہ معتبر ہے۔ مثلاً ایک شخص کو بدمعاشوں نے راستہ میں پکڑ لیا۔ اس کی تلاشی لی، کوئی مال نہیں نکلا، حالانکہ اس کے سامان میں مال ہے۔ ان بدمعاشوں نے قسم کھلائی۔ اس شخص نے قسم کھائی کہ میرے پاس کچھ نہیں، اور مراد ہاتھ میں یا جیب میں نہ ہونا لیا۔ تو یہ جھوٹی قسم نہیں۔ کیونکہ قسم کھانے والا مظلوم ہے۔

۵۔ ان شاء اللہ کہنے کی صورت میں کفارہ نہ ہونے کی وجہ

حدیث ——— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے قسم کھائی، پس اس نے کہا: ان شاء اللہ تو وہ حانث نہ ہوگا''
(مشکوۃ حدیث ۳۴۲۴)

تشریح: جب قسم کے ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ لیا جائے تو وہ قسم منعقد نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں قسم کھانے کی پختہ نیت اور مضبوط ارادہ نہیں ہوتا، اور کفارہ عقدِ قلب کی خلاف ورزی کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ اور یہ وجہ متحقق نہیں، اس لئے کفارہ واجب نہیں۔

۶- قسم توڑنے کی صورت میں وجوبِ کفارہ کی وجہ

سورۃ المائدہ آیت ۸۹ میں ارشاد پاک ہے: ''اللہ تعالیٰ تمہارا مؤاخذہ نہیں کرتے تمہاری بیہودہ قسموں پر یعنی کفارہ واجب نہیں کرتے۔ البتہ ان قسموں پر مؤاخذہ فرماتے ہیں جن کو تم مستحکم کردو۔ پس اس کا کفارہ دس محتاجوں کو کھانا دینا ہے، اوسط درجہ کا جو تم اپنے گھر والوں کو کھانے کے لئے دیا کرتے ہو، یا ان کو کپڑا دینا ہے، یا ایک غلام یا باندی آزاد کرنا ہے۔ اور جس کو مقدور نہ ہو، تو تین دن کے روزے ہیں، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھاؤ''

تشریح: قسم توڑنے سے اللہ کے نام کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ مذکورہ کفارہ اس کی ایک طرح کی سزا ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص شعائر اللہ کی بے حرمتی پر کمربستہ ہوجائے، اور اس کی بنیاد خواہش نفس ہو، تو ضروری ہے کہ اس کو ایسی عبادت کا مکلف کیا جائے جو نہایت دشوار ہو، تاکہ وہ کفارہ اس کی نگاہوں کے سامنے رہے، اور آئندہ اس کے نفس کو بے راہ روی سے روکے (رحمۃ اللہ ۲:۱۴۹)

ملحوظہ: یہاں یہ آیت کریمہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آگے نذر کا بیان آرہا ہے جس میں بعض صورتوں میں کفارۂ یمین واجب ہوتا ہے۔ اس لئے قاری کو کفارۂ یمین سے واقف کرنے کے لئے یہ آیت کریمہ لکھی ہے۔

[۱] قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لاتحلفوا بآبائكم، من كان حالفا فليحلف بالله، أو لِيَصْمُتِ" وقال صلى الله عليه وسلم: " من حلف بغير الله فقد أشرك"

أقول: الحلف باسمِ شيئٍ لايتحقق حتى يعتقد فيه عظمةً، وفي اسمه بركةً، والتفريطَ في جنبه، وإهمالَ ما ذكر اسمَه عليه: إثمًا.

[۲] قال صلى الله عليه وسلم: " من حلَف فقال في حَلِفِه: باللاَّت والعزّى، فليقل: لا إِلَٰه إلا الله؛ ومن قال لصاحبه: تعالَ أقامِرْك، فليتصدَّق"

أقول: اللسان ترجمانُ القلب ومقدِّمتُه، ولايتحقق تهذيبُ القلب حتى يؤاخذ بحفظ اللسان.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " إذا حلفتَ على يمين، فرأيتَ غيرَها خيرا منها، فكفِّر عن يمينك، وَأْتِ الذي هو خير" وقال عليه السلام: " لأن يَلَجَّ أحدُكم بيمينه في أهله، آثِمُ له عند الله من أن يُعْطِيَ كفارتَه التي افترض اللهُ عليه"

أقول: كثيرًا ما يحلف الإنسانُ على شيئ، فيضيق على نفسه وعلى الناس، وليست تلك من المصلحة؛ وإنما شرعت الكفارةُ مُنْهِيَةً لما يجده المكلفُ في نفسه.

[٤] وقال صلى الله عليه وسلم: "يمينُك على ما يُصَدِّقُك عليه صاحبُك"

أقول: قد يُحتال لاقتطاع مالِ امرئ مسلم، بأن يتأوَّل في اليمين، فيقول - مثلاً -: واللهِ! ليس في

يدى من مالك شيئ: يريد ليس فى يدى شيئ، وإن كان فى تصرفى وقبضى؛ وهذامحله الظالم.

[٥] وقال صلى الله عليه وسلم: "من حلف، فقال: إن شاء الله: لم يحنث"

أقول: حينئذ لم يتحقق عقدُ القلب، ولا جَزْمُ النية، وهو المعنيُّ فى الكفارة.

[٦] قال الله تعالىٰ: ﴿لَايُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْ أَيْمَانِكُمْ، وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْأَيْمَانَ. فَكَفَّارَتُهٗ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِيْنَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ أَهْلِيْكُمْ، أَوْ كِسْوَتُهُمْ، أَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ، فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ، ذٰلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ﴾

أقول: قد مر سر وجوبِ الكفارة من قبلُ، فراجع.

ترجمہ:(۱) کسی چیز کے نام سے قسم کھانا نہیں پایا جاتا تا آنکہ وہ اعتقاد رکھے اس (کی ذات) میں عظمت کا، اور اس کے نام میں برکت کا۔ اور گناہ کا اس کے پہلو میں کوتاہی کرنے کی صورت میں، اور اس چیز کو رائگاں کرنے کی صورت میں جس پر اس (غیر اللہ) کا نام لیا ہے ـــــ (۲) زبان دل کی ترجمان اور اس کا پیش خیمہ ہے۔ اور نہیں پایا جاتا دل کا سنورنا، تا آنکہ وہ اپنی زبان کی حفاظت کا اہتمام کرے ـــ (۳) بارہا انسان کسی بات پر قسم کھاتا ہے، پس خود پر اور لوگوں پر تنگی کرتا ہے۔ اور یہ بات مصلحت میں سے نہیں ہے یعنی قسم کا یہ مقصد نہیں ہے۔ اور کفارہ مشروع کیا گیا ہے اس بات کو ختم کرنے کیلئے جس کو مکلف اپنے دل میں پاتا ہے ـــــ (۴) کبھی حیلہ کیا جاتا ہے کسی مسلمان آدمی کے مال کو ہتھیانے کیلئے بایں طور کہ وہ قسم میں تاویل کرتا ہے۔ پس مثال کے طور پر کہتا ہے: بخدا! میرے ہاتھ میں تیرے مال میں سے کچھ نہیں! مراد لیتا ہے وہ: میرے ہاتھ میں کوئی چیز نہیں، اگرچہ وہ تصرف اور قبضہ میں ہے۔ اور اس حدیث کا مصداق ظالم ہے ـــ (۵) اس وقت نہیں پایا گیا دل کا عہد، اور نہ پختہ نیت، درانحالیکہ وہی کفارہ میں مراد لیا ہوا ہے ـــ (۶) کفارہ کے وجوب کا راز قبل ازیں گذر چکا ہے، پس اس کی مراجعت کر لی جائے۔

لغات: لَجَّ يَلَجُّ لَجًّا وَلَجَاجَةً: اصرار کرنا۔ ترجمہ: اصرار کرے تم میں سے کوئی محلوف علیہ پر اپنی قسم کی وجہ سے اپنے گھر والوں کے بارے میں...... آثم (اسم تفضیل) أى أكثر إثما.

☆ ☆ ☆

نذر کی قسمیں اور ان کے احکام

نذر: ایسی بات کو اپنے اوپر لازم کرنے کا نام ہے جو شرعاً لازم نہ ہو، اور اس کی چند قسمیں ہیں:

پہلی قسم ـــــ نذر مبہم ـــــ وہ نذر ہے جس کی ناذر نے تعیین نہ کی ہو۔ مثلاً اس نے کہا کہ اگر اس کے بچہ کو شفا ہو جائے تو وہ منت مانتا ہے۔ مگر کس چیز کی منت مانتا ہے؟ یہ بات واضح نہ کی۔ اس قسم کا حکم یہ ہے کہ جب بچہ کو شفا ہو جائے تو قسم کا کفارہ ادا کرے۔ دس محتاجوں کو کھانا دے، کپڑا پہنائے، یا ایک بردہ آزاد کرے۔ اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو مسلسل

تین روزے رکھے۔اوراس کی دلیل یہ حدیث ہے:من نَذَرَ نذرًا لم یسمّه، فکفارته کفارة یمین :جس نے کوئی ایسی نذر مانی،جس کی تعیین نہ کی ہوتواس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے(مشکوۃ حدیث ۳۴۳۶)

اوراس کی وجہ: یہ ہے کہ نذرویمین میں قریبی تعلق ہے۔نذر کے ذریعہ غیر واجب کوواجب کیا جاتا ہے۔اور قسم کی ایک صورت میں بھی کسی کام کے کرنے کا عہد کیا جاتا ہے۔پس جب ابہام کی وجہ سے نذر کی تعمیل ممکن نہیں ،تو اس کے قرین سے مدد لی جائے۔اور کفارہ دے کرمنت سے عہدہ برآ ہوجائے۔

دوسری قسم ـــــ نذرمباح ـــــ یعنی ایسے کام کی نذر ماننا جس میں نہ طاعت کے معنی ہوں نہ معصیت کے،یا نذرتو طاعت کی ہو،مگر شرعاًوہ نذرصحیح نہ ہو۔جیسے کافر کی یا بچہ کی نذر۔اس قسم کا حکم یہ ہے کہ یہ نذرواجب نہیں،مگراس کا وفا جائز ہے۔جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمانۂ جاہلیت میں مسجد حرام میں ایک رات کے اعتکاف کی منت مانی تھی۔چنانچہ آپؐ نے ان سےفرمایا:''اپنی نذر پوری کرلو''(بخاری حدیث ۲۰۳۲)اورعدم وجوب کی دلیل ابواسرائیل کاواقعہ ہے جوآگے آرہا ہے۔

تیسری قسم ـــــ نذرطاعت ـــــ یعنی ایسی عبادت کی نذر ماننا جس کی جنس سے کوئی واجب عبادت ہو۔جیسے نماز، روزے اور پیدل حج کرنے کی نذر ماننا۔یہی اصل نذر ہے۔اوراسی کا ایفاء واجب ہے۔سورۃ الحج آیت ۲۹ میں ارشاد پاک ہے:﴿وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ﴾یعنی چاہئے کہ حجاج اپنی منتیں پوری کریں ـــــ البتہ اگر کسی معین جگہ میں یا کسی معین صورت میں نذرمانی ہو،تو وہ لغو ہے۔نفس طاعت کی نذر درست ہے۔

جگہ کی تعیین غیر معتبر ہونے کے دلائل:

(۱) فتح مکہ کے موقع پر ایک شخص نے مسئلہ دریافت کیا کہ اس نے منت مانی ہے کہ اگر مکہ فتح ہوگیا،تو وہ بیت المقدس میں دو رکعتیں پڑھے گا۔آپؐ نے فرمایا:''یہیں پڑھ لو''اس نے مکرر سوال کیا تو آپؐ نے پھر یہی فرمایا۔جب اس نے تیسری مرتبہ پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:شأنَكَ إذًا:اب تو جانے(مشکوۃ حدیث ۳۴۴۰)

(۲) رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے منت مانی کہ وہ مقام بُوانہ میں ایک اونٹ ذبح کرے گا۔آپؐ نے پوچھا:''کیا وہاں زمانۂ جاہلیت میں کوئی بت تھا جس کی پوجا کی جاتی تھی؟''جواب دیا گیا:نہیں۔آپؐ نے پوچھا:''کیا زمانۂ جاہلیت میں اس جگہ کوئی میلا لگتا تھا؟''جواب دیا گیا:نہیں۔آپؐ نے فرمایا:''اپنی نذر پوری کرلو''(مشکوۃ حدیث ۳۴۳۷)یعنی نذرصحیح ہے،یہیں اونٹ ذبح کرکے غریبوں کو کھلادو۔اگر بُوانہ میں کوئی مورتی یا میلا لگتا ہوتا تو یہ نذرمعصیت ہوتی،اوراس کا وفا جائز نہ ہوتا۔بلکہ قسم کا کفارہ دینا پڑتا۔جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

خاص ہیئت غیر معتبر ہونے کے دلائل:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے۔آپؐ نے ایک شخص کو دھوپ میں کھڑا ہوا دیکھا۔آپؐ نے اس کا حال دریافت کیا۔صحابہ نے عرض کیا:یہ ابواسرائیل ہے۔اس نے روزے کی

منت مانی ہے، جس میں نہ وہ بیٹھے گا، نہ سایہ میں جائے گا، اور نہ کسی سے بات کرے گا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس کو حکم دو کہ بات کرے، سایہ میں جائے، بیٹھ جائے، اور اپنا روزہ پورا کرے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۳۰) یعنی روزہ کی نذر صحیح ہے، کیونکہ وہ طاعت ہے۔ باقی امور جو مباح ہیں ان کی نذر صحیح نہیں، اس لئے وہ واجب نہیں۔

(۲) حضرت عقبۃ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن نے ننگے سر ننگے پیر پیدل حج کرنے کی منت مانی تھی۔ آپؐ نے حکم دیا کہ وہ اوڑھنی اوڑھے، اور سوار ہو کر حج کرے، اور تین روزے رکھے (مشکوۃ حدیث ۳۴۴۲) پیدل حج کرنے کی نذر صحیح ہے، مگر ایک عورت کے لئے یہ کام دشوار ہے، اس لئے کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا۔

چوتھی قسم ــــ نذرِ معصیت ــــ جیسے شراب پینے کی یا زنا کرنے کی نذر ماننا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا وفا واجب ہے نہ جائز۔ بلکہ قسم کا کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔ حدیث میں ہے: **لانذر فی معصیۃ، وکفارتُه کفارۃ الیمین**: کسی بھی گناہ کی نذر نہیں یعنی اس کا وفا جائز نہیں، اور اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۳۵)

اور اس کی وجہ: یہ ہے کہ معصیت کی نذر ماننا حرام کو حلال کرنا ہے، جو بحکم یمین ہے۔ جیسا کہ اس کی برعکس صورت یعنی حلال کو حرام کرنا یمین ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے شہد کو حرام کیا تھا۔ سورۃ التحریم کی ابتدائی آیات میں آپؐ کو حکم دیا گیا کہ آپ شہد استعمال کریں، اور قسم کا کفارہ دیں۔ چنانچہ آپؐ نے شہد استعمال فرمایا، اور کفارہ میں ایک غلام آزاد فرمایا۔

پانچویں قسم ــــ نذرِ مستحیل یعنی سخت دشوار کام کی نذر ــــ جیسے بہت بوڑھے شخص کا، یا عورت کا، یا دور دراز ممالک کے باشندے کا پیدل حج کرنے کی منت ماننا، یا جیسے زمانہ بھر کے روزں کی منت ماننا۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر منت پوری نہ کر سکے تو قسم کا کفارہ دے۔ حدیث میں ہے: ''جس نے کوئی ایسی منت مانی جو اس کے بس کی نہیں، تو اس کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے'' (مشکوۃ حدیث ۳۴۳۶)

اور اس کی وجہ: یہ ہے کہ یہ نذر صحیح ہے، پس حتی الامکان اس کو پورا کرنا چاہئے۔ لیکن اگر دشواری کی وجہ سے وفا نہ کر سکے تو کفارہ دینا ضروری ہے۔ کفارہ کی مشروعیت گناہ کو ختم کرنے کے لئے، اور دل میں بیٹھی ہوئی بات کو نکالنے کے لئے ہے۔ پس کفارہ ادا کرنے سے گناہ بھی ختم ہو جائے گا اور دل بھی مطمئن ہو جائے گا۔

والنذر: علی أقسام:

[۱] **النذر المبهم**: وفیه قوله صلی الله علیه وسلم: "کفارۃ النذر إذا لم یسم کفارۃُ الیمین"

[۲] **والنذر المباح**: وفیه قوله صلی الله علیه وسلم: "أوفِ بنذرك" بلاوجوب، لما یأتي من قصة أبي إسرائیل.

[۳] **ونذر طاعة**: في موضع بعینه، أو بهیئة بعینها: وفیه قصة أبي إسرائیل: نذر أن یقوم، ولایَقعُد، ولایستظلَّ، ولایتکلَّم، ویصومَ، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: "مُرُوه

فليتكلم، وليستظلَّ، وليقعُدْ، وليُتمَّ صومَه" وقصةُ من نذر أن ينحر إبلا ببُوانةَ، ليس بها وثنٌ، ولا عيدٌ لأهل الجاهلية، قال: "أوف بنذرك"

[٤] ونذر المعصية: وفيه قوله صلى الله عليه وسلم: "من نذر نذرًا في معصية، فكفارته كفارة يمين"

[٥] ونذرٌ مستحيلٌ: وفيه قوله صلى الله عليه وسلم: "من نذر نذرًا لايُطيقه، فكفارتُه كفارة يمين"

والأصل في هذا الباب: أن الكفارة شرعت منهيةً للإثم، مُزِيْلَةً لما حاك في صدره: فمن نذر بطاعة فليفعل، ومن نذر غير ذلك، ووجد في صدره حرجًا: وجبت الكفارة، والله أعلم.

ترجمہ: (۴) اور عبادت کی نذر: کسی معین جگہ میں یا کسی معین صورت کے ساتھ۔ اور اس میں یعنی معین صورت میں ابو اسرائیل کا واقعہ ہے ...... اور (معین جگہ میں) اس شخص کا واقعہ ہے جس نے بُوانہ میں اونٹ ذبح کرنے کی منت مانی تھی (۵) اور ضابطہ اس باب میں یعنی پانچویں قسم میں کفارہ واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کفارہ گناہ کو ختم کرنے کے لئے، اور اس بات کو جو ناذر کے سینہ میں جمی ہوئی ہے نکالنے کے لئے مشروع کیا گیا ہے۔ پس جس نے عبادت کی نذر مانی چاہئے کہ وہ اس کو کرے، اور جس نے اس کے علاوہ کی نذر مانی (یہ معصیت کی نذر کو بھی شامل ہے) اور وہ اپنے سینہ میں تنگی پائے تو کفارہ واجب ہوگا۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بحمد اللہ! ہم اُن باتوں سے فارغ ہوگئے جن کو اس کتاب (کی قسم دوم) میں لانے کا ہمارا ارادہ تھا، اور جس کا ہم نے خود کو پابند کیا تھا۔ اس کی تفصیل: قسم اول، مبحث ہفتم کے باب اول میں گذر چکی ہے۔ اُس باب میں شاہ صاحب رحمہ اللہ نے احادیث کی دو قسمیں کی ہیں: ایک: وہ جو حکم شرعی کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔ دوسری: وہ جو دنیوی امور میں رائے کے طور پر وارد ہوئی ہیں۔ کتاب کی قسم دوم میں احادیث کی قسم اول کی شرح کی ہے۔ قسم دوم کی احادیث کی شرح نہیں کی (رحمۃ اللہ ۲: ۴۴۴)

اور کتاب میں جو اسرار شریعت ذکر کئے گئے ہیں: وہ ان باتوں کا احاطہ نہیں کرتے جو ہمارے سینوں میں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ دل ہر وقت مخفی باتوں کی سخاوت نہیں کرتا۔ اور نہ زبان ہر وقت دلوں کے اسرار کو ظاہر کرتی ہے۔ اور نہ ہر بات عوام کے سامنے ظاہر کرنا مناسب ہے۔ اور نہ ہر بات تمہید مقدمات کے بغیر سمجھائی جاسکتی ہے (کتاب میں جو باتیں تشنۂ تکمیل تھیں: شارح نے ان کو مکمل کردیا ہے)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے سینوں میں جو اسرار شریعت ودیعت فرمائے ہیں: وہ ان سب اسرار کا احاطہ نہیں کرتے جو نبی ﷺ کے قلب مبارک پر نازل کئے گئے ہیں۔ اور بھلا اس دل کی جس پر وحی نازل ہوتی تھی، اور جو قرآن کا محلِ نزول تھا: ایک امتی کے دل سے کیا نسبت ہوسکتی ہے؟ پاسنگ کے برابر بھی نہیں!



اسی طرح جو اسرار سینۂ مبارک میں جمع تھے: انھوں نے اُن حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ نہیں کیا تھا، جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام میں رعایت فرمائی ہے۔ کیونکہ ساری کائنات کے علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کے علم سے ایسی ہے جیسی حضرت خضر علیہ السلام نے واضح کی ہے۔ آپ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کشتی میں سفر کر رہے تھے۔ ایک چڑیا آئی اور اس نے سمندر میں سے ایک یا دو چونچ پانی پیا۔ حضرت خضر نے فرمایا: ''موسیٰ! میرے اور آپ کے علم کی اللہ کے علم سے نسبت ایسی ہے، جیسی چڑیا کے پیئے ہوئے پانی کی سمندر کے پانی سے نسبت ہے'' (بخاری حدیث ۳۴۰۱)

اس سے احکام شرعیہ میں ملحوظ اسرار و مصالح کی جلالت شان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات جانی جاسکتی ہے کہ مصالح کی انتہا نہیں۔ اور کتاب میں جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں: ان سے مصالح کا واجبی حق ادا نہیں ہوا۔ نہ ان سے حقیقت حال کی پوری وضاحت ہوئی ہے۔ مگر جو چیز پوری حاصل نہ کی جاسکتی ہو، اس کو بالکل چھوڑ دینا بھی مناسب نہیں۔ چنانچہ بقدر استطاعت اسرار بیان کئے گئے ہیں۔

اب ہم سیرتِ پاک، فتن و مناقب کے مضامین بقدر سہولت بیان کریں گے۔ احاطہ کرنے کا ارادہ نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

﴿من أبواب شتّى﴾

قد فرغنا ـــــ والحمدلله رب العالمين ـــــ عما أردنا إيرادَه في هذا الكتاب، وشَرَطنا على أنفسنا، ولا اسْتَوْعَب المذكورُ جميعَ ماهو مكنون في صدورنا من أسرار الشريعة، فليس كلُّ وقتٍ يَسْمَحُ القلبُ بمضنونات السرائر، ويَنْفَتِحُ اللسانُ بمكنونات الضمائر، ولا كلُّ حديثٍ يُنْثَى للعامة، ولا كل شيئ يَحْسُنُ ذكرُه بغير تمهيد مقدّماته.

ولا اسْتوعب ماجمع الله في صدورنا جميعَ ما أُنزل على قلب النبي صلى الله عليه وسلم، وكيف يكون لِمَوْرِدِ الوحي، ومَنْزِلِ القرآن نسبةٌ مع رجل من أمته؟ هيهات ذلك!

ولا استوعب ما جمع الله في صدره صلى الله عليه وسلم جميعَ ما عند الله تعالىٰ من الْحِكَمِ والمصالح المرعية في أحكامه تعالى، وقد أفصح ذلك الخضرُ عليه السلام، حيث قال: "ما نقص علمي وعلمُك إلا كما نقص هذا العصفور من البحر"

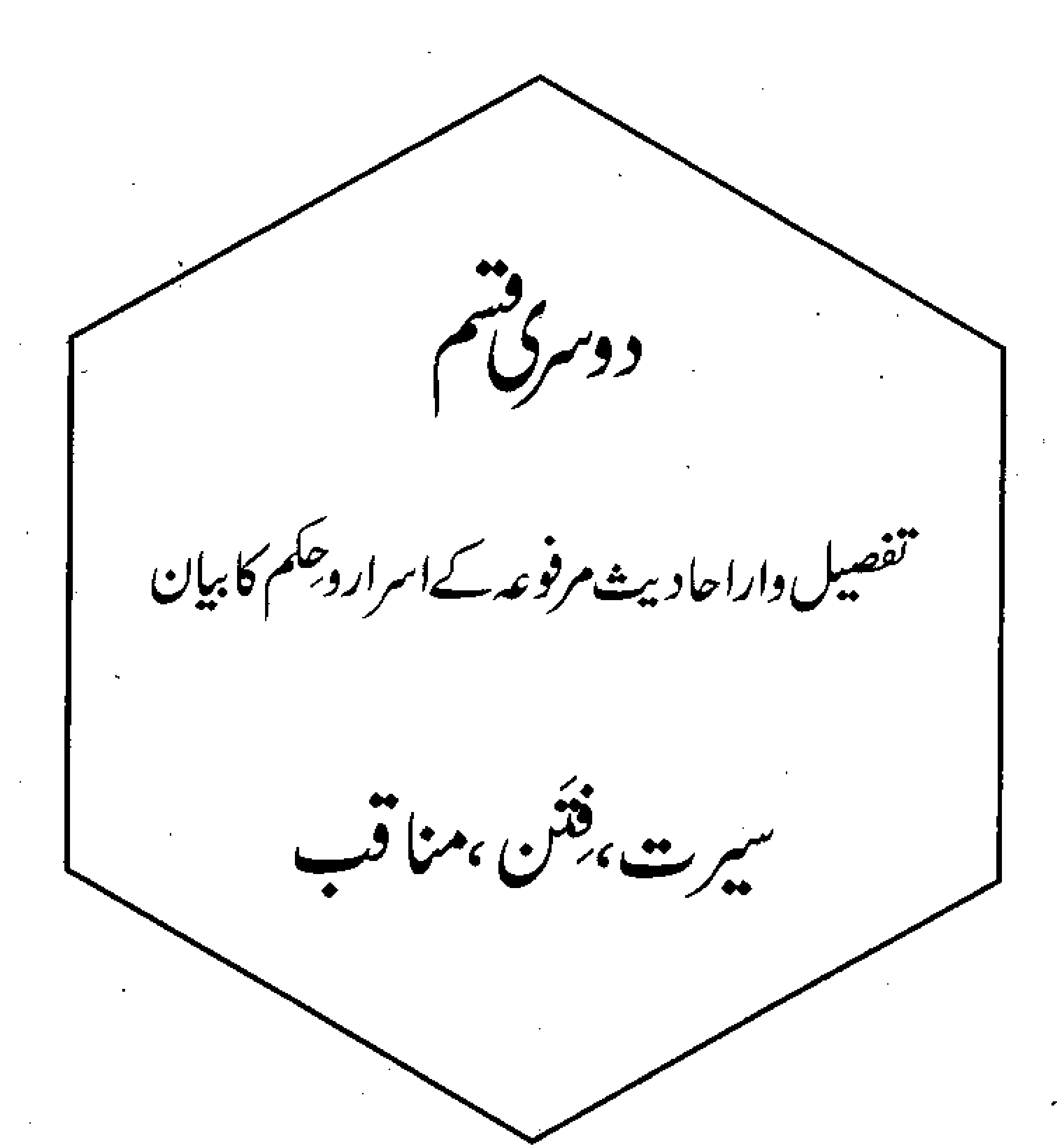
فمن هذا الوجه ينبغي أن يُعرف فخامةُ أمرِ المصالح المرعية في الأحكام الشرعية، وأنها لا منتهى لها، وأن جميع ما يُذكر فيها غيرُ وافٍ بواجب حقها، ولا كافٍ بحقيقة شأنها؛ ولكن مالا يُدرك كلُّه لايُترك كلُّه، ونحن الآن نشتغل بشيئ من السِّيَرِ، والفِتَنِ، والمناقب، على التيسير، دون الاستيعاب، والله الموفق.

ترجمہ: مختلف ابواب کے سلسلہ میں ایک بات: تحقیق ہم فارغ ہوگئے —— اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو جہانوں کے پالنہار ہیں —— ان باتوں سے جن کے لانے کا ہم نے اس کتاب میں ارادہ کیا ہے، اور جس کا ہم نے خود کو پابند کیا ہے۔ اور نہیں احاطہ کیا ہے مذکورہ باتوں نے ان سب کا جو ہمارے سینوں میں شریعت کے اسرار میں سے مکنون ہیں۔ کیونکہ ہر وقت دل مخفی باتوں کی سخاوت نہیں کرتا۔ اور زبان دلوں کے بھید بیان کرنے میں نہیں کھلتی۔ اور نہ ہر بات عوام کے سامنے پھیلانا مناسب ہے۔ اور نہ ہر بات کا تذکرہ اس کے مقدمات تیار کئے بغیر مناسب ہے —— اور نہیں احاطہ کیا ہے اس نے جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سینوں میں جمع کیا۔ یہ: اس سب کا جو نبی ﷺ کے قلب پر اتارا گیا تھا۔ اور کیا نسبت ہوسکتی ہے مور دِ وحی اور منزلِ قرآن کی اس کے امتی کے ایک شخص سے؟ بہت دور کی بات ہے! —— اور نہیں احاطہ کیا اس نے جس کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے سینہ میں جمع کیا تھا: اس سب کا جو اللہ کے پاس ہے حکمتوں اور مصلحتوں میں سے جو اللہ تعالیٰ نے احکام میں ملحوظ رکھی ہیں۔ اور یہ بات خضر علیہ السلام نے واضح کی ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا: ''نہیں گھٹایا میرے اور آپ کے علم نے مگر جتنا گھٹایا اس چڑیا نے سمندر سے!''

پس اس جہت سے مناسب ہے کہ پہچانی جائے احکام شرعیہ میں ملحوظ مصلحتوں کے معاملہ کی جلالت شان، اور یہ بات کہ ان مصالح کی کوئی حد نہیں، اور یہ بات کہ وہ تمام باتیں جو مصالح کے سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں: ان کے واجبی حق کو ادا کرنے والی نہیں۔ اور ان کی حقیقتِ حال کی وضاحت کے لئے کافی نہیں۔ لیکن جو چیز پوری حاصل نہ کی جاسکتی ہو، اس کو بالکل چھوڑ بھی نہ دیا جائے۔ اور اب ہم مشغول ہوتے ہیں کچھ سیرت، فتن اور مناقب کے بیان میں، آسانی کے بقدر، احاطہ کئے بغیر، اور اللہ ہی توفیق دینے والے ہیں۔

لغات: شرط علیه أمرا: کسی سے کسی بات کی شرط لگانا یعنی دوسرے کو پابند کرنا...... سَمَحَ به: دل کھول کر دینا...... انفتح: کھلنا (یہ لفظ مطبوعہ میں ینفح تھا، تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے)...... نَثَی الخبرَ ینثی نثیًا: خبر پھیلانا۔ کتاب میں فعل مجہول ہے...... المورِد (ظرف) وارد ہونے کی جگہ...... المنزِل (ظرف) اترنے کی جگہ۔

(بحمد اللہ! ۴ ذی الحجہ ۱۴۲۴ ہجری مطابق ۲۹ جنوری ۲۰۰۴ عیسوی کو مبحثِ معیشت کی شرح مکمل ہوئی۔)



دوسری قسم

تفصیل وار احادیث مرفوعہ کے اسرار و حِکم کا بیان

سیرت، فِتَن، مناقب

باب (۱) سیرتِ پاک

باب (۲) فِتن: آزمائشیں اور ہنگامے

باب (۳) مناقب

باب ——— ۱

سیرتِ پاک

نسب پاک اور اونچے خاندان میں نبی بھیجنے کی وجہ

ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ کے والد کا نام عبداللہ، دادا کا نام عبدالمطلب (شیبہ) پردادا کا نام ہاشم (عَمرو) بن عبد مُناف (مغیرۃ) بن قُصَیّ (زید) تھا۔ نبی ﷺ کا خانوادہ انہی ہاشم کی نسبت سے خانوادۂ ہاشمی کہلاتا ہے۔ آگے نسب نامہ یہ ہے: قصی بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فِہر (ان کا لقب قریش تھا، اور ان کی طرف قبیلۂ قریش منسوب ہے) آگے نسب نامہ مَعَدّ بن عدنان تک پہنچتا ہے۔ اور اس پر ماہرین انساب کا اتفاق ہے۔ اور عدنان سے اوپر حضرت اسماعیل علیہ السلام تک مؤرخین میں وسائط میں اختلاف ہے۔

آپؐ کا خاندان عرب کا نامی گرامی خاندان تھا۔ نہایت بہادر، بے حد سخی، فصاحت میں یکتا اور ذکاوت میں نرالا تھا۔ آپؐ نے ایسے اونچے خاندان میں آنکھ کھولی۔ اسی طرح انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام بہترین خاندان میں مبعوث کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ انسانوں کا حال سونے چاندی کی کھانوں جیسا ہے۔ کسی کھان سے عمدہ سونا نکلتا ہے، اور کسی سے معمولی۔ اور اخلاق کی عمدگی موروثی چیز ہے۔ اور نبوت کے حقدار کامل اخلاق والے ہیں۔ کیونکہ بعثتِ انبیاء کی غرض دینِ حق کی تبلیغ ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ کج روامت کو سیدھا کرتے ہیں، اور ان کو پیشوائی کا مقام عطا فرماتے ہیں۔ اور اس مقصد کی تحصیل وتکمیل کا بہترین ذریعہ اونچے خاندان کے لوگ ہیں۔ انہی کی بات لوگوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اللہ کے معاملات میں لطف ومہربانی ملحوظ ہوتی ہے۔ ارشاد پاک ہے: ''اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں جہاں وہ اپنا پیغام بھیجتے ہیں'' (الأنعام آیت ۱۲۴) یعنی وہ اونچے خاندان سے انبیاء بھیجتے ہیں، تاکہ ان کی بات قابلِ قبول ہو۔

﴿سِيَرُ النبی صلی اللہ علیہ وسلم﴾

[۱] نبيُّنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم: ابنُ عبد اللہ بن عبد المطلب بن هاشم بن عبدِ مُناف

بن قُصَيّ: نشأ من أفضلِ العرب نسبًا، وأقواهم شجاعة، وأوفرِهم سخاوةً، وأفصحِهم لسانا، وأذكاهم جنانا.

وكذلك الأنبياء عليهم السلام: لاتُبعَثُ إلا في نسب قومها، فإن الناس معادنُ كمعادن الذهب والفضة؛ وجودةُ الأخلاقِ يَرِثُها الرجلُ من آبائه، ولايستحق النبوة إلا الكاملون في الأخلاق؛ وقد أراد الله ببعثتهم أن يُظهر الحقَّ، ويُقيم بهم الأمةَ العوجاءَ، ويجعلَهم أئمة، والأقربُ لذلك أهل النسب الرفيع؛ واللطفُ مرعيٌّ في أمر الله، وهو قوله تعالى: ﴿وَاللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾

ترجمہ: نبی ﷺ کے حالات: ہمارے نبی محمد ﷺ عبداللہ کے بیٹے، وہ عبدالمطلب کے بیٹے، وہ ہاشم کے بیٹے، وہ عبد مناف کے بیٹے، وہ قصی کے بیٹے ہیں۔ آپؐ پیدا ہوئے بہترین عرب نسب میں، بہادری میں قوی ترین، سخاوت میں کامل ترین، فصاحتِ لسان میں بہترین، اور دل کے اعتبار سے نہایت ذہین خاندان میں۔ اور اسی طرح انبیاء علیہم السلام نہیں بھیجے جاتے مگر اس کی قوم کے بہترین خاندان میں۔ پس بیشک لوگ کھانیں ہیں سونے چاندی کی کھانوں کی طرح۔ اور اخلاق کی عمدگی: آدمی ان کا وارث ہوتا ہے اپنے اسلاف سے۔ اور نبوت کے حقدار نہیں مگر اخلاق میں کامل لوگ۔ اور اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت سے ارادہ فرمایا ہے کہ دین حق ظاہر ہو، اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ کج روامت کو سیدھا کریں، اور ان کو پیشوا بنائیں۔ اور اس مقصد کے لئے قریب ترین اونچے خاندان کے لوگ ہیں۔ اور اللہ کے کام میں مہربانی ملحوظ ہوتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں جہاں وہ اپنا پیغام بھیجتے ہیں''

☆ ☆ ☆

کمالِ صورت وسیرت

آپ ﷺ حلیہ اور اخلاق میں معتدل تھے:

(الف) آپؐ میانہ قد تھے: نہ طویل تھے نہ ٹھگنے۔ آپؐ کے بال نہ بالکل پیچدار تھے، نہ بالکل سیدھے، بلکہ کچھ پیچیدگی لئے ہوئے تھے۔ آپؐ نہ موٹے بدن کے تھے، نہ گول چہرے والے۔ اور آپؐ کے چہرے میں تھوڑی سی گولائی تھی۔ سر اور ڈاڑھی بڑی تھی۔ ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت تھے۔ آپؐ کا رنگ سرخی مائل تھا، بدن کے جوڑوں کے ملنے کی ہڈیاں (جیسے گھٹنے اور کہنیاں) موٹی تھیں۔ آپؐ کی گرفت (طاقت) اور قوتِ مردمی قوی تھی۔

(ب) آپؐ سب سے زیادہ سچی زبان اور سب سے زیادہ نرم طبیعت والے تھے۔ جو شخص آپؐ کو یکایک دیکھتا مرعوب ہوجاتا، اور جو آپؐ کو پہچان کر میل جول کرتا وہ آپؐ کا گرویدہ ہوجاتا۔ آپؐ خودداری کے ساتھ انکساری میں سب سے بڑھے

ہوئے تھے۔اور آپؐ اپنے گھر والوں اور خدام کے ساتھ سب سے زیادہ نرم تھے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی دس سال خدمت کی ہے۔اس عرصہ میں آپؐ نے ان سے نہ اُف کہا، نہ یہ کہا کہ یہ کام کیوں کیا؟ اور یہ کام کیوں نہیں کیا؟ (مشکوٰۃ حدیث ۵۸۰۱) اور مدینہ والوں کی باندیوں میں سے ایک باندی آپؐ کا ہاتھ پکڑتی، پس جہاں چاہتی آپؐ کو لے جاتی (مشکوٰۃ حدیث ۵۸۰۹)

(ج) اور آپؐ اپنے گھر والوں کے کام کاج میں شریک ہوتے تھے۔آپ فحش گو نہیں تھے، اور نہ بہت لعن طعن کرنے والے، اور نہ گالی گلوچ کرنے والے تھے، آپؐ اپنی چپل ٹانک لیتے، اپنا کپڑا سی لیتے اور بکری دوہ لیتے تھے، حالانکہ آپؐ ایک الوالعزم شخصیت کے مالک تھے۔آپؐ کی بات ہی بات تھی، اور آپؐ پر کوئی امر غالب نہیں آتا تھا، اور نہ کوئی مصلحت آپؐ سے فوت ہوتی تھی۔

(د) اور آپ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی، سب سے زیادہ ایذا ؤں پر صبر کرنے والے، اور سب سے زیادہ لوگوں پر مہربان تھے۔آپ کی ذات سے کسی کو برائی نہیں پہنچتی تھی: نہ آپؐ کے ہاتھ سے، اور نہ آپؐ کی زبان سے، مگر یہ کہ آپؐ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

(ہ) اور آپؐ سب سے زیادہ چپکنے والے تھے نظام خانہ داری کی اصلاح، ساتھیوں کا خیال رکھنے، اور شہری مصلحت کے ساتھ، بایں طور کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔آپؐ ہر چیز کا اندازہ پہچانتے تھے۔

نوٹ: یہ سب باتیں مختلف روایات میں آئی ہیں۔

[۲] ونشأ معتدلاً فی الخَلقِ والخُلقِ:

[الف] کان رَبْعَةً: لیس بالطویل ولا بالقصیر، ولا الجَعْدِ القَطَطِ ولا السَّبِطِ، کان جَعْدًا رَجِلاً، ولم یکن بالمطَهَّمِ ولا بالمُکَلْثَمِ، وکان فی وجهه تدویر، ضَخْمَ الرأس واللّحیة، شَثْنَ الکفین والقدمین، مُشْرَبًا حمرةً، ضَخْمَ الکرادیس، قویَّ البطش والباء ة.

[ب] أصدقَ الناس لهجةً، وألینَهم عریکةً، من رآه بدیهةً هَابَه، ومن خالَطَه معرفةً أحبه، أشدَّ الناس تواضعًا مع کبر النفس، وأرفَقَهم بأهل بیته وخَدَمِه:

خَدَمَه أنس رضی الله عنه عشر سنین، فما قال له: أفٍ، ولالم صنعت؟ ولا ألاَّ صنعت؟ وإن کانت الأمةُ من إماء أهل المدینة لتأخذ بیده، فتنطلق به حیث شاء ت.

[ج] وکان یکون فی مَهْنَةِ أهله، ولم یکن فاحشا، ولا لعَّانا ولاسبَّابا، وکان یخصِفُ نعلَه، ویخیط ثوبه، ویحلب شاته، مع کونه ذا عزیمة نافذة، قیلُه القیلُ، لایغلبه أمرٌ، ولا تفوتُه مصلحةٌ.

[د] وکان أجودَ الناس، وأصبرَهم علی الأذی، وأکثرَهم رحمةً بالناس، لایصل إلی أحد منه

شرٌ، لامن يده ولا من لسانه، إلا أن يجاهد في سبيل الله.

[هـ] وكان ألزمَهم بإصلاح تدبير المنزل ورعايةِ الأصحاب وسياسةِ المدنية، بحيث لايُتَصوَّرُ فوقَه، يَعْرِفُ لكل شيئ قدرَه.

لغات: الخَلق: پیدا کرنا۔ یہاں مراد حلیہ اور ظاہری صورت ہے...... الخُلق: باطنی صورت یعنی سیرت واخلاق حسنہ...... ربعة (بسکون الباء وفتحہا) میانہ قد...... الجعد: (صیغہ صفت) بالوں کا گھنگھریالا ہونا...... القَطَط: بالوں کا بہت زیادہ گھنگھریالہ ہونا...... السبِط: سیدھے (غیر گھونگھریالے) بال...... الرجِل: بالوں کا قدرے گھنگھریالہ ہونا...... المُطَهَّم (اسم مفعول) بھاری، موٹا...... المكلثم: (اسم مفعول) كلثم وجْهُه: چہرے کا گوشت بغیر تیور چڑھے سمٹ جانا۔ جس سے چہرہ گول ہوجاتا ہے...... شَثْن: سخت اور پُر گوشت...... مُشْرَب (اسم مفعول) ملایا ہوا یعنی آپؐ کا رنگ سفید سرخی مائل تھا...... الكراديس جمع الكردوس: ہر دو ہڈیاں جو ایک جوڑ پر اکٹھی ہوں، جیسے مونڈھے، گھٹنے اور کولہے کی ہڈیاں ...... العَرِيكة: مزاج، طبیعت، عادت لَيِّنُ العريكة: نرم مزاج، نرم خو۔

☆ ☆ ☆

صفاتِ نبوت

نبی ﷺ ہمیشہ عالم ملکوت کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ اللہ کے ذکر پر فریفتہ تھے۔ یہ بات آپؐ کی بے ساختہ باتوں سے اور آپؐ کے تمام احوال سے محسوس کی جاتی تھی۔ آپؐ غیب (اللہ تعالیٰ کی طرف) سے تقویت پہنچائے ہوئے تھے۔ آپؐ بابرکت تھے۔ آپؐ کی دعائیں قبول کی جاتی تھیں۔ اور آپؐ پر حظیرۃ القدس سے علوم وا کئے جاتے تھے۔ اور آپؐ سے مختلف طرح سے معجزات ظاہر ہوئے ہیں۔ مثلاً: دعاؤں کا قبول کیا جانا، آئندہ کے واقعات کا منکشف ہونا، اور ان چیزوں میں برکت ہونا جن میں آپؐ برکت کی دعا فرماتے۔ یہی صفات تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ہیں۔ اور وہ فطری باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان صفات پر پیدا کیا ہے، اس لئے وہ امور فطرت کی طرح ان باتوں کو انجام دیتے ہیں۔

[۲] وكان دائمَ النظر إلى الملكوت، مُسْتَهْتِرًا بذكر الله، يُحَسُّ ذلك من فَلَتَاتِ لسانه وجميعِ حالاته، مؤيَّدا من الغيب، مباركًا، يُستجاب دعاؤُه، وتُفتح عليه العلومُ من حظيرة القدس، ويَظهر منه المعجزاتُ من وجوهِ استجابةِ الدعواتِ، وانكشافِ خبرِ المستقبَلِ، وظهورِ البركة فيما يُبرِّكُ عليه، وكذلك الأنبياء — صلوات الله عليهم — يُجْبَلون على هذه الصفات، ويُنْدَفعون إليها فطرةً، فَطَرَهم الله عليها.



لغات:المُسْتَهْتِر:عاشق،فریفتہ......الفَلْتَة:بےسوچے عجلت میں کہی ہوئی بات۔هذا من فَلَتَاتِ اللسان :یہ سبقتِ لسانی سے ہوا، یہاں مراد بےساختہ منہ سے نکلی ہوئی باتیں ہیں،جیسے تکیہ کلام......وجوہ کی مابعد کی طرف اضافت ہے۔

☆ ☆ ☆

بشارات وعلامات

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ ﷺ کا اپنی دعا میں ذکر کیا ہے۔اور آپؐ کی جلالتِ شان واضح کی ہے۔اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام نے آپؐ کی خوش خبریاں دی ہیں۔اور آپؐ کی والدہ ماجدہ نے خواب دیکھا کہ گویا ایک نور اُن سے نکلا،پس اس نے زمین کو منور کردیا۔اس خواب کی تعبیر یہ بیان کی گئی کہ ایک بابرکت لڑکا تولّد ہوگا،جس کا دین مشرق ومغرب میں پھیل جائے گا۔اور جنّات نے غیبی آوازیں دیں۔اور کاہنوں اور نجومیوں نے آپؐ کے پیدا ہونے کی اور آپؐ کی جلالتِ شان کی خبریں دیں۔اور فضائی واقعات: جیسے کسریٰ (شاہ ایران) کے کنگوروں کے گرنے نے آپؐ کی بزرگی وشرف پر دلالت کی۔اور علاماتِ نبوت نے آپؐ کا احاطہ کرلیا،جیسا کہ ہرقل شاہِ روم نے خبر دی ہے

وضاحت اور حوالے:(۱)حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۹ میں مذکور ہے۔

(۲)حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارتیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔جیسے حضرت عبداللہ بن عَمرو کی روایت مشکوٰۃ (حدیث ۵۷۵۲) میں ہے۔اور کعب احبار نے تورات سے جو بشارتیں نقل کی ہیں،وہ مشکوٰۃ (حدیث ۵۷۷۱) میں ہیں۔اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے تورات سے جو علامات نقل کی ہیں وہ مختصراً مشکوٰۃ (حدیث ۵۷۷۲) میں،اور تفصیل سے بیہقی کی دلائل النبوہ (۱:۳۷۶) میں ہیں۔

(۳)حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت سورۃ الصّف آیت ۶ میں مذکور ہے۔یہی بشارت انجیل میں فارقلیط کے لفظ سے ہے (دیکھیں انجیل یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ و ۲۶ باب ۱۵ آیت ۲۶ باب ۱۶ آیت ۷)

(۴)دیگر انبیاء علیہم السلام کی بشارتیں ان کی کتابوں میں ہیں۔جیسے داؤد علیہ السلام کی بشارتیں زبور میں ہیں۔اور وہب بن منبہ کی روایت سے دلائل النبوۃ (۱:۳۸۰) میں منقول ہیں۔اور ہندوؤں کی کتابوں میں نراشش (محمد) اور کلکی اوتار (خاتم النّبیین) کے الفاظ سے آج بھی موجود ہیں۔

(۵)اور آپؐ کی والدہ ماجدہ کے خواب کا تذکرہ آپؐ نے خود فرمایا ہے۔اور یہ بھی فرمایا ہے:وكذلك أمهاتُ النبيين ترَين:انبیاء کی مائیں اسی طرح خواب دیکھتی ہیں (مسند احمد ۴:۱۲۷ و ۱۲۸ مستدرک حاکم ۲:۶۰۰ مجمع الزوائد ۸:۲۲۳ دلائل النبوۃ ۱:۸۰)

(۶)سواد بن قارب ازدی کو اس کے جنّ نے خبر دی تھی،اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو مذبوحہ گائے کے پیٹ سے

غیبی آواز سنی تھی اس کا تذکرہ بخاری (حدیث ۳۸۶۶) اورالبدایہ والنہایۃ (۲: ۳۳۲) میں ہے۔ نیز جنات کی غیبی آوازوں کے سلسلہ میں البدایہ والنہایہ (۲: ۳۳۲-۳۵۶) میں ایک پوری فصل ہے: جس میں بہت سے واقعات مذکور ہیں۔

(۷) کسری کے محل کی چودہ برجیوں کا گرنا: کسری کا ایک خواب تھا۔ خارجی واقعہ نہیں تھا، جیسا کہ مشہور ہے۔ البتہ آتشکدہ کا بجھنا خارجی واقعہ تھا۔ اسی طرح موبذان نے بھی اسی رات ایک خواب دیکھا تھا کہ سخت اونٹ آگے اور عربی گھوڑے پیچھے ہیں۔ انھوں نے دریائے دجلہ عبور کیا، اور ملک میں پھیل گئے۔ واقعہ کی تفصیل درج ذیل ہے:

جس رات نبی ﷺ کی ولادت ہوئی: اُسی رات کسری نے خواب میں دیکھا کہ اس کے محل کے چودہ کنگورے گر گئے ہیں۔ کسری صبح گھبرایا ہوا اٹھا، مگر وہ بتکلف بہادر بنا، اور کسی سے خواب ظاہر نہیں کیا۔ پھر اس کی رائے ہوئی کہ مرزبانوں سے یہ خواب مخفی نہیں رکھنا چاہئے۔ چنانچہ اس نے پوری تیاری کر کے دربار کیا، اور مرزبانوں کو بھی بلایا۔ جب وہ آئے تو کسری نے ان سے پوچھا: میں نے آپ لوگوں کو کیوں بلایا ہے؟ انھوں نے کہا: ہم نہیں جانتے، آپ بتلائیں۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ آتشکدہ کے بجھنے کے سلسلہ میں خط آیا، جس سے کسری کا غم بالائے غم ہو گیا۔ ثم أخبرهم بما رأى، وماهاله: پھر کسری نے مرزبانوں کو اپنا خواب بتلایا، اور اس نے اپنی پریشانی کا بھی اظہار کیا (البدایہ والنہایہ ۲: ۲۶۸) اور موبذان نے بھی اپنا خواب بیان کیا۔ کسری نے کہا: موبذان! کیا ہونا ہے؟ اس نے کہا: عرب کے علاقہ میں کوئی نیا واقعہ پیش آیا ہے۔ چنانچہ کسری نے نعمان بن منذر کو خط لکھا کہ میرے پاس کوئی عالم بھیجو، جو میرے سوال کا جواب دے۔ نعمان نے عبدالمسیح کاہن کو بھیجا۔ کسری نے اس سے اپنا اور موبذان کا خواب بیان کیا۔ اس نے کہا: ان کا مطلب میرا ماموں سطیح کاہن بتا سکتا ہے۔ چنانچہ عبدالمسیح کو اس کے پاس بھیجا گیا۔ اس نے بتلایا: کسری کی حکومت چودہ بادشاہوں تک رہے گی۔ عبدالمسیح نے واپس آکر جب کسری کو یہ تعبیر بتائی تو اس نے کہا: چودہ بادشاہوں تک تو بہت لمبا زمانہ ہے! مگر چار ہی سال میں دس بادشاہ بدل گئے، اور باقی چار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک نمٹ گئے، اور اس کے بعد ایران کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ ساری تفصیل البدایہ والنہایہ (حوالہ بالا) سے ماخوذ ہے۔

(۸) ہرقل شاہ روم نے نبی ﷺ کے بارے میں ابوسفیان سے چند سوالات کئے تھے۔ ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیئے تھے ان کو ہرقل نے آپ ؐ کے سچا نبی ہونے کی علامات قرار دیا ہے (بخاری حدیث ۷)

[٤] ذَكَرَه إبراهيمُ ـــ عليه السلام ـــ في دعائه، وبَشَّرَ بفخامة أمره، وبشربه موسى وعيسى ـــ عليهما السلام ـــ وسائرُ الأنبياء، صلواتُ الله عليهم، ورأتْ أُمُّه كأن نورًا خرج منها، فأضاء الأرض، فعُبِّرَتْ بوجودِ ولدٍ مبارك، يظهر دينُه شرقا وغربا، وهَتَفَتِ الجنُّ، وأخبرتِ الكُهَّانُ والمنجِّمون بوجوده وعلوِّ أمره، ودلَّتِ الواقعات الجوِّية ـــ كانكسار شُرُفاتِ كسرى ـــ على شَرَفِه، وأحاطت به دلائلُ النبوة، كما أخبرهرقلُ قيصرُ الروم.



لغات: هَتَفَ هَتْفًا: کسی کو پکارنا، لمبی آواز سے بلانا الهاتف: غیبی آواز دینے والا یعنی آواز دینے والا نظر نہ آئے......
الشُرفة: کنگورہ جو دیوار پر خوبصورتی کے لئے بنایا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

واقعۂ شقِ صدر

آپ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت، اور مدتِ رَضاعت (دودھ پینے کے زمانہ) میں لوگوں نے بہت سے برکت کے آثار دیکھے، جو حدیث وسیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ شقِ صدر کا ہے۔ اس کی تفصیل حضرت انس رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ حضرت جبریل نے آپ کو پکڑا اور پچھاڑا، اور سینہ چاک کر کے دل نکالا، پھر دل سے ایک لوتھڑا نکالا، اور فرمایا: ''یہ تمہارے اندر شیطان کا حصہ ہے!'' (اور اس کو پھینک دیا) پھر دل کو ایک طشت میں آبِ زمزم سے دھویا، پھر اسے جوڑ کر اس کی جگہ لوٹا دیا۔ اُدھر بچے دوڑ کر آپ کی ماں یعنی دایہ کے پاس پہنچے، اور اطلاع دی کہ محمد قتل کر دیئے گئے۔ وہ لوگ دوڑے آئے، دیکھا کہ آپ کا رنگ اترا ہوا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں آپ کے سینے میں سینے کا اثر دیکھا کرتا تھا (مشکوۃ حدیث ۵۸۵۲ باب علامات النبوۃ)

تشریح: واقعۂ شقِ صدر عالم مثال (روحانی عالم) اور عالم شہادۃ (عالم اجساد) کے درمیان پیش آیا تھا، اس لئے دل چیرنے سے آپ ہلاک نہیں ہوئے (یہ عالم مثال کا اثر تھا) اور سینے کا اثر باقی رہا (یہ عالم شہادت کا اثر تھا) اور اسی طرح ہر وہ واقعہ جس میں عالم مثال اور عالم شہادۃ کا اختلاط ہوتا ہے، دونوں مشابہتیں جمع ہوتی ہیں۔

قبل بعثت کے چند واقعات

پہلا واقعہ: جب آپ ﷺ کی عمر بارہ برس کی ہوئی: ابوطالب آپ کو ساتھ لے کر تجارت کے لئے ملک شام کے سفر پر نکلے۔ جب بُصریٰ مقام پر قافلہ پہنچا تو جرجیس نامی راہب نے آپ کو دیکھا، اس کا لقب بحیراء تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کے اوصاف سے پہچان لیا۔ اور ابوطالب سے کہا: انہیں واپس کر دو، یہود سے خطرہ ہے۔ چنانچہ ابو طالب نے آپ کو مکہ واپس بھیج دیا (ترمذی حدیث ۳۶۲۴ مناقب، باب ماجاء فی بدء نبوۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم البدایۃ والنہایۃ ۲: ۲۸۵-۲۸۶ زاد المعاد ۱: ۷۶ مشکوۃ حدیث ۵۹۱۸)

دوسرا واقعہ: جب آپ ﷺ جوان ہوئے تو غیبی آوازیں سننے کی اور فرشتوں کے تمثل کی آپ میں صلاحیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ بعض روایات میں ــــ جن کی استنادی حیثیت مشکوک ہے ــــ آیا ہے کہ ایک مرتبہ بچے کھیلنے کے لئے پتھر جمع

کررہے تھے، اور سب برہنہ ہوکر، تہبند کندھے پر رکھ کر پتھر اٹھا کر لارہے تھے۔ آپؐ نے بھی ایسا کرنے کا ارادہ کیا تو کسی نے ہلکا چپت مارا، اور کہا: اپنا تہبند باندھے رہو (البدایہ ۲: ۲۸۷ یہ واقعہ اس واقعہ جیسا ہے جو بناء کعبہ کے وقت پیش آیا تھا) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ مشرکین کے ساتھ کسی مذہبی تقریب میں شرکت کے لئے جارہے تھے کہ آپؐ نے اپنے پیچھے دو فرشتوں کو سنا، ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا: آؤ چلیں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہوجائیں۔ دوسرے نے جواب دیا: ہم آپؐ کے پیچھے کیسے کھڑیں ہونگے، آپؐ تو مورتیوں کو ہاتھ لگا ئیں گے؟! آپؐ نے یہ بات سن لی، اور اس کے بعد مشرکین کی کسی مذہبی تقریب میں شرکت نہ کی (البدایہ والنہایہ ۲: ۲۸۸) اور متفق علیہ روایت میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ آپؐ مکہ میں پندرہ سال تک آواز سنتے تھے۔ روشنی دیکھتے تھے۔ اور کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی (مشکوۃ حدیث ۵۸۳۸)

تیسرا واقعہ: سورۃ الضحیٰ میں ارشاد پاک ہے: ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنٰى﴾ ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو نادار پایا، پس مالدار بنایا۔ اور وہ اس طرح کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال میں آپؐ نے پہلے مضاربت کی، اور اس میں نفع ملا۔ پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپؐ سے نکاح کرلیا، اور اپنا تمام مال حاضر کردیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نسب و دولت میں اپنی قوم کی سب سے معزز اور افضل خاتون تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت بھی یہی ہے۔ وہ جس بندے سے محبت فرماتے ہیں اس کی اسی طرح چارہ سازی کرتے ہیں۔ اور ایسی جگہ سے رزق عطا فرماتے ہیں جس کا گمان بھی نہ ہو۔

چوتھا واقعہ: جب آپ ﷺ کی عمر مبارک کا ۳۵واں سال تھا: قریش نے خانۂ کعبہ کی تعمیر از سرِ نو شروع کی، تعمیر کے لئے لوگ پتھر جمع کرنے لگے۔ آپؐ بھی اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ پتھر لا رہے تھے۔ آپؐ نے عربوں کی عادت کے مطابق اپنا تہبند کھول کر اپنے کندھے پر رکھ لیا، اور آپؐ کا ستر کھل گیا۔ آپؐ فوراً بے ہوش ہوکر گر پڑے (بخاری حدیث ۳۶۴) اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں کسی نے آپؐ کو ستر کھولنے سے منع کیا (البدایہ والنہایہ ۲: ۲۸۷)

تشریح: یہ واقعہ نبوت کی ایک شاخ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو کار نبوت کے لئے تیار کرتے ہیں، اور نامناسب باتوں سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ سورۃ طٰہٰ آیت ۴۱ میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا ہے: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي﴾ اور میں نے تم کو خاص اپنے واسطے بنایا ہے یعنی اپنی وحی و رسالت کے لئے تیار کیا ہے۔ پس قبل نبوت بھی کوئی نامناسب بات صادر ہورہی ہو تو اللہ تعالیٰ حفاظت فرماتے ہیں۔ نبوت کی شاخ ہونے کا یہی مطلب ہے۔ اور یہ واقعہ روحانی دارو گیر کی ایک نوعیت بھی ہے یعنی نامناسب عمل کی وجہ سے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے، اور بے ہوشی کی بھی نوبت آتی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں (رحمۃ اللہ ۱: ۳۶۶)

پانچواں واقعہ: جب نبوت ملنے کا زمانہ قریب آیا تو آپ ﷺ کو تنہائی محبوب ہوگئی۔ چنانچہ آپؐ پانی اور ستو لے کر کئی دنوں کے لئے غار حراء میں چلے جاتے تھے۔ (وہاں سے کعبہ شریف صاف نظر آتا ہے، وہاں سے ہر وقت جلوۂ

خداوندی کا نظارہ کرتے اور ذکر وفکر میں مشغول رہتے) اور جب توشہ ختم ہوجاتا تو گھر لوٹ آتے (اور چند دن گھر رہ کر) دوبارہ کئی دنوں کا توشہ لے کر اسی غار میں جابیٹھتے۔ اس طرح شب وروز گزرتے رہے (بخاری حدیث ۳)

تشریح: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تنہائی پسندی اللہ کی تدبیر کا ایک حصہ تھی۔ اللہ تعالیٰ جس ہستی سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں اس کا دل دنیا سے ہٹ جاتا ہے، اور وہ خود کو روحانیت کے لئے آمادہ کرلیتا ہے۔

[٥] ورَأَوا آثارَ البركة عند مولده وإرضاعه، وظهرت الملائكة فشقَّت عن قلبه، فملأته إيمانا وحكمة: وذلك: بين عالَم المثال والشهادة، فلذلك لم يكن الشَّقُّ عن القلب إهلاكًا، وقد بقي منه أثر المخيط، وكذلك كل ما اختلط فيه عالَم المثال والشهادة.

[٦] ولما خرج به أبو طالب إلى الشام، فرآه الراهب، شهد بنبوته، لآياتٍ رآها فيه؛ ولما شَبَّ ظهرت مناسبة الملائكة بالهتفِ به، والتمثل له؛ وسَدَّ الله خَلَّتَه برغبةِ خديجة —— رضي الله عنها —— فيه، ومواساتِها به، وكانت من مياسير نساء قريش، وكذلك من أحبه الله، يُدَبِّرُ له في عباده.

[٧] ولما بني الكعبة فيمن بني، ألقى إزاره على عاتقه كعادة العرب، فانكشفت عورتُه، فأُسقِطَ مغشيًّا عليه، ونُهي عن كشف عورته في غشيته؛ وذلك: شعبةٌ من النبوة، ونوعٌ من المؤاخذة في النفس.

[٨] ثم حُبِّبَ إليه الخلاءُ، فكان يخلو بحراءَ الليالِيَ ذواتِ العدد، ثم يأتي أهلَه، ويتزوَّد لمثلها: لِعُزُوْفِه عن الدنيا، وتجرُّدِه إلى الفطرة التي فطره الله عليها.

ترجمہ: (۵) اور لوگوں نے آپ کی رضاعت کے وقت برکت کے آثار دیکھے۔ اور فرشتے ظاہر ہوئے، اور انھوں نے آپ کے دل کو چیرا، پس اس کو ایمان وحکمت سے بھر دیا (ایمان وحکمت سے قلب مبارک کو بھرنے کا تذکرہ معراج کی روایت میں ہے (مشکوٰۃ حدیث ۵۸۶۲) پہلی مرتبہ شق صدر کی روایت میں اس کا تذکرہ نہیں بلکہ شیطان کا حصہ نکال پھینکنے کا ذکر ہے) اور یہ واقعہ عالَم مثال اور عالَم شہادت کے درمیان پیش آیا تھا۔ پس اس وجہ سے دل کا چیرنا ہلاک کرنا نہیں ہوا، اور باقی رہا شق سے سینے کا اثر۔ اور اسی طرح ہر وہ معاملہ ہے جس میں عالَم مثال اور عالَم شہادۃ میں اختلاط ہوتا ہے ——

(۶) اور جب ابو طالب نے آپ کو لیکر شام کا سفر کیا، اور راہب نے آپ کو دیکھا، تو اس نے آپ کے نبی ہونے کی گواہی دی، چند ایسی نشانیوں کی وجہ سے جو اس نے آپ کے اندر دیکھیں۔ اور جب آپ جوان ہوئے تو مناسبت ظاہر ہوئی غیب سے فرشتوں کے آواز دینے اور آپ کے سامنے نمودار ہونے کی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حاجت روائی کی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے آپ میں رغبت کرنے کے ذریعہ۔ اور ان کے آپ کی غمخواری کرنے کے ذریعہ۔ اور وہ قریش کی مالدار عورتوں

میں سے تھیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ چارہ سازی کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے جس سے وہ محبت کرتے ہیں ——

(۷) اور جب آپؐ نے کعبہ تعمیر کیا منجملہ ان لوگوں کے جنھوں نے تعمیر کیا، تو آپؐ نے اپنا تہبند اپنے کندھے پر ڈال لیا، عربوں کی عادت کے مطابق، پس آپؐ کا ستر کھل گیا۔ پس آپؐ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔ اور آپؐ اپنی بے ہوشی کی حالت میں اپنے ستر کو کھولنے سے روکے گئے۔ اور یہ واقعہ نبوت کی ایک شاخ ہے، اور نفسانی داروگیر کی ایک نوعیت ہے ——

(۸) پھر آپؐ کو خلوت نشینی پسند آنے لگی۔ چنانچہ آپ کئی کئی راتیں غار حراء میں خلوت گزیں رہا کرتے تھے۔ پھر آپؐ گھر تشریف لاتے، اور اتنی ہی راتوں کے لئے خوراک لے جاتے: آپؐ کے دنیا سے بے رغبت ہونے کی وجہ سے، اور آپؐ کے جدا ہونے کی وجہ سے اس فطرت کی طرف جس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو پیدا کیا تھا۔

لغات: المَخِیْط: سلا ہوا، پیٹ کی اندرونی جلد کے سمٹنے کی جگہ، آنتوں کے قریب ابھرا ہوا حصہ المِخْیَط: سلائی کا آلہ یعنی سوئی وغیرہ۔ حدیث میں پہلا لفظ ہے..... عَزَفَتْ نفسُه عن الشيئ: دل پھرنا، بے رغبت ہونا، کنارہ کش ہونا۔

☆ ☆ ☆

اچھے خوابوں سے وحی کی ابتدا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا اچھے خوابوں سے ہوئی۔ آپؐ جو بھی خواب دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہوتا تھا (بخاری حدیث ۳) یہ خواب نبوت کی ایک شاخ ہیں۔ حدیث میں ہے: ''اچھے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں'' (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۴۶۰۸ کتاب الرؤیا)

فائدہ: خواب چونکہ عالم مثال اور عالم شہادت کے درمیان کا معاملہ ہے۔ اس لئے عالم شہادۃ میں نزولِ وحی سے پہلے انبیاء کو اچھے خواب نظر آتے ہیں۔ اور وہ نزولِ وحی کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔

پہلی وحی آنے پر گھبراہٹ

خوابوں کا سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ آپؐ کے پاس حق آیا، یعنی پہلی وحی نازل ہوئی جبکہ آپؐ غار حراء میں تھے۔ اس موقع پر سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ آپؐ اُن آیات کے ساتھ گھر لوٹے۔ آپؐ کا دل دَھک دَھک کر رہا تھا۔ اور یہ فطری گھبراہٹ تھی یعنی جب ایسا کوئی واقعہ اچانک پیش آتا ہے تو دل گھبراتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ملکیت کا غلبہ ہوتا ہے تو بہیمیت مبہوت ہو جاتی ہے۔ اور اس کی حیرانی گھبراہٹ کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک نانبائی کو ایک بزرگ نے توجہ دی تھی، جس سے وہ اس بزرگ جیسا ہو گیا۔ مگر بہیمیت اس کو سہار نہ سکی، اور اس کی وفات ہو گئی۔

ورقہ کی تصدیق سے تسکین

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو اپنے چچیرے بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ دور جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے۔ اور عبرانی زبان میں انجیل لکھتے تھے۔ اور اس وقت بہت بوڑھے اور نابینا ہوچکے تھے۔ ان سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: بھائی جان! آپ اپنے بھتیجے کی بات سنیں۔ ورقہ نے کہا: بھتیجے! تم نے کیا دیکھا؟ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرمایا۔ اس پر ورقہ نے کہا: یہ وہی ناموس (بڑا فرشتہ) ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔ اس سے نبی ﷺ کو تسکین ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی نیک آدمی تصدیق کرتا ہے تو طبیعت کو سکون حاصل ہوتا ہے۔ جیسے لوگ خواب دیکھتے ہیں، اور گھبرا جاتے ہیں۔ اور جب کوئی نیک آدمی کہتا ہے کہ خواب مبارک ہے تو تسکین ہوجاتی ہے۔

کچھ عرصہ وحی بند ہونے کی وجہ

پھر کچھ عرصہ وحی کی آمد بند ہوگئی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں دو جہتیں ہیں: ایک: بشریت کی جہت، دوسری: ملکیت کی جہت۔ اور تاریکیوں سے نور کی طرف نکلتے وقت مزاحمتیں اور ٹکراؤ پیش آتے ہیں، یہاں تک کہ اللہ کا معاملہ مکمل ہوجاتا ہے یعنی یہ وقفہ تیاری کے لئے تھا۔ اس درمیان میں ملکیت کو غلبہ حاصل ہوگیا، خوف دور ہوگیا، اور وحی کا اشتیاق پیدا ہوگیا تو موسلا دھار وحی کا نزول شروع ہوگیا۔

فرشتہ اصلی شکل میں نظر آنے کی وجہ

اور آپ ﷺ کبھی فرشتہ کو آسمان و زمین کے درمیان میں بیٹھا ہوا دیکھتے تھے۔ اور کبھی حرم میں کھڑا ہوا دیکھتے تھے۔ اس کی کمر کعبہ کی بلندی تک پہنچی ہوئی ہوتی تھی۔ اور اسی طرح اور صورتوں میں فرشتہ نظر آتا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ملائکہ ان نفوس سے قریب ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد پیدا ہوچکی ہوتی ہے۔ مگر ہر وقت ان کو ملائکہ نظر نہیں آتے۔ بلکہ جب وہ نفوس بشریت کے چنگل سے چھوٹ جاتے ہیں اور ملکیت غالب آتی ہے تو وقت کے تقاضے کے موافق ان پر ایک ملکی بجلی چمکتی ہے، اور ان کو ملائکہ نظر آتے ہیں۔ جیسے عام لوگوں کے نفوس جب بہیمیت کے چنگل سے چھوٹ جاتے ہیں، اور ملکیت کا ان پر غلبہ ہوتا ہے تو خواب میں ان کو بھی اس طرح کے کچھ احوال پیش آتے ہیں، اور فرشتوں کی زیارت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اللہ کے بندوں کو تو بیداری میں بھی فرشتے نظر آتے ہیں، جیسے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کو نظر آتے تھے۔

وحی کی دوصورتیں اوران کی حقیقت

حضرت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: یارسول اللہ! آپؐ پروحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کبھی وحی میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے، اور وہ مجھ پر بہت بھاری ہوتی ہے، پس جب وہ آواز بند ہوتی ہے تو میں وحی کو محفوظ کرچکا ہوتا ہوں۔ اور کبھی فرشتہ میرے پاس انسانی شکل میں آتا ہے۔ پس وہ جو کچھ کہتا ہے: میں محفوظ کرلیتا ہوں''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: سخت جاڑے کے زمانہ میں آپؐ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ پڑتا تھا (بخاری حدیث ۲)

تشریح: وحی کی پہلی صورت میں جو گھنٹی کی آواز سنائی دیتی تھی: اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب حواس سے قوی تاثیر ٹکراتی ہے تو وہ پراگندہ ہوجاتے ہیں۔ پس جب قوتِ بصارت پراگندہ ہوتی ہے تو اس کو مختلف رنگ: سرخ، زرد، سبز اور اس کے مانند نظر آتے ہیں۔ اور جب قوتِ سماعت پراگندہ ہوتی ہے تو اس کو مبہم آوازیں: جھن جھن، ٹن ٹن اور بڑبڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ پھر جب وہ اثر ختم ہوجاتا تھا تو نبی کو علم حاصل ہوجاتا تھا۔

اور وحی کی دوسری صورت: جس میں فرشتہ متمثل ہوتا ہے: وہ ایک ایسے مقام میں متمثل ہوتا ہے جو عالَم مثال اور عالم شہادت کے احکام کا سنگم ہوتا ہے، چنانچہ فرشتہ نبی کو نظر آتا ہے، دوسروں کو نظر نہیں آتا۔

وضاحت: اس مضمون کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ وحی کی پہلی صورت میں نبی ﷺ بشری ساخت سے عروج کرکے حدودِ ملکیت میں داخل ہوتے ہیں، پھر اُس موطن کے لحاظ سے کلام سنتے ہیں، جو اس عالم میں گھنٹی کی آواز کے مشابہ ہوتا ہے۔ مگر وہ محض آواز نہیں ہوتی، بلکہ باقاعدہ کلام ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ آواز بند ہوتی ہے تو نبی ﷺ وحی کو محفوظ کرچکے ہوتے ہیں —— اور دوسری صورت میں فرشتہ ملکی شاخت سے نزول کرکے حدودِ بشریت میں قدم رکھتا ہے، اور اس عالم کے لحاظ سے کلام کرتا ہے۔ اس لئے اس صورت میں نبی ﷺ پر بوجھ نہیں پڑتا۔ پھر اگر فرشتہ ایسے مقام تک اترتا ہے جس میں عالم مثال کی مشابہت بھی ہوتی ہے تو اس کو صرف نبی ﷺ دیکھتے ہیں، دوسروں کو وہ نظر نہیں آتا۔ جیسے ایک مرتبہ حضرت جبرئیل تشریف لائے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سلام کہلوایا۔ آپؐ نے ان کو سلام پہنچایا فرمایا: یہ جبرئیل ہیں تم کو سلام کہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: میں تو جبریل کو نہیں دیکھتی۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم نہیں دیکھتیں، مگر وہ تمہیں دیکھ رہے ہیں'' (بخاری حدیث ۳۷۶۸) اور اگر فرشتہ بالکل عالَم ناسوت میں اترآتا ہے تو اس کو سب لوگ دیکھتے ہیں۔ جیسے حدیث جبریل میں سب صحابہ نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تھا۔

اور اس مضمون کو سمجھنے کے لئے بلاتشبیہ یہ مثال ہے کہ جب عامل: حاضرات کا عمل کرتا ہے تو اس کی حالت غیر ہوجاتی ہے۔ اور جب جن حاضر ہوتا ہے تو وہ بالکل مبہوت ہوجاتا ہے۔ آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں، اور بدن پسینہ سے شرابور ہوجاتا ہے۔ اور جب جن انسانی صورت میں عامل یا غیر عامل کو نظر آتا ہے تو یہ حالت نہیں ہوتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ

پہلی صورت میں عامل کو بشری ساخت سے عروج کرکے جنّی ساخت کی حدود میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اور دوسری صورت میں جنّ انسانی چولے میں نمودار ہوتا ہے۔

[۹] وكان أول ما بُدِئَ به الرؤيا الصالحةُ، فكان لايرى رؤيا إلا جاء ت مثلَ فَلَقِ الصبح: وهذه شعبة من شعب النبوة.

[۱۰] ثم نزل الحقُّ عليه وهو بحراءَ، ففزع بطبيعته: بأن تشوَّشتِ البهيمية من سَنَنها لغلبة الملكية، فذهبت به خديجه إلى ورقةَ، فقال:" هو الناموس الذى نزل على موسى"

[۱۱] ثم فتر الوحى : وذلك: لأن الإنسان يجمَعُ جهتين: جهةَ البشرية وجهةَ الملكية، فيكون عند الخروج من الظلمات إلى النور مزاحماتٌ ومصادماتٌ، حتى يَتِمَّ أمر الله.

[۱۲] وكان يرى الملك تارةً جالسًا بين السماء والأرض، وتارةً واقفًا فى الحرم، تَصِلُ حُجْزَتُه إلى الكعبة، ونحو ذلك:

وسره: أن الملكوت تُلِمُّ بالنفوس المستعِدَّة للنبوة، فكلما انْفَلَتَتْ بَرِقَ عليها بارقٌ ملكى، حسبما يقتضيه الوقت، كما تَنْفَلِتُ نفوسُ العامة، فَتَطَّلع فى الرؤيا على بعض الأمر.

[۱۳] قيل: يارسول الله! كيف يأتيك الوحىُ؟ فقال:" أحيانا يأتينى مثل صَلْصَلة الجَرسِ، وهو أشدُّه علىَّ، فَيَفْصِمُ عنى وقد وعيتُ ماقال؛ وأحيانا يتمثل لِىَ المَلَكُ رجلاً، فَأَعِىْ مايقول"

أقول: أما الصلصلة: فحقيقتُها: أن الحواسَّ إذا صادمَها تأثيرٌ قوىٌّ تشوَّشت: فتشويش قوة البصر: أن يرى ألوانا: الحمرةَ والصفرةَ والخضرة، ونحو ذلك؛ وتشويش قوة السمع: أن يسمع أصواتًا مبهمة، كالطَّنِيْنِ، والصلصلة، والهَمْهَمة؛ فإذا تم الأثر حصل العلم.

وأما التمثل: فهو فى موطن يَجْمع بعضَ أحكام المثال والشهادة، ولذلك كان يرى المَلَكَ بعضُهم دون بعض.

ترجمہ: (۱۰) پھر آپؐ پر حق اترا، درانحالیکہ آپؐ غارحراء میں تھے، پس آپؐ فطری طور پر گھبرائے: بایں طور کہ بہیمیت پراگندہ ہوئی اپنی راہوں سے، ملکیت کے غلبہ کی وجہ سے الی آخرہ ـــــ (۱۱) پھر وحی سست پڑ گئی۔ اور وہ بات اس لئے ہے کہ انسان دو جہتوں کو اکٹھا کئے ہوئے ہے: بشریت کی جہت اور ملکیت کی جہت۔ پس تاریکیوں سے نور کی طرف نکلتے وقت مزاحمتیں اور تصادم پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کا معاملہ مکمل ہوجاتا ہے ـــــ (۱۲) اور آپؐ کبھی فرشتہ کو آسمان وزمین کے درمیان بیٹھا ہوا دیکھتے تھے، اور کبھی حرم میں کھڑا ہوا دیکھتے تھے۔ پہنچی ہوئی ہوتی تھی اس کی کمر کعبہ تک، اور اس کے

مانند۔ اوراس کا راز یہ ہے کہ ملائکہ قریب ہوتے ہیں ان نفوس سے جن میں نبوت کی استعداد پیدا ہوچکی ہوتی ہے۔ پس جب جب وہ نفوس چھوٹ جاتے ہیں، ان پر ایک ملکی بجلی چمکتی ہے، وقت کے تقاضے کے موافق، جیسے عام لوگوں کے نفوس چھوٹ جاتے ہیں تو وہ خواب میں کچھ معاملہ سے واقف ہوجاتے ہیں —— (۱۳) میں کہتا ہوں: رہی گھنٹی کی آواز تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حواس سے جب قوی تاثیر ٹکراتی ہے تو وہ پراگندہ ہوجاتے ہیں۔ پس قوتِ بصارت کی پراگندگی یہ ہے کہ آدمی رنگوں کو دیکھے۔ سرخ، زرد، سبز اور اس کے مانند۔ اور قوتِ سماعت کی پراگندگی یہ ہے کہ آدمی مبہم آوازیں سنے: جیسے جھن جھن، گونج (جھنکار) اور بڑبڑاہٹ۔ پس جب اثر پورا ہوجاتا ہے تو علم حاصل ہوجاتا ہے —— اور رہا فرشتہ کا متمثل ہونا: تو وہ ایک ایسی جگہ میں ہوتا ہے جو مثال کے بعض احکام اور شہادت کے بعض احکام کو جمع کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے فرشتہ کو بعض لوگ دیکھتے ہیں، اور بعض نہیں دیکھتے۔

☆ ☆ ☆

ابتدائے دعوت اور ہجرتِ حبشہ

پھر نبی ﷺ کو دعوت کا حکم دیا گیا۔ آپؐ نے خفیہ طور پر دعوت کا کام شروع کیا۔ سب سے پہلے ان لوگوں پر اسلام پیش کیا جن سے خاص تعلق تھا۔ چنانچہ حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت بلال، اور ان جیسے حضرات رضی اللہ عنہم اسلام کے ہراول دستہ میں شامل ہوئے۔ پھر آپ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ اس حکم کو جو آپؐ کو دیا گیا ہے: کھول کر بیان کریں (سورۃ الحجر آیت ۹۴) اور آپؐ سے یہ بھی کہا گیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو (عذابِ الٰہی سے) ڈرائیں (سورۃ الشعراء آیت ۲۱۴) چنانچہ آپؐ نے برملا دعوت کا کام شروع کیا۔ اور شرک کی خرافات کا پردہ چاک کرنا شروع کردیا، اس پر مشرکین کا غیظ وغضب بھڑکا، اور انھوں نے محاذ آرائی شروع کردی۔ اور آپؐ کو دست وزبان سے ستانا شروع کیا۔ درج ذیل دوواقعات سے ایذارسانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

پہلا واقعہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل اور اس کے کچھ رفقاء بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مجلس میں بعض نے بعض سے کہا: کوئی ہے: فلاں کی اونٹنی بیاہی ہے: جائے اور اس کی جیری لائے، اور جب محمد (ﷺ) سجدہ کریں تو اس کو ان کی پیٹھ پر رکھ دے؟ اس پر قوم کا بدبخت ترین آدمی عقبہ بن ابی مُعَیط اٹھا، اور جیری لاکر انتظار کرنے لگا۔ جب نبی ﷺ نے سجدہ کیا، تو اس کو آپؐ کی پیٹھ پر دونوں شانوں کے درمیان رکھ دیا۔ اہل محفل یہ ماجرا دیکھ کر ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ اور رسول اللہ ﷺ سجدہ ہی میں رہے، یہاں تک کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں، اور پیٹھ سے وہ جیری ہٹائی، تب آپؐ نے سر اٹھایا الی آخرہ (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۵۸۴۷)

دوسرا واقعہ: حضرت عبداللہ بن عَمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبۃ بن ابی مُعَیط آیا، اور اپنی چادر آپؐ کی گردن میں پھانس کر آپؐ کا سخت گلا گھونٹا۔ یہاں تک کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے، اور اس کو ہٹایا (بخاری حدیث ۳۶۷۸)

نبی ﷺ ان سخت حالات کا صبر وہمت سے مقابلہ کرتے رہے، اور مؤمنین کو نصرتِ الٰہی کی خوش خبری سناتے رہے، اور کافروں کو ہزیمت سے ڈراتے رہے۔ ارشاد پاک ہے: ''عنقریب جتھا شکست کھائے گا، اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا!'' (سورۃ القمر آیت ۴۵) اور ارشاد پاک ہے: ''وہاں (مکہ میں) ایک معمولی سا لشکر ہے، جو منجملہ اور گرہوں کے شکست دیا ہوا ہے!'' (سورہ صٓ آیت ۱۱)

پھر محاذ آرائی میں شدت پیدا ہوئی۔ اور کفار نے مسلمانوں کی ایذا رسانی، اور ان لوگوں کو ستانے کی باہم قسمیں کھائیں جو مسلمانوں کے ہمنوا تھے یعنی بنو ہاشم اور بنو المطلب۔ پس مسلمانوں کے لئے مکہ میں قیام دشوار ہوگیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی راہ سوجھائی، اور صحابہ کی ایک جماعت نے حبشہ کی طرف ہجرت کی، وہاں پہنچ کر کچھ سکون نصیب ہوا۔

[۱٤] ثم أُمر بالدعوة: فاشتغل بها إخفاءً، فآمنت خديجةُ، وأبوبكر الصديق، وبلال، وأمثالُهم، رضي الله عنهم، ثم قيل له: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ وقيل: ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ فَجَهَرَ بالدعوة وإبطالِ وجوه الشرك، فَتَعَصَّبَ عليه الناس، وآذَوْه بألسنتهم وأيدهم، كقصة إلقاءِ سَلَى جزورٍ والخَنْقِ، وهو صابر في كل ذلك، يبشر المؤمنين بالنصر، وينذر الكافرين بالانهزام، كما قال الله تعالى: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ وقال الله تعالى: ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِنَ الْأَحْزَابِ﴾

ثم ازدادوا في التعصب، فتقاسموا على إيذاء المسلمين، ومن وَلِيَهُم من بني هاشم وبني المطلب، فَهُدُوْا إلى الهجرة قِبَلَ الحبشة، فوجدوا سعةً قبل السعة الكبرى.

لغات: إبطال کا عطف الدعوة پر ہے...... تَعَصَّب عليه: محاذ آرائی کرنا، کسی کے مقابلہ میں گروہ بندی کرنا...... السَّلَى: باریک جھلّی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے، اور وہ پیدائش کے وقت بچہ سے الگ ہوجاتی ہے، اور کچھ وقفہ کے بعد نکل آتی ہے۔ اس کو المَشِيْمَة بھی کہتے ہیں۔ انسان میں اس کو نال اور آنول نال کہتے ہیں۔ اور جانور میں جیری کہتے ہیں۔ اس لفظ کا ترجمہ اوجھ یا بچہ دانی صحیح نہیں...... الخَنْق: گلا گھونٹنا...... السعة الكبرى سے ہجرت مدینہ کا چین مراد ہے۔

☆ ☆ ☆

دورِ ابتلا اور ہجرت کی تیاری

جب ۱۰ھ نبوی میں دلدار غمگسار اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات ہوگئی، اور اُسی سال عم محترم حضرت ابو طالب بھی چل بسے، تو خاندانِ بنو ہاشم کی بات بکھر گئی۔ اور آپؐ ان حالات سے سخت ملول ہوئے۔ اسی زمانہ میں آپؐ کے قلب مبارک میں اجمالی طور پر یہ بات ڈالی گئی کہ دین اسلام کی سربلندی ہجرت میں مضمر ہے۔ چنانچہ آپؐ نے اس سلسلہ میں سوچ وچار اور غور وفکر شروع کیا۔ ہجرت کے سلسلہ میں آپؐ کا ذہن مختلف مقامات کی طرف گیا۔ طائف، ہَجَر، یمامہ وغیرہ کا خیال آیا۔ اور آپؐ فوراً (شوال ۱۰ نبوی میں طائف تشریف لے گئے، مگر وہاں آپؐ کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہاں سے آپؐ مُطعم بن عدی کی پناہ میں مکہ واپس آئے۔ اور حج کے موقعہ پر اور دیگر قومی میلوں میں آپؐ نے مختلف قبائل سے رابطہ قائم کرنا شروع کیا، مگر کسی نے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اسی زمانہ میں سورۃ الحج کی آیت ۵۲ نازل ہوئی: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَلاَ نَبِيٍّ إِلاَّ إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ أُمْنِيَّتِهِ، فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ، ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهِ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ ترجمہ: اور ہم نے آپؐ سے پہلے کوئی رسول اور کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر جب اس نے آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں رخنہ ڈالا۔ پس اللہ تعالیٰ دور کرتے ہیں اس رخنہ کو جو شیطان ڈالتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کو مستحکم کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے، بڑی حکمت والے ہیں۔ یعنی تمام رسولوں اور نبیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب دین کی ترقی کے آثار نمودار ہوتے ہیں، اور اللہ کے فرستادے امید باندھتے ہیں کہ اب ظہور اسلام کا وقت قریب آگیا ہے، تو شیطان رنگ میں بھنگ ڈالتا ہے۔ مگر یہ موانع عارضی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جلد ہی ان رکاوٹوں کو ہٹا دیتے ہیں۔ اور غلبۂ اسلام کا وعدہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ہیں۔

اور اللہ کی یہ سنت کیوں ہے؟ اس کا جواب اگلی آیتوں میں ہے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ دل کے روگیوں اور سخت دل لوگوں کی آزمائش کرتے ہیں۔ وہ اسلام کے بارے میں طرح طرح کے وساوس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر یہ سچا نبی ہے، اور دین اسلام اللہ کا دین ہے تو یہ ایک دم پانسہ پلٹ کیوں گیا؟ —— اور جن لوگوں کو فہم صحیح عطا ہوا ہے ان کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے، اور ان کے دل حق کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر معاملہ ہمیشہ انبیاء کی آرزو کے مطابق ظاہر ہوتا رہے تو حق واشگاف ہو جائے گا، اور امتحان کا پہلو رائگاں ہو جائے گا۔

پس جس طرح نبی اور اس کے مخالفین کے درمیان جنگی معرکے کنویں کے ڈول کی طرح ہیں۔ کبھی نبی فتح مند ہوتا ہے تو کبھی مخالفین۔ مگر آخری انجام نبی اور مؤمنین کے حق میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ معاملہ بھی ہے۔ یہ آیت اس زمانہ میں نازل ہوئی ہے جب حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما مسلمان ہو چکے تھے، بنو ہاشم اور بنو مطلب نبی ﷺ کی حفاظت کا عہد و پیمان کر چکے تھے، اور بائیکاٹ والا صحیفہ چاک کیا جا چکا تھا۔ اور ظہور اسلام کے آثار نمودار ہو چکے تھے، بس

ہجرت کی دیر تھی کہ آپؐ ہجرت کی جگہ تلاش کرنے کے لئے طائف تشریف لے جاتے ہیں، اور دیگر معزز قبائل سے بھی ملاقاتیں کرتے ہیں، مگر صدائے برنخواست! یہی شیطان کا ڈالا ہوا رخنہ ہے۔ جسے جلد ہی اللہ تعالیٰ نے ہٹادیا۔ مدینہ منورہ کے حضرات نصرت وحمایت کے لئے تیار ہوگئے، اور اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہا۔

[١٥] ولما ماتت خديجة رضي الله عنها، ومات أبو طالب عمُّه، وتفرقت كلمة بني هاشم: فزع لذلك؛ وكان قد نُفث في صدره أن علوَّ كلمته في الهجرة نفثا إجماليًا، فتلقاه برَويته وفكره، فذهب وَهْلُه إلى الطائف، وإلى هَجَر، وإلى اليمامة، وإلى كل مذهب، فاستعجل وذهب إلى الطائف، فلقي عَناءً شديدًا، ثم إلى بني كنانة، فلم ير منهم مايسرُّه، فعاد إلى مكة بعهد زَمْعَةَ، ونزل: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنّٰى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيْ أُمْنِيَّتِه﴾ فالأمنية: أن يتمنى إنجازَ الوعد فيما يتفكره من قِبَلِ نفسه. وإلقاء الشيطان: أن يكون خلافَ ما أراد الله، ونسخه: كشفُ حقيقةِ الحال، وإزالته من قلبه.

ترجمہ: اور جب خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا، اور آپؐ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہوا، اور بنی ہاشم کی بات (اجتماعیت) منتشر ہوگئی تو آپؐ ان حالات سے گھبرائے۔ اور آپؐ کے سینے میں یہ بات اجمالی طور پر پھونکی گئی تھی کہ آپؐ کے کلمہ (دین اسلام) کی سربلندی ہجرت میں ہے۔ پس آپؐ نے اس کو حاصل کیا اپنے سوچ وچار اور غور وفکر کے ساتھ، پس آپؐ کا خیال گیا طائف، ہَجَر، یمامہ اور ہر جگہ کی طرف، پس آپؐ نے جلدی کی اور طائف تشریف لے گئے، پس آپؐ کو سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ پس بنی کنانہ کے پاس گئے، پس آپ نے ان سے وہ بات نہ دیکھی جو آپؐ کو خوش کرے، پس آپؐ مکہ کی طرف زمعہ کی پناہ میں لوٹے، اور نازل ہوا:...... پس اُمنیہ: یہ ہے کہ نبی آرزو کرے وعدہ پورا کرنے کی اس بات میں جس کو وہ سوچتا ہے اپنے نفس کی جانب سے۔ یعنی اللہ نے نبی کے دل میں ایک بات ڈالی، اس سلسلہ میں نبی اپنے دل میں ایک صورت سوچتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اس صورت میں اللہ کا وعدہ پورا ہو، یہ امنیہ ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اسلام کی سربلندی ہجرت میں ہے۔ آپؐ نے طائف وغیرہ کی طرف ہجرت کی بات اپنی طرف سے سوچی، اور چاہا کہ اللہ کا وعدہ اس صورت میں پورا ہو، یہ امنیہ ہے —— یا جیسے آپؐ نے خواب دیکھا کہ آپؐ صحابہ کے ساتھ حج یا عمرہ کرنے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، اور ارکان ادا کر کے احرام کھولا۔ آپؐ نے اس کی صورت سوچی، اور عمرہ کا احرام باندھ کر سفر شروع کیا، اور امید باندھی کہ مکہ والے عمرہ کرنے دیں گے، یہ امنیہ (آرزو) ہے —— اور شیطان کا رخنہ ڈالنا: یہ ہے کہ اس کے برخلاف ہو جو اللہ چاہتے ہیں۔ مثلاً: اللہ مدینہ کی طرف ہجرت چاہتے ہیں اور آپؐ اپنے اجتہاد سے طائف تشریف لے گئے اس اجتہادی چوک کو شیطان کا رخنہ ڈالنا کہا ہے —— اور رخنہ ہٹانا: حقیقتِ حال کو کھولنا اور دل سے اس

خیال کو زائل کرنا ہے۔ مثلاً: بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ اللہ کی مرضی مدینہ کی طرف ہجرت کی ہے۔ چنانچہ طائف کا خیال دل سے نکل گیا۔

وضاحتیں: (۱) فاستَعجَلَ: پس آپؐ نے جلدی کی یعنی اپنے اجتہاد سے ہجرت کی جگہ متعین کی، اور اللہ کی وحی کا انتظار نہ کیا، جس کے نتیجہ میں طائف میں سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا —— (۲) بنوکنانہ کی طرف جانا، اور زمعہ کی پناہ میں مکہ واپس آنا: مجھے نہیں ملا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ والنہایہ (۱۴۶:۳) میں واقدی رحمہ اللہ کے حوالے سے ان تمام قبائل کا تذکرہ کیا ہے، جن سے نبی ﷺ نے رابطہ قائم کیا تھا۔ ان میں بھی بنوکنانہ کا تذکرہ نہیں۔ اس لئے شرح میں یہ ٹکڑا نہیں لیا —— (۳) آیت پاک کی جو تفسیر شاہ صاحب قدس سرہٗ نے کی ہے وہ بہت اہم ہے۔ اور یہی صحیح تفسیر ہے۔ عام طور پر مفسرین کرام جو تفسیر کرتے ہیں وہ ایک مہمل واقعہ پر مبنی ہے۔ نیز تمنی کو قرأ کے معنی میں لینا، اور امنیۃ سے قراءت مراد لینا بہت ہی بعید تاویل ہے۔

☆ ☆ ☆

اسراء و معراج کی حکمتیں

ہجرت سے کچھ پہلے اسراء و معراج کا واقعہ پیش آیا۔ مسجد حرام سے مسجد اقصی تک کا سفر اسراء کہلاتا ہے۔ اور مسجد اقصی سے آسمانوں کے اوپر تک کی سیر معراج کہلاتی ہے۔ اسراء کے معنی ہیں: رات میں چلنا، اور اَسریٰ بہ کے معنی ہیں: رات میں لے چلنا۔ چونکہ یہ سفر رات میں کرایا گیا تھا، اس لئے وہ اسراء کہلاتا ہے۔ اور معراج کے معنی ہیں: سیڑھی۔ چونکہ آسمانوں پر چڑھنے کے لئے سیڑھی لگائی گئی تھی، اس لئے اس سفر کو معراج کہتے ہیں۔ مگر عرف عام میں دونوں کے مجموعہ کو معراج کہتے ہیں۔

اسراء و معراج میں بہت سی حکمتیں تھیں۔ دو کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے:

ضمنی حکمت: یہ تھی کہ یہ واقعہ لوگوں کے لئے ابتلا اور آزمائش بنے۔ ارشاد پاک ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْ أَرَيْنٰكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ ترجمہ: اور ہم نے آپ کو (شب معراج میں) جو مشاہدہ کرایا تھا: اس کو ہم نے لوگوں کے لئے آزمائش ہی بنایا تھا (بنی اسرائیل آیت ۶۰) یہ واقعہ اس زمانہ میں پیش آیا تھا جبکہ دعوت و تبلیغ کے کام میں کامیابی کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ اس واقعہ سے کچے پیچھے چلے گئے، اور پکے مضبوط ہو گئے۔ اسی واقعہ کی تصدیق کی وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا خطاب ملا ہے۔

اور اصل حکمت: کی طرف: ﴿لِنُرِيَهٗ مِنْ آيَاتِنَا﴾ کہہ کر اشارہ کیا ہے یعنی ہم (اللہ تعالیٰ) آپ ﷺ کو اپنی کچھ نشانیاں دکھلانا چاہتے ہیں (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱) یہ نشانیاں بہت ہیں۔ اسراء سے یعنی بیت المقدس لے جانے سے مقصود تو آپؐ کا امام الانبیاء ہونا واضح کرنا تھا۔ چنانچہ ایک ہی آیت میں اسراء کا تذکرہ کر کے کلام کا رخ بنی اسرائیل کی سیاہ کاریوں کی طرف پھیر دیا۔ اور آخر میں انہیں آگاہ کیا کہ یہ قرآن وہ راہ دکھلاتا ہے جو بالکل سیدھی اور صحیح ہے۔ اس انداز کلام میں اشارہ ہے کہ اب

بنی اسرائیل کونوعِ انسانی کی قیادت سے معزول کیا جارہا ہے۔اوراب یہ منصب آپ ﷺ کواورآپ کی امت کوسونپا جارہا ہے۔چنانچہ اس سفر کے آخر میں آپؐ نے جوتمام انبیاء ورسل کی امامت فرمائی ہے،اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔

پھرآپ ﷺ کو عالَم بالا کی سیر کرائی گئی،آسمانوں کے احوال سے واقف کیا گیا، جنت وجہنم کا مشاہدہ کرایا گیا،اور ان گنت عجائباتِ قدرت دکھلائے گئے،تاکہ آپؐ اپنی امت کو دوسری دنیا کا آنکھوں دیکھا حال بتلائیں،اورآپؐ کا بیان صرف شنیدہ نہ ہو، بلکہ دیدہ ہو۔اوراس مقصد کے لئے آپؐ کا انتخاب اس لئے کیا گیا کہ آپؐ ہی خوب سننے والے،خوب دیکھنے والے یعنی کامل فہم وبصیرت رکھنے والے ہیں۔[1]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آخرت کے احوال اور جنت وجہنم کے کوائف تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی امتوں کے سامنے بیان کئے ہیں،مگر وہ سب شنیدہ تھے یعنی وحی کے ذریعہ جن احوال کی ان کواطلاع دی گئی تھی، وہی احوال انھوں نے اپنی امتوں سے بیان کئے تھے۔اور ہمارے نبی ﷺ کو دوسری دنیا کے احوال صرف وحی سے نہیں بتلائے گئے، بلکہ معراج میں موقع پر لے جاکر تفصیلی مشاہدہ کرایا۔چنانچہ آپؐ نے جنت وجہنم وغیرہ کے احوال اتنی تفصیل سے امت کو سنائے کہ گذشتہ کسی نبی نے اتنی تفصیل بیان نہیں کی۔اس کی مثال ایسی ہے کہ جب کوئی شخص حج کرکے لوٹتا ہے تو ہفتوں مہینوں حرمین کے احوال لوگوں کو سناتا ہے،اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بیان کرتا ہے،اور مزے لے لے کر بیان کرتا ہے،تھکتا نہیں۔اب آپ معراج کی احادیث پڑھیں۔اتنی تفصیل سے نبی ﷺ نے عجائباتِ قدرت بیان کئے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے،اورصاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں آپؐ کی چشم دید ہیں (یہاں تک اضافہ ہے)

معراج کی نوعیت کیا تھی؟اس میں اختلاف ہے کہ معراج بیداری میں پیش آئی یا خواب میں؟ بالفاظ دیگر:معراج جسمانی تھی یاروحانی؟ جمہور صحابہ کے نزدیک:معراج بیداری میں ہوئی تھی اور جسمانی تھی۔اورحضرت عائشہ اورحضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ معراج منامی اور روحانی تھی،آپؐ نے یہ سب واقعات بحالت خواب دیکھے تھے۔حضرت شاہ صاحب قدس سرۂ فرماتے ہیں:

معراج بیداری میں جسم اطہر کے ساتھ ہوئی تھی۔البتہ وہ خالص مادّی عالَم کا معاملہ نہیں تھا، بلکہ عالَم مثال اور عالَم شہادۃ کے بَین بَین پیش آیا تھا،جودونوں عالموں کے احکام کا سنگم تھا۔چنانچہ جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے۔یعنی جسم نے پرواز کی اور ایک ہی رات میں یہ طویل سفر طے ہوگیا۔اورروح نے اور روحانی باتوں (معنویات) نے جسموں کا پیکر اختیار کیا یعنی اس سفر میں معنویات مجسّم ہوکر سامنے آئے۔اس لئے اس سفر میں جوواقعات پیش آئے ہیں،ان کی خوابوں کی طرح تعبیرات ہیں۔خواب میں بھی معنویات محسوس بناکر تمثیلی رنگ میں دکھائے جاتے ہیں۔اس لئے خواب تعبیر کا

---

[1] ارشاد پاک ﴿إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ میں ضمیریں نبی ﷺ کی طرف راجع ہیں۔اورانسانوں کے لئے یہ دونوں صفتیں سورۃ الدہر آیت ۲ میں ثابت کی گئی ہیں۔فرمایا: ﴿فَجَعَلْنَاهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ ترجمہ:ہم نے انسان کو سنتا دیکھتا بنایا۱۲

محتاج ہوتا ہے۔ اسی طرح واقعاتِ معراج کی بھی تعبیرات ہیں، جو آگے آرہی ہیں۔

اور ایسے واقعات حضرت حزقیل علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، اور دیگر انبیاء کو بھی پیش آئے ہیں۔ اور اولیاء امت کو بھی پیش آتے ہیں۔ مگر ہر ایک کا اللہ کے نزدیک جو درجہ ہے، اس کے اعتبار سے واقعہ کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ جیسے ان کے خوابوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

وضاحت: (۱) حضرت حزقیل علیہ السلام کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، اس سے مراد وہ واقعہ ہے جس کی طرف سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۳ میں اشارہ ہے۔ کسی زمانہ میں ہزاروں آدمی موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکلے۔ ان کو حکم الٰہی پہنچا کہ مرجاؤ، چنانچہ سب مرگئے۔ عرصہ بعد وہاں حضرت حزقیل علیہ السلام پہنچے۔ اور انسانی ہڈیوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ اور دعا کی: ''الٰہی! ان کو زندہ فرما!'' حکم آیا: ہڈیوں سے کہو: ''اے پرانی ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ جمع ہوجاؤ'' دیکھتے دیکھتے ہر انسان کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ لگ گئیں۔ پھر حکم آیا آواز دو: ''اے ہڈیو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ گوشت پہن لو، اور کھال پٹھے درست کرلو'' فوراً ہی ہر ڈھانچہ مکمل لاش بن گیا۔ پھر حکم آیا کہ کہو: ''اے روحو! اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اپنے ان جسموں میں لوٹ آؤ جن کو تم آباد کئے ہوئے تھیں'' فوراً ہی سارے لاشے زندہ ہوکر اللہ کی پاکی بیان کرنے لگے (البدایہ والنہایہ ۲:۳) یہ سارا منظر حضرت حزقیل علیہ السلام نے مشاہدہ کیا تھا۔ دوسروں نے تو بس اتنا دیکھا تھا کہ مردے زندہ ہوگئے۔

(۲) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے، اس سے مراد کوہِ طور کا واقعہ ہے۔ وہاں آپؑ نے جو آگ دیکھی تھی، اور کلام الٰہی سنا تھا وہ بھی عالم مثال اور عالم شہادۃ کے درمیان کا معاملہ تھا۔ چنانچہ وہ آگ صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نظر آئی تھی، دوسروں کو نظر نہیں آئی تھی۔

(۳) اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۹ میں مذکور ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۰ میں مذکور ہے۔ دونوں کو مردوں کو زندہ کرنے کا منظر دکھایا گیا ہے۔ یہ واقعات بھی اسی نوعیت کے ہیں۔

(۴) اور اولیاء امت کو جو اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں، اس سے مراد مکاشفات ہیں۔ جیسے ایک خطبۂ جمعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بے جوڑ فرمایا: ''اے ساری! پہاڑ کا خیال رکھو!'' آپؓ کی یہ آواز نہاوند کے میدانِ جنگ میں سنی گئی، اور فوج چوکنا ہوگئی (مشکوۃ حدیث ۵۹۵۴) ظاہر ہے یہ واقعہ صرف عالم شہادۃ کا نہیں تھا۔ اتنے فاصلہ پر آواز اس عالم کے اعتبار سے نہیں پہنچ سکتی۔ بلکہ وہ دونوں عالموں کے درمیان کا واقعہ تھا۔

(۵) انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں، اور اولیاء کے خواب صرف خوش خبریاں! یہ فرق درجات کے فرق کی وجہ سے ہے۔ نبی کا درجہ اونچا ہے اس لئے اس کا خواب حجت ہوتا ہے، اور اولیاء کا مقام فروتر ہے، اس لئے ان کے خواب حجت شرعیہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح واقعات ومکاشفات جو انبیاء اور اولیاء کو پیش آتے ہیں، ان کے بھی درجات ہیں۔

حضرت حزقیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے واقعات کا موازنہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجائے گی۔ ہمارے آقا ﷺ کا مرتبہ چونکہ سب سے بڑا ہے، اس لئے آپ کے ساتھ ہم کلامی کا واقعہ فوق السماوات پیش آیا ہے۔

[۱۶] وأُسْرِىَ به إلى المسجد الأقصى، ثم إلى سِدْرة المنتهى، وإلى ماشاء الله:

[الف] وكل ذلك لجسده صلى الله عليه وسلم في اليقظة، ولكن في موطن هو برزخ بين المثال والشهادة، جامعٌ لأحكامهما، فظهر على الجسد أحكامُ الروح، وتمثلَ الروحُ والمعانى الروحيةُ أجسادًا، ولذلك كان لكل واقعة من تلك الوقائع تعبير.

وقد ظهر لحِزْقيل وموسىٰ وغيرهما ـ عليهم السلام ـ نحوٌ من تلك الوقائع، وكذلك لأولياء الأمة، لكنهم على درجاتهم عند الله، كحالهم في الرؤيا، والله أعلم.

ترجمہ: (۱۶) اور آپ ﷺ کو رات میں مسجد اقصیٰ لے جایا گیا، پھر سدرۃ المنتہیٰ تک، اور جہاں تک اللہ نے چاہا:

(الف) اور یہ سب بیداری میں جسم کے ساتھ ہوا، لیکن وہ ایک ایسی جگہ میں ہوا جو عالم مثال اور عالم شہادۃ کے درمیان برزخ ہے، جو دونوں عالموں کے احکام کا سنگم ہے۔ پس جسم پر روح کے احکام ظاہر ہوئے، اور روح اور روحانی باتیں جسموں میں متمثل ہوئیں، اور اسی وجہ سے ان واقعات میں سے ہر واقعہ کے لئے تعبیر تھی ـــــ اور حزقیل اور موسیٰ اور ان کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی اس قسم کے واقعات ظاہر ہوئے ہیں۔ اور اسی طرح اولیاء امت کے لئے بھی۔ لیکن وہ اپنے درجات پر ہوتے ہیں اللہ کے نزدیک، جیسے ان کا حال خواب کے معاملہ میں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

تصحیح: ولذلك كان مطبوعہ میں ولذلك بان تھا۔ اور لكنهم على درجاتهم مطبوعہ میں ليكون علو درجاتهم تھا۔ یہ دونوں اصلاحات مخطوطہ کراچی سے کی ہیں۔

☆ ☆ ☆

واقعاتِ معراج کی حکمتیں

شَقِّ صدر کی وجہ ـــــ معراج میں لے چلنے سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی ﷺ کا سینہ مبارک چیرا، اور اس کو زمزم سے دھویا، پھر وہ سونے کا ایک تھال لائے، جو ایمان وحکمت سے بھرا ہوا تھا، اس کو آپ کے سینے میں انڈیلا، اور سینہ بند کردیا، پھر آپ کا ہاتھ پکڑ کر لے چلے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۶۴)

تشریح: یہ شَقِّ صدر تین مقاصد سے کیا گیا تھا: ایک: اس لئے کہ ملکیت کے انوار غالب آجائیں۔ دوم: اس لئے کہ بہیمیت کے تقاضے ٹھنڈے پڑ جائیں۔ سوم: اس لئے کہ فطرت ان باتوں کی طرف مائل ہوجائے، جن کا بارگاہِ مقدس

سے فیضان کیا جائے گا۔

بُراق پر سوار ہونے کا فائدہ —— پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس براق لایا گیا —— بُراق: بَرق سے ہے، جس کے معنی ہیں: بجلی۔ اس سواری کو بُراق اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے کہا گیا ہے۔ یہ سواری جنت سے لائی گئی تھی —— اور وہ سفید لانبے قد کا ایک چوپایہ تھا۔ گدھے سے کچھ بڑا، اور خچر سے کچھ چھوٹا۔ اور اس کی تیز رفتاری کا حال یہ تھا کہ وہ منتہائے نظر پر قدم رکھتا تھا۔ آپؐ اس پر سوار ہو کر چلے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۶۲)

تشریح: براق پر سواری کا فائدہ بھی وہی ہے جو شق صدر کا ہے۔ شق صدر سے نفس ناطقہ (روح ربانی) کے احکام بہیمیت پر غالب آئے ہیں، اور اس پر قبضہ جمایا ہے۔ اسی طرح براق پر سوار ہونے سے آپؐ کا نفس ناطقہ اس نسمہ (روح حیوانی) پر جم کر بیٹھ گیا جو اصل کمالِ حیوانی ہے، جس کے ساتھ حیاتِ دنیوی وابستہ ہے۔ پس براق پر سواری کی صورت میں آپ ﷺ کو نسمہ پر استیلا (قبضہ) حاصل ہو گیا۔

مسجد اقصی لے جانے کا مقصد —— پہلے آپ ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصی لے جایا گیا۔ آپؐ نے سواری سے اتر کر بُراق کو اس کنڈے سے باندھ دیا جس سے انبیاء بنی اسرائیل اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ پھر آپ مسجد میں تشریف لے گئے، اور تحیۃ المسجد پڑھی (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۵۸۶۳)

تشریح: آپ ﷺ کو پہلے بیت المقدس اس لئے لے جایا گیا کہ وہ بھی شعائر اللہ کے ظہور کی جگہ ہے، ملأاعلی کی خاص توجہات اس گھر سے بھی جڑی رہتی ہیں۔ اور وہ بہت سے انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ پس وہ بھی ملکوت کی طرف ایک روزن ہے۔

فائدہ: اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ دعوتِ ابراہیمی کے دونوں مراکز، اور حضرات انبیاء علیہم السلام کے دونوں قبلے، اب نبی ﷺ کے ماتحت کئے جارہے ہیں۔ اب آپؐ کی نبوت کا فیضان عام ہوگا، اور تمام دینی قیادتیں اور قبلے خاتم النبیین ﷺ کے ماتحت کئے جائیں گے۔ اسی مقصد سے معراج کے اختتام پر آپؐ نے تمام انبیاء کی امامت کی ہے، اور اسی غرض سے ہجرت کے بعد تحویل قبلہ عمل میں آئی ہے۔

انبیاء سے ملاقات، اور ان کی امامت کرنے کی وجہ —— اس میں اختلاف ہے کہ امامتِ انبیاء کا واقعہ کس وقت پیش آیا ہے؟ آسمانوں پر چڑھنے سے پہلے یا معراج کے ختم پر؟ شاہ صاحب قدس سرہ کے نزدیک عروج سے پہلے یہ واقعہ پیش آیا ہے۔ اس لئے آپ نے اس جگہ اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ واقعہ اختتام معراج پر پیش آیا تھا۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں روایاتِ معراج کا خلاصہ لکھا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ”پھر آپؐ بیت المقدس کی طرف واپس تشریف لائے، اور انبیاء کرام بھی آپؐ کے ساتھ اترے۔ اور جب نماز کا وقت ہوا تو آپؐ نے امام بن کر سب کو نماز پڑھائی۔ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ نماز اس دن کی صبح کی نماز ہو۔ اور بعض کا خیال یہ ہے کہ یہ امامت آسمانوں میں فرمائی ہے، حالانکہ بہت سی روایات میں صراحت ہے کہ بیت المقدس میں امامت فرمائی ہے۔

ہاں بعض روایات میں یہ ہے کہ امامتِ انبیاء کا واقعہ آسمانوں پر چڑھنے سے پہلے پیش آیا ہے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ امامت واپسی پر فرمائی ہے۔ کیونکہ آسمانوں پر انبیاء کرام سے ملاقات کے وقت سب انبیاء سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ کا تعارف کرایا ہے، اگر واقعۂ امامت پہلے پیش آچکا ہوتا تو تعارف کی کیا ضرورت تھی؟ اور واقعات کی فطری ترتیب بھی یہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سفر کا اصل مقصد بارگاہِ خداوندی میں حاضری تھا، تاکہ آپؐ پر اور آپؐ کی امت پر جو احکام فرض کئے جانے ہیں: وہ فرض کئے جائیں۔ پھر جب آپؐ اصل کام سے فارغ ہوگئے تو تمام انبیاء مشایعت کے لئے بیت المقدس تک آئے۔ اور جبرئیل امین کے اشارے سے آپؐ کو سب کا امام بنا کر آپؐ کی سیادت وقیادت کا عملی ثبوت پیش کیا گیا''

بہرحال حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ اس موقعہ پر حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے جمع ہونے کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ سب حضرات ایک ہی جماعت ہیں۔ بارگاہِ مقدس میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس خاص تقریب میں سب حضرات جمع ہوگئے۔ اور آپؐ نے جو سب کی امامت فرمائی ہے اس سے ان کمالات کا اظہار مقصود ہے جو آپؐ کو مخصوص طور پر عنایت فرمائے گئے ہیں۔ دوسرے انبیاء کو ان کمالات سے سرفراز نہیں کیا گیا۔

آسمانوں پر یکے بعد دیگرے چڑھنے کی حکمتیں — پھر بیت المقدس سے سیڑھی کے ذریعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام: نبی ﷺ کو لے کر آسمانوں کی طرف چڑھے۔ پہلے آسمان میں آدم علیہ السلام سے، دوسرے میں یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام سے، تیسرے میں یوسف علیہ السلام سے، چوتھے میں ادریس علیہ السلام سے، پانچویں میں ہارون علیہ السلام سے، چھٹے میں موسیٰ علیہ السلام سے، اور ساتویں میں ابراہیم علیہ السلام سے ملاقاتیں اور تعارف ہوا، اور سب نے آپؐ کو خوش آمدید کہا۔ ہر آسمان پر جب یہ حضرات پہنچتے تو حضرت جبرئیل دروازہ کھلواتے۔ اندر سے دریافت کیا جاتا: کون ہے؟ جبرئیل جواب دیتے: میں جبرئیل ہوں۔ پوچھا جاتا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ بتایا جاتا کہ حضرت محمد ﷺ ہیں۔ دریافت کیا جاتا کہ ان کو بلایا گیا ہے؟ جواب دیا جاتا: ہاں بلایا گیا ہے۔ پس دروازہ کھولا جاتا۔ یہاں تک کہ آپؐ ایسے مقام پر پہنچے جہاں کلکِ کرّوبیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی (روایات کا خلاصہ)

تشریح: یکے بعد دیگرے آسمانوں پر چڑھنے میں چند حکمتیں ہیں: (۱) آپ ﷺ بتدریج مہربان اللہ پاک کے مستوی (مقام) کی طرف بلند ہوتے گئے (۲) ان ملائکہ کے احوال سے واقف ہوتے گئے جن کی آسمانوں میں ڈیوٹیاں ہیں (۳) ان بڑے انسانوں (نبیوں) کے احوال سے واقف ہوتے گئے، جو ملائکہ کے ساتھ ملحق کئے گئے ہیں (۴) آپؐ آسمانوں کے نظم وانتظام سے واقف ہوتے گئے (۵) اور اس گفتگو سے بھی واقف ہوئے جو ملأاعلیٰ میں ہو رہی تھی۔

موسیٰ علیہ السلام کے رونے کی وجہ —— چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نبی ﷺ کی ملاقات ہوئی آپؐ نے سلام کیا۔ انھوں نے مرحبا کہا، اور اقرار نبوت کیا۔ البتہ جب آپؐ وہاں سے آگے بڑھے تو وہ رونے

لگے۔ان سے پوچھا گیا: آپ کیوں رورہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: میں اس لئے رورہا ہوں کہ یہ نوجوان جو میرے بعد مبعوث کیا گیا: اس کی امت کے لوگ میری امت کے لوگوں سے بہت زیادہ تعداد میں جنت میں داخل ہوں گے"
(متفق علیہ،مشکوۃ حدیث۵۸۶۲)

تشریح: موسیٰ علیہ السلام کا رونا حسد کی بنا پر نہیں تھا، بلکہ وہ دو باتوں پر حسرت کا پیکر محسوس تھا: ایک: اس بات کی حسرت کہ ان کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا۔دوم: اس بات کی حسرت کہ وہ کچھ کمالاتِ نبوت سے، جن کے وہ درپے تھے،محروم رہ گئے ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ، وَاللّٰهُ ذُوْ الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (سورۃ الجمعہ آیت ۴)

سدرۃ المنتہی کی حقیقت —— ساتویں آسمان کے بعد آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہی (باڈر کی بیری) تک پہنچایا گیا۔ اس پر سونے کے پتنگے اور مختلف رنگوں کے پروانے گر رہے تھے،اور جس کو اللہ کے فرشتوں نے گھیر رکھا تھا۔اوراس پر مقام ہَجَر کے مٹکوں جیسے بڑے بڑے بیر لگے ہوئے تھے۔اوراس کے پتے ہاتھی کے کانوں جتنے بڑے تھے۔پھر جب اس بیری کے درخت پر بحکم الٰہی وہ انوار چھاگئے جو چھاگئے تو اس کا حسن اس قدر دوبالا ہوگیا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس کی خوبصورتی بیان ہی نہیں کرسکتا (حوالہ بالا)

تشریح: سدرۃ المنتہی: وجود کا درخت ہے۔اور وجود کے بعض کا بعض پر ترتب،اور ایک انتظام میں اس کا اکٹھا ہونا ایسا ہے جیسا درخت: قوتِ غاذیہ،قوتِ نامیہ وغیرہ قویٰ میں اکٹھا ہوتا ہے۔

وضاحت: وجود دو ہیں: ایک خالق تعالیٰ کا وجود،دوسرا مخلوق کا وجود۔اللہ تعالیٰ کا وجود تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدیمہ ہے، اور مخلوقات کا وجود حادث ومخلوق ہے۔یہ وجود ایک امرِ منبسط (پھیلی ہوئی چیز) ہے اور امر واحد ہے۔اس میں تقطیعات ہوکر مخلوقات وجود میں آتی ہیں۔جیسے سورج کی روشنی ایک امر منبسط ہے۔جب وہ روشندان سے گذر کر گھر میں آتی ہے تو اس کی ایک خاص شکل پیدا ہوتی ہے۔اسی طرح موجوداتِ خارجیہ وجود پذیر ہوتی ہیں۔سدرۃ المنتہی کی صورت میں وہی وجود مخلوق دکھایا گیا ہے، چنانچہ اس سے کوئی موجود آگے نہیں جاسکتا۔اس وجود مخلوق کا بعض بعض پر مرتب ہے اور وہ سارا وجود ایک انتظام کے ماتحت ہے۔جیسے درخت کے سارے قویٰ ایک نظام کے تحت کام کرتے ہیں۔

سوال: اس وجودِ مخلوق کو کسی حیوان (جاندار) کی صورت میں کیوں نہیں دکھایا گیا؟ وجود سے اقرب تو حیوان (جاندار مخلوق) ہے،درخت (جسم نامی) سے تو اس کی مشابہت دور کی ہے!

جواب: وجود کو درخت کی شکل میں اس لئے دکھایا گیا ہے،اور حیوان کی شکل میں اس لئے نہیں دکھایا گیا کہ کلی اجمالی انتظام سے، جو اس جنس عالی کے انتظام سے مشابہ ہے جس کے افراد بھی کلی ہیں،قریب ترین مشابہت درخت ہی کی ہے،حیوان سے اتنی قریبی مشابہت نہیں۔حیوان میں اتنا اجمال نہیں جتنا درخت میں ہے۔کیونکہ حیوان میں قویٰ تفصیلیہ ہیں،حتی کہ اس کا ارادہ بھی فطری طور پر ایک علحدہ چیز ہے۔

وضاحت: نوع کے افراد جزئیات ہوتے ہیں۔ جیسے انسان کے افراد زید، عمر، بکر جزئیات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا انتظام الگ ہے۔ اور جنس کے افراد کلیات ہوتے ہیں۔ جیسے حیوان کے افراد انسان، فرس، بقر، غنم انواع ہیں جو کلیات ہیں۔ اور کلی ایک انتظام کے تحت ہوتی ہے۔ اور جنس الاجناس وجود ہے، پس اس کے تمام افراد کا انتظام بھی ایک ہے۔ اور کلی سے اجمالی انتظام میں قریب ترین مشابہ چیز درخت ہے، حیوان کو یہ مشابہت حاصل نہیں۔ کیونکہ حیوان میں قوی تفصیلیہ ہیں۔ حتی کہ حیوان کا ارادہ بھی ایک الگ چیز ہے، چنانچہ شجرۂ الکون کو حیوان کی شکل میں متشکل کرنے کے بجائے درخت کی شکل میں متشکل کیا گیا۔

نہروں کی حقیقت — نبی ﷺ نے سدرۃ المنتہی کی جڑ میں چار نہریں دیکھیں۔ دو باطنی اور دو ظاہری۔ آپؐ نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا: یہ کیا ہیں؟ جبریل نے بتایا: جو دو اندر کی طرف بہ رہی ہیں وہ جنت میں جارہی ہیں، اور جو دو باہر کی طرف بہ رہی ہیں: وہ دریائے نیل اور دریائے فرات ہیں (حوالہ بالا)

تشریح: یہ نہریں اُس رحمت کی تمثیل ہیں جس کا ملکوت میں فیضان ہورہا ہے، اور حیات اور بالیدگی کا پیکر محسوس ہیں۔ چنانچہ نیل وفرات بھی وہاں متمثل ہوئے جو اس عالم شہادۃ میں مفید ہیں۔

فائدہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت اسی وجودِ مخلوق کا حصہ ہے۔ جیسا کہ عالم شہادۃ اسی وجود کا حصہ ہے۔

انوار کی حقیقت — اور سدرۃ المنتہی کو جن انوار نے ڈھانک رکھا تھا: وہ تجلیاتِ ربانیہ اور تدبیراتِ الٰہیہ تھیں، جو عالم شہادۃ میں چمکیں جہاں ان کی استعداد پیدا ہوئی۔

بیتِ معمور کی حقیقت — پھر نبی ﷺ کو بیتِ معمور (عبادت سے آباد گھر) دکھایا گیا۔ اس گھر میں روزانہ ستر ہزار فرشتے عبادت کے لئے داخل ہوتے ہیں، پھر قیامت تک ان کا نمبر نہیں آتا (مشکوۃ حدیث ۵۸۶۳)

تشریح: جس طرح دنیا میں کعبہ شریف تجلیاتِ ربانیہ کی جلوہ گاہ ہے، جس کی طرف انسانوں کے سجدے (نمازیں) اور ان کے تضرعات (دعائیں) متوجہ ہوتے ہیں، اسی طرح آسمانوں میں اللہ کا یہ گھر ہے، جو کعبہ شریف کے بالمقابل واقع ہے، ملائکہ کی عبادتیں اور دعائیں اس گھر کی طرف متوجہ رہتی ہیں۔

دودھ اور شراب کا پیش کیا جانا، اور آپؐ کا دودھ کو اختیار کرنا — پھر آپ ﷺ کے سامنے دودھ اور شراب کے دو جام پیش کئے گئے، آپؐ نے دودھ اختیار فرمایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: ''آپؐ کی فطرت کی طرف راہ نمائی کی گئی، اگر آپؐ شراب اختیار کرتے تو آپؐ کی امت گمراہ ہوجاتی'' (بخاری حدیث ۳۳۹۴)

تشریح: دودھ: فطرت (دین اسلام) کا اور شراب لذاتِ دنیا کا پیکر محسوس تھی۔ اور آپ ﷺ نے دودھ اختیار فرما کر امت کو دین اسلام پر جمع کردیا، اور آپؐ اُن کے ظہور وغلبہ کا منشا بن گئے۔

پانچ نمازیں درحقیقت پچاس نمازیں ہیں — پھر جب آپ ﷺ بارگاہِ خداوندی میں پہنچے تو اللہ کو جو وحی فرمانی

تھی: وہ فرمائی، اور پچاس نمازیں فرض کیں۔ جب آپ اتر کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرے تو انھوں نے پوچھا: اللہ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا؟ آپ نے بتایا: پچاس نمازیں! موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: آپ کی امت پچاس نمازیں نہیں پڑھ سکے گی، میں بنی اسرائیل کا تجربہ کر چکا ہوں، آپ واپس جائیں، اور تخفیف کی درخواست کریں۔ چنانچہ آپ واپس گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں کم کردیں۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بار بار واپس بھیجتے رہے، اور پانچ پانچ نمازیں کم ہوتی رہیں۔ آخری بار بھی موسیٰ علیہ السلام نے تخفیف کی درخواست کرنے کا مشورہ دیا، مگر آپ ﷺ نے فرمایا: "اب مجھے پروردگار سے شرم محسوس ہورہی ہے، میں اس پر راضی ہوں" جب آپ وہاں سے آگے بڑھے تو اللہ پاک نے پکارا: "اے محمد! یہ شب وروز میں پانچ نمازیں ہیں، اور ہر نماز کا دس گنا بدلہ ہے، پس مجموعہ پچاس ہوگیا" (مسلم شریف ۲: ۲۰۹ کتاب الایمان)

تشریح: معراج میں جو نبی ﷺ کو آخر میں پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا تھا: وہ مجاز تھا۔ حقیقت میں ثواب کے اعتبار سے وہ پچاس نمازیں تھیں۔ چنانچہ تدریجاً اللہ پاک نے اپنی مراد واضح فرمائی تاکہ آپ جان لیں کہ اللہ نے دشواری ختم کردی، اور نعمت مکمل کردی۔ اور موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ کی صورت میں یہ بات اس لئے متمثل ہوئی کہ ان کو بنی اسرائیل کا خوب تجربہ تھا۔ جتنی انھوں نے بنی اسرائیل کی چارہ سازی کی ہے کسی نے نہیں کی، اور جتنے انھوں نے اپنی امت کے نظم وانتظام میں پاپڑ بیلے ہیں کسی نے نہیں بیلے۔ اور تجربہ کار آدمی مشورہ دیتا ہے تو لمحۂ فکریہ پیدا ہوتا ہے، دوسرا کوئی مشورہ دیتا تو شاید آپ ﷺ تخفیف کی درخواست نہ کرتے۔

[ب] أما شق الصدر ومَلْؤُه إيمانا: فحقيقته: غلبةُ أنوارِ الملكية، وانطفاءُ لَهَبِ الطبيعة، وخضوعُها لما يَفيض عليها من حظيرة القدس.

[ج] وأما ركوبُه على البراق: فحقيقته: استواء نفسه النطقية على نسمته اللتي هي الكمالُ الحيواني، فاستوى راكبا على البراق، كما غلبت أحكامُ نفسِه النطقية على البهيمية، وتسلَّطت عليها.

[د] وأما إسراؤه إلى المسجد الأقصى: فلأنه محلُّ ظهورِ شعائر الله، ومتعلَّقُ هِمَمِ الملأ الأعلى، ومَطْمَحُ أنظارِ الأنبياء عليهم السلام، فكأنه كُوَّةٌ إلى الملكوت.

[هـ] وأما ملاقاتُه مع الأنبياء صلوات الله عليهم، ومفاخرتُه معهم: فحقيقتها: اجتماعُهم من حيث ارتباطهم بحظيرة القدس، وظهورُ ما اختُصَّ به من بينهم من وجوه الكمال.

[و] وأما رَقْيُه إلى السماوات: سماءً بعد سماء: فحقيقته: الانسلاخ إلى مستوى الرحمن: منزلةً بعد منزلة، ومعرفةُ حال الملائكة المؤكلة بها، ومن لحق بهم من أفاضل البشر، والتدبيرِ الذى أوحاه الله فيها، والاختصام الذى يحصل فى مَلَئِها.

[ز] وأما بُكاء موسى: فليس بحسد، ولكنه مثال لفقده عمومَ الدعوة، وبقاءَ كمال لم

يحصِّله،مما هو في وجهه.

[ح] وأما سدرة المنتهى: فشجرةُ الكون: وترتبُ بعضِها على بعضٍ، وانجماعُها في تدبير واحد كانجماع الشجرة في الغاذية والنامية ونحوهما.

ولم تتمثل حيوانا: لأن التدبير الجُمَليَّ الإجماليَّ الشبيهَ بسياسة الكلي أفرادَه: إنما أشبهُ الأشياءِ به الشجرةُ، دون الحيوان: فإن الحيوان فيه قوى تفصيلية، والإرادةُ فيه أصرحُ من سُنن الطبيعة.

[ط] وأما الأنهار في أصلها: فرحمة فائضة في الملكوت حَذْوَ الشهادة، وحياةٌ، وإنماءٌ؛ فلذلك تعين هنالك بعض الأمور النافعة في الشهادة، كالنيل والفرات.

[ى] وأما الأنوار التي غَشِيَتْها: فتدليات إلٰهية، وتدبيرات رحمانية: تَلَعْلَعَتْ في الشهادة حيثما استعدت لها.

[ك] وأما البيت المعمور: فحقيقته: التجلي الإلٰهي الذي تتوجه إليه سَجَدَاتُ البشر وتَضَرُّعَاتُهم: تمثَّلَ بيتا على حَذْوِ ما عندهم من الكعبة وبيت المقدس.

[ل] ثم أُتي بإناء من لبن وإناءٍ من خمر، فاختار اللبن، فقال جبريل: "هديتَ للفطرة، ولو أخذتَ الخمر لَغَوَتْ أمتُك!" فكان هو صلى الله عليه وسلم جامعَ أمته، ومنشأَ ظهورِهم، وكان اللبنُ اختيارَهم الفطرةَ، والخَمْرُ اختيارَهم لذَّاتِ الدنيا.

[م] وأُمر بخمس صلوات: بلسان التجَوُّز، لأنها خمسون باعتبار الثواب، ثم أوضح الله مراده تدريجًا، ليعلم أن الحرج مدفوع، وأن النعمة كاملة،وتمثل هذا المعنى مستَنَداً إلى موسىٰ عليه السلام، فإنه أكثر الأنبياء معالجةً للأمة ومعرفةً بسياستها.

ترجمہ:(ب) رہا شقِ صدر،اوراس کوایمان سے بھرنا: تواس کی حقیقت: ملکیت کے انوار کا غلبہ،اورطبیعت کی لپٹوں کا بجھنا،اورطبیعت کا جھکنا ہے،اس چیز کی طرف جس کا حظیرۃ القدس سے طبیعت پر فیضان ہوگا —— (ج)اوررہا آپؐ کا براق پرسوار ہونا: تواس کی حقیقت: آپؐ کے نفس ناطقہ کا استیلاء ہے،آپؐ کے اس نسمہ پر جو کہ وہی کمالِ حیوانی ہے۔پس آپؐ نے قبضہ کیا براق پرسوار ہونے کی صورت میں،جس طرح آپؐ کے نفس ناطقہ کے احکام غالب ہوئے بہیمیت پر،اوراس پر قبضہ جمایا —— (د)اوررہا آپؐ کورات میں مسجد اقصیٰ لے جانا: تواس لئے تھا کہ وہ شعائر اللہ کے ظہور کی جگہ ہے،اور ملأ اعلیٰ کی خاص توجہات کے جُڑنے کی جگہ ہے،اور انبیاء کی نظروں کے گرنے کی جگہ ہے،پس گویا وہ ملکوت کی طرف ایک روزن ہے —— (ہ)اوررہا آپؐ کا انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کرنا،اور(امام بن کر)ان کے مقابلہ میں اپنی برتری ثابت کرنا: تواس کی حقیقت: ان کا جمع ہونا ہے،ان کے حظیرۃ القدس کے ساتھ ایک دوسرے سے جڑے ہونے کی وجہ

سے (یہ ملاقات کی وجہ ہے) اور ان وجوہ کمال کا ظہور ہے جن کے ساتھ آپؐ خاص کئے گئے ہیں انبیاء کے درمیان میں سے (یہ برتری ثابت کرنے کی وجہ سے) ـــــ (و) اور رہا آپؐ کا آسمانوں کی طرف چڑھنا، یکے بعد دیگرے یعنی بتدریج: تو اس کی حقیقت: (۱) مہربان اللہ کے مستوی (مقام) کی طرف درجہ بدرجہ یعنی بتدریج الگ ہونا ہے یعنی ترقی کرنا ہے (۲) اور ان ملائکہ کے حال کو جاننا ہے جو آسمانوں پر مؤکل ہیں (۳) اور ان بڑے انسانوں (انبیاء) کا حال جاننا ہے جو ان (ملائکہ) کے ساتھ ملے ہوئے ہیں (۴) اور اس انتظام کو جاننا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں وحی کیا ہے (۵) اور اس بحث (گفتگو) کو جاننا ہے جو ان (ملائکہ) کے اکابر میں ہوتی ہے ـــــ (ز) اور رہا موسیٰ علیہ السلام کا رونا: تو وہ جلنا نہیں ہے، بلکہ وہ تمثیل ہے: (۱) آپؐ کے عموم دعوت کو گم کرنے کی (۲) اور ایسے کمال کے باقی رہ جانے کی جو آپؐ کو حاصل نہیں ہوا، ان کمالات میں سے جن کے درپے آپؐ تھے ـــــ (ح) اور رہی باڑ کی بیری: تو وہ وجود کا درخت ہے۔ اور اس وجود کے بعض کا بعض پر ترتب، اور اس کا ایک انتظام میں اکٹھا ہونا ایسا ہے جیسا درخت کا اکٹھا ہونا قوت غاذیہ اور قوت نامیہ اور ان دونوں کے مانند میں ـــــ (سوال کا جواب) اور یہ شجرۃ الکون کسی حیوان کی صورت میں متشکل نہیں کیا گیا: اس لئے کہ کلی اجمالی انتظام جو اس چیز کے انتظام کے مشابہ ہے جس کے افراد کلی ہیں: چیزوں میں سے اس کے ساتھ مشابہ ترین درخت ہے، نہ کہ حیوان۔ کیونکہ حیوان میں قُویٰ تفصیلیہ ہیں، اور ارادہ حیوان میں فطرت کی راہوں سے زیادہ واضح ہے یعنی وہ بالکل فطری امر اور حیوان سے بالکلیہ متحد نہیں ہے ـــــ (ط) اور رہیں سدرۃ کی جڑ میں نہریں: تو وہ وہ رحمت ہے، اور حیات اور بالیدگی ہے جن کا ملکوت میں فیضان ہو رہا ہے، عالم شہادۃ کے مقابلہ میں۔ پس اسی وجہ سے وہاں بعض وہ امور متعین ہوئے جو عالم شہادۃ میں مفید ہیں، جیسے نیل و فرات ـــــ (ی) اور رہے وہ انوار جنھوں نے اس درخت کو ڈھانک رکھا ہے: وہ تجلیاتِ الٰہیہ اور تدبیرات رحمانیہ ہیں۔ وہ عالم شہادۃ میں چمکتی ہیں جہاں ان کی استعداد پیدا ہوتی ہے ـــــ (ک) اور رہا بیتِ معمور: تو اس کی حقیقت: وہ تجلی ربانی ہے جس کی طرف انسانوں کے سجدے اور ان کے تضرعات متوجہ ہوتے ہیں، وہ گھر کی صورت میں متشکل ہوئی ہے اس کعبہ اور بیت المقدس کے بالمقابل جو بشر کے پاس ہیں (بیت معمور کعبہ شریف کے بالمقابل واقع ہے، شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جو بیت المقدس کو بھی ساتھ ملایا ہے: اس کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں) ـــــ (ل) پھر آپؐ کے پاس ایک برتن دودھ کا، اور ایک برتن شراب کا لایا گیا، پس آپؐ نے دودھ اختیار فرمایا۔ پس جبرئیل نے کہا: ''فطرت کی طرف آپؐ کی راہ نمائی کی گئی، اور اگر آپؐ شراب کو اختیار کرتے تو آپؐ کی امت گمراہ ہو جاتی'' پس آپ ﷺ اپنی امت کو اکٹھا کرنے والے اور ان کے ظہور و غلبہ کا منشا ہیں یعنی آپؐ کے دودھ کو اختیار کرنے کی وجہ سے سب امت ہدایت پر مجتمع رہی، ان میں گمراہی نے راہ نہیں بنائی، اور امت اپنی اجتماعیت کی بنا پر تمام ادیان پر غالب آئی۔ اور دودھ امت کا فطرت کو اختیار کرنا، اور شراب ان کا دنیا کی لذتوں کو اختیار کرنا ہے یعنی دودھ اور شراب: امت کی ہدایت اور گمراہی کی تمثیل تھی ـــــ (م) اور آپؐ کو پانچ نمازوں کا حکم دیا گیا: زبانِ مجاز میں، اس لئے کہ وہ ثواب

کے اعتبار سے پچاس ہیں۔ پھر بتدریج اللہ نے اپنی مراد واضح فرمائی، تاکہ آپؐ جان لیں کہ تنگی اٹھائی ہوئی ہے، اور یہ کہ نعمت کامل ہے یعنی نمازیں کم ہو کرامت کے لئے سہولت ہوگئی، اور پچاس نمازوں کا ثواب مل کر نعمتِ الٰہی کامل ہوئی —— اور متمثل ہوئی یہ بات موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرکے: اس لئے کہ وہ انبیاء میں زیادہ ہیں امت کی چارہ سازی کے اعتبار سے، اور امت کے نظم وانتظام کو جاننے کے اعتبار سے۔

ترکیب: (د) میں من لحق، التدبیر اور الاختصام کا عطف الملائکۃ پر ہے —— (ح) میں ترتب اور انجماع مل کر مبتدا ہیں، اور کانجماع محذوف سے متعلق ہو کر خبر ہے: قاعدہ سے کتر تب وانجماع کہنا چاہئے تھا، مگر مابعد سے ترتب کا جوڑ نہیں تھا، اس لئے خبر میں اس کو چھوڑ دیا —— قولہ: لأن التدبیر الجملی إلخ میں الجملی، الإجمالی، الشبیہ صفتیں ہیں التدبیر کی، اور موصوف مع صفات أن کا اسم ہے۔ اور بسیاسۃ متعلق ہے الشبیہ سے۔ اور الکلی خبر مقدم اور افرادہ مبتدا مؤخر ہے، پھر جملہ مضاف الیہ ہے سیاسۃ کا، اور جملہ إنما أشبہ إلخ أن کی خبر ہے —— إنما سے پہلے مطبوعہ میں واو تھا، اس کو حذف کیا گیا ہے، یہ تصحیح مخطوطہ کراچی سے کی ہے —— (ط) میں حیاۃ اور إنماء کا رحمۃ پر عطف ہے۔

☆ ☆ ☆

ہجرتِ مدینہ اور ظہور معجزات

پھر نبی ﷺ نے عرب کے مختلف قبائل سے رابطہ قائم کیا، ان کو اسلام کی دعوت دی، اور ان سے چاہا کہ وہ آپؐ کو اپنے یہاں لے جائیں، اور آپؐ کی ہر طرح سے نصرت وحمایت کریں۔ مگر صدائے برنخواست۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت انصار کے لئے مقدر کی تھی۔ چنانچہ نبوت کے گیارہویں سال موسم حج میں یثرب کے چھ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ اور وعدہ کیا کہ وہ لوٹ کر دینِ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیں گے۔ چنانچہ اگلے سال موسم حج میں بارہ آدمی آئے، اور انھوں نے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت عَقَبہ اُولیٰ کہلاتی ہے۔ نبی ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مُصعب بن عُمیر رضی اللہ عنہ کو داعی بنا کر روانہ کیا۔ اللہ نے ان کے کام میں برکت فرمائی۔ اور نبوت کے تیرہویں سال ستر سے زیادہ مسلمان آئے۔ اور انھوں نے ۱۲ ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کے قریب کی گھاٹی میں رات کے وقت آپؐ سے بیعت کی۔ یہ بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے۔ اس موقع پر ان حضرات نے نبی ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی، اور ہر طرح سے نصرت وحمایت کا وعدہ کیا۔ آپؐ نے ان میں سے بارہ نقیب (سردار) مقرر کئے، جن کی دعوت سے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام پہنچ گیا۔ اِدھر نبی ﷺ کو شرح صدر ہوگیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ پر یہ بات واضح کردی کہ اسلام کی سربلندی ہجرتِ مدینہ ہی سے ہوسکتی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ہجرت کا پختہ ارادہ کرلیا۔ اور مسلمانوں نے آپؐ کے حکم سے مدینہ کی طرف ہجرت شروع کردی۔

جب قریش کے علم میں یہ بات آئی تو وہ غصہ سے پھٹ پڑے۔ فوراً دار الندوہ میں اجلاس بلایا، اور نبی ﷺ کے معاملہ میں بحث شروع کی۔ پہلے ابوالاسود نے تجویز رکھی کہ آپ کو شہر بدر کردیا جائے۔ ابلیس نے ـــ جو شیخ نجدی کی صورت میں شریک محفل تھا ـــ کہا: یہ مسئلہ کا حل نہیں۔ یہ شخص دوسرے قبائل میں جاکر اپنے ہمنوا بنالے گا، پھر وہ تمہارے لئے درد سر بن جائے گا۔ دوسری تجویز ابوالبختری نے پیش کی کہ اسے لوہے کی بیڑیوں میں جکڑ کر قید کردیا جائے۔ ابلیس نے کہا: اس کی خبر اس کے حمایتوں کو ہوجائے گی، اور وہ دھاوا بول دیں گے اور چھڑالے جائیں گے۔ تیسری تجویز فرعونِ امت ابوجہل نے پیش کی کہ ہر قبیلہ سے ایک مضبوط آدمی منتخب کیا جائے، اور سب مل کر یکبارگی وار کریں، اور قصہ نمٹادیں۔ ابلیس نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اور اس مجرمانہ تجویز پر سب نے اتفاق کرلیا۔

سفر ہجرت میں متعدد معجزات ظاہر ہوئے ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے محبوب بندے اور مبارک ہستی تھے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے غلبہ کا فیصلہ فرمایا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ہر طرح سے حفاظت فرمائی۔ چند معجزات درج ذیل ہیں:

پہلا معجزہ: جو سب سے اہم معجزہ ہے: وہ یہ ہے کہ جب دار الندوۃ میں مذکورہ مجرمانہ قرارداد پاس ہوگئی تو حضرت جبرئیل علیہ السلام خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ اور قریش کی سازش سے آپ کو آگاہ کیا،، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کی اجازت دی۔ اور وقت کی تعیین بھی کردی کہ اسی رات نکل جانا ہے۔ ادھر کفار نے تجویز طے ہونے کے بعد سارا دن تیاری میں گذارا۔ اور جب رات آئی تو گیارہ مجرمین نے خانۂ مبارک گھیرلیا۔ آپ باہر تشریف لائے، اور ان کے سروں پر سنگریزوں والی مٹی ڈالتے ہوئے صاف بچ کر نکل گئے۔ وہ لوگ صبح تک وہیں پڑے رہے۔ جب صبح حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے بستر سے اٹھے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ صحیح ہے: اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہیں۔ ان کے ہاتھ میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے، وہ جسے بچانا چاہیں اس کا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا (یہ معجزہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے ذکر نہیں کیا)

دوسرا معجزہ: جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار ثور پر پہنچے، تو ابوبکرؓ نے کہا: یارسول اللہ! ابھی آپ غار میں داخل نہ ہوں۔ پہلے میں داخل ہوکر دیکھ لیتا ہوں۔ ابوبکرؓ داخل ہوئے، اور غار کو صاف کیا۔ ایک جانب چند سوراخ تھے، آپؓ نے اپنا تہبند پھاڑ کر ان کو بند کیا۔ لیکن دو سوراخ بچ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں کو اپنے پاؤں سے بند کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو اندر بلایا۔ آپ اندر تشریف لے جاکر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آغوش میں سر رکھ کر سوگئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا، مگر وہ اس ڈر سے نہیں ہلے کہ آپ جاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر ٹپک پڑے۔ آپ کی آنکھ کھل گئی۔ دریافت کیا: کیا بات ہے؟ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ آپ نے اس پر لعاب دہن لگادیا، اور فوراً تکلیف جاتی رہی

(رواہ رزین، مشکوۃ حدیث ۶۰۲۵)



تیسرا معجزہ: جب تلاش کرنے والے غار کے دہانے تک پہنچے، اور وہ ان کے سروں پر کھڑے ہوئے، اور ان کے پاؤں نظر آنے لگے، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر ان میں سے کوئی اپنے پیروں کی طرف دیکھے گا تو ہمیں دیکھ لے گا! آپؐ نے فرمایا: ''ابوبکر! تمہارا کیا خیال ہے ان دو کے بارے میں جن کا تیسرا اللہ ہے!'' یہ ایک معجزہ تھا، اللہ نے ان کی آنکھیں اندھی کردیں، اور ان کی سوچیں پھیردیں۔ انھوں نے دیکھا کہ غار کے منہ پر مکڑی کا جالا ہے، وہ یہ دیکھ کر واپس پلٹ گئے، حالانکہ چند قدم سے زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا تھا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۶۸ وحدیث ۵۹۳۴)

چوتھا معجزہ: راستہ میں سُراقہ بن مالک نے تعاقب کیا۔ جب وہ قریب پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے لئے بددعا کی۔ فوراً گھوڑا پیٹ تک سخت زمین میں دھنس گیا۔ اس نے کہا: تم دونوں نے میرے لئے بددعا کی ہے، اب میری خلاصی کی دعا کرو، میں تلاش کرنے والوں کو پھیردونگا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے اس کے لئے دعا فرمائی، اور وہ بچ گیا۔ اور واپس لوٹ گیا۔ راستہ میں جوملتا اس سے کہتا: یہاں تمہارا جو کام تھا وہ کیا جاچکا ہے۔ اس طرح لوگوں کو واپس لے گیا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۶۹)

پانچواں معجزہ: اسی سفر میں آپ ﷺ کا گذر ام مَعبد خزاعیہ کے خیمہ سے ہوا۔ آپؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، ان کا غلام عامر بن فُہیرہ اور گائڈ عبداللہ لیثی تھے۔ آپؐ نے ام معبد سے دریافت کیا: تمہارے پاس گوشت اور کھجوریں ہیں، تاکہ ان کو خریدیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے خیمہ کے ایک گوشہ میں بکری دیکھی۔ پوچھا: ام معبد! یہ کیسی بکری ہے؟ بولیں: اسے کمزوری نے ریوڑ سے پیچھے چھوڑ رکھا ہے۔ آپؐ نے پوچھا: اس میں کچھ دودھ ہے؟ بولیں: وہ اس سے کہیں زیادہ کمزور ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اجازت ہوتو میں اسے دوہ لوں؟ کہنے لگیں: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! اگر تمہیں اس میں دودھ دکھائی دے رہا ہو تو دوہ لو۔ آپؐ نے بکری کے تھن پر ہاتھ پھیرا، بکری نے پاؤں پھیلادیئے، اور تھن بھر گئے۔ آپؐ نے ایک بڑا برتن لیا، جو ایک جماعت کو آسودہ کرسکتا تھا، اور اس میں اتنا دوہا کہ جھاگ اوپر آگیا۔ پھر پہلے ام معبد کو پلایا، پھر ساتھیوں کو اور آخر میں خود پیا، پھر دوبارہ اسی برتن میں اتنا دودھ دوہا کہ برتن بھر گیا، اور اسے ام معبد کے پاس چھوڑ کر آگے چل پڑے (مشکوۃ حدیث ۵۹۴۳)

چھٹا معجزہ: جب نبی ﷺ مدینہ پہنچے تو حضرت عبداللہ بن سلام آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور کہا: میں آپؐ سے ایسی تین باتیں پوچھتا ہوں جن کو نبی ہی جانتا ہے: (۱) قیامت کی سب سے پہلی نشانی کیا ہے؟ (۲) جنتیوں کو سب سے پہلے کیا کھانا دیا جائے گا (۳) بچے کی باپ سے یا ماں سے مشابہت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ باتیں ابھی مجھے جبرئیل نے بتائی ہیں: (۱) قیامت کی پہلی نشانی ایسی آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے مغرب کی طرف جمع کرے گی (۲) اور جنتیوں کا پہلا کھانا: مچھلی کے جگر کا بڑھا ہوا حصہ ہے (۳) اور جب آدمی کا مادّہ قوی ہوتا ہے تو اس سے مشابہت پیدا ہوتی ہے، اور جب عورت کا قوی ہوتا ہے، تو اس سے مشابہت ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے یہ جواب سن کر فوراً اسلام قبول کیا۔ اور عرض کیا: یارسول اللہ! یہود بہتان تراش قوم ہے۔ اس سے پہلے کہ میرا اسلام ظاہر ہو، آپؐ میرے

بارے میں یہود سے معلوم کرلیں۔ چنانچہ جب یہود کے دیگر بڑے علماء ملنے آئے تو آپؐ نے پوچھا: تم میں عبداللہ کا کیا مقام ہے؟ کہنے لگے: ہم میں بہتر ہیں، ان کے والد بھی ہم میں بہتر تھے، وہ ہمارے سردار ہیں، اور وہ ہمارے سردار کے بیٹے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''بتاؤ اگر عبداللہ بن سلام ایمان لے آئیں تو؟'' کہنے لگے: اللہ تعالیٰ ان کو اس سے محفوظ رکھیں! فوراً ہی حضرت عبداللہ نکلے، اور کلمۂ شہادت پڑھا۔ کہنے لگے: ہم میں بدتر، اور بدتر کا بیٹا! حضرت عبداللہ نے کہا: یارسول اللہ! مجھے اسی کا اندیشہ تھا (رواہ البخاری مشکوٰۃ حدیث ۵۸۷۰)

[۱۷] ثم كان النبي صلى الله عليه وسلم يَسْتَنْجِدُ من أحياء العرب، فَوُفِّقَ الأنصارُ لذلك، فبايعوه بيعةَ العَقَبَةِ: الأولى والثانية، ودخل الإسلام كلَّ دار من دُوْرِ المدينة، وأوضح الله على نبيه أن ارتفاعَ دينه في الهجرة إلى المدينة، فأجمعَ عليها، وأزداد غيظُ قريش، فمكروا به ليقتلوه، أو يُثبتوه، أو يخرجوه.

فظهرت آياتٌ لكونه محبوبا مباركا مَقْضِيًّا له بالغلبة:

[الف] فلما دخل هو وأبوبكر الصديقُ — رضي الله عنه — الغارَ، لُدِغَ أبوبكر رضي الله عنه فَتَفَلَ النبي صلى الله عليه وسلم، فَشُفِيَ من ساعته.

[ب] ولما وقف الكفارُ على رأسِ الغار، أعْمَى الله أبصارَهم، وصرف عنه أفكارَهم.

[ج] ولما أدركهما سُراقةُ بنُ مالك: دعا عليه، فارْتَطَمَتْ به فرسُه إلى بطنها في جَلَدٍ من الأرض، بأن انْخَسَفَتِ الأرضُ بتقريب من الله، فَتَكَفَّل بالردِّ عنهما.

[د] ولما مَرُّوا بخيمة أم معبد دَرَّتْ له شاةٌ، لم تكن من شياه الدَّرِّ.

[هـ] و لما قَدِمَا المدينةَ، جاءه عبد الله بن سلام، فسأله عن ثلاث لايعلمهن إلا نبي: فما أولُ أشراط الساعة؟ وما أولُ طعام أهل الجنة؟ وما يَنْزِعُ الولدَ إلى أبيه، أو إلى أمه؟ قال صلى الله عليه وسلم:" أما أول أشراط الساعة: فنارٌ تَحْشُرُ الناسَ من المشرق إلى المغرب، وأما أول طعام يأكله أهل الجنة: فزيادةُ كَبِدِحوتٍ، وإذا سبق ماءُ الرجل ماءَ المرأة نزع الولد، وإذا سبق ماءُ المرأة نزعت" فأسلم عبد الله، وكان إفحامًا لأحبار اليهود.

ترجمہ: (۱۷) پھر نبی ﷺ قبائل عرب سے طاقت حاصل کیا کرتے تھے۔ پس انصار اس کی توفیق دیئے گئے، پس انھوں نے آپؐ سے بیعتِ عقبہ اولی اور ثانیہ کی۔ اور اسلام مدینہ کے گھروں میں سے ہر گھر میں پہنچ گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ بات واضح کی کہ آپؐ کے دین کی سربلندی مدینہ کی طرف ہجرت میں ہے۔ پس آپؐ نے اس کا پختہ ارادہ

کرلیا۔ اور قریش کا غصہ بڑھ گیا۔ پس انھوں نے آپؐ کے بارے میں اسکیم بنائی، تاکہ وہ آپؐ کو قتل کردیں، یا قید کردیں، یا وطن سے نکال دیں (سورۃ الانفال آیت ۳۰) پس نشانیاں ظاہر ہوئیں آپؐ کے محبوب و مبارک ہونے کی وجہ سے، اور آپؐ کے لئے غلبہ کا فیصلہ ہونے کی وجہ سے —— (الف) پس جب آپؐ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار میں داخل ہوئے تو ابوبکرؓ کو کسی چیز نے ڈس لیا، پس اس پر نبی ﷺ نے لعاب لگایا، پس انھوں نے اسی وقت شفا پائی —— (ب) اور جب کفار غار کے سر پر کھڑے ہوئے تو اللہ نے ان کی آنکھیں اندھی کردیں، اور آپؐ سے ان کی سوچ پھیر دی —— (ج) اور جب ان دونوں کو سراقہ بن مالک نے آلیا، تو آپؐ نے اس کے لئے بددعا کی، پس اس کے ساتھ اس کا گھوڑا اپنے پیٹ تک سخت زمین میں دھنس گیا: بایں طور کہ زمین ڈِھ گئی اللہ کی تقریب سے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کا کوئی خفیہ سبب بنایا۔ پس وہ دونوں سے طلب کو پھیرنے کا ذمہ دار بن گیا —— (د) اور جب وہ لوگ ام معبد کے خیمے پر گذرے تو آپؐ کے لئے دودھ دیا ایک ایسی بکری نے جو دودھ کی بکریوں میں سے نہیں تھی —— (ھ)...... پس عبداللہ نے اسلام قبول کیا، اور وہ اسلام لانا یہود کے بڑے علماء کو ساکت و لاجواب کرنے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

ہجرت کے فوراً بعد پانچ اہم کام

نبی ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد پانچ اہم کام انجام دیئے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

پہلا کام —— یہود کے ساتھ معاہدہ —— مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔ مشرکین سے زیادہ خطرہ نہیں تھا، کیونکہ مسلمان انہی قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر یہود مسلمانوں سے عداوت رکھتے تھے، اس لئے ان کے شر کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جس سے ان کے شر سے حفاظت ہوگئی (اس معاہدہ کی دفعات سیرت ابن ہشام میں ہیں)

دوسرا کام —— مسجد نبوی کی تعمیر —— مدینہ میں فروکش ہوتے ہی نبی ﷺ نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مسجد نبوی کی تعمیر شروع کردی۔ اور مسلمانوں کو نماز اور اس کے اوقات کی تعلیم دی۔ اور اس طریقہ کے بارے میں باہم مشورہ کیا، جس کے ذریعہ لوگوں کو نماز کی اطلاع دی جاسکے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ کو خواب میں اذان دکھلائی گئی، اور اس کے مطابق عمل شروع ہوا۔

سوال: غیر نبی کا خواب حجت نہیں، پھر حضرت عبداللہ کے خواب پر عمل کیوں شروع کیا گیا؟

جواب: یہ غیبی فیضان درحقیقت رسول اللہ ﷺ پر ہوا تھا، اگرچہ واسطہ عبداللہ تھے۔ جیسے مبشرات: صاحبِ معاملہ کے علاوہ کو بھی دکھلائے جاتے ہیں، مگر مقصود وہ شخص ہوتا ہے جس کے لئے وہ خواب دکھلایا گیا ہے۔ چنانچہ جب حضرت

عبداللہ نے اپنا خواب رسول اللہ ﷺ کو سنایا تو آپؐ نے فرمایا: إنها لرؤیا حق، إن شاء الله: یہ برحق خواب ہے، اگر اللہ نے چاہا۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اطلاع دی کہ انھوں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے، تو آپؐ نے فرمایا: فللّٰه الحمد: خدا کا شکر ہے! (مشکوۃ حدیث ۶۵۰ باب الأذان)

تیسرا کام ـــــ دینی نظام کی استواری ـــــ پھر لوگوں کو جمعہ و جماعت اور روزوں پر ابھارا، اور زکوۃ کا حکم دیا، اور لوگوں کو زکوۃ کے احکام سکھلائے۔ مکی سورتوں میں صرف اسلامی مبادیات کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ اسلامی عبادات اور ان کے احکام اب نازل کیے گئے، تاکہ مسلمانوں کا معاشرہ اسلامی اقدار پر پروان چڑھے۔

چوتھا کام ـــــ دعوت اسلامی اور ہجرت کی ترغیب ـــــ ہجرت کے بعد اللہ کی مخلوق کو خوب زور وشور سے دعوت دی گئی کہ یہی اصل مقصود تھا۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان کو ترغیب دی جاتی تھی کہ وہ اپنے وطن چھوڑ کر مدینہ چلے آئیں کیونکہ ان کے وطن اس زمانہ میں دارالکفر تھے، وہ وہاں اسلامی احکام پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ ایسی جگہ آجائیں جہاں دین پر آزادی کے ساتھ عمل پیرا ہو سکیں۔

پانچواں کام ـــــ مسلمانوں میں بھائی چارہ ـــــ ہجرت کے بعد مدینہ میں دو طرح کے مسلمان جمع ہو گئے تھے۔ ایک: انصار تھے، جو اپنے گھروں میں آباد تھے۔ ان کی اپنی زمینیں، کاروبار اور قبائل تھے۔ دوسرے: مہاجرین تھے، جو بے خانماں تھے۔ وہ لُٹ پٹ کر مدینہ پہنچے تھے۔ ان کے پاس نہ تو رہنے کے لئے گھر تھے، نہ گذارہ کا سامان۔ ان کے قبائل بھی نہیں تھے، اس لئے وہ بے یارومددگار تھے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے مہاجرین وانصار کے درمیان بھائی چارہ کرایا۔ اور مسلمانوں کے بعض کو بعض سے جوڑ دیا، ان کو ایک خاندان بنادیا۔ اور صلہ رحمی اور انفاق کا حکم دیا۔ اور مواخات کو توارث کی بنیاد قرار دیا (یہ حکم جنگ بدر تک قائم رہا) اس طرح مسلمانوں کا کلمہ متحد ہو گیا، تاکہ ضرورت پیش آنے پر جہاد کیا جا سکے، اور مسلمان اپنے دشمنوں سے محفوظ ہو جائیں۔ اور بھائی چارہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس زمانہ میں لوگ قبائل کی بنیاد پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے خوگر تھے۔ چنانچہ مواخات کے ذریعہ مہاجرین کو انصار کے قبائل میں داخل کر دیا۔

[۱۸] ثم عاهد النبيُّ صلى الله عليه وسلم اليهودَ، وأمِنَ شرَّهم، واشتغل ببناء المسجد، وعلَّم المؤمنين الصلاةَ، وأوقاتِها، وشاور فيما يحصل به الإعلام بالصلاة، فأُرِيَ عبدُ الله بن زيد في منامه الأذانَ، وكان مطمحَ الإفاضةِ الغيبية رسولُ الله صلى الله عليه وسلم، وإن كان السفيرَ عبدُ الله، وحرَّضهم على الجماعة، والجمعة، والصوم؛ وأمَرَ بالزكاة، وعلَّمهم حدودَها، وجَهَرَ بدعوة الخلق إلى الإسلام، ورغَّبهم في الهجرة من أوطانهم، لأنها يومئذ دارُ الكفر، ولايستطيعون إقامة الإسلام هنالك، وشَدَّ المسلمين بعضَهم ببعض بالمواخاة، وإيجاب الصلة والإنفاق والتوارث بتلك المواخاة، لتتفق كلمتُهم، فيتأتى الجهاد، ويَتَمَنَّعُوا من أعدائهم، وكان القومُ أَلِفُوا التناصرَ بالقبائل.

ترجمہ:(۱) پھر نبی ﷺ نے یہود سے معاہدہ کیا، اور ان کے شر سے محفوظ ہوگئے (۲) اور مسجد کی تعمیر میں مشغول ہوئے، اور مسلمانوں کو نماز کی اور اس کے اوقات کی تعلیم دی، اور اس طریقہ کے بارے میں مشورہ کیا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو نماز کی اطلاع ہوسکے۔ پس عبداللہ بن زید خواب میں اذان دکھلائے گئے (سوال کا جواب) اور غیبی فیضان کے گرنے کی جگہ رسول اللہ ﷺ تھے، اگرچہ واسطہ عبداللہ تھے (۳) اور لوگوں کو جماعت، جمعہ اور روزوں پر ابھارا، اور زکوۃ کا حکم دیا، اور لوگوں کو زکوۃ کے احکام سکھلائے (۴) اور مخلوق کو زور وشور سے اسلام کی دعوت دی، اور لوگوں کو ان کے وطنوں سے ہجرت کرنے کی ترغیب دی، اس لئے کہ وہ اوطان اس زمانہ میں دارالکفر تھے، اور لوگ وہاں اقامتِ اسلام کی طاقت نہیں رکھتے تھے (۵) اور مسلمانوں کو بعض کو بعض سے مضبوط کیا بھائی چارہ کے ذریعہ، اور صلہ رحمی اور انفاق اور اس مواخات کی وجہ سے ایک دوسرے کے وارث ہونے کو واجب کرنے کے ذریعہ۔ تاکہ مسلمانوں کا کلمہ متفق ہو، پس جہاد کی صورت پیدا ہو، اور مسلمان اپنے دشمنوں سے محفوظ ہوجائیں۔ اور لوگ قبائل کے ذریعہ ایک دوسرے کی مدد کرنے کے خوگر تھے۔

☆ ☆ ☆

فیصلہ کن معرکہ: غزوۂ بدر کبری

ہجرت سے پہلے تیرہ سال تک مسلمان ظلم وستم کی چکی میں پستے رہے۔ اور صبر وہمت سے ہر طرح کی چیرہ دستیاں سہتے رہے۔ مگر اس وقت ظالموں کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ کیونکہ اس وقت مسلمان مجتمع نہیں تھے، نہ اس وقت مقابلہ کی طاقت تھی۔ پھر جب مسلمان ہجرت کرکے مدینہ میں جمع ہوگئے، اور ان میں مقابلہ کی طاقت پیدا ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے ان مظلوموں کو ظالموں سے بدلہ لینے کی اجازت دی (سورۃ الحج آیت ۳۹) چنانچہ کافروں کے ساتھ پہلی قابلِ ذکر ٹکر ۲ ہجری میں میدانِ بدر میں ہوئی، اور وہ فیصلہ کن معرکہ ثابت ہوا، اس نے حق وباطل کے درمیان واضح فیصلہ کردیا۔ اس معرکہ کے چند واقعات درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ: ۱۲/رمضان ۲ ہجری میں رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ سے ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے تعاقب میں نکلے، اور اسی انداز سے تیاری کرکے نکلے، مگر جب مقام بدر کے قریب پہنچے تو خبر ملی کہ قافلہ تو بچ کر نکل گیا، مگر مکہ مکرمہ سے ایک بڑا لشکر آرہا ہے۔ اس خبر نے لمحۂ فکریہ پیدا کیا۔ اور آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ آنے والے لشکر سے مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ خود آپؐ کی رائے مقابلہ کی تھی، مگر حضرت ابوایوب انصاری وغیرہ صحابہ نے عرض کیا کہ لشکر میں ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں، اور ہم اس کی تیاری بھی کرکے نہیں آئے۔ مگر مہاجرین نے مشورہ دیا کہ مقابلہ کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ اس مشورہ سے خوش ہوئے، مگر ابھی انصار کی طرف سے موافقت میں کوئی آواز نہیں اٹھی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''لوگو! مجھے مشورہ دو'' لشکر کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ انصار کے اکابر سمجھ گئے کہ روئے سخن ہماری طرف ہے۔ چنانچہ ان کے

سرداروں نے بھی مہاجرین کی تجویز کی تائید کی، اور سب نے پر جوش تقریریں کیں۔ رسول اللہ ﷺ اس کو سن کر بہت مسرور ہوئے۔ اور قافلہ کو حکم دیا کہ اللہ کے نام پر چلو۔ اور یہ خوش خبری سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ قافلہ اور لشکر میں سے ایک پر ہمیں ظفر یاب کریں گے پس اب قافلہ تو نکل گیا ہے، لشکر ہی مدمقابل ہے، اسی پر ان شاء اللہ فتح حاصل ہوگی۔

دوسرا واقعہ: میدانِ بدر میں کفار نے پہلے سے اچھی جگہ اور پانی پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور مسلمان نشیب میں تھے، ان کی طرف ریت بہت زیادہ تھی، چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ گرد وغبار سے الگ پریشان تھے۔ ایک طرف وضوء وغسل کی پریشانی تھی تو دوسری طرف تشنگی ستا رہی تھی۔ مزید شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ تم اللہ کے مقبول بندے ہوتے تو تائید الٰہی تمہارے ساتھ ہوتی۔ اس نازک گھڑی میں اللہ تعالیٰ نے مدد کی، اور زور کا مینہ برسا، جس سے میدان کی ریت جم گئی، وضوء وغسل کے لئے پانی کی افراط ہوگئی، گرد وغبار سے نجات مل گئی، اور شیطان کا وسوسہ کافور ہوگیا۔ اور جس جگہ کفار کا لشکر تھا: کیچڑ اور پھلسن ہوگئی، اور چلنا پھرنا دشوار ہوگیا۔ اس فضلِ خداوندی کا تذکرہ سورۃ الانفال آیت گیارہ میں ہے۔

تیسرا واقعہ: میدانِ بدر میں جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں، اور نبی ﷺ نے لشکرِ دشمن کی زیادتی دیکھی، تو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کی: ''اے اللہ! آپ نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے اس کو پورا فرما۔ اے اللہ! میں آپ کو آپ کے عہد اور وعدہ کی قسم دیتا ہوں!'' چنانچہ آپ کو فتح کی خوش خبری دی گئی۔ اور آپ زِرہ پہنے ہوئے پر جوش یہ فرماتے ہوئے جھونپڑی سے نکلے: ''عنقریب یہ جتھہ شکست کھائے گا، اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا!'' (سورۃ القمر آیت ۴۵) (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۵۸۷۲)

چوتھا واقعہ: جنگ سے پہلے رات میں رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ رکھ رکھ کر صحابہ کو بتایا کہ کل فلاں یہاں گرے گا، اور فلاں یہاں گرے گا۔ حدیث کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ کی جگہ سے اِدھر اُدھر نہ ہوا (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۵۸۷۱ و ۵۹۳۸)

پانچواں واقعہ: اس جنگ میں اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی کمک بھیجی، صحابہ نے فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں، اور کفار کے دلوں میں رعب ڈالیں (سورۃ الانفال آیت ۱۲ میں اس کا ذکر ہے)

چھٹا واقعہ: جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی: ''اے اللہ! یہ قریش ہیں، جو اپنے پورے غرور و تکبر کے ساتھ، تیری مخالفت کرتے ہوئے، اور تیرے رسول کو جھٹلاتے ہوئے آگئے ہیں۔ اے اللہ! اپنی مدد نازل فرما جس کا تو نے وعدہ کیا ہے۔ اے اللہ! آج انہیں اینٹھ کر رکھ دے!'' اُدھر ابوجہل نے دعا کی: ''اے اللہ! ہم میں سے جو فریق رشتہ داری کو زیادہ کاٹنے والا، اور غلط حرکتیں زیادہ کرنے والا ہے، اُسے تو آج توڑ دے۔ اے اللہ! ہم میں سے جو فریق تیرے نزدیک زیادہ محبوب اور زیادہ پسندیدہ ہے، اس کی مدد فرما!''

اس کے بعد جنگ شروع ہوئی جو مشرکین کی شکست فاش، اور مسلمانوں کی فتح عظیم پر ختم ہوئی۔ اس میں چودہ مسلمان شہید ہوئے۔ لیکن مشرکین کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا، ان کے ستر آدمی مارے گئے، اور ستر قید ہوئے، جن میں سے اکثر قائد، سردار اور سر برآوردہ لوگ تھے۔ قیدیوں سے مسلمانوں کو معقول فدیہ حاصل ہوا۔ اور کافی سے زیادہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس جنگ کو فرقان (فیصلہ کن معرکہ) قرار دیا (سورۃ الانفال آیت ۴۰)

ساتواں واقعہ: مدینہ لوٹ کر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے قیدیوں کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ مسلمانوں کا میلان فدیہ لینے کی طرف ہوا، جو منشاء خداوندی کے خلاف تھا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند تھی کہ سب قیدیوں کو قتل کر دیا جائے، تاکہ مشرکین کے سب سرغنہ ختم ہو جائیں، چنانچہ سورۃ الانفال آیات ۶۷-۶۹ میں صحابہ کو سرزنش کی گئی، مگر چونکہ معاملہ صحابہ کے اجتہاد پر چھوڑا گیا تھا، جس میں ان سے چوک ہوگئی، اس لئے ان سے درگذر کیا گیا۔

[۱۹] ثم لما رأى الله فيهم اجتماعًا ونَجْدَةً، أوحى إلى نبيه أن يجاهد، ويقعد لهم كلَّ مرصد:

[الف] ولما وقعت واقعةُ بدرٍ: لم يكونوا على ماء، فأمطر الله مطرًا.

[ب] واستشار الناسَ: هل يختار العير أم النفير؟ فبورك في رأيهم حسب رأيه، فأجمعوا على النفير، بعد مالم يكد يكون ذلك.

[ج] ولما رأى صلى الله عليه وسلم كثرة العدو: تضرَّع إلى الله، فَبُشِّر بالفتح.

[د] وأُوحي إليه مصارعُ القوم، فقال: "هذا مصرعُ فلانٍ، وهذا مصرع فلان، يضع يَدَه ههنا وههنا، فما مَاطَ أحدُهم عن موضع يدِ رسول الله صلى الله عليه وسلم"

[هـ] وظهرت الملائكة يومئذ، بحيث يراها الناس، لِتُثَبِّتَ قلوبَ الموحدين، وتُرْعِبَ قلوبَ المشركين.

[و] فكان ذلك فتحًا عظيمًا، أغناهم الله به وأَشْبَعَهم، وقَطَعَ حبلَ الشرك، وأهلك أفلاذَ كبدِ قريش، ولذا يسمى فرقانا.

[ز] وكان ميلُهم للافتداء، مخالفاً لما أحبه الله من قطع دابرِ الشرك، فعوتبوا، ثم عُفي عنهم.

ترجمہ: (۱۹) پھر جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اجتماعیت اور قوت دیکھی تو اپنے نبی کی طرف وحی کی کہ وہ جہاد کو ے، اور دشمنوں کے لئے ہر گھات میں بیٹھے: —— (الف) اور جب جنگ بدر پیش آئی تو مسلمان پانی پر نہیں تھے، پس اللہ نے بارش برسائی (اس کو شرح میں دوسرے نمبر پر لیا ہے) —— (ب) اور آپؐ نے لوگوں سے مشورہ کیا: آیا عیر (تجارتی قافلہ) کو اختیار کریں یا نفیر (جنگی لشکر) کو؟ (صحیح بات وہ ہے جو شرح میں ہے۔ کیونکہ یہ مشورہ تجارتی قافلہ کے بچ کر نکل

جانے کے بعد کیا گیا تھا) پس صحابہ کی رائے میں جو آپؐ کی رائے کے موافق تھی برکت کی گئی۔ پس سب نے لشکر سے مقابلہ کرنے پر اتفاق کرلیا، اس کے بعد کہ قریب نہیں تھا کہ اتفاق ہو ـــــ (ج) اور جب نبی ﷺ نے دشمن کی زیادتی دیکھی تو آپؐ اللہ کے سامنے گڑگڑائے، پس آپؐ فتح کی خوش خبری دیئے گئے ـــ (د) اور آپؐ کی طرف قوم کی پچھڑنے کی جگہیں وحی کی گئیں۔ پس آپؐ نے فرمایا:...... (ہ) اور اس دن فرشتے ظاہر ہوئے، بایں طور کہ ان کو لوگوں نے دیکھا، تاکہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کریں، اور مشرکین کے دلوں کو مرعوب کریں ـــــ (و) پس وہ جنگ: عظیم فتح تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ مسلمانوں کو مالدار کیا، اور ان کو شکم سیر کیا، اور شرک کی رسی کاٹ دی، اور قریش کے جگر کے ٹکڑوں کو تباہ کیا، اور اسی وجہ سے وہ فرقان کہلائی ـــــ (ز) اور مسلمانوں کا میلان فدیہ لینے کی طرف تھا، اس بات کے برخلاف جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے تھے یعنی شرک کی جڑ کاٹنا، پس وہ سرزنش کیے گئے، پھر ان سے درگذر کیا گیا۔

☆ ☆ ☆

مدینہ سے یہود کا صفایا

مدینہ شریف میں اور اس کے قرب وجوار میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقُریظہ۔ بنوقینقاع: خاص مدینہ میں سکونت پذیر تھے، اور باقی دو قبیلے مدینہ کے پڑوس میں آباد تھے۔ ہجرت کے فوراً بعد نبی ﷺ نے ان سے جو معاہدۂ امن کیا تھا اس کی دفعات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں[1] جنگ بدر کے موقع پر سب سے پہلے بنوقینقاع نے مدینہ میں فساد برپا کیا، پھر بنونضیر نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، اور آخر میں غزوۂ خندق میں بنوقریظہ نے قریش کی مدد کی[2] اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کئے کہ وہ یکے بعد دیگرے جلاوطن کئے گئے۔ کیونکہ مدینہ میں اللہ کا دین اسی وقت خالص ہوسکتا تھا، جب یہود مدینہ کے پڑوس میں نہ رہیں۔ چنانچہ خود انھوں نے نقض عہد کیا، اور اس کی پاداش میں جلاوطن کئے گئے، اور کعب بن اشرف کو جوان کا بڑا خبیث سرغنہ تھا قتل کیا گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے دلوں میں مسلمانوں کی ایسی دھاک بٹھادی کہ وہ فوراً جلاوطن ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ اور ان لوگوں کی کچھ پرواہ نہ کی جنھوں نے ان سے مدد کا وعدہ کیا تھا، اور ان کے دلوں کو مضبوط کیا تھا۔ مراد مدینہ کے منافقین عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی ہیں، جن کا تذکرہ سورۃ الحشر آیت گیارہ میں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے سب اموال ودیار نبی ﷺ کو عنایت فرمائے۔ اور یہ مسلمانوں پر سب سے پہلی فراخی اور کشائش تھی۔

اسی طرح حجاز کا مشہور تاجر ابورافع یہودی: مسلمانوں کے درپے آزار رہا کرتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف حضرت

[1] دیکھیں البدایہ والنہایہ ۳: ۲۲۴ سیرت ابن ہشام ۱: ۱۷۸ مطبوعہ بولاق مصر ۱۲

[2] تفصیل میری تفسیر ہدایت القرآن: پارہ دس ۳: ۵۱-۵۳ میں ہے ۱۲

عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔ انھوں نے بڑی آسانی سے اس کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ مگر وہ واپسی میں سیڑھی سے گر پڑے، اوران کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔ انھوں نے عمامہ سے اس کو باندھ دیا، اور خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: ''پیر پھیلاؤ'' آپؐ نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ تو وہ ایسی ہوگئی: جیسے کبھی اس کو کوئی گزند پہنچی ہی نہیں! (مشکوۃ حدیث ۵۸۷۶)

[۲۰] ثم أهاج الله تقريبًا لإجلاء اليهود، فإنه لم يكن يصفو دينُ الله بالمدينة، وهم مجاوروها، فكان منهم نقضُ العهد، فأجلىٰ بني النضير، وبني قَيْنُقَاع، وقتل كعبَ بنَ الأشرفِ، وألقى الله في قلوبهم الرعبَ، فلم يُعَرِّجوا لمن وَعَدَهم النصرَ وشَجَّعَ قلوبَهم، فأفاء الله أموالهم على نبيه، وكان أولُ توسيع عليهم.

وكان أبو رافع تاجرُ الحجاز يؤذي المسلمين، فبعث إليه عبدَ اللّٰهِ بنَ عتيك، فيسَّر الله له قتلَه، فلما خرج من بيته انكسرتْ ساقُه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " أُبْسُطْ رِجْلَكَ" فَمَسَحَها، فكأنها لم يَشْتَكِهَا قط.

ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے یہود کو جلا وطن کرنے کی تقریب پیدا کی۔ کیونکہ مدینہ میں اللہ کا دین خالص نہیں ہوسکتا تھا درانحالیکہ وہ مدینہ کے پڑوس میں ہوں۔ پس ان کی طرف سے نقضِ عہد ہوا۔ پس بنونضیر اور بنوقینقاع کو جلا وطن کیا (اور بنو قریظہ کا تذکرہ آگے آرہا ہے) اور کعب بن اشرف کو قتل کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے (بنونضیر کے) دلوں میں رعب ڈالا، پس انھوں نے ان لوگوں کی طرف التفات نہ کیا جنھوں نے ان سے مدد کا وعدہ کیا تھا، اوران کے دلوں کو مضبوط کیا تھا، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اموال نبی ﷺ کو عنایت فرمائے، اور وہ عنایت فرمانا مسلمانوں پر پہلی فراخی تھا —— اور حجاز کا تاجر ابورافع مسلمانوں کو ستایا کرتا تھا۔ پس آپؐ نے اس کی طرف عبداللہ بن عتیک کو بھیجا۔ پس اللہ نے ان کے لئے اس کا قتل آسان کردیا، پس جب وہ اس کے گھر سے نکلے تو ان کی پنڈلی ٹوٹ گئی۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنا پیر پھیلاؤ'' پس آپؐ نے اس پر ہاتھ پھیرا، پس گویا وہ ٹانگ: کبھی بھی اس کو کوئی شکایت نہیں ہوئی!

☆ ☆ ☆

اُحُد کی شکست میں رحمت کے پہلو

جنگِ احد میں قدرتی عوامل ایسے اکٹھا ہوگئے کہ مسلمانوں کو بظاہر شکست کا سامنا کرنا پڑا، مگر اس شکست میں بھی رحمتِ خداوندی کے پہلو تھے:

پہلا پہلو —— پیش خبری —— جنگ احد میں جو صورت پیش آئی اجمالی طور پر اس کی خبر پہلے دیدی گئی تھی۔ ترمذی کی

روایت ہے کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں جب مشورہ کیا گیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے صحابہ کو بتایا کہ اگر تم قیدیوں کو کچل ڈالنے کا فیصلہ کروگے تو فبہا، اور اگر فدیہ لینے کا فیصلہ کروگے تو آئندہ سال تمہارے اتنے ہی یعنی ستر آدمی شہید ہوں گے (ظاہر ہے اتنا بڑا نقصان شکست ہی کی صورت میں ہوتا ہے) صحابہ نے کہا: ہم فدیہ لیں گے، رہی شہادت کی بات تو وہ ہماری عین آرزو ہے (جامع الاصول حدیث ۶۰۲۷)

پھر احد کی جنگ سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپؐ کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ آپؐ نے اس کو ہلایا تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا (یہ جنگ احد کی شکست تھی) اور آپؐ نے ایسی گائے دیکھی جو ذبح کی ہوئی تھی (یہ صحابہ کی شہادت تھی) (متفق علیہ، جامع الاصول حدیث ۱۰۱۳) پس جس صورتِ حال کی اللہ تعالیٰ نے پہلے سے خبر کردی: اس کا کیا افسوس کرنا۔ ایسا واقعہ تو موجبِ شکر ہے۔

دوسرا پہلو ــــ عبرت وبصیرت ــــ اللہ تعالیٰ نے اس شکست کو دین کے معاملہ میں آنکھیں کھولنے والا، اور سامانِ عبرت بنایا۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۵۲ میں اس جنگ میں ناکامی کا سبب: رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کی خلاف ورزی کو قرار دیا جو آپؐ نے گھاٹی پر ٹھہرے رہنے کے بارے میں دیا تھا۔

تیسرا پہلو ــــ امتحان وامتیاز ــــ سورۃ البقرۃ آیت ۲۴۹ میں طالوت کا واقعہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لشکر کا ایک نہر کے ذریعہ امتحان کیا تھا، تاکہ مخلص اور غیر مخلص جدا ہوجائیں۔ اسی طرح سورۃ آل عمران آیات ۱۴۰-۱۴۲ میں احد کی شکست کو امتحان وامتیاز کا ذریعہ قرار دیا۔ اس واقعہ نے دودھ اور پانی الگ کردیا، تاکہ رسول اللہ ﷺ بودے لوگوں پر نامناسب حد تک بھروسہ نہ کریں۔

[۲۱] ولما اجتمعت الأسبابُ السماويةُ على هزيمة المسلمين يومَ أُحُدٍ: ظهرت رحمة الله ثَمَّ من وجوه كثيرة:

[الف] فجعل الواقعةَ استبصارًا في دينهم وعبرةً، فلم يجعل سَبَبه إلا مخالفةَ رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما أمر من القيام على الشعب.

[ب] وعلَّم الله تعالى نبيَّه بالانهزام إجمالاً، فأراه سيفًا انقطع، وبقرةً ذُبحت، فكانت الهزيمةُ، وشهادةُ الصحابة.

[ج] وجعلها بمنزلة نهر طالوت، مَيَّزَ الله بها المخلصين من غيرهم، لئلا يَعْتَمِدَ على أحد أكثرَ مما ينبغي.

ترجمہ: (۲۱) اور جب سماوی اسباب احد کے دن مسلمانوں کی شکست پر اکٹھا ہوگئے: تو اس جگہ بہت سی صورتوں میں

اللہ کی رحمت ظاہر ہوئی ـــــ (الف) پس واقعہ کو اللہ نے آنکھیں کھولنے والا بنایا ان کے دین میں اور عبرت بنایا۔ پس نہیں گردانا اس کا سبب مگر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کو اس بات میں جس کا آپؐ نے حکم دیا تھا یعنی گھاٹی پر ٹھہرا رہنا (شرح میں اس کو دوسرا پہلو بنایا ہے) ـــــ (ب) اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اجمالی طور پر شکست جتلا دی تھی، پس اللہ نے آپؐ کو ایسی تلوار دکھلائی جو ٹوٹ گئی تھی، اور ایسی گائے دکھلائی جو ذبح کی ہوئی تھی۔ پس شکست ہوئی اور صحابہ کی شہادت ہوئی۔ (شرح میں اس کو پہلا پہلو بنایا ہے) ـــــ (ج) اور اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو طالوت کی نہر کی طرح بنایا۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مخلصین کو ان کے علاوہ سے جدا کر دیا، تا کہ رسول اللہ ﷺ نہ بھروسہ کریں کسی پر اس سے زیادہ جو مناسب ہو۔

☆ ☆ ☆

بھڑوں نے لاش کی حفاظت کی

۴ ہجری میں رجیع (چشمہ کا نام) مقام پر کفار نے حضرت عاصم بن ثابت (امیر) اور ان کے چھ ساتھیوں کو شہید کیا تو قریش نے آدمی بھیجے کہ حضرت عاصمؓ کے جسم کا کوئی ٹکڑا لائیں، جس سے ان کو پہچانا جائے۔ کیونکہ انھوں نے جنگ بدر میں قریش کے کسی سرغنہ کو قتل کیا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی لاش پر بھڑوں کا جھنڈ بھیج دیا، اور وہ لوگ مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ درحقیقت حضرت عاصم نے اللہ تعالیٰ سے عہد و پیمان کر رکھا تھا کہ نہ انھیں کوئی مشرک چھوئے گا نہ وہ کسی مشرک کو چھوئیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی لاش کی بھی حفاظت کی (بخاری حدیث ۴۰۸۶)

بیر معونہ کا حادثہ اور قنوتِ نازلہ

جس مہینے رجیع کا حادثہ پیش آیا ٹھیک اسی مہینے بیر معونہ کا حادثہ بھی پیش آیا، جو رجیع کے حادثہ سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ اس حادثہ میں کفار نے ستّر صحابہ کو جو قرّاء کے نام سے مشہور تھے شہید کیا۔ جب اس المیہ کی خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپؐ نہایت غمگین اور دلفگار ہوئے۔ اور فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھنی شروع کی۔ جس میں اُن قبائل کے لئے بددعا کی جاتی تھی جو حادثہ کے ذمہ دار تھے۔ تیس دن کے بعد سورہ آل عمران کی آیت ۱۲۸ نازل ہوئی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ، أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ ترجمہ: آپؐ کا معاملے میں کچھ دخل نہیں: یا تو اللہ تعالیٰ ان کی طرف توجہ فرمائیں گے، یا ان کو سزا دیں گے، کیونکہ وہ ستم گار ہیں! اس آیت کے نزول پر آپؐ نے قنوت نازلہ بند کر دی (مسلم شریف ۵:۱۷۷ مصری) اس آیت پاک کے ذریعہ نبی ﷺ کو متنبہ فرمایا کہ بندے کو اختیار نہیں، نہ اس کا علم محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہیں سو کریں۔ آپؐ کو اپنے مقام رفیع پر رہنا چاہئے، آپؐ رحمتِ عالم ہیں، وہ ظلم کرتے جائیں، آپؐ دعائیں دیتے جائیں۔ باقی ان کا انجام خدا کے حوالے کریں۔

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے شہدائے بیر معونہ کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ''ہماری قوم کو بتلا دو کہ ہم اپنے رب سے ملے: وہ ہم سے راضی ہے، اور ہم اس سے راضی ہیں'' یہ آیت بعد میں منسوخ کردی گئی۔ پہلے اس لئے نازل کی گئی کہ ان شہداء کی خواہش تھی، جو پوری کردی گئی (یہ فائدہ کتاب میں ہے)

غزوۂ احزاب اور اللہ کی رحمتیں

شوال ۵ ہجری میں کفر کے بڑے بڑے جتھوں نے ایکا کر کے مدینہ پر چڑھائی کی۔ ان کے ٹھاٹھیں مارتے لشکر کی پیش قدمی روکنے کے لئے خندق کھودی گئی، تو بہت سی صورتوں میں اللہ کی رحمت ظاہر ہوئی۔ چند واقعات درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ پر سخت بھوک کے آثار دیکھے۔ وہ گھر گئے۔ بیوی سے دریافت کیا: کچھ ہے آپ سخت بھوکے ہیں۔ بیوی نے جائزہ لیا تو گھر میں ایک صاع (تقریباً ڈھائی کلو) جَو نکلے، جو انھوں نے پیسے۔ گھر میں ایک بکری کا بچہ تھا، حضرت جابرؓ نے اس کو ذبح کیا، اور پکانے کے لئے دیا۔ پھر حاضر خدمت ہوکر رازداری کے انداز میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: میں نے تھوڑا سا کھانا تیار کیا ہے۔ آپؐ چند رفقاء کے ساتھ تشریف لے چلیں۔ آپؐ نے اعلانِ عام کردیا کہ جابر کی دعوت ہے، چلو! تمام اہل خندق نے جن کی تعداد ایک ہزار تھی: شکم سیر ہوکر کھانا کھایا، پھر بھی گوشت کی ہانڈی اپنی حالت پر برقرار رہی، اور گوندھا ہوا آٹا بھی بحالہ رہا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۷۷)

دوسرا واقعہ: خندق کی کھدائی میں ایک سخت چٹان آئی، جس سے کدال اُچٹ جاتی تھی اور کچھ ٹوٹتا نہیں تھا۔ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے صورتِ حال عرض کی۔ آپؐ تشریف لائے، اور بسم اللہ کہہ کر ایک ضرب لگائی، تہائی چٹان ٹوٹی، اور ایک چمک پیدا ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ اکبر! مجھے ملک شام کی کنجیاں دی گئیں، واللہ! میں وہاں کے سرخ محل کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر دوسری چوٹ ماری، تو دوسری تہائی ٹوٹی، اور پھر روشنی ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ اکبر! مجھے فارس کی کنجیاں دی گئیں، واللہ! میں اس وقت مدائن کو اور اس کے سفید محل کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر تیسری ضرب ماری، تو چٹان بھر بھرے تودے میں تبدیل ہوگئی، اور ایک روشنی چمکی۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ اکبر! مجھے یمن کی کنجیاں دی گئیں، واللہ! میں اپنی اس جگہ سے صنعاء کو دیکھ رہا ہوں (مسند احمد ۴: ۳۰۳)

تیسرا واقعہ: پھر ایک رات اللہ تعالیٰ نے سخت تند ہوا چلائی، جس سے لشکر کفار کے خیمے اکھڑ گئے، ہانڈیاں الٹ گئیں، طنابوں کی میخیں نکل گئیں، اور کسی چیز کو قرار نہ رہا، اور اللہ نے کفر کے سرغنوں کے دلوں میں رعب اور خوف ڈالدیا، اور وہ شکست خوردہ لوٹ گئے، اور اللہ نے ان کی چالوں کو ان کے سینوں میں پھیر دیا، اور وہ مسلمانوں کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا، رسول اللہ ﷺ کی مدد کی، اور تن تنہا سارے لشکر کو شکست دیدی۔

بنوقریظہ کا انجام

غزوۂ احزاب کے موقع پر بنوقریظہ نے، جبکہ مسلمان موت وحیات کے نازک لمحات سے گذر رہے تھے، سخت ترین بدعہدی کی، اور احزاب کا ساتھ دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو نامراد لوٹا دیا، اور لشکر اسلام اپنے گھروں کو لوٹا، تو ظہر کے وقت جبکہ آپ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں غسل فرما رہے تھے، حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے، اور حکم دیا کہ بنوقریظہ پر چڑھائی کی جائے۔ چنانچہ لشکر اسلام نے ان کے قلعوں کا محاصرہ کرلیا۔ بالآخر وہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر اتر آئے۔ حضرت سعدؓ ان کے حلیف تھے۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ کیا کہ ان کے مردوں کو قتل کردیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے، اور ان کے اموال غنیمت میں تقسیم کردیئے جائیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے وہ فیصلہ کیا جو اللہ کا فیصلہ ہے!'' (بخاری حدیث ۴۱۲۱)

[۲۲] ولما استشهد عاصم وأصحابُه: حَمَتْهُم الزَّنَابِيْرُ من الأعادى، فلم يبلغوا منهم ما أرادوا.

[۲۳] ولـمـا استشهـد القراءُ فـى بئـر معـونة، جعل النبى صلى الله عليه وسلم يدعو عليهم فى صلاته، وكان فيه نوعٌ من استعجال البشرية، فنبَّه على ذلك، ليكون كلُّ أمره فى الله، وبالله، ولله.

ونـزل فـى الـقـرآن مـقالتُهم: " بَلِّغُوا قومَنا أنَّا قد لقينا رَبَّنَا، فرضى عنا، ورضينا عنه" لِتَتَسَلَّى قلوبُهم، ثم نُسخ بعدُ.

[۲٤] ولما أحاطت بهم الأحزاب، وحُفر الخندقُ: ظهرت رحمة الله بهم من وجوه كثيرة:

[الف] رَدَّ الله كيدَهم فى نحورهم، لم يضروا المسلمين شيئًا.

[ب] وبورك فى طعام جابر رضى الله عنه، فكفى صاعٌ من شعير وبُهْمَةٌ نحوَ ألفِ رجل.

[ج] وانكشفت قصورُ كسرى وقيصر فى قدحِ الحجرَ، وبَشَّرَ بفتحها.

[د] وهَبَّتْ ريح شديدة فى ليلة مظلمة، وأُلقى الرعبُ فى قلوبهم، فانهزموا.

[۲٥] وحـاصـر قُـريـظةَ، فـنـزلـوا عـلـى حكم سعدٍ رضى الله عنه، فأمر بقتل مُقاتلهم، وسَبْيِ ذريتهم، فأصاب الحقَّ.

ترجمہ: (۲۲) اور جب عاصم اور ان کے ساتھی شہید کئے گئے، تو بھڑوں نے ان کو دشمنوں سے بچایا۔ پس وہ نہ پہنچے ان سے اس مقصد تک جس کو وہ چاہتے تھے ـــ (۲۳) اور جب بیر معونہ میں قرّاء شہید کئے گئے تو نبی ﷺ نے ان کے لئے اپنی نماز میں بددعا کی۔ اور اس میں ایک طرح کی بشری جلد بازی تھی، پس اللہ تعالیٰ نے اس پر متنبہ کیا، تا کہ آپؐ کا ہر

معاملہ اللہ کی راہ میں، اور اللہ کی مدد سے، اور اللہ کے لئے ہو ——— (فائدہ) اور اتری قرآن میں ان کی بات: ''پہنچا دو ہماری قوم کو کہ ہم نے یقیناً اپنے پروردگار سے ملاقات کی، پس وہ ہم سے راضی ہوئے، اور ہم ان سے راضی ہوئے'' تاکہ ان کے دلوں کو اطمینان ہو جائے، پھر بعد میں وہ آیت منسوخ کر دی گئی ——— (۴۴) اور جب احزاب (جتھوں) نے صحابہ کو گھیر لیا، اور خندق کھودی گئی، تو ان پر بہت سی شکلوں میں اللہ کی رحمت ظاہر ہوئی ——— (الف) اللہ تعالیٰ نے ان کی چالوں کو ان کے سینوں میں پھیر دیا، انھوں نے مسلمانوں کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچایا (شرح میں اس کو (د) کے ساتھ ملا کر تیسرا واقعہ قرار دیا ہے) ——— (ب) اور جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے میں برکت فرمائی گئی، پس جَو کا ایک صاع اور بکری کا ایک بچہ تقریباً ہزار آدمیوں کو کافی ہو گیا ——— (ج) اور کسریٰ اور قیصر کے محلات ظاہر ہوئے آپؐ کے پتھر پر کدال مارنے میں، اور آپؐ نے ان کے فتح ہونے کی خوش خبری سنائی ——— (د) اور تاریک رات میں سخت ہوا چلی، اور ان کے دلوں میں رعب ڈالا گیا، پس انھوں نے شکست کھائی ——— (۴۵) اور آپؐ نے قریظہ کا محاصرہ کیا، پس وہ سعد رضی اللہ عنہ کے حکم پر اترے، پس انھوں نے حکم دیا ان کے لڑنے والوں کو قتل کرنے کا، اور ان کی ذرّیت کو قید کرنے کا، پس وہ برحق فیصلے کو پہنچے۔

☆ ☆ ☆

حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کی حکمت

عربوں کے تصورات میں لے پالک حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ شرعاً یہ بات درست نہیں تھی۔ چنانچہ اس رسم کو مٹانے کے لئے حضرت زینبؓ کا نکاح نبی ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ سے کرایا گیا۔ یہ نکاح حضرت زینب اور ان کے بھائی کی مرضی کے خلاف محض اللہ و رسول کے حکم سے ہوا تھا۔ کیونکہ حضرت زیدؓ پر غلامی کا داغ لگ چکا تھا۔ سورۃ الاحزاب آیت ۳۶ میں اس کا ذکر ہے۔

نکاح کے بعد زوجین میں موافقت نہ ہوئی۔ حضرت زیدؓ رسول اللہ ﷺ سے باپ ہونے کی حیثیت سے عرض کرتے کہ میں بیوی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ آپؐ سمجھاتے کہ زینب نے میری خاطر اپنے منشا کے خلاف تم کو قبول کیا ہے۔ اب چھوڑو گے تو اس کی دل شکنی ہوگی، پس اللہ سے ڈرو، بگاڑ مت پیدا کرو، نباہ کرو۔ مگر آپؐ کو آثار ایسے نظر آرہے تھے کہ یہ کشتی کنارے لگنے والی نہیں۔ چنانچہ آپؐ سوچتے تھے کہ اگر خدانخواستہ زید نے طلاق دیدی، تو زینب کی اشک شوئی کی اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں کہ آپؐ ان سے نکاح کرلیں۔ مگر اندیشہ یہ تھا کہ دشمنانِ اسلام طوفان کھڑا کریں گے۔ کہیں گے: بہو کو گھر میں بسالیا! اور یہ بات نئے اور کمزور مسلمانوں کے لئے دین میں تشکیک کا باعث ہوگی۔

مگر نوشتۂ تقدیر پورا ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ ایک وقت آیا کہ حضرت زیدؓ نے طلاق دیدی۔ جب عدت پوری ہوئی تو وحی نازل ہوئی، اور اللہ کے حکم سے آپ ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا۔ تاکہ عملی طور پر یہ رسم مٹ جائے۔ پس یہ نکاح

ایک دینی مصلحت سے ہوا تھا۔

[۲۶] وكانت للنبي صلى الله عليه وسلم رغبةٌ طبيعيةٌ في زينب رضي الله عنها، فوفَّر الله له ذلك، حيث كانت فيه مصلحةٌ دينية، ليعلموا أن حلائل الأدعياء تَحِلُّ لهم، فطلقها زوجها، فانكحها الله نبيَّه صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: (۲۶) اور نبی ﷺ کی زینب رضی اللہ عنہا میں فطری رغبت تھی۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بیوی بہم پہنچائی، کیونکہ اس میں دینی مصلحت تھی، تاکہ مسلمان جان لیں کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں ان کے لئے حلال ہیں۔ پس زینبؓ کو ان کے شوہر نے طلاق دیدی۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے ان کا نکاح کردیا۔

ملحوظہ: حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کے سلسلہ میں حاطب اللیل مفسرین ومؤرخین نے سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۷ کی تفسیر میں چند لغو روایتیں اور دور از کار قصے بیان کئے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں: **لا ينبغي التشاغل بها**: ان میں مشغول ہونا مناسب نہیں۔ اور ابن کثیر لکھتے ہیں: **أحببنا أن نضرب عنها صفحًا، لعدم صحتها، فلا نوردها**: ہم یہ بات پسند کرتے ہیں کہ ان سے پہلو تہی کریں، کیونکہ وہ روایات صحیح نہیں، پس ہم ان کو بیان نہیں کررہے (فوائد عثمانی) حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے ان روایات کا لحاظ کیا ہے۔ اور ''فطری رغبت'' کہہ کر بات ہلکی کی ہے۔ ہم نے شرح میں ان روایات کا قطعاً لحاظ نہیں کیا۔ ان روایات پر نہ آیت کی تفسیر موقوف ہے، نہ وہ نبی ﷺ کے حالات سے ہم آہنگ ہیں۔ ہم پہلے یہ مضمون لکھ آئے ہیں کہ آپؐ نے حضرت خدیجہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ کوئی نکاح اپنی ضرورت، اپنی رغبت، اپنی پسند سے نہیں کیا۔ سب نکاح تین مقاصد سے کئے ہیں: ملّی، ملکی اور شخصی۔ حضرت زینب سے نکاح ملّی (دینی) مصلحت سے فرمایا ہے۔

☆ ☆ ☆

دعائے نبوی کی برکات

پہلا واقعہ: قحط سالی کے زمانہ میں نبی ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔ ایک دیہاتی اٹھا، اور اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جانور مرنے لگے، اور بچے فاقہ مست ہوگئے، آپؐ ہمارے لئے دعا فرمائیں۔ آپؐ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ آسمان میں بادل کی دھجی بھی نہیں تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! آپؐ نے اس وقت تک ہاتھ نہیں رکھے جب تک پہاڑوں کے مانند بادل اٹھ نہ آئے۔ اور زور سے برسنے نہ لگے۔ پھر ہفتہ بھر بارش ہوتی رہی۔ اگلے جمعہ کو وہی دیہاتی یا کوئی اور اٹھا، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! عمارتیں ڈھ

پڑیں، اور جانور ڈوبنے لگے، آپ ہمارے لئے دعا فرمائیں۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھائے، اور دعا کی: ''الٰہی! ہمارے اردگرد برسے، ہم پر نہ برسے!'' آپؐ جس طرف بھی اشارہ کرتے، بادل چھٹتے چلے جاتے، یہاں تک کہ مدینہ ڈھال کی طرح ہوگیا، اور لوگ دھوپ میں گھر لوٹے (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۵۹۰۲)

دوسرا واقعہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ پر ان کے والد کا بہت قرضہ تھا۔ جب کھجور کی فصل تیار ہوئی، تو انھوں نے قرض خواہوں سے کہا: یہ سب کھجوریں اپنے قرضہ میں لے لو۔ انھوں نے انکار کیا۔ حضرت جابرؓ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا: آپؐ کو معلوم ہے، ابا جان احد میں شہید ہوگئے ہیں، اور قرضہ بہت چھوڑ گئے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپؐ کھلیان میں تشریف لے چلیں، تاکہ قرض خواہ آپؐ کے لحاظ میں کچھ نرمی کریں۔ آپؐ نے فرمایا: ''جاؤ، سب کھجوریں ایک جگہ ڈھیر کردو'' میں نے ایسا کرکے آپؐ کو بلایا۔ قرض خواہ آپؐ کو دیکھ کر اور بھڑکے۔ آپؐ نے جب ان کے یہ تیور دیکھے، تو بڑے ڈھیر کے گرد تین چکر لگائے، پھر اس پر بیٹھ گئے۔ اور فرمایا: ''اپنے قرض خواہوں کو بلاؤ'' آپؐ اس ڈھیر سے ان کو ناپ ناپ کر دیتے رہے، یہاں تک کہ سارا قرضہ ادا ہوگیا، اور میں دیکھ رہا تھا: اس ڈھیر میں سے ایک کھجور بھی کم نہ ہوئی (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۵۹۰۶)

تیسرا واقعہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے سوتیلے والد ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنی اہلیہ ام سلیم سے کہا: میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ آہستہ بول رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے آپؐ فاقہ سے ہیں۔ کیا گھر میں کچھ ہے؟ ام سلیم نے جَو کی چند روٹیاں نکالیں، پھر ایک اوڑھنی نکالی، اس میں روٹیاں لپیٹ کر میرے بغل میں دیں۔ میں خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ آپؐ اس وقت لوگوں کے ساتھ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ میں کھڑا ہوگیا۔ آپؐ نے پوچھا: ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے دریافت کیا: کچھ کھانا لے کر آئے ہو؟ میں نے کہا: ہاں۔ آپؐ نے سب لوگوں سے کہا: چلو۔ پس آپؐ چلے، اور میں آگے چلا، اور ابوطلحہ کو صورتِ حال بتلائی۔ انھوں نے کہا: ام سلیم! رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ تشریف لے آئے، اور ہمارے پاس سب کو کھلانے کے لئے کچھ نہیں! ام سلیم نے کہا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں! پھر ابوطلحہ نے بڑھ کر آپ کا استقبال کیا، اور سب کو لے کر آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ام سلیم! تمہارے پاس کیا ہے؟'' ام سلیم وہی روٹیاں لائیں، ان کو چورا، اور ان پر گھی کی ایک کپّی نچوڑی۔ آپؐ نے اس میں برکت کی دعا فرمائی، اور انسؓ سے فرمایا: ''دس آدمیوں کو بلاؤ'' وہ آئے اور انھوں نے شکم سیر ہوکر کھایا۔ اسی طرح دس دس بلائے جاتے رہے اور وہ شکم سیر ہوکر کھاتے رہے اور لوگ ستر یا اسّی تھے (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۵۹۰۸)

[۲۷] وبينا هو يخطب يومَ الجمعة، إذ قام أعرابي، فقال: يارسول الله! هلك المال، وجاع العيال، فاستسقى وما في السماء قَزَعَةٌ، فما وضع يدَه حتى ثار السماء كأمثال الجبال، فَمُطِروا حتى خافوا الضرر، فقال: "حوالينا ولاعلينا" لايشير إلى ناحية إلا انفرجت.

[٢٨] وتكرر ظهور البركة فيما برَّك عليه، كَبُيْدَرِ جابر، وأقراص أم سليم، ونحوها.

ترجمہ: (٢٧) اور دریں اثنا کہ آپؐ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے، اچانک ایک دیہاتی اٹھا، پس اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! مال (جانور) ہلاک ہوگیا، اور بچے فاقہ زدہ ہوگئے! پس آپؐ نے بارش طلب کی، درانحالیکہ آسمان میں ایک دھجّی بھی نہیں تھی، پس آپؐ نے اپنے ہاتھ نہیں رکھے کہ پہاڑوں کے مانند بادل اٹھے، پس لوگ بارش برسائے گئے یہاں تک کہ ان کو نقصان کا اندیشہ ہوا۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''ہمارے اردگرد برسے اور ہم پر نہ برسے!'' آپؐ کسی بھی کنارہ کی طرف اشارہ نہیں کرتے تھے، مگر بادل کھل جاتے تھے —— (٢٨) اور بار بار برکت ظاہر ہوئی اس چیز میں جس میں آپؐ نے برکت کی دعا فرمائی۔ جیسے جابرؓ کا کھلیان اور ام سلیم کی روٹیاں، اور ان کے مانند۔

☆ ☆ ☆

غزوۂ بنی المُصطلق اور واقعہ افک

غزوۂ احزاب کے بعد یہ غزوہ پیش آیا ہے۔ بنوالمصطلق: قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ ہے۔ یہ غزوہ: غزوۂ مُرَیسیع بھی کہلاتا ہے۔ مریسیع ایک چشمہ کا نام ہے۔ یہ غزوہ جنگی نقطۂ نظر سے کوئی اہم غزوہ نہیں۔ مگر اس غزوہ میں چند اہم واقعات پیش آئے ہیں:

پہلا واقعہ: اس غزوہ میں بھی ملائکہ کا نزول ہوا ہے۔ فرشتے لوگوں کو نظر آئے جس سے دشمن ڈر گیا۔ اور خاص جنگ کے بغیر فتح حاصل ہوگئی (مگر سرسری تلاش میں مجھے اس کا حوالہ نہیں ملا)

دوسرا واقعہ: اس غزوہ سے واپسی پر واقعۂ افک پیش آیا۔ جس میں سورۃ النور کی آیات ١١-٢٠ نازل ہوئیں۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بے گناہی واضح کی گئی۔ اور جن لوگوں نے تہمت لگائی تھی ان پر حدِ قذف جاری کی گئی۔

تیسرا واقعہ: اس غزوہ میں پہلی مرتبہ منافقین کی بڑی تعداد نے شرکت کی، اور طرح طرح سے شرارتیں کیں۔ اسی غزوہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے مدینہ سے ذلیل ترین آدمی کو نکالنے کی بات کہی تھی (سورۃ المنافقون آیت ٨)

چوتھا واقعہ: حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا جو بنوالمصطلق کے سردار حارث بن ابی ضِرار کی لڑکی تھیں، اور جنگ میں گرفتار ہوئی تھیں: حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں۔ انھوں نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے کتابت کا معاملہ کرلیا۔ اور رسول اللہ ﷺ سے تعاون لینے کے لئے پہنچیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم چاہو تو میں بدل کتابت ادا کردوں اور تم سے نکاح کرلوں'' وہ تیار ہوگئیں۔ جب اس نکاح کی خبر مسلمانوں کو ہوئی تو سب نے بنوالمصطلق کے قیدی آزاد کردیئے۔ لوگوں نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کے سسرالی ہوگئے! چنانچہ اس نکاح کی برکت سے ایک سو خاندان آزاد ہوئے۔ پس یہ نکاح ملکی (سیاسی) مصلحت سے کیا تھا۔

نوٹ: شاہ صاحب قدس سرہ نے یہ آخری دو واقعے ذکر نہیں فرمائے۔

سورج گہن اور سنتِ نبوی

۱۰ ہجری میں سورج گہن ہوا۔ نبی ﷺ نے نماز کسوف پڑھائی، اور گڑگڑا کر دعا مانگی۔ کیونکہ سورج جیسے بڑے ستارہ کا گہنانا اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اور ایسے وقت میں اللہ کے منتخب بندوں کے دلوں پر خوفِ الٰہی مترشح ہوتا ہے۔ اور آپ ﷺ نے نماز کسوف میں اپنے اور جدارِ قبلہ کے درمیان جنت وجہنم کو دیکھا۔ یہ مثالی صورتیں تھیں جو خاص جگہ میں ظاہر ہوئیں۔ اصل جنت وجہنم نہیں تھیں۔

صلح حدیبیہ کی تقریب

غزوۂ احزاب کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ تو فرما ہی دیا تھا کہ اب مکہ والے ہم پر چڑھائی نہیں کریں گے۔ اب ہم ان پر چڑھ کر جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو خواب دکھلایا کہ آپؐ صحابہ کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ اور بے خوف وخطر مناسک ادا فرما کر احرام کھول دیا۔ کسی نے حلق کرایا کسی نے قصر۔ یہ وہ منظر دکھایا گیا تھا جو فتح مکہ کے بعد پیش آنے والا تھا۔ مگر زیارتِ بیت اللہ کے شوق نے بے تاب کر دیا۔ حالانکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے پندرہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ مکرمہ کا سفر شروع کر دیا۔ اس طرح صلح حدیبیہ کی تقریب پیدا ہوگئی۔ شروع میں فریقین مصالحت پر تیار نہیں تھے، مگر بالآخر دس سال کے لئے ناجنگ معاہدہ ہوگیا، جو بہت سی فتوحات کا سبب بنا۔ فتح مکہ کا سبب بھی یہی معاہدہ بنا، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

اس کی نظیر: یہ واقعہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقریر کی کہ ابھی آپؐ کی وفات نہیں ہوئی۔ جب تک آپؐ منافقین کو کیفرکردار تک نہیں پہنچائیں گے وفات نہیں ہوگی۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انھوں نے اس کے خلاف تقریر کی۔ فرمایا: ''جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے وہ جان لے کہ آپؐ کی وفات ہوچکی ہے۔ اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے: وہ حی لایموت ہے'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: دونوں کی باتیں مفید ثابت ہوئیں۔ حضرت عمرؓ کی بات سے منافقین کے حوصلے پست ہوئے، اور حضرت ابوبکرؓ کی بات سے حقیقتِ حال واضح ہوئی (بخاری حدیث ۳۶۶۹) اسی طرح مذکورہ خواب دکھانے کا جو منشا تھا، اس کے مطابق فتح مکہ کے بعد سفر ہوتا تو بھی بہتر تھا۔ اور زیارتِ کعبہ کے شوق میں فوراً سفر کیا گیا وہ بھی بہتر ہوا۔

حدیبیہ میں اللہ کی رحمتیں

حدیبیہ میں اللہ کی رحمت متعدد صورتوں میں ظاہر ہوئی:



پہلی صورت: حدیبیہ میں لوگ پیاسے ہوئے۔ کسی کے پاس پانی نہیں تھا۔ صرف چمڑے کی ایک چھاگل میں تھوڑا سا پانی تھا۔ نبی ﷺ نے اس میں اپنا ہاتھ رکھا تو آپؐ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی ابلنا شروع ہوگیا۔ اور پندرہ سو آدمیوں نے پیا بھی اور وضو بھی کیا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۸۲)

دوسری صورت: حدیبیہ میں جو کنواں تھا، لوگوں نے اس کا سارا پانی کھینچ ڈالا، ایک قطرہ بھی نہ چھوڑا۔ نبی ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی، آپؐ تشریف لائے اور کنویں کی من پر تشریف فرما ہوئے، پھر پانی کا ایک برتن منگوایا اور اس میں وضو کیا۔ اور غُسالہ کنویں میں ڈالا، اور فرمایا: تھوڑی دیر کنویں کو چھوڑ دو۔ پھر اس میں اتنا پانی ہوگیا کہ حدیبیہ کے پورے قیام میں لوگ اس کا پانی استعمال کرتے رہے (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۵۸۸۳)

تیسری صورت: حدیبیہ میں بیعتِ رضوان ہوئی۔ جس کا تذکرہ سورۃ الفتح آیت ۱۸ میں ہے۔ اس بیعت نے مخلص مسلمانوں کے اخلاص پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

[۲۹] ولما غزا بنی المصطلق: ظهرت الملائكة متمثلةً، فخاف العدوُّ.

واتُّهِمت عائشةُ في تلك الغزوة، فظهرت رحمة الله بتَبْرِئَتِها، وإقامةِ الحدّ على من أشاع الفاحشةَ عليها.

[۳۰] ولما انكسفت الشمس: تضرَّع إلى الله: فإنه آية من آيات الله، يترشح عندها خوف في قلوب المُصْطَفَيْنَ؛ ورأى في ذلك الجنةَ والنارَ، بينه وبين جدار القبلة، وهو من ظهور حكم المثال في مكان خاص.

[۳۱] وأراه الله في رؤياه: ما يقع بعدَ الفتح: من دخولهم مكةَ محلِّقين ومقصِّرين، لايخافون، فرغبوا في العمرة، ولَمَّا يأْنِ وقتُها، وكان ذلك تقريبًا من الله للصلح الذي هو سبب فتوح كثيرة، وهم لايشعرون.

ونظير ذلك: ما قالته عائشة رضي الله عنها في معارضة أبي بكر وعمر رضي الله عنهما، عند موت النبي صلى الله عليه وسلم: " إن في كل قولٍ فائدةً فردُّ الله المنافقين بقول عمر رضي الله عنه، وبَيَّنَ الحقَّ بقول أبي بكر رضي الله عنه"

فآل الأمر إلى أن اجتمع رأي هؤلاء وهؤلاء أن يصطلحوا، وإن كرهه الفتنان.

وظهرتْ هنالك آيات:

[الف] عطشوا، ولم يكن عندهم ماءٌ إلا في رَكْوَةٍ، فوضع عليه السلام يدَه فيها، فجعل الماءُ يفور من بين أصابعه.

[ب] ونزحوا ماءَ الحديبية، فلم يتركوا فيها قطرة، فَبَرَّكَ عليها، فسقوا واستَقَوْا.
[ج] ووقعت بيعةُ الرضوان: مُعَرِّفَةً لإخلاص المخلصين.

ترجمہ: (۲۹) اور جب آپ نے بنوالمصطلق پر فوج کشی کی تو ملائکہ ظاہر ہوئے، درانحالیکہ وہ پیکر محسوس اختیار کرنے والے تھے، پس دشمن ڈر گیا ـــــ اور عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس غزوہ میں تہمت لگائی گئی، پس اللہ کی رحمت ظاہر ہوئی، ان کی بے گناہی ظاہر کرنے کے ذریعہ، اور ان لوگوں پر حد جاری کرنے کے ذریعہ جنھوں نے ان کے بارے میں بدکاری کی اشاعت کی تھی ـــــ (۳۰) اور جب سورج گہنایا تو آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے یعنی نماز کسوف پڑھی۔ کیونکہ گہن لگنا اللہ کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی ہے۔ خوف مترشح ہوتا ہے نشانیاں ظاہر ہونے پر منتخب بندوں کے دلوں میں۔ اور آپ نے اس تضرع (نماز) میں جنت وجہنم کو دیکھا، اپنے اور جدار قبلہ کے درمیان۔ اور وہ مثال کا حکم ظاہر ہونے سے ہے خاص مقام میں ـــــ (۳۱) اور اللہ نے آپ کو اپنے خواب میں وہ بات دکھلائی جو فتح مکہ کے بعد پیش آنے والی تھی یعنی صحابہ کا مکہ میں جانا، درانحالیکہ وہ سر منڈوانے والے ہیں، اور پٹھے کٹوانے والے ہیں، کسی سے نہیں ڈرتے ہیں۔ پس ان کو عمرہ کا شوق ہوا، حالانکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اور یہ بات (شوق) اللہ کی طرف سے ایک تقریب تھی اس صلح کے لئے جو کہ وہ بہت سی فتوحات کا سبب تھی، درانحالیکہ ان کو احساس نہیں تھا ـــــ اور اس کی نظیر: وہ بات ہے جو عائشہ رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے معارضہ (مقابلہ) کے سلسلہ میں نبی ﷺ کی وفات کے وقت: ”بیشک ہر بات میں فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عمرؓ کی بات سے منافقین کو پھیر دیا، اور ابوبکرؓ کی بات سے حق کو واضح کیا“ ـــــ پس لوٹا معاملہ اس بات کی طرف کہ اِن کی اور اُن کی رائے متفق ہوگئی اس پر کہ وہ مصالحت کریں۔ اگرچہ اس کو دونوں جماعتیں (مسلمان اور مشرکین) ناپسند کرتی تھیں (اس کا تعلق ماسبق سے ہے، نظیر سے نہیں) ـــــ اور وہاں نشانیاں ظاہر ہوئیں: (الف) لوگ پیاسے ہوئے، اور ان کے پاس پانی نہیں تھا، مگر چمڑے کے ایک چھوٹے سے برتن میں، پس نبی ﷺ نے اس میں اپنا ہاتھ رکھا، پس آپ کی انگلیوں کے درمیان سے پانی نے ابلنا شروع کیا ـــــ (ب) اور لوگوں نے حدیبیہ کا پانی کھینچ لیا، پس اس میں ایک قطرہ بھی نہ چھوڑا، پس اس کے لئے آپ نے برکت کی دعا کی، پس انھوں نے پیا اور پانی لیا ـــــ (ج) اور بیعت رضوان پیش آئی: درانحالیکہ وہ مخلصین کے اخلاص کو پہچانوانے والی تھی۔

☆ ☆ ☆

فتح خیبر: فائدے اور نشانیاں

ذی قعدہ ۶ ہجری میں صلح حدیبیہ ہوئی۔ اس کے فوراً بعد محرم ۷ ہجری میں خیبر فتح ہوا، یہاں یہود آباد تھے۔ اس فتح سے دو عظیم فائدے حاصل ہوئے:

ایک: مالِ غنیمت میں جائدادیں بھی ہاتھ آئیں۔ جن سے مسلمانوں کے لئے آمدنی کا ذریعہ پیدا ہوگیا، اور وہ جہاد کے لئے فارغ ہوگئے۔

دوسرا: اس فتح سے نظام خلافت کا آغاز ہوا۔ اور نبی ﷺ زمین میں اللہ کے خلیفہ بن گئے۔

وضاحت: غزوۂ احزاب تک مسلمان دفاعی پوزیشن میں تھے۔ اس وقت تک مسلمانوں کو اپنا وجود باقی رکھنا ہی مشکل ہو رہا تھا۔ صلح حدیبیہ سے امن و اطمینان نصیب ہوا۔ اس کے بعد فتح خیبر اسلامی حکومت کی پہلی باقاعدہ مہم تھی۔ جس سے نظامِ حکومت کی داغ بیل پڑی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سربراہی منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی۔

اور جنگِ خیبر کے موقعہ پر جو نشانیاں ظاہر ہوئیں: وہ درج ذیل ہیں:

پہلی نشانی: سلام بن مِشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے آپ ﷺ کی دعوت کی، اور بھنی ہوئی بکری میں زہر ملادیا۔ آپؐ نے اس کا ایک ٹکڑا چبایا، مگر نگلا نہیں، تھوک دیا، اور فرمایا: یہ گوشت مجھے بتلا رہا ہے کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔ پھر اس عورت سے پوچھا گیا تو اس نے اقرار کیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے کہا: میں نے سوچا اگر یہ بادشاہ ہے تو ہمیں اس سے نجات مل جائے گی، اور اگر نبی ہے تو اسے خبر دیدی جائے گی (رواہ البخاری وغیرہ، مشکوٰۃ حدیث ۵۹۳۱، ۵۹۳۵)

دوسری نشانی: جنگِ خیبر میں حضرت سلمۃ بن الاکوع رضی اللہ عنہ کو سخت چوٹ لگی۔ آپؐ نے اس پر تین پھونکیں ماریں، پس اس میں کبھی تکلیف محسوس نہ ہوئی (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۵۸۸۶)

تیسری نشانی: آپ ﷺ نے قضاء حاجت کرنی چاہی۔ مگر کوئی ایسی چیز نہ دیکھی جس سے پردہ کریں۔ آپؐ نے دو درختوں کو بلایا۔ دونوں نکیل ڈلے ہوئے اونٹ کی طرح تابعداری کی۔ پھر جب آپؐ فارغ ہوگئے تو دونوں کو ان کی جگہوں کی طرف واپس کردیا (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۵۸۸۵)

چوتھی نشانی: نبی ﷺ اپنی تلوار ایک درخت سے لٹکا کر اس کے نیچے آرام فرما رہے تھے۔ صحابہ دور تھے۔ اچانک قبیلہ بنی محارب کا ایک شخص آیا جس کا نام غَورث بن الحارث تھا۔ اس نے تلوار اتاری، اور سونت کر کھڑا ہوگیا۔ آپؐ کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ اس نے کہا: بتا اب تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ نے تین بار فرمایا: "اللہ!" اللہ نے اس کے ہاتھ باندھ دیئے، اور وہ تلوار نہ چلا سکا (بخاری حدیث ۴۱۳۶ یہ واقعہ غزوۂ خیبر کا نہیں۔ دیکھیں فتح الباری ۷: ۴۱۷ باب غزوۃ ذات الرقاع)

[۳۲] ثم فتح الله عليه خيبر، فأفاء منه على النبى صلى الله عليه وسلم والمسلمين ما يَتَقَوَّوْنَ به على الجهاد؛ وكان ابتداء انتظام الخلافة، فصار عليه السلام خليفةَ الله فى الأرض.

وظهرت آيات:

[الف] دَسُّوا السَّمَّ فى طعامه صلى الله عليه وسلم، فَنَبَّأَهُ اللّٰهُ به.

[ب] وأصابت سلمةَ بن الأكوع ضربةٌ، فنفث فيها ثلاث نفثاتٍ، فما اشتكاها بعدُ.
[ج] وأراد أن يقضي حاجته، فلم يرشيئا يستتر به، فدعا شجرتين، فانقادتا كالبعير المَخْشُوْشِ، حتى إذا فرغ ردَّهما إلى موضعهما.
[د] ولما أراد المحاربيُّ أن يَسْطُوَ بالنبي صلى الله عليه وسلم: ألقي الله عليه الرعب، فربط يده.

لغت: خَشَّ البعيرَ: اونٹ کے ناک میں خِشاش ڈالنا الخِشَاش: اونٹ کی ناک میں ڈالی جانے والی لکڑی، جس سے رسّی کو باندھا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

شاہوں کے نام والا نامے

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل میں وہ بات ڈالی جو ملأ اعلیٰ میں طے پاچکی تھی یعنی سرکشوں کا صفایا کرنا، ان کے دبدبہ کو ختم کرنا، اور ان کی ریت رواج کو مٹانا۔ چنانچہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ـــــ حکومت کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے نہیں ـــــ اس سلسلہ میں سعی شروع کردی۔ پس آپؐ نے کسریٰ (شاہِ ایران خسرو پرویز) قیصر (شاہ روم) اور ہر ضدی ظالم کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے۔ کسریٰ نے آپؐ کے خط کو چاک کردیا۔ اور نہایت متکبرانہ انداز میں بولا: ہماری رعایا کا ایک حقیر غلام اپنا نام مجھ سے پہلے لکھتا ہے! رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ اس کی بادشاہت کو پارہ پارہ کردے!'' چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا آپؐ نے فرمایا تھا (بخاری حدیث ۶۴)

معرکہ مُوتہ اور شہدا کی اطلاع

رسول اللہ ﷺ نے تین ہزار کا ایک لشکر موتہ کی طرف روانہ فرمایا۔ اور اس کا سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بنایا، اور فرمایا: ''اگر وہ شہید ہوجائیں تو جعفر رضی اللہ عنہ سپہ سالار ہیں۔ اور وہ بھی شہید ہوجائیں تو عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کمان سنبھالیں۔ اور وہ بھی شہید ہوجائیں تو مسلمان مشورہ کرکے کسی کو امیر بنالیں'' خلاف توقع اس لشکر کا مقابلہ ایک لاکھ رومیوں سے ہوگیا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے وحی سے اطلاع دینی شروع کی۔ فرمایا: جھنڈا زید نے لیا، اور وہ لڑتے لڑتے شہید ہوگئے۔ پھر جھنڈا جعفر نے لیا، اور وہ بھی شہید ہوگئے۔ پھر ابن رواحہ نے لیا، اور وہ بھی شہید ہوگئے ـــــ آپؐ یہ اطلاعات دے رہے تھے اور آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں ـــــ پھر فرمایا: اب جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالد بن ولید رضی اللہ عنہ) نے لیا، اور اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائی۔

تقریب فتح مکہ

حدیبیہ کی مصالحت میں ایک دفعہ یہ تھی: ''جو محمد (ﷺ) کے عہد و پیمان میں داخل ہونا چاہے: داخل ہو سکے گا۔ اور جو قریش کے عہد و پیمان میں داخل ہونا چاہے: داخل ہو سکے گا۔ اور جو قبیلہ جس فریق میں شامل ہوگا: اس فریق کا ایک جزء سمجھا جائے گا۔ اوراس قبیلہ پر زیادتی خود اس فریق پر زیادتی متصور ہوگی''

اس دفعہ کی رو سے بنو خُزاعہ رسول اللہ ﷺ کے عہد و پیمان میں داخل ہو گئے، اور بنو بکر قریش کے عہد و پیمان میں۔ مگر چونکہ ان دونوں قبیلوں میں دورِ جاہلیت سے عداوت چلی آرہی تھی اس لئے ایک وقت کے بعد بنو بکر کی نیت بگڑی۔ اور انھوں نے شعبان ۸ ہجری میں رات کی تاریکی میں بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے اس جنگ میں ہتھیاروں سے بنوبکر کی مدد کی، بلکہ ان کے کچھ آدمی بھی رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر لڑائی میں شریک ہوئے، اور بنوخزاعہ کے متعدد آدمیوں کو مار دیا۔ بنوخزاعہ نے مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، اور مدد طلب کی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اس طرح جب رسول اللہ ﷺ عرب قبائل کے ساتھ جہاد سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کی تقریب پیدا کی۔ چنانچہ آپؐ دس ہزار کا لشکر لے کر نہایت راز داری کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے جو بدری صحابی ہیں اپنے بال بچوں کی محبت میں جو مکہ میں تھے: ایک خط کے ذریعہ قریش کو اطلاع دینی چاہی، مگر وحی کے ذریعہ آپؐ کو اس کی اطلاع ہوگئی، اور وہ خط پکڑ لیا گیا۔ اور آپؐ اچانک مکہ مکرمہ پہنچ گئے، اور مکہ کافروں کے علی الرغم فتح ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان تک ایسے طریقے سے اسلام پہنچا دیا کہ ان کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

حنین میں آپؐ کی ثابت قدمی

جب جنگ حنین میں مسلمانوں اور کافروں میں مڈبھیڑ ہوئی، اور مسلمانوں میں بھگدڑ مچی تو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے خاندان کے لوگ ثابت قدمی کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے۔ اور آپؐ نے کفار پر ایک مٹھی مٹی پھینکی۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اس مٹی پھینکنے میں برکت پیدا کی۔ چنانچہ کوئی کافر ایسا نہ بچا جس کی دونوں آنکھوں میں وہ مٹی بھر نہ گئی ہو، پس وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر سکینت نازل فرمائی، پس وہ اکٹھا ہوئے، اور جم کر لڑے، یہاں تک کہ فتح ہوگئی (مشکوۃ احادیث ۵۸۸۸-۵۸۹۱)

اس جنگ میں ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک شخص جو اسلام کا مدعی تھا، اور میدان جنگ میں خوب جم کر لڑا تھا: اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ وہ دوزخیوں میں سے ہے! آپؐ کی اس بات سے قریب تھا کہ بعض لوگ شک میں مبتلا ہو جائیں۔ مگر جلد یہ بات کھلی کہ اس نے خودکشی کر لی ہے (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۵۸۹۲)



[۳۳] ثم نفث الله في رُوعه ما انعقد في الملأ الأعلى: من لعن الجبابرة، وإزالة شوكتهم، وإبطالِ رسومهم: فتقرب إلى الله بالسعي في ذلك، فكتب إلى قيصر وكسرى، وكلِّ جبار عنيد، فأساء كسرى الأدبَ، فدعا عليه، فمزَّقه الله كلَّ ممزق.

[۳٤] وبعث صلى الله عليه وسلم زيدًا، وجعفرًا، وابنَ رَواحة إلى مُؤْتَةَ، فانكشف عليه حالُهم، فنَعَاهم عليه السلام قبلَ أن يأتي الخبر.

[۳۵] ثم بعث الله تقريبًا لفتح مكة، بعد مافرغ من جهاد أحياء العرب، فنقضت قريشٌ عهودَها، وتَعَامَوْا، وأراد حاطب أن يخبرهم، فنبأ الله بذلك رسولَه، وفتح مكة ولو كره الكافرون، وأدخل عليهم الإسلامَ من حيث لم يحتسبوا.

[۳٦] ولما التقى المسلمون والكفار يوم حنين، وكانت لهم جولةٌ: استقام رسولُ الله صلى الله عليه وسلم وأهلُ بيته أشدَّ استقامةٍ، ورماهم بتراب، فبورك في رميه، فما خلق الله منهم إنسانا إلا ملأ عينيه ترابا، فولوا مدبرين؛ ثم ألقى الله سكينته على المسلمين، فاجتمعوا واجتهدوا، حتى كان الفتح.

وقال لرجل يَدَّعِي الإسلامَ، وقاتل أشد القتال: "هو من أهل النار!" فكاد بعض الناس يرتاب، ثم ظهر أنه قتل نفسَه.

ترجمہ: (۳۳) پھر اللہ نے آپؐ کے دل میں وہ بات ڈالی جو ملأ اعلیٰ میں طے پاچکی تھی یعنی سرکشوں کو اللہ کی رحمت سے دور کرنا، اور ان کے دبدبہ کو ختم کرنا، اور ان کے طور طریقوں کو ملیامیٹ کرنا۔ پس آپؐ نے اللہ کی نزدیکی حاصل کی اس سلسلہ میں کوشش کرنے کے ذریعہ۔ چنانچہ آپؐ نے کسریٰ و قیصر اور ہر ضدی ظالم کی طرف خطوط لکھے۔ پس کسریٰ نے بے ادبی کی، پس آپؐ نے اس کے حق میں بددعا کی، پس اس کو اللہ نے پارہ پارہ کرکے پھاڑ دیا —— (۳۴) اور نبی ﷺ نے زید اور جعفر اور ابن رواحہ کو موتہ کی طرف بھیجا۔ پس آپؐ پر ان کی حالت منکشف ہوئی۔ پس آپ ﷺ نے ان کی شہادت کی خبر دی محاذ جنگ سے خبر آنے سے پہلے —— (۳۵) پھر اللہ نے فتح مکہ کے لئے تقریب اٹھائی، قبائل عرب سے جہاد سے فارغ ہونے کے بعد، پس قریش نے اپنے عہدوں کو توڑ دیا۔ اور وہ اندھے بن گئے۔ اور حاطب نے چاہا کہ ان کو خبر کردیں، پس اللہ نے اپنے رسول کو اس کی خبر کردی، اور آپؐ نے مکہ فتح کرلیا، اگرچہ کافروں کو کیسا ہی ناگوار ہو۔ اور ان پر اللہ نے اسلام کو داخل کیا جہاں سے ان کو وہم و گمان بھی نہیں تھا —— (۳۶) اور جب جنگِ حنین کے موقعہ پر مسلمانوں اور کافروں میں مڈبھیڑ ہوئی، اور مسلمانوں میں بھگدڑ مچی، تو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے خاندان کے لوگ (آپؐ کے بھتیجے ابوسفیان بن الحارث

اور آپؐ کے چچا حضرت عباس) ثابت قدمی کے ساتھ ڈٹے رہے۔ اور آپؐ نے کفار پر مٹی پھینکی۔ پس آپؐ کے مٹی پھینکنے میں برکت پیدا کی گئی، پس نہیں پیدا کیا اللہ نے ان میں سے کسی انسان کو مگر اللہ نے اس کی دونوں آنکھوں کو مٹی سے بھر دیا۔ بس وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا سکون نازل فرمایا، پس وہ اکٹھا ہوئے، اور تن توڑ محنت کی، یہاں تک کہ فتح ہوئی ــــ اور آپؐ نے فرمایا ایک ایسے شخص کے بارے میں جو اسلام کا دعویدار تھا۔ اور خوب جم کر لڑا تھا: ''وہ دوزخیوں میں سے ہے!'' پس قریب تھے بعض لوگ کہ شک میں مبتلا ہو جائیں، پھر ظاہر ہوئی یہ بات کہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔

☆ ☆ ☆

آٹھ معجزات

پہلا معجزہ: نبی ﷺ پر سحر کیا گیا۔ جس سے یہ اثر ہوا کہ بعض دنیوی کاموں میں ایسا خیال ہونے لگا کہ آپؐ نے وہ کام کر لیا ہے، حالانکہ نہیں کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن نبی ﷺ میرے گھر میں تھے۔ آپؐ نے اللہ سے دعا کی اور خوب دعا کی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''عائشہ! تمہیں معلوم ہے، اللہ نے مجھے اس معاملہ میں صورتِ حال سے واقف کر دیا جس کے بارے میں میں نے اللہ سے دعا کی تھی! میرے پاس خواب میں دو شخص آئے۔ ایک سر کے پاس بیٹھا، دوسرا پیروں کے پاس۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: ان صاحب کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا: یہ سحر زدہ ہیں۔ پہلے نے پوچھا: کس نے سحر کیا ہے؟ جواب دیا: لبید بن اعصم یہودی نے۔ پہلے نے پوچھا: کس چیز پر کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا: کنگھی، کنگھی کرتے وقت گرے ہوئے بال، اور نر درخت کھجور کے پھول کے چھلکے میں۔ پہلے نے پوچھا: اس کو کہاں دفن کیا ہے؟ دوسرے نے کہا: بیر ذروان میں۔ چنانچہ آپؐ چند صحابہ کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے، اور اس کو نکال لائے (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۵۸۹۳)

دوسرا معجزہ: نبی ﷺ حنین کی غنیمتیں تقسیم فرما رہے تھے کہ ذو الخُوَیصرہ نامی شخص آیا، اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! انصاف سے کام لیں! آپؐ نے فرمایا: ''تیرا ناس ہو! اگر میں انصاف نہیں کرونگا تو کون انصاف کرے گا؟!'' پھر آپؐ پر اس کا اور اس کی قوم کا انجام منکشف ہوا۔ فرمایا: یہ لوگوں کی بہترین جماعت سے لڑیں گے۔ ان کی نشانی ایک سیاہ فام آدمی ہے، جس کے دو بازوؤں میں سے ایک بازو عورت کی پستان کی طرح ہوگا۔ یہی خوارج کا فرقہ بنا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ٹکرایا۔ جنگ کے خاتمہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے لاشوں کو دیکھا گیا تو ان میں ایک شخص انہی علامتوں کا پایا گیا (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۵۸۹۴)

تیسرا معجزہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کو دین کی دعوت دیتے تھے، مگر وہ نہیں مانتی تھیں۔ ایک بار اس نے نبی ﷺ کی شان میں نامناسب کلمات کہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دلفگار خدمتِ نبوی میں پہنچے، اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میری والدہ کی ہدایت کے لئے دعا فرمائیے! آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! ابو ہریرۃ کی والدہ کو ہدایت عطا

فرمایا!'' ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ خوشی سے اچھلتے ہوئے گھر پہنچے، دیکھا کہ ان کی والدہ نہارہی ہے۔ کپڑے بدل کر انھوں نے کلمہ شہادت پڑھا۔ ابو ہریرۃ خوشی کے آنسو بہاتے ہوئے پھر حاضر خدمت ہوئے، اور آپؐ کو اطلاع دی۔ آپؐ نے خدا کا شکرادا کیا (رواہ مسلم، مشکوۃ حدیث ۵۸۹۵)

چوتھا معجزہ: ایک بار نبی ﷺ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، اور فرمایا: ''اگر کوئی شخص اپنا کپڑا بچھاوے، یہاں تک کہ میں اپنی بات پوری کروں، پھر وہ کپڑا سمیٹ کر اپنے سینے سے لگالے، تو وہ میری اس گفتگو میں سے قطعاً کوئی بات نہیں بھولے گا'' حضرت ابو ہریرۃ نے فوراً اپنی چادر بچھادی، اور جب تقریر پوری ہوئی تو سمیٹ کر اپنے سینہ سے لگالی۔ فرماتے ہیں کہ میں اس تقریر کا ایک حرف آج تک نہیں بھولا! (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۹۶)

پانچواں معجزہ: نبی ﷺ نے حضرت جریر بن عبداللہ بجلی کو ذوالخلصہ مندر یڈھانے کے لئے بھیجنا چاہا تو انھوں نے عرض کیا: میں گھوڑے پر جم کر نہیں بیٹھ سکتا، گر پڑتا ہوں! آپؐ نے ان کے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا، اور فرمایا: ''اے اللہ! اس کو جمادے!'' چنانچہ وہ اس کے بعد کبھی گھوڑے سے نہیں گرے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۹۷)

چھٹا معجزہ: ایک شخص نبی ﷺ کا کاتب تھا۔ وہ اسلام سے پھر گیا، اور مشرکین سے جاملا۔ آپؐ نے اس کے بارے میں فرمایا: ''اس کو زمین قبول نہیں کرے گی!'' چنانچہ جب وہ مرا، تو اس کو بار بار دفن کیا گیا، مگر زمین نے ہر بار اس کو نکال پھینکا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۸۹۸)

ساتواں معجزہ: نبی ﷺ کھجور کے ایک ستون سے ٹیک لگا کر جمعہ کا خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب ممبر بنایا گیا، اور اس کو مسجد میں رکھا گیا، اور آپؐ خطبہ دینے کے لئے اس پر کھڑے ہوئے تو وہ ستون چیخ پڑا۔ آپؐ ممبر سے اترے اور اس کو پکڑ کر چمٹایا تب اس کو سکون ہوا (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۵۹۰۳)

آٹھواں معجزہ: ایک رات کوئی شور سنائی دیا۔ نبی ﷺ فوراً گھر سے نکلے، اور حضرت ابوطلحہ کے ایک مَنْتھے گھوڑے پر سوار ہوکر آواز کی طرف تشریف لے گئے۔ جب لوگ نکل کر اس طرف چلے تو آپ لوٹ کر آرہے تھے۔ فرمایا: ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں'' اور گھوڑے کے بارے میں فرمایا: ''یہ گھوڑا جس کو تم مَنْتھا کہتے ہو، ہم نے تو اس کو سمندر پایا!'' یہ آپؐ کی سواری کی برکت تھی۔ چنانچہ بعد میں اس گھوڑے کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا (رواہ البخاری، مشکوۃ حدیث ۵۹۰۵)

[٣٧] وسُحِر النبي صلى الله عليه وسلم، فدعا الله أن يكشف عليه جلية الحال، فجاءه فيما يراه رجلان، وأخبراه عن السحر والساحر.

[٣٨] وأتاه ذو الخُوَيصرةَ، فقال: يارسول الله! اعْدِلْ، فانكشف عليه مآله ومآل قومه: يقاتلون خيرَ فرقةٍ من الناس؛ آيتهم رجلٌ أسودُ، إحدى عَضُديه مثلُ ثَدْيِ المرأة، فقاتلهم علي رضي الله عنه، ووجد الوصف كما قال.

[٣٩] ودعا لأم أبي هريرة، فآمنت في يومها.

[٤٠] وقال عليه السلام يوما: " لن يَبْسُطَ أحدٌ منكم ثوبَه حتى أَقْضِيَ مقالتي هذه، ثم يجمعه إلى صدره، فَيَنْسٰى من مقالتي شيئًا أبدًا" فبسط أبو هريرة، فما نسي منها شيئا.

[٤١] وضرب عليه السلام بيده على صدر جرير، وقال: " اللّٰهم ثَبِّتْهُ!" فما سقط عن فرسه بعدُ؛ وكان لايثبت على الخيل.

[٤٢] وارتدَّ رجل عن دينه، فلم تقبله الأرض.

[٤٣] وكان عليه السلام يخطب، مستنِدًا إلى جِذْعٍ، فلما صُنع له المنبر، واستوى عليه: صاح، حتى أخذه وضمَّه.

[٤٤] ورَكِبَ فرسًا بطيئًا، وقال: " وجدنا فرسكم هذا بحرًا!" فكان بعد ذلك لايُجَارى.

ترجمہ: (۴۴) اور آپ ﷺ ایک سست گھوڑے پر سوار ہوئے، اور فرمایا: ''ہم نے تمہارے اس گھوڑے کو سمندر پایا!'' پس وہ اس کے بعد مقابلہ نہیں کیا جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

غزوۂ تبوک کا سبب اور اس سفر کے چھ واقعات

فتح مکہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مضبوط کردیا، لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگے، فتوحات کا دروازہ کھل گیا، آپؐ نے قبائل پر عُمّال (زکوۃ وصول کرنے والے) بھیجے۔ تمام علاقوں میں قاضیوں کا تقرر کیا، اور خلافتِ اسلامیہ کا ڈھانچہ مکمل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے دل میں غزوۂ تبوک کا داعیہ پیدا کیا، تاکہ روم پر آپؐ کا دبدبہ ظاہر ہو، اور اُس علاقہ کے لوگ بھی آپؐ کی تابعداری کریں —— یہ غزوہ سخت گرمی کے زمانہ میں اور قحط سالی کے وقت میں پیش آیا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو کسوٹی بنادیا، اور اس کے ذریعہ سچے مؤمنین اور منافقین کے درمیان امتیاز قائم کردیا۔

فائدہ: غزوۂ تبوک کا سلسلہ بظاہر غزوۂ موتہ سے جُڑا ہوا تھا۔ غزوۂ موتہ کا سبب یہ بنا تھا کہ آپؐ نے حضرت حارث بن عُمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو بُصریٰ کے حاکم کے نام ایک خط دیکر روانہ کیا تھا۔ راستہ میں رومیوں کے گورنر شرحبیل بن عَمرو غسانی نے ان کو پکڑ کر سخت تکلیف دیکر قتل کردیا تھا۔ آپؐ نے اس کے خلاف کارروائی کے لئے تین ہزار کا لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں روانہ فرمایا تھا۔ مگر اتفاق سے اس کا ٹکراؤ رومیوں کی ایک لاکھ فوج سے ہوگیا۔ اور سخت معرکہ کے بعد اور کئی سرداروں کی شہادت کے بعد، حضرت خالد رضی اللہ عنہ اس لشکر کو ایک ترکیب سے نکال لائے۔

اس واقعہ کے بعد رومیوں نے، جو اس وقت کی واحد بڑی طاقت تھی، مدینہ پر چڑھائی کرنے کی زور وشور سے تیاری

شروع کردی، اور چالیس ہزار کا لشکرِ جرار سرحد پر جمع کرلیا۔ جب نبی ﷺ کو اس کی اطلاعات پہنچیں تو فوجی حکمت عملی کا تقاضا ہوا کہ وہ چڑھ آئیں، اس سے پہلے ان پر وار کیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے پوری تیاری کے ساتھ یہ سفر کیا، مگر اللہ نے رومیوں کے دل میں خوف ڈال دیا، اور وہ منتشر ہوگئے، اور آپؐ مظفر و منصور لوٹ آئے۔

اس سفر میں چند واقعات پیش آئے: جو درج ذیل ہیں:

پہلا واقعہ: نبی ﷺ وادی القریٰ میں ایک عورت کے باغ سے گذرے۔ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا: ''اسے تاڑو'' چنانچہ صحابہ نے مختلف اندازے کئے، آپؐ نے بھی تاڑا، اور دس وسق کا اندازہ لگایا۔ اور اس کی مالکہ سے کہا کہ پیداوار یاد رکھنا، واپسی میں ہم دریافت کریں گے۔ واپسی میں اس نے بتایا کہ دس وسق پیداوار ہوئی (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۹۱۵)

دوسرا واقعہ: تبوک کی راہ میں لشکر کا گزر مقام حجر (دیارِ ثمود) سے ہوا۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم یہاں کا پانی نہ پینا، اور اس سے نماز کے لئے وضو نہ کرنا، اور جو آٹا تم نے اس کے پانی سے گوندھا ہے، وہ جانوروں کو کھلا دو'' ——— صحیحین میں یہ ارشاد بھی مروی ہے کہ ''ان ظالموں کی جائے سکونت میں داخل نہ ہونا، کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آپڑے! ہاں مگر روتے ہوئے'' (بخاری نزول النبی ﷺ الحجر ۲: ۶۳۷) شاہ صاحب رحمہ اللہ اس نہی کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ اس کا مقصد لعنت کی جگہ سے لوگوں کو متنفر کرنا تھا۔ وہ پانی ناپاک نہیں تھا۔

تیسرا واقعہ: تبوک کے راستہ میں ایک رات رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آج رات سخت آندھی چلے گی، پس کوئی نہ اٹھے، اور جس کے پاس اونٹ ہے وہ اس کو رسّی سے مضبوط باندھ دے'' چنانچہ سخت آندھی چلی۔ ایک شخص کھڑا ہوگیا۔ آندھی نے اس کو اڑا کر قبیلہ طی کے دو پہاڑوں کے پاس پھینک دیا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۵۹۱۵)

چوتھا واقعہ: اس سفر میں آپؐ کی اونٹنی گم ہوگئی۔ لوگ اس کی تلاش میں لگ گئے۔ ایک منافق کہنے لگا: یہ نبی تمہیں آسمان کی خبریں دیتے ہیں، اور ان کو معلوم نہیں کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو منافق کی بات کی خبر کی اور اونٹنی کی جگہ بھی بتلائی۔ آپؐ نے فرمایا: ''بخدا! میں وہی جانتا ہوں جو اللہ مجھے بتلاتے ہیں۔ اونٹنی فلاں وادی میں ہے، اس کی لگام ایک درخت سے الجھ گئی ہے!'' (البدایہ والنہایہ ۵: ۹)

پانچواں واقعہ: اس سفر میں تین مخلص صحابہ بغیر عذر کے پیچھے رہ گئے، یہ ان کی لغزش تھی۔ پھر جب ان پر زمین باوجود اپنی پہنائی کے تنگ ہوگئی تو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۸ نازل ہوئی، اور اللہ نے ان سے درگذر کیا۔

چھٹا واقعہ: اس سفر میں رسول اللہ ﷺ نے ۴۲۰ سواروں کا رسالہ دے کر حضرت خالدؓ کو دومۃ الجندل کے حاکم اُکیدر کی طرف بھیجا، اور فرمایا کہ تم اسے نیل گائے کا شکار کرتے ہوئے پاؤ گے۔ جب ان کا لشکر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک نیل گائے آئی اور قلعہ کے دروازے سے سینگ رگڑنے لگی۔ اکیدر اس کے شکار کو نکلا، چاندنی رات تھی، حضرت خالد اور ان کے سواروں نے اس کو پکڑ لیا، اور خدمت نبوی میں لے آئے۔ آپؐ نے اس کی جان بخشی کی، اور جزیہ پر مصالحت کرلی (البدایہ ۵: ۱۷)

[٤٥] ثم أحكم الله دينه، وتواردت الوفودُ، وتواترت الفتوح، وبَعَثَ العمَّال على القبائل، ونَصَبَ القضاةَ في البلاد، وتمت الخلافة، فَنُفِثَ في رُوعه صلى الله عليه وسلم أن يخرج إلى تبوك، ليظهر شوكتُه على الروم، فينقاد له أهلُ تلك الناحية؛ وكانت تلك غزوة في وقت الحر والعسرة، فجعلها الله تمييزا بين المؤمنين حقًا والمنافقين.

[الف] ومَرَّ عليه السلام على حديقة لامرأة في وادی القرى، فخرصها، وخرصها الصحابة رضي الله عنهم، فكان كما قال عليه السلام.

[ب] ولما وصل إلى ديار حِجْرٍ، نهاهم عن مياهه: تنفيرًا عن محل اللعن.

[ج] ونهاهم ليلةً أن يخرج أحدٌ، فخرج رجل، فألقته الريح بجبلَيْ طَيِّئٍ.

[د] وضَلَّ له صلى الله عليه وسلم بعير، فقال بعض المنافقين: لو كان نبيا لعلم أين بعيره؟ فنبأه الله بقول المنافق، وبمكان البعير.

[هـ] وتخلَّف ناس من المخلصين زلَّةً منهم، ثم ضاقت عليهم الأرض بما رحبت، فعفا الله عنهم.

[و] وأُلقي مِلِكُ أيلةَ في أَسْرِ خالد، من حيث لم يحتسب.

ترجمہ: (۴۵) پھر اللہ نے (فتح مکہ کے ذریعہ) اپنا دین مضبوط کیا، اور دَھڑا دھڑ وفود آنے لگے، اور مسلسل فتوحات ہونے لگیں، اور آپؐ نے قبائل پر عُمّال (زکوۃ وصول کرنے والوں) کو بھیجا، اور علاقوں میں قاضیوں کو مقرر کیا، اور خلافت تکمیل پذیر ہوئی، تو آپؐ کے دل میں ڈالا گیا کہ آپ تبوک کی طرف نکلیں، تاکہ روم پر آپؐ کا دبدبہ ظاہر ہو، پس اس علاقہ کے لوگ آپؐ کی تابعداری کریں ــــ اور وہ غزوہ گرمی اور تنگی کے وقت میں پیش آیا تھا، پس اللہ نے اس کو سچے مؤمنین اور منافقین کے درمیان امتیاز کا ذریعہ بنادیا ــــ (الف) اور آپؐ وادی القری میں ایک عورت کے باغ سے گذرے، پس آپؐ نے اس کو تاڑا، اور صحابہ نے بھی اس کو تاڑا، پس ویسا نکلا جیسا نبی ﷺ نے فرمایا تھا ــــ (ب) اور جب آپؐ مقام حِجر پر پہنچے تو لوگوں کو اس کے پانی کے استعمال سے منع کیا: لعنت کی جگہ سے متنفر کرنے کے طور پر ــــ (ج) اور آپؐ نے ایک رات لوگوں کو منع کیا کہ کوئی ڈیرے سے نکلے، پس ایک شخص نکلا، پس اس کو ہوا نے قبیلۂ طی کے دو پہاڑوں میں ڈالدیا ــــ (د) اور نبی ﷺ کا ایک اونٹ گم ہوگیا، پس بعض منافقین نے کہا: ''اگر وہ نبی ہوتے تو وہ جانتے کہ ان کا اونٹ کہاں ہے؟'' پس اللہ نے آپؐ کو منافق کی بات کی بھی خبر کی اور اونٹ کی جگہ کی بھی ــــ (ہ) اور کچھ مخلص لوگ پیچھے رہ گئے، اپنی لغزش کی وجہ سے۔ پھر ان پر زمین باوجود اپنی پہنائی کے تنگ ہوگئی تو اللہ نے ان سے درگزر کیا ــــ (و) اور ایلہ کا بادشاہ (یہ شاید تسامح ہے) خالد کی قید میں پھنسادیا گیا، بایں طور کہ وہ گمان نہیں کرتا تھا۔

☆ ☆ ☆

آخری چھ باتیں

پہلی بات — عہد و پیمان ختم — جب اسلام قوی ہوا، اور لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ نازل فرمائی۔ اور مشرکین کے ساتھ جو عہد و پیمان تھے وہ سب ختم کردیئے گئے۔ اور ۹ ہجری میں حج کے موقعہ پر ان کا اعلانِ عام کردیا گیا۔

دوسری بات — مباہلہ کی تیاری، پھر جزیہ پر مصالحت — نجران کے نصاریٰ کا ایک وفد خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ اور اس نے آپؐ سے مذہبی معاملات میں گفتگو کی۔ اس سلسلہ میں سورہ آل عمران کا ابتدائی حصہ نازل ہوا، اور اس کی آیت ۶۱ میں مباہلہ کا حکم دیا۔ آپ ﷺ مباہلہ کرنے کیلئے تیار ہوگئے، مگر ان لوگوں نے ہتھیار ڈالدیئے، اور جزیہ پر مصالحت کرلی۔

تیسری بات — مناسکِ حج کی تعلیم — ۱۰ ہجری میں آپ ﷺ نے حج فرمایا۔ آپؐ کے ساتھ تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ تھے، آپؐ نے سب کو مناسکِ حج کی تعلیم دی۔ اور مشرکین نے حج میں جو تحریفات کردی تھیں ان کا قلع قمع کردیا۔

چوتھی بات — دین کا خلاصہ کیا — جب دینی راہنمائی کا معاملہ پایۂ تکمیل کو پہنچا، اور آپ ﷺ کی وفات کا وقت قریب آیا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آدمی کی صورت میں بھیجا، جن کو سب صحابہ دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے بارے میں سوالات کئے، اور آپؐ نے جوابات دیئے۔ جن کی جبرئیل علیہ السلام نے تصدیق کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ امت کے سامنے دین کا خلاصہ اور لبِ لباب آجائے۔

پانچویں بات — ملأ اعلیٰ سے ملنے کا اشتیاق — جب آپ ﷺ بیمار ہوئے، تو برابر رفیق اعلیٰ کو یاد کرتے رہے، اور ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وفات دی۔

چھٹی بات — اللہ تعالیٰ ملت کے ذمہ دار — پھر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی ملت کے ذمہ دار بن گئے۔ اور ایسے لوگوں کو دین کے کام کے لئے کھڑا کردیا جو ملامت گر کی ملامت کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے جھوٹے مدعیانِ نبوت سے اور روم وفارس سے لوہا لیا، یہاں تک کہ اللہ کا معاملہ تام ہوا۔ اور نبی ﷺ نے جو وعدے کئے تھے وہ پورے ہوئے۔ اللہ کی بے پایاں رحمتیں برسیں آپؐ پر، آپؐ کے خاندان پر، آپؐ کے اصحاب پر، اور سلام ہو!

[۴۷] فلما قوى الإسلام، ودخل الناس في دين الله أفواجًا: أوحى الله إلى نبيه أن يَنْبِذَ عهدَ كلِّ معاهد من المشركين، ونزلت سورة براءة.

[۴۸] وأراد المباهلة من نصارى نجران، فعجزوا، واختاروا الجزية.

[۴۹] ثم خرج إلى الحج، وحضر معه نحوٌ من مائة ألف وأربعة وعشرين ألفًا، فأراهم مناسكَ الحج، وردَّ تحريفاتِ الشرك.



[۵۰] ولما تم أمر الإرشاد، واقترب أجلُه: بعث الله جبريل في صورة رجل، يراه الناس، فسأل النبيَّ صلى الله عليه وسلم عن الإيمان، والإسلام، والإحسان، والساعة، فبين النبي صلى الله عليه وسلم، وصدَّقه جبريل، ليكون ذلك كالفَذْلكة لدينه.

[۵۱] ولما مَرِضَ: لم يزل يذكر الرفيقَ الأعلى، ويَحِنُّ إليهم، حتى توفاه الله.

[۵۲] ثم تكفَّلَ أمرَ ملتِه، فنصب قومًا لايخافون لومة لائم، فقاتلوا المتنبئين، والروم، والعجم، حتى تم أمر الله، ووقع وعده صلى الله عليه وعلى آله وأصحابه وسلم.

باب ــــــ ۲

فِتَن (آزمائشیں اور ہنگامے)

فتنہ: کا مادہ فَتْن ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں: سونے کو آگ میں تپا کر کھرا کھوٹا معلوم کرنا: أصلُ الفَتْن: إدخالُ الذهبِ النارَ، لِتَظْهَرَ جودتُه من رَداءَتِه (راغب) پھر فتنہ کے معنی آزمائش کے ہوگئے۔ اور آزمائش میں چونکہ تکلیف دی جاتی ہے، اس لئے ایذا رسانی، اور اس کی مختلف شکلوں، اور آزمائش میں جو کھوٹا ثابت ہو، اس کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے: ان سب کے لئے قرآن وحدیث میں لفظ فتنہ اور اس کے مشتقات استعمال کئے گئے ہیں۔ پس فتنہ کے معنی ہیں: آزمائش، آفت، دنگا فساد، ہنگامہ، دکھ دینا اور تختۂ مشق بنانا وغیرہ۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ یہاں انسان ہر گھڑی میدانِ امتحان میں ہے۔ ایمان وکفر تو بڑے امتحان ہیں۔ مگر مؤمن کا بھی مختلف شکلوں میں امتحان ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے: "اللہ تعالیٰ ہر امت کی آزمائش کرتے ہیں، اور میری امت کی آزمائش مال سے کریں گے" (مشکوۃ حدیث ۵۱۹۴) پس اگر مؤمن اس آزمائش میں کامیاب ہوجائے زہے نصیب! ورنہ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

احادیث میں بہت سے فتنوں اور ہنگاموں کی پیشگی اطلاعات دی گئی ہیں، یہ فتن کی روایات کہلاتی ہیں۔ شاہ صاحب قدس سرۂ اس باب میں پہلے فتنوں کی صورتیں بیان کریں گے، پھر احادیثِ فتن کی شرح کریں گے۔

فتنوں کی چھ قسمیں

فتنے چھ قسم کے ہیں:

پہلی قسم ــــ آدمی کے اندر کا فتنہ ــــ اور وہ یہ ہے کہ آدمی کے احوال بگڑ جائیں، اس کا دل سخت ہوجائے، اور اس کو

عبادت میں حلاوت اور مناجات میں لذت محسوس نہ ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے جسم میں فہم کے اعتبار سے تین باریک (خفی) چیزیں ہیں: قلب عقل اورنفس (فطرت وطبیعت) دل: سے غصہ، بہادری، حیا، محبت، خوف، انقباض وانبساط جیسے احوال کا تعلق ہے۔ اورعقل: کا دائرۂ کار وہاں سے شروع ہوتا ہے، جہاں پہنچ کر حواس خمسہ ظاہرہ کا کام ختم ہوجاتا ہے عقل: بدیہی اور نظری دونوں قسم کے علوم کا ادراک کرتی ہے۔ جیسے تجربہ اور حدس وغیرہ کے ذریعہ جو بدیہی باتیں جانی جاتی ہیں وہ عقل کا کام ہے۔ اسی طرح برہان وخطابیات وغیرہ کے ذریعہ جو نظری علوم حاصل کئے جاتے ہیں: وہ بھی عقل کا فعل ہے۔ اورنفس: خواہش کرتا ہے یعنی انسان کی بقاء کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں، جیسے کھانا، پینا، سونا اور صحبت کرنا: ان کی نفس خواہش کرتا ہے۔

قلب کے برے احوال:

۱۔ جب قلب پر بہیمی خصلتیں قبضہ جمالیتی ہیں، اور اس کی دلچسپیاں جانوروں جیسی ہوجاتی ہیں تو وہ قلبِ بہیمی کہلاتا ہے (یہ ادنی درجہ ہے)

۲۔ اور جب خواب یا بیداری میں قلب شیطان کے وسوسے قبول کرتا ہے، تو وہ قلب: قلبِ شیطانی ہوجاتا ہے۔ قرآن (سورۃ الانعام آیت ۱۱۲) میں ایسے لوگوں کو شیاطین الانس (انسان نما شیطان) کہا گیا ہے (یہ فسادِ قلب کا اعلی درجہ ہے)

قلب کے اچھے احوال:

۱۔ جب قلب پر ملکی خصلتیں قبضہ جماتی ہیں، تو وہ قلب: قلبِ انسانی کہلاتا ہے۔ اور اس وقت خوف اور محبت وغیرہ جذبات اُن برحق اعتقادات کی طرف مائل ہوجاتے ہیں جن کو آدمی نے محنت سے حاصل کیا ہے (یہ صلاح کا ادنی درجہ ہے)

۲۔ اور جب دل کی صفائی اور نور قوی ہوجاتا ہے، تو صوفیا کی اصطلاح میں اس کو روح کہتے ہیں۔ اب اس دل میں انبساط ہی انبساط ہوتا ہے۔ انقباض کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ اور الفت ومحبت ہی ہوتی ہے، قلق وبے چینی کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ اس دل کے احوال کو صوفیا انفاس کہتے ہیں۔ جب قلب اس حال میں پہنچ جاتا ہے تو ملکی خصوصیات عادتِ ثانیہ بن جاتی ہیں، اب وہ اکتسابی نہیں رہتیں (یہ صلاح کا اعلی درجہ ہے)

عقل کے برے احوال:

۱۔ جب عقل پر بہیمی خصلتیں غالب آجاتی ہیں تو عقل مکار ہوجاتی ہے۔ اور آدمی کو ایسے خیالات آنے لگتے ہیں جو فطری تقاضوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جیسے جماع کے خیالات آتے ہیں، اگر شہوت کی فراوانی ہوتی ہے، اور کھانوں کے خیالات آتے ہیں، اگر وہ بھوکا ہوتا ہے (یہ فسادِ عقل کا ادنی درجہ ہے)

۲۔ اور اگر عقل پر شیطان کی وحی قبضہ جمالیتی ہے تو آدمی کو بہترین نظام کی شکست وریخت کے خیالات آتے ہیں۔

معتقداتِ حقّہ میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایسی مکروہ ومنکر ہیئتوں کی طرف اس کا میلان ہوجاتا ہے جن سے نفوس سلیمہ نفرت کرتے ہیں (یہ فسادِ عقل کا اعلی درجہ ہے)

عقل کے اچھے احوال:

۱۔ جب عقل پر کسی درجہ میں ملکی خصلتیں قبضہ جمالیتی ہیں تو وہ بدیہی یا نظری ارتفاقی اور احسانی علوم کی تصدیق کرنے لگتی ہے، جن کی تصدیق ضروری ہے (یہ ادنی درجہ ہے)

۲۔۔۔ اور جب عقل کی صفائی اور نور قوی ہوجاتا ہے تو اس کو صوفیا کی اصطلاح میں ''سر'' کہتے ہیں۔ جس کا کام ایسے علوم کو قبول کرنا ہوتا ہے جن کا خواب میں یا ذہانت، کشف اور غیبی آواز وغیرہ کے ذریعہ عالم غیب سے فیضان کیا جاتا ہے (یہ درمیانی درجہ ہے)

۳۔ اور جب عقل ایسی مجرد ذات کی طرف مائل ہوتی ہے، جو زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے، تو صوفیا کی اصطلاح میں اس کو عقل خفی کہتے ہیں (اور یہ عقل کی ترقی کا اعلی درجہ ہے، اس سے اوپر کوئی درجہ نہیں)

نفس کے تین احوال:

۱۔ جب نفس بہیمی خصلتوں کی طرف اترتا ہے تو وہ نفس امّارہ کہلاتا ہے (یہ برا نفس ہے)

۲۔۔ اور جب نفس: ملکیت وبہیمیت کے درمیان متردد ہوتا ہے۔ کبھی ملکیت کی طرف جھکتا ہے تو کبھی بہیمیت کی طرف، تو وہ نفس لوّامہ کہلاتا ہے (یہ بَین بَین حالت ہے، اور غنیمت ہے)

۳۔ اور جب نفس: شریعت کے احکام کا پابند ہوجاتا ہے، اور کبھی اس کے خلاف اقدام نہیں کرتا ہمیشہ اس کے موافق ہی عمل کرتا ہے، تو وہ نفس مطمئنہ کہلاتا ہے (یہ عمدہ نفس ہے)

غرض: قلب، عقل اور نفس کے خارجی اثرات کی وجہ سے جو برے احوال ہیں، وہ آدمی کے اندرونی فتنے ہیں، جن سے اپنی حفاظت ضروری ہے۔ اور قرآن وحدیث میں عام طور پر اسی فتنہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورۃ الانبیاء آیت ۳۵ میں ہے: ﴿وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً﴾ ترجمہ: اور ہم تم کو جانچتے ہیں برائی سے اور بھلائی سے آزمانے کو یعنی سختی نرمی، تندرستی بیماری، تنگی فراخی، عیش مصیبت وغیرہ احوال بھیج کر تم کو جانچا جاتا ہے، تاکہ کھرا کھوٹا الگ ہوجائے، اور علانیہ ظاہر ہوجائے کہ کُندن کون ہے اور خزف کون؟!

دوسری قسم ۔۔۔ گھر میں فتنہ ۔۔۔ اور وہ نظام خانہ داری کا بگاڑ ہے۔ حدیث میں ہے: ''ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے یعنی دربار لگاتا ہے، پھر وہ لشکر کی ٹکڑیاں بھیجتا ہے۔ ان میں سے اس کے نزدیک مرتبہ میں قریب تر وہ ہوتا ہے، جو ان میں سے سب سے بڑا فتنہ بپا کرے: ان میں سے ایک آتا ہے، اور کہتا ہے: میں نے یہ کیا وہ کیا۔ شیطان کہتا ہے: تونے کچھ نہیں کیا! پھر ان میں سے ایک آتا ہے، اور کہتا ہے: میں ایک شخص کے پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے

درمیان جدائی کرادی! شیطان اس کو قریب کرتا ہے، اور کہتا ہے: تُو نے ! تو نے بڑا اچھا کام کیا! (مسلم شریف ۹:۱۵۷ مصری)

تیسری قسم ـــــ وہ فتنہ جو سمندر کی طرح موجیں مارتا ہے ـــــ اور وہ نظام مملکت کا بگاڑ ہے، اور لوگوں کا ناحق حکومت کی آز کرنا ہے۔ حدیث میں ہے: ''شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرۃ العرب میں نمازی بندے اس کی پرستش کریں۔ البتہ وہ ان کو آپس میں لڑانے میں لگا ہوا ہے'' (مسلم ۱۵۶:۱۷)

چوتھی قسم ـــــ ملی فتنہ ـــــ اور وہ یہ ہے کہ مخصوص صحابہ وفات پا جائیں، اور دین کا معاملہ نااہلوں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ پس اولیاء اور علماء دین میں غلو کریں، اور بادشاہ اور عوام دین میں سستی برتیں۔ نہ اچھے کاموں کا حکم دیں، نہ برے کاموں سے روکیں۔ پس زمانہ: زمانۂ جاہلیت ہو کر رہ جائے۔ حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی بھی امت میں جو بھی نبی مبعوث کیا ہے، اس کے لئے اس کی امت میں سے مخصوص حضرات اور ساتھی ہوتے تھے، جو اس کی سنت پر عمل پیرا ہوتے تھے، اور اس کے دین کی پیروی کرتے تھے۔ پھر ان کے جانشین ایسے ناخلف ہو گئے جو وہ باتیں کہتے تھے جو کرتے نہیں تھے۔ اور وہ کام کرتے تھے جن کا وہ حکم نہیں دئے گئے تھے۔ پس جو شخص ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے، اور جو زبان سے جہاد کرے وہ بھی مؤمن ہے، اور جو دل سے جہاد کرے وہ بھی مؤمن ہے، اور اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ رائے کے دانے کے برابر بھی نہیں'' (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۱۵۷ باب الاعتصام)

پانچویں قسم ـــــ عالم گیر فتنہ ـــــ یہ بددینی کا فتنہ ہے، جب یہ فتنہ رونما ہوتا ہے تو لوگ انسانیت اور اس کے تقاضوں سے نکل جاتے ہیں۔ اور لوگ تین طرح کے ہو جاتے ہیں:

ایک: جو سب سے زیادہ ستھرے اور سب سے زیادہ دنیا سے بے رغبت ہوتے ہیں: وہ دو کام کرتے ہیں: ایک: طبیعت کے تقاضوں سے بالکلیہ برطرف ہو جاتے ہیں، ان کی اصلاح نہیں کرتے یعنی تارک الدنیا ہو جاتے ہیں، اور بیوی بچوں سے بے تعلق ہو کر سنیاسی بن جاتے ہیں۔ حالانکہ شریعت کی یہ تعلیم نہیں۔ شریعت نے طبیعت کی اصلاح کا حکم دیا ہے، اور اس کی صورتیں تجویز کی ہیں۔ دوم: مجردات یعنی ملائکہ کی مشابہت اور ان کا اشتیاق پیدا کرتے ہیں، اور اس کی وہ کوئی نہ کوئی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً شب بیداری کرنا یا کثرت سے روزے رکھنا۔ وغیرہ۔

دوسرے: عام لوگ ہوتے ہیں جو بہیمیتِ خالصہ کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اور حیوانیت کو شرما دینے والے کام کرنے لگتے ہیں۔

تیسرے: بیچ کے لوگ ہوتے ہیں، جو نہ پوری طرح ان کی طرف مائل ہوتے ہیں، نہ اُن کی طرف۔

چھٹی قسم ـــــ فضائی حادثات کا فتنہ ـــــ بڑے بڑے طوفان اٹھتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں، زمین دھنستی ہے، اور بڑے علاقہ میں آگ لگتی ہے اور عام تباہی مچتی ہے، اللہ تعالیٰ ان حادثات کے ذریعہ مخلوق کو ڈراتے ہیں، تاکہ وہ اپنی بداعمالیوں سے باز آئیں۔

﴿ الفِتَن ﴾

اعلَم: أن الفِتَنَ على أقسام:

[۱] فتنة الرجل في نفسه: بأن يَقْسُوَ قلبُه، فلا يجد حلاوةَ الطاعة، ولا لذةَ المناجاة.

وإنما الإنسانُ ثلاثُ شُعَبٍ:

[الف] قلبٌ: هو مبدأ الأحوال، كالغضب، والجرأة، والحياء، والمحبة، والخوف، والقبض، والبسط، ونحوها.

[ب] وعقلٌ: هو مبدأ العلوم اللتي ينتهي إليها الحواسُّ، كالأحكام البديهية: من التجربة، والحدس، ونحوهما؛ والنظرية من البرهان، والخطابة، ونحوهما.

[ج] وطبعٌ: هو مبدأ اقتضاءِ النفسِ مالابد منه، أو لابد من جنسه في بقاء البِنيَة، كالداعية المنبجسة في شهوة الطعام، والشراب، والنوم، والجماع، ونحوها.

ترجمہ: فتنوں کا بیان: جان لیں کہ فتنے چند قسم کے ہیں: (۱) آدمی کا فتنہ اس کی ذات میں: بایں طور کہ اس کا دل سخت ہوجائے، پس وہ عبادت کی حلاوت نہ پائے، اور نہ دعا میں لذت محسوس کرے —— اور انسان تین شاخیں ہی ہے: (الف) دل: وہ احوال کا مبدا ہے، جیسے غصہ، دلیری، شرم، محبت، خوف، انقباض، انبساط، اور ان کے مانند —— (ب) اور عقل: اور وہ ان علوم کا مبدا ہے، جن پر حواس کی انتہا ہوتی ہے۔ جیسے بدیہی احکام: تجربہ اور حدس اور ان کے مانند سے حاصل ہونے والے، اور جیسے نظری احکام: برہان اور خطابت اور ان کے مانند سے حاصل ہونے والے —— (ج) اور طبیعت (نفس) اور وہ آدمی کے اس چیز کو چاہنے کا مبدا ہے جس کے بغیر چارہ نہیں یا اس کی جنس کے بغیر چارہ نہیں، باڈی کے بقاء میں، جیسے وہ تقاضا جو ابھرنے والا ہے کھانے، پینے، سونے اور جماع اور ان کے مانند کی خواہش میں (باقی عبارت اور ترجمہ آگے آرہا ہے)

فالقلب: مهما غلب عليه خصالُ البهيمية، فكان قبضُه وبسطُه نحوَ قبض البهائم وبسطها الحاصلَين من طبيعة ووهم: كان قلبا بهيميا —— ومهما قَبِلَ من الشياطين وسوستَهم في النوم أو اليقظة: يسمى الإنسانُ شيطانَ الإنس.

ومهما غلب عليه خصالُ الملكية: يسمى قلبًا إنسانيا، فيكون خوفُه ومحبتُه وما يشبههما مائلةً إلى اعتقادات حقَّةٍ حصَّلها —— ومهما قَوِيَ صفاؤُه، وعظُم نورُه: كان روحا، فيكون بسطا بلا قبض، وألفةً بلاقلق، وكانت أحوالُه أنفاسًا، وكانت الخواصُّ الملكية كالديدَن له، دون الأمورِ المكتسبةِ بسعي.

ومهما غلب خصال البهيمية على العقل: صار جُرْبُزَةً، وأحاديثُ نفسٍ تميل إلى بعض الدواعي الطبيعية، فيحدِّث نفسَه بالجماع، إن كان فيه شبق، وبأنواع الطعام، إن كان فيه جوع، ونحوُ ذلك —— أو وحيُ الشيطان: فتكون أحاديثُ النفس تميل إلى فكِّ النظامات الفاضلة، وشكٍّ في المعتقدات الحقَّة، وإلى هيئاتٍ منكرةٍ، تعافها النفوس السليمة.

ومهما غلبت عليه خصالُ الملكية في الجملة: كان عقلاً: من فعله التصديق بما يجب تصديقُه من العلوم الارتفاقية أو الإحسانية: بديهة أو نظرًا —— ومهما قَوِيَ نورُه وصفاؤُه: كان سِرًّا: من فعله قبولُ علومٍ فائضةٍ من الغيب: رؤيا، وفراسة، وكشفا، وهتفا، ونحو ذلك —— ومهما مال إلى المجردات البريَّة من الزمان والمكان: كان خفيًّا.

ومهما انحدر الطبعُ إلى الخصال البهيمية: كان نفساً أمَّارةً بالسوء —— ومهما كان مترددًا بين البهيمية والملكية، وكان الأمر سِجَالاً ونُوَبًا: كان نفسًا لوَّامة —— ومهما تقيدت بالشرع، ولم تَبْغِ عليه، ولم تَنْبَجِسْ إلا فيما يوافقه: كان نفسًا مطمئنة —— هذا ما عندي من معرفة لطائف الإنسان، والله أعلم.

ترجمہ: پس جب بھی دل پر بہیمی خصلتیں غالب آتی ہیں، پس اس کا انقباض وانبساط تقریباً جانوروں کے اس انقباض وانبساط کی طرح ہوجاتا ہے جو دونوں طبیعت (فطرت) اور وہم کی وجہ سے حاصل ہونے والے ہیں: تو وہ قلب قلبِ بہیمی ہوتا ہے —— اور جب وہ نیند میں یا بیداری میں شیطان کا وسوسہ قبول کرتا ہے تو انسان: شیطان الانس کہلاتا ہے۔

اور جب قلب پر ملکی خصلتیں غالب آتی ہیں، تو وہ قلب قلبِ انسانی کہلاتا ہے۔ پس اس کا (اللہ سے) ڈرنا اور اس کا محبت کرنا، اور وہ باتیں جو ان دونوں کے مشابہ ہیں: مائل ہونے والی ہوتی ہیں اُن برحق اعتقادات کی طرف جن کو اس نے محنت سے حاصل کیا ہے —— اور جب دل کی صفائی قوی ہوتی ہے، اور اس کا نور بڑا ہوتا ہے: تو وہ دل روح کہلاتا ہے، پس انبساط ہوتا ہے انقباض کے بغیر، اور الفت ہوتی ہے بے چینی کے بغیر، اور اس دل کے احوال انفاس کہلاتے ہیں۔ اور ملکی خصوصیتیں (عبادتیں) دل کے لئے عادت کی طرح ہوجاتی ہیں محنت سے حاصل کی ہوئی چیزوں کی طرح نہیں رہتیں۔

اور جب بہیمی خصلتیں عقل پر غالب آتی ہیں تو عقل مکار اور ایسے خیالات بن جاتی ہے جو بعض فطری تقاضوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ پس آدمی اپنے نفس سے جماع کی باتیں کرتا ہے، اگر اس میں شہوت کی زیادتی ہوتی ہے، اور قسم قسم کے کھانوں کی باتیں کرتا ہے، اگر اس کو بھوک ہوتی ہے، اور اس کے مانند —— یا شیطان کی وحی غالب آتی ہے تو خیالات مائل ہوتے ہیں بہترین نظاموں کو کھولنے کی طرف، اور معتقداتِ حقہ میں تشکیک کی طرف، اور ایسی اوپری ہیئتوں کی طرف

جن کونفوس سلیمہ ناپسند کرتے ہیں (الجُرْبُز: دھوکہ باز جمع جَرَابِزَۃ)

اور جب عقل پر کسی درجہ میں ملکی خصلتیں غالب آتی ہیں تو وہ ایسی عقل بن جاتی ہے، جس کے کام سے اُن بدیہی یا نظری علوم ارتقاقیہ یا احسانیہ کی تصدیق کرنا ہوتا ہے جن کا غیب سے فیضان ہوتا ہے، خواب کی صورت میں، اور فراست، کشف اور غیبی آواز کے طور پر، اور ان کے مانند طریقوں سے —— اور جب عقل ایسے مجردات کی طرف مائل ہوتی ہے جو زمان ومکان سے پاک ہیں تو وہ عقلِ خفی ہے۔

اور جب فطرت اترتی ہے بہیمی خصلتوں کی طرف تو وہ برائیوں کا بہت زیادہ حکم کرنے والا نفس ہوتی ہے —— اور جب فطرت: بہیمیت وملکیت کے درمیان متردد ہوتی ہے، اور معاملہ کنویں کے ڈول اور باریوں کا ہوتا ہے تو فطرت: برائیوں پر بہت زیادہ ملامت کرنے والا نفس ہوتی ہے —— اور جب فطرت: شریعت کی پابند ہوجاتی ہے، اور اس سے بغاوت نہیں کرتی، اور اس سے وہی چیز پھوٹتی ہے جو شریعت کے موافق ہوتی ہے، تو وہ فطرت: پرسکون نفس ہوتی ہے —— یہ وہ بات ہے جو میرے پاس ہے انسان کے لطائف کے علم سے، باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

---

[۲] وفتنة الرجل في أهله: وهي فساد تدبير المنزل، وإليها الإشارة في قوله صلى الله عليه وسلم:" إن إبليس يضع عرشهَ —— إلى أن قال —— ثم يجيئ أحدهم، فيقول: ما تركتُه حتى فرَّقتُ بينه وبين امرأته، فيُدْنيه منه، ويقول: نِعْمَ أنت!"

[۳] وفتنة تموج كموج البحر: وهي فساد تدبير المدينة، وطمع الناس في الخلافة من غير حق، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" إن الشيطان قد أيس أن يعبده المصلون في جزيرة العرب، ولكن في التحريش بينهم"

[٤] وفتنة مِلِّية: وهي ان يموت الحواريون من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، ويُستند الأمرُ إلى غير أهله، فيتعمق رهبانهم وأحبارهم، ويتهاون ملوكهم وجهالهم، ولايأمرون بمعروف، ولا ينهون عن منكر، فيصير الزمانُ زمانَ الجاهلية، وهو قوله صلى الله عليه وسلم: "مامن نبي إلا كان له حواريون" الحديث.

[٥] وفتنة مستطيرة: وهي تغير الناس من الإنسانية ومقتضاها:

[الف] فأزكاهم وأزهدهم: إلى الانسلاخ من مقتضيات الطبع رأسًا، دون إصلاحها، والتشبه بالمجردات والتحنُّن إليهم بوجه من الوجوه، ونحو ذلك.

[ب] وعامتهم: إلى البهيمية الخالصة.

[ج] ويكون ناس بين الفريقين: لا إلى هؤلاء، ولا إلى هؤلاء.

[٦] وفتنة الوقائع الجوّية المنذِرة بالإهلاك العام: كالطوفانات العظيمة: من الوباء، والخسف، والنار المنتشرة في الأقطار، ونحو ذلك.

ترجمہ: (۲) اور آدمی کا فتنہ اس کی بیوی میں: اور وہ نظام خانہ داری کا بگاڑ ہے — (۳) اور وہ فتنہ جو سمندر کی طرح موجیں مارتا ہے: اور وہ نظام مملکت کا بگاڑ ہے، اور لوگوں کا ناحق حکومت کی حرص کرنا ہے — (۴) اور ملّی (مذہبی) فتنہ: اور وہ یہ ہے کہ مخصوص صحابہ وفات پا جائیں (یہ صفتِ کاشفہ ہے، تمام ہی صحابہ مخصوص حضرات تھے) اور (دینی) معاملہ نااہلوں کے سپرد کر دیا جائے، پس ان کے بزرگ اور علماء تعمق سے کام لیں، اور ان کے بادشاہ اور عوام سستی برتیں، وہ نہ کسی معروف کا حکم دیں، اور نہ کسی منکر سے روکیں، پس زمانہ: زمانہ جاہلیت ہو کر رہ جائے — (۵) اور چار دانگ عالَم پھیلنے والا فتنہ: اور وہ لوگوں کا انسانیت اور اس کے تقاضوں سے بدل جانا ہے: — (الف) پس ان کا سب سے زیادہ پاکیزہ اور ان کا سب سے بڑا زاہد (مائل ہونے والا ہوتا ہے:) طبیعت کے تقاضوں سے بالکلیہ نکل جانے کی طرف، نہ کہ ان کی اصلاح کی طرف، اور مجردات سے مشابہت پیدا کرنے کی طرف، اور صورتوں میں سے کسی صورت کے ذریعہ مجردات کے اشتیاق کی طرف، اور اس کے مانند کی طرف — (ب) اور ان کے عوام بہیمیتِ خالصہ کی طرف مائل ہوتے ہیں — (ج) اور کچھ لوگ دونوں فریقوں کے درمیان درمیان ہوتے ہیں، نہ ان کی طرف ہوتے ہیں، نہ اُن کی طرف — (۶) اور فضائی واقعات کا فتنہ جو ڈرانے والا ہوتا ہے عام تباہی کے ذریعہ۔ جیسے بڑے طوفان یعنی وبائیں، زمین کا دھنسنا، اور علاقوں میں پھیلنے والی آتش زدگی، اور ان کے مانند۔

نوٹ: لطائفِ انسانی کی زیادہ وضاحت اس لئے نہیں کی کہ ان کی کافی تفصیل رحمۃ اللہ (۴: ۴۱۲-۵۱۴) میں آچکی ہے۔

☆ ☆ ☆

روایاتِ فتن

۱- قساوتِ قلبی

حدیث (۱) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم ضرور گذشتہ لوگوں کے طریقوں کی پیروی کرو گے، جیسے بالشت بالشت کے برابر ہوتی ہے اور ہاتھ ہاتھ کے برابر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ لوگ گوہ کے بل میں گھسے ہونگے، تو تم بھی ان کی پیروی کرو گے“ پوچھا گیا: یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ”اور کس کی؟!“ (مشکوٰۃ حدیث ۵۳۶۱)

حدیث (۲) — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”نیک لوگ ختم ہو جائیں گے: یکے بعد دیگرے، اور جَو کی بھوسی کی طرح بھوسی رہ جائے گی یعنی جیسے جَو کا آٹا کھا لیا جاتا ہے اور بھوسی رہ جاتی ہے: یہی حال امت کا بھی ہو جائے گا۔ پس اللہ

تعالیٰ ان لوگوں کی کچھ پرواہ نہیں کریں گے یعنی وہ لوگ کسی شمار قطار میں نہیں ہونگے (مشکوٰۃ حدیث ۵۳۶۲)

تشریح: سورۃ الحدید آیت ۱۶ میں ہے: ''کیا ایمان لانے والوں کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت اور اس دین حق کے سامنے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے، اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجائیں، جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر زمانۂ دراز بیت گیا، پس ان کے دل سخت ہوگئے، اور ان میں سے بہت سے اطاعت سے نکلنے والے ہیں'' اس آیت سے نبی ﷺ نے یہ بات جانی کہ جب آپؐ کی امت کا زمانہ: زمانۂ نبوت سے دور ہوگا، اور آپؐ کے مخصوص اصحاب ختم ہوجائیں گے، اور معاملہ نااہلوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا تو لوگ ضرور نفسانی اور شیطانی تقاضوں کے پیچھے چل پڑیں گے۔ اور وہ تقاضے سبھی لوگوں کو عام ہوجائیں گے، صرف وہی لوگ بچیں گے جن کو اللہ کا فضل شامل ہوگا۔

۲-حکومت کا بگاڑ

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس دین کا آغاز نبوت ورحمت سے ہوا ہے، پھر خلافت ورحمت ہوگی، پھر گزندہ حکومت آئے گی۔ پھر جبر، ظلم اور فساد فی الارض ہوگا۔ لوگ ریشم، شرمگاہ اور شراب کو حلال کرلیں گے، اور وہ اسی حالت میں روزی دیئے جائیں گے اور مدد کئے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ اللہ سے ملیں گے'' (مشکوٰۃ حدیث ۵۳۷۵)

تشریح: عہد نبوت آنحضرت ﷺ کی وفات پر ختم ہوگیا۔ اور اس خلافت کا زمانہ جس میں تلوار نیام سے نہیں نکلی: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت پر ختم ہوا۔ اور مطلق خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے عہدے سے ہٹنے پر ختم ہوا۔ پھر گزندہ حکومت آئی۔ اور وہ بنوامیہ کے جھگڑے اور مظالم ہیں۔ یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکومت کو قرار حاصل ہوا۔ اور جبر وسرکشی کا دور عباسیوں کی حکومت ہے۔ انھوں نے حکومت کی بنیاد قیصر وکسری کے طریقوں پر قائم کی۔

فائدہ: دو باتیں جاننی چاہئیں: ایک: ضروری نہیں کہ ابتک روایاتِ فتن میں بیان کی ہوئی ساری باتیں پائی جاچکی ہوں۔ ممکن ہے کچھ باتیں آگے پائی جائیں۔ دوم: ایک خبر کا مصداق متعدد واقعات ہوسکتے ہیں۔ مثلاً جبر وظلم، عناد وسرکشی اور فساد فی الارض پر مشتمل متعدد حکومتیں ہوسکتی ہیں۔

۳-فاسد خیالات

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فتنے دلوں پر پیش کئے جاتے ہیں: چٹائی کی طرح تنکا تنکا کرکے یعنی فتنے رفتہ رفتہ اثر انداز ہوتے ہیں، پس جو دل فتنے پلایا گیا ہے یعنی فتنوں سے اسے دلچسپی ہے، اس میں ایک سیاہ دھبہ لگایا جاتا ہے۔ اور جو دل فتنوں کو اجنبی سمجھتا ہے، اس میں ایک سفید نقطہ لگایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دل دو طرح کے ہوجاتے ہیں: ایک

سنگ مرمر کی طرح سفید۔ اس کو کوئی فتنہ ضرر نہیں پہنچاتا، جب تک آسمان وزمین برقرار ہیں۔ دوسرا: سیاہ خیالا، اوندھی صراحی کی طرح، جو نہ کسی نیکی کو پہچانتا ہے، نہ کسی برائی کو، مگر اس خواہش کو جو اس میں پیوست ہو چکی ہے'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۸۰)

تشریح: نفسانی اور شیطانی خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں، پھر اعمالِ فاسدہ ان کو اپنے پہلو میں لے لیتے ہیں۔ پس جس کے دل میں فتنوں کے برخلاف ہیئت ہوتی ہے، اس کو برے خیالات نہیں آتے، اور نہ وہ برائیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور بصورت دیگر آدمی وساوس میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس وقت اس میں دین پر عمل کرنے کا مضبوط داعیہ باقی نہیں رہتا۔ فاسد خیالات اس کا گریبان پکڑے رہتے ہیں، اور اس کو دین پر گامزن نہیں ہونے دیتے۔

۴-امانت داری کا فقدان

حدیث — رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''امانت لوگوں کے دلوں کی تھاہ میں اتری، پھر لوگوں نے قرآن سیکھا، پھر انھوں نے سنت سیکھی'' اس کے بعد آپؐ نے یہ بات بیان فرمائی کہ امانت کس طرح اٹھائی جائے گی، فرمایا: ''آدمی ایک نیند سوتا ہے یعنی ذرا غافل ہوتا ہے کہ امانت اس کے دل سے نکال لی جاتی ہے۔ اس کا اثر ایک نشان کی طرح رہ جاتا ہے۔ پھر وہ ایک نیند سوتا ہے کہ باقی ماندہ امانت بھی نکال لی جاتی ہے، بس چھالے کے نشان کی طرح باقی رہ جاتی ہے۔ جیسے چنگاری پیر پر لڑھکائی جائے، اور آبلہ پڑ جائے، تو وہ پھولا ہوا نظر آئے گا، مگر اس میں کوئی (کارآمد) چیز نہیں ہوگی'' (مشکوۃ حدیث ۵۳۸۱)

تشریح: اس حدیث میں امت کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ظہور کا ارادہ فرمایا تو صحابہ کی جماعت کو منتخب فرمایا۔ ان کے دلوں کو انقیاد واذعان کا، اور اللہ کے احکام کی موافقت پر پوری توجہ منعطف کرنے کا خوگر بنایا، اور ان کو خیر امت بنا کر کھڑا کیا۔ پھر اپنی شریعت نازل فرمائی، اور قرآن وحدیث میں مفصل احکام بیان کئے، جن پر ان حضرات نے مضبوطی سے عمل کیا۔ پھر زمانہ آگے بڑھا تو وہ احکام سینوں سے نکلنے لگے۔ لوگوں نے احکام کی طرف سے غفلت برتی، وہ دین کو بتدریج فراموش کرتے گئے۔ اور لوگوں کا یہ حال ہو گیا کہ آدمی بڑا دانا فرزانہ نظر آتا ہے، مگر دل میں ذرہ بھر امانت نہیں ہوتی، نہ دین کے تعلق سے، نہ معاملات کے تعلق سے۔

۵-انقلابِ زمانہ

حدیث — حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم پہلے برے حال میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں خیر سے ہمکنار کیا، پس کیا اس خیر کے بعد بھی شر ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں!'' انھوں نے دریافت کیا: اس سے بچنے کی کیا صورت ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تلوار!'' انھوں نے دریافت کیا: کیا جنگ کے بعد بھی شر کا کچھ حصہ باقی رہے گا؟ آپؐ نے

فرمایا: ''ہاں! چپڑی آنکھ والی حکومت، اور کدورت کے ساتھ صلح!'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: پھر کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: ''گمراہی کے داعی اٹھیں گے! پس اگر زمین میں کوئی اللہ کا خلیفہ ہو، جو تیری پشت پر کوڑے مارے، اور تیرے مال کو لیلے تو بھی اس کی اطاعت کر، ورنہ کسی درخت کے تنے کو مضبوط پکڑے ہوئے مرجا (مشکوۃ حدیث ۵۳۹۶)

تشریح: وہ فتنہ جس سے بچاؤ تلوار ہوگی وہ دور صدیقی میں عرب کا ارتداد ہے۔ اور چپڑی آنکھ والی حکومت: وہ جھگڑے ہیں جو حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں پیش آئے۔ اور کدورت کے ساتھ صلح: وہ صلح ہے جو معاویہ اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی۔ اور گمراہی کے داعی شام میں یزید، عراق میں مختار ثقفی، اور ان جیسے لوگ ہیں، یہاں تک کہ لوگ عبد الملک کی حکومت پر متفق ہوگئے۔

چار بڑے فتنے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فتنۃ الاحلاس (ٹاٹ کے فتنے) کا تذکرہ فرمایا۔ پوچھا گیا: ٹاٹ کا فتنہ کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ بھاگنا اور لڑنا ہے!'' پھر اس کے بعد فتنۃ السرّاء (خوش حالی کا فتنہ) ہوگا۔ اور اس کا غبار میرے خاندان کے ایک شخص کے پیروں تلے سے اٹھے گا، اس کا گمان ہوگا کہ وہ میرا ہے، حالانکہ وہ میرا نہیں، میرے دوست تو پرہیزگار ہیں۔ پھر لوگ ایک شخص پر جو پسلی پر سرین کی طرح ہوگا اتفاق کرلیں گے یعنی اس کا انتظام بہت ہی خراب ہوگا، پھر فتنہ تار ہوگا، جو امت کے کسی آدمی کو نہیں چھوڑے گا۔ ہر ایک کو طمانچہ مارے گا۔ جب کہا جائے گا کہ فتنہ فرو ہوا تو وہ دراز ہوگا (مشکوۃ حدیث ۵۴۰۳)

تشریح: احلاس کا فتنہ: شامیوں کی عبد اللہ بن الزبیر سے جنگ ہے، جبکہ وہ مدینہ سے بھاگ کر مکہ چلے گئے۔ اور خوش حالی کا فتنہ: یا تو مختار ثقفی کا تغلب اور اس کا قتل ولوٹ میں حد سے بڑھ جانا ہے، جو اہل بیت کے خون کے بدلے کا دعویدار ہوگا، اور یہ ارشاد کہ: ''اس کا گمان ہوگا کہ وہ میرا ہے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت کی پارٹی کا اور ان کا مددگار ہوگا، نسبی رشتہ مراد نہیں۔ پھر لوگ مروان پر متفق ہوگئے، جس کی حکومت پسلی پر سرین کی طرح تھی۔ یا فتنۃ السرّاء سے ابو مسلم خراسانی کا خروج مراد ہے، جو بنو عباس کی حمایت میں اٹھا۔ اس کا بھی دعوی تھا کہ وہ اہل بیت کی خلافت کے لئے کوشاں ہے۔ پھر سفاح کی حکومت پر لوگ متفق ہوگئے، جس کی امارت پسلی پر سرین کی طرح تھی۔ اور فتنہ تار: تاتاری چنگیز خانیوں کا مسلمانوں پر تغلّب، اور ان کا بلاد اسلام کو لوٹنا ہے (ان فتنوں کی تفصیل آگے آرہی ہے)

قیامت کی نشانیاں: فتنے ہی فتنے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک قیامت کی نشانیاں یہ ہیں: علم اٹھالیا جائے گا، جہالت پھیل جائے

گی، زنا کی کثرت ہوگی۔ شراب عام ہوجائے گی، مرد کم ہوجائیں گے اور عورتوں کی کثرت ہوگی، یہاں تک کہ پچاس عورتوں کے لئے ایک مرد ذمہ دار ہوگا'' (مشکوۃ حدیث ۵۴۳۷)

تشریح: قیامت کی اِن نشانیوں کا تعلق فتنوں کی مذکورہ بالا انواع، ان کے شیوع اور ان کی کثرت سے ہے۔ پس جو فتنوں سے قریب ہوگا وہ ہلاک ہوگا۔ اور اگر ہلاک نہیں ہوگا تو ہلاکت کے کنارے پہنچ جائے گا۔ اور اس کی تفصیل لمبی ہے۔

فائدہ: حشر کا لفظ شریعت کی اصطلاح میں دو معنی میں استعمال کیا جاتا ہے: ایک: لوگوں کو ملک شام میں جمع کرنا۔ ایسا قیامت سے پہلے ہونے والا ہے۔ جب لوگ روئے زمین پر کم ہوجائیں گے تو سب کو شام میں جمع کیا جائے گا۔ کچھ لوگ مختلف تقریبات سے مثلاً تجارت، نوکری وغیرہ کے لئے وہاں پہنچیں گے، اور کچھ لوگوں کو آگ ہانک کر لے جائے گی۔ دوم: مرنے کے بعد زندہ ہونے کو بھی حشر کہا جاتا ہے۔ جس کی تفصیل رحمۃ اللہ (۱:۳۹۹-۴۱۳) میں گذر چکی ہے۔

وقد بين النبي صلى الله عليه وسلم أكثر الفتن:

[۱] قال: " لتتَّبِعُنَّ سُنَنَ من قبلكم، شبرًا بشبر، وذراعًا بذراع، حتى لو دخلوا جُحر ضَبٍّ تَبِعتُموهم" وقال عليه السلام: " يذهب الصالحون: الأول فالأول، وتبقى حُفالَةٌ كحفالة الشعير، لايباليهم الله بالةً"

أقول: علِم النبي صلى الله عليه وسلم أنه إذا بَعُدَ العهدُ من النبي، وانقرض الحواريون من أصحابه، ووُسِّدَ الأمر إلى غير أهله: لابد أن تجرِيَ الرسمُ حسب الدواعي النفسانية والشيطانية، وتَعُمُّهم جميعا إلا من شاء الله منهم.

[۲] وقال صلى الله عليه وسلم: " إن هذا الأمر بدأ نبوة ورحمة، ثم يكون خلافة ورحمة، ثم مُلْكاً عَضُوْضًا، ثم كائنٌ جبريةً وعتوًّا وفسادًا في الأرض، يستحلُّون الحرير، والفروج، والخمور، يرزقون على ذلك، وينصرون، حتى يلقوا الله"

أقول: فالنبوة انقضت بوفاة النبي صلى الله عليه وسلم؛ والخلافةُ التي لاسيف فيها بمقتل عثمان؛ والخلافةُ بشهادة علي كرّم الله وجهه، وخلعِ الحسن رضي الله عنه؛ والملك العضوض مشاجرات بني أمية، ومظالمهم، إلى أن استقر أمر معاوية، والجبريةُ والعتو خلافة بني العباس، فإنهم مَهَّدوها على رسوم كسرى وقيصر.

[۳] وقال صلى الله عليه وسلم: " تُعْرَضُ الفتن على القلوب كالحصير عودًا عودًا، فأي قلب أُشْرِبَهَا نُكتت فيه نكتة سوداء، وأيُّ قلب أنكرها نكتت فيه نكتة بيضاء، حتى تصير على قلبين: أبيضُ مثلُ الصفا، فلا تضره فتنة مادامت السماوات والأرض، والآخَرُ أسودُ مُرْبَادًّا،

كالكوز مُجَخِّيًا، لايعرف معروفا، ولاينكر منكرًا، إلا ما أُشرب من هواه"

أقول: الهواجس النفسانية والشيطانية تنبعث في القلوب، والأعمالُ الفاسدة تكتنفها، ولا تكون حينئذ دعوة حثيثة إلى الحق، فلاينكرها إلا من جبل في قلبه هيئة مضادّة للفتن، وتَعُمُّ من سوى ذلك، وتأخذ بتلابيبه.

[٤] وقال صلى الله عليه وسلم:" إن الأمانة نزلت في جذر قلوب الناس، ثم عَلِمُوا من القرآن، ثم عَلِمُوا من السنة" وحدَّث عليه السلام عن رفعها، فقال:" ينام الرجلُ النومةَ، فَتُقْبض الأمانة من قلبه، فَيَظَلُّ أثرها مثلَ أثر الوَكْتِ، ثم ينام النومة، فتُقبض الأمانة، فيبقى أثرها مثلَ أثر المَجْل، كجمر دحرجتَه على رجلك، فَنَفِطَ، فتراه مُنْتَبِرًا"

أقول: لما أراد الله ظهور ملة الإسلام: اختار قومًا، ومَرَّنَهم للانقياد والإذعان، وجمع الهمة على موافقة حكم الله، ثم كانت الأحكام المفصلة في الكتاب والسنة تفصيلا لذلك الإذعان الإجمالي؛ ثم إنها تخرج من صدورهم على غفلة منها وذهولٍ، شيئا فشيئا، فَيُرَى الإنسانُ أظرف مايكون وأعقَلَه، وليس في قلبه مقدار شيئ من الأمانة، لابالنسبة إلى دين الله، ولا بالنسبة إلى معاملات الناس.

[٥] وقال حذيفة رضي الله عنه: قلت: يارسولَ الله! أيكون بعد هذا الخير شر، كما كان قبله شر؟ قال:" نعم" قلت: فما العصمة؟ قال:" السيف" قلت: وهل بعد السيف بقية؟ قال:" نعم، يكون إمارةٌ على أَقْذاءٍ، وهُدْنَةٌ على دَخَنٍ" قلت: ثم ماذا؟ قال:" يَنْشَأُ دعاةُ الضلال، فإن كان لله في الأرض خليفةٌ، جَلَدَ ظهرك، وأخَذَ مالك، فَأَطِعْهُ، وإلا فَمُتْ وأنت عاضٌّ على جَذْلِ شجرة"

أقول: الفتنة التي تكون العصمة فيها السيف: ارتداد العرب في أيام أبي بكر رضي الله عنه؛ وأما إمارة على أقذاء، فالمشاجرات التي وقعت في أيام عثمان وعلى رضي الله عنهما؛ وهدنة على دَخَن: الصلح الذي وقع بين معاوية والحسن بن على رضي الله عنه؛ ودعاةُ الضلال: يزيد بالشام، ومختار بالعراق، ونحو ذلك، حتى استقر الأمر على عبد الملك.

[٦] وذكر صلى الله عليه وسلم فتنة الأحلاس، قيل: وما فتنة الأحلاس؟ قال:" هي هربٌ وحرب" قال:" ثم فتنة السرَّاء: دَخَنُهَا من تحت قدمَيْ رجلٍ من أهل بيتي، يزعم أنه مني، وليس مني، إنما أوليائي المتقون، ثم يصطلح الناس على رجل كوَرِكٍ على ضِلَعٍ، ثم فتنة

الدُّهَيْمَاء، لا تدع أحدًا من هذه الأمة إلا لَطَمَتْه لطمة، فإذا قيل: انْقَضَتْ، تَمادَتْ"

أقول: يُشبه — والله أعلم— أن تكون فتنةُ الأحلاس: قتالَ أهل الشام عبدَ الله بنَ الزبير بعد هربه من المدينة؛ وفتنة السرَّاء: إما تغلُّب المختار، وإفراطُه في القتل والنهب، يَدَّعي ثأْرَ أهل البيت؛ فقوله عليه السلام:" يزعم أنه مني" معناه: من حزب أهل البيت، وناصريهم؛ ثم اصطلحوا على مروان وأولاده؛ أو خروج أبي مسلم الخُراساني لبني العباس، يزعم أنه يسعى في خلافة أهل البيت؛ ثم اصطلحوا على السفاح؛ والفتنة الدهيماء: تغلُّب الجنكيزية على المسلمين، ونهبهم بلادَ الإسلام.

[۷] وبين النبي صلى الله عليه وسلم أشراطَ الساعة، وهي ترجع إلى أنواع الفتنِ التي مر ذكرها، وشيوعِها وكثرتها، فإن التَّلَفَ من القَرَفِ، وإنما يجيئ النقصان من حيث يجيئ الهلاك، وشرح هذا يطول.

قال صلى الله عليه وسلم:" إن من أشراط الساعة: أن يُرْفَعَ العلم، ويكثر الجهل، ويكثر الزنا، ويكثر شرب الخمر، ويقل الرجال، وتكثر النساء، حتى يكون لخمسين امرأةً القيمُ الواحد"

والحشر: في لسان الشريعة مقول على معنيين:

[۱] حشرُ الناس إلى الشام: وهو واقعةٌ قبل القيامة، حين يَقِلُّ الناسُ على وجه الأرض: يُحشر بعضُهم بتقريبات، وبعضُهم بنار تسوقهم.

[۲] وحشرٌ هو البعثُ بعد الموت: وقد ذكرنا من قبل أسرار المعاد، والله أعلم.

ترجمہ: نبی ﷺ نے بیشتر فتنے واضح کردیئے ہیں: (۱) نبی ﷺ نے یہ بات جانی کہ جب زمانہ نبی سے دور ہوگا، اور اس کے ساتھیوں میں سے مخصوص اصحاب گذر جائیں گے، اور دین کا معاملہ نا اہلوں کے سپرد کردیا جائے گا تو ضروری ہے کہ طریقہ چل پڑے نفسانی اور شیطانی تقاضوں کے مطابق، اور عام ہوجائیں وہ تقاضے سب کو، مگر ان میں سے جن کو اللہ تعالیٰ چاہیں (حُفالة اور حُثالة ہم وزن اور ہم معنی ہیں: یعنی بھوسی)

(۲) پس نبوت گذر گئی نبی ﷺ کی وفات سے۔ اور وہ خلافت جس میں تلوار نہیں شہادت عثمان سے، اور (مطلق) خلافت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت اور حسن رضی اللہ عنہ کے عہدہ چھوڑنے سے، اور کٹ کھنی حکومت بنی امیہ کے جھگڑے اور ان کے مظالم ہیں، یہاں تک کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ ٹھہر گیا۔ اور زبردستی اور سرکشی بنو العباس کی حکومت ہے۔ کیونکہ وہ حکومت کو قابو میں لائے ہیں کسریٰ اور قیصر کے طریقوں پر۔

(۳) نفسانی اور شیطانی خیالات دلوں میں ابھرتے ہیں۔ اور اعمالِ فاسدہ ان کو پہلو میں لئے رہتے ہیں۔ اور نہیں ہوتی اس وقت دینِ حق کی طرف برانگیختہ کرنے والی دعوت، پس نہیں اجنبی سمجھتا ان خیالات کو مگر وہ شخص جس کے دل میں فتنوں کے برخلاف حالت پیدا کی گئی ہے۔ اور عام ہوجاتے ہیں وہ خیالات ان لوگوں کو جو ان کے سوا ہیں۔ اور پکڑ لیتے ہیں وہ خیالات ان کے گریبانوں کو۔

(۴) جب اللہ تعالیٰ نے ملتِ اسلامیہ کا ظہور چاہا یعنی جب آخری پیغمبر کا زمانہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک قوم (صحابہ) کو منتخب کیا، اور ان کو خوگر بنایا اذعان وانقیاد کا، اور اللہ کے حکم کی موافقت پر کامل توجہ کو اکٹھا کرنے کا۔ پھر وہ احکام جن کی قرآن وسنت میں تفصیل کی گئی ہے اس اجمالی اذعان کی تفصیل تھے۔ یعنی وہ احکام بعد میں نازل ہوئے، اور صحابہ نے ان پر دل وجان سے عمل شروع کیا۔ پھر وہ احکام مسلمانوں کے سینوں سے نکل جاتے ہیں ان کی ذرا سی غفلت اور ذہول کی وجہ سے۔ تدریجی طور پر یعنی زمانہ گذرنے کے ساتھ سستی پیدا ہوتی گئی، اور دن بہ دن امت احکامِ شرعیہ بھولتی گئی۔ پس انسان دیکھا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ ہوشیار اور زیادہ سے زیادہ عقلمند، اور نہیں ہوتی اس کے دل میں امانت کی ذرا سی مقدار بھی، نہ اللہ کے دین کے تعلق سے، اور نہ لوگوں کے ساتھ معاملات کے تعلق سے۔ امانت کی تفسیر کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ (۱:۶ ۲۴)

لغات: الوَکْت: جسم کا کوئی بھی نشان...... المَجْل: گٹھا۔ وہ نشان جو کام کرنے سے ہاتھ وغیرہ میں پڑ جاتا ہے۔

(۵) وہ فتنہ جس میں بچاؤ تلوار ہوگی: وہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عربوں کا مرتد ہونا ہے۔ اور رہی آنکھ کی چیپڑ کے ساتھ حکومت: تو وہ وہ جھگڑے ہیں جو حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں پیش آئے۔ اور کدورت کے ساتھ مصالحت: وہ صلح ہے جو حضرت معاویہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی۔ اور گمراہی کے داعی: شام میں یزید، اور عراق میں مختار، اور ان کے مانند ہیں، یہاں تک کہ معاملہ عبدالملک پر ٹھہر گیا۔

(۶) صحت سے قریب —— اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں —— یہ بات ہے کہ فتنۃ الاحلاس: اہلِ شام کی عبداللہ بن الزبیر سے جنگ ہے، ان کے مدینہ سے بھاگنے کے بعد، اور فتنۃ السرّاء: یا تو مختار ثقفی کا تغلب ہے، اور اس کا قتل اور لوٹ میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ جو اہلِ بیت کے خون کے بدلے کا دعویدار تھا۔ پس آپؐ کا ارشاد: ''وہ گمان کرے گا کہ وہ مجھ سے ہے'' اس کے معنی ہیں: اہلِ بیت کے گروہ سے ہوگا، اور ان کے مددگاروں میں سے ہوگا۔ پھر لوگ متفق ہوگئے مروان اور اس کی اولاد پر (یہ تیسرا فتنہ ہے) یا ابومسلم خراسانی کا خروج (بغاوت) ہے، بنی عباس کے لئے، وہ گمان کرے گا کہ وہ کوشش کررہا ہے اہلِ بیت کی خلافت کے لئے، پھر لوگ متفق ہوگئے سفاح (کی ناقص حکومت) پر۔ اور تاریک فتنہ: چنگیزیوں کا مسلمانوں پر تغلب، اور ان کا بلادِ اسلام کو لوٹنا ہے۔

فائدہ: پسلی پر سرین: یہ محاورہ ہے۔ اس کے معنی ہیں: ناقص، ناتمام۔ کیونکہ سرین تو پسلی کا بوجھ اٹھا سکتی ہے، مگر پسلی

سرین کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔

(۷) اور نبی ﷺ نے قیامت کی نشانیاں بیان کیں، اور وہ لوٹتی ہیں فتنوں کی ان انواع کی طرف جن کا تذکرہ گزر چکا، اور ان فتنوں کے شیوع اور ان کی کثرت کی طرف، پس بیشک نزدیکی میں ہلاکت ہے یعنی جو فتنوں سے نزدیک ہوگا وہ ہلاک ہوگا۔ اور نقصان آتا ہے جہاں سے ہلاکت آتی ہے یعنی اگر کوئی فتنوں سے پوری طرح ہلاک نہیں ہوگا تو بسمل ضرور ہو جائے گا، اور اس کی تفصیل دراز ہے۔

(فائدہ) اور حشر شریعت کی زبان میں دو معنی پر بولا جاتا ہے: (۱) لوگوں کو شام کی طرف جمع کرنا، اور ایسا قیامت سے پہلے ہونے والا ہے، جب لوگ زمین پر کم ہو جائیں گے، کچھ مختلف مناسبتوں سے جمع کئے جائیں گے، اور کچھ لوگ ایسی آگ کے ذریعہ جمع کئے جائیں گے جو ان کو ہانک کر لے جائے گی ——— (۲) اور وہ حشر جو کہ وہ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے، اور ہم نے قبل ازیں معاد کے اسرار بیان کر دیئے ہیں۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

چار بڑے فتنوں کی تعیین

گذشتہ حدیث میں جن چار بڑے فتنوں کا تذکرہ آیا ہے: وہ درج ذیل ہیں:

پہلا فتنہ ——— آنکھ کی چیپڑ کے ساتھ حکومت کا فتنہ ——— اس کا مصداق وہ اختلافات ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رونما ہوئے۔ یہاں تک کہ معاویہ رضی اللہ عنہ پر اتفاق ہو گیا۔ اسی اتفاق کو ''کدورت کے ساتھ مصالحت'' کہا گیا ہے۔ اور معاویہؓ کے سب کام شریعت کے موافق نہیں تھے، ان کے بعض کام اوپرے تھے، کیونکہ ان کا طریقہ بادشاہوں کا طریقہ تھا۔ وہ ان سے پہلے والے خلفاء کی سیرت پر نہیں تھے۔

دوسرا فتنہ ——— احلاس کا فتنہ، اور جہنم کی طرف داعیوں کا فتنہ ——— اس کا مصداق وہ اختلافات اور بغاوتیں ہیں جو معاویہؓ کی وفات کے بعد لوگوں میں حکومت کی آز میں پیدا ہوئیں۔ یہاں تک کہ معاملہ عبد الملک بن مروان پر ٹھہر گیا۔

تیسرا فتنہ ——— خوش حالی، زبردستی اور سرکشی کا فتنہ ——— اس کا مصداق امویوں کے خلاف عباسیوں کی بغاوت ہے۔ یہاں تک کہ خلافتِ عباسیہ قائم ہوگئی۔ دولتِ عباسیہ کی بنا شاہانِ فارس کے طریقوں پر تھی، اور انھوں نے زبردستی اور سرکشی سے حکومت حاصل کی تھی۔

چوتھا فتنہ ——— اندھا فتنہ ——— جس نے تمام لوگوں کو چپت رسید کیا۔ جب بھی اس کے بارے میں خیال کیا جاتا کہ نمٹ گیا تو وہ پیر پھیلاتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ دو خیموں میں تقسیم ہوگئے۔ یہ تاتاریوں کا فتنہ ہے۔ انھوں نے دولتِ عباسیہ پر یلغار کی، اور ان کی حکومت کو بیخ وبُن سے اکھاڑ دیا۔

فتنوں کی دواور روایتیں

۱-ستر سال تک اسلام کی چکی چلتی رہے گی

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی چکی ۳۵ سال، یا ۳۶ سال، یا ۳۷ سال تک چلتی رہے گی۔ پس اگر مسلمان ہلاک ہوگئے تو وہ ان لوگوں کی راہ ہے جو پہلے ہلاک ہوئے یعنی پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ اور اگر ان کے لئے ان کا دین قائم رہا، تو وہ ستر سال تک قائم رہے گا'' پوچھا گیا: کیا ان سے جو باقی رہے یا ان سے جو گذر گئے؟ یعنی یہ ستر سال شروع سے شمار کئے جائیں یا ۳۵ سال کے بعد سے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ان سے جو گذر گئے'' یعنی شروع اسلام سے شمار کئے جائیں (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۵۴۰۷)

تشریحات: (۱) ''اسلام کی چکی چلتی رہے گی'' کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا معاملہ مستقیم رہے گا، حدود نافذ ہوتی رہیں گی، اور جہاد جاری رہے گا۔ چنانچہ آغاز ہجرت اور ابتدائے جہاد سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت تک اسی طرح معاملہ چلتا رہا (آپؓ کی شہادت ذی الحجہ ۳۵ ہجری میں ہوئی ہے)

(۲) اور ۳۵، ۳۶ اور ۳۷ میں شک کی وجہ یہ ہے کہ اجمالی وحی آئی تھی، پوری طرح تعیین نہیں کی گئی تھی۔

(۳) ''اگر مسلمان ہلاک ہوگئے تو وہ ان لوگوں کی راہ ہے جو پہلے ہلاک ہوئے'': اس ارشاد میں معاملہ کی سنگینی کا بیان ہے یعنی امت ایسے پر آشوب دور سے گزرے گی کہ لوگوں کو اس کی ہلاکت کا اور اس کے معاملات کے درہم برہم ہوجانے کا اندیشہ لاحق ہوگا۔

(۴) ''ستر سال'' کی ابتدا بعثتِ نبوی سے ہے، جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر پورے ہوجاتے ہیں (آپؓ کی وفات رجب ۶۰ ہجری میں ہوئی ہے) اور اس کے بعد گمراہی کے داعیوں کا فتنہ اٹھے گا۔

(۵) ''ستر سال'' میں تین باتوں کا بیان ہے: ایک: معاملہ کی ہولناکی۔ دوم: اس طرف اشارہ ہے کہ اس مدت میں بھی امت کا معاملہ مشیتِ ایزدی کے تحت رہے گا۔ سوم: اس مدت کے بعد امت کا معاملہ مستقیم نہیں رہے گا۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

۲-ترکوں کے ساتھ تین معرکے

حدیث —— رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے چھوٹی آنکھوں والی قوم یعنی ترک جنگ کریں گے، تم ان کا تین مرتبہ تعاقب کروگے یہاں تک کہ تم ان کو جزیرۃ العرب سے ملادوگے یعنی باہر کردوگے۔ پہلے تعاقب میں: جو ان میں سے

بھاگیں گے بچ جائیں گے۔ اور دوسرے تعاقب میں: بعض بچ جائیں گے، بعض ہلاک ہوں گے، اور تیسرے تعاقب میں ان کا صفایا ہو جائے گا'' (رواہ ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۵۴۳۱)

تشریح: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عربوں کی ترکوں سے جنگ ہوگی، اور عرب غلبہ پائیں گے۔ مگر اس سے ترکوں کے دلوں میں کینہ اور دشمنی پیدا ہوگی، اور معاملہ یہاں تک پہنچے گا کہ وہ عربوں کو اپنے علاقوں سے نکال دیں گے۔ پھر اس پر بس نہیں کریں گے، بلکہ وہ عرب علاقے میں گھس جائیں گے۔ ان کو جزیرۃ العرب سے ملانے کا یہی مطلب ہے۔

پہلے تعاقب میں وہ عرب نجات پائیں گے جو ان کے سامنے سے بھاگیں گے۔ چنانچہ جب چنگیزیوں نے حملہ کیا تو وہ عباسی ہلاک ہوئے جو بغداد میں تھے، اور وہ عباسی بچ گئے جو مصر کی طرف بھاگ گئے۔ اور دوسرے تعاقب میں بعض نجات پائیں گے، بعض ہلاک ہوں گے۔ چنانچہ تیمور لنگ نے دیارِ شام کو روندا، اور عباسیوں کی حکومت کو درہم برہم کر دیا۔ اور تیسرے تعاقب میں: وہ سب کو ہلاک کر دیں گے، چنانچہ عثمانیوں نے غلبہ پالیا، اور ساری اسلامی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

نوٹ: شاہ صاحب رحمہ اللہ نے حدیث کی جو شرح کی ہے، اس میں غور کیا جائے۔ حدیث میں تیسرے تعاقب میں ترکوں کا صفایا ہو جانے کا ذکر ہے۔

الفتن العظيمة: التى أخبربها النبى صلى الله عليه وسلم أربع:

الأولى: فتنة إمارة على أقذاء: وذلك صادق بمشاجرات الصحابة بعد مقتل عثمان رضى الله عنه، إلى أن استقرت خلافة معاوية؛ وهى التى أشير إليها بقوله:" هدنة على دخن" وهو الذى يُعرف أمره ويُنكر، لأنه كان على سيرة الملوك، لا على سيرة الخلفاء قبله.

الثانية: فتنة الأحلاس، وفتنة الدعاة إلى أبواب جهنم: وذلك صادق باختلاف الناس وخروجهم طالبين الخلافةَ بعد موت معاوية، إلى أن استقرت خلافة عبد الملك.

الثالثة: فتنة السرَّاء، والجبرية، والعتو: وذلك صادق بخروج بنى العباس على بنى أمية، إلى أن استقرت خلافة العباسية، ومهدوها على رسوم الأكاسرة، وأخذوا بجبرية وعتو.

الرابعة: فتنة تلطم جميعَ الناس، إذا قيل: انقضت تمادت حتى رجع الناس إلى فسطاطين: وذلك صادق بخروج الأتراك الجنكيزية، وإبطالهم خلافةَ بنى العباس، ومزقهم على وجهها الفتن.

والأحاديث الواردة فى الفتن: أكثرها مرت من قبل:

[۱] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" تدور رحى الإسلام لخمس وثلاثين، أوست وثلاثين، أو سبع وثلاثين؛ فإن يَهْلكوا فسبيلُ من هلك، وإن يَقُمْ لهم دينهم: يقم لهم سبعين

عامًا" قلت: أمما بقي، أوممامضى؟ قال:" مما مضى"

فمعنى قوله:" تدور رحى الإسلام" أى يقوم أمر الإسلام بإقامة الحدود والجهادفي هذه الأمة: وذلك صادق من ابتداء وقت الجهاد وأوائل الهجرة إلى مقتل سيدنا عثمان رضى الله عنه.

والشك في خمسة وثلاثين وأخواتها: لأن الله تعالى أوحى إليه مجملاً.

وقوله:" فإن يهلكوا" بيان لصعوبة الأمر، وأن الأمر يصير إلى حالة: لو نظر فيها الناظر يشك في هلاك الأمة، وبطلان أمورهم.

قوله:" سبعين عامًا" ابتداؤُهامن البعثة، وتمامها موتُ معاوية رضى الله عنه، وبعده قامت فتنة دعاة الضلال.

وقوله:" سبعين عامًا"معناه: تهويل الأمر، وأنه يكون تحت بطن الباطن فيه، وأنه لايكون بعد هذه استقامة الأمر، والله أعلم.

[٢] وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم:"يقاتلكم قوم صغار الأعين — يعني الترك — تسوقهم ثلاث مرات" الحديث.

معناه: أن العرب يجاهدونهم،ويغلبونهم، فيصير ذلك سببا لأحقاد وضغائن، حتى يؤول الأمر إلى أن يَذُبُّوْا العرب من بلادهم، ثم لايقتصرون على ذلك، بل يدخلون بلاد العرب، وهذاهو المراد من قوله:" حتى تلحقوهم بجزيرة العرب".

أمافي السياقة الأولى فينجو من العرب من هرب من قتالهم: بأن يفر من بين أيديهم؛ وذلك صادق بقتال الجنكيزية، فهلك العباسية الذين كانوا ببغداد، ونجا العباسية الذين فروا إلى مصر.

وأما في السياقة الثانية: فينجو بعض، ويهلك بعض: وذلك صادق بوطء تيمور ديار الشام، وإهلاك أمر العباسية.

وأما في الثالثة فَيُصْطَلَمُوْنَ: وذلك صادق بغلبة العثمانية على جميع العمل، والله أعلم.

ترجمہ: وہ بڑے فتنے جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے: چار ہیں: پہلا: آنکھ کی چیڑ کے ساتھ حکومت کا فتنہ ہے۔ اور یہ بات صادق ہے صحابہ کے اختلاف پر عثمانؓ کی شہادت کے بعد، یہاں تک کہ معاویہؓ کی خلافت کو قرار آ گیا۔ اور یہی (استقرار خلافتِ معاویہ) وہ ہے جس کی طرف ''کدروت کے ساتھ مصالحت'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اور معاویہؓ وہ ہیں جن کا معاملہ پہچانا بھی جاتا ہے اور انکار بھی کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ بادشاہوں کی سیرت پر تھے، ان سے پہلے کے خلفاء کی سیرت پر نہیں تھے —— دوسرا احلاس کا فتنہ، اور جہنم کے دروازوں پر کھڑے ہوئے داعیوں کا فتنہ ہے۔ اور یہ بات صادق آتی ہے

لوگوں کے اختلاف کرنے پر اوران کے نکلنے پر درانحالیکہ وہ طلب کرنے والے تھے حکومت کو معاویہؓ کی موت کے بعد، یہاں تک کہ عبدالملک کی حکومت ٹھہر گئی ـــــ تیسرا: سَرّاء، جبریت اور سرکشی کا فتنہ ہے۔ اور یہ صادق ہے بنی عباس کے خروج پر بنی امیہ کے خلاف، یہاں تک کہ عباسیوں کی حکومت قائم ہوگئی، اور انھوں نے حکومت کی بنیاد شاہانِ فارس کے طریقوں پر رکھی تھی، اور انھوں نے زبردستی اور سرکشی سے حکومت حاصل کی تھی ـــــ چوتھا: وہ فتنہ ہے جو تمام لوگوں کو چپت رسید کرے گا۔ جب کہا جائے گا کہ تمٹ گیا: پیر پھیلائے گا، یہاں تک کہ لوگ دو خیموں (عرب وعجم) کی طرف لوٹیں گے۔ اور یہ بات صادق ہے چنگیزی ترکوں کے خروج پر، اور ان کے بنوالعباس کی حکومت مٹانے پر، اور ان کے فتنوں کی بیٹ کرنے پر خلافت کے چہرے پر (مَزَق الطائر مَزْقا: پرندہ کا بیٹ کرنا)

اور وہ حدیثیں جو فتنوں کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں: ان میں سے بیشتر قبل ازیں گزر چکی ہیں: (۱) آپؐ کے ارشاد: ''اسلام کی چکی چلتی رہے گی'' کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کا معاملہ مستقیم رہے گا، حدود قائم کرنے اور جہاد کرنے کے ذریعہ۔ اور یہ بات صادق ہے جہاد کے وقت کی ابتدا اور اوائل ہجرت سے سیدنا عثمانؓ کی شہادت تک ـــــ اور ۳۵ اور اس کی بہنوں میں شک بایں وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی طرف مجمل وحی فرمائی تھی ـــــ اور آپؐ کا ارشاد: ''پس اگر وہ ہلاک ہوئے'' معاملہ کی سنگینی کا بیان ہے، اور یہ بات بیان کی ہے کہ معاملہ ایسی حالت کی طرف لوٹے گا کہ اگر غور کرنے والا اس میں غور کرے تو وہ شک کرے گا امت کی ہلاکت میں اور ان کے معاملات کے درہم برہم ہونے میں ـــــ اور آپؐ کا ارشاد: ''ستر سال'' اس کی ابتدا بعثت سے ہے، اور اس کی انتہا معاویہؓ کی موت پر ہے، اور اس کے بعد گمراہی کے داعیوں کا فتنہ اٹھے گا ـــــ اور آپؐ کے ارشاد: ''ستر سال'' کا مطلب یہ ہے کہ (۱) معاملہ بڑا ہولناک ہوگا (۲) اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہوگا (الباطن: اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور بطن سے مراد مخفی معاملہ ہے) (۳) اور یہ کہ اس کے بعد معاملہ مستقیم نہیں ہوگا۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں ـــــ (۲) حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عرب: ترکوں کے ساتھ جہاد کریں گے، اور ان پر غلبہ پائیں گے۔ پس یہ بات کینہ اور دشمنی کا سبب ہوگی، یہاں تک کہ معاملہ لوٹے گا اس طرف کہ وہ عربوں کو اپنے شہروں سے دفع کریں گے۔ پھر وہ اس پر اکتفا نہیں کریں گے، بلکہ وہ عربوں کے علاقہ میں داخل ہوجائیں گے۔ اور یہی بات مراد ہے آپؐ کے ارشاد: ''یہاں تک کہ وہ ان کو جزیرۃ العرب سے ملادیں گے'' سے ـــــ رہا پہلی مرتبہ کے تعاقب میں: پس وہ عرب نجات پائیں گے جو ان کی جنگ سے بھاگیں گے، بایں طور کہ وہ ان کے سامنے سے بھاگ کھڑا ہو۔ اور یہ بات صادق ہے چنگیزیوں کی جنگ پر، پس وہ عباسی ہلاک ہوئے جو بغداد میں تھے، اور وہ عباسی بچ گئے جو مصر کی طرف بھاگ گئے ـــــ اور رہا دوسری مرتبہ کے تعاقب میں: پس نجات پائیں گے بعض، اور ہلاک ہونگے بعض۔ اور یہ بات صادق ہے تیمور کے دیارِ شام کو روندنے پر، اور عباسیوں کے معاملہ کو تباہ کرنے پر ـــــ اور رہا تیسری مرتبہ کے تعاقب میں: پس وہ ہلاک کردیں گے (شاہ صاحب نے فعل معروف لیا ہے) اور یہ بات صادق ہے عثمانیوں کے غلبہ پانے سے سارے کام پر۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں۔

نوٹ: الفتن العظيمة سے باب کے آخر تک عبارت مخطوطہ کراچی میں نہیں ہے۔ اور مطبوعہ کے محشی نے لکھا ہے کہ صرف ایک مخطوطہ میں یہ عبارت تھی، جس کی بنا پر اس کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔

باب ــــــ ۳

مناقب

فضائل صحابہ کی بنیادیں

احادیث میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل وارد ہوئے ہیں، ان کی چند بنیادیں ہیں:

پہلی بنیاد: نبی ﷺ کسی کی ایسی قلبی کیفیت پر مطلع ہوں جو دخولِ جنت کا باعث ہو، جیسے آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''آپ ان لوگوں میں سے نہیں، جو تکبر کی بنا پر ایسا کرتے ہیں'' (رواہ البخاری، مشکوٰۃ حدیث ۴۳۶۹) یعنی تہبند گھسیٹتے ہیں۔ اور آپ نے یہ بات بھی جانی کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کمالات اور خصالِ حمیدہ کی تکمیل کرلی ہے جن کی وجہ سے ان کے لئے جنت کے بھی باب وا ہوجائیں گے چنانچہ آپ نے فرمایا ''میں امید کرتا ہوں کہ آپ انہی لوگوں میں سے ہیں'' (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۹۰) یعنی آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو جنت کے تمام دروازوں سے پکارا جائے گا (رحمۃ اللہ ۴: ۱۴۶) اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''شیطان تمہیں جس راستہ پر چلتا ہوا دیکھتا ہے، وہ تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۲۷) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ ''اگر میری امت میں کوئی محدَّث (ملہم) ہے تو وہ عمر ہیں'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۲۶)

دوسری بنیاد: خواب میں نبی ﷺ دیکھیں، یا آپ کے دل میں یہ بات ڈالی جائے کہ فلاں شخص دین میں راسخ القدم ہے۔ جیسے آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جنت میں آپ سے آگے چل رہے ہیں (رحمۃ اللہ ۳: ۵۲۱) یا آپ نے جنت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا محل دیکھا (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۲۸) اور خواب میں آپ ﷺ کے سامنے لوگ پیش کئے گئے، جنھوں نے کرتے پہن رکھے تھے۔ کسی کا کرتا چھاتی تک تھا، کسی کا اس سے نیچے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پیش کئے گئے، انھوں نے اتنا لمبا کرتا پہن رکھا تھا جو زمین پر گھسٹتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا: اس کی تعبیر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''دین'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۲۹) یعنی دین میں آپ راسخ القدم ہیں۔ اور خواب میں آپ ﷺ کے سامنے دودھ کا پیالہ پیش کیا گیا۔ آپ نے خوب چھک کر پیا، اور بچا ہوا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیا۔ لوگوں نے پوچھا: اس کی تعبیر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''علم'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۳۰) یعنی علم دین میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔

تیسری بنیاد: نبی ﷺ کسی سے محبت کریں، یا اس کی تعظیم وتکریم کریں، یا اس کے ساتھ ہمدردی کریں، یا اس نے

اسلام کی طرف سبقت کی ہو، تو یہ سب باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ اس کا دل ایمان سے لبریز ہے۔ جیسے ایک مرتبہ آپ ﷺ لیٹے ہوئے تھے، پنڈلیاں کھلی تھیں، ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے آئے آپؐ نے اسی حال میں ان کو اجازت دیدی۔ پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ آئے تو آپؐ بیٹھ گئے، کپڑے درست کر دیئے، پھر ان کو اجازت دی (رواہ مسلم، مشکوٰۃ حدیث ۶۰۶۰) یہ تکریم کی مثال ہے۔ اور جیسے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق میں زخمی ہوئے، تو آپؐ نے ان کی خبر گیری کے لئے ان کا خیمہ مسجد نبوی کے پاس لگوایا۔ یہ ہمدردی کی مثال ہے۔

قرونِ ثلاثہ کی فضیلت جزئی فضیلت ہے

متفق علیہ روایت میں ہے: خیر أمتي قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم: میری بہترین امت میرا قرن ہے، پھر وہ لوگ ہیں جو ان سے ملے ہوئے ہیں، پھر وہ لوگ ہیں جو ان سے ملے ہوئے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۶۰۰۱) اس حدیث میں اسلام کی شروع کی تین صدیوں کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے، وہ جزئی فضیلت ہے، کلّی (ہر اعتبار سے) نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ میری امت کا حال بارش جیسا ہے، معلوم نہیں شروع کی بارش بہتر ہے یا آخر کی؟ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ حدیث ۶۲۷۷) اور حدیث میں ہے کہ آپؐ قبرستان تشریف لے گئے، اور مُردوں کو سلام کیا، پھر فرمایا: ''میری خواہش تھی کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھتا'' صحابہ نے عرض کیا: کیا ہم آپؐ کے بھائی نہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم میرے صحابہ (ساتھی) ہو، اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے'' (مسلم شریف ۳: ۱۳۸)

اور اس کی وجہ: یہ ہے کہ اعتبارات متعارض اور فضیلت کی وجوہ مختلف ہیں۔ مثلاً ایمان کے ساتھ آپ ﷺ کی زیارت باعثِ فضیلت ہے، تو آپؐ کے دیدار کے بغیر ایمان لانا بھی فضیلت کی بات ہے۔ حدیث میں ہے: ''ان لوگوں کے لئے خوشی کا موقع ہے، جنھوں نے مجھے دیکھا ہے۔ اور ان لوگوں کیلئے سات مرتبہ خوشی کا موقع ہے، جنھوں نے مجھے نہیں دیکھا، اور وہ مجھ پر ایمان لائے ہیں'' (رواہ احمد، مشکوٰۃ حدیث ۶۲۸۱) پس یہ بات ممکن نہیں کہ قرنِ فاضل: قرنِ مفضول سے ہر اعتبار سے افضل ہو۔ یہ بات کیسے ہوسکتی ہے؟ قرون ثلاثہ میں بالاتفاق منافق اور فاسق بھی تھے۔ اور ان میں حجاج بن یوسف، یزید بن معاویہ، مختار ثقفی اور قریش کے وہ لونڈے بھی تھے جن کے ہاتھ سے امت تباہ ہونے والی تھی (بخاری حدیث ۳۶۰۵) اور ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ تھے جن کی تباہ حالی نبی ﷺ نے خود بیان فرمائی ہے۔ پس برحق بات یہ ہے کہ قرنِ اول کے جمہور: قرنِ ثانی کے جمہور سے افضل ہیں۔ اسی طرح قرنِ ثانی کے جمہور: قرنِ ثالث کے جمہور سے افضل ہیں۔

فائدہ: قرونِ ثلاثہ عرض (زمانہ کی چوڑائی) میں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ جب آپؐ حیات تھے، اس وقت جسے بحالتِ ایمان آپؐ کی زیارت نصیب ہوئی وہ صحابی ہے۔ مگر اس زمانہ میں بھی سب مسلمانوں نے آپؐ کی زیارت نہیں کی تھی۔ بہت سے مدینہ سے باہر رہتے تھے۔ اور ان کو خدمتِ نبوی میں حاضری کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ وہ صحابی نہیں تھے۔ البتہ اگر

انھوں نے کسی صحابی کی زیارت کی ہے تو وہ تابعی ہیں، اور جس نے تابعی کو دیکھا ہے وہ تبع تابعی ہے۔ اور جس کو یہ سعادت بھی حاصل نہیں ہوئی وہ کچھ بھی نہیں۔ پس زمانۂ صحابہ میں جو برے لوگ تھے وہ ایمان میں مخلص نہیں تھے، جیسے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی لعنہ اللہ! یا وہ مابعد کے طبقات کے لوگ ہیں جن کا دوسرا درجہ ہے، وہ اول درجہ کے لوگ نہیں ہیں۔

صحابہ پر اعتماد کیوں ضروری ہے؟

ملتِ اسلامیہ: زمانہ کے طول وعرض میں نقل وتوارث کے ذریعہ ثابت کی جاتی ہے یعنی جہاں آئندہ نسل کو دین صحابہ نے پہنچایا ہے، وہیں جزیرۃ العرب سے باہر پوری دنیا میں بھی دین صحابہ نے پہنچایا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ ۲: ۵۱) پس اگر صحابہ کی توقیر وتعظیم نہیں کی جائے گی اور ان لوگوں کو قابل اعتماد قرار نہیں دیا جائے گا جنھوں نے مواقع وحی کو دیکھا ہے، وحی کا مطلب سمجھا ہے، سیرت طیبہ کا مشاہدہ کیا ہے، اور ملت کی ہر طرح سے حفاظت کی ہے۔ نہ اس میں غلو کیا ہے، نہ عمل میں سستی برتی ہے، نہ اس کو دوسری ملت کے ساتھ خلط ملط کیا ہے: تو نقل وتوارث سے اعتماد اٹھ جائے گا اور دین کا استناد ختم ہو جائے گا۔

ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما افضلِ امت کیوں ہیں؟

امت کے وہ لوگ جو قابل اعتبار ہیں: اس پر متفق ہیں کہ افضلِ امت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کارِ نبوت کے دو بازو ہیں: ایک: اللہ تعالیٰ سے دین حاصل کرنا۔ دوسرا: لوگوں میں اس کو پھیلانا۔ ظاہر ہے کہ اللہ سے دین حاصل کرنے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ البتہ دین کی اشاعت کے لئے تدبیر وتالیف ضروری ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی اور آپؐ کے بعد بھی اس معاملہ میں پیش پیش رہے ہیں۔ فجزاهما الله عن أمة محمد صلى الله عليه وسلم أحسنَ الجزاء (آمین)

﴿ المناقب ﴾

الأصل في مناقب الصحابة رضي الله عنهم أمور:

منها: أن يطَّلع النبيُّ صلى الله عليه وسلم على هيئة نفسانية، تُعِدُّ الإنسانَ لدخول الجنان، كما اطَّلع على أبي بكر رضي الله عنه: أنه ليس فيه خُيَلاء، وأنه ممن أكملَ الخصالَ اللتي تكون أبوابُ الجنة تمثالاً لها، فقال: "أرجو أن تكون منهم" يعني الذين يُدْعَوْن من الأبواب جميعًا؛ وقال صلى الله عليه وسلم لعمر رضي الله عنه: "ما لَقِيَكَ الشيطانُ سالكًا فَجًّا قطُّ، إلا سلك فجًا غير فجك" وقال صلى الله عليه وسلم: "إن يَكُ من أمتي أحد من المحدَّثين، فإنه عمر"

ومنها: أن يرى في المنام، أو يُنفث في رُوعه مايدل على رسوخ قدمه في الدين، كما رأى

بـلالاً رضـي الله عنـه يتقدّمه في الجنة؛ ورأى قصرا لعمر رضي الله عنه في الجنة؛ ورآه قُمُصَ بقميص سابغ؛ وأنه عليه السلام أعطاه سؤره من اللبن، فعَبَّرَ بالدين والعلم.

ومنها: حبُّ النبي صلى الله عليه وسلم إياهم، وتوقيرهم، ومواساته معهم، وسوابقهم في الإسلام، فذلك كله: ظاهره: أنه لم يكن إلا لا متلاء القلب من الإيمان.

واعلم: أن فضل بعض القرون على بعض: لايمكن أن يكون من جهة كل فضيلة، وهو قوله صلى الله عليه وسلم:" مثلُ أمتي مثلُ المطر: لايُدرى أوله خير أم آخره" وقوله صلى الله عليه وسلم:" أنتم أصحابي، وإخواني الذين يأتون بعد"

وذلك: أن الاعتبـاراتِ متعـارضة، والوجوهَ متجاذبة، ولايمكن أن يكون تفضيلُ كل أحد من القرن الفاضل على كل أحد من القرن المفضول، كيف؟ ومن القرون الفاضلة اتفاقا من هو منافق، أو فاسق، ومنها الحجاج، ويزيد بن معاوية، ومختار، وغِلْمة من قريش، الذين يُهلكون الناسَ، وغيرُهم ممن بين النبي صلى الله عليه وسلم سوءَ حالهم؛ ولكن الحقّ أن جمهور القرن الأول أفضل من جمهور القرن الثاني، ونحو ذلك.

والملة: إنما تُثبت بالنقل والتوارث، ولاتوارث إلا بأن يُعَظِّمَ الذين شاهدوا مواقعَ الوحي، وعرفوا تأويله، وشاهدوا سيرة النبي صلى الله عليه وسلم، ولم يُخلِّطوا معها تعمقا، ولا تهاونا، ولا ملة أخرى.

وقد أجمع من يُعتَدُّ به من الأمة: على أن أفضل الأمة أبوبكر الصديق، ثم عمر رضي الله عنهما: وذلك: لأن أمر النبوة له جناحان: تلقي العلم عن الله تعالى؛ وبثُّه في الناس؛ أما التلقي من الله: فلا يَشْرَكُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم في ذلك أحد؛ وأما بثُّه: فإنما تحقَّق بسياسة وتاليف، ونحوِ ذلك؛ ولاشك أن الشيخين رضي الله عنهما أكثرُ الأمة في هذه الأمور، في زمان النبي صلى الله عليه وسلم وبعدَه، والله أعلم.

وليكنْ هذا آخرَ ما أردنا إيراده في كتاب حجة الله البالغة، والحمدلله تعالى أولاً وآخرًا، وظاهرًا وباطنًا، وصلى الله على خير خلقه محمد، وآله وأصحابه أجمعين.

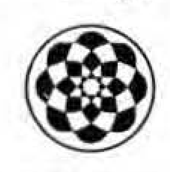
ترجمہ: مناقب کا بیان: صحابہ رضی اللہ عنہم کے مناقب کی بنیاد چند امور ہیں: از انجملہ: یہ ہے کہ نبی ﷺ مطلع ہوں کسی ایسی نفسانی ہیئت پر جو انسان کو دخولِ جنت کے لئے تیار کرتی ہے، جیسے آپ ابوبکرؓ کے بارے میں مطلع ہوئے کہ ان میں غرور نہیں ہے۔ اور اس پر مطلع ہوئے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ان باتوں کو مکمل کرلیا ہے، جن کے

لئے جنت کے دروازے پیکرِ محسوس (منتظر) ہوتے ہیں ــــــ اور از انجملہ: یہ ہے کہ آپؐ خواب میں دیکھیں یا آپؐ کے دل میں وہ بات ڈالی جائے جو کسی کے دین میں راسخ القدم ہونے پر دلالت کرتی ہو، جیسا کہ آپؐ نے بلالؓ کو دیکھا کہ وہ جنت میں آپؐ سے آگے جارہے ہیں، اور آپؐ نے جنت میں عمرؓ کا محل دیکھا، اور آپؐ نے ان کو دیکھا کہ وہ ایک لمبا کرتا پہنائے گئے ہیں، اور آپؐ نے ان کو اپنا بچا ہوا دودھ عطا فرمایا، پس آپؐ نے اس کی تعبیر دین اور علم سے بیان کی ــــــ اور از انجملہ: نبی ﷺ کا ان سے محبت کرنا، اور ان کی توقیر وتعظیم کرنا، انکے ساتھ ہمدردی کرنا ہے۔ اور ان کا اسلام قبول کرنے میں سبقت کرنا ہے۔ پس یہ ساری باتیں: اس کا ظاہر یہ ہے کہ وہ برتاؤ نہیں تھا، مگر ایمان سے دل بھر جانے کی وجہ سے۔

اور جان لیں کہ بعض صدیوں کی بعض پر فضیلت: ممکن نہیں کہ ہو ہر فضیلت کی جہت سے...... اور وہ بات: اس لئے ہے کہ اعتبارات متعارض، اور وجوہات مختلف ہیں، اور قرنِ فاضل کے ہر ایک کی تفضیل ممکن نہیں قرنِ مفضول کے ہر ایک پر۔ کیسے؟ اور قرونِ فاضلہ میں بالاتفاق وہ لوگ تھے جو منافق یا فاسق تھے۔ اور ان میں حجاج، یزید بن معاویہ، مختار اور قریش کے وہ لڑکے تھے جو لوگوں کو تباہ کریں گے۔ اور ان کے علاوہ وہ لوگ تھے جن کی بدحالی نبی ﷺ نے بیان فرمائی ہے۔ بلکہ برحق بات یہ ہے کہ قرنِ اول کے جمہور: قرنِ ثانی کے جمہور سے افضل ہیں، اور اس کے مانند یعنی آئندہ دو قرنوں میں بھی یہی کہا جائے۔

اور ملت: نقل وتوارث ہی سے ثابت کی جاتی ہے، اور توارث (قابل اعتماد) نہیں، مگر بایں طور کہ ان لوگوں کی توقیر وتعظیم کی جائے جنھوں نے مواقع وحی کو دیکھا ہے، اور انھوں نے وحی کا مطلب سمجھا ہے، اور انھوں نے نبی ﷺ کی سیرت کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور انھوں نے ملت کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا غلو کو، اور نہ سستی کو، اور نہ دوسری ملت کو۔

اور امت میں جو لوگ قابل لحاظ ہیں وہ اس بات پر متفق ہیں کہ افضلِ امت ابوبکر صدیق ہیں، پھر عمر ہیں، اللہ دونوں سے راضی ہوں۔ اور یہ بات اس لئے ہے کہ کارِ نبوت کے دو بازو ہیں: اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنا، اور اس کو لوگوں میں پھیلانا۔ رہا اللہ سے لینا: تو اس میں نبی ﷺ کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اور رہا اس کا پھیلانا: تو وہ پایا جاتا ہے سیاست (تدبیر وانتظام) اور تالیف (لوگوں کو دین سے جوڑنے) کے ذریعہ، اور ان کے مانند سے۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امت میں سے شیخین سب سے زیادہ ہیں ان کاموں میں نبی ﷺ کے زمانہ میں، اور آپؐ کے بعد۔ باقی اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں ــــــ اور چاہئے کہ یہ آخر ہو اس کا جس کو لانے کا ہم نے ارادہ کیا ہے حجۃ اللہ البالغہ میں۔ اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں: آغاز میں اور انتہا میں، ظاہر میں اور باطن میں۔ اور اللہ تعالیٰ بے پایاں رحمتیں نازل فرمائیں بہترین خلائق حضرت محمد پر، اور ان کے خاندان پر اور ان کے تمام صحابہ پر۔



تقریبِ اختتام

اسی کے فضل سے آغاز کا انجام ہوتا ہے ✷ اسی کی مہربانی سے جہاں کا کام ہوتا ہے

ذی قعدہ ۱۴۱۹ھ ہجری میں اس شرح کا آغاز ہوا۔ اور آج ۱۹ر ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ ہجری مطابق فروری ۲۰۰۴ء عیسوی بروز بدھ یہ شرح تکمیل پذیر ہوئی۔ اس موقعہ پر دل بارگاہِ بے نیاز میں سجدہ ریز ہے کہ اس نے اس ناتواں بندے سے یہ کام لے لیا۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے ✷ جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

فالحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات، وصلی الله علی النبی العربی الهاشمي وعلى آله وصحبه أجمعين.